دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماهنامه جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
ستمبر 2013
نگران اعلیٰ
معراج رسول

جلد 43 • شمارہ 09 • ستمبر 2013 • زرِسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مدیر اعلیٰ

چینی نکتہ چینی

عزیزانِ من... السلام علیکم!

دفاعِ پاکستان... ستمبر 2013 کا شمارہ آپ کی نذر ہے... ملک اور خصوصاً کراچی میں بڑھتی ہوئی لاقانونیت کے ساتھ جمہوریت کا سفر جاری ہے۔ زرداری صاحب جارہے ہیں، ممنون صاحب ان کے جانشین منتخب ہوچکے ہیں۔ پارلیمان میں نواز لیگ سب پر حاوی ہوگئی، پیپلز پارٹی پس منظر میں چلی گئی۔ پرانے وزیروں، مشیروں کی جگہ نئے لوگوں نے لے لی مگر اب تک عوام کے مفاد میں کوئی فیصلہ سامنے نہیں آیا۔ یہ سب گاؤ آمد و خر رفت والا معاملہ بنا ہوا ہے۔ کراچی میں دہشت گرد بے خوفی سے دندنا رہے ہیں، روز لاشیں گر رہی ہیں، رہزنی اتنی عام ہوچکی ہے کہ پیدل چلنے والا محفوظ ہے نہ کار سوار۔ پستول کی نال پر پوری پوری بسوں کو بھی لوٹا جاتا ہے۔ ڈیزل اور پیٹرول کے دام بڑھاتے ہوئے مژدہ سنایا جاتا ہے کہ عوام پر اس کا اثر نہیں ہوگا... کیسے نہیں ہوگا؟ نقل و حمل کے اخراجات آخر کار عوام کی جیب سے ہی پورے ہوتے ہیں۔ گوشت، دال، سبزیاں سب روز بروز مہنگی اور مہنگی تر ہورہی ہیں... متوسط طبقہ تو جیسے تیسے گزر بسر کرلے گا۔ اکثریتی اور غریب طبقہ کیا گھاس کھانا شروع کردے۔ کاش آئینی موشگافیوں اور ذاتی مفتعقوں میں شب و روز سر کھپاتے والے ہمارے مقتدر رہنما اقتدار کی بلندیوں سے نیچے... بہت نیچے آکر ان کا حال بھی دیکھیں جو اپنی معاشی ابتری سے بے حال ہیں، جنھیں کہیں مہنگائی نوچ کھسوٹ رہی ہے، کہیں سیلابی ریلے بے دردی سے بہائے لیے جارہے ہیں... لکھنے بیٹھیں تو دفتر کے دفتر سیاہ ہوجائیں... کہاں تک سنو گے... کہاں تک سنائیں۔

ان مصائب و عوامل کو تھوڑی دیر بھولتے ہیں... اور آپ کی خوب صورت خطوط کی محفل میں چلتے ہیں...

بہاولپور سے بشریٰ افضل کی پُربہار حاضری ''2 اگست کو جاسوسی ہمارے پیارے ہاتھوں میں جگ مگ کررہا تھا۔ ٹائٹل پر صنف کرخت سخت اذیت میں مبتلا تھا بے چارہ۔ جشن آزادی سمندر، بوری بند لاش مکمل جاسوسی نامہ پیش کرتا نظر آیا۔ کبیر عباسی آپ کا تبصرہ لمبا چوڑا نہ ہونے کے باوجود پہلے نمبر پر آگیا، لکھا بھی سو سو تھا کرسی صدارت مبارک۔ انکل! کبھی ہمیں بھی یہ کرسی دے دیا کریں، ہماری محنت کا صلہ ہی سہی۔ (آپ ہماری سینئر ترین تبصرہ نگار ہیں... یقیناً آپ حق رکھتی ہیں کرسی صدارت کے اعزاز کے لیے) کبیر صاحب خالص غذا استعمال کریں تاکہ معدہ ہر چیز ہضم کرسکے۔ اس محفل میں تقریباً سارے نئے قاری نظر آئے میرے پرانے تمام ساتھی واپس آجائیں کہ بشریٰ افضل نے کمان سنبھال لی ہے۔ ڈاکٹر عمران خیر تو ہے صنف نازک کا پہلا نمبر دیکھ کر آپ کا دل کیوں جل رہا ہے۔ تفسیر عباس مستقل مزاجی سے حاضری لگوا رہے ہیں، وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔ ماہتاب عمیر آپ کے ''وہ'' کا کوئی نام تو ہوگا۔ بہرحال انکل اپنے لکھنے والوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ آپ کا تبصرہ بھی لگا دیا۔ ان کا شکریہ ادا کریں۔ کاشف صاحب خدا کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے جس کو ہم انسان نہیں سمجھ سکتے۔ اب اپنے رنگوں کی طرف چلیں۔ سرورق کی پہلی کہانی قفس کا قیدی ثمرہ اور آصف نے بڑی بہادری سے حالات کا مقابلہ کیا۔ خرم نے جی جان سے انکوائری کی۔ میرا اندازہ درست نکلا کہ احسن ہی دولت کی خاطر یہ کام کرواسکتا ہے۔ دوسرے رنگ نے خاص تاثر نہیں دیا، بس گزارہ ہی تھا۔ حساب کے ساتھ بھی کوئی انصاف نظر نہیں آیا۔ انداز دگر، واہ شوہروں نے بیویوں سے جان چھڑانے کا انداز نرالا ہی نکالا ہے۔ موقع شناس میں تو اتنا جاسوسی پن تھا، پل پل... جاسوسی، سنسنی خیزی، اتنا تیز ٹیمپو کہ ختم کرکے بھی سحر میں کھوئی رہی۔ اس کہانی نے آخر تک اپنے سحر میں جکڑ کر رکھا۔ بے شناخت مجرم ٹیلر کی بیوی کا شبہ درست تھا کہ اس کے شوہر کو قتل کیا گیا ہے۔ باب نے بڑی باریک بینی سے قاتل کا سراغ لگایا اور مسز ٹیلر کو 20 لاکھ کی رقم بھی مل گئی۔ مٹی میں ریت، مریم کے خان کی خوب صورت ترین تحریر سطر سطر جاسوسی، فارمولے کو حاصل کرنے کے لیے امریکی اور چینی نے ڈٹ کر مقابلہ کیا حتیٰ کہ فضا میں بھی۔ عمارہ کی ذہانت کی داد دینی چاہیے۔''

کلول ضلع بھکر سے قیصر اقبال گچھ، اعجاز احمد راحیل کی دوست نوازی ''وقت کے دھارے پر چل کر انسان نے ترقی کا بہت سفر طے کیا۔ انسان کی ترقی کے اس سفر میں جہاں نفرتوں نے جنم لیا، وہاں محبتیں ناپید ہوتی گئیں مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نفرتوں کے اس جہاں میں کوئی تو ہے جو اپنے حصے کی شمع جلا کر محبتوں کو فروغ دے رہا ہے۔ وہ ہے ہمارا ہر دلعزیز جاسوسی۔ اگست کا جاسوسی ہو، رم جھم برستی بارش ہو، عید کی خوشیاں ہوں اور جاسوسی کی وساطت سے اعجاز احمد راحیل جیسے دوست کا ساتھ ہو تو دل بے اختیار کہے گا۔

برسات کے موسم میں، عید کے عالم میں
میں گھر سے نکل آیا، جاسوسی بھی اٹھا لایا

سب باتوں سے نظر چرا کر سید حاد داخل ہوئے اپنی محفل میں جہاں کبیر عباسی کی گریڈنگ نے انہیں گریڈ ون کی پوزیشن پر لا کھڑا کیا، مبارک باد۔ اچھے سید بادشاہ! لگے رہو بھیا، ہوسکتا ہے پوزیشن دریافت کرنے کا ورلڈ ریکارڈ آپ کے حصے میں آجائے۔ زریاب جی! ذرا دیکھیں سعدیہ بخاری کا پہلی بال پر سکسر اور دوسری بال پر بیک ٹو دی بلیک... محمد اشفاق صاحب! تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ تفسیر بھیا! سعدیہ بخاری کی اس پہلی پرواز کی اتنی حوصلہ شکنی نہ کرو کہ بے چاری محفل سے احتجاجاً واک آؤٹ ہی کرجائے۔ احسان بھیا! آپ ڈنکے کی چوٹ پر رہیں یا ڈنکا آپ پر چوٹ لگاتا رہے۔ ہم تو آپ کی خوشی میں خوش ہیں۔ طاہرہ بی بی! دعا ہے کہ صبا گل کے سرکار دور غائب ہوجائے، کہیں سر ہی نہ غائب ہوجائے۔ ہمایوں سعید! ہم نے سنا ہے کہ پچھلے کچھ عرصے سے

سید بادشاہ کے عظیم الشان شہر میں ایک الّو کا اضافہ ہو چکا ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب۔ شہریار اور سلو اپنے مشن کی جانب گامزن تو ماہ بانو حالات کی ستم ظریفی کا شکار۔ لگتا ہے کہانی اپنے اختتام کی جانب گامزن ہے۔ جواری کی دوسری قسط بھی شاندار رہی۔ امید ہے کہ جواری کسی حد تک للکار کا مداوا کرنے میں کامیاب رہے۔ مریم کے خان کی پہلی کہانی مٹھی میں ریت ایک زبردست کہانی تھی۔ جان کو انگلی کا ناچ نچانے والے چینی ایجنٹ زیان کا کردار بہت جان دار تھا۔ سلیم فاروقی کا پہلا رنگ نفس کا قیدی میں مجھے پہلے ہی شک ہو گیا تھا کہ اس سارے معاملے میں احسن کا ہی ہاتھ ہوگا۔ دولت کی ہوس احسن کو لے ڈوبی۔ دوسرے رنگ صیاد شب میں شہر میں قتل و غارت گری کا طوفان کھڑا کرنے والا قاتل کتنے سکون کے ساتھ ہر جگہ قاسم کے ساتھ رہا۔ بہرحال سفاک قاتل توحید علی اپنے انجام کو پہنچا۔ آخر میں ایک چھوٹی سی تجویز اثر نعمانی کی وفات کے بعد چونکہ اب ان کے ترجمہ شدہ ناول کی جگہ خالی ہے تو پہلے کی طرح آخر میں تین رنگ ہونے چاہئیں۔ امید ہے کہ دیگر ساتھی بھی میری اس بات کی تائید کریں گے۔“

لاہور سے زویا اعجاز کی فیاضی ”اگست کا جاسوسی کسی خوشگوار حیرت کی طرح تین اگست کو ہی مل گیا۔ ٹائٹل کے بیک گراؤنڈ رنگ بہت بھائے۔ اداریے میں بیان شدہ تلخ سچائی کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ جیسی عوام ویسے حکمران۔ چینی نکتہ چینی میں اس بار نکتہ چینی کا تناسب غالب رہا۔ کئی پرانے ساتھی اس مرتبہ بھی غائب تھے۔ تفسیر عباس صاحب پروردگار آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ تحاریر میں اس مرتبہ مریم کے خان کی مٹھی میں ریت اسٹوری آف دی منتھ رہی۔ سیکنڈ پوزیشن ساحر جمیل سید کی صیاد شب نے حاصل کی۔ تجسس، سنسنی اور ایکشن سے بھرپور سرورق کا یہ رنگ صحیح معنوں میں جاسوسی کے شایانِ شان ثابت ہوا۔ والدین کے غیر متوازن رویے اولاد کو ذہنی و جذباتی مریض بنا کر ان کی زندگیاں جہنم بنا دیتے ہیں۔ نفس کا قیدی سلیم فاروقی کی سابقہ تحریروں کا سیکوئل لگی۔ پلاٹ کافی کمزور تھا۔ کرداروں پر بھی رائٹر کی گرفت مضبوط نہ تھی۔ گرداب مزید ہنگامے اور سازشیں آشکار کرتی نظر آئی۔ سنتھیا اپنی تمام تر شیطانیت کے ساتھ انجام بد کو پہنچی۔ خس کم جہاں پاک۔ شہریار کافی خوں ریزی کے بعد ڈاکٹر فرحان جمیل کا سراغ پانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ چودھری کے ساتھ ٹکراؤ کا بے چینی سے انتظار ہے۔ جواری میں فرید فی الحال ذہنی جمناسٹک میں ہی مشغول ہے۔ مترجم کہانیوں میں فرشتہ اجل بہترین تھی۔ امریکی قوم کی بے حسی اور سازشیں عنقریب ضرب المثل بن جائیں گی۔ کاشف زبیر کی میری دعا بھی بے حد پسند آئی۔ ہیروں کی خیرات جاسوسی یا سسپنس میں پہلے بھی شائع ہو چکی ہے۔ دیگر کہانیاں بھی خوب تھیں۔ مجموعی طور پر اگست کے شمارے کو سو میں سے سو نمبر ملیں گے۔“

تلہ گنگ سے عروج ناز کی عنایت ”سب سے پہلے تو معذرت کہ وہ بے نام دوشیزہ ہم ہی ہیں۔ اصل میں کسی بھی رسالے یا ماہنامے میں ہمارا پہلا خط تھا اس لیے خط لکھنے کے آداب اور طریقہ کار سے مکمل ناواقف تھے۔ ورنہ یوں تو ہم نے متعدد خطوط لکھے مگر وہ سب ہمارے نصاب میں شامل تھے۔ بہرحال ہم نے اپنی غلطی کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس دفعہ بھی جاسوسی کے درشن حسبِ معمول 7 تاریخ کو ہوئے۔ جشنِ آزادی سے سجا سرورق بہت عمدہ اور منفرد لگا۔ سرورق پر موجود صنفِ کرخت جو یقیناً ہمایوں سعید تھے، صنفِ نازک کے حسن کی تاب نہ لاتے ہوئے تکلیف میں تھے۔ اس کے بعد انٹری دی اپنی محفلِ یاراں میں جہاں کبیر عباسی کرسیٔ صدارت پر براجمان تھے۔ مبارک باد۔ اگر سرورق پر آپ اور کترینہ کیف موجود ہوتے تو ”پہلوئے حور میں لنگور“ والی کہاوت آپ پر فٹ بیٹھتی۔ شکیل کاظمی صاحب اپنی پڑوسن کے ”اگ الاپ“ نظر آئے۔ یقیناً یہ پڑوسن کو بھی اپنی عظمت کا قائل کرنا چاہتے ہیں۔ فہد علی جنجوعہ! سالگرہ مبارک۔ تفسیر عباس کو محفل میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ نام نہاد ہمایوں سعید کو ہزار کوششوں کے بعد آخر کار محفل کے قدموں میں جگہ مل ہی گئی۔ شاید اسی لیے انہوں نے ڈرون حملے کرنے سے پرہیز کیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ابتدائی جواری سے جو فی الحال تو سر کے اوپر سے گزر رہی ہے۔ اس کے بعد گرداب پڑھی۔ سلو اور شہریار ایکشن میں نظر آئے۔ ابتدائی صفحات پر بکھری مریم کے خان کی مٹھی میں ریت پسند آئی۔ سرورق کا دوسرا رنگ صیاد شب بھی پسندیدہ کہانیوں کی فہرست میں شامل۔ مختصر کہانیوں میں انگوٹھی اور موقع شناس پسند آئیں۔ باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے کیونکہ آج چاند رات ہے اور ہم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے جاسوسی کے لیے محبت نامہ ترتیب دے رہے ہیں۔ یہ ہماری جاسوسی سے محبت ہے۔ آخر میں سب اسٹاف اور قارئین کو میری طرف سے جشنِ آزادی اور عید مبارک۔“ (آپ کو بھی گزری اور آنے والی عید کی ڈھیروں مبارکباد بے نام دوشیزہ صاحبہ)

جھنگ سے ڈاکٹر عمران فاروق کی آمد ”جاسوسی 8 تاریخ کو جلوہ افروز ہوا۔ سرورق پر نظر پڑی، اتنی خوب صورت حسینہ کے ساتھ انتہائی کرب میں مبتلا بھائی صاحب اللہ خیر کرے۔ ساحل سمندر، چیلیں اور بوری بند لاش، ڈاکر انکل نے کیا خوب منظر کشی کی ہے۔ اشتہارات کی دنیا کو پیچھے چھوڑتے ہوئے پہنچے محفلِ یاراں میں۔ شہزادہ کوہسار کی گریڈنگ پسند آئی۔ کرسیٔ صدارت کی مبارک باد جناب۔ سید شکیل کاظمی کو دوسرے نمبر پر آنے اور بڑی آپا ماہا ایمان کو مشورہ دینے پر مبارک باد دیتا ہوں۔ مجھے بڑی امید ہے کہ بڑی آپا ایمان جی ضرور ماہِ ستمبر میں اپنے آپ کو آثارِ قدیمہ سے دریافت کروا لیں گی ہاہاہا۔ بھائی کاشف اور محی الدین اشفاق صاحب! اللہ پاک آپ دونوں کو عید کے پرمسرت موقع پر اپنے اپنے غم بھلانے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ اعجاز احمد راحیل صاحب! آپ اور آپ کے تمام دوستوں کو ہمارا والسلام جناب۔ بھائی تفسیر صاحب کا تبصرہ واقعی جان دار تھا۔ ماہ تاب عمیر رانا صاحب! میرا خیال ہے کہ آپ کے سرتاج عید کی چھٹیاں ہونے پر تحفۂ جاسوسی لے کر پہنچے ہوں گے اور واپسی پر آپ نے اپنا خط پوسٹ کرنے کے لیے ضرور دیا ہوگا۔ جاسوسی میں ساحل ایمان کو ویلکم۔ منشی رانا حماد فرہاد اللہ تعالیٰ کی ذات پاک آپ کی رہائی کے لیے بھی کوئی سبیل پیدا کر دے، آمین۔ اینڈ پر برادر ہمایوں سعید کا وعظ و نصیحت سے بھرا تبصرہ پڑھا، واہ بھائی صاحب۔ سب سے پہلے جواری پڑھی۔ اب دیکھنا ہے کہ مسٹر خاور اور نورین کی لڑائی کیا رنگ لاتی ہے۔ دوسرے نمبر پر گرداب پڑھی۔ اسماعی کہانی کو تمام کرداروں کے ساتھ لے کر صحیح ڈگر پر لے جا رہی ہیں۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ پہلا رنگ نفس کا قیدی بہت اچھا جبکہ دوسرا رنگ صیاد شب اپنا کوئی رنگ نہ چھوڑ سکا۔ مختصر کہانیوں میں ہیروں کی خیرات پڑھی۔ واقعی سکوں کے ساتھ ہیروں کی بھی

خیرات ہو گئی ہاہاہا۔ محترمہ مریم کے خان کی مٹھی میں ریت پڑھنی شروع کی ہے۔ شروع میں تو بوریت محسوس ہوئی، مجموعی طور پر اچھی کہانی تھی۔“

رانا منشی حماد فرہاد اینڈ قیصر گل قیدی سزائے موت سینٹرل جیل ساہیوال سے ”ان دیکھے ٹائٹل پر لفظ ضائع کرنا کچھ مناسب اس لیے نہیں لگ رہا ہے کہ آج اگست کی 5 تاریخ ہو گئی مگر ہمارے محبوب کے درشن نہیں ہو سکے۔ عید آنے میں ابھی تین دن باقی ہیں مگر عید سے پہلے کی عید جب آتی جب جاسوسی ہمارے ہاتھ میں آتا۔ مگر شاید خدا یہ نہیں چاہتا کہ ہم دو عیدیں اکٹھی گزاریں۔ شاید اس لیے کہ اتنی خوشی ہم سنبھال نہیں پائیں گے واللہ اعلم بالصواب۔ محفلِ یاراں کے ہر دوست کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے عید مبارک قبول ہو۔ اگر پچھلے ماہ میرا خط شائع ہو گیا ہوا تو میرے یہ الفاظ میں واپس لے لوں گا۔ کیونکہ یہ بات میں پچھلے خط میں عرض کر چکا ہوں۔ دوسری بار اس لیے لکھ رہا ہوں کہ جاسوسی کی انتظامیہ کی طرف سے مجھے کوئی بھی خوش فہمی نہیں ہے۔ مجھے صرف ایک فیصد امید ہے کہ میرا خط شائع ہوگا مگر بار بار خط لکھنے کا حوصلہ ایک ہزار ایک فیصد سے بھی زیادہ ہے۔ انکل جی! میں پہلے بھی بار بار لکھ چکا ہوں۔ اعجاز احمد راحیل صاحب سے مجھے بات کرنا ہے۔ اعجاز بھائی میرے نام، ولدیت اور قیدی سزائے موت کی شناخت سے میرے نام خط پوسٹ کریں۔ مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے اور ہاں، میری ولدیت مشتاق احمد فرہاد ہے۔ انکل جی! اب آپ نے میرا یہ دعا میرے دوست تک نہ پہنچایا تو میں آپ کی شکایت کر دوں گا۔“ (کس سے؟)

فتح پور لیہ سے سید محی الدین اشفاق کی کارگزاری ”اس مرتبہ ٹائٹل پر کبیر عباسی عرف شہزادہ کہسار کی تصویر لگا کر دل خوش کر دیا۔ عباسی صاحب! کترینہ کیف کو چھوڑیں، کوئی پاکستانی ایکٹریس کے بارے میں سوچیں۔ فہد علی صاحب! خدا آپ کو اور ہزاروں سالگرہ منانے کا موقع دے، پر یار کوئی سچ تو بولو۔ 46 کو 26 کیوں لکھ دیا ہاہاہا۔ زویا اعجاز! آپ کب سکسر لگا رہی ہیں؟ اعجاز احمد راحیل صاحب! اٹک کس چیز کی ہے؟ تفسیر صاحب! ماہتاب عمیر رانا، احسان سحر، طاہرہ گلزار اور محمد ہمایوں سعید کے تبصرے جان دار تھے۔ جواری ایک زبردست تحریر ہے۔ احمد اقبال صاحب کی ایک خوبی یا خامی ہے، وہ کہانی کو پہلی ہی قسط میں وہاں پہنچا دیتے ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ یہ کہانی کافی عرصے سے چل رہی ہے۔ گرداب نئی اور پرانی باتوں اور کرداروں کے درمیان گھومتی رہی۔ نفس کا قیدی میں وہی لالچ و ہوس نے خون کے رشتوں کو بے اعتبار کر دیا۔ ساحر جمیل سید کی صیاد شب اچھی لگی۔“

کوئٹہ سے ثمینہ حبیب کے استفسارات ”خوب صورت سرورق سے سجا ہوا اگست کا جاسوسی چار اگست کو ملا۔ اداریہ حسبِ معمول تھا یعنی پاکستان کے حالات کا نوحہ۔ بس دعائے خیر ہی کی جا سکتی ہے۔ سید شکیل کاظمی! آپ کا شکریہ آپ نے کہا کہ میں اچھا لکھتی ہوں۔ اعجاز احمد راحیل! آپ کے میرے تبصرے پر کیے کمنٹس پر نو کمنٹس۔ تفسیر عباس بابر! آپ خود تو لفظوں کے کھلاڑی ہیں ہی مگر آپ نے مجھ ناچیز کے تبصرے کو مفصل، مربوط، جاندار کہہ کر جی خوش کیا ہے۔ ذرہ نوازی ہے آپ کی جی۔ دکھ کی خبریں بھی ملیں آپ کی طرف سے لیکن جیسا کہ آپ نے خود کہا کہ وقت سے بڑا مرہم اور مسیحا کوئی نہیں، اللہ آپ کو ہمت دے، آمین۔ ماہتاب عمیر رانا آپ تو واقعی مشکل میں پڑ گئی ہیں۔ ساحل امان اور بے نام دوشیزہ کو خوش آمدید۔ محمد ہمایوں سعید! میرا تعلق ان لوگوں میں سے ہے جو اپنے اوپر ہنسنا جانتے ہیں، باقی آپ خود سمجھ دار ہیں۔ اس بار میں احتجاجاً کم کہانیاں پڑھ کے ابھی پر تبصرہ ارسال کر رہی ہوں کیونکہ میں تھوڑی دل گرفتہ ہوں تبصرہ جو نہیں چھپا۔ اب آپ کو میرا یہ تبصرہ شائع کر کے مجھے عیدی بھی دینی ہوگی اگر تبصرہ نہیں چھپا تو تو پھر... پھر کیا؟ خاموشی سے اگلے شمارے کا انتظار شروع کر دوں گی۔ اب یہ رشتہ بنا ہے تو نبھانا بھی تو ہے نا... سلیم فاروقی کی کہانی نفس کا قیدی، مصنف سے انتہائی معذرت کے ساتھ بور لگی۔ انداز دگر نے چونکا دیا۔ رائے نے تو بیوی سے چھٹکارے کا اچھا انتظام کر لیا، کہانی دلچسپ رہی۔ بے شناخت مجرم رنگ نہ جما سکی۔ موقع شناس میں ذوالفقار تو بلیک میلر مگر پوری کہانی میں اس نے سراغ رساں سے کم کردار ادا نہیں کیا۔ جب اس میں اتنی صلاحیتیں تھیں تو وہ بلیک میلر کیوں بن گیا؟ کوئی اچھی شرافت والی نوکری بھی کر سکتا تھا۔“ (ہاں... ہمیں بھی یہی پوچھنا تھا۔ دونوں مل کے پوچھیں گے تو دماغ ٹھکانے آ جائیں گے ذوالفقار کے...)

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی آمد ”جاسوسی اس بار 4 تاریخ ہی کو مل گیا اور برسات کا لطف دوبالا کر گیا۔ سرورق اچھا تھا مگر شاید الٹا چھپ گیا کہ ڈاکر صاحب کے دستخط الٹے تھے اور اندر سرورق کی کہانیوں کے ساتھ چھپی تصویروں کے برعکس بھی تھا۔ بہتر ہوتا کہ ڈاکر صاحب موسم کی مناسبت سے کچھ برسات کے رنگ بھی شامل کر دیتے۔ صدرِ محفل اس بار مری کے شہزادہ کوہسار قرار پائے جو بہت عرصے بعد محفل میں شامل ہوئے۔ اس بار بی بی ماہا ایمان بھی چٹکیاں لیتی نظر آئیں۔ شاید روزے رکھ کر نڈھال ہو گئی ہوں۔ (زئی صاحب! آپ زیادہ نہ چھیڑا کریں... کہیں تمہیں نہ لگ جائے آنٹیوں کو) کہانیوں میں جواری کی ابھی ابتدا ہے اور پولیس اور خاور و نورین کے درمیان آنکھ مچولی جاری ہے۔ اس بار بھی قسط کا اختتام پولیس کی آمد سے ہوا جو غالباً پروفیسر کی موت کی تفتیش ہی کرنے آئی ہوگی۔ نورین ابھی تک ایک معمہ بنی ہوئی ہے۔ دوسری قسط وار کہانی گرداب حسبِ معمول کچھوے کی چال کی طرح رینگ رہی ہے۔ امید ہے اسلم جلد ہی ماہ بانو کو تلاش کر لے گا۔ سرورق کی دونوں کہانیاں بس خانہ پری ہی تھیں۔ البتہ شمارے کی پہلی کہانی مٹھی میں ریت خاصے کی چیز تھی گوکہ مغربی کہانی سے ماخوذ یا ترجمہ تھی، اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ دیسی کہانیوں میں کاشف زبیر کی میری دعا بہترین تھی اور ترجمہ شدہ دیگر کہانیوں میں تحریر ریاض کی آستین کا سانپ اچھی رہی۔ کتر نوں کا انتخاب اس بار بہتر تھا۔ اگر چینی نکتہ چینی کے لیے ای میل سے بھیجا جائے تو کیا رومن میں تحریر کرنا ہوگا یا انگریزی میں بھی قابلِ قبول ہوگا، براہ کرم وضاحت فرمائیں۔“ (رومن میں ہی لکھ دیجیے گا... زحمت سے ہم بچ جائیں گے)

پنجاب سے ماہا ایمان کی آدھی ملاقات ”اگست 2013ء کا جاسوسی ہاتھ میں آیا تو ہماری باچھیں ایسے کھل گئیں جیسے عموماً صنفِ کرخت کی

باچھیں صنفِ نازک کو دیکھ کے کھل جاتی ہیں۔ یہ عام مشاہدے کی بات ہے۔ صنفِ مخالف کا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ (اچھا ہوا یہ وضاحت ابھی کردی ورنہ بعد میں بتانا پڑتا...) سرورق خوب صورت سی حسینہ کے ہمراہ آزادی کی نوید سنا رہا تھا۔ نیچے ساحلِ سمندر اور اڑتے پرندے مع ایک بوری بند لاش کے شاید کراچی کے حالات کی سنگینی پر روشنی ڈال رہے تھے۔ ایک بات تو بتائیں ذاکر انکل! ہمیشہ صنفِ کرخت کو عالمِ افراتفری اور مضحکہ خیز پوزیشن میں ہی کیوں دکھاتے ہیں؟ وجہ ان کی حقیقت پسندی ہے یا کچھ اور؟ (بتائیں بھئی!) ٹائٹل سے ڈائریکٹ دیارِ محفل کا رخ کرتے ہیں۔ اول نمبر پہ تو کبیر عباسی صاحب کو خوش نصیبوں کا بخار چڑھا ہوا تھا لیکن کیا کریں ہماری بدنصیبی کہ محترم کا لکھا تبصرہ اکثر دل کو بھاتا ہے۔ شکیل کاظمی صاحب! اس دوراندیشی کی میں بھی آج معترف ہو گئی کیونکہ میں خطروں کی کھلاڑی ہی نہیں ہوں۔ قیصر اقبال کچھ زیادہ تو نہیں کہوں گی لیکن پلیز ونیز ڈاکٹر عمران فاروق صاحب جناب کتنے ڈنگروں کو ٹیکے لگا لیتے ہیں روز؟ اعجاز احمد راحیل اہلِ دانش بھی اہلِ عقل کو پہچان نہ پائے تو ہم صرف افسوس ہی کر سکتے ہیں۔ نشی رانا حماد آپ زیادہ فکر نہ کریں، میں عادی ہو چکی ہوں۔ اچھے کمنٹس کوئی نئی بات نہیں ہے میرے لیے۔ محمد عزیر آپ کا تبصرہ پڑھ کے بے ساختہ ہنسی آئی۔ تفسیر انکل! آپ کا تبصرہ پڑھ کے میں قائل ہو گئی کہ بزرگ بڑھاپے میں اکثر بچوں جیسی باتیں کر جاتے ہیں۔ محترم انکل اشتاق قریشی صاحب! انشاء اللہ وہ وقت بھی زیادہ دور نہیں ہے اور آپ کی دعا ہی میرے لیے سب سے بڑا تحفہ ہوگی۔ اتنے پُرخلوص مشورے کا شکریہ۔ زویا اعجاز اور طاہرہ گلزار کی جوہر شناس نظروں کو ہمارا پیار بھرا سلام۔ انور یوسف زئی صاحب! لیجیے میں ایک بریک لے رہی ہوں۔ میری غیر موجودگی دوسروں کو موقع دے گی زیادہ سے زیادہ شامل ہونے کا۔ کہانیوں میں آغاز گرداب سے کیا۔ شہریار اینڈ کمپنی ایکشن میں نظر آئی۔ ماہ پانو کو اغوا کرنے والا طارق تھا۔ خبیث الفطرت شخص دوبارہ سے وہی داستان دہرائے گا یقیناً۔ منظر نگاری کے بادشاہ احمد اقبال کی تحریر جواری آہستہ آہستہ اپنی جگہ بنا رہی ہے۔ پہلی طویل تحریر مٹی میں ریت اپنے ہم وطنوں کو جینے کا ہنر عطا کرنے والے سراب در سراب بھٹکتے سوداگر کا سنسنی خیز کارنامہ واقعی سنسنی خیز ٹھہرا۔ زبردست تحریر جس نے ذرا بھی اِدھر اُدھر بھٹکنے نہیں دیا۔''

سید اکبر شاہ، اوگی مانسہرہ سے نوید دیتے ہیں'' انتظار کی گھڑیاں بالآخر 7 تاریخ کو اختتام پذیر ہوئیں۔ سرورق متاثر کن تھا۔ نکتہ چینیوں کی محفل میں پہنچے، پہلا نمبر اور شہزادہ کو سہارے ہوا۔ یہ صاحب بھی کترینہ کے پیچھے پڑے ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے یار۔ کاظمی صاحب کو روزوں میں بھی پھیکے رنگ دلکش محسوس ہو رہے تھے، عجب بات ہے۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی بہترین تھے۔ خاص کر تفسیر عباس اور ہمایوں سعید جو میرے فیورٹ ہیں۔ کہانیوں کی ابتدا جواری سے کی۔ دوسری قسط بھی شاندار تھی۔ ابھی تو شروعات ہیں، آگے آگے دیکھتے ہیں کہ ہوتا ہے کیا؟ گرداب اس بار اپنے جوبن پر تھی۔ سنتھیا کی موت پر کافی خوشی ہوئی۔ سلو اور شہریار بھی ایکشن میں نظر آئے۔ اسٹوری آہستہ آہستہ سمٹ رہی ہے۔ اب آتے ہیں رنگوں کی طرف... پہلے کے مقابلے میں دوسرا کافی بہتر تھا۔ مختصر کہانی میری دعا ایک اچھی کاوش تھی۔ باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ یہ بات ہم مدیرِ اعلیٰ پر ہی چھوڑتے ہیں کہ وہ میرا دوسرا تجربہ کامیاب ہونے دیں گے یا نہیں۔ اگر کامیاب ہوا تو تمام دوستوں کو 6 ستمبر کی مبارک باد اور خوش خبری...''

اٹک سے احمد وصال حیات کی پہلی کاوش'' آپ کی بزم میں یہ ہماری پہلی انٹری ہے۔ (خوش آمدید) میں کافی عرصے سے جاسوسی کا خاموش قاری ہوں لیکن طاہر جاوید مغل کی خوب صورت کاوش للکار نے خاموشی توڑنے پر مجبور کر دیا۔ اس کہانی کو ہر لحاظ سے ایک شاہکار کا نام دیا جا سکتا ہے۔ عمدہ پلاٹ، بہترین کردار نگاری اور دلوں کو چھو لینے والے مکالمے للکار کو ایک یادگار کہانی بناتے ہیں اور دوسری بات جو جاسوسی سے تعلق بنائے رکھنے پر مجبور کرتی ہے، وہ ہے اس کا معیار جو کہ آپ کی لگن اور محنت کا نتیجہ ہے۔ یوں تو جاسوسی کے تمام رائٹرز بہت اچھا لکھتے ہیں لیکن کاشف زبیر، مریم کے خان، طاہر جاوید مغل اور اسما قادری تو اپنی مثال آپ ہیں۔ اب کچھ بات ہو جائے بزمِ یاراں یعنی چیں نکتہ چینی کی تو کبیر عباسی، ہمایوں سعید، محسن علی سوم، ماہا ایمان، ثاقب تبسم کے تبصرے محفل کو گرما دیتے ہیں۔ صنفِ نازک اور صنفِ وجاہت کی آپس کی نوک جھوک چیں نکتہ چینی میں رنگ بھر دیتی ہے۔ ہمیں لکھنے کا اتنا تجربہ نہیں ہے اور نہ ہی الفاظ کے چناؤ کا۔ یہ کسی بھی میگزین میں ہمارا پہلا تعارف ہے جس میں کچھ غلطیاں بھی ہوں گی لیکن ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا جاسوسی سے تعلق قائم رہے اور ہم کوشش کریں گے کہ اگر ہمیں ویلکم کیا گیا تو اپنی بزمِ جاسوسی میں آتے رہیں گے۔'' (یقیناً آپ اگلی دفعہ اس سے زیادہ اچھا تبصرہ لکھیں گے۔ پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آ جاتے ہیں)

کراچی سے ادریس احمد خان کی تحریر'' جاسوسی اپنے وقت پر مل گیا۔ سرورق سے آگے بڑھے اور اپنی محفل میں پہنچے جہاں سرِفہرست کبیر عباسی کا نام نظر آیا، سو مبارک باد۔ آگے بڑھے اور جواری کی بساط میں جا پہنچے۔ پہلی اور دوسری قسط میں تسلسل نظر نہیں آیا مگر تحریر زبردست ہے اور ایڈونچر سے بھرپور ہے۔ نشی رانا فرہاد کے لیے دعا کہ جیل کی کال کوٹھری سے اللہ نجات دے۔ دوسرا مقبول سلسلہ گرداب بھی کامیابی سے جاری و ساری ہے اور شہریار اینڈ کمپنی جان ہتھیلی پر لیے دشمنوں کی سرزمین پر کارنامے انجام دے رہے ہیں۔ مٹی میں ریت بھی اچھا تاثر لیے ہوئے تھی جہاں یہودی مسلمانوں کے در پے ہیں۔ یہودیوں کا بس نہیں چلتا کہ وہ مسلمانوں کو مٹا ڈالیں مگر منہ کی کھاتے ہیں اور انشاء اللہ ہمیشہ مسلمانوں کے سامنے سرنگوں رہیں گے۔ بے شناخت مجرم بھی دلچسپ تھی۔ امداد گر، موقع شناس میں موقع سے فائدہ اٹھا کر دولت کا حصول ممکن ہو سکا۔ میری دعا نے بھی متاثر کیا۔ مجرم ذہن کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ طاقت کے بل بوتے پر ہر کام ان کی مرضی کے عین مطابق ہوگا تو وہ بھول جاتے ہیں کہ سب سے بڑے منصف کی عدالت بھی ہے اور قانون بھی اندھا نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ سچ کی خاطر انسان کو بہت تکلیفیں اٹھانا پڑتی ہیں مگر سچ کا ہمیشہ بول بالا رہتا ہے۔ نفس کا قیدی دولت کے لالچ نے احسن شیرازی کو اندھا کر دیا کہ وہ اپنے خون کو ہی راستے سے ہٹانے پر کمربستہ ہو گیا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ خون کے رشتوں کو بھی بھول گیا اور یہ بھی نہیں سوچا کہ جب خونی رشتے نہ رہیں گے تو دنیا کی ساری دولت بیکار ہے۔ سرورق کی ایک اچھی کہانی تھی۔ صیادِ شب میں ایک مجرم کا قصہ جس میں یہ بتایا

گیا کہ گھر والوں کا رویہ خصوصاً ماں باپ کا رویہ اولاد کے ساتھ ایسا ہونا چاہیے کہ بچے کو احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ بصورتِ دیگر بچے میں یہ کمزوری ہمیشہ رہتی ہے اور اس سے منسوب ہونے والے شخص کی زندگی بھی جہنم ہو جاتی ہے جیسا کہ احمد جہانگیر کے ساتھ ہوا۔ احساسِ کمتری نے اسے مجرم بنا دیا اور قاتل بن کر کتنوں خصوصاً لڑکیوں کی زندگیوں کا چراغ گل کر دیا۔''

اوکاڑہ سے تصویر الحسین کی عجلت'' ٹائٹل گرل تو پیاری تھی اور سمندر کا منظر بھی لیکن بند بوری نے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ سائڈ پر موجود یقیناً اس آدمی کے تاثرات سید شکیل کاظمی سے ملتے جلتے تھے۔ ان کی پڑوسن کے بارے میں بات کرو تو ان کے تاثرات بھی ایسے ہو جاتے ہیں۔ سب سے پہلے چیں نکتہ چینی کے دربار میں حاضری دی جہاں صدارت کی کرسی پر کبیر عباسی عرف شہزادہ موجود تھے۔ مبارکاں، آپ بھی کترینہ کیف کے دیوانے نکلے۔ اس سے زیادہ خوب صورت تو ہماری صنم بلوچ ہیں۔ ویسے ماہا ایمان کی عمر کے بارے میں آپ کو نہیں پتا ہوگا تو کسے پتا ہوگا۔ آپ بھی تو وہیں شناختی کارڈ بنوانے کے لیے موجود تھے۔ خبردار! سب دوست سن لیں، اب کوئی سید شکیل عباسی کی پڑوسن کو کچھ نہیں کہے گا۔ بھئی سمجھا کریں نا سید شکیل کو ہارٹ اٹیک ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ فہد علی جنجوعہ پتا نہیں کیوں آپ کا نام پڑھ کر میرے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ آپ ہر وقت حالتِ جنگ میں ہی رہتے ہوں گے۔ زویا اعجاز آپ کا نام محفل میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ قیصر اقبال کچھ ہر انسان کے خیالات مختلف ہوتے ہیں لہٰذا سرورق پر آئندہ خود ہی تبصرہ کیجیے، کسی دوسرے کی ذمے داری نہ لگائیں۔ اعجاز احمد راحیل، ہمایوں سعید ستاروں پر نہیں بلکہ براہِ راست چاند پر ہی کمندیں ڈالیں گے۔ تفسیر عباس بھائی آپ کا خط دیکھ کر دل کو خوشی بھی ہوئی لیکن ساتھ ساتھ آپ کے والدین اور بیٹے کی وفات کا پڑھ کر افسوس بھی ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین۔ ماہتاب، بہت بہت مبارک ہو کہ آپ ماہ تاب گل سے ماہتاب عمیر رانا بن گئی ہیں۔ آپ کی باتیں پڑھ کر میرے ذہن میں آیا کہ کاش کوئی ایسا طریقہ ہوتا کہ ہم ایک سال کے سارے جاسوسی ڈائجسٹ اکٹھے پڑھ لیتے مگر یہ ہو نہیں سکتا۔ ساحل امان آپ کا نام بہت خوب صورت ہے۔ جاسوسی کی محفل میں خوش آمدید۔ نشی رانا حماد آپ کا تبصرہ بہت اچھا تھا۔ محمد عزیر خوشی ہوئی یہ جان کر کہ آپ کو بھی آرٹ میں دلچسپی ہے۔ ہمایوں سعید مجھے آپ کی یہ لائن اچھی لگی کہ جس صنف کو آپ چڑیلیں کہہ رہے ہیں، وہی صنف آپ کی زندگی کے ہر حصے سے جڑی ہے۔ ویسے کیا زبردست ڈائیلاگ لکھا ہے آپ نے۔ احمد اقبال کی جواری اب تک تو اچھی جا رہی ہے لیکن ان کی ایک خوبی ہے کہ کہانی کے ہیرو کے ساتھ ہمیشہ دو یا تین ہیروئن ہی ہوتی ہیں۔ اب آگے آگے دیکھیے جواری میں کیا ہوتا ہے۔ جاسوسی کے آخری صفحات پر ساحر جمیل سید کی دوسری کہانی صیادِ شب پسند آئی۔ باقی ابھی کوئی کہانی نہیں پڑھی کہ آگے عید آ رہی ہے اور خط بھی ابھی پوسٹ کرنا ہے۔''

پشاور سے انجینئر عمیر شہزاد بنگش کے ارادے'' ماہِ اگست کے شروع ہوتے ہی بوندا باندی بھی اسٹارٹ ہوئی اور ان بوندا باندی میں 3 تاریخ کو ہم پر اللہ تعالیٰ کی ایک اور رحمت نازل ہوئی یعنی کہ جاسوسی اپنی آن بان اور شان سے بک اسٹال پر نمودار ہوا۔ نمودار ہونے کے بعد ہم نے اسے اپنے قبضے میں کرنا ضروری سمجھا۔ ٹائٹل پر ایک بدصورت شکل آدمی شدید تکلیف میں نظر آیا۔ دوسری طرف پاکستان کا قومی پرچم دیکھ کر دل کو ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ اس کے نیچے ذاکر انکل نے ٹی وی کمرشل کی طرح گرمی اور رمضان میں پانی کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا تاکہ روزہ داروں کے امتحان میں مزید اضافہ ہو۔ نوٹ: (رمضان المبارک کا لحاظ کرتے ہوئے ہم نے ٹائٹل گرل پر کوئی توجہ نہیں دی لہٰذا معذرت)۔ اشتہارات کے طویل سلسلے کو پھلانگتے ہوئے ہم اپنی محفل چیں کم نکتے زیادہ میں وارد ہوئے جہاں پر کبیر عباسی ایک ماہ کے لیے شہزادے سے صدر کی پوسٹ تک ترقی حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ بھائی مبارک باد۔ آپ کا تبصرہ ہمیں پسند آیا۔ لہٰذا ہم آپ کو اے پلس گریڈ سے نوازتے ہیں۔ سید شکیل کاظمی نے اس دفعہ اپنی پڑوسن کے بارے میں ایک اور نیا انکشاف کیا۔ ڈاکٹر عمران فاروق! ماہا ایمان کو بڑی آپا کہنا گویا ماہا جی پر بم نازل کرنے کے مترادف ہے۔ فہد علی جنجوعہ! آپ کالج کے دور میں کس کی یادوں میں گم ہوتے تھے جس کی وجہ سے لیکچر آپ کے سر سے گزر جاتا۔ محمد اشتاق قریشی صاحب! مجھے آپ کے حال پر بہت رحم آ رہا ہے کہ ماہا آپی نے آپ کو دعوت پر مدعو کیا۔ ہم بس آپ کے لیے دعا ہی کر سکتے ہیں۔ نامعلوم مقام سے ہماری بے نام بہن پہلی دفعہ خط لکھنے کی وجہ سے نروس تھی، بھی تو اپنا نام اور پتا بھی بھول گئیں۔ اعجاز احمد راحیل ہم آپ کی باریک بینی کے قائل ہوئے کہ آپ نے سعدیہ بخاری کی اتنی خفیہ بات معلوم کی۔ کہیں آپ کا تعلق وکی لیکس سے... ماہتاب عمیر رانا! بہن آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے اتنی مشکلات کے باوجود دوستوں کی محفل میں حاضری دی اور ہمیں اپنے حالات سے آگاہ کیا۔ نشی رانا حماد اگر آپ حسینہ کو اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھو گے تو یقیناً وہ بے ہوش تو ہوگی ہی۔ طاہرہ گلزار باجی! آپ کو ایک بار پھر سے محفل میں دیکھ کر دل مسرت سے بھر گیا۔ آخرکار آپ بلیک لسٹ سے نکل آئیں۔ محفل میں ماہا ایمان کو نہ پا کر اطمینان ہوا مگر اس کے برعکس ہمایوں سعید کو دیکھ کر شدید حیرت ہوئی کہ آپ رمضان میں یہاں کیسے...؟ باقی دوستوں میں عدنان یوسف اور محی الدین اشفاق کو مس کیا۔ مسلسل تین ماہ سے میرا تبصرہ شائع نہ ہوا جس کی وجہ سے رسالہ ملتے ہی خط لکھ رہا ہوں تاکہ ٹائم پر پہنچ جائے اور ایڈیٹر صاحب محکمۂ ڈاک کو قصوروار نہ ٹھہرائیں۔ اگر اس دفعہ بھی خط نہ پہنچ سکا تو اگلے ماہ خط دینے ہم خود بہ نفسِ نفیس کراچی تشریف لائیں گے، سوچ لیں ایڈیٹر صاحب...'' (پلیز اتنی خوفناک دھمکی مت دیں، ہم آپ کا خط شائع کر رہے ہیں)۔

شہزادہ کوہسار کبیر عباسی کی چہچہاہٹیں مری سے'' اتنے چکر تو ہم نے کبھی محبوب کی گلی کے نہیں لگائے جتنے جاسوسی کے لیے بک گیلری کے لگائے۔ آخرکار سات تاریخ کو جب چکر پہ چکر لگانے کے بعد ہمارا سر چکرا چکا تھا اور ہم چکراتے سر کے ساتھ آنکھیں پھاڑے بکس کے درمیان جاسوسی کو متلاشی نظروں سے تک رہے تھے تو شاپ کیپر نے کہا یہ رہا آپ کا جاسوسی۔ ہم نے کچھ شرمندگی اور کچھ مشکوری نظر سے شاپ کیپر کو دیکھا اور گھر آ گئے۔ واہ جی اس بار تو ٹائٹل پہ انقلاب آ گیا۔ خلافِ معمول و خلافِ توقع اس بار ٹائٹل پہ کڑی ایک تے بندے وی ایک۔ اب پتا نہیں یہ انقلاب ہمارے

مشورے کی بدولت آیا یا یہ اتفاق کا نتیجہ ہے۔ سمندر، پرندے اور بوری بنا کے ڈاکر انکل نے سرورق کے رائٹرز کو ایک اچھی سچویشن دی۔ ہمارا تبصرہ ہم سے زیادہ ہماری بیگم کو پسند آیا۔ سید شکیل! ہمارے ساتھ رہے تو اسی طرح آپ کو اپنی نامعلوم و ناموجود خوبیوں کا پتا چلتا رہے گا۔ قیصر اقبال! بری بات، اپنا کام دوسروں پہ نہیں چھوڑنا چاہیے اور معذرت کے ساتھ، آپ کا دانے والا کمنٹ بہت نامناسب سا تھا۔ پلیز اس طرح کے کمنٹس سے گریز کیا کیجیے، شکریہ۔ اشفاق قریشی اور زویا کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ اعجاز احمد! مجھے آپ ماما کو اسے اس کے حال پہ چھوڑنے کا مشورہ دے رہے ہیں اور خود پنجے جھاڑ کے اور ہاتھ منہ کالے صابن سے دھو کے ان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ کیا یہ کھلا تضاد نہیں ہے؟ تفسیر عباس! تبصرہ تو ہم نے بیوٹی پارلر میں بیٹھ کے نہیں لکھا تھا البتہ یہ بات ہے کہ شادی کے بعد ہمارا ابھی تمام اچھے شوہروں کی طرح وائف جی کی خاطر کافی وقت بیوٹی پارلر میں گزرتا ہے۔ ماہتاب عمیر! آپ نے ریڈیو پہ پروگرام کرنا چھوڑ دیا ہے کیا؟ مہر اختر عباس! عشق کا وائرس ہم پہ بھی کافی دفعہ حملہ آور ہوا مگر ہم اس کی تباہ کاری سے واقف تھے چنانچہ ای کی جوتی کی اینٹی بایوٹک کھا کے بچ گئے۔ طاہرہ گلزار زیادہ بغلیں بجانے کی ضرورت نہیں، یہ وقت آپ پر بھی آسکتا ہے۔ منشی حماد! آپ کیا پڑوسن کا کہا ماننے کے نتیجے میں جیل کی ہوا کھا رہے ہیں جو باقیوں کو خبردار کر رہے ہیں۔ گرداب میں سنسنی عروج پر رہی۔ اینڈ جہاں ماہ بانو کو انگشت بدنداں کر گیا، وہاں ہمیں بھی حیراں پریشاں کر گیا۔ جواری میں فرید کا بار بار تخیل کے گھوڑے دوڑانا اور وہ بھی گھوڑے کا بار بار ایک جیسے خیالات پکڑ کے لانا بہت بور کرتا ہے۔ خلاصے میں کچھ باتیں موجودہ قسط کی بھی شامل کر دی گئیں جس کی وجہ سے پچھلی قسط کو بھی سرسری دیکھنا پڑا مگر ان باتوں کا عقدہ موجودہ قسط پڑھ کے ہی کھلا۔ عالمی سامراج کے مکروہ چہرے کو بے نقاب کرتی مریم کے خان کی چشم کشا تحریر، مٹھی میں ریت دل کی گہرائی تک اترنے میں کامیاب رہی۔ طویل تحریروں میں اس تحریر کو ہم نے پہلے نمبر پر رکھا۔ ساحر جمیل کی صیادِ شب خوب صورت نام، شاندار منظر نگاری اور سسپنس سے بھرپور انداز تحریر کی بدولت ہماری پسندیدگی کے معیار پر اترنے میں کامیاب رہی۔ توحید پر شروع میں ہی شک ہو گیا تھا جو درست نکلنے پہ وائف جی نے ہمیں شاباشی دی۔ یہ تحریر طویل تحریروں میں دوسرے نمبر پر رہی۔ سلیم فاروقی پرانے پلاٹ اور مخصوص انداز کے ساتھ تشریف لائے۔ یہ جس کردار کو سب سے زیادہ صاف ستھرا دکھاتے ہیں، اینڈ میں سارا ملبا اسی پہ ڈال دیتے ہیں۔ چنانچہ احسن نے جب ستر کروڑ روپے کے نقصان پہ لات ماری، اسی وقت اس پر شک ہو گیا جو اینڈ پہ درست نکلنے پر ایک دفعہ پھر وائف جی سے شاباشی لی۔ یہ تحریر طویل تحریروں میں تیسرے نمبر پر رہی۔ مختصر تحریروں میں کچھ اچھا بھی ہے، کی امید ولاتی کاشف زبیر کی میری دعا پہلے نمبر پر رہی۔ آصف ملک کی موقع شناس کو دوسرا جبکہ سیر بنارافض کی فرشتۂ اجل کو ہم نے تیسرا نمبر دیا۔ تنویر ریاض کی آستین کے سانپ اور جمال دستی کی بے شناخت مجرم ہمارے نزدیک بالترتیب چوتھے اور پانچویں نمبر کی حق دار ٹھہریں۔ اسی طرح سیکنڈ لاسٹ ہم نے امجد رئیس کی ہیروں کی خیرات کو جبکہ لاسٹ بشریٰ امجد کی اندازِ دگر کو قرار دیا۔" (اب تفصیلی خط شائع ہونے پر بھی بیگم جی سے شاباش لیجیے گا)

محمد اقبال، کراچی سے "جاسوسی ڈائجسٹ کے ملنے کی تاریخ نہیں بتاؤں گا بس اتنا کافی ہے کہ ہم ان خوش نصیبوں میں سے ایک ہیں جنہیں جاسوسی ڈائجسٹ فوراً ہی مل جاتا ہے۔ حیران نہ ہوں کہ ہمیں اتنی جلدی کیوں مل جاتا ہے، یہ سیکرٹ ہے۔ کبیر عباسی کو کرسیٔ صدارت پر دیکھ کر ہمیں کوئی حیرانی نہیں ہوئی، خط مناسب تھا مبارکاں۔ پرانے ساتھیوں سے گزارش ہے کہ چٹکی نکتہ چینی کے لیے وقت نکالیں۔ یہ میں رسمی طور پر نہیں لکھ رہا، نئے ساتھیوں کی موجودگی کے ساتھ پرانے ساتھیوں کا ہونا محفل کو پُررونق بنا دیتا ہے۔ نئے ساتھیوں کی ایک دوسرے پر نکتہ چینی مزہ دیتی ہے اور کہانیوں پر تبصرے مناسب ہوتے ہیں۔ سب کی اپنی اپنی رائے ہوتی ہے۔ ہم نے ٹائٹل پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد سب سے پہلے احمد اقبال کی جواری کا انتخاب کیا۔ پہلی قسط کے بعد دوسری قسط اور اب تیسری کا انتظار ہے کہ شاید اس میں کچھ تیز ہو جائے۔ جواری نے للکار کی کمی کسی حد تک پوری کی ہے مگر تشنگی باقی ہے۔ گرداب میں بھی شہریار ایکشن میں ہے لیکن للکار میں عمران اور اس کی ٹیم نے انڈیا میں جو ایکشن دکھائے ہیں، اس کے سامنے شہریار کی ٹیم کا ایکشن پھیکا نظر آتا ہے۔ مگر شکر ہے اب ماہ بانو کا ذکر خیر بھی آرہا ہے۔ امید ہے آگے جا کر کہانی کچھ اور تیز ہوگی۔ مشابرم خان شاید ماہ بانو کی مدد کے لیے پہنچ جائے۔ سلیم فاروقی سرورق کے پہلے رنگ قفس کا قیدی میں چھائے رہے، اچھی کہانی تھی۔ ساحر جمیل سید دوسرے سرورق صیادِ شب میں جاسوسی کے معیار کے مطابق کہانی میں سارے لوازمات لیے موجود تھے جو مزہ دے گئے۔ اندازِ دگر، موقع شناس اچھی رہیں۔ مریم کے خان کی مٹھی میں ریت خوب صورت تحریر تھی۔ کاشف زبیر کی میری دعا پسند آئی۔ سیر بنارافض کی فرشتۂ اجل، تنویر ریاض کی آستین کا سانپ، جمال دستی کی بے شناخت مجرم بھی مناسب تھیں۔ نکتہ چینی کے ساتھیوں کے خطوط پر تبصرہ کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتا ہوں کیونکہ عید کی تیاریاں بھی کرنی اور کروانی ہیں، سمجھے آپ لوگ... آخر میں گزارش ہے کہ اثر نعمانی (مرحوم) کی تحریروں کو بھی کبھی کبھار جاسوسی کی زینت بنا دیا کریں تاکہ ہم انہیں اس بہانے یاد کر لیا کریں۔"

فیض پور سے وشیقہ زمرہ کا مکتوب "جاسوسی چار اگست کو ملا۔ ٹائٹل بس ٹھیک تھا، زیادہ غور نہیں کیا۔ سب سے پہلے میری طرف سے سب دوستوں کو عید مبارک۔ چینی، نکتہ چینی صدارت کی کرسی پر کبیر عباسی صاحب تشریف فرما تھے، بہت بہت مبارک ہو۔ صرف ایک ماہ کے لیے، وزیر اعظم کی کرسی پر شکیل کاظمی کو پایا۔ چلو اچھا ہوا بے چارے اتنی دور سے آئے کچھ تو حق بنتا ہے۔ ڈاکٹر عمران فاروق! یہ تو آپ کی خوش فہمی ہے، کیا پتا قسموں سے چور حسینہ بنوں والے بھائی کو دیکھ رہی ہو جو آپ کو بھاگتے نظر آرہے تھے۔ جگر سے ثمر خان، آپ نے محفل پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ باقی دوستوں کے خط بھی اچھے تھے۔ کہانیوں میں گرداب کی یہ قسط زبردست تھی۔ عین سسپنس پر ختم ہوئی، اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ جواری کی دوسری قسط اچھی لگی۔ سرورق کا پہلا رنگ اچھا لگا لیکن دوسرا رنگ ٹاپ پر رہا۔ توحید کی موت کا بہت دکھ ہوا لیکن پھر اتنے قتل کرنے کے بعد بھی ہم نفرت نہیں کر پائے۔ باقی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں۔"

رحیم یار خان سے اے کیو حسین کی تفصیلات "اگست کا شمارہ میرے ہاتھ میں ہے۔ اس دفعہ تو ڈاکر انکل نے منہ اور آنکھ دونوں کا ذائقہ خراب

کر دیا، کبیر عباسی کے ساتھ خوب صورت حسینہ کو سرورق کی زینت بنا کر۔ کبیر عباسی کو صدارت دی، مبارک تے ساڈا خیال رکھن دا شکریہ۔ ڈاکٹر صاحب! لگتا ہے آپ معدے کے ڈاکٹر ہیں جو اتنی جلدی ماما ایمان جی کے مرض کی تشخیص کر دی۔ شکیل صاحب! ذرا پڑوستوں پر کم نظر رکھ کر اپنے گھر پر نظر رکھیں۔ نامعلوم صاحب! آپ آئندہ خیال رکھیے گا۔ فہد! میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ راحیل نادان! آخر کس بات کی ٹنک ہے آپ کو؟ تفسیر صاحب! ذرا حوصلہ پیدا کر کے دیکھیں، ہم نے بھی تو اپنا غم پیا ہی ہے۔ اب کچھ بات ہو جائے تصانیف کی تو تمام ہی خوب تھیں، خاص طور پر حساب چھوٹی کہانیوں میں بہتر لگی اور زبردست یعنی فرسٹ پرائز کی حق دار کاشف زبیر کی میری دعا رہی۔ دونوں رنگ خاص کر صیادِ شب بہت زیادہ بہترین تحریر ثابت ہوئی۔ گرداب نے شکر ہے کچھ رفتار پکڑی اور ماہ بانو بھی کچھ نظر آئیں لیکن ابھی کافی تھرل باقی ہے۔ باقی تمام ساتھیوں نے خوب کارکردگی دکھائی۔ میرا مطلب ہے جاوید اور شہریار عادل وغیرہ نے۔ اب تو چودھری کا بھی آخری وقت قریب ہے۔ میں اور میرے والد ہم دونوں ہی بہت شوق سے جاسوسی پڑھتے ہیں اور باقی گھر والوں کی تنقید بھی برداشت خوب خوب کرتے ہیں خاص کر والدہ کی اور وہ صحیح بھی ہیں کیونکہ ہم ان کچھ دنوں میں انہیں بالکل ٹائم نہیں دے پاتے کیونکہ جاسوسی نے جو اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہوتا ہے۔"

طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے "محترم احمد اقبال جواری کو بڑے تیز رفتاری سے آگے لے جا رہے ہیں۔ خاور اور نورین کی مشکلات میں اضافہ۔ پہلی کہانی مٹھی میں ریت مریم کے خان کی بہت زیادہ اچھی تحریر تھی۔ اس تحریر میں مریم کے خان نے امریکیوں کی مکاری اور چالاکی زبردست طریقے سے آشکار کی اور ایک سبق دیا کہ سچی محبت اب بھی موجود ہے۔ بڑا عرصہ ہو گیا شامی اور تیمور کا کوئی نیا کیس سامنے نہیں آیا۔ سرسری دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس دفعہ کا جاسوسی بہت زبردست ہے۔ اب دوستوں کے ساتھ تھوڑی چٹ پٹی باتیں کرتے ہیں۔ محمد جاوید بلوچ کو اعتکاف میں بیٹھنے کی سعادت پر مبارک ہو۔ ہائے کبیر عباسی پھر کرسیٔ صدارت پر۔ انکل دال میں کچھ کالا کالا (تورتور) ہے۔ شکیل صاحب کی خوش فہمی تو دیکھیں۔ شکیل صاحب! پڑوسن کے لیے اتنا جذباتی اعلان بھی کر لیا کہ خبردار پڑوسن کے جملہ حقوق اور تمام تر اختیارات میرے پاس محفوظ ہیں، خیریت جناب۔ ہائے صنفِ نازک سے جلے ہوئے جھنگ سے ڈاکٹر عمران فاروق بھی نظر آئے۔ زیادہ نہ جلیں بالکل بیگن کے بھائی لگو گے۔ فہد علی جنجوعہ! آپ کو اور شکیل کاظمی کو سالگرہ مبارک ہو۔ ویسے یہ چھبیسویں سالگرہ کتنے سال تک چلے گی؟ کچھ جی! ایسی بھی کیا بے دلی کہ سرورق کا اظہار کبیر عباسی کے ذمے لگاتے ہیں۔ اقبال جی! لگتا ہے بھابی نے بریک لگا دی۔ راحیل صاحب کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔ تفسیر بھائی شکر کرو آپ نے جاسوسی کو ہی رسی پر الٹا لٹک کے دیکھا۔ ہماری پولیس تو بے گناہ لوگوں کو الٹا لٹکا دیتی ہے۔ تفسیر بھائی! آپ کے ایک بار بلیک لسٹ ہونے پر یہ حال ہیں تو پھر میرے حال کا کیا پوچھنا جو مسلسل چھ مہینے سے بلیک لسٹ ہو رہی ہوں اور تینوں رسالوں میں۔ احسان سحر کا تبصرہ بھی اچھا لگا۔ ہمایوں سعید کی یہ بات بہت اچھی لگی کہ صنفِ نازک زندگی کے ہر حصے میں جڑی ہے، چاہے وہ ماں ہو، بہن، بیوی یا بیٹی ہو۔ ادریس احمد خان اور محمد قدرت اللہ نیازی کو بلیک لسٹ میں دیکھ کے بہت دکھ ہوا۔ ارے اچھے تبصرہ نگار پیچھے ہو گئے ہیں کہ اب انکل ہمیں بلیک لسٹ کر دیتے ہیں، پلیز انکل ہمیں اتنے اچھے تبصروں سے محروم نہ کریں۔"

آفتاب احمد تفسیر اشرفی، لاہور سے پھلوں کی سوغات لائے ہیں "جاسوسی کے لیے رکھے گئے گارڈ کو نظر انداز کر کے ہم پھلوں سے سجی ہوئی اس دکان میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے ہیرو آم نے ہمیں متوجہ کیا جو شہریار کی طرح دشمنوں کے گرداب میں پھنسا نظر آیا اور التجا کی کہ پہلے میری بپتا سن لیں۔ مٹھی میں ریت رکھ کر عمارہ نے اپنے باپ کی چپ چھپائی جو اسے امریکیوں کو دینی ہی پڑی۔ پہلی مرتبہ کسی جگہ امجد رئیس کی یہ ضرورت ہمیں میٹھے خربوزے کی طرح بہت بھائی تھی لیکن اس مرتبہ پھیکے خربوزے کی طرح ان کی تحریر بے ذائقہ لگی۔ وجہ تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ ہم جمال دستی کو آگاہ کر رہے ہیں کہ ہمارا جرم شناخت بے مجرم اس لیے نہیں ہے کہ ہم اس بات کی شناخت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ناریل پھل ہے یا میوہ اور جو بھی ہے، ہے کون سے موسم کا۔ موقع شناس میں جان نے کسی کی جان بچا کر دس ملین ڈالر کمائے اور ہم اپنی جان بنانے کے لیے دس کلو انار خرید لائے۔ انگوٹھی اگر غائب ہو گئی تھی تو وانسن اسے مارنے کے بجائے جاسن کھلا دیتا تو انگوٹھی کسی نہ کسی جگہ مل جاتی۔ آستین کے سانپ کو ہم نے شہتوت کی طرح نظر انداز کر دیا کیونکہ ہم شہتوت خوف کے مارے استعمال نہیں کرتے۔ التجا اور خوشامد کتنی اثر انگیز ہوتی ہے اس کا اندازہ ہمیں کبیر عباسی کو مسندِ صدارت پر دیکھ کر ہوا۔ قیصر اقبال کچھ! پھلوں کی اس دکان میں اناناس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کبھی مٹھاس کبھی کھٹاس کبھی ترشی کبھی تلخی کے ساتھ سب کے لیے قابلِ قبول۔ محمد اشفاق قریشی! آپ اسٹرابری کی طرح دوسروں کو حوصلوں کی توانائی سے بادِ مخالف سے ٹکرانے کا عزم دلاتے ہیں۔ ماما ایمان! تم خوش قسمت ہو۔ اعجاز احمد راحیل! آپ ہر موسم میں ہر جگہ اور بے موسم میں خاص خاص جگہ ایک اعلیٰ درجے کے کینو کی طرح سب کے لیے فرحت بخش ہو۔ تفسیر عباس! آپ شریفے کی طرح شریف طبیعت ہیں۔ مہتاب عمیر رانا! آپ کے مسائل کا حل صرف چیری کے استعمال میں ہے۔ وہ بھی آپ کے تبصرے کی طرح اثر انگیز ہے۔ منشی رانا حماد فرہاد، محمد عزیر، ثمر خان، فوجی علی ڈنو، بے نام دوشیزہ، ساحل امان، عبدالوہاب، انور یوسف زئی، اے کیو حسین، طاہرہ گلزار اور محمد ہمایوں سعید آپ سب میں بھی کوئی اپنے اندر مالٹے کی مٹھاس کوئی سوسی کی تاثیر، کوئی سنگترے کی طرح طرح دار، کوئی پپیتے کی طرح ہاضم، کوئی سردا، کوئی گرما، کوئی ہڑ، کوئی انجیر کی طرح ہے جو اپنے اپنے پسندیدہ پرچوں کے لیے قوت بخش ٹانک کا درجہ رکھتے ہیں۔ کترنوں کے لیے ابھی ہم مزید پھل تلاش کرنے کے موڈ میں تھے کہ خوشگوار نظر آنے والی کاؤنٹر گرل کا موڈ خراب ہو گیا کیونکہ اس نے دکان بند کرنا تھی۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

افضل کریم، کراچی۔ ہما انصار، پشاور۔ جاوید محمود، حیدر آباد۔ فیصل قریشی، کوئٹہ۔ سونیا عزیز، کوٹری۔ حرا صابری، کراچی۔ جواد احمد، ٹنڈو آدم۔ ثنا جبار، لاہور۔ عائشہ اقبال، فیصل آباد۔ علی ڈوگر، ساہیوال۔

گردوپیش کے تانوں بانوں میں الجھتی سلجھتی ایک بازی کا فسوں خیز فسانہ

جہاں گیری کی خواہش اور طاقت کا حصول انسان کی فطری کمزوری ہے... وقت کی بساط پر سجے پیادے ایک دوسرے کو پچھاڑ کر ڈوریں ہلانے والوں کی متعین کردہ اُس منزل تک پہنچنے کی جستجو میں سرگرداں رہتے ہیں جس کا حصول ان کی ذات کے لیے بے مقصد بھی ثابت ہوتا ہے

... پیادہ تو پیادہ ہی ہوتا ہے... دوسرے طاقت ور مہرے آخری خانوں کے قریب تک ہی کیوں نہ پہنچ جائیں... اپنی مرضی سے نہ گھر بدل سکتے ہیں... نہ بے سمت چال چل سکتے ہیں اسی طرح تقدیر نوشتہ ہوتی ہے... وہ بھی بساطِ زیست پر بازی بچھانے والوں کی چال کا ایک معمولی پیادہ تھا... چال ساز اسے آگے بڑھاتے رہے اور بڑے مہرے اپنا کھیل، کھیلتے رہے... شاہ محفوظ گھر میں تھا۔ پیادے دوڑ رہے تھے، وزیر حکم چلا رہے تھے... بازی جاری تھی مگر پھر صفِ دوستان سے ایک اور مہرہ نکلا۔اس کی چال مختلف تھی۔اس نے بازی کا رخ پلٹا دیا مگر بازی پھر بھی جاری رہی۔
یہ بازی عشق کی بازی نہ تھی... ڈر خوف اور داؤ پیچ سے بے نیاز انتقام، نفرت اور محبت کی یہ بازی ہر اصول کو ٹھکراتی انجام تک جاری رہی... ہر چال پہ ان گنت وسوسے، کشمکش اور گمان آخر تک اس کا خوف اور تعاقب کرتے رہے...

خاک وخون سے سجائی ہوئی ہولناک بساط پر پٹتے اور پیٹتے ہوئے پیادوں کی اعصاب شکن داستان

''آج تو پھر دیر سے آیا ہے؟'' فرزانہ نے بیٹے کو گھورتے ہوئے اسے ڈانٹا۔

''ہاں ماں، آج سے میں نے سوچ لیا ہے کہ آزاد گھوموں گا۔ جب جی چاہے گا، جہاں جی چاہے گا آؤں، جاؤں گا۔ گھر کے اندر گھر کے باہر مجھے کوئی روک نہیں سکتا... کوئی بھی نہیں۔ آپ بھی نہیں، بابا بھی نہیں۔'' وہ بڑے جوش اور ترنگ میں فلمی ہیرو کی طرح ڈائیلاگ بول رہا تھا۔

''بابا گھر پر نہیں ہیں۔'' فرزانہ نے کچھ حیران نظروں سے دیکھتے ہوئے اطلاع دی۔

''اسی لیے تو بول رہا ہوں۔ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ان کے قافلے کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔'' ہنسنے کی آواز پر اس نے پلٹ کر کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا۔

''تم دونوں کیا کھی کھی کرکے ہنس رہی ہو۔ ایک دن بابا کے سامنے بھی اسی طرح بول کر دکھاؤں گا۔'' سعد نے مزاحیہ انداز میں منہ پھلا کر ہوا میں ہاتھ لہراتے ہوئے کہا تو اس کی دونوں بہنیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

''رہنے دیں بھائی، بابا کے سامنے تو بتی گل ہوجاتی ہے آپ کی۔'' تاباں نے ہنستے ہنستے کہا۔

''ہاں... فیوز ہی اڑ جاتا ہے۔'' خوباں نے بھی بہن کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''احترام... میری پیاری بہنوں، احترام۔ ورنہ ڈرتا ورتا میں کسی سے نہیں ہوں۔'' اس نے بے پروائی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا تو وہ دونوں اور زور سے ہنس پڑیں۔

''ہنس لو، ہنس لو کبھی نہ کبھی تو ایسا ہوگا، تم دیکھ لینا پھر میں ہنسوں گا اور تم...'' وہ بڑے اچھے موڈ میں سیٹی بجاتا ہوا ڈائننگ ٹیبل پر جاکر بیٹھ گیا اور سامنے کھڑی ماں کو مخاطب کیا۔

''ماں... تیرے ہاتھوں میں جو جادو ہے وہ بنا دیتا ہے ہر ایک کو تیرے کھانوں کا دیوانہ۔ کچھ مل جائے جو اس ناچیز کو بھی جو بچایا ہو کچھ۔ تیرے میاں نے کھانا... او ماں...!'' اس نے زور زور سے ٹیبل بجاتے ہوئے آخر میں ایک زوردار ہاتھ مار کر بوم کردیا۔

''کمینہ، ڈرامے باز۔'' فرزانہ بیٹے کو گھورتے ہوئے اٹھیں اور کچن کی طرف چلی گئیں۔

''بھائی، بابا نے اگر کسی دن تمہاری یہ باتیں سن لیں تو تمہارے گانے اور یہ ڈرامے بازی مروائے گی تمہیں بابا کے ہاتھوں۔ پتا تو ہے تمہیں کتنے سخت ہیں وہ۔'' چھوٹی بہن کو فکر ہوگئی تھی اپنے جان سے پیارے بھائی کی۔

''ارے جانے دے، جانے دے۔ پروا کون کرتا ہے۔ کیا کریں گے بابا؟ ڈانٹیں گے دل بھر کر، دو چار تھپڑ لگالیں گے۔ جان سے تو نہیں مار سکتے نا باپ ہیں میرے۔ آفٹر آل اکلوتا بیٹا ہوں میں ان کا۔ ولی عہد، جانشین اور

...اور وہ کیا کہتے ہیں...‘‘ وہ تیزی سے بولتے بولتے کچھ گڑبڑایا۔

’’ہاں... آخر کو صمد رحمن کی اتنی... بڑی سلطنت کے اکلوتے وارث ہیں آپ جناب۔ کس کی مجال جو آپ سے پنگا لے کوئی۔ بابا تو ایسے ہی بس۔‘‘ خوباں نے اتنی ی ی ی کہتے ہوئے دونوں بازو آخری حدوں تک پھیلائے۔

’’وہ کچھ نہیں، ایسے ہی بھرم رکھتے ہیں اپنے باپ ہونے کا۔ رعب و دبدبہ۔‘‘ اس نے بے پروائی سے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

’’اور تو کیوں اس طرح بڑھ بڑھ کر بول رہا ہے باپ کے بارے میں۔ شرم نہیں آتی، اولاد باپ کا احترام کرتی ہے اور تو انہیں مذاق کا نشانہ بنا رہا ہے۔ پٹتا ہے کیا کچ کچ۔‘‘ فرزانہ نے خانساماں کو کھانے کی ٹرالی ٹیبل کے پاس چھوڑنے کا اشارہ کیا اور اس کا کان پکڑ کر کھینچا۔

’’آآآ... امی میرا کان اکھڑ جائے گا۔ او کے او کے نہیں کہتا کچھ آپ کے ہائی پروفائل میاں کو۔‘‘ اس نے چیختے ہوئے کہا۔

’’تو ہر وقت، باپ کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ انہوں نے کیا بگاڑا کیا ہے تیرے ساتھ؟‘‘ فرزانہ نے پوچھا۔

’’اب دیکھیں، ڈکٹیٹرشپ اور دھاندلی... مجھے کہتے ہیں تمہیں صرف لا پڑھنا ہے جبکہ مجھے انجینئرنگ پسند ہے۔ کمپیوٹر انجینئر بننا میرا سب سے بڑا شوق ہے لیکن نہیں انہوں نے آرڈر جاری کر دیا ہے اس لیے یس سر کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔‘‘ وہ کھانا کھاتے کھاتے بولتا جا رہا تھا۔

’’بھئی تو کمپیوٹر کا شوق تو تم ویسے ہی پورا کر سکتے ہو۔ ڈگری لا میں لے لو۔‘‘ فرزانہ نے بیٹے کو راہ دکھائی۔

’’ایک تو آپ ان کی مکمل وزارتِ داخلہ ہیں جو انہوں نے ارشاد فرمایا آپ فوری عمل درآمد کروانے کے لیے کوشاں ہو جاتی ہیں۔ ارے منسٹر صاحب! کبھی اس اپوزیشن بیچاری کی بھی سن لیا کریں۔ ہم غریب کہاں جائیں فریاد لے کر۔ جج صاحب... جج صاحب... جج...‘‘ وہ سامنے دیکھتے ہوئے کسی فرضی جج کے سامنے دہائیاں دے رہا تھا کہ الفاظ منہ ہی میں رہ گئے کیونکہ اچانک ہی بابا کے سیکریٹری فیضان حسن نے لاؤنج میں انٹری دی تھی۔

’’وہ بیگم صاحبہ آج ترکی کے قومی دن کے موقع پر ان کے قونصلیٹ آفس میں ڈنر پارٹی ہے۔ سر کے ساتھ آپ کو بھی جانا ہے ٹھیک نو بجے تیار رہیے گا۔‘‘ اس کی حرکات و سکنات دیکھ کر سعد زور سے ہنسا۔

’’یہ بھی بڑے کمال کی چیز پالی ہوئی ہے بابا نے۔ لگتا ہے بندہ نہیں کوئی روبوٹ ہے اور چہرے پر ہمیشہ ایسے تاثرات ہوتے ہیں جیسے لبنان ابھی ابھی اسرائیل کی بمباری سے فارغ ہوا ہو۔‘‘

’’اپنے بابا سے پوچھو اس کی اہمیت۔ جیسا بھی ہے لیکن ان کے لیے بہت اہم ہے کیونکہ اس کے بغیر ان کا کوئی کام چلتا نہیں ہے۔‘‘ فرزانہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

’’بابا کے چراغ کا جن۔‘‘ سعد کی بات سن کر فرزانہ مسکرائیں اور ہولے سے اس کے سر پر چپت مار کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

☆☆☆

صمد رحمن سیاست دانوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو سیاسی داؤ پیچ اور جوڑ توڑ کے ماہر تھے۔ حکومت چاہے کسی پارٹی کی ہو صمد رحمن اس کا حصہ ہوتے تھے۔ کھٹا کھٹ پٹریاں بدلنا اور اچھی وزارتوں پر قائم رہنا ان کا دل پسند مشغلہ تھا۔ وفاقی کیبنٹ کا کوئی نہ کوئی قلمدان ان کے پاس ہمیشہ رہتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو حکومت کی ضرورت بنا دیتے تھے۔ کیوں اور کیسے یہ نہیں معلوم لیکن ہوتا یہی تھا کہ حکومت کو انہیں اپنے ساتھ شامل کرنا ہی پڑتا تھا۔ بقول شخصے وہ ٹماٹر کی طرح تھے جو تقریباً ہر سالن کی ضرورت ہوتا ہے۔

اپنے باپ دادا سے نہ تو انہیں کوئی جاگیر ملی تھی اور نہ ہی کوئی سیاسی بیک گراؤنڈ لیکن اصل وراثت ان کی چالاک فطرت، سازشیں اور جوڑ توڑ کرنے کی مہارت تھی۔

انہیں دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ زندگی کے کسی بھی میدان میں ہوتے تو اپنی فطرت کے سبب ایسی ہی کامیابیاں حاصل کرتے جیسی انہوں نے سیاست کے میدان میں حاصل کی تھیں۔ انہوں نے اپنے عہدے اور دائرہ کار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت کچھ بنایا تھا۔

صمد رحمن نے وزارت کے علاوہ بھی اور نہ جانے کہاں کہاں ٹانگ پھنسائی ہوئی تھی بقول ان کے وہ دکھی انسانیت کے لیے بھی ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہتے تھے اور یہ بات وہ اپنی ہر سیاسی تقریر، ریڈیو، ٹی وی انٹرویوز اور اخباری بیانات میں بار بار دہراتے رہتے تھے۔

اکثر اخبارات میں ان کی تصویریں چھپتیں، وہ کہیں غریبوں میں سائیکلیں بانٹ رہے ہیں، بیواؤں میں مشینیں بانٹ رہے ہیں۔ ہر آفت میں وہ بڑھ چڑھ کر مدد کر رہے ہیں۔ کتنے ہی سماجی فلاحی ادارے ان کی زیرِ سرپرستی چل رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے لیے بہت کچھ کر رہے تھے۔ وہ بین الاقوامی فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹس کی فرنچائز ان کے پاس تھی۔ بہت بڑے بڑے تجارتی سودے وہ اپنی سرپرستی میں کرواتے جیسے ابھی حال ہی میں وزرا کے لیے خریدے گئے قیمتی بلٹ پروف مرسڈیز کاروں کا سودا انہی کے توسط سے ہوا جس کا کمیشن ہی کروڑوں میں تھا۔

ان کی اپنی ایک سیاسی جماعت تھی جس کے وہ تاحیات صدر تھے۔ ان کی جماعت زور و شور سے ہر الیکشن میں حصہ لیتی تھی۔ صمد رحمن بین الاقوامی لابسٹ فرم سے اپنے الیکشن کے لیے لابنگ کرواتے۔ نتیجتاً ان کی پارٹی کے الیکشن کے نتائج سب کے لیے بڑے حیران کن ہوتے تھے۔ اپنی اس شاندار کامیابی کو لے کر وہ حکومت بنانے والی پارٹی کے ساتھ شامل ہو جاتے۔ ایک دو وفاقی وزارتیں بھی انہیں آسانی سے مل جاتیں۔ ان کی جماعت کا غیر تحریر شدہ ایک ہی نعرہ تھا۔ ’’جو جیتے اس کے ساتھ۔‘‘

صمد رحمن کی گھریلو زندگی بس ایک ساتھ بیٹھ کر لنچ کرنے یا کبھی کبھار ڈنر کرنے تک محدود تھی۔ گھر اور بچوں کی مکمل ذمے داری فرزانہ کے پاس تھی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ غیر ملکی دوروں میں وہ بیوی اور بچوں کو بھی لے جاتے لیکن وہاں بھی ان کی مصروفیات الگ رہتیں اور بیوی بچے پروٹوکول آفیسر کے بنائے ہوئے پروگراموں کے حساب سے ادھر ادھر گھومتے تھے۔ جس میں ان کی پسند یا مرضی کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا لہٰذا وہ تفریح سے زیادہ تھکن کا سبب بن جاتا تھا اور وہ گھر آ کر زیادہ سکون کا سانس لیتے۔

گھر میں صمد رحمن کے معمولات بڑے لگے بندھے اور گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ چلتے۔ صبح نو بجے سے لنچ تک وہ اپنی وزارت کے آفس میں ہوتے اور وہاں کے معاملات نمٹاتے پھر لنچ کے لیے گھر آتے۔ لنچ سے فارغ ہو کر تھوڑی دیر اپنے مخصوص کمرے میں آرام کرتے اور تین بجے کے بعد وہ اپنی کوٹھی کے الگ تھلگ حصے میں بنے اپنے آفس میں بیٹھتے۔ جہاں وہ مختلف لوگوں سے ملتے۔ جن میں ان کی اپنی جماعت کے عہدیدان، میڈیا کے لوگ، کسی سماجی فلاحی ادارے کے کرتا دھرتا کے علاوہ ان کے اپنے قانونی مشیر، ٹیکس کے ماہرین اور مالیاتی اداروں سے وابستہ لوگ بھی شامل تھے۔

ان کے تینوں بچوں اور بیگم کے لیے یہ لازم تھا کہ وہ لنچ ان کے ساتھ کریں۔ چاہے کوئی کہیں بھی مصروف ہو ڈیڑھ بجے اسے ڈائننگ ٹیبل پر ہر حال میں موجود ہونا چاہیے۔

کھانے کے وہ شوقین تھے اور اچھا کھانا پسند کرتے تھے چنانچہ فرزانہ لنچ کی تیاری کے لیے خود کچن میں موجود ہوتی تھیں اور مستقل خانساماں کو ہدایات دے دے کر کھانے تیار کرواتی تھیں۔ ٹھیک ڈیڑھ بجے لنچ لگ چکا ہوتا تھا اور وہ چاروں وہاں موجود ہوتے تھے۔

وہ حسبِ معمول اپنے اسٹاف کو مختلف ہدایات دیتے۔ کاغذات پر دستخط کرتے تیز تیز چلتے ہوئے طویل و عریض لاؤنج کے ڈائننگ سیکشن میں داخل ہوتے تو ان کا اسٹاف وہیں سے واپس لوٹ جاتا اور وہ حسبِ عادت راستے میں ملنے والے ملازموں کا حال احوال پوچھتے آ کر اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ جاتے۔

’’ہاں بھئی، آ گئے ہو سب۔ کیا حال ہے بچوں؟‘‘ وہ ان سب پر ایک نظر ڈالتے ہوئے پوچھتے۔

’’ٹھیک ہیں بابا۔‘‘ کوئی نہ کوئی جواب دے دیتا۔

’’اچھا چلو پھر کھانا شروع کرو۔ فرزانہ آج کی اسپیشل ڈش کیا ہے بھئی؟‘‘

’’ٹراؤٹ مچھلی ہے۔‘‘ فرزانہ ان کی طرف ڈش بڑھا دیتیں۔

’’ہائیں... یہ ٹراؤٹ کون لے آیا بھئی؟‘‘ وہ حیران ہو کر پوچھتے۔

’’اپنا مالی ہے ناں اس کے بھائی کے ہاں جرید میں ٹراؤٹ مچھلی کے فارم ہیں۔ بہت بڑی فارمنگ ہے اس کی۔ میں اس سے کہہ کر منگوا لیتی ہوں۔ آپ کو پسند ہے ناں اس لیے۔‘‘ فرزانہ مسکرا کر کہتیں۔

’’واہ... واہ، کیا بات ہے۔‘‘ وہ کہتے اور اسی طرح کی اِدھر اُدھر کی باتوں میں لنچ چلتا رہتا۔ اس دن انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے سعد کو مخاطب کیا۔

’’ہاں برخوردار، تمہارا کیا پروگرام چل رہا ہے؟‘‘ انہوں نے اس سے پوچھا۔

’’کچھ خاص نہیں بابا، رزلٹ کا انتظار کر رہا ہوں۔‘‘ اس نے بے دلی سے جواب دیا کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ وہ اب کیا کہنے والے ہیں۔

’’وہ دیکھو میں نے فیضان سے کہہ دیا تھا کہ لندن میں تمہارے داخلے کا انتظام کر دے لنکنز ان میں۔ جانتے ہو نا جہاں سے قائد اعظم نے لا کی ڈگری حاصل کی تھی۔ فیضان ساری فارمیلٹیز پوری کر کے تمہارے جانے اور وہاں بورڈنگ اور لاجنگ کا بندوبست بھی کر دے گا۔ تم تیار کر لو۔‘‘ صمد رحمن نے مچھلی کا بڑا سا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا تو سعد کے چہرے پر بدمزگی کا تاثر جھلکا۔ اس نے سر اٹھا کر شاید

کچھ کہنا چاہا لیکن ماں کی آنکھوں میں تنبیہ دیکھ کر رک گیا اور چپ چاپ اپنی پلیٹ پر جھک گیا۔

صمد رحمن جلدی جلدی نہ جانے کیا کیا بولتے رہے اور کھانا کھاتے رہے۔ یہاں تک کہ بٹلر نے آخری ڈش یعنی سوئٹ ڈش سرو کی۔ فروٹ سلاد تھی جس میں چیری، اسٹرابیری اور پائن ایپل جیسے ٹن پیک فروٹس بھی نظر آرہے تھے۔ اسے صمد رحمن نے بڑے شوق سے اور باقی سب نے بڑی بے دلی سے تھوڑا بہت کھایا کیونکہ سعد کا موڈ خراب تھا اور اسے دیکھ کر دونوں بہنیں بھی پریشان تھیں۔ فرزانہ بھی کچھ آزردہ سی ہوگئی تھیں۔ ایک گھنٹے میں لنچ ختم ہوا اور اسی وقت ڈرائیور نے آکر اطلاع دی۔

"سر، گاڑی تیار ہے۔" اس نے ایک ہاتھ سے ٹوپی اتاری اور دوسرا ہاتھ سینے پر رکھ کر ذرا سا جھک کر یہ جملہ بولا تو وہ بیوی بچوں کو خدا حافظ کہتے ہوئے روانہ ہوگئے۔ فیضان ان کی بقیہ دن کی مصروفیات کا شیڈول لیے پہلے ہی دروازے پر کھڑا تھا۔ ان کے نکلتے ہی وہ بھی پیچھے پیچھے روانہ ہوگیا۔

ان کے جاتے ہی سعد نے ہاتھ میں پکڑا کانٹا زور سے پلیٹ میں پھینکا۔ دھڑ سے کرسی پیچھے کھسکا کر پاؤں پٹختا ہوا سیڑھیاں پھلانگتا اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"امی! بھائی ناراض ہے۔ وہ لاء نہیں پڑھنا چاہ رہا تو بابا کیوں زبردستی اسے مجبور کررہے ہیں؟" خوباں کا دل بھائی کے لیے دکھ رہا تھا۔

"ہاں امی، آپ بابا کو بتائیں ناں کہ بھائی کمپیوٹر انجینئرنگ پڑھنا چاہتے ہیں۔" تاباں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

"ماں باپ اپنے بچوں کے لیے بہتر ہی سوچتے ہیں۔" فرزانہ نے ٹشو سے ہاتھ رگڑ کر پونچھا اور اٹھ کر چلی گئیں۔

☆☆☆

سعد نے بہت احتجاج کیا۔ ماں سے کئی بار زوردار بحث ہوئی حتیٰ کہ اس نے ہمت کرکے ایک دن بابا سے بھی یہی بات کہہ دی۔

"بابا! میں لاء نہیں پڑھنا چاہتا۔"

"کیوں؟" صمد رحمن نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" اس نے سر جھکائے جھکائے کہا۔

"تو تمہیں کس چیز میں دلچسپی ہے؟"

"میں کمپیوٹر انجینئر بننا چاہتا ہوں۔" سعد نے اپنی پسند بتائی۔

"دیکھو برخوردار! یہ ایک ایسا سبجیکٹ ہے جسے ہر ہما شما پڑھ رہا ہے۔ دو چار سال بعد ہی ایسا وقت آئے گا کہ بھنگی چماروں کی اولادیں بھی کمپیوٹر ماسٹر ہوں گی اور میں نہیں چاہتا کہ تم بھی ایسی فیلڈ میں جاؤ جس میں ہر عام آدمی جارہا ہو۔"

"کیوں؟" سعد نے سوال کیا۔

"اس لیے کہ تم عام آدمی نہیں ہو۔ قدرت نے تمہیں بہت خاص بنا کر ایک بہت خاص گھرانے میں پیدا کیا ہے لہٰذا اپنی ذمے داریوں کو محسوس کرو۔ تم جن لوگوں پر حکومت کرنے کے لیے اس دنیا میں بھیجے گئے ہو، ان کے ساتھ کام کرنا اور ڈیلنگ کرنا تمہارے شایانِ شان نہیں ہے۔ میں نے تمہارے لیے زندگی میں ہر اس چیز کا انتخاب کیا ہے جو بہترین ہے۔ خاص الخاص ہے۔ تم اپنے لائف اسٹائل پر غور کرو۔ بہترین غیر ملکی تعلیمی ادارہ، بہترین مشاغل، گھڑ سواری، کار ریسنگ، فلائنگ، آئس اسکیٹنگ یہ عام لوگوں کے مشغلے نہیں ہیں۔ تمہارا گھر، تمہاری کار، تمہارا رہن سہن یہ سب تم اچھی طرح جانتے ہو، یہ لائف اسٹائل بہت خاص اور بڑے لوگوں کا ہے پھر تمہارا کیریئر... یہ عام لوگوں والا کیسے ہوسکتا ہے؟ نو... اینڈ نیور۔" صمد رحمن نے اس کی خواہش کو مکمل طور پر مسترد کردیا۔

سعد کا دل ڈوبنے لگا پھر بھی اس نے ہمت کرکے ایک اور سوال پوچھ ڈالا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ بابا کے پاس اس کا بھی مدلل جواب ہوگا۔

"لاء کی تعلیم میں کیا خاص بات ہے؟ بہت سے لوگ لاء پڑھ رہے ہیں؟"

"ہاں لیکن سب لوگ لنکزان سے لاء نہیں پڑھ رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے ہم پلہ لوگوں میں بھی نمایاں مقام کے حامل ہو۔ تمہاری ہائی پروفائل پرسنالٹی کا پرسونا اپنے ہم پلہ لوگوں کے لیے بھی قابلِ رشک ہو۔ یہ تمہارے سیاسی کیریئر کی شروعات ہی ایک زبردست بوم کے ساتھ کرے گا۔"

"سیاسی کیریئر؟" سعد بھونچکا رہ گیا۔ "کیا میرا مستقبل بھی سیاست میں ہی ہے؟" اس نے حیران ہوکر پوچھا۔

"آف کورس۔ یہ جو میں نے ساری عمر کی جان توڑ کوشش کے بعد ایک سیاسی مقام بنایا ہے اس کا سارا ثمر میری اولاد کے بجائے کوئی اور لوٹ کرلے جائے۔ یہ تو میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔ میرے اکلوتے بیٹے کی حیثیت سے یہ سب کچھ تمہی کو سنبھالنا ہے۔ جاؤ جانے کی تیاری کرو۔" انہوں نے اپنی بات ختم کرکے اسے جانے کا اشارہ کیا تو وہ اپنا سامنہ لے کر اپنے کمرے میں آگیا۔

اور پھر کچھ عرصے بعد ہی وہ فیضان کے ساتھ لندن روانہ ہوگیا۔ فیضان نے اس کی تمام ضروریات کا معقول طریقے پر بندوبست کردیا تھا۔ اس کے لیے ایک اپارٹمنٹ اور گاڑی اور ایک ملازم کا انتظام کردیا گیا تھا جو تمام گھریلو امور کے ساتھ ساتھ ڈرائیونگ بھی کرلیتا تھا۔ یوں سعد رحمن نے نہ چاہتے ہوئے قانون کی تعلیم حاصل کرنا شروع کردی۔

لنکزان کا انتہائی سنجیدہ بلکہ بورنگ ماحول اس کی فطرت سے میل نہیں کھاتا تھا سو اس نے دوستیاں بڑھائیں اور مختلف کلبز اور ایسے اداروں کی ممبر شپ لے لی جو نوجوانوں کو مختلف مشاغل کے مواقع فراہم کرتے تھے پھر ایک دن اس کی دوستی ایک انڈین لڑکے پردیش ورما سے ہوئی۔ پردیش کمپیوٹر ورم (کیڑا) تھا اس کا سب سے دلچسپ مشغلہ ہیکنگ تھا۔ وہ مختلف اکاؤنٹس ہیک کرلیتا تھا پھر پرائیویٹ میلز، ڈیٹا اور ہائی لی کانفیڈنشل معلومات حاصل کرکے بڑا خوش ہوتا تھا۔ اگرچہ اس نے کبھی (بقول اس کے) اس سے کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا لیکن یہ اس کا مشغلہ تھا جس سے وہ بہت لطف اندوز ہوتا تھا۔

سعد سے دوستی ہوئی تو اپنے اپنے مشاغل شیئر کرنے کے بعد جب اسے پتا چلا کہ پردیش کمپیوٹر ماسٹر ہے تو وہ بہت ہی خوش ہوگیا۔

"پردیش! یار مجھے بھی بڑا شوق ہے مگر میرا شوق صرف تھوڑا بہت آف لائن کام کرنے میں ہے یا پھر نیٹ پر مختلف سائٹس کی سرچنگ تک محدود ہے۔ تو مجھے بھی یہ سارا فن سکھا دے۔"

"شیور! کیوں نہیں جب بھی وقت ہو آجایا کرو میرے پاس، سکھا دوں گا۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"لیکن یار! تیرا گھر دور بہت ہے۔ ڈیڑھ گھنٹا جانے کے اور اتنا ہی آنے کا۔" سعد نے کہا کیونکہ پردیش واقعی بہت دور رہتا تھا۔

"بھئی کنوئیں کے پاس پیاسے کو آنا ہی پڑتا ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی دور کیوں نہ ہو۔" پردیش نے اس کے شوق کو ہوا دی۔

"یار تو کسی کے ساتھ شیئر کرکے رہتا ہے ناں؟" سعد نے پوچھا۔

"ہاں دو لڑکے اور ہیں۔ ہم تینوں مل کر ایک اسٹوڈیو اپارٹمنٹ میں رہتے ہیں اور سارے اخراجات مل کر شیئر کرتے ہیں۔"

"پردیش! ایسا نہیں ہوسکتا کہ تو میرے ساتھ اپارٹمنٹ میں موو ہوجائے۔ دو کمروں کا اپارٹمنٹ ہے ایک کمرا تو لے لینا۔" سعد نے اسے کافی بڑی پیشکش کی۔

"ہائیں... یہاں ہم تین ایک کمرے میں رہتے ہیں اور وہاں دو کمروں میں تو اکیلا رہتا ہے۔ بہوت ناانصافی ہے۔" پردیش نے فلمی ڈائیلاگ بولا۔

"اسی لیے بلا رہا ہوں تجھے۔"

"تو ٹھیک ہے میں کب انکار کررہا ہوں۔" دونوں نے ہنستے ہوئے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور اس طرح پردیش، سعد کو اپنا فن سکھانے لگا جسے سعد بھی بڑی دلچسپی سے سیکھنے لگا۔ اسے بہت مزہ آتا تھا۔ اکثر رات گئے تک وہ عجیب عجیب کانفیڈنشل سائٹس ہیک کرکے دیکھتے اور ہنستے رہتے۔

کچھ عرصے بعد ہی پردیش نے اسے اطلاع دی کہ اب وہ ہیکنگ میں اس قدر ماہر ہوچکا ہے کہ چاہے تو جتنے مرضی کریڈٹ کارڈز کے نمبر ہیک کرکے مفت میں ایک لگژری لائف گزار سکتا ہے اور اگر مریخ پر بھی کسی مخلوق نے اپنی کوئی سائٹ بنائی ہوئی ہو تو وہ آسانی سے اسے ہیک کرسکتا ہے۔" اب اکثر یہ ہوتا کہ پردیش یونہی اسے کوئی مشکل سا اسائنمنٹ دے دیتا۔

کچھ اس کا اپنا شوق کچھ پردیش جیسا بڑھاوا دینے والا۔ وہ کمپیوٹر میں چھپے بے شمار اسرار و رموز سے واقف ہوتا چلا گیا۔ ساتھ ساتھ اس کی قانون کی تعلیم بھی چلتی رہی۔

پانچ سال بعد جب وہ تعلیم مکمل کرکے لوٹا تو سب کچھ ویسا ہی تھا۔ اس کے جانے کے بعد حکومت بدل گئی تھی لیکن اس کے بابا اب بھی وفاقی وزارت کا قلمدان سنبھالے ہوئے تھے۔ وہی ٹھاٹ باٹ، وہی مصروفیت اور وہی اس کا گھر۔

بڑی بہن خوباں ماس کمیونیکیشنز میں ماسٹرز کرکے ایک بڑی خبر رساں ایجنسی میں بطور فری لانسر کام کررہی تھی۔ اس کی تیار کردہ رپورٹس فیچرز ٹی وی پر بھی کبھی کبھار نظر آتے رہتے تھے۔ جنہیں وہ شوق سے سعد کو دکھاتی۔

"بھائی! شہری حکومت کی کارکردگی پر بنائی رپورٹ آج دکھائی جائے گی۔ تم ساڑھے نو بجے ضرور دیکھنا۔" وہ فون پر اسے بتاتی یا پھر "کاروکاری کے بارے میں میرا فیچر نیوز پیپر میں آیا ہے۔ بھائی تم ضرور پڑھنا۔" وہ شب بخیر کہنے سے پہلے اسے بتاتی۔

بڑا ایکس کلوسو کام کررہی تھی۔ چھوٹی بہن تاباں میڈیکل کے سیکنڈ ایئر میں تھی۔ بابا نے کہا تھا اس سے کہ وہ ڈاکٹر بن جائے گی تو وہ اسے شاندار اسپتال بنوا کردیں گے۔

امی وہی امی تھیں۔ ویسی کی ویسی۔ محبت کرنے والی خاطریں کرنے والی ہلکی پھلکی ڈانٹ ڈپٹ کرنے والی۔

☆☆☆

اس رات کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آیا تو خوباں بھی اس کے پیچھے آگئی۔

”بھائی! آج خبروں کے بعد میری ایک رپورٹ آرہی ہے۔ میں چاہتی ہوں تمہارے ساتھ بیٹھ کر وہ رپورٹ دیکھوں۔ تم سے باتیں کرنے کو بھی دل چاہ رہا تھا۔ تم اسے غور سے دیکھ کر اپنی رائے دینا۔“ خوباں تیز تیز لہجے میں بولتی اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا اور اس کے بیڈ پر پیر پھیلا کر بیٹھ گئی۔ ٹی وی پر ابھی خبریں چل رہی تھیں۔

”ایسی کون سی خاص بات ہے جس کے لیے تمہیں سوچنا پڑ رہا ہے۔ میرے خیال میں تو تم نے سوچنے کا سارا کام تو صرف تاباں پر چھوڑا ہوا تھا۔ تم تو ہمیشہ آفریدی کی طرح زبانی چوکوں چھکوں کی قائل ہو۔“ سعد نے ہنستے ہوئے کہا تب بھی خوباں کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

”بھائی! میں یہ سوچ رہی ہوں کہ میں تمہیں بتاؤں یا نہ بتاؤں؟“ خوباں نے آہستگی سے کہا تو سعد چونک گیا۔

”کیا بات ہے خوباں؟ ایسی کیا بات ہے تم نے تو مجھے سسپنس میں ڈال دیا ہے۔“ سعد حیران بھی تھا اور پریشان بھی کہ ایسا کیا ہے جسے بتانے کے لیے اس کی بہن سوچ میں پڑ گئی ہے۔

”بات دراصل یہ ہے بھائی کہ پچھلے چند ہفتوں سے میں اور میرا ایک ساتھی جرنلسٹ خودکش بم دھماکوں کے سلسلے میں معلومات اکٹھی کررہے تھے۔ آپ بھی خبریں دیکھتے اور سنتے رہتے ہیں۔ کافی عرصے سے یہ کچھ عجیب طرح کا ایک چین ری ایکشن چل رہا ہے۔ اس سلسلے کو دیکھتے ہوئے بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ فرقہ وارانہ مخاصمت چل رہی ہے۔ ایک دوسرے سے بدلہ لینے کے لیے ایک دوسرے کے رہنماؤں کو مارا جارہا ہے اور کچھ ہی وقت گزرتا ہے کہ اس طرح کے واقعات کے نتیجے میں پورے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوسکتے ہیں۔ میں اور میرا جرنلسٹ ساتھی... ہم لوگ انوسٹی گیٹو رپورٹنگ کرتے ہیں لہٰذا اسی سلسلے میں جائے وقوع پر بھی پہنچ کر کلیوز لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ متعلقہ لوگوں سے پوچھتے ہیں۔ پولیس رپورٹس سے مدد لیتے ہیں۔ عینی شاہدوں سے ملاقاتیں کرتے ہیں اور پھر شہادتی اشاروں کی مدد سے ہم اپنی رپورٹس تیار کرتے ہیں۔ ویسے تو میں خود بھی پوری سرگرمی اور محنت و عرق ریزی سے اپنا کام کرتی ہوں لیکن منصور اس معاملے میں بہت ہوشیار ہے۔ اس کی باریک بین نظریں اور بجلی کی سی تیزی سے چلتا ہوا دماغ بڑے کمال دکھاتا ہے۔ بے انتہا نڈر اور دلیر ہے۔ کسی بڑی سے بڑی توپ چیز سے بھی نہیں ڈرتا۔“ خوباں جلدی جلدی بول رہی تھی کہ سعد نے سوال کیا۔

”منصور؟“

”وہی... میرا ساتھی جرنلسٹ۔ ہاں تو بھائی ہم لوگوں نے ان خودکش بمبار لوگوں کے بارے میں چھان بین کرنے کی کوشش کی تو بڑی عجیب و غریب کہانیاں سامنے آگئیں۔ ابھی آپ جو ٹی وی پر دیکھیں گے یہ تو وہی عام سی رپورٹ ہے لیکن جو کچھ اس میں نہیں ہے وہ بڑا ہورہیبل ہے۔“ اس کا لہجہ تیز لیکن آواز کا والیوم کافی مدھم ہوگیا تھا۔

”کیا مطلب ہے بھئی۔ جو کچھ ٹی وی پر یا پیپرز میں دکھایا جاتا ہے، وہ کیا کچھ کم ہورہیبل ہوتا ہے جو اس سے بھی زیادہ ہورہیبل کچھ اور ہے۔“ سعد نے اسے گھورتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

”ہاں... ہم سوچ بھی نہیں سکتے ایسا کچھ ہے۔“ خوباں نے اس کی حیرت دوچند کرتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔

”بھائی! ہمارے پورے ملک میں ایسی درس گاہوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے جہاں دینی تعلیم دی جاتی ہے اور ہزاروں کیا لاکھوں طلبہ وہاں پڑھتے ہیں۔ ان کا تعلیمی نصاب کوئی خاص نہیں۔ یہ صرف قرآن و سنہ پڑھاتے ہیں اور ہمیں کیا ساری دنیا کو پتا ہے کہ یہاں مخصوص ذہنی تربیت کے بعد جو ذہن تیار کیے جاتے ہیں ان سے بڑے خاص مقاصد کے لیے کام لیا جاتا ہے۔“

”ہاں ہاں، جانتا ہوں۔“ سعد نے اس کی بات سنتے سنتے کہا۔

”اصل بات یہ ہے کہ اس طرح معصوم ذہنوں کو مسموم کرنے والے جو لوگ ہیں، وہ ہمیں بظاہر عام سے مسلمان نظر آتے ہیں۔ اپنی وضع قطع اپنے طور طریقوں اور اپنے انداز و اطوار سے لیکن بھائی کیا تمہیں معلوم ہے کہ ان میں سے بہت سے بیرونِ ملک سے ڈکٹیشن لیتے ہیں۔ ان کے اشاروں پر کام کرتے ہیں۔ ان کے باقاعدہ پیرول پر ہیں۔“ خوباں نے سعد کی آنکھوں میں حیرت پڑھتے ہوئے کہا۔

”تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ بعض لوگ اپنی اسلامی وضع قطع کے بھیس میں ایک باقاعدہ نیٹ ورک قائم کیے ہوئے ہیں اور اس نیٹ ورک کو چلانے والے لوگ ہمارے اپنے اندر، ہمارے آس پاس بہت قریب کہیں ہیں۔ انہیں ہمارے دشمن ملکوں کی خفیہ ایجنسیوں سے ہدایات ملتی ہیں اور یہ لوگ ان ہدایات پر عمل کرکے یہاں انتشار اور دہشت گردی پھیلاتے ہیں۔“

”تو ہماری خفیہ ایجنسیاں کیا چین کی نیند سو رہی ہیں۔ وہ ایسے لوگوں کو آبزرو نہیں کرتیں؟“ سعد نے تلخی سے کہا۔

”یہی تو مسئلہ ہے کہ بھائی کوئی سی ایجنسی ہو کوئی بھی اتھارٹی ہو، سب انہیں اپنے اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ انہیں اوپر سے جو ہدایات ملتی ہیں، وہ وہی مانتے ہیں۔“ خوباں نے کہا۔

”حلف تو اپنے وطن سے وفاداری کا اٹھاتے ہیں۔ کام دوسروں کے مفادات کے لیے کرتے ہیں۔ کوئی دھرم ایمان نہیں ہے۔“ سعد نے کہا۔

”چھوڑو بھائی! اس قسم کی باتوں کو دیوانے کی بڑ سمجھا جاتا ہے۔“ خوباں نے آزردگی سے کہا۔

”آخر کون لوگ ہیں جن کے مفادات اس ملک، اپنے وطن کو نقصان پہنچانے سے پورے ہوتے ہیں؟“ سعد بڑبڑایا۔

”ہاں... یہ ہے نا ملین ڈالر والا سوال۔ میں اسی بارے میں تمہیں کچھ بتانے کی کوشش کررہی تھی۔“ خوباں نے کہا۔ ”میں نے اور منصور نے بڑی جان جوکھم کے بعد اس الجھے ہوئے گنجلک نیٹ ورک میں سے ایک سرا پکڑ لیا ہے۔“ خوباں نے انکشاف کیا تو سعد چونک پڑا۔ اس کے سوالیہ انداز پر خوباں نے مدھم مدھم سی آواز میں کہنا شروع کیا۔

”آپ کو معلوم ہے کہ دینی تعلیم کے نام سے کئی ادارے جگہ جگہ قائم ہیں۔ یہ بہت بڑے بڑے ادارے ہیں اور تقریباً تمام میں ہی بڑے بڑے ہاسٹل ہیں۔ جہاں نہ صرف پورے پاکستان سے بلکہ بعض دوسرے مسلم ممالک سے طلبہ پڑھنے کے لیے آتے ہیں اور وہ سالہا سال تک یہاں قیام پذیر رہتے ہیں۔ اس دوران ان کی تعلیم و تربیت جاری رہتی ہے۔ یہ اپنے بے پناہ معارف ان رقوم سے پورے کرتے ہیں جو مخیر حضرات انہیں صدقہ خیرات کی مد میں دیتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے بھائی کیا اپنے ملک کے مخیر حضرات انہیں خیرات کے طور پر اتنی رقم دیتے ہوں گے کہ ان کی بہت سی درس گاہوں کے ہزاروں طلبہ کے اخراجات پورے ہوسکیں؟“ خوباں نے بھائی سے سوال کیا اور اسے الجھا دیکھ کر خود ہی جواب دے دیا۔

”بالکل بھی نہیں۔ اپنے پیارے پاکستان کے دولت مندوں کو تم بھی اچھی طرح جانتے ہی ہوگے کہ ان کے پاس جتنی بھی دولت ہو وہ اس میں سے کسی کو دینے کی بات تو چھوڑو ہمیشہ اسی جوڑ توڑ میں لگے رہتے ہیں کہ اس کو مزید کس طرح بڑھایا جاسکتا ہے اور ان کی ساری کالی پیلی دولت گمنام سوئس اکاؤنٹس میں جمع ہوتی رہتی ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے پھر یہ لوگ کیا کرتے ہیں؟“ سعد نے پوچھا۔

”بھائی انہیں ملتی تو امداد ہی ہے اسی سے چل رہی ہے ان کی گاڑی لیکن جانتے ہو انہیں یہ امداد کون دیتا ہے؟“ خوباں نے بھائی سے سوال کیا تو اس نے نفی میں گردن ہلادی۔

”یہودی۔“ خوباں نے جیسے کان کے پاس پٹاخہ پھوڑا۔

”کیا...؟“ وہ بہت حیران ہوا۔

”ہمارے چند نام نہاد مخصوص تعلیمی مراکز کی فنڈنگ یہودی کرتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ انہیں کیا پڑی ہے کہ وہ مسلمان کی پیسوں سے مدد کرکے ان کی دینی اور مذہبی تعلیم کے سلسلے کو بڑھائیں۔ یہودی بھلا مسلمانوں کے دوست کیسے ہوسکتے ہیں؟“

”نو... نیور۔“ سعد نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔

”یہی تو سمجھنے والی بات ہے بھائی۔ تم نے بھی ڈیوڈ اسٹارز، ڈیوڈ ٹرسینڈر، ہنوکاز، اسٹلے جیوز فورم جیسے نام سنے ہیں؟“ خوبان نے پوچھا۔

”ہاں سنے تو ہیں۔ یہ یہودیوں کے خدمتی ادارے ہیں۔ بہت سی ورلڈ وائڈ کمپنیز ان کو یہودیوں اور دوسرے لوگوں کی امداد کے لیے بڑے بڑے فنڈز دیتی ہیں تاکہ وہ رفاہِ عامہ کے لیے کام کرکے غریب اور پریشان حال لوگوں کی مدد کرسکیں۔“ سعد ان کے بارے میں جو کچھ جانتا تھا، اس نے بتادیا۔

”بالکل ٹھیک، سب یہی جانتے ہیں ان کے بارے میں لیکن تم اس بات پر غور کرو کہ ہمارے حضورؐ نے ان کے بارے میں کیا کہا تھا یہی ناں کہ یہود کبھی مسلمانوں کے دوست نہیں ہوسکتے۔ تو اس ارشادِ پاکؐ کی روشنی میں ذرا اس بات کا جائزہ لو کہ یہودیوں کے اتنے بڑے بڑے ادارے پاکستانی درس گاہ میں دینی تعلیم کی ترویج کے لیے اتنے بڑے بڑے فنڈز کیوں دے رہے ہیں... سوچو سوچو؟“ خوباں نے پھر بھائی کے سامنے سوال رکھ دیا۔

”یقیناً ان کا مقصد نیک تو نہیں ہوگا۔ یہ بات تو طے ہے۔“ سعد نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ان کا مقصد قطعاً نیک نہیں ہے۔ یہ انہی کا پروگرام ہے کہ مسلمانوں کو احمقانہ لڑائی جھگڑے میں پھنسائے رکھو تاکہ یہ کبھی طاقت نہ پکڑ پائیں اور ان احمقانہ لڑائی جھگڑوں کی بنیاد فرقہ واریت پر رکھی گئی ہے۔ سارے اسلامی ممالک میں دیکھ لو ہر طرف فساد برپا ہے۔ عراق، ایران، افغانستان اور اب پاکستان۔ ان فسادات کو بھڑکانے والے اور اس جلتی آگ پر تیل چھڑکنے والے لوگ کون ہیں... معلوم ہے نا؟" خوباں نے پھر بھائی سے سوال کیا۔

"بھئی بظاہر تو ہر جگہ امریکا ہی ہے جس نے ہر طرف فساد ڈالا ہوا ہے۔" سعد نے سر ہلا کر کہا۔

"رائٹ تمہیں معلوم ہے نا کہ امریکا میں یہودی لابی کتنی مضبوط ہے۔ بزنس، کمیونیکیشن، میڈیا تو موٹی موٹی باتیں ہیں ان کی تو سیاست ساری کی ساری انہی کے ہاتھ میں ہے۔ امریکا میں الیکشن ہوتے ہیں تو یہی جیوز لابی اس صدارتی امیدوار کے لیے فنڈنگ کرتی ہے جو ان کے مخصوص عزائم کی تکمیل کے لیے کام کرنے پر تیار ہو، وہ امیدوار جیت جاتا ہے پھر وہ انہی کے لیے کام کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ارے بھائی ان کی تو ساری خفیہ ایجنسیاں بھی جیوز کی پالیسی کے لیے کام کرتی ہیں تو اصل میں تو وہی اس وقت پالیسی میکرز ہیں۔ ساری دنیا ان کے اشاروں کے مطابق چل رہی ہے۔" خوباں نے اس قدر تفصیل سے ساری باتیں بیان کیں کہ سعد کچھ حیران ہو کر اسے دیکھتا رہا۔

"اس کا مطلب ہے مشرقِ وسطیٰ میں جب تک اسرائیل کی حدیں ان کی پسند کے مطابق نہیں ہو جاتیں، وہ یہاں اسی طرح فساد ڈلواتے رہیں گے؟" سعد نے کہا۔

"آف کورس، وہ ہر اس مسلمان ملک کو تباہ و برباد کر کے چھوڑیں گے جو ان کے لیے کبھی بھی کسی قسم کا خطرہ بن سکتا ہو اور اس کام کے لیے انہوں نے امریکا کو قابو میں کیا ہوا ہے۔ امریکا کو اس کے بدلے تیل کا چسکا لگ گیا ہے۔ یہ دراصل مسلمانوں کے لیے بلڈ سکرز ہیں خون چوسنے والے۔" خوباں نے جذباتی انداز میں کہا۔

"واہ کمال ہے، پانچ سال کے عرصے میں میری چھوٹی بہن کتنی بڑی اور کتنی سمجھدار ہوگئی ہے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" سعد نے محبت سے بہن کو دیکھتے ہوئے اس کے سلکی بالوں کو ہولے سے کھینچا۔ "لیکن سوال یہ ہے کہ تم اس وقت مجھے کرنٹ افیئرز پر یہ لیکچر کیوں دے رہی ہو۔ تمہارا وہ رپورٹ والا حصہ تو اس انٹرنیشنل سیاست میں کہیں کھو گیا۔"

"یہ سب کچھ جو میں نے کہا، اس کی تمہید ہے اور یہ سب کچھ میں آپ کو اس لیے بتا رہی تھی کہ اب جو اصل بات میں آپ کو بتانے جا رہی ہوں، آپ کو اسے سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔ بھائی! تم نے ایک ملین ڈالر والا سوال کیا تھا نا کہ کون لوگ ہیں یہ اور میں نے تمہیں درس گاہ کے بارے میں بتایا تھا۔ میں نے اور منصور نے اس کے بارے میں کافی چھان بین کی تو ہمیں معلوم ہوا کہ ان کی درس گاہوں کے چیف کہہ لو مہتمم کہہ لو وہ ہیں مولانا انعام اللہ جبار اور وہ تمام معاملات کے کرتا دھرتا ہیں۔ انہوں نے ہر ادارے میں کچھ لوگوں کو انتظامی امور کا نگراں ضرور بنایا ہوا ہے لیکن سارے فیصلے کا اختیار صرف مولانا جبار کو ہی ہے۔

بھائی! ہم لوگوں نے مولانا کے بارے میں جاننے کی بہت کوشش کی کہ وہ کہاں سے آئے ہیں، کہاں تعلیم حاصل کی۔ کن لوگوں سے ان کے روابط ہیں لیکن تم یقین کرو بھائی کہ ان تک جانے والا ہر راستہ اندھیرا ہے۔ ان کے بارے میں کوئی نہیں جانتا، یہ ساری باتیں۔ میں نے انٹرویو کے بہانے ان سے ملنا چاہا تو انہوں نے بہانہ بنا کر انکار کر دیا۔"

"تو یہ تو کوئی ایسی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔ بعض لوگ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ان کی ذاتی زندگی کو سب کے سامنے کھول کر رکھ دیا جائے۔" سعد نے بہن کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں لیکن بات دراصل یہ ہے کہ جبار صاحب کی مصروفیات نہ صرف پاکستان بلکہ بیرونِ ملک بھی خاصی پُراسراری ہیں۔ تمہیں پتا ہے یہ اکثر بیرونِ ملک دوروں پر بھی جاتے رہتے ہیں۔ منصور نے یہ کھوج لگایا ہے کہ جب یہ امریکا جاتے ہیں تو ایسے لوگوں سے بھی ملاقات کرتے ہیں جو مختلف یہودی این جی اوز کے ایجنٹ بھی ہیں۔"

"ہیں... یہ ان سے کیوں ملتے ہیں بھئی؟" سعد نے حیران ہو کر بہن کو دیکھا۔

"ہم م م... یہی تو اصل بات ہے۔ منصور کا خیال ہے کہ یہ بھی دراصل بالواسطہ یا بلاواسطہ یہودیوں کے آلۂ کار ہیں اور اپنے ملک میں ان کے مقاصد کی تکمیل میں ان کے مددگار بنے ہوئے ہیں۔" خوباں نے دکھی لہجے میں کہا۔

"مددگار بنے ہوئے، وہ کیسے؟" سعد نے غیر یقینی لہجے میں سوال کیا۔

"بھائی! ان کے اداروں میں جن طلبہ کو تعلیم دی جاتی ہے ان میں سے بعض کو ان کی کچھ خاص صلاحیتوں کی وجہ سے منتخب کیا جاتا ہے اور ان کی خصوصی تربیت کے لیے انہیں مخصوص کیمپوں میں بھیجا جاتا ہے جہاں وہ دھماکا خیز مواد تیار کرتے اور انہیں استعمال کرنے کی تربیت لیتے ہیں پھر جہاں کے لیے انہیں ہدایات دی جاتی ہیں وہ وہاں جا کر یا تو ریموٹ کے ذریعے دھماکے کر کے لوگوں کی جانوں کا ضیاع کرتے ہیں یا پھر خود اپنے آپ سے وہ دھماکا خیز مواد باندھ کر کسی مخصوص شخصیت یا شخصیات کو ہلاک کر دیتے ہیں۔" خوباں نے بتایا۔

"بھئی وہ لوگ اس قدر پاگل کیسے ہو جاتے ہیں کہ خود بھی مرتے ہیں حرام موت اور دوسرے بھی کتنے معصوم لوگ بے موت مارے جاتے ہیں۔" سعد نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

"یہ مخصوص تربیت کیا ہے؟ یہی تو وہ برین واشنگ ہے جو معصوم اور ناپختہ ذہنوں کو مسموم کرتی ہے مثلاً یہ کہ اگر تم فلاں شخص یا لوگوں کو مار دو تو سمجھو تم نے اپنی اور اپنے تمام خاندان کی عاقبت سنوار دی۔ تم سیدھے جنت میں جاؤ گے اور یہاں رہ جانے والے تمہارے لواحقین ہماری ذمے داری ہوں گے۔ ان کی زندگی ہم سنواریں گے۔ انہیں اتنا مال و دولت دیں گے کہ انہیں کبھی کوئی کمی نہیں ہوگی۔ وہ ہمیشہ بہت آرام اور عزت سے رہیں گے وغیرہ وغیرہ۔"

"خوباں! یہ سب کچھ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" سعد نے بہن کو گھورتے ہوئے پوچھا تو وہ مسکرائی۔

"بھائی! یہ بڑا ہائی ٹیک دور ہے ایسے سینسرز عام ملتے ہیں جو بڑی دور سے آواز کیچ کر لیتے ہیں۔ ایسے ننھے منے اسپائی کیمرے دستیاب ہیں جو بڑی دور کے منظر کی بھی بالکل صاف ستھری تصویریں کھینچ سکتے ہیں اور مووی بنا سکتے ہیں۔ پچھلے دو ڈھائی مہینوں سے میں اور منصور اس اسائنمنٹ پر کام کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کے دو تین تربیتی کیمپ ہیں ایک سرحدی علاقے میں ہے۔ ایک جنوبی پنجاب میں اور ایک کراچی میں۔ دھماکا خیز مواد کی عملی تربیت جنوبی پنجاب والے کیمپ میں دی جاتی ہے۔ ہم لوگوں نے دو کیمپوں میں جا کر خفیہ طریقے سے کافی کچھ مواد جمع کیا ہے۔ ایک کراچی والے میں اور دوسرا پنجاب والے میں۔ ایسی تصویریں اور موویز بنائی ہیں جہاں ان لوگوں کو تربیت دیتے ہوئے دکھایا ہوا ہے۔ ایسی ریکارڈنگز کی ہیں ہم نے جس سے صاف پتا چل رہا ہے کہ کس طرح زیرِ تربیت لوگوں کا برین واش کیا جا رہا ہے۔" خوباں نے دھماکا خیز اطلاع بھائی کو دی۔

"تو ابھی جو رپورٹ آنے والی ہے کیا اس میں یہ سب کچھ شامل ہے؟" سعد نے پوچھا۔

"اونہہ ہوں... یہ سب کچھ اس میں شامل نہیں ہے... کیونکہ اس طرح کی چیزیں ٹی وی پر نہیں چل سکیں گی۔ کوئی چینل رسک لینے پر راضی نہ ہوگا اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ معلومات ابھی نامکمل ہیں۔ مسٹر جبار تو صرف ایک شخص ہیں۔ وہ اکیلے اتنی بڑی توپ نہیں چلا سکتے... یہاں سیاسی اداروں میں... اسٹیبلشمنٹ میں اور دوسرے خفیہ اداروں میں یقیناً کچھ ایسے لوگ ہیں جو ان کی مدد کر رہے ہیں... ابھی ان کا پتا چلانا باقی ہے۔ کام جاری ہے۔" خوباں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یعنی اپنے ہی ملک کی جڑوں میں بیٹھے لوگ... انہیں کاٹنے میں دشمنوں کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں۔" سعد نے انتہائی تاسف سے کہا۔

"ارے ہاں بھائی، یہ کون سی نئی بات ہے۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ لو... ساری کی ساری میر جعفروں اور میر صادقوں سے بھری پڑی ہے۔" خوباں نے بے پروائی سے کہا۔

"میرا بس چلے تو ایسے تمام لوگوں کو... شاہراہوں پر لگے بڑے بڑے درختوں پر پھانسی دے دوں اور کئی دنوں تک ان کی لاشیں وہیں لٹکنے دوں تاکہ دوسروں کو دیکھ کر عبرت حاصل ہو کہ یہ انجام ہوتا ہے ملک و قوم سے غداری کرنے والوں کا۔" سعد کو واقعی غصہ آ رہا تھا۔

"ریلیکس بھائی... ریلیکس... وہ سادہ لوگ تھے۔ جو تھے وہی نظر آتے تھے۔ آج کا دور دوسرا ہے کچھ لوگ اپنے عمل میں میر جعفر اور میر صادق ہیں... لیکن چہروں پر ماسک سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کے لگائے ہوئے ہیں۔ ان کی شناخت کرنا اتنا آسان نہیں ہے اور پھر ہم جس سسٹم میں رہ رہے ہیں اس میں اس لیول کے لوگوں کے لیے کوئی سزا ہی نہیں ہے۔ شناخت ہو بھی جائے کسی کی... تو کوئی ان کا کیا بگاڑ سکتا ہے اور الٹا شناخت کرنے والا پھنس جاتا ہے۔ وہ اور اس کے اہلِ خانہ کی زندگی عذاب بنا دی جاتی ہے۔ یا انہیں غائب کر دیا جاتا ہے۔" خوباں نے بھائی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"بات تو ٹھیک ہے لیکن پھر تم کیوں یہ خطرات مول لے رہی ہو۔ اگر کسی کو معلوم ہو گیا کہ تم کہاں تک پہنچ چکی ہو اور کتنے ثبوت جمع کر لیے ہیں... تو تمہارے لیے خطرات پیدا نہیں ہو جائیں گے خوباں؟ اور ویسے بھی تم ایک لڑکی ہو... تمہارے لیے پریشانیاں دگنی ہو جائیں گی۔" سعد نے اسے سمجھایا۔

"بھائی! مجھے خطروں سے خوف نہیں آتا۔ بس ایک بات پر کڑھتی رہتی ہوں کہ کاش مجھے سزا دینے کا اختیار

ہوتا... یا کم از کم ہمارے ہاں قانون بااختیار لوگوں کے ہاتھوں بکا ہوا نہ ہوتا... تو شاید میری محنت سنور جاتی۔ بس سب کچھ جان کر خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی ہوں۔ سب کچھ جان کر بھی کچھ کر نہیں سکتی۔"

"ہاں... لیکن اگر مجھے کچھ بھی ایسا معلوم ہوا... جیسا تمہیں معلوم ہے تو میں بھی خاموش نہیں بیٹھوں گا۔ گناہ گار کو سزا مل کر رہے گی..." سعد نے حتمی لہجے میں کہا۔

"سزا؟ کون دے گا یہ سزا؟ ہمارا قانون ان لوگوں کی جیب میں پڑا ہوا ہے جو بااختیار ہیں... وہ اپنی مرضی سے جسے چاہتے ہیں سزا دیتے ہیں اور جسے نہیں دینا چاہتے... اسے صاف بچا لیتے ہیں۔ چاہے وہ کتنا ہی بڑا مجرم کیوں نہ ہو۔" خوباں نے اسے حقیقت سے آگاہ کیا۔

"پھر ایسے مجرم کو سزا میں خود دوں گا۔ ایسی عبرت ناک سزا... جس کا اس نے تصور بھی نہ کیا ہو۔" سعد غصے میں تھا۔

"کول مین... کول... اتنا غصہ تمہاری صحت کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ جانے دو... وہ دیکھو میرا پروگرام شروع ہو گیا۔"

"لیکن یہ سب کچھ ہو رہا ہے... ہمارے ہی آس پاس اور ہماری ہی ناک کے نیچے اور ہم... ہم اتنے مجبور ہیں کہ سوائے دور سے تماشا دیکھنے کے... اور کچھ نہیں کر سکتے... لعنت ہے ہم پر بھی اور ہمارے جیسے سارے بے حسوں پر بھی۔" سعد واقعی طیش میں تھا۔

"بھائی! یہ کس نے کہا کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے... ہم اپنے اپنے میدان میں اپنی اپنی ذمے داریاں پوری کر لیں تو سمجھو ہم نے وہ قرض اتار دیا جو ہمیں ہمارے وطن... ہماری مٹی کا ہم پر واجب ہے۔" خوباں نے رسان سے کہا۔

"اپنی اپنی ذمے داریاں تو سب ہی نبھا رہے ہیں... ہم ایسا کریں گے تو کیا تیر مار لیں گے؟"

"دیکھو بھائی! تم ایک قانون داں ہو... عدل کرو انصاف کرو... صحیح فیصلے کرو... کسی سے ڈرے بغیر کسی سے دبے بغیر... تو تم ایک مثال بن جاؤ گے۔ اگر ہزار میں سے صرف ایک دو ہی تمہاری مثال سامنے رکھ کر تمہارے جیسے بن جائیں تو دیکھو... اس کا فیض کتنے لوگوں کو پہنچے گا۔ بدکاروں کو غداروں کو سزائیں دو... تو معاشرے سے کتنا گند صاف ہو جائے گا۔ بس یہی ملک و قوم سے محبت کا تقاضا ہے جو ادا ہو جائے گا۔" خوباں نے بھائی کو پیار سے سمجھانے کی کوشش کی تو سعد اس کی بات سنتے سنتے مسکرا دیا۔

"خوباں! یہ آگ سے کھیلنے کا شوق کب سے ہو گیا ہے تجھے... جب میں گیا تھا تب تو ایسی نہیں تھی تو۔" اس نے کہا۔

"بس کیا کہوں سوائے اس کے کہ..." کچھ شہر دے لوگ وی ظالم سن... کچھ میتوں مرن دا شوق وی سی ارے بھائی! یہی تو زندگی ہے... یہ نہ ہو تو یہ جینا بھی کوئی جینا ہے للو۔" خوباں نے فلمی ڈائیلاگ بولا اور دونوں بہن بھائی ہنسنے لگے۔ ٹی وی پر پچھلے دنوں ہونے والے کئی خودکش بم دھماکوں کے بارے میں پروگرام شروع ہو گیا تھا۔ وہ دونوں اسے دیکھنے لگے۔

☆☆☆

کافی شدید گرمی کے بعد اس دن موسم کافی خوشگوار ہو گیا تھا۔ تیز چلچلاتی دھوپ اور حبس کے بعد دن ڈھلے آسمان پر بادل چھا گئے جو گہرے سے گہرے ہوتے جا رہے تھے اور اب ٹھنڈی ہوا کے خوشگوار جھونکے بھی آنا شروع ہو گئے تھے۔ سعد کئی دن سے اپنے مستقبل کی پلاننگ میں لگا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کسی اچھے وکیل کے ساتھ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کرے... اس سلسلے میں ایک دو اچھی لاء فرم بھی اس کے ذہن میں تھیں جہاں بہت سے معروف وکلا ہوتے تھے۔

لیکن بابا کی ہدایات کچھ اور تھیں۔

"دیکھو برخوردار! 'لنکزان' سے قانون کی ڈگری لینے والا قانون داں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوتا تمہیں اپنی پیشہ ورانہ زندگی کی ابتدا بہت سوچ سمجھ کر ایسی جگہ سے کرنا چاہیے جو تمہارے شایانِ شان ہو... میں اس کوشش میں لگا ہوا ہوں کہ اٹارنی جنرل آف پاکستان کے آفس میں تمہارے لیے جگہ نکلوا سکوں۔ تھوڑے دن اور ٹھہر جاؤ... میری کچھ لوگوں سے اس سلسلے میں بات چل رہی ہے۔ جیسے ہی معاملات طے ہوتے ہیں میں تمہیں بتا دوں گا تب تک تم گھومو پھرو... آرام کرو، انجوائے کرو لائف۔"

وہ ٹیرس پر کھڑا خوشگوار موسم سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور یہ ساری باتیں اس کے ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔

"پتا نہیں بابا مجھے باندھ کر کیوں رکھنا چاہتے ہیں۔ اٹارنی جنرل کا آفس... ہونہہ... آج تک تو کچھ کیا نہیں یہاں کے لوگوں نے... اب میں اگر چلا گیا تو کیا تیر مار لوں گا۔ سوائے اس کے کہ جو کچھ پڑھا لکھا ہے صرف ڈگری کی حد تک ہی رہ جائے گا۔" اس نے بیزاری سے سر جھٹکا۔

موسم کی خوب صورتی اس کے دل سے اتر رہی تھی کیونکہ اس کے اندر کا موسم بگڑ رہا تھا اور وہ آتشِ زیرپا... ٹیرس پر ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔

اچانک کوٹھی کے پس منظر میں مرگلہ کی سبز پہاڑیوں پر چھائے گہرے سیاہ بادلوں میں بجلی کا ایک زوردار کوندا لپکا اور وہ ابھی اس طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ بادلوں کی ہولناک گرج نے اسے کچھ دہلا سا دیا۔ یوں لگا جیسے موٹے شیشے کی کوئی بڑی شیٹ کسی چوٹ سے دور تک تڑختی چلی گئی ہو۔

ادھر دیکھتے ہوئے اس کی نظر کوٹھی کے پچھلے حصے میں واقع بابا کے آفس اور گیسٹ ہاؤس پر پڑی... گہرے بادلوں کے سبب چھا جانے والی تاریکی کی وجہ سے اس حصے میں روشنیاں جلا دی گئی تھیں... اور اسی وقت آفس کا دروازہ کھلا اور وہاں سے مولانا جبار باہر نکلے۔ ان کے ساتھ بابا بھی باہر آئے۔ پیچھے پیچھے فیضان بھی تھا۔ مولانا جبار اور بابا وہاں کھڑے ہو کر بھی کچھ بات چیت کر رہے تھے۔ سعد کو ان کی آوازیں تو فاصلہ ہونے کے سبب سنائی نہیں دے رہی تھیں لیکن دونوں کے چہروں کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ دونوں کسی سنجیدہ موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر بات کرنے کے بعد وہ تیز تیز قدموں سے آگے گئے اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر خود ہی ڈرائیو کرتے ہوئے خاموشی سے چلے گئے۔

"ہیں... آج ان کا لاؤ لشکر ان کے ساتھ نہیں تھا... اکیلے آئے اور اکیلے خاموشی سے چلے گئے۔" سعد بڑبڑایا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ پولیس کی ایک گاڑی اور ایک دو موٹر سائیکلیں ہوٹر بجاتی ہوئی انہیں ریسکورٹ کرتی تھیں اور وہ بلٹ پروف جھنڈے والی گاڑی میں موو کیا کرتے تھے۔

"کچھ ان کے بارے میں پتا کرنا چاہیے آخر یہ ہیں کیا چیز... اور پاپا سے ان کے معاملات کیا ہیں... چلو خوباں کی کچھ مدد ہی ہو جائے گی اس بہانے..." سعد نے باآوازِ بلند سوچا اور اوپر سے جھانک کر دیکھا بابا بھی شاید کہیں جا رہے تھے۔

فیضان کچھ فائلیں اٹھائے ان کے پیچھے پیچھے گاڑی تک گیا تھا۔ باوردی ڈرائیور نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا تو بابا بیٹھ گئے۔ فیضان اگلی پسنجر سیٹ پر مع اپنی فائلوں کے ساتھ بیٹھے اور ان کی سیاہ مرسیڈیز باہر نکل گئی۔

وہ ٹیرس سے نیچے آیا اور لاؤنج پار کر کے کوٹھی کے پچھلے حصے کی طرف نکل آیا۔ یہ ایک طویل روش کے بعد بنا ہوا بالکل الگ ہی ونگ تھا کوٹھی کا... گہرے سرمئی چکنے چکنے پتھر روش پر پھیلے ہوئے تھے جس کے دونوں جانب خوش رنگ پھولوں کے تختے بچھے ہوئے تھے۔ وہ اس روش پر ٹہلتا ہوا آفس کے سامنے پہنچ گیا۔ آفس کا دروازہ بند تھا۔ داہنی جانب کھڑکی سے اندر جلتی ہوئی ہلکی روشنی نظر آ رہی تھی۔

سعد نے آفس کے دروازے کی ناب گھمائی تو پتا چلا کہ وہ لاک ہے۔ اسے بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا پھر اس نے گیسٹ ہاؤس کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو فوراً کھل گیا۔ وہ اندر داخل ہو کر لاؤنج میں کھڑا داہنی جانب کھڑکی اور دروازے کو دیکھ رہا تھا جو آفس میں کھلتے تھے۔

وہ اس آفس میں پہلے بھی کئی بار آ چکا تھا لیکن آج وہ اس کو کچھ الگ انداز سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا کھوجی ذہن وہاں کی ترتیب پر غور کر رہا تھا۔ لیکن سعد کی دلچسپی کی اصل چیز اس پر رکھا ہوا کمپیوٹر تھا۔ وہ سسٹم آن کر کے آرام سے چرمی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"چلو مسٹر سعد! آج تمہاری مہارت کا امتحان ہو جائے۔ کافی دن ہو گئے اسے ٹیسٹ کیے ہوئے۔ استاد ہرویش! دیکھیں آج تمہارا شاگرد تمہارے پڑھائے ہوئے سبق کو یاد رکھے ہوئے ہے یا تمہارا نام ڈبونے کا سامان کر رہا ہے۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے کی بورڈ پر انگلیاں چلائیں۔

وہ انٹرنیٹ کی دنیا میں داخل ہوا تو اندر گھستا ہی چلا گیا۔ صمد رحمن کی مختلف ناموں سے کئی فائلز بنی ہوئی تھیں اور کتنے ہی فولڈرز بھی تھے۔ ان کا ای میل ایڈریس اور مختلف لنکو اس کے سامنے تھے۔ یہ سب کسی نامعلوم کوڈ کی مدد سے کسی دوسرے کی پہنچ سے محفوظ کیے گئے تھے لیکن سعد کے لیے کوڈ کے اس بیریئر کو اڑانا بائیں ہاتھ کا کام تھا اور اس نے یہ کام کیا۔

وہ بڑی دیر تک ایک کے بعد دوسرا فولڈر اور مختلف فائلز کھول کھول کر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ان کا میل باکس کھول لیا۔ بے شمار میلز موجود تھیں لیکن وہ ان میں سے بعض میلز دیکھ کر حیران رہ گیا۔

وہ بہت مختصر... یعنی ایک یا دو جملوں میں تھیں اور کسی بہت ہی عجیب سی زبان میں تھیں۔ جو وہ نہیں پڑھ سکتا تھا۔ شاید رشین زبان... یا پھر اسی سے ملتی جلتی کوئی اور زبان... اس نے دماغ لڑانے کی کوشش کی مگر نہیں سمجھ سکا۔

اس نے جلدی سے ایک کاغذ پر وہ میلز نقل کر لی۔ اس کے بعد اس نے کئی میلز پڑھیں اور اس کے تیز ذہن نے فوراً یہ نتیجہ نکال لیا کہ یہ ساری میلز عام سی نہیں ہیں۔ ان میں سے کئی ایسی ہیں جو کچھ خفیہ اور خاص معاملات سے تعلق رکھتی ہیں لیکن یہ معاملات کیا ہیں، اس کا اندازہ وہ نہیں کر پایا۔ سعد نے دوسرا فولڈر کھولا۔

"اتنے کریڈٹ کارڈز! اور اتنی بڑی بڑی رقمیں بابا ادھر سے ادھر کرتے رہتے ہیں..." اس نے اسکرین پر نظر

دوڑاتے ہوئے کہا۔

''ایک اکیلا آدمی اتنی بڑی بڑی رقموں کی ڈیل کرتا رہا... یہ کیسے ممکن ہے... ٹھیک ہے بابا کے پاس کافی کچھ ہے... لیکن یہ سب تو کافی کچھ سے بھی بہت زیادہ ہے... کچھ نہ کچھ تو ہے... جو اس میں چھپا ہوا ہے۔''

سعد پہلے تو حیران ہو کر وہ سب کچھ دیکھتا رہا پھر اس نے مناسب یہی سمجھا کہ ان چیزوں پر اطمینان سے بیٹھ کر غور کیا جائے تو شاید یہ گورکھ دھندا سمجھ میں آجائے۔ اس نے جلدی جلدی ضروری چیزوں کے پرنٹ آؤٹ نکالے۔ ان میں کچھ ای میلز... کریڈٹ کارڈز اور بینک ٹرانزیکشن کے علاوہ بعض خفیہ اکاؤنٹس کی تفصیل والے پیجز... بعض کوڈ ورڈز میں لکھے ہوئے نوٹس... کچھ اور ضروری چیزیں۔

جلدی جلدی اس نے یہ پرنٹ آؤٹ سمیٹ کر اپنی شرٹ کے بٹن کھول کر اندر رکھے... پھر وہاں اپنی موجودگی کے تمام آثار مٹائے... یہاں تک کہ رومال سے رگڑ رگڑ کر ہر وہ جگہ بھی صاف کر دی جہاں جہاں اس نے ہاتھ لگائے تھے۔ ہر چیز کو دوبارہ اسی جگہ رکھا جہاں وہ پہلے رکھی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ گیسٹ ہاؤس والے دروازے کے دونوں جانب والے ہینڈل بھی رومال سے رگڑ ڈالے... تاکہ کبھی اس کی آمد کی خبر نہ ہو سکے۔

باہر نکلتے ہوئے کسی کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا اس لیے پردے کی جھری سے اس نے باہر جھانکا... گارڈز وغیرہ شاید کھانا کھا رہے تھے اس لیے وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ باہر نکلا اور آرام سے چلتا ہوا لاؤنج کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کچن سے خانساماں اور بٹلر کی آوازیں آرہی تھیں۔ ڈنر میں ابھی وقت تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آگیا۔ وہ ان ساری چیزوں کو اچھی طرح دیکھنا چاہتا تھا۔ اس پر غور کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ ان کاغذات میں ایک ایسا خفیہ جہان پوشیدہ ہے جس کا تعلق اس کے بابا سے ہے اور ان تمام اسرار کو جاننے کے لیے وہ بہت بے تاب تھا اور اس رات وہ دیر تک انہیں کھنگالتا رہا... اور ان سے جو نتائج اس نے اخذ کیے تھے، وہ اس کے دل و دماغ پر بجلی گرانے کے لیے کافی تھے۔ تاہم پھر بھی اسے زنجیر کی کئی کڑیاں گمشدہ ملیں اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ان گمشدہ کڑیوں کو تلاش کرے گا۔ جو کچھ بھی ان نامکمل شواہد سے اسے معلوم ہوا تھا، اس کی روشنی میں وہ یہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ اس کے بابا کا ظاہری کردار جو بھی ہے اس کے پیچھے ان کا کوئی اور کردار بھی ہے... جو پُراسرار ہے... خفیہ ہے... اور جس کے بارے میں وہ سب گھر والے بھی کچھ نہیں جانتے۔

یہ ایک ایسا خیال تھا جس نے تمام رات اس کے اعصاب میں ہلچل مچائے رکھی۔ اور اب اس پر ایک عجیب سا اضمحلال طاری تھا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں نیند کے بجائے سوچ و فکر کی پرچھائیاں تھیں... یہاں تک کہ صبح کی ہلکی سفیدی نے اسے احساس دلایا کہ پوری رات گزر چکی ہے اس نے ان تمام کاغذات کو ایک بڑے لفافے میں ڈال کر ایک جگہ محفوظ رکھ دیے۔

اس نے کھڑکی کا بھاری پردہ ہٹا کر باہر دیکھا، صبح کی ہلکی ہلکی روشنی میں باہر لان کا منظر اسے بہت اچھا لگا۔ وہ طبیعت کی کسلمندی دور کرنے کے لیے باہر لان میں آگیا۔ نئے دن کی ابتدا سہانی صبح سے ہو رہی تھی۔ وہ بڑی دیر تک لان میں ٹہلتا رہا۔ زندگی آہستہ آہستہ بیدار ہو رہی تھی۔ سرسبز مرگلہ کی پہاڑیوں کے پیچھے سے سورج کی کرنیں آہستہ آہستہ باہر آرہی تھیں اور ماحول روشن ہوتا جا رہا تھا۔ پھر وہ دوڑتا دوڑتا سوئمنگ پول پر پہنچا اور ڈائیونگ بورڈ سے اس میں چھلانگ لگا دی۔ پول میں نہانے سے ایک نہایت فرحت بخش سا احساس ہوا۔ وہ کافی دیر سوئمنگ کرتا رہا پھر ناشتے کا وقت ہو رہا تھا تو وہ اندر آگیا۔

کپڑے بدل کر جب وہ لاؤنج میں پہنچا تو سب کچھ اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔

فرزانہ ایک ایک کو آواز دے کر بلا رہی تھیں۔ خوباں اور تاباں تو ناشتے پر پہنچ چکی تھیں۔ آخر میں پہنچنے والا وہی تھا۔ تاباں اور خوباں کو جانا تھا۔ وہ جلدی جلدی ناشتا ختم کر کے چلی گئیں۔ وہ دونوں ماں بیٹے اطمینان سے بیٹھے ناشتا کرتے رہے۔ چائے پیتے رہے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔

''امی! ہمارے ننھیال کی طرف کے تو کئی رشتے دار ہیں... نانا نانی... خالہ... ماموں وغیرہ لیکن ددھیال کی طرف کا کوئی رشتے دار نہیں ہے... کیا بابا کا کوئی خاندان ہے؟ اور اگر ہے تو کیا ہم ان سے ملتے جلتے نہیں ہیں؟'' سعد نے ماں سے پوچھا۔

''نہیں بیٹا! ان کا کوئی خاندان ہی نہیں... یہ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے اور ان کے والدین اس وقت ایک ائر کریش میں ختم ہو گئے تھے جب یہ کافی چھوٹے تھے۔ ان کے والد کے ایک قریبی دوست نے ان کی سرپرستی کی تھی۔'' فرزانہ نے بتایا۔

''تو والدین کے والدین بھی نہیں تھے کیا؟'' سعد کو بڑا عجیب لگا یہ سن کر کہ اس کے بابا کا کوئی خاندان ہی نہیں۔

''دراصل ان کے والدین نے پسند سے شادی کی تھی اور دونوں کے خاندان ایک دوسرے سے پرانی دشمنی رکھتے تھے۔ اس لیے وہ دونوں طرف کے لوگوں سے چھپ چھپا کر رہتے تھے۔ نہ انہوں نے کبھی بتایا۔ نہ کسی کو معلوم کہ ان دونوں خاندان کے افراد کہاں ہیں اور کون ہیں؟'' انہوں نے وضاحت کی۔

''جب آپ کی شادی بابا سے ہوئی تو آپ کے گھر والوں نے ان سے ان کے خاندان کے بارے میں نہیں پوچھا؟'' سعد نے نہ جانے کیا سوچ کر پوچھا۔

''پوچھا تھا... اور انہوں نے یہی بتایا جو میں تمہیں بتا رہی ہوں۔'' فرزانہ نے اطمینان سے کہا۔

''اچھا۔'' سعد نے کچھ الجھتے ہوئے کہا اور خاموش ہو کر چائے کے گھونٹ لیتا رہا۔

''کیا بات ہے؟ آج بابا کے بارے میں چھان بین کیوں ہو رہی ہے؟'' فرزانہ نے مسکرا کر بیٹے سے پوچھا۔

''کچھ نہیں، بس ایسے ہی خیال آگیا تھا کہ بابا کی طرف سے ہمارا کوئی رشتے دار نہیں ہے۔ اچھا امی! میں تھوڑی دیر سونا چاہتا ہوں... رات کافی دیر میں سویا مگر پھر بھی ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی... سر کچھ بھاری بھاری سا ہو رہا ہے۔'' سعد نے اٹھتے ہوئے ماں سے کہا اور اپنے کمرے میں آگیا۔ بستر پر لیٹنے کے باوجود نیند اس کی آنکھوں میں دور دور تک نہیں تھی۔ وہ سوچتا رہا۔

''بابا کا کوئی خاندان... کوئی پہچان... کوئی شناخت... کچھ بھی نہیں ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔ کافی دیر تک سوچنے کے بعد اس نے اس بات پر یقین کر لیا کہ وہ صمد رحمٰن کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ اپنے شکوک و شبہات کی روشنی میں اسے اپنے بابا کا وجود پُراسرار اور بھیدوں بھرا لگنے لگا۔

''مجھے ان کے بارے میں کافی کچھ جاننا پڑے گا اور وہ بھی اس طرح کہ انہیں ذرا سا بھی شک نہ ہو کہ مجھے ان پر کچھ شک ہونے لگا ہے۔'' اس نے سوچ کر سر ہلایا اور کروٹ لے کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

''اوہ... سعد رحمٰن... آؤ بھی آؤ...'' پروفیسر غوری نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر ہاتھ ملایا۔

سعد نے پروفیسر سے فون پر ملنے کا ٹائم لیا تھا اور ان سے ملنے آگیا تھا۔

''سر! آپ کے کیسے مزاج ہیں؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پروفیسر غوری کو دیکھا۔ اس نے قائداعظم یونیورسٹی سے پڑھا تھا اور پروفیسر غوری سے اس کی کافی اچھی سلام دعا تھی۔

''ارے بھئی! ان پانچ چھ سالوں میں ہم میں کیا تبدیلی آنی ہے۔ بس یہ ہے کہ ریٹائرمنٹ کا مرحلہ اور نزدیک آگیا ہے۔ تم سناؤ... کیا احوال ہیں... کیا کر رہے ہو آج کل...؟'' انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''بس سر! لاء پڑھ کر آیا ہوں۔ اور آج کل میں پریکٹس شروع کرنے کا ارادہ ہے۔'' اس نے بتایا۔

پروفیسر غوری ماہرِ لسانیات تھے اور دنیا کی کئی زبانوں پر اتھارٹی رکھتے تھے۔ سعد نے جب یونیورسٹی چھوڑی تھی تو وہ قدیم مصری زبان پر کچھ تحقیق کر رہے تھے۔ اس نے اسی بارے میں پروفیسر سے پوچھا۔

''سر! وہ قدیم مصری زبان کی تحقیق کہاں تک پہنچی؟''

''ہاں، وہ اس پر کافی کام کیا میں نے... بلکہ اسی سلسلے میں مصر کا ایک چکر بھی لگایا۔ پھر کتاب بھی لکھی اس موضوع پر۔'' انہوں نے تفصیل بتائی۔

''آج کل کیا مشغلہ ہے؟'' سعد نے پوچھا۔

''بس آج کل بھی کچھ ایسا ہی کام چل رہا ہے۔ آج کل میں آسمانی کتابوں کی زبان پر کام کر رہا ہوں۔'' انہوں نے بتایا۔

''سر! دراصل مجھے آپ کی تھوڑی سی مدد کی ضرورت ہے۔ آپ بے شمار زبانیں جانتے ہیں۔ میں آپ کو یہ تحریر دکھا کر پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ کون سی زبان ہے اور جو کچھ لکھا ہوا ہے اس کا کیا مطلب ہے۔'' سعد نے کاغذ کا وہ پرزہ پروفیسر کے سامنے رکھتے ہوئے کہا جو اس نے بابا کی ایک میل سے نقل کیا تھا۔

پروفیسر غوری نے چشمہ آنکھوں پر درست کرتے ہوئے تحریر پر نظر دوڑائی۔

''ارے بھئی! یہ عبرانی زبان ہے۔ اسے ہیبرو بھی کہا جاتا ہے۔ توریت کی زبان تھی یہ... ہزاروں سال کی مدت گزر جانے پر یہ مردہ ہو گئی تھی... مردہ سمجھتے ہو نا... وہ زبان جو اب دنیا میں نہ کہیں بولی جاتی ہو اور نہ سمجھی جاتی ہو۔ اسے مردہ زبان کہا جاتا ہے۔ لیکن یہودیوں کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے اپنی اس کھوئی ہوئی مردہ زبان کو دوبارہ زندہ کر لیا۔ اب عبرانی زبان اسرائیل کی قومی زبان ہے۔ ان کے ہاں یہی سرکاری، دفتری اور تعلیمی زبان ہے۔'' پروفیسر نے تفصیل بتائی تو سعد حیران تھا۔

''یہ عبرانی زبان ہے... اسرائیل کی زبان؟'' اس

نے حیران ہو کر پوچھا۔
"ہاں بھئی... سو فیصد یہ وہی زبان ہے اور یہ جو تحریر اس کاغذ پر لکھی ہوئی ہے، اس کا مطلب بھی میں تمہیں بتاتا ہوں۔" پروفیسر نے میز کی دراز کھول کر ایک موٹی سی ڈائری نکالی اور لفظوں کو کاغذی تحریر سے ملاتے ہوئے کچھ سوچا پھر بولے۔ "ون ملین ڈالر کی رقم تمہارے اکاؤنٹ میں بھیجی جا چکی ہے۔ ہفتے سے پہلے پہلے ٹاسک مکمل ہو جانا چاہیے۔" بس یہی دو جملے لکھے ہوئے ہیں۔ ویسے ایک بات بتاؤ... یہ تحریر تمہیں ملی کہاں سے؟" پروفیسر نے سوچ میں ڈوبے ہوئے سعد کو گڑبڑا دیا۔
"جی... جی وہ سر... میں ایک انگلش ناول پڑھ رہا تھا اس میں ایک کردار کی اپنی زبان میں کچھ جملے اس ناول میں لکھے ہوئے تھے تو مجھے کچھ تجسس ہوا کہ آخر یہ ہے کون سی زبان... آپ سے ملنے تو آنا تھا مجھے... میں نے سوچا چلو اس بارے میں بھی آپ سے پوچھ لوں۔ صرف اپنی دلچسپی اور معلومات کے لیے۔" سعد نے بات بنائی لیکن اسے لگا کہ پروفیسر کی آنکھوں میں کچھ شک و شبے کی سی پرچھائیاں جھانک رہی ہیں۔
"ویسے سر! یہ کتنی حیرت ناک بات ہے کہ ہزاروں سال پرانی اس مردہ زبان کو نہ صرف زندہ کر لیا گیا بلکہ ملک کا سارا نظم و نسق چلانے کے لیے اسی زبان کو استعمال بھی کیا جانے لگا۔" سعد نے پروفیسر کے ذہن کو موڑنے کی کوشش کی۔
"ہاں، وہ دشمن سہی... مگر یہ ماننا پڑے گا کہ یہ ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اب اسرائیل میں وہ لوگ ہیبرو ہی بولتے ہیں۔ یہی لکھتے اور پڑھتے بھی ہیں۔" پروفیسر نے بتایا۔
"واؤ... سر! اب تو مجھے بھی اس میں دلچسپی پیدا ہونے لگی ہے کہ آخر کیا خاص بات ہے اس زبان میں... کیا میں سیکھ سکتا ہوں؟" سعد نے نہ جانے کیا سوچ کر پروفیسر کے سامنے اپنی خواہش ظاہر کی۔
"اگر تمہیں دلچسپی ہے تو ضرور سیکھو... لیکن یہ ان کی مقدس کتاب کی زبان ہے اور انہوں نے اسی لیے اسے نئے سرے سے سیکھا ہے... کیا تمہیں اپنی مقدس کتاب کی زبان آتی ہے؟" پروفیسر نے چشمے کے اوپر سے جھانکتے ہوئے سعد سے پوچھا تو اسے کچھ شرمندگی ہوئی۔
"نو سر! میں عربی زبان نہیں جانتا۔" اس نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔
"کوئی بات نہیں... اگر عربی بھی سیکھو تو بہت اچھی بات ہے۔ کوئی بھی زبان سیکھنا کوئی بری بات نہیں ہے۔ تمہیں اگر ہیبرو سیکھنے میں دلچسپی ہے تو میں جس حد تک ممکن ہو سکا، تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔" پروفیسر نے سادہ سے انداز میں کہا۔
"تھینکس آ لاٹ سر! میں آپ کے پاس پھر آؤں گا۔ فی الحال اجازت... اللہ حافظ۔" سعد ان سے ہاتھ ملا کر باہر نکل آیا۔ اس کے دماغ میں وہ دو جملے چبھ رہے تھے جو پروفیسر نے اس عبرانی تحریر کا ترجمہ کر کے بتائے تھے۔ وہ مسلسل اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

ون ملین ڈالر کی رقم جس ٹاسک کے لیے بھیجی جائے... وہ ٹاسک کیا ہو سکتا ہے؟ اور پھر بابا کے اکاؤنٹ میں وہ رقم کس نے بھیجی ہے؟ انہیں کون سا ٹاسک دیا گیا ہے؟ یہ ایسے سوالات تھے جو مسلسل اس کے ذہن میں ہلچل مچا رہے تھے اور اسے ان کا کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔

راستے بھر وہ سوچتا رہا اور گھر پہنچنے تک اس فیصلے پر پہنچ گیا کہ اسے خاموشی سے ہی معلومات حاصل کرنا ہوں گی۔ بابا کے آس پاس جو پُراسراریت کا غبار چھایا ہوا ہے، اس میں گھسنا ہی پڑے گا تب ہی معلوم ہو سکے گا کہ یہاں ہو کیا رہا ہے؟
یہ سب سوچتے ہوئے وہ گاڑی سے اتر کر تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ دل پر کچھ عجب یاسیت سی چھا رہی تھی۔ وہ جوتے اتارے بغیر بیڈ پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے شکوک اسے ڈرا رہے تھے اور اسے صاف لگ رہا تھا کہ اگر خدانخواستہ اس کے شکوک میں سے پانچ فیصد بھی درست ثابت ہوئے تو شاید اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگا۔
اگر بابا پر کوئی الزام ثابت ہو گیا۔ تو وہ کیا کرے گا؟ کیا وہ انہیں قانون کے حوالے کر سکے گا؟
"نہیں... شاید یہ میرے لیے ممکن نہیں ہوگا۔" اس کی نظروں کے سامنے اس کی دونوں بہنوں اور امی کا چہرہ آ گیا پھر کیا ہوگا؟ "یا اللہ! میرے شکوک و شبہات کو غلط ثابت کر دینا۔ باپ بیٹے کے آمنے سامنے کھڑے ہو جانے کے مشکل لمحے کو وقت کی فہرست سے نکال دینا میرے مولا... اس کے اندر شدید کشمکش اور توڑ پھوڑ سی مچی ہوئی تھی اور یہ کیفیت اتنی شدید تھی کہ وہ نڈھال سا ہوا جا رہا تھا آخرکار اس کے اندر کی کشمکش نے اس کے دل میں اتنا گداز پیدا کر دیا کہ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ایسے میں ہی مہربان نیند نے اس کی بے چین طبیعت کو کچھ دیر کے لیے سلا دیا۔ وہ اسی طرح بیڈ پر آڑا ترچھا لیٹا سو گیا۔
جانے کتنی دیر تک سویا ہوگا کہ ٹیلی فون کی مسلسل بجتی گھنٹی

سے اس کی آنکھ کھلی... اس نے کسلمندی سے آنکھیں کھول کر نمبر دیکھا، وہ اس کے پرانے دوستوں میں سے ایک کا تھا۔
"ہیلو جواد!" اس نے بھاری آواز میں بات کی۔
"کیا بات ہے یار! سو رہا تھا کیا؟" دوست نے اس کی آواز سے درست اندازہ لگایا۔
"ہاں... بول کیسے فون کیا تو نے؟"
"ارے یار! یاددہانی کے لیے فون کیا ہے، کل ٹھیک آٹھ بجے پہنچ جانا اپنے اسی پرانے ٹھکانے پر۔" جواد نے اسے یاد دلایا۔
"کون کون آ رہا ہے؟" سعد نے پوچھا۔
"ارے اپنے سارے پرانے دوستوں کو بلایا ہے میں نے... بہت دنوں بعد ایک اچھی گیدرنگ رہے گی... تجھ سے اور شمیلا سے تو کئی سالوں کے بعد ملاقات ہوگی۔ باقی ہم سب تو ہوں گے ہی۔" جواد نے تفصیل بتائی۔
"اچھا ٹھیک ہے... میں پہنچ جاؤں گا۔ وہی آبپارہ والے ریسٹورنٹ پر نا؟" سعد نے پوچھا۔
"ہاں بھئی... وہیں... ٹیبل بھی وہی بک کروائی ہے میں نے... اوکے... کل ملاقات ہوتی ہے بائے۔"
اگلے دن ساڑھے آٹھ بجے تک جب وہ وہاں پہنچا تو زبردست محفل جمی ہوئی تھی۔ یونیورسٹی کے زمانے کے سارے پرانے دوستوں کا گروپ موجود تھا۔ کئی لوگوں کی کتنے ہی سالوں کے بعد ملاقات ہو رہی تھی۔ پرانے قصے چل رہے تھے۔ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچی جا رہی تھی، ان سب کا ہلا گلا عروج پر تھا۔
سعد کو بھی ان سب سے مل کر بہت خوشی ہو رہی تھی لیکن نہ جانے کیوں اس کے ذہن پر جو بوجھ موجود تھا اس نے اس کے اندر کے شوخ اور کھلنڈرے سعد کو جیسے اپنے اندر دبوچ رکھا تھا۔
"کیا بات ہے سعد! لائٹ پوری نہیں آ رہی ہے کوئی فیوز اڑا ہوا ہے کیا؟" اس کے بے تکلف دوست حارث نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اس کے لہجے میں کچھ جھنجلاہٹ تھی مگر اس نے مسکرا کے سب کو مطمئن کر دیا۔
"یہ بات ہوئی نا۔" جواد نے خوش ہو کر کہا تو سب نے خوشی کا نعرہ مارا۔
اسی طرح کے ماحول میں وہ سب بے حد خوش و خرم دکھائی دے رہے تھے۔ سب نے ایک دوسرے کے بارے میں معلومات حاصل کی تو تقریباً سب ہی اپنی اپنی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔ کچھ اپنا بزنس چلا رہے تھے کچھ جاب کر رہے تھے اور کچھ بہت کچھ کرنے کی پلاننگ کر رہے تھے۔ اس طرح ہنستے بولتے کھاتے پیتے وقت گزرتا چلا گیا۔
"ارے یار! بارہ بج چکے ہیں... اب چلنا چاہیے کافی دیر ہو گئی ہے... اگلی گیدرنگ پندرہ دن بعد... اسی جگہ... اسی وقت ہوگی... سب کو آنا ہے... اور اس دفعہ یہ دعوت میری طرف سے ہوگی۔" حارث نے ان سب کو دوبارہ انوائٹ کیا تھا پھر وہ سب روانہ ہوتے چلے گئے۔
جواد آخر میں سعد کے ساتھ ساتھ پارکنگ کی طرف آ رہا تھا کہ سعد نے اسے مخاطب کیا۔
"یار جواد! تو نے بتایا کہ تو الیکٹرونکس گڈز سپلائر ہے۔"
"ہاں یار! میں مختلف آفسز... شاپنگ مالز... اور اداروں کو الیکٹرونکس آئٹمز سپلائی کرتا ہوں... یہی میرا بزنس ہے۔"
"اچھا، اگر مجھے ایک دو چیزیں چاہیے ہوں... تو مجھے لا کر دے سکتا ہے تو؟" سعد نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔
"کیوں نہیں... بول کیا چاہیے؟" جواد نے خوش دلی سے پوچھا۔
"مجھے کوئی ایسی ڈیوائس چاہیے جو کافی دور کی گفتگو مجھے سنا سکے۔ بلکہ ریکارڈ کر سکے... اور سب سے بڑھ کر کہ یہ کارڈلیس ہونا چاہیے... کوئی تار وار نہ ہو۔" سعد نے آہستگی سے اسے بتایا تو جواد نے چونک کر اسے دیکھا۔
"میں سمجھ رہا تھا کہ تجھے کوئی دھانسو قسم کا میوزک سسٹم یا ہوم تھیٹر ٹائپ کی کوئی چیز چاہیے ہوگی لیکن تو نے جس چیز کی فرمائش کی ہے، اس سے تو لگ رہا ہے کہ جیمز بونڈ 007 ٹائپ کی کوئی چیز بننے جا رہا ہے... خیریت ہے یہ کس کی جاسوسی کرنے کی ضرورت پڑ گئی ہے تجھے...؟" جواد نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔
"یار تجھے معلوم ہے... اپنا تو پروفیشن ہی ایسا ہے کبھی کبھی قانون دانوں کو بھی ثبوت اکٹھے کرنے کے لیے جاسوسی کی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔" سعد نے بات بنائی۔
"تجھے پتا ہے اس طرح کی چیزیں اوپن مارکیٹ میں نہیں ملتیں... ان کا بیچنا اور خریدنا دونوں غیر قانونی سمجھے جاتے ہیں۔" جواد نے اسے بتایا۔
"ہاں، مجھے اندازہ ہے... اسی لیے تو تجھ سے پوچھ رہا ہوں۔ اوپن مارکیٹ میں مل جائیں تو تجھ سے کہنے کی کیا ضرورت تھی مجھے۔" سعد نے بتایا۔
"اچھا ٹھیک ہے... میں دیکھتا ہوں شاید کسی سے مل ہی جائے۔" جواد نے سر ہلا کر کہا۔

"شاید... شاید والی بات تو کر... مجھے لازمی طور پر چاہیے... بلکہ جلد سے جلد بھی چاہیے... ورنہ... ورنہ میں تیرا جینا حرام کردوں گا... مستقل تیرے سر پر سوار رہ کر... اور ہاں ایسا ہی مجھے ایک مختصر سا مووی کیمرا بھی چاہیے۔" سعد نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

"یک نہ شد... دو شد... اچھا اچھا یار دیکھتا ہوں تو فکرمت کر... چل نکال گاڑی۔" جواد نے اشارہ کیا۔

"اور ہاں، یہ بات صرف تیرے اور میرے درمیان ہے۔ کسی سے اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" سعد نے الوداعی ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"اوکے..."

پھر وہ گھر چلا آیا۔ کافی رات ہو چکی تھی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے پچھلی کھڑکی کی بلائنڈ کھول کر دیکھا تو دور نظر آنے والے بابا کے آفس میں ابھی تک روشنیاں جل رہی تھیں۔ اس کا مطلب ہے نہ صرف وہ جاگ رہے تھے بلکہ شاید کوئی اور بھی ان کے پاس تھا کیونکہ اس نے آفس کے بند دروازے کے اوپر جلنے والی سرخ روشنی دیکھ لی تھی۔ یہ لال رنگ کی لائٹ اسی وقت روشن ہوتی تھی جب آفس میں بابا کے پاس کوئی بیٹھا ہوتا تھا اور بابا نہیں چاہتے تھے کہ اس دوران میں کوئی ان کی گفتگو میں مخل ہو۔

وہ اندھیرے کمرے میں چپ چاپ کھڑا آفس کے دروازے کو گھورتا رہا۔ اس کے دل میں شدت سے یہ خواہش بیدار ہوئی کہ کاش وہ جان سکتا کہ اس وقت بابا کے پاس کون ہے اور وہ اس سے کیا باتیں کررہے ہیں لیکن اسے معلوم تھا کہ اس نے آفس کی طرف جانے کی کوشش کی تو گارڈز اسے فوراً روک دیں گے۔ وہ کافی دیر سے کھڑا دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اچانک آفس کا دروازہ کھلتا ہوا نظر آیا اور اس نے حیران ہو کر دیکھا کہ اس دروازے سے مولانا جبار باہر آرہے تھے۔ وہ خاموشی سے نکلے تھے اور تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اپنی گاڑی میں بیٹھے اور چلے گئے۔ آج بھی وہ خود ہی ڈرائیو کررہے تھے یعنی اکیلے ہی آئے تھے۔

اتنی رات کو جبار، بابا سے کیا باتیں کرنے کے لیے آئے تھے اور پھر جس طرح وہ نکلے تھے ان کی باڈی لینگویج بتارہی تھی کہ وہ کچھ جھنجلائے ہوئے اور شاید کچھ پریشان سے بھی تھے۔ کیا معاملہ ہے... میرا خیال ہے خوباں نے مولانا کی کچھ کمزوریاں جو پکڑی ہیں... اس کی شاید انہیں خبر ہوگئی ہے... اور وہ بابا سے خوباں کی شکایت کرنے آئے ہوں۔ وہ یہی سوچتا ہوا کھڑکی سے ہٹ گیا۔

سوچ سوچ کر جب اس کا ذہن تھک گیا تو اس نے خود اپنے آپ کو تسلی دی۔

"چلو بھئی، اب طے کرلیا ہے تو معلومات کرہی لیں گے۔ پتا چل جائے گا کہ کیا ہورہا ہے۔" اس نے سوچا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ جواد نے جلد ہی اس کی مطلوبہ چیزیں اسے لاکردے دیں۔

"دیکھ بھئی، یہ جو ڈیوائس ہے اس میں سب کچھ ریکارڈ ہوجائے گا۔" جواد نے اسے سمجھایا۔

"اور کیمرا... کیمرا نہیں لایا تو؟" سعد نے اس سے پوچھا۔

"لایا ہوں یار، نہ لاتا تو تو مجھے جینے دیتا۔" اس نے اپنے بیگ کی جیبیں ٹٹولتے ہوئے ایک نسبتاً بڑے سائز کا فاؤنٹین پین اس کے حوالے کیا۔ "یہ کیمرا ہے بلکہ مووی کیمرا!"

پھر جواد نے اسے تفصیل بتائی تو سعد خوش ہوگیا۔

"تھینکس یار، مجھے بالکل ایسی ہی چیزیں چاہیے تھیں۔ تو نے میری بات بہت اچھی طرح سمجھ لی تھی۔"

"یاروں کے یار ہیں بھائی۔ دوست کو نہیں سمجھیں گے تو کسے سمجھیں گے۔ دوست خوش تو ہم بھی خوش۔" جواد نے ہنس کر کہا۔

"ہرجانہ کیا ہے ان چیزوں کا؟" سعد نے قیمت پوچھی۔

"ہرجانہ ہے دوستی، پیار، محبت اور اپنا پن۔" جواد نے بڑے اسٹائل سے کہا۔

"انارکلی کے چچے، قیمت پوچھ رہا ہوں اور تو ڈائیلاگ بول رہا ہے۔" سعد نے اسے جھاڑا۔

"یار! دوستوں میں کوئی چیز دے کر قیمت نہیں لی جاتی۔ تجھے ضرورت تھی میں لے آیا، تحفہ سمجھ لے میری طرف سے۔"

"دیکھ میں جانتا ہوں کہ یہ چیزیں اوپن مارکیٹ میں کہیں نہیں ملتیں تو نے کسی نہ کسی کے ذریعے بلیک مارکیٹ سے ہی لی ہوں گی یہ چیزیں اور اس طرح لی ہوئی چیزیں کس قدر مہنگی ہوتی ہیں مجھے بہت اچھی طرح اندازہ ہے۔ صحیح طرح ان کی قیمت بتائے گا یا پھر میں کروں تھرڈ ڈگری تیرے اوپر استعمال؟" سعد نے دونوں ہاتھوں کی دو دو انگلیاں پھیلا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ جھرجھری لیتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

سعد کیا تقریباً سارے دوستوں کو معلوم تھا کہ جواد کو اگر دور سے بھی کوئی گدگدی کرنے کا اشارہ کرے تو وہ جھرجھری لینے لگتا ہے۔ گدگدی اسے بالکل برداشت نہیں ہوتی پھر وہ کچھ دیر کاغذ پر لکھ کر حساب کتاب کرتا رہا اور بولا۔

"دیکھ بھئی، یہ سب کچھ ملا جلا کر تقریباً ڈیڑھ لاکھ کا فیگر بن رہا ہے۔"

"اوکے! یہ لے چیک ڈیڑھ لاکھ روپیز اونلی۔" سعد نے ڈیڑھ لاکھ کا چیک کاٹ کر اس کو پکڑا دیا۔

☆☆☆

اگلے دن دس بجے کے قریب وہ بابا کے آفس کی طرف گیا۔ گارڈ برآمدے میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ سعد نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے ہاتھ ہلا کر حال چال پوچھا۔

"ہاں گل زمین، کیسے ہو؟ سب ٹھیک ہے؟" گارڈ نے بھی خوش دلی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"میں ذرا لائبریری میں جارہا ہوں۔" سعد نے غیر شعوری طور پر گارڈ کو گمراہ کرنے کی کوشش کی اور آفس کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ دروازہ بند کرکے وہ کچھ دیر وہیں کھڑا سوچتا رہا کہ کیا کرے پھر کچھ سوچ کر سر ہلایا اور اپنی جیبیں ٹٹولتا ہوا آفس ٹیبل کے پیچھے گھومنے والی چرمی کرسی پر بیٹھ گیا۔ جیب سے بٹن نما مائک نکال کر ٹیبل ٹاپ کے باہر نکلے ہوئے حصے پر نیچے کی طرف چپکا دیا۔

اب اس چرمی کرسی پر بیٹھ کر بولنے والا شخص کچھ بھی بولتا، سعد اسے اپنے ریسیونگ آپریٹس پر سن سکتا تھا اور اس پر عموماً بابا ہی بیٹھتے تھے پھر یہی عمل اس نے اس کے مقابل والے حصے پر کیا یعنی بابا کے سامنے بیٹھ کر جو بھی شخص بولے گا سعد اسے بھی باآسانی سن سکے گا۔ یہ کام کرنے کے بعد وہ ملحقہ طویل وعریض لائبریری میں گھس گیا اور وہاں سے ایک موٹی سی کتاب اٹھا کر آفس سے اس طرح نکلا کہ کتاب کھول کر اس نے ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھی اور اس کے صفحات پر نظر دوڑاتا ہوا وہ آہستہ آہستہ کوٹھی کے دوسرے حصے کی طرف چلا گیا۔

اب سعد کو بے چینی سے انتظار تھا کہ کب بابا آفس میں آتے ہیں اور کب کس سے کیا بات کرتے ہیں۔ خصوصاً مولانا انعام اللہ جبار سے ان کے کس طرح کے معاملات ہیں۔

اس نے کچھ لوگوں کو آفس میں آتے دیکھا تو ریسیونگ آپریٹس کی ننھی منی سی لیڈ اپنے کان میں لگا کر اسے آن کیا۔ اسے گفتگو بالکل صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ کسی غیر ملکی کنسٹرکشن کمپنی کے ایجنٹ تھے جو اسلام آباد میں کوئی بہت بڑا شاپنگ مال تعمیر کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔

اس کے بعد آنے والے لوگوں کا تعلق اپوزیشن کی کسی جماعت سے تھا۔ یہ جماعت دشمنی کی حد تک حزب مخالف تھی مگر سعد نے حیران ہو کر سنا کہ وہ سب بابا سے بالکل اس طرح ہنستے بولتے باتیں کررہے تھے جیسے پرانے دوست ہوں۔

"کمال ہے، اسمبلی کے فلور پر تو بالکل جانی دشمنوں کی طرح لڑتے جھگڑتے ہیں اور یہاں چہرے کس قدر بدلے ہوئے ہیں۔ سیاست ہے یا منافقت۔" وہ ان کی باتیں سنتا رہا اور سوچتا رہا۔

آخر ایک دن اس نے مولانا جبار کو آتے دیکھ لیا۔ آج بھی وہ اکیلے ہی آئے تھے۔ جیسے ہی وہ بابا کے آفس میں گئے، سعد نے جلدی سے ریسیونگ آپریٹس کی پن اپنے کان میں لگائی۔

رسمی علیک سلیک کے بعد فوراً ہی مولانا کچھ اس طرح کی باتیں کرنے لگے جیسے کوئی رپورٹ سنا رہے ہوں۔

"اب دیکھیے ناصر صاحب! مہنگائی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ جو اخراجات مجھے تربیتی اداروں کے لیے دیے جاتے ہیں، وہ قطعاً ناکافی ثابت ہونے لگے ہیں۔ میں نے پچھلی مرتبہ بھی آپ سے عرض کی تھی اور آج بھی اسی پر بات کرنے آیا ہوں۔"

"مولانا! تم تو آکر میرے سامنے اپنے دکھڑے رو لیتے ہو، میں کس سے کہوں۔ مجھے تو جتنی رقم بھیجی جاتی ہے اسی میں سے مجھے سب کچھ پورا کرنا ہوتا ہے۔"

"آپ ان لوگوں سے کہیں کہ اب اتنے پیسوں میں یہ کام ممکن نہیں رہا۔ آپ کو معلوم ہے سرحدوں پر کس قدر سختی ہوگئی ہے۔ دھماکا خیز مواد اب ہر جگہ اس قدر استعمال ہورہا ہے کہ اس کی سپلائی لینے کے لیے ہر مرتبہ پہلے سے زیادہ قیمت دینا پڑ رہی ہے اور پھر جو لوگ کیریئر ہیں ان کی بھی ڈیمانڈز بڑھ گئی ہیں۔ اب وہ خالی خولی جذباتی باتوں سے قابو نہیں آتے۔ ان کو بھی ٹھیک ٹھاک بے منت کرنا پڑتی ہے۔ کوئی بھی اپنی جان خالی باتوں کے لیے دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ ان کے پیچھے پورا خاندان ہوتا ہے جن کی ضروریات کی رقم اب وہ یکمشت مانگتے ہیں۔ پہلے ہم وعدوں پر ٹرخا دیا کرتے تھے۔ یہ سوچ کر کہ مرنے کے بعد کون آتا ہے پوچھنے کہ تم نے میرے خاندان کو میری جان کی قیمت ادا کی یا نہیں۔ نہیں صاحب! کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا ورنہ کام چلنے والا نہیں ہے۔" مولانا نے اپنی بات ختم کی۔

"اچھا اچھا کچھ نہ کچھ کرتے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ اب اگلا پروگرام کس دن ہے۔ کافی وقفہ دے دیتے ہو۔ اتنے دنوں میں لوگوں کا جوش وخروش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔" بابا کی آواز آئی۔

"اس دفعہ تو ہوجائے گا ناصر صاحب لیکن اگلا پروگرام بغیر رقم بڑھائے ممکن نہیں ہوگا کیونکہ دھماکا خیز مواد تقریباً ختم ہورہا ہے اور اتنی جلدی اس کی سپلائی بھی شاید ممکن نہ ہو۔"

مولانا نے انہیں مطلع کیا۔

”تمہیں میں نے پچھلے دنوں پچاس لاکھ دیے تھے، ان سے تم نے خریدا نہیں بارود؟“

”پچاس لاکھ کون سی بڑی رقم ہوتی ہے صاحب۔ پندرہ لاکھ تو کیریئر کو ہی دے دیے تھے پھر کچھ لوگوں کو بھی خریدنا پڑتا ہے تاکہ وہ کچھ دیر کو آنکھیں بند رکھ سکیں۔“ مولانا نے کچھ جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا تو صمد صاحب نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔

”یہ نہ کہو جبار، مجھے معلوم ہے لاہور میں کوٹھی بن رہی ہے تمہاری پورے کنال پر اور ایک عدد سوئس اکاؤنٹ بھی کھل گیا ہے۔ دو پیٹرول پمپ اور ایک شاپنگ پلازا کی ملکیت میں بھی تمہارا نام شامل ہے۔“

”او ناجی میرا صرف مکان ہے۔ پیٹرول پمپ بھائی کے ہیں اور پلازہ میرے بیٹے کا ہے۔“ مولانا نے وضاحت کی۔

”ایک ہی بات ہے بھائی کا اور بیٹے کا مال بھی اپنا ہی ہوتا ہے۔ خیر میں بات کروں گا کچھ بڑھوا دوں گا لیکن تم اپنا اسائنمنٹ وقت پر تیار کیا کرو دیر نہ کیا کرو۔ مجھے پتا نہیں کہاں کہاں وضاحتیں دینی پڑتی ہیں۔“

”صمد صاحب! یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا۔ مجھے تو اب کچھ کچھ ڈر لگنے لگا ہے۔ ایجنسیاں بھی پیچھے پڑ گئی ہیں۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی آجاتا ہے پوچھ گچھ کرنے کے لیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔“ جبار کے لہجے میں خوف کی جھلک تھی۔

”ارے ہمارے ہوتے تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جو بھی تمہارے گلے پڑنے کی کوشش کرے، مجھے بتاؤ۔ یہاں ہر چیز کی ایک قیمت ہے، ہر چیز بکاؤ ہے۔ قیمت لگاؤ پیسا پھینکو دن کو رات، رات کو دن بنالو۔ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کر ڈالو۔ پیسا ہے تو نہ ڈرنے کی ضرورت ہے اور نہ گھبرانے کی۔“ یہ سنتے ہوئے سعد کے کان تک سرخ ہو گئے۔ بابا کے لہجے میں اس قدر استہزاء تھا کہ لگتا تھا کہ انہوں نے ملک اور قوم کو کبھی اپنا نہ سمجھا ہو۔ وہ غیر ہوں اور اس قوم کا مذاق اڑا رہے ہوں۔

”میں صرف اس لیے کہہ رہا ہوں صمد صاحب! کہ مجھے کچھ شبہ سا ہے کہ کچھ نامعلوم لوگ ہمارے تربیتی کیمپوں کے اردگرد منڈلاتے نظر آنے لگے ہیں۔ شاید وہ وہاں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ مولانا نے خطرے کا اظہار کیا۔

”کون لوگ ہیں اور کوئی بھی ہوں، کسی کا بھی لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ فوراً اڑا دو اور لاش غائب کر دو۔ بس مجھے اطلاع دے دینا، میں سنبھال لوں گا۔“ صمد صاحب نے کہا اور الوداعی کلمات کہہ کر جبار کو رخصت کر دیا۔

سعد نے کان سے لیڈ نکالی اور تھکے تھکے انداز میں تکیے پر سر پٹخ دیا۔ اس کی پیشانی سے پسینے کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے وجود کے اندر کچھ ایسی توڑ پھوڑ ہو رہی ہے جیسے ابھی ابھی کوئی زلزلہ اس کے اندر سے گزرا ہو۔ اس کو بابا کے کہے ہوئے الفاظ او رجملے ڈرا رہے تھے۔ ان کی مولانا سے گفتگو سے صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ جگہ جگہ ہونے والے خودکش حملے ان کی اور جبار کی گھناؤنی کاوشوں کا ثمر ہیں بلکہ صرف یہ دونوں ہی کیوں اور نہ جانے کون کون ہوگا ان کے ساتھ شامل...... یہ سوچتے سوچتے اسے خیال آیا۔

”بابا کسی اوپر والے کا ذکر کر رہے تھے۔ اس کا مطلب ہے کوئی اور ہی قوت ہے جو ان تباہ کن مقاصد کی تکمیل کے لیے رقوم فراہم کر رہی ہے۔“ اس نے زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے سوچا۔

اچانک اس کے ذہن میں ایک بجلی سی چمکی۔ اس کے ذہن میں عبرانی زبان میں بھیجی گئی ای میل کے الفاظ اور اس کا مفہوم جلنے بجھنے لگے۔

”ون ملین ڈالر کی رقم تمہارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کی جارہی ہے۔ ہفتے سے پہلے پہلے ٹاسک مکمل ہو جانا چاہیے۔“

”تو... تو... اس کا مطلب ہے کہ ان گھناؤنی سرگرمیوں کے لیے رقوم یہودی فراہم کر رہے ہیں۔ اوہ مائی گاڈ اور وہ بھی بابا کے ذریعے۔“ وہ گھبرا کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”نہیں... ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ بابا ان غیر ملکیوں کے ایجنٹ بن جائیں۔ کیسے ممکن ہے کہ وہ دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیل کر اپنے ہی ملک، اپنی ہی قوم کے دشمن بن جائیں۔ نہیں... نہیں یہ ممکن نہیں ہے۔ بالکل ممکن نہیں۔“ اس نے شاید خود کو جھوٹی تسلی سے بہلانے کی ناکام کوشش کی۔

”اگر نہیں تو جو کچھ میں نے سنا، میں نے دیکھا وہ کیا تھا؟ کیا تھا وہ؟“ وہ غصے کی زیادتی سے چلایا پھر خود ہی اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

”کیا کرنا چاہیے؟“ یہ وہ سوال تھا جو اسے واپس اپنے حواسوں میں لانے کا سبب بنا۔ ”کیا کروں میں، کس طرح یہ سب کچھ روک دوں؟ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا... مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔“ کافی دیر سوچتے رہنے کے بعد

آخر کار ایک لائحہ عمل اس کے ذہن میں آ ہی گیا۔

کسی ایک نتیجے پر پہنچ جانے کے بعد اس کے اندر کی اضطراری کیفیت کو کچھ سکون حاصل ہوا۔ اگرچہ دل اچانک پہنچنے والے صدمے کے زیرِ اثر کچھ بجھا ہوا تھا لیکن کچھ کرنے کی لگن نے اس کے اندر پھر سے زندگی بھرنا شروع کر دی تھی۔ وہ سوچتا رہا اور اپنے ارادوں اور عزم کو مضبوط کرتا رہا۔ اس نے اپنے بابا کے بارے میں سوچنا شروع کیا کہ وہ ان کے بارے میں کتنا جانتا ہے۔

ہم میں سے کبھی کسی نے بھی ان سے... ان کے بارے میں جاننے کی کوشش ہی نہیں کی... کیوں؟

اس نے اپنے آپ سے سوال کیا اور پھر خود ہی جواب دیا۔

اس لیے کہ ہوش سنبھالنے سے لے کر آج تک بابا نے اپنے اور ہمارے درمیان اتنے فاصلے رکھے... کہ ہم ان سے کبھی اس قسم کی کوئی بات کر ہی نہیں پائے... کچھ عجب سا خوف ہمارے ذہنوں پر انہوں نے مسلط کیا ہوا تھا کہ ہم بہت ضروری اور کافی اہم گفتگو کے علاوہ کوئی فالتو بات کر ہی نہیں پاتے تھے... اور وہ بھی مختصر ترین جملوں میں...

سعد کے دل میں کھوج نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔ وہ رات دن اسی کوشش میں رہنے لگا کہ کسی طرح وہ اس بات کا سراغ لگا سکے کہ بابا کی اصل حقیقت کیا ہے اور وہ یہ سب کیوں اور کس کے لیے کر رہے ہیں؟ اس نے فیصلہ کیا اور اٹھ کر لائبریری کی طرف چل دیا...

وہ لائبریری میں داخل ہوا اور سیدھا کمپیوٹر کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں کی بورڈ پر اس کی انگلیاں تیزی سے متحرک ہوئیں اور وہ ان فولڈرز اور فائلوں تک پہنچ گیا جو انتہائی خفیہ یعنی کانفیڈنشل تھیں۔ ان پر کوڈ بلکہ ڈبل کوڈ لگے ہوئے تھے جو سعد کو بالکل معلوم نہیں تھے... لیکن بھلا ہو ہر ویش کا... کہ اس نے ایسے سارے بند تالوں کو کھولنے کے لیے کھل جا سم سم جیسے چند ٹیکنیکل قسم کے جنتر منتر اسے سکھا دیے تھے اس کے لیے ان کوڈ کو توڑنا کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔

جیسے جیسے وہ فولڈرز کھول کھول کر فائلیں دیکھتا جا رہا تھا اس کے حواس، اس کے اعصاب تناؤ کی آخری شدتوں تک پہنچتے جا رہے تھے۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں اسکرین پر جمی تھیں اور وہ ذہنی دباؤ کی آخری حد پر پہنچ کر چلایا۔

”نو... نو... آئی کانٹ بلیو...“ وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر کچھ اپنے آپ کو سنبھالا اور کمپیوٹر کو جوں توں شٹ ڈاؤن کر کے وہ باہر نکلا اور سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

جانے کتنا وقت گزر گیا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے بکھرے وجود کو سمیٹا... منتشر ذہن کو تسلی دلاسے دے کر پُرسکون کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ درست سمت میں کچھ سوچ اور سمجھ سکے۔

وہ سوچتے سوچتے تھک گیا۔ کوئی حل اسے ایسا نہیں سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ نہ صرف اس سازش کو جڑ سے اکھاڑ کر تباہ و برباد کر دے بلکہ اس کے مجرموں کو... جن میں اس کے بابا بھی شامل ہیں... قرار واقعی سزا بھی دلوا سکے۔

وہ کمرے میں ٹہلتا جا رہا تھا اور گہری سوچ و فکر میں غلطاں نہ جانے کب آئینے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے عکس پر نظر پڑی تو ایک پژمردہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آئی۔

”تو یہ آپ ہیں مسٹر سعد! ایک ملک دشمن... قوم فروش کے بیٹے... لعنت ہے آپ پر... کہ سب کچھ آپ کی ناک کے نیچے ہو رہا ہے اور آپ کچھ بھی کرنے سے اپنے آپ کو مجبور پا رہے ہیں؟“

”ہاں تو کیا کروں... باپ کے خلاف کھڑا ہو بھی جاؤں... تو کیا میں انہیں ایسا کرنے سے روک سکتا ہوں کیا؟“

”یہ تو طے ہے کہ میں یہ سب ہوتے ہوئے خاموشی سے نہیں دیکھ سکتا... یعنی سب کچھ جان کر بھی ہونٹوں پر چپ کا قفل لگائے تماشائی بنا رہوں۔“

”کیوں نہ میں گمنام طریقے سے کسی ایجنسی کو خبر کر دوں... دو ایک ثبوت بھی ساتھ بھجوا دوں۔“ اس نے سوچا۔

پھر اگلے دو چار دنوں میں ہی اس نے خفیہ طریقے سے حاصل کردہ معلومات، کچھ اعداد و شمار اور کچھ ناموں کو ان کے کارناموں کے ساتھ ایک پیکٹ بنایا اور ایک معروف خفیہ ایجنسی کے نام اور پتے کے ساتھ پوسٹ کر دیا۔ اگلے دن سے ہی لاشعوری طور پر اس بات کا انتظار کرنے لگا کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔

اس کے لگائے ہوئے بگ خوب کام کر رہے تھے اور وہ اپنے کمرے میں اکثر بابا کے آفس میں ہونے والی گفتگو سنتا رہتا تھا، خواہ وہ کسی کے ساتھ روبرو... یا پھر ٹیلی فون پر ہو رہی ہو... کچھ گفتگو کے خاص حصے وہ ریکارڈ بھی کرتا رہتا تھا جو ان کے پوشیدہ کارناموں کے لیے ثبوت کے طور پر استعمال کیے جا سکتے ہوں۔

اس کا تصور بار بار اسے یہ منظر اسے دکھاتا رہتا تھا کہ بابا کے آفس کے باہر کئی سیاہ بند گاڑیاں آ کر رکی ہیں۔ اس میں سے کچھ پُراسرار سے لوگ اتر کر اندر آفس میں داخل ہوئے ہیں... تھوڑی دیر بعد وہ بابا کو گن پوائنٹ پر لے کر باہر آئے ہیں... ان کے پیچھے پیچھے کچھ لوگ سامان اور کمپیوٹر

وغیرہ بھی اٹھا کر لائے ہیں اور پھر انہی گاڑیوں میں سب لوگ واپس گئے اور جاتے جاتے آفس کو سیل کر گئے ہیں۔

لیکن ہر روز شدید خواہش کے باوجود وہ یہ منظر دیکھنے میں ناکام رہا حتیٰ کہ ایک دن اس نے اپنے خفیہ ریسیور پر ایک فون کال سنی جو کہیں سے کسی نے بابا کو کی تھی۔

”ہیلو!“ صمد رحمن کی آواز سنائی دی۔

”ہاں بھئی، پہچانوں گا کیسے نہیں... ہر مہینے اچھی خاصی رقم دیتا ہوں تمہیں اندر کی خبریں دینے کے لیے میرے پے رول پر ہو بھئی جس کو پیسا دیتا ہو... انہیں بھولا نہیں جا سکتا... خیر کہو... کوئی نہیں خبر ہے کیا میرے لیے؟“

”کیا؟ میرے بارے میں خفیہ معلومات... ارے کس نے کیا بھیج دیا ہے بھئی کچھ پتا تو چلے؟“ سعد کو یک طرفہ طور پر صرف بابا کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”گمنام ہے... اچھا... اور وہ لفافہ ہے کس کے پاس؟ ابھی تمہارے پاس ہی ہے... تو بتاؤ کیا میٹر ہے اس میں؟“

”ایسا کون سا میٹر بھیج دیا ہے بھئی جس سے میری گردن پھنسنے کے سو فیصد چانسز ہیں۔“

”اوہ نو! اچھا پھر ایسا کرو... تم وہ لفافہ میرے پاس لے کر آ جاؤ۔“

”قیمت...؟ قیمت کی کیا بات کرتے ہو... انہی کاموں کی تو ہر ماہ قیمت دیتا ہوں میں۔“ صمد رحمن کچھ جھنجلائے۔

”اچھا وہ قیمت صرف اندر کی خبروں کی ہے؟ گڈ... اور یہ لفافہ خبر نہیں ہے... بلکہ الگ چیز ہے... او کے لو بولو کیا قیمت لگاتے ہو اس کی...؟“

”ایک کروڑ روپے؟“ صمد رحمن حیرت کی زیادتی سے چلائے۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا... ایسا کوئی جن بند نہیں ہے اس لفافے میں... جس کی اتنی بڑی قیمت لگا رہے ہو تم؟“ وہ بھنائے ہوئے تھے۔

”ہم م م م... یعنی یہ میری عزت اور میری جان کی قیمت ہے... ٹھیک ہے... ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو... لیکن میں دیکھے بغیر کیسے کہہ سکتا ہوں... ہو سکتا ہے تم بلف کر رہے ہو۔“ انہوں نے غراتے ہوئے کہا لیکن لہجے میں فکر کی پرچھائیاں محسوس ہوئیں۔ وہ کچھ دیر دوسری طرف والے کی بات سنتے رہے پھر ایک دم ہی گھبرا کر بولے۔

”او کے... او کے... تم نے جتنے اقتباس پڑھ دیے ہیں... اس سے مجھے اندازہ ہو گیا... تم لفافہ لے کر آ جاؤ... ایک کروڑ تمہارے اکاؤنٹ میں پہنچ جائیں گے...“ یہ کہہ کر شاید انہوں نے فون رکھ دیا کیونکہ سعد کو آواز آنا بند ہو گئی تھی۔ سعد نے کان سے لیڈ نکال کر غصے سے بیڈ پر دے ماری۔

”کوئی فائدہ نہیں... کوئی فائدہ نہیں... یہاں سب گدھ اور بھیڑیے آپس میں ملے ہوئے ہیں... سب ایک دوسرے کو بچانے کے لیے سرگرمِ عمل ہیں... کون انصاف کرے گا... کون سزا دلوائے گا... کسی سے کچھ بھی کہنے کا کوئی فائدہ نہیں... پہلے مرحلے میں ہی شکست فاش ہو گئی مجھے، لعنت ہے۔“

”لیکن کیا مجھے ہتھیار پھینک کر بیٹھ جانا چاہیے... جو کچھ ہو رہا ہے اسے چپ چاپ کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے مجھے بھی ان میں شامل ہو جانا چاہیے۔“ وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے آپ کو دیکھنے لگا۔ اسے اپنا چہرہ بدلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ پھر وہ اپنی شکل تبدیل کر کے کسی گدھ کا عکس نظر آنے لگا۔ پھر کچھ لہروں سے سے پس منظر میں بدلتا ہوا اچانک بھیڑیا بن گیا۔

”نہیں۔“ سعد نے ڈر کر اپنے چہرے پر زور زور سے ہاتھ ملے اور آئینے کے سامنے سے ہٹ گیا۔ وہ ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا... آخر کار ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

”مجھے کچھ اور ہی کرنا ہو گا۔“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے جوتے پہنے اور کمرا چھوڑ کر گھر سے ہی نکل گیا۔ دیوانوں کی طرح اسلام آباد کی لمبی لمبی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہا... اس کا ذہنی اُبال اسے پاگل کیے دے رہا تھا۔

☆☆☆

مولانا جبار گہری سوچ میں گم تھے۔ آج کل کچھ پریشانیوں نے گھیرا ہوا تھا۔ انہیں کچھ شبہ سا ہو رہا تھا کہ کچھ نادیدہ سی آنکھیں ان کے معاملات کو دیکھ رہی ہیں۔ انہیں فکر سی لاحق ہو گئی تھی۔ اتنے میں ہی ان کا آفس منیجر کمرے میں داخل ہوا۔

”مولانا صاحب! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہیں۔“ اس نے ان کے سامنے قالین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ہاں احسان اللہ! بولو کیا بات ہے؟“ مولانا جبار نے خیالوں کو جھٹک کر اس کی طرف توجہ کی۔

”بات یہ ہے محترم کہ آپ نے حکم فرمایا تھا کہ دس سرفروشوں کا گروہ تیار کیا جائے... تین تو میں نے یہاں سے لے لیے ہیں... تین ادھر سرحد سے مل گئے ہیں... پنجاب سے اگر چار مل جائیں... تو پورے دس ہو جاتے ہیں لیکن وہاں ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ان کے پاس سے فی الحال صرف دو سرفروشوں کا بندوبست ممکن ہے... تو ایسی صورت میں اب کیا کیا جائے۔“ اس سیاہ داڑھی والے نوجوان کی چمکیلی نگاہیں مولانا جبار کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”احسان اللہ! تمہیں جب میں کوئی ذمے داری سونپتا ہوں... تو اس یقین کے ساتھ کہ تم اس ذمے داری کو پوری طرح نبھانے کے اہل ہو۔ تمہارے اس طرح کے معروضات میرے لیے حیرت انگیز ہیں۔“ مولانا نے ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات مکمل کی۔

”آپ کا یہ اعتماد میرے لیے قابلِ فخر ہے... اور میں بھی آپ کا حکم حرف بہ حرف بجا لانے میں بے حد مسرت محسوس کرتا ہوں... تاہم اس وقت اس بات کا مقصد آپ کو یہ بتانا نہیں... کہ مجھے مزید سرفروشوں کی تلاش میں مشکل پیش آ رہی ہے... بلکہ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اب یہ معاملات تھوڑے مہنگے ہو گئے ہیں... جو بجٹ اس سلسلے میں مجھے دیا جاتا ہے وہ اب قطعاً ناکافی ہونے لگا ہے۔“ احسان اللہ نے اصل بات کہی۔

”دیکھو احسان اللہ! ہماری جتنی چادر ہے۔ اتنے ہی پیر پھیلا سکتے ہیں ہم... ہمیں جو بھی چندے، صدقے اور امداد وغیرہ ملتی ہے... ہمیں اسی میں اپنے سارے اخراجات پورے کرنے ہیں۔“

”آپ بجا فرماتے ہیں... لیکن کیا کیا جائے... مہنگائی اتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ حساب نہیں ہے... صرف درس گاہ کے ڈھائی سو رہائشی طلبہ کے کچن کا خرچ اتنا زیادہ ہو گیا ہے... کہ آمدنی کا بڑا حصہ تو ان کی خوراک پر خرچ ہو جاتا ہے۔“

”تو کم کرو نا اسے... تاکہ دوسری ضروری مد کے لیے پیسے بچ سکیں۔“ مولانا کچھ جھنجلائے۔

”کیسے کم کروں؟ ہفتے میں صرف دو دن گوشت پکتا ہے... باقی دن سبزی اور دالوں سے گزارا ہوتا ہے اور اسی طرح بقیہ اخراجات ہیں۔“ احسان اللہ نے بتایا۔

”بھئی تو ہفتے میں صرف ایک دن گوشت پکواؤ... اور پھر بھی اخراجات قابو میں نہ آئیں... تو ایک دن بھی نہ پکواؤ... ناشتے میں انڈے اور مکھن کاٹ دو... دودھ کی تعداد کم کرو... ایسے چھوٹے چھوٹے اقدامات سے بہت سی بچت ہو سکتی ہے۔“ مولانا جبار نے نہایت بیدردی سے احسان اللہ کو بچت کے طریقے بتائے۔

”کپڑے روزانہ کے بجائے ہفتے میں صرف دو دن دھلواؤ... دن میں کم از کم تین گھنٹے بجلی بند رکھو... بل کم ہو جائے گا۔“

احسان اللہ حیرت سے مولانا جبار کی باتیں سنتا رہا۔

”لیکن... لیکن محترم! یہ تو بچوں کے ساتھ ظلم ہو گا۔“ اس نے بمشکل یہ احتجاجی جملہ کہا۔

”اچھا... اچھا... اگر اتنی ہمدردی ہے تمہیں ان بچوں سے... تو تم خود انتظام کرو ان کے فالتو اخراجات کا... میں اس سے زیادہ نہیں کر سکتا کچھ بھی... مجھے صرف اپنے احکامات کی تعمیل چاہیے... اور وہ بھی مکمل طور پر... دس سرفروش کا مطلب دس ہے سمجھے تم...؟“ انہوں نے غصے سے چلاتے ہوئے احسان اللہ کو جھاڑ پلائی۔

احسان اللہ کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ کر انہیں احساس ہوا کہ شاید وہ کچھ زیادہ ہی کہہ گئے ہیں۔

”دیکھو احسان اللہ! حالات پہلے کچھ اور تھے اب کچھ اور ہیں... تم جانتے ہو پہلے حالات ہمارے حق میں تھے... صرف اپنے ملک ہی نہیں بلکہ دوسرے ممالک کے لوگ بھی ہماری کوشش کو سراہتے تھے... اور ہمیں بے شمار مالی امداد ملتی تھی... لیکن اب حالات بالکل ہی ہمارے مخالف ہو گئے ہیں۔ پہلے ہمیں کھلا ہاتھ دیا جاتا تھا اور اب ہمیں چھپنا پڑتا ہے... پوشیدہ رہ کر نہ صرف اپنے آپ کو بچانا بلکہ اپنے مشن کو جاری بھی رکھنا ہے... بیرونی امداد تو اب خیال و خواب ہو گئی ہے اپنے بھی اب بہت سوچ سمجھ کر مدد کرتے ہیں... خصوصاً جب سے لوگوں کے اکاؤنٹس چیک ہونا شروع ہوئے ہیں تو بہت ہی مشکل ہو گئی ہے۔“

”لیکن اب حالات چاہے جیسے بھی ہوں... ہمیں خود اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو نہ صرف زندہ بھی رکھنا ہے... بلکہ اپنے مشن کو بھی جاری رکھنا ہے... اس لیے انہی مشکلوں میں سے اپنے راستے نکالنے ہوں گے۔“

”تم کوشش کر کے دس کی گنتی جلد سے جلد پوری کرو... مجھے اگلے جمعے کو انہیں فائنل ٹارگٹ دینا ہیں اور پھر بڑے صاحب کے سامنے پیش کرنا ہیں اور پھر روانہ کرنے کے انتظام تم کو کرنا ہوں گے۔“ انہوں نے احسان اللہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے بھی سر ہلایا اور اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔

یوں تو احسان اللہ ان کی باتیں سن کر خاموشی سے چلا گیا تھا لیکن مولانا جبار کو خوب اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی یہ خاموشی اپنے اندر خاصے شکوے شکایات رکھتی ہے۔ وہ کچھ فکرمند سے بھی ہو گئے تھے۔

”چلو کوئی بات نہیں پھر کسی وقت اس کی دل جوئی کر کے

اس کا ملال ختم کر دیں گے۔" مولانا سوچ کر مطمئن ہو گئے۔

پھر وہ اٹھے اور جیب سے چابیاں نکالتے ہوئے... فائلنگ کیبنٹ کی طرف بڑھ گئے۔ اسے کھولا اور چند موٹی موٹی فائلیں نکال کر میز پر لا کر رکھیں اور گاؤ تکیے کو کمر کے پیچھے رکھتے ہوئے آرام سے بیٹھ گئے۔

ان فائلوں میں سارا حساب کتاب لکھا ہوا تھا جو درس گاہ کے اخراجات سے متعلق تھا۔ کتنی رقم مختلف مدات میں حاصل ہوئی اور اسے کہاں کہاں خرچ کیا گیا... کچن کے اخراجات... بجلی گیس پانی اور ٹیلی فون کے بل... عملے کی تنخواہیں... وغیرہ وغیرہ... لیکن ان میں کہیں ان اخراجات کا اندراج نہیں تھا جو سرفروشوں اور ان کی عسکری تربیت پر کیے جاتے تھے ان اخراجات کا اندراج خفیہ الفاظ میں اور خفیہ رجسٹرز میں لکھا جاتا تھا۔ پھر ان تمام رجسٹرز کو بہت احتیاط سے کسی خفیہ جگہ پر رکھا جاتا تاکہ کسی کی پہنچ وہاں تک نہ ہو سکے۔ صرف مولانا ہی جانتے تھے کہ وہ حساب کتاب انہوں نے کہاں رکھا ہوا ہے۔

تھوڑی دیر وہ ان موٹے موٹے رجسٹرز پر جھکے رہے جو درس گاہ کے اخراجات سے متعلق تھے پھر آخر کار انہوں نے انہیں بڑھا دیا... اور سر اٹھا کر وال کلاک پر نظر ڈالی۔

پھر انہوں نے آفس کا دروازہ اندر سے بند کیا... کھڑکیوں پر پردے کھینچ دیے۔ اس کے بعد کتابوں کی ایک الماری کھولی اور سامنے رکھی کتابوں میں سے کچھ کو ہٹایا... پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چابی نکالی... الماری کے اوپر والے بیرونی حصے پر لکڑی میں کھدائی کر کے ایک خوب صورت بیل بنی ہوئی تھی۔ اس بیل میں پھول، پتے اور کلیوں کے گچھے سے بنے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہاتھ اوپر کر کے ایک مخصوص پھول کے ابھرے ہوئے حصے کو دبایا... تو الماری کے اس حصے میں ایک چھوٹا سا خانہ نمودار ہو گیا۔ انہوں نے اس حصے میں چابی ڈال کر گھمائی اور الماری کے ایک حصے کو پکڑ کر کھینچا تو وہ ایک دروازے کی طرح کھلتی چلی گئی اور اس کے پیچھے ایک مختصر سا لوہے کا دروازہ نمودار ہوا۔ جسے کھول کر مولانا ایک چھوٹے سے تہ خانے نما کمرے میں پہنچ گئے۔ اس میں چاروں جانب کچھ نہ کچھ موجود تھا۔ کتابیں، رجسٹر، کاغذات، کمپیوٹر اور سب سے نمایاں ایک بڑے سائز کا ٹرانسمیٹر سیٹ تھا... اس کے ساتھ کچھ ہیڈ فون اور پرانے ٹائپ کے ٹیپ ریکارڈر بھی موجود تھے۔

مولانا نے ایک شیلف سے کچھ نوٹ بکس اٹھائیں اور ایک فائل کیبنٹ سے ایک رجسٹر نکالا اور یہ چیزیں لے کر وہ واپس اپنے آفس نما کمرے میں آ گئے۔ انہوں نے نوٹ بکس اور رجسٹر کے اندراجات کو کھنگالنا شروع کیا۔ کہیں کہیں وہ اس پر پنسل سے کچھ مختصراً لکھ بھی رہے تھے۔

وہ تفکیر کے انداز میں کچھ دیر رجسٹر کو دیکھتے رہے پھر ناگوار انداز میں نفی میں سر ہلاتے رہے۔ "نہیں... کوئی گنجائش نہیں ہے... بہت کھینچ تان کر اگر نکالوں بھی تو ایک لاکھ بھی نہیں نکلتے... اور اگر یہ پیسے میں دوسروں کو بانٹ دوں... تو میرے لیے کتنا مسئلہ ہو جائے گا... میرے گھر پر جو کام جاری ہے اس کی پیمنٹ کہاں سے کروں گا۔" انہوں نے بڑبڑاتے ہوئے نفی میں سر ہلایا اور جھنجلا کر رجسٹر بند کر دیا۔

مسئلہ یہ تھا کہ انہوں نے لاہور میں جو اپنی حویلی نما کوٹھی بنوائی تھی وہ اس میں سینٹرلی ائر کنڈیشن سسٹم لگوا رہے تھے جس کے لیے اچھی خاصی رقم درکار تھی۔ کافی کام ہو چکا تھا اور اب ٹھیکیدار ان سے پیسے مانگ رہا تھا...

"تو کیا تمہیں پیسے ملتے نہیں ہیں؟ تم نے یہ سارا کام بغیر پیسوں کے کیا ہے؟" مولانا نے اسے جھاڑا۔

"نہیں حضرت! پیسے ملے ہیں لیکن آپ جانتے ہیں ابھی باقی بھی بہت ہیں..." ٹھیکیدار ان کے غصے سے متاثر نہیں ہوا۔

"تو مل جائیں گے... میں کہیں بھاگا نہیں جا رہا ہوں... تھوڑا صبر کرنے کی ضرورت ہے۔"

مولانا تو کہتے ہوئے چلے گئے لیکن غالباً ٹھیکیدار کی تسلی نہیں ہوئی۔ وہ پرخیال انداز میں انہیں دیکھتا ہوا واپس چلا گیا لیکن اگلے دن سے ان کے گھر کا کام رک گیا اور مولانا اس پریشانی میں مبتلا تھے کہ وہ کہاں سے بندوبست کریں اور اسی سلسلے میں انہوں نے صمد رحمن سے بھی گھما پھرا کر بات کی اخراجات اور مہنگائی بڑھنے کا رونا رویا۔ اپنی پریشانی کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا لیکن اس کے جواب میں صمد رحمن نے وہ تمام کارنامے مولانا کو ایک سانس میں سنا دیے جو مولانا نے اپنے خیال میں بہت خفیہ رکھے ہوئے تھے۔

"دیکھیں کیا ہوتا ہے۔" انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر وہ چیزیں سمیٹیں اور دوبارہ اپنی جگہ پہنچا کر سب کچھ پہلے جیسا کر کے وہ آفس کا دروازہ کھول کر واپس اپنی نشست پر آ گئے۔

تھوڑی دیر بعد انہوں نے گھنٹی بجائی تو ایک لڑکا اندر آیا۔

"احسان اللہ کو بلاؤ۔" انہوں نے حکم دیا تو لڑکا واپس مڑ کر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد احسان اللہ اندر داخل ہوا۔

"آؤ احسان! ادھر بیٹھو... میرے پاس۔" مولانا نے اپنے نزدیک اشارہ کیا تو وہ خاموشی سے گاؤ تکیے سے ٹکنے کے بجائے آگے ہو کر بیٹھ گیا۔

"دیکھو احسان اللہ! میں جانتا ہوں تم بہت کام کرتے ہو۔ پوری درس گاہ کا نظم و نسق جس طرح تم چلا رہے ہو وہ بہت قابلِ تحسین ہے۔ اس میں تمہاری صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ تمہاری محنت اور فرض شناسی کا بھی بہت قابلِ تعریف کردار ہے۔ جس نیک مقصد کے لیے تم یہ محنت کر رہے ہو اس کا اجر تو تمہیں اس قدر ملے گا کہ جس کا تصور بھی محال ہے۔"

مولانا جبار نے الفاظ کے شہد سے اس کے مزاج کی تلخی دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"آپ درست فرماتے ہیں۔ اجر و ثواب تو آخرت میں اعمال کے حساب کتاب کے بعد ہی طے ہوگا کہ ملتا ہے یا نہیں... لیکن فی الوقت اس دنیا میں جو کچھ مسئلے مسائل ہیں ان کا دارومدار بندوں کے ہاتھ میں ہے کہ وہ کیا کرتے ہیں میں نے آپ کے سامنے جن مسائل کا ذکر کیا تھا وہ ایسے نہیں ہیں جن سے صرفِ نظر کیا جا سکے۔"

"میں نے تمہیں بتایا تھا نا؟" مولانا کچھ کہنا چاہ رہے تھے کہ احسان اللہ نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا۔

"اگر آپ دوبارہ یہی ہدایت دینا چاہ رہے ہیں کہ میں بچوں کے کھانے پینے اور ان کی جائز ضروریات میں سے پیسے بچانے کی کوشش کروں تو میں بہت افسوس کے ساتھ عرض کروں گا کہ میں ایسا نہیں کر سکوں گا... میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس وقت بھی انہیں جتنا کھانا دیا جا رہا ہے وہ ان کی ضرورت سے کم ہے جب میں ان بچوں کو بھوک لگنے پر... بار بار نل سے منہ لگا کر پانی پی کر اپنی بھوک بہلاتے دیکھتا ہوں تو آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ مجھے کس قدر اذیت ہوتی ہے ایک ایک بچے کے پاس صرف دو دو جوڑے کپڑے ہیں... اس قدر شدید گرمی میں وہ تین چار دن ایک ہی جوڑا پہن کر کیسے رہ سکتے ہیں... آپ کا کہنا ہے کہ کم از کم تین گھنٹے کے لیے بجلی بند کر دوں... اس قدر شدت کی گرمی میں بجلی بند ہونے کا مطلب ہے سارے پنکھے بند ہو جانا... کیا یہ ان بچوں کے لیے قابلِ برداشت ہوگا... میرے خیال میں ایسا کرنا ظلم ہوگا اور میں اپنے نامۂ اعمال میں یہ سب کچھ کس طرح لکھوا لوں؟" احسان اللہ کے اندر انسانیت بول رہی تھی۔

"احسان اللہ! یہ صرف کچھ عرصے کے لیے ہے... تم اچھی طرح جانتے ہو پہلے ہماری مدد کرنے والوں کا جمِ غفیر تھا اور وہ اس قدر مالی امداد دیتے تھے کہ ہمیں کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی بلکہ اچھا خاصا بچ بھی جاتا تھا جو بینکوں میں جمع

ہو جاتا تھا مناسب وقت کے لیے... لیکن اب جب سے حالات بدلے ہیں... ہوائیں بھی ہماری مخالف ہو گئی ہیں۔ بینک اکاؤنٹس منجمد ہو گئے ہیں۔ عطیات دینے والوں کی فہرست میں سے بے شمار لوگوں کے نام کٹ گئے ہیں۔ غیر ملکوں سے آنے والی امداد تو بالکل ہی ختم ہو گئی ہے... بس جو لوگ چوری چھپے کچھ دے دیتے ہیں اسی میں ہمیں گزارا کرنا ہے... امید ہے انشاء اللہ اچھا وقت بھی ضرور آئے گا اور ہماری پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔" مولانا جبار نے احسان کے سامنے اپنی بات ماننے کے سوا کوئی راستہ نہیں چھوڑا۔

وہ کچھ دیر سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اجازت لے کر چلا گیا لیکن بڑے بھاری دل کے ساتھ... کیونکہ مولانا نے جو ذمے داری اس پر ڈالی تھی، اسے اس کا دل قبول نہیں کر رہا تھا۔ ایسا کرنے پر مجبور ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو مجرم سا محسوس کر رہا تھا۔

☆☆☆

بھری دوپہر کی اس چلچلاتی دھوپ میں گرمی کی شدت اپنے عروج پر تھی۔ آسمان پر دور دور تک بادل کا کوئی چھوٹا سا ٹکڑا بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچے راستے پر خشک مٹی باریک پاؤڈر کی طرح بچھی ہوئی تھی۔ اس پورے علاقے میں دور دور کہیں کہیں چھوٹے درخت اور بڑی جھاڑیاں نظر آتے تھے ورنہ سوائے کانٹے دار خودرو چھوٹی جھاڑیوں کے اور کچھ نہیں تھا۔

ایسے میں کچے راستے پر دور سے ایک بیل گاڑی آتی نظر آئی۔ آگے کی طرف دو دیہاتی مرد بیٹھے تھے۔ سفید کرتے اور تہ بند کے ساتھ سر پر بڑے بڑے پگڑ پہنے وہ گرمی سے پریشان نظر آ رہے تھے۔

گاڑی تھوڑی اور آگے آئی تو پیچھے کی طرف دو عورتیں بھی بیٹھی نظر آ گئیں۔ دونوں نے گہرے رنگوں کے خوب گھیر دار لہنگے اور بڑے بڑے دوپٹے اوڑھے ہوئے تھے۔ دیہاتی قسم کا موٹا موٹا زیور بھی ان کی کلائیوں، پیروں اور گلے میں نظر آ رہا تھا۔

درس گاہ کی بڑی سی عمارت کو دیکھ کر گاڑی بان نے بیلوں کو چمکار کر اشارہ کیا اور وہ رک گئے۔

اتفاق سے اسی وقت احسان اللہ وہاں سے گزر رہا تھا۔ وہ دیہاتی مرد کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر رک گیا۔

"اے بھائیا! ہم مسافر ہیں... میری بھابھو بہت بیمار ہے۔ ہم اس کو لے کر جا رہے تھے... پر ہمارا پینے کا پانی ختم ہو گیا ہے۔ گرمی بہت زیادہ ہے نا... اب گرمی اور

پیاس سے اس کی حالت کھراب ہورہی ہے... اگر اجاجت ہو تو ہم تھوڑی دیر ادھر چھائیں میں بیٹھ جاویں... اور تھوڑا پانی بھی مل جاوے پینے کے واسطے...'' دیہاتی نے اپنی حالت بتائی تو وہ اس کا چہرہ اور کپڑے پسینے میں شرابور دیکھ کر سمجھ گیا کہ واقعی یہ لوگ گرمی کی شدت سے نڈھال اور بھوکے پیاسے ہیں۔

''ہاں آجاؤ اندر... یہ سامنے برآمدہ ہے... یہاں پنکھا چل رہا ہے۔ یہاں آکر بیٹھ جاؤ... میں پانی لے کر آتا ہوں۔'' احسان اللہ نے انہیں اجازت دیتے ہوئے کہا۔

وہ چاروں ٹھیٹ دیہاتی انداز میں زمین پر پاؤں پسار کر بیٹھ گئے۔ عورتوں نے اپنے دوپٹے سر پر لے کر آگے ماتھے تک کھینچے ہوئے تھے اور ذرا سا ہاتھ پاؤں ہلانے میں ان کے موٹے موٹے زیور بج اٹھتے تھے۔

''اُف توبات توڑے... میں تو مرنے لگی تھی گرمی کے مارے... شکر ہے کہ پہنچ گئے۔'' ایک عورت نے دوپٹے کی اوٹ سے جھانکتے ہوئے دوسرے مرد سے کہا تو وہ مسکرا دیا۔

''محترمہ! انویسٹی گیٹو رپورٹنگ اتنی آسان نہیں ہوتی۔ جان پر کھیلنا پڑتا ہے... اب یہاں تک پہنچ تو گئے ہیں یہ بتاؤ... تمہارے اوزار و ہتھیار تو تیار ہیں نا... فوٹوگرافی اور ریکارڈنگ کے لیے؟'' اس نے پوچھا۔

''آف کورس تیار ہیں... یہ دیکھو یہ کیمرا...اس نے گلے میں پڑے ہوئے موٹے موٹے منکوں کے ہار کو ہاتھ سے اٹھا کر دکھایا جس کے بیچ میں ایک گول سجا ہوا آئینہ سا لگا ہوا تھا جو اس ہار کا ایک خوب صورت حصہ لگ رہا تھا۔

''اچھا اچھا... وہ آدمی آرہا ہے... ہوشیار۔'' مرد نے اشارہ کرتے ہوئے آہستہ سے کہا اور پگڑی کے پلو سے اپنا سانولا چہرہ پونچھنے لگا۔

''یہ لو بھائی پانی...'' احسان اللہ نے ٹھنڈے پانی سے بھرا ہوا اسٹیل کا ایک جگ اور دو اسٹیل کے گلاس ان کے پاس رکھتے ہوئے کہا۔

''اے بھائیا! اتنے تھوڑے پانی میں ہمارا گجارہ کیسے ہووے گا؟''

''لڑکا اور لے کر آرہا ہے پانی... آپ بے فکر ہو کر بیٹھو۔'' احسان اللہ نے مسکراتے ہوئے اسے بتایا۔

''اتنے میں دوسری یہاتی عورت جو کچھ نڈھال سی پڑی ہوئی تھی اچانک ابکائیاں لینے لگی۔ دوسری عورت نے پریشان ہو کر احسان اللہ سے کہا۔

''اے بھائیا! ادھر کوئی گسل کھانہ ہے کیا... بھابو کو الٹیاں آرہی ہیں۔''

''ہاں... یہ سامنے بچوں کے کمرے ہیں... اسی میں غسل خانے بھی ہیں۔ آپ انہیں ادھر لے جائیں۔''

یہ سن کر اس نے دوسری عورت کو سہارا دے کر اٹھایا اور تیزی سے کمرے کی طرف لے گئی۔ کمرے میں داخل ہو کر ان دونوں نے ایک جگہ رک کر ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا۔

''چلو... جلدی کرو... ہری اَپ۔'' اور وہ دونوں عورتیں اپنے موٹے منکوں کے ہار میں چھپائے ہوئے کیمروں سے کمرے کے اندر اور پچھلی کھڑکیوں سے باہر نظر آنے والے چند خیموں پر مشتمل کیمپ کی تصاویر بنانے لگیں۔ ان کے پاس مووی اور اسٹیل دونوں کیمرے تھے۔

''اس کیمپ کو زوم کر کے فوکس کرو زینی!'' ایک نے دوسری کو ہدایات دیں اور خود بھی بڑی مہارت سے اپنا کام کرتی رہی پھر جلد ہی ان دونوں نے اپنا کام ختم کرلیا۔

''چلو ڈرامے باز... ابھی دوسرے ایکٹ بھی باقی ہیں۔'' دوسری نے ہنس کر کہا تو پہلے والی نے مسکراتے ہوئے پھر دوپٹا سر پر لے کر آگے ماتھے تک کھینچ لیا اور پھر اسی گری گری حالت میں دوسری کے سہارے چلتی ہوئی کمرے سے باہر آگئیں۔

برآمدے میں ان کے ساتھی مردوں نے احسان اللہ کو باتوں میں لگایا ہوا تھا۔ وہ دونوں دوبارہ وہیں آکر بیٹھ گئیں۔

''اے بھائیا! ادھر بڑے نیک لوگ رہوے ہیں۔ اللہ کا پاک کلام پڑھنے والے۔ نماج پڑھنے والے۔ ماری بھابو کو نیک لوگوں سے پاک کلام کی ہوا دلوا دو... اس کی بیماری ٹھیک ہوجاوے گی۔''

ایک عورت نے سامنے بیٹھے اپنے مرد کو آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے احسان اللہ سے کہا۔

''ہا بھائیا! ماہرے گھروالی کو کچھ پھائیدہ ہوجاوے گا۔ ماری ارجی مان لو بھائیا...'' مرد نے بھی عرض کیا۔

''اچھا... میں پڑھ کر پھونک دیتا ہوں۔'' احسان اللہ نے ان کی بات رکھنے کے لیے کہا۔

''ارے نہ بھائیا... تو اکلا پڑھے تو اتنا اثر نہ ہووے... ادھ بہوت سارے جنے کلام پڑھیں... جوان سب کی دعا اور سب کے کلام کی ہوا مل جاوے... تو شاید اس کا بیڑا پار ہوجاوے... تو بس اتی مہربانی کر... ان سب کو راجی کرلے... ما اپنی جنانی کو لے آوں ادھر۔'' مرد نے ہاتھ جوڑ کر اس طرح کہا کہ احسان اللہ کو انکار کرتے نہ بنی۔

وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا اٹھ کر چلا گیا اور سوچتا رہا۔

''یہ سادہ دل سادہ لوح دیہاتی کیسا پختہ یقین رکھتے ہیں کہ کلام اللہ میں اثر ہے اور ان کو اس سے شفا ملے گی... چلو اچھا ہے... تھوڑی تسلی ہوجائے گی۔''

تھوڑی ہی دیر میں وہ چاروں اس بڑے سے ہال کے دروازے کے قریب ہی زمین پر بیٹھے تھے جہاں بے شمار مختلف کمروں کے طلبہ باآوازِ بلند قرآن پڑھ رہے تھے کچھ حفظ کررہے تھے اور کچھ ناظرہ۔

کچھ ہی دیر میں شاید زوال کا وقت ہونے والا تھا تو ان کے پڑھنے کا سلسلہ موقوف کردیا گیا اور ایک باریش نوجوان نے طلبہ کو ہدایت کی کہ وہ اپنی ایک بیمار بہن پر کلام شفا پڑھ کر پھونک دیں اور ان کی صحت یابی کے لیے دعا کریں۔

چنانچہ تمام طلبہ نے ایسا ہی کیا۔

پھر ان بچوں کے دوپہر کے کھانے کا وقت ہوگیا تھا۔ طویل برآمدوں میں چٹائیوں پر لمبے لمبے دسترخوان بچھائے گئے تھے تمام طلبہ بھاگ بھاگ کر دسترخوان کی دونوں جانب بیٹھ گئے۔ اور کچھ بڑی عمر کے طلبہ ہاتھوں میں اسٹیل کی بالٹیاں اور ٹوکرے لے کر برآمد ہوئے اور ایک سب کی پلیٹوں میں دو دو چمچے دال ڈال کر آگے بڑھ رہا تھا تو دوسرا ٹوکرے میں سے تندور کی دو دو روٹیاں ان کے ہاتھوں میں تھماتا جارہا تھا۔

انہوں نے دیکھا کہ دال اتنی پتلی تھی کہ لگتا تھا پانی میں چند دال کے دانے تیر رہے ہوں... اور روٹی کا رنگ اس طرح مٹیالا سا تھا جیسے گندم کو مٹی کنکروں سمیت پیس دیا گیا ہو... مگر وہ بچے شاید بھوک سے اس قدر بے تاب تھے کہ اس کھانے کو بھی وہ اس طرح بے صبری سے کھا رہے تھے جیسے دنیا میں اس سے بڑی کوئی اور نعمت نہ ہو۔

اب تھوڑی دیر بعد انہوں نے دیکھا کہ کچھ بچوں نے جلدی جلدی کھا کر اپنی روٹیاں ختم کرلیں تو انہوں نے ان سے چھین چھین کر کھانا شروع کردیں جن کے ہاتھ میں ابھی روٹیاں تھیں... اور اس چھین جھپٹ کا نتیجہ مارکٹائی کی شکل میں نکلنے لگا تو ایک باریش شخص ہاتھ میں لمبی اور مضبوط چھڑی لے کر کسی کمرے سے باہر برآمدے میں آیا اور اس نے لڑنے جھگڑنے والے لڑکوں کی بیدردی سے دھنائی شروع کردی۔

جس لڑکے کی کمر یا کاندھے یا ہاتھ پر وہ ضرب پڑتی وہ تڑپ کر بری طرح اچھل کر گرتا اور چیخ مارتا تھا۔ تھوڑی دیر میں کئی لڑکے برآمدے کے فرش پر لوٹ پوٹ ہورہے تھے اور وہ شخص انتہائی بے رحمی سے انہیں جانوروں کی طرح پیٹ رہا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ اس شخص کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ اور بھیانک ہورہا تھا... منہ سے جھاگ نکل رہے تھے اور جیسے جیسے بچوں کی چیخیں بڑھ رہی تھیں، اس کے مارنے کا جنون بھی بڑھتا جارہا تھا... یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے ہوش حواس میں ہی نہیں ہے۔

اچانک ایک نئی بات ہوئی سب بچے صرف پٹ رہے تھے یا اپنے آپ کو چھڑی کی ضرب سے بچانے کی حتی الامکان کوشش کررہے تھے لیکن ایک بڑی عمر کے طالب علم نے پٹتے پٹتے اچانک پلٹ کر اس شخص کی چھڑی کو اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑلیا۔

''چھوڑ... چھوڑ بدبخت... کیوں اپنی جان کا دشمن ہوا ہے... چھوڑ۔'' یہ کہہ کر انہوں نے لاکھ زور لگایا لیکن اس لڑکے نے چھڑی نہیں چھوڑی اور وہ چھڑی پکڑے اس شخص کو کینہ توز نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر جب اس استاد نے چھڑی چھڑانے کی کوشش ترک کردی تو لڑکے نے ایک جھٹکے سے چھڑی ان سے چھینی اور دونوں سرے پکڑ کر زور سے اپنے گھٹنے پر مار کر اس مضبوط چھڑی کے دو ٹکڑے کردیے اور انہیں غصے میں اچھال کر دور پھینک دیا۔

استاد کی آنکھوں میں ایک لمحے کو خوف جھلکا۔ پھر انہوں نے کچھ لوگوں کے نام لے کر زور زور سے آوازیں دیں اور جب وہ آگئے تو اس نے اس لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں حکم دیا۔

''اس باغی، نافرمان اور بدتمیز کو زنجیریں پہناؤ... پھر میں دیکھتا ہوں، یہ کیسے گستاخی کرتا ہے؟''

وہ تین چار آدمی اسے پکڑنے کو آگے بڑھے تو اس نے ان کے بھی ہاتھ جھٹک دیے اور خود اس سمت بڑھ گیا جدھر سے وہ لوگ آئے تھے۔

کھانا کھانے والے بچے یکلخت سہم کر بالکل خاموش ہوگئے پھر وہ سب خاموشی سے اٹھے اور سامنے بنے ہوئے وضوخانوں پر جا کر وضو کرنے لگے۔ غالباً ظہر کی تیاری تھی۔

ان لوگوں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کیمرے کی آنکھوں کو بھی دکھایا۔ اپنے کانوں سے سنا اور ٹیپ ریکارڈر کو بھی سنوایا۔

اچانک اس خاموشی میں اس عورت کی آواز گونجی۔

''ہائے ہائے... کیسے بچے ہی یہ بھائیا؟ استاد کی عجت کرنی نہ جانیں... کیا ہے جو جرا سا مار لیا۔ کلام پاک بھی تو پڑھاویں ہیں... لو بتاؤ... استاد کے ہاتھ سے مولا بخش چھین کر توڑ ڈالا... چچ چچ چچ... جانیں نہ... استاد کی کیا عجت ہووے ہے... کیا مکام ہووے۔'' وہ آگے بڑھ کر

استاد کے قریب پہنچی۔

"را استاد بھائیا! مارا بڑا جی چاوے... ما اس چھوکرے کو سمجھا کے تمہارے پاس لاؤں... وہ تمھارے پیر چھو کے تمھارے سے ماپھی مانگے... دیکھ بھائیا... انکار نہ کریو... عورت جات اچھی طرح جانے ہے کہ بچوں کو کیسے سمجھا سکت ہیں... ہم کو اس کے پاس جانے دے... پھر دیکھ... وہ کیسے نہ ماپھی مانگے تمھارے پیر چھو کے... بس ایک بار مارے کو اجاجت دے دو... اس کے پاس جانے کی۔"

اس نے اپنا دوپٹا چہرے سے ہٹا کر استاد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ ایسے انداز سے کہا کہ استاد صاحب گم صم سے ہو گئے۔ ان کے چاروں طرف وہ سرمہ بھری موٹی موٹی آنکھیں پلکوں کے جھلارے لیے چھا گئیں... وہ دم بخود کھڑے اس کی بات سن تو رہے تھے لیکن معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ کیا بول رہی ہے... بس وہ تو اس کی آنکھوں سے کچھ ایسے ٹرانس میں آ گئے تھے کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر سے ہو گئے۔

ایسے میں ہی اس نے نہ جانے کیا کہہ کر اثبات میں سر ہلایا تو ان کا سر بھی بے اختیار اثبات میں ہل گیا۔

"چل رہے چل بھائیا! استاد جی نے اجاجت دے دی۔ مارے کو لے چل اس لڑکے کے پاس۔"

اس دیہاتی عورت نے اس آدمی کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا جو ان لوگوں میں شامل تھا جو لڑکے کو اندر کہیں لے کر گئے تھے۔

"لو... ہو گیا بیڑا غرق ان کا..." عورت کو جاتے دیکھ کر دیہاتی مرد نے زیرِ لب بڑبڑا کر کہا تو گھونگھٹ میں چھپی دوسری عورت نے ہونٹوں پر پھیلنے والی اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کو آنچل سے چھپا لیا۔

وہ اس ہٹے کٹے شخص کے پیچھے چلتی ہوئی ایک نیم تاریک، سیلن زدہ سے کمرے میں داخل ہوئی۔ تو پہلے تو یکدم اندھیرے میں آنے سے اسے کچھ دکھائی ہی نہیں دیا۔ اور جب اس نے زور سے آنکھیں میچ کر دوبارہ آہستہ آہستہ کھولیں تو اس کا دل اندر سے یک دم لرز سا گیا۔ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہی ہے، وہ بالکل حقیقت ہے۔

اس نیم تاریک کمرے میں تقریباً پندرہ سے بیس مختلف عمروں کے لڑکے زنجیروں میں اس طرح جکڑے ہوئے بیٹھے تھے کہ ان کے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر لوہے کی اچھی خاصی موٹی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور پھر انہیں ایک علیحدہ زنجیر سے ملا کر اس طرح باندھا گیا تھا کہ وہ سب ایک دوسرے سے منسلک ہو گئے تھے ان میں سے کوئی ایک اٹھنے یا لیٹنے کی کوشش کرتا تو ان سب کو حرکت کرنا پڑتی۔

وہ حیرت اور صدمے سے آنکھیں پھاڑے ان بچوں کو دیکھ رہی تھی جن کے بال، داڑھی اور ناخن بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ کپڑے گندے اور میلے، آنکھوں میں وحشت اور چہروں پر سنگین بے حسی کی کیفیت... وہ انتہائی قابلِ رحم حالت میں اس کمرے میں بند تھے جس میں شاید روشنی کی کوئی کرن بھی داخل نہیں ہوتی تھی اور شاید اسی وجہ سے باہر کے مقابلے میں یہاں گرمی کی شدت نسبتاً کم تھی لیکن اتنی بھی کم نہ تھی کہ ایک پرانے، بوسیدہ چھت کے پنکھے کے رینگنے سے دور ہو جاتی۔

وہ انہیں دیکھ رہی تھی اور بار بار بے چینی کے عالم میں اپنے سینے پر ہاتھ مار رہی تھی جس سے اس کے گلے میں پڑا ہوا گول چپٹا سا پینڈنیٹ بھی حرکت کر رہا تھا جو اس کے موٹے موٹے منکوں والے ہار کا حصہ تھا ابھی اندر لایا جانے والا لڑکا دور کمرے کے دوسرے کونے میں چپ چاپ گھٹنوں میں منہ دیے بیٹھا تھا۔ وہ ان سب کو دیکھتے ہوئے اس لڑکے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے نزدیک پہنچ کر وہ فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی اور اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے ہولے سے مخاطب کیا۔

"را چھورا!" اس کے مہربان لمس اور نرم آواز نے اس لڑکے کو چونک کر سر اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ اس نے اپنی وحشت زدہ آنکھیں پھاڑ کر اس عورت کو دیکھا اور سوچا۔

"عورت؟ یہ اس درس گاہ میں کہاں سے آ گئی؟ پچھلے چار سالوں میں تو میں نے آج تک یہاں کسی عورت کو نہیں دیکھا؟ یہ کون ہے؟" وہ الجھے ہوئے انداز میں اسے دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

"را چھورا! کاہے واسطے استاد صاحب سے جبان داری کی تو نے... دیکھ تو... کیسی چار چوٹ کی مار پڑی... اور اب اس کید کھانے میں آ گیا... جانے ہور کتنی سجا ملے گی ابھی... میری مان... استاد صاب سے ماپھی مانگ لے میں تمھارے کو اپنے ساتھ لے کے چلوں... میں ماپھی دلاؤں تمھارے کو استاد صاب سے۔"

"مانے گا میری بات؟" اس نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا تو بھی وہ لڑکا حیرت سے اسے گھورتا رہا۔ بولا کچھ نہیں۔

پھر وہ کافی دیر تک اسے سمجھاتی رہی اور خود بھی چاروں طرف دیکھتی رہی۔ اپنے کیمرے کو بھی دکھاتی رہی

اور آخر کار اس لڑکے کو لے کر استاد کے پاس آ گئی۔

"لو استاد صاب! بچہ ماپھی مانگ رہا ہے... تم بھی بڑے بن کے اس کو ماپھ کر دو... آئندہ نہ کرے گا یہ کوئی بدتمیجی... پر تم بھی اپنے گسے کو کابو رکھا کرو۔" اس نے استاد صاحب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اتنے میں پیچھے کھڑے ہوئے ایک ہٹے کٹے باریش شخص نے پیچھے سے اس لڑکے کو دھکا دیا تو وہ لڑھکتا ہوا استاد کے پیروں کے پاس گرا، ساتھ ہی وہ دہاڑا۔

"پیر پکڑ کر معافی مانگ مولوی صاحب سے بدبخت۔"

"ملا صاب! میرے کو ماف کر دو... میرے کو ماف کر دو..." لڑکا زور زور سے روتا جا رہا تھا اور وہیں پڑا ہوا اسی جملے کی تکرار کر رہا تھا۔

وہ عورت خاموشی سے مڑی اور اپنے ساتھیوں کے پاس آ گئی پھر وہ سب اٹھ کر اپنے سفر پر دوبارہ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ جب وہ وہاں سے نکل رہے تھے تو احسان اللہ نظر آیا۔ ان سب نے اپنے ٹھیٹ دیہاتی اسٹائل میں اس کا دل و جان سے شکریہ ادا کیا جس کی مہربانی سے ان کی بیمار بھابھو کو کچھ تسلی ہو گئی تھی۔

باہر نکلے تو حسبِ توقع ایک بیل غائب تھا۔

"لو بھئی! اب اپنی مہم کا آغاز ہوتا ہے... ہارون! اپنے اوزار و ہتھیار ریڈی کر... ہم سیدھے کیمپ میں جا رہے ہیں..." ایک نے اپنی پگڑی اور تعویذ درست کرتے ہوئے دوسرے سے کہا۔

"ہاں... جا تو رہے ہیں پر کیا خبر بیل وہیں ہے... یا کہیں اور چلا گیا۔ ہم یونہی منہ اٹھا کر گھس گئے تو پھنس ہی نہ جائیں... منصور! تو مروا مت دینا یار۔"

"میری جان! انوسٹی گیٹو رپورٹنگ اتنی آسان نہیں ہوتی۔ جان تو جوکھم میں ڈالنی پڑتی ہے... تو کیا ہمارے ساتھ پکنک منانے کے خیال سے آیا تھا... چل!" منصور نے اسے پھٹکارا۔

"چل تو رہا ہوں یار! پر ضروری تو نہیں... کہ بیل وہیں ہو... نہ ہوا تو ہم شبہے کی زد میں نہیں آئیں گے کیا؟"

"ابے وہ کہیں اور جا ہی نہیں سکتا۔ اس لیے کہ میں نے اسے کھولنے کے بعد... یہ جو چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں ہیں نا... یہ یہاں سے کیمپ تک کے راستے میں پھیلا دی تھیں... وہ ان کی خوشبو سونگھتا ہوا ادھر ہی گیا ہوگا۔" منصور نے بتایا۔

"کیا بات ہے تیری... تیرے اور بیل کے خیالات کس قدر ملتے ہوئے ہیں... تو اسے سمجھتا ہے... وہ تجھے سمجھتا ہوگا تو نے اسے کان میں کہا تو ہوگا۔ ڈبل ہے استاد! جانے دو... سیدھا کیمپ۔" ہارون نے کہا تو وہ دونوں ہنستے ہوئے کیمپ کی جانب بڑھ گئے۔

اور پھر وہ دونوں باؤلوں کی طرح پورے کیمپ میں چکراتے پھرے اور ہر ملنے والے سے پوچھتے رہے۔ "رے بھائیا! مارا بیل ادھر تو نہیں آیا؟"

"رے مارا ابا تو ٹانگیں توڑ ڈالے گا ہم دونوں بھائیاں کی۔"

"او بھائیا... مارا بیل دکھا تیں۔"

انہوں نے حالانکہ دیکھ لیا تھا کہ ان کا بیل ایک خیمے کے پیچھے سائے میں بیٹھا ہوا اطمینان سے جگالی کر رہا ہے پھر وہ اس کی مخالف سمت میں اسے تلاش کرتے ادھر سے ادھر چکراتے رہے حتیٰ کہ انہوں نے خیموں کے اندر جھانک جھانک کر بھی بیل کو تلاش کیا۔ وہاں کے محافظ ان پاگلوں کو ڈانٹتے اور پھٹکارتے بھی رہے لیکن انہوں نے اپنا کام کر ہی لیا۔

انہوں نے جو کچھ دیکھنا تھا، دیکھ لیا... اور دوسروں کو دکھانے اور سنانے کے لیے ریکارڈ بھی کر لیا پھر آخر کار ایک باریش ہتھیار بند نوجوان نے ان دونوں کو گردن سے پکڑا اور لے جا کر خیمے کے پیچھے ان کے بیل کے سامنے کھڑا کر دیا۔

وہ بھی ایک ڈرامے باز... دوڑ کر بیل کی گردن سے چمٹ گئے۔

"رے تو کدر چلا گیا تھا رے... ماری تو جان ای نکل گئی... جو تو نہ ملتا تو ابے نے ٹانگیں کٹوا کر ہاتھ میں رکھ دینی تھیں چل رے چل۔"

پھر ان چاروں کا واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ کچے راستے پر پچیس منٹ سفر کرنے کے بعد انہیں ایک جیپ درخت کے نیچے کھڑی ہوئی نظر آئی۔ انہوں نے بیل گاڑی وہاں روکی اور اتر کر بند جیپ کا دروازہ کھول کر اندر آ گئے۔ جیپ اسٹارٹ تھی اور اندر اے سی کی خوشگوار ٹھنڈک پھیلی ہوئی تھی۔

"تھینکس گاڈ! اب ذرا جان میں جان آئی۔ کیا قیامت کی گرمی میں ہم نے کھلی بیل گاڑی میں دھوپ کھاتے ہوئے یہ سفر کیا ہے... میری تو سچ مچ حالت خراب ہو رہی تھی... تو نے تو مروا ہی دیا تھا خوباں کی بچی۔" زینی نے خوباں کے بازو پر مکا رسید کرتے ہوئے کہا۔

"کہہ لے مجھے بھلا برا... لیکن ایک بات ہے... اور وہ یہ... کہ تم اور ہارون اپنی زندگی کا یہ ایڈونچر کبھی بھول نہیں پاؤ گے۔" خوباں نے سر ہلاتے ہوئے اسے جواب دیا۔

''ہاں یہ بات تو ہے... اٹس ریمارک ایبل... میری زندگی کا یادگار ایڈونچر...'' ہارون نے پُرجوش انداز میں کہا۔

''اور اس ایڈونچر کے نتیجے میں جو کچھ ہاتھ آیا ہے... وہ اتنا خاص ہے کہ میں تو ایسی کامیابی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔'' منصور نے بھی اظہار کیا۔

''لیکن جو کچھ میں نے اپنی گنہگار آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ اتنا خطرناک ہے کہ میری دعا ہے خدا آئندہ نہ دکھائے اور مجھے کیا... کسی کو بھی نہ دکھائے... میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ درس گاہوں میں... دین کی تعلیم دینے والے... ذہنی طور پر اس قدر دیوالیا ہوں گے... جو ماحول وہاں میں نے دیکھا ہے وہ قطعاً اسلامی نہیں... بلکہ میں تو کہتی ہوں کہ انسانیت کا بھی وہاں گزر نہیں... جس طرح کا سلوک وہاں بچوں کے ساتھ ہو رہا تھا... وہ ناقابلِ یقین ہے۔'' خوباں کے لہجے میں گہرا تاسف تھا۔

''کیا تھا وہاں؟'' منصور نے پوچھا۔

''کیا بتاؤں... لفظوں میں اتنی طاقت نہیں کہ اس کیفیت کو بیان کر سکیں... سب کچھ تو شوٹ کر لیا ہے دکھا دوں گی پھر دیکھ کر بتانا... کہ وہ سب کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟'' خوباں نے پانی کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔

ڈرائیور کے ساتھ آگے پسنجر سیٹ پر ایک دیہاتی بیٹھا ہوا تھا۔ منصور نے جیب سے کچھ نوٹ نکالے اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یہ لو یار! یہ کرایہ ہے تمہاری بیل گاڑی کا اور یہ میری طرف سے انعام رکھ لو... پھر اگر ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت پڑی تو ہم پھر آئیں گے تمہارے پاس... ٹھیک ہے۔'' دیہاتی نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

خوباں اور اس کی ساتھی زینی اپنا میک اَپ اتارنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ اپنی گہری سانولی رنگت کے لیے لگایا گیا لوشن کسی دوسرے ریموور کی مدد سے صاف کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''ویسے ایک بات ہے... تم دونوں اس روپ میں زیادہ اچھی لگ رہی ہو... ٹھیٹ پینڈو۔'' ہارون نے ہنستے ہوئے کہا تو زینی چلائی۔

''اور اپنی شکل دیکھو ذرا... کالے رنگ کے ساتھ یہ سفید کرتے اور لاچے اور سر پر یہ بڑا سا پگڑ... مجھے تو تم دونوں کی شکلیں بھی ان بیلوں سے ملتی جلتی لگنے لگی ہیں... خاص طور پر سرمہ لگی آنکھوں کا تو سو فیصد میچ ہے بالکل وہی بیل ہو... جو گاڑی میں جُتے ہوئے تھے۔''

خوباں بڑی زور سے ہنسی۔

''واہ زینی! کیا ٹپ ٹاپ آبزرویشن ہے تیری۔'' منصور اور ہارون... دو بیل... سرمے والی آنکھوں والے۔'' پھر وہ سب اسی طرح ہنستے بولتے کراچی کی طرف بڑھتے رہے۔

☆☆☆

وہ دھواں دھار بارش میں سڑکوں پر پاگلوں کی طرح گاڑی دوڑاتے دوڑاتے تھک گیا تو سڑک کے کنارے ایک طرف گاڑی روک کر اس نے اپنا بوجھل سر اسٹیئرنگ پر رکھ دیا۔ نہ جانے کتنی دیر وہ اسی طرح بیٹھا رہا پھر اندر آنے والی بارش کی باریک پھوار نے اس کے وجود کو نم کرنا شروع کیا تو اس کے اندر جلتے الاؤ کی تپش بھی کم ہونے لگی۔

تیز بارش کے سبب دور تک پانی کی چادر سی پھیلی نظر آ رہی تھی... گہرے سرمئی بادلوں نے دن ہونے کے باوجود... اندھیرا سا پھیلا دیا تھا... کھڑکی کے سارے شیشے بند ہونے سے... ان پر اندر کی طرف بھی نمی کی بوندیں بار بار جم رہی تھیں... باہر چلنے والے وائپر پوری تیز رفتاری سے ونڈ اسکرین کو صاف کر رہے تھے اور اندر وہ بار بار ٹشو تاول سے آنکھوں کی نمی صاف کر رہا تھا۔

اس کا رخ گھر کی طرف تھا... گھر پہنچ کر وہ سیدھا کچن میں گیا جہاں ان کا کک چائے بنا رہا تھا۔

''بابا! مجھے ایک کپ گرما گرم چائے... فوراً... جلدی۔'' اس نے خانساماں کو اشارہ کیا تو اس نے فوراً چائے کی پیالی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ وہ اسے لے کر سیدھا اپنے کمرے میں آ گیا اور غیر ارادی طور پر پچھلی جانب کھلنے والی کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بلائنڈ کھول کر دیکھا تو دور... بابا کے آفس میں روشنی ہو رہی تھی۔

''اس کا مطلب ہے بابا اندر آفس میں ہی ہیں... چلو مسٹر سعد رحمن آج ٹکرا ہو ہی جائے... دیکھیں کیا کہتے ہیں۔''

چائے پی کر اس نے کپ رکھا اور لاؤنج کے پچھلے دروازے سے باہر نکلا۔ تھوڑا سا کھلا حصہ اس نے جل تھل برستی بارش میں دوڑ کر طے کیا اور طویل کوریڈور میں آ گیا۔ تیز بارش کی وجہ سے گارڈز بھی کہیں چھپ چھپا کر بیٹھے ہوئے تھے وہ تیز قدموں سے کوریڈور عبور کرتا ہوا آفس کے دروازے پر پہنچا تو دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے دو تین دفعہ ہینڈل گھما کر اسے کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ وہ واپس مڑا اور اپنے پرانے راستے سے آفس میں جانے کی کوشش کی۔ گیسٹ ہاؤس میں داخل ہو کر آفس سے ملحقہ کمرے کی طرف آیا۔

اس کا دروازہ بھی آفس کی طرف سے بند تھا۔ وہ کچھ مایوس سا ہوا لیکن جلد ہی اس کی نظر کھڑکی پر پڑی۔ وہ بڑی سی بلائنڈنگ ونڈو بند نہیں تھی۔ اس نے شٹر کھسکایا اور آفس میں جھانکا۔

''آفس تو خالی پڑا ہے... بابا کہاں ہیں؟ شاید لائبریری والے حصے میں ہوں گے۔'' اس نے سوچتے ہوئے کھلی ہوئی کھڑکی سے آفس میں قدم رکھا، اِدھر اُدھر دیکھا لیکن بابا نظر نہیں آئے۔ لائبریری والے حصے میں جھانکا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔

''آفس کے دروازے اندر سے بند ہیں۔ اس کا مطلب بابا اندر ہی ہیں لیکن ہیں کہاں؟'' اس نے سوچتے سوچتے ایک بار پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں آفس اور لائبریری کو کھنگالا لیکن صمد رحمن کہیں نظر نہیں آئے۔

''یہ کیا گورکھ دھندا ہے بھئی... بابا نے سلیمانی ٹوپی اوڑھ لی ہے کیا؟'' وہ بڑبڑاتا ہوا ادھر سے ادھر چکرانے لگا پھر تھوڑی دیر میں اور زیادہ حیران ہو کر وہیں صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

باہر تیز بارش کا سلسلہ جاری تھا اور اس کا بے پناہ شور بھی ہو گا لیکن یہاں کے دروازے اور کھڑکیاں اس طرح مضبوطی سے بند تھے کہ باہر کا شور باہر ہی رہ گیا تھا۔ وہ بے خیالی میں بیٹھا اس کی ٹِک ٹِک سنتا اور شمار کرتا رہا۔

اچانک اس کے کانوں میں ہلکی ہلکی آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ یوں لگا جیسے دور کہیں کوئی کسی سے بات کر رہا ہو... وہ چونک کر اس طرف متوجہ ہوا۔ غور کیا تو صاف پہچان لیا، وہ بابا کی آواز تھی۔ وہی کسی سے بات کر رہے تھے شاید فون پر۔

حیرت کے ایک جھٹکے کے ساتھ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور آواز کی سمت قدم بڑھانے شروع کیے... اور تھوڑی ہی دیر میں وہ ایک نئے، اپنے دریافت شدہ دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ نیم وا تھا اور اندر سے صمد رحمن کی آواز آ رہی تھی۔

''اس سے پہلے تو یہ دروازہ یہاں نہیں تھا۔'' اس نے دیوار کے ہم رنگ و ہم ڈیزائن دروازے کو گھورتے ہوئے سوچا پھر آہستگی سے دروازے پر ہاتھ رکھ کر اسے اندر کی طرف دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔

اندر ایک مختصر کاریڈور کے اختتام پر ایک کمرا نظر آ رہا تھا جہاں تیز روشنی ہو رہی تھی۔ وہ اندر داخل ہو گیا اور کمرے میں پہنچ کر حیرت سے صمد رحمن کو گھورنے لگا جو اس کی طرف پشت کیے ہوئے کسی اجنبی زبان میں کسی سے باتیں کر رہے تھے۔

سعد نے غور سے اس زبان کو سمجھنے کی پوری کوشش کی لیکن ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکا... حالانکہ یورپ میں اتنا عرصہ گزارنے کے بعد وہ انگریزی اور فرنچ کے علاوہ بہت سی ایسی زبانوں سے واقف ہو چکا تھا جو یورپ کے مختلف حصوں میں بولی اور سمجھی جاتی تھیں... مطلب نہ بھی سمجھ میں آئے تاہم سن کر وہ بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا کہ کون سی زبان بولی جا رہی ہے لیکن اس وقت بابا جو چناتی زبان بول رہے تھے... وہ اس کے سر پر سے گزر رہی تھی... اور وہ کچھ نہ سمجھنے کے باوجود خاموشی سے کھڑا سن رہا تھا۔

شاید اچانک ہی صمد کی چھٹی حس نے کسی کی موجودگی کا احساس دلایا تو وہ ایک جھٹکے سے مڑے اور سامنے سعد کو کھڑا دیکھ کر حیرت سے ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''تم...؟ تم یہاں تک کیسے پہنچے؟'' ان کے لہجے میں حیرت کے ساتھ ساتھ تادیب بھی تھی۔

''یہاں سے۔'' سعد نے کھلے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن آفس کے دروازے میں نے خود بند کیے تھے... تم اندر کیسے آئے؟'' انہوں نے جھنجلاتے ہوئے پوچھا تو سعد خاموشی سے ان کے چہرے کو دیکھتا رہا۔

''میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔'' انہوں نے غصے سے پوچھا تو سعد کے چہرے پر سرد مہری کا تاثر ابھرا۔

''زیادہ اہم بات یہ نہیں ہے کہ میں اندر کیسے آیا... زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟ اور آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' سعد نے پہلی مرتبہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس انداز میں بات کی کہ ان کی حیرت دوچند ہو گئی۔

''تم... تم مجھ سے جواب طلب کرو... تمہاری یہ ہمت؟'' انہوں نے غصے سے چلا کر کہا۔

''جی ہاں... مجھے یہ ہمت کرنا پڑی کیونکہ جو کچھ میں نے دیکھا اور جو کچھ سنا ہے... اس سے میرے اندر شکوک و شبہات کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا ہے اور میں چاہوں گا کہ آپ مجھے بتائیں کہ یہ سب کیا ہے؟'' سعد نے سنگین لہجے میں کہا تو صمد رحمن نے اسے استہزائیہ انداز میں دیکھا اور ایک طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

''اچھا... اور اگر میں تمہیں کچھ نہ بتاؤں... تو تم کیا کرو گے؟''

''وہ میں بعد میں سوچوں گا... لیکن فی الحال میں آپ کو اتنا بتانا چاہوں گا کہ مجھے نہ جانے کیوں... آپ پر شک ہو رہا ہے... کہ آپ کچھ بہت ہی غلط قسم کے معاملات میں ملوث ہیں۔ ایسے معاملات... جو صرف آپ کو تو بہت فائدہ

پہنچا رہے ہیں لیکن ملک اور قوم کے لیے شاید بہت نقصان دہ ہیں۔" سعد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"دیکھو برخوردار! میں ایک سیاسی لیڈر ہوں... ملک اور قوم کے معاملات کا دردِسر میرے لیے چھوڑ دو... تم صرف اپنی فکر کرو اور اپنے کام سے کام رکھو۔" انہوں نے بیٹے کو جھاڑا۔

"ابھی آپ کس زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔" سعد نے ان کی جھاڑ کی پروانہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے کہا... اپنے کام سے کام رکھو... میرے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی کوشش مت کرو۔" صمد رحمن پھر چلائے۔

"شاید عبرانی زبان میں... اسرائیلیوں کی زبان میں... یقیناً دوسری طرف بھی کوئی اسرائیلی یہودی ہوگا۔" سعد کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی اور سعد کی یہ بات سن کر پہلی مرتبہ صمد رحمن کی آنکھوں سے فکرمندی جھلکی۔

"تمہیں یہ بات کیسے معلوم؟ میرا مطلب ہے تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" ان کے لہجے کا چڑھاؤ تھوڑا اترا۔

"آپ کے کسی یہودی سے... اس سارے سیٹ اَپ کے تھرو... خفیہ تعلقات... یقیناً خاصے قابلِ اعتراض ہیں... اور اگر اس کی خبر کسی کو مل جائے... تو پھر کیا کریں گے آپ؟" سعد نے کہا۔

"بیٹے ہو کر اپنے باپ کو دھمکی دے رہے ہو، شرم نہیں آتی؟"

"مجھے اس لمحے سے شرم آتی ہے جب لوگوں کے سامنے آپ کے کرتوت آئیں گے اور لوگ مجھ سے کہیں گے کہ یہ دیکھو... یہ ہے ایک غدار کا بیٹا... میں ایسی شرمندگی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ بس کریں... ختم کریں یہ سب غلط کام... بہت دولت جمع کرلی ہے آپ نے... اتنا کافی ہے۔" سعد نے انتہائی ٹھنڈے لہجے میں کہا تو صمد رحمن نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"دولت...؟ تمہارے خیال میں یہ سب میں دولت جمع کرنے کے لیے کر رہا ہوں؟"

"عام طور پر لوگ اپنا ضمیر، قوم کی غیرت اور ملک کی عزت... دولت کے لیے ہی نیلام کرتے ہیں۔" سعد نے اپنا نقطۂ نظر بیان کیا۔

اس کی بات سن کر صمد رحمن کچھ دیر اسے خاموشی سے گھورتے رہے پھر بولے۔ "برخوردار! تم میرے بارے میں جانتے کیا ہو؟ تم نے مجھے کسی اجنبی زبان میں کسی سے باتیں کرتے اتفاقاً سن لیا تو تم نے پوری ایک کہانی اپنے ذہن میں تراش لی اور اس کی روشنی میں مجھے ضمیر فروش قرار دے دیا۔ فرض کرو کہ تمہارا خیال صحیح بھی ہو... تو بھی میں یہ دولت تم لوگوں کے لیے... اپنی اولاد کے لیے ہی جمع کر رہا ہوں نا... اپنے ساتھ قبر میں لے کر تو نہیں جاؤں گا میں۔" انہوں نے کہا۔

"اولاد کے لیے؟ اور اگر اولاد یہ کہے کہ ہمیں ایسی دولت نہیں چاہیے تو پھر آپ کیا کہیں گے؟" سعد نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔

صمد رحمن کو اندازہ ہو گیا تھا کہ شاید سعد ان کے بارے میں کچھ جان گیا ہے۔ وہ اس سے گفتگو کر کے یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ وہ ان کے بارے میں کیا... اور کتنا جانتا ہے۔

"مجھے سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ ایک چھوٹی سی بات کی وجہ سے تم مجھے ملک و قوم کا غدار قرار دینے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟" انہوں نے بات بڑھائی۔

"چھوٹی سی بات... نہیں بابا! یہ چھوٹی سی بات اپنے پیچھے بہت بڑا پس منظر رکھتی ہے جس کا میں اچھی طرح اندازہ کرسکتا ہوں۔" سعد آج شاید ٹھان کے آیا تھا کہ کچھ نہ کچھ فیصلہ کر کے ہی واپس جائے گا۔

"تم شاید اس سارے خفیہ سیٹ اپ کو دیکھ کر کہہ رہے ہو... دیکھو... سیاست میں یہ سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے... مخالفین سے نمٹنے کے لیے اپنی حیثیت بنائے رکھنے کے لیے... مختلف سازشیں اور جوڑ توڑ... ہمارے ملک کی سیاست میں لازم و ملزوم ہیں... اس سیاست میں کمزوری کا ایک لمحہ برداشت نہیں کیا جاتا۔ اس ایک لمحے کا فائدہ اٹھا کر ہی لوگ اپنے مخالفین کو پچھاڑ ڈالتے ہیں... تم نے دیکھا ہے نا کہ کبھی کبھی بڑے ہجوم میں بھگدڑ مچ جانے سے کس طرح کمزور لوگ کچلے جاتے ہیں... وہی حال ہماری سیاست کا ہے اس ہجوم میں کمزور لوگ اس طرح کچلے اور روندے جاتے ہیں... اسی لیے ہمیں زندہ اور طاقتور رہنے کے لیے... دوسروں کی کمزوریاں اپنے ہاتھ میں رکھنی پڑتی ہیں... یہ سب کچھ اسی طرح کیا جاتا ہے جو تمہیں یہاں نظر آیا ہے۔ تمہارے لیے یہ نئی اور عجیب بات ہوگی لیکن یہاں سب ایسا ہی کر رہے ہیں... کیونکہ اپنی بقا اسی میں ہے۔" صمد رحمن نے گول مول الفاظ میں اپنا مدعا بیان کرنے کی کوشش کی۔

"اپنے آپ کو بچانا تو خیر حق ہے لیکن معصوم اور بے گناہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنا... انہیں کچلنا اور روندنا... اس کو تو کسی طور جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔" سعد نے آہستہ اور ٹھنڈے لہجے میں اس طرح کہا کہ صمد رحمن چونک پڑے۔

انہیں یقین ہو گیا کہ سعد بہت کچھ جانتا ہے۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو... وضاحت سے کہو۔" انہوں نے براہِ راست بات کی۔

"صرف اتنا... کہ دنیا کا کوئی مذہب... کوئی قانون اور کوئی اخلاق یہ اجازت نہیں دیتا کہ کوئی بھی وجہ تراش کر... انسانی خون کی ہولی کھیلی جائے۔" سعد نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم نے یہی بات ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی کہی تھی... کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں لوگوں کو قتل کرتا پھر رہا ہوں؟" صمد رحمن نے تلخی سے کہا تو سعد نے ان کی آنکھوں میں براہِ راست جھانکا اور ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

"مجھے جو کہنا تھا... میں کہہ چکا ہوں... اور مجھے پورا یقین ہے کہ آپ میری بات سمجھ بھی چکے ہیں۔"

"نہیں، بالکل نہیں... یہ جو تم ملک و قوم اور غداری جیسے الفاظ استعمال کر رہے ہو... تو کیا ثابت کرنا چاہتے ہو... یہ تمہیں بتانا پڑے گا۔" صمد رحمن نے چراغ پا ہو کر چلا کر کہا تو سعد نے نہایت سنجیدگی سے ان کے بہت قریب آکر کہا۔

"بابا! میں اس لمحے سے بچنا چاہتا ہوں... جب میں اور آپ آمنے سامنے کھڑے ہوں... اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ اس لمحے کو آنے سے پہلے روک لیں... کیونکہ یہ صرف آپ کے ہاتھ میں ہے اور وہ بھی صرف ابھی۔" سعد اپنی بات ختم کر کے واپسی کے لیے مڑا اور بھاری قدموں سے سیڑھیاں طے کر کے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ صمد رحمن پُرخیال نظروں سے اس کے غیر مرئی نقشِ قدم کو گھورتے رہے۔

"بیوقوف!" انہوں نے حقارت آمیز انداز میں زیرِ لب کہا اور اوپر آکر آفس کے دروازے چیک کرنے لگے۔ سامنے کا دروازہ نیم وا تھا جس سے اندازہ ہوا کہ سعد اس دروازے سے نکل کر گیا ہے۔

وہ ذہن میں سعد کی کہی ہوئی باتیں دہرا رہے تھے اور اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ اسے کس حد تک معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ آخر وہ میرے بارے میں کہاں تک اور کیا کیا جانتا ہے؟ ان کے ذہن میں بار بار یہ سوال گونج رہا تھا۔

انہوں نے دو چار دن بعد پھر اسے رات میں اپنے آفس میں طلب کیا۔

"سعد! میری کرنل محمود سے بات ہو گئی ہے۔ اٹارنی جنرل کے آفس میں تمہارے لیے چیمبر کا انتظام ہو گیا ہے لیکن جوائن کرنے کے لیے ابھی تمہیں کچھ وقت انتظار کرنا ہوگا جگہ ابھی خالی نہیں ہے... تم ایسا کرو کہ اس دوران کوئی غیر ملکی زبان سیکھ لو... میں فارن آفس میں تمہاری پوسٹنگ کروا دوں گا۔" انہوں نے غور سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں سیکھ رہا ہوں... دو زبانیں۔" سعد نے سر جھکائے جھکائے آہستگی سے کہا تو انہوں نے چونک کر پوچھا۔

"کون سی؟"

"ایک عربک اور دوسری ہیبرو۔" اس نے باپ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا تو صمد رحمن پھر حیران ہو گئے۔

"ہیبرو... یعنی عبرانی زبان؟ اسے سیکھ کر کیا کرو گے؟" انہوں نے کچھ خفگی سے پوچھا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ اس کی خاصی اہمیت ہے... کم از کم میرے لیے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا اہمیت ہے؟ مجھے بھی تو معلوم ہو؟" انہوں نے ترش لہجے میں پوچھا۔

"آپ جانتے ہیں پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں۔" اس نے بھی کچھ ایسے ہی انداز میں جواب دیا تو صمد رحمن کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے۔

"دیکھو... شاید تم میری طرف سے کچھ غلط فہمیوں کا شکار ہو رہے ہو... مجھے ہیبرو بولتے ہوئے سن کر غالباً تمہارا ذہن بھٹک رہا ہے۔"

"تو آپ میری غلط فہمی دور کیوں نہیں کر دیتے۔" سعد نے ان کی بات درمیان سے اچکتے ہوئے جواب دیا۔

"کس طرح دور کروں... میں نے تمہیں بتایا تو ہے کہ یہ ہماری سیاست ہے یہاں اپنے وجود کی بقا کے لیے کسی نہ کسی طاقت کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے... اور جب کسی طاقت کا سہارا لیا جاتا ہے تو بدلے میں کچھ نہ کچھ دینا بھی پڑتا ہے۔ دنیا میں زندگی ہمیشہ سے کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر ہی چل رہی ہے... اور میں دنیا سے الگ تو نہیں ہوں۔" صمد رحمن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اس اصول کو میں بھی جانتا ہوں لیکن اس میں بھی کچھ حدود مقرر ہیں... مثلاً یہ کہ اتنا ہی لو... جتنا دے سکو... اور جو کچھ دے رہے ہو اس سے کسی دوسرے کی حق تلفی نہ ہو... جب لینے کی ہوس بہت بڑھ جائے تو دوسری طرف سے مطالبے بھی اتنے ہی بڑھ جاتے ہیں کہ انہیں اگر ضرورت ہو تو کاندھوں سے اتار کر سر بھی دینا پڑ جاتے ہیں... اور اکثر یہ سر دوسروں کے ہی ہوتے ہیں... اپنا سر کون دیتا ہے۔" سعد نے تلخی سے کہا تو صمد رحمن کی آنکھوں میں شدید جھنجلاہٹ ابھر آئی۔

”تم آخر کہنا کیا چاہتے ہو؟ جو کچھ کہنا ہے... صاف لفظوں میں کہو۔“ انہوں نے جھلا کر کہا۔
”مجھے صرف ایک بات معلوم کرنا ہے کہ اس خفیہ سیٹ اپ کے ذریعے عبرانی زبان میں آپ کن لوگوں سے بات چیت کرتے ہیں اور ان لوگوں سے آپ کے تعلقات کس قسم کے ہیں؟“ سعد نے آخر کار کھل کر پوچھ ہی لیا۔
”بھئی ظاہر ہے کہ یہ عبرانی زبان میں گفتگو کرنے والے یہودی ہی ہیں... اور میں ان کی ایک این جی او کے ذریعے اپنے معاملات چلاتا ہوں... تم جانتے ہو میرے کتنے کاروبار ہیں بعض ملٹی نیشنل کمپنیوں میں شیئرز ہیں... کچھ معروف اداروں کی فرنچائز ہے میرے پاس... پھر مجھے الیکشن میں لابنگ کے لیے ان کی مدد چاہیے ہوتی ہے... فنڈنگ بھی کرتے ہیں وہ لوگ... میرے بہت سے کام ان کے توسط سے ہی چل رہے ہیں۔“ صمد رحمن نے تفصیل بتائی۔
”اور آپ اس سب کے بدلے ان کے لیے کیا کرتے ہیں؟“ سعد نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
”بہت کچھ... جو کچھ وہ چاہتے ہیں میں اسے پورا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ صمد رحمن کے لہجے میں کھوکھلا پن تھا۔
”وہ کیا چاہتے ہیں؟ اور آپ کیا کرتے ہیں... مجھے یہی معلوم کرنا ہے۔“ سعد نے کہا۔
”جہنم میں جاؤ... مجھے لگ رہا ہے کہ میں تمہارا باپ نہیں ہوں... تم میرے باپ ہو... میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں اور مجھ سے کوئی بھی اس طرح جواب طلبی کرے... یہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے... دفعان ہو جاؤ یہاں سے اور آئندہ میرے آفس میں قدم رکھنے کی کوشش بھی مت کرنا... ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ تم میری اولاد ہو۔“
صمد رحمن نہایت جلال میں آگئے تھے۔ وہ چلاّ رہے تھے اور سعد ان کے سامنے کھڑا دونوں ہاتھ سینے پر باندھے براہِ راست ان کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔
”میں جانتا تھا... سچ آپ کبھی نہیں بتائیں گے لیکن پھر بھی میں نے کوشش کی، اسے آپ اتمامِ حجت کہہ لیں... جا رہا ہوں لیکن ایک بات ضرور کہنا چاہوں گا۔ وقت کا احتساب بڑا کڑا ہوتا ہے اسے جھیلنا آسان نہیں ہوتا... پتا نہیں آپ کتنا دل جگر رکھتے ہیں... حساب ضرور لگا لیجیے گا۔“ یہ کہہ کر وہ مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا آفس سے نکل گیا۔

☆☆☆

رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ جانے کون سا پہر تھا کہ احسان اللہ کی آنکھ کھلی... شاید اسے کچھ حاجت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بستر سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکلا... غسل خانہ کافی دور تھا... وہ مندی مندی آنکھوں کے ساتھ طویل برآمدے سے گزر گیا۔ واپس آیا تو ہر طرف پھیلی چاندنی میں اسے درس گاہ کی عمارت خاموشی میں ڈوبی ہوئی نظر آئی۔ سب گہری نیند میں تھے۔
اسے رات کی ہلکی سی خنکی اور گہری خاموشی بہت اچھی لگی۔ چلتے چلتے یونہی اس نے دور تک نظریں دوڑا کر چاندنی کے حسن کو آنکھوں میں سمیٹنے کی کوشش کی اور چونک پڑا۔
برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھا... ستون سے سر لگائے وہ خاموشی اور سکوت کا حصہ لگ رہا تھا۔ احسان اللہ نے غور سے دیکھا اور پہچان لیا وہ ان سرفروشوں میں سے ایک تھا جو مختلف درس گاہوں سے یہاں مختصر تربیت کے لیے لائے گئے تھے۔
”جانے کیا پریشانی ہے اسے؟ پتا نہیں طبیعت ناساز ہے یا گھر والے یاد آرہے ہیں؟ یا کوئی اور بات ہے؟“ احسان اللہ کھڑا ہوا سوچتا رہا اور اسے دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب جا کر سیڑھیوں پر ہی بیٹھ گیا۔
”کیا بات ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ احسان نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
”پریشان ہو؟“ احسان نے دوبارہ پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔
”پھر کیا بات ہے؟ گھر والے یاد آرہے ہیں؟“ احسان کے سوال پر وہ خاموش رہا۔
”دیکھو برادر! ہم دین کی راہ پر نکلے ہیں۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر... اور اس سب کچھ میں ہمارے گھر والے بھی شامل ہیں... آگے ہماری ابدی زندگی میں بڑے اجر اور انعامات ہمارے منتظر ہیں... دل چھوٹا نہ کرو... دنیا کی یہ سب نعمتیں تمام خوشیاں اور خوب صورتیاں... کچھ نہیں ان کے آگے... جو ہمیں اور خاص طور پر تمہیں ملنے والا ہے۔“ احسان اللہ نے اس کی دلجوئی کی کوشش کی۔
”ویسے تمہارے گھر والوں میں کون کون ہے؟ مجھے کچھ بتاؤ اپنے گھر والوں کے بارے میں... ان کا ذکر کرنے سے تمہارے دل پر سے یادوں کا بوجھ کچھ کم ہو جائے گا۔“
”میری ماں نے دکھوں بھری زندگی گزاری ہے... اور مجھے بڑی مشکلوں سے پال پوس کے بڑا کیا ہے... اور اصل بات یہ ہے کہ میں جانتا ہوں میری ماں مجھ سے کتنا زیادہ

پیار کرتی ہے اب اگر اسے یہ خبر ملی کہ میں نے جان دے دی ہے تو مجھے یقین ہے کہ میری تدفین سے پہلے اس کی جان نکل جائے گی... مر جائے گی وہ یہ سن کر کہ اس کا جوان بیٹا... اس کی امیدوں کا مرکز... مٹی میں مل چکا ہے... اور اگر ایسا ہوا... تو آپ بتائیں... میری یہ قربانی کس کام کی رہ جائے گی جس کی خاطر جان دینے کی راہ پر نکلا ہوں... وہی ختم ہو گئی تو سب کچھ بے مقصد ہی رہ جائے گا... بس یہی پریشانی ہے مجھے...“ وہ گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔
”تو مت جاؤ اس راستے پر... واپس پلٹ جاؤ... سب سے زیادہ افضل بوڑھے اور بیمار والدین کی خدمت ہے۔ تمہاری ماں کو تمہاری زیادہ ضرورت ہے...“ احسان اللہ نے آہستہ آہستہ کہا۔ اس احتیاط کے ساتھ کہ اس کی بات کوئی نہ سن لے۔
”اب یہ ممکن کہاں ہے میرے لیے... میں نے ذکر کیا تھا اپنے انچارج کیمپ سے... وہ تو آپے سے باہر ہو گیا غصے میں... کہنے لگا۔ ”تم نے اس فریضے کو مذاق سمجھا ہوا ہے... آج ارادہ کیا... کل بدل دیا... یہ اللہ کا راستہ ہے... آئندہ ایسا کبھی سوچنا بھی مت... ورنہ دونوں ماں بیٹے ہمیشہ جہنم کی آگ میں جلو گے... بخشش بھی نہیں ہو گی... اور یہاں سے جانے کی تو کوشش بھی مت کرنا... ورنہ میں خود تمہیں اپنے ہاتھ سے سزا دوں گا اور وہ بھی ایسی بھیانک کہ آئندہ فرار کے تصور سے بھی کانپ جاؤ گے...“
اس کی مایوسی اور بے بسی دیکھ کر احسان اللہ بھی آزردہ سا ہو گیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ گروہ بالکل الگ کام کرتا ہے وہ ہر صورت میں اپنے لیے سرفروش ڈھونڈتے ہیں۔
یہ سب جانتے ہوئے احسان اللہ اس سرفروش کو زبانی تسلیوں کے سوا اور کچھ نہیں دے سکتا تھا... چنانچہ اس نے یہی کیا اور ہلکے سے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔
اپنے کمرے میں پہنچ کر بھی وہ بے چین ہی رہا اور بستر پر کروٹیں بدلتے بدلتے فجر ہو گئی۔

☆☆☆

آج کل اس پر ایک عجب بیزاری اور اضمحلال سا طاری رہتا تھا۔ نہ جانے کیوں کہیں کسی جگہ اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ ایک دو بار دوستوں کی طرف بھی گیا۔
اس کے دوستوں کے حلقے نے ایک چھوٹا سا روٹین بنا لیا تھا ہر ویک اینڈ پر پرانے دوست اپنے اسی مخصوص ریسٹورنٹ میں جمع ہو جاتے۔ کھاتے پیتے، ہلا گلا کرتے اور اچھا وقت گزار کر اپنے اپنے گھر چلے جاتے...
ایسے ہی ایک دن سعد اس پارٹی میں شزہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ شزہ... جو کبھی اس کی زندگی کی بہار تھی، اس کی کلاس فیلو اور ہر وقت ساتھ ساتھ رہنے والی... وقت کے ساتھ ساتھ وہ کب اس کے دل میں اتر گئی، اسے احساس بھی نہیں ہوا۔
بڑی عجیب لڑکی تھی وہ۔ بظاہر وہ بہت خوب صورت نہیں تھی لیکن اس کے چہرے پر قدرت نے آنکھوں کی جگہ قیامت سجائی تھی۔ اس قدر حسین اور خوبصورت آنکھیں تھیں کہ دیکھنے والے کی آنکھوں میں سورج اتر آئیں۔
تین سال کا وہ عرصہ ان دونوں نے محبت کی فضاؤں میں پرواز کرتے ہوئے گزارا اور یہی طے ہوا کہ گریجویشن کے بعد دونوں اپنے اپنے گھر والوں سے شادی کی بات کریں گے۔
پر نہ جانے کیا ہوا۔ اس کے بیوروکریٹ باپ اور اپنے سیاست داں باپ کے درمیان کچھ ایسے اختلافی پہلو نکل آئے کہ شادی تو بہت دور کی بات ہے، وہ ایک دوسرے کا نام بھی سننا نہیں چاہتے تھے اور ایسے میں شزہ کے خونخوار باپ نے اسے دباؤ ڈال کر کسی دوسری توپ کے بیٹے سے شادی کرنے پر مجبور کر دیا اور شادی کا دعوت نامہ خصوصی طور پر صمد رحمن اور ان کی فیملی کے لیے بھیجا۔
سعد نے بہت دن ماتم منایا۔ شدتِ غم سے بیمار بھی پڑ گیا اگر امی نہ ہوتیں تو شاید وہ بکھر ہی جاتا لیکن امی کی محبتوں... تسلیوں اور دعاؤں نے اسے جلد سنبھل جانے پر مجبور کر دیا۔
لیکن آج... آج شزہ کو دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ دبلی پتلی تو وہ ویسے ہی تھی لیکن اس کی آنکھوں کی روشنی جیسے کہیں کھو سی گئی تھی۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ جو اس کے چہرے اور آنکھوں میں کلبلاتی رہتی تھی، وہ بالکل معدوم ہو گئی تھی۔ مایوسی اور ناامیدی اس کے وجود سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ وہ اس پارٹی میں سعدیہ کے ساتھ آئی تھی جو ان دونوں کی مشترکہ دوست تھی۔ ان میں بڑی نارمل سی گفتگو ہوئی۔
”کیسی ہو شزہ؟“ سعد نے پوچھا۔
”ٹھیک ہوں، تم کیسے ہو؟“ اس نے سپاٹ سے لہجے میں پوچھا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اسے غور سے دیکھتا رہا، نہ جانے کیوں اسے کہیں سنے ہوئے شعر کا ایک مصرع یاد آگیا۔

آنکھوں میں اڑ رہی ہے لُٹی محفلوں کی دُھول

پارٹی میں سب ہی ہنس بول رہے تھے۔ اونچی

آوازوں میں قہقہے لگا رہے تھے۔ کھا پی رہے تھے۔ ہلا گلا کر رہے تھے۔ اسے لگ رہا تھا کہ بس ایک وہ ہے اور دوسری شزہ... جن کے دل بجھے ہوئے ہیں۔

رات گئے پارٹی سے واپس آنے کے بعد وہ بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔

پھر اس سے صبر نہیں ہوا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی، ایک بج رہا تھا اگرچہ اسے اندازہ تھا کہ رات زیادہ ہو چکی ہے اور یہ وقت کسی شریف آدمی کو فون کرنے کا نہیں ہے لیکن پھر بھی اس نے عاصم کا نمبر گھما ہی دیا۔ بیل جا رہی تھی۔

عاصم اور سعدیہ دونوں اس کے کلاس فیلوز تھے اور دونوں نے پہلے محبت کی اور پھر شادی کر لی تھی۔ اب ایک خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے۔ آج شزہ کیونکہ سعدیہ کے ساتھ آئی تھی اس لیے سعد اس سے شزہ کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔

''ہیلو!'' عاصم کی آواز آئی اور اس نے سعد کی جوابی ہیلو سن کر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہا۔

''میں تیرے ہی فون کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ مجھے معلوم ہے تجھے بے چینی لگی ہوگی اور تو شزہ کے بارے میں پوچھنے کے لیے فون ضرور کرے گا۔''

''آئی ایم سوری یار! میری وجہ سے تجھے...'' سعد اس سے کچھ اور کہنے جا ہی رہا تھا کہ اس نے بات کاٹ دی۔

''ارے یار! دوستوں میں سوری اور تھینکس والے الفاظ استعمال کرنا سخت منع ہے... بلکہ گناہ ہوتا ہے۔ یہ اپنے پیر لفنگے جواد صاحب کہتے ہیں... سمجھا... آئندہ ایسی بات نہ کرنا۔ ویسے یار! مجھے اندازہ ہے کہ تو کتنا بے چین ہو گا۔ یہ لے... سعدیہ سے بات کر۔'' عاصم نے ریسیور سعدیہ کو پکڑا دیا۔

''ہیلو سعد! کیا بات ہے؟ سب خیریت تو ہے نا؟'' سعدیہ نے پوچھا۔

''خیریت؟ میرے لیے یہ لفظ اپنے معنی کھو چکا ہے اور خصوصاً آج... جب سے میں نے شزہ کو دیکھا ہے سعدیہ! شزہ کو کیا ہوا ہے؟ میں نے اس قدر بدحال پہلے کبھی نہیں دیکھا... اس کے ساتھ سب کچھ ٹھیک ہے نا؟'' سعد نے اندیشے سموتے ہوئے پوچھا۔

''سب کچھ کہاں... کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے اس بے چاری کے ساتھ... تم اس کے ڈیڈی کو تو جانتے ہو نا... ٹاپ بیوروکریٹ ہیں اور انہیں یہ اونچا مقام یونہی تو نہیں مل گیا ہو گا کیونکہ کسی بھی ایسی پوزیشن کو حاصل کرنے کے لیے نہ جانے کیا کیا جوڑ توڑ کرنے پڑتے ہیں۔ کون کون سی بیساکھیاں استعمال کرنی پڑتی ہیں۔ تو شزہ کو بھی انہوں نے ایک بیساکھی کے طور پر استعمال کیا۔''

''یعنی ایک ڈیل کے نتیجے میں اس کی شادی ایک آدمی سے زبردستی کر دی گئی۔''

''سعد! بڑی بدنصیب ہے میری یہ پیاری دوست... جانتے ہو جس آدمی سے اس کی شادی ہوئی... ایک نفسیاتی مریض ہے اس پر جنون کے دورے پڑتے ہیں... اور جب دورہ پڑتا ہے تو وہ نہ صرف چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتا اور توڑتا ہے بلکہ شزہ کو بھی اس قدر بے رحمی سے مارتا ہے کہ وہ اسے ہفتہ دس دن سکتی رہتی ہے۔ اس کے باپ کو اور اس کے خاص ملازم کو اس کا ایک ہی علاج معلوم ہے۔ اسے شراب پلاتے ہیں... یا نشہ آور انجکشن لگاتے رہتے ہیں تو وہ نشے میں دھت اور ہوش و حواس سے بیگانہ پڑا رہتا ہے... جب وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتا ہے تو جانتے ہو... شزہ کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔'' سعدیہ کچھ کہتے کہتے جھجک کر خاموش ہو گئی۔

''کیا ہوتا ہے... کیا ہوتا ہے بتاؤ نا... سعدیہ پلیز میرا دل بند نہ ہو جائے کہیں۔'' سعد نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''وہ... سعد... ہوتا یہ ہے کہ... برابر والے کمرے میں کھلنے والا دروازہ کھلتا ہے... اور اس کا باپ کمرے میں داخل ہو کر... شزہ کو... اٹھا کر لے جاتا ہے... وہ دو درندوں کے بیچ پڑی ایک ایسی بھیڑ ہے جسے دونوں نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں اور اس معصوم کو یہ حق بھی حاصل نہیں ہے کہ وہ اس ظلم و ستم پر فریاد کر سکے۔'' سعدیہ یہ کہتے کہتے رونے لگی اور سعد کے ہاتھ سے ریسیور گر گیا۔ اسے لگا کہ اس کے دماغ میں کوئی سوئچ تھا جو آف ہو گیا اور اس کے پورے وجود میں اندھیرا اپھیل گیا جس میں بیکراں سناٹے گونج رہے تھے۔

سعدیہ کی آوز برابر سنائی دے رہی تھی جو ٹیبل سے نیچے لٹکے ہوئے ریسیور سے باہر آ رہی تھی۔

مگر وہ نہ کچھ سن رہا تھا اور نہ سمجھ رہا تھا۔ اس کی ٹانگیں بے جان سی ہونے لگیں تو وہ لڑکھڑا کر اپنے بیڈ پر گر پڑا... جانے کب تک وہ اسی کیفیت میں پڑا رہا۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ کھڑکی کے بلائنڈز کے پیچھے سے روشنی جھلکنے لگی۔ وہ یونہی پڑا رہا۔ پھر صبح ہو گئی اور گھر میں بھی زندگی بیدار ہو گئی۔ اس نے ایک دو بار سر کو ادھر ادھر موڑا، اور سُن ہونے والے ہاتھ پیروں کو ہلکی ہلکی جنبش دی تو اس کے احساسات سے بے حسی کی

برف پگھلنی شروع ہوئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ذہن میں آنے والا پہلا خیال شزہ کا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی سعدیہ کے ساتھ ہونے والی گفتگو یاد آ گئی۔

اس نے تڑپ کر سر پکڑ لیا اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔

''اب میں کیا کروں؟ کیا کروں میں تمہارے لیے...؟ کس طرح نکالوں اس عذاب ناک جہنم سے؟'' وہ سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے سعدیہ کو فون کیا... اس کی ''ہیلو'' کے جواب میں سعدیہ کی تیز آواز سنائی دی۔

''سعد! ابھی اگر تم فون نہ کرتے تو میں تمہارے گھر آنے والی تھی۔ رات کو بات کرتے کرتے تم نے اچانک خاموشی اختیار کر لی۔ میں تو ڈر ہی گئی تھی کہ نہ جانے میری بات سن کر... تم پر کوئی بہت بُرا اثر ہی نہ ہوا ہو... میری پوری رات دعائیں کرتے کرتے گزری ہے کہ اللہ کرے تم ٹھیک ہو۔ میں نے عاصم کو بھی بتایا تھا، وہ بھی پریشان ہو رہا تھا... تم ٹھیک تو ہو نا سعد؟'' اس نے جلدی جلدی بولتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں، زندہ ہوں... سعدیہ! کیا کسی کے ساتھ اتنا برا بھی ہو سکتا ہے... جتنا برا شزہ کے ساتھ ہوا ہے؟'' سعد نے مضمحل لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں سعد! دنیا میں بہت بُرے بُرے لوگ ہیں۔ بظاہر بہت اچھے، نیک اور مہذب نظر آنے والے اندر سے کتنے بڑے جانور ہیں، یہ ہمیں اس وقت پتا چلتا ہے جب ہمارے کسی پیارے پر گزرتی ہے۔ اس وقت... اس وقت یہ دل چاہتا ہے کہ آگ لگا دو اس پوری دنیا کو... یا پھر اسے چھوڑ کر چلے جاؤ... کہیں ایسی جگہ جہاں نہ کوئی انسان ہو... اور نہ ہی اس کا کوئی دکھ... مگر کیا کریں یہ دونوں باتیں ہمارے اختیار میں نہیں ہیں سوائے اس کے کہ دیکھتے رہو اور جلتے کڑھتے رہو... یا پھر اپنی بے بسی پر آنسو بہاتے رہو۔'' سعدیہ کے اندر کا غصہ اور بے بسی اس کے الفاظ میں عیاں تھا۔

''سعدیہ! کیا ہم لوگ شزہ کے لیے کچھ نہیں کر سکتے؟'' سعد نے بے بسی سے پوچھا۔

''کیا کر سکتے ہیں سعد؟ شزہ کا خبیث باپ... اس کا شیطان سسر اور اس کا درندہ شوہر... تینوں اتنے بڑے جانتے ہیں کہ ہم جیسے لوگ کچھ بھی کر لیں ان کے چنگل سے شزہ کو نہیں چھڑا سکتے... ان تینوں کے مفادات کے مضبوط تحفظ کی ایک ہی چابی ہے... شزہ... جسے وہ تینوں کسی قیمت پر نہیں چھوڑیں گے۔'' سعدیہ نے حقائق کا تجزیہ کیا۔

''سعدیہ! شزہ تمہارے پاس آتی رہتی ہے؟ میرا مطلب ہے تم سے ملنے جلنے... کوئی پابندی تو نہیں ہے اس پر؟'' سعد نے پوچھا۔

''آتی ہے... پر بہت کم... کبھی کبھی... زیادہ تر تو وہ اپنے گھر ہی رہتی ہے لیکن کبھی کبھی اپنی امی اور بھائیوں سے ملنے آتی ہے تو مجھے فون ضرور کرتی ہے۔ اگر میں اصرار کروں تو آ بھی جاتی ہے۔'' سعدیہ نے بتایا۔

''سعدیہ! کیا تم ایک بار... صرف ایک بار مجھے اس سے ملوا سکتی ہو؟ پلیز دیکھو انکار مت کرنا... جیسے بھی ہو اپنے گھر پر اسے بلا لو... اور مجھے بھی... میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔'' سعد نے التجا کی۔

''سعد! کیا کرو گے اس سے مل کر؟ تمہیں بہت تکلیف ہو گی۔ وہ اب پرانی والی شزہ نہیں رہی ہے۔ میں نے اس سے تمہارے بارے میں بھی ایک دو دفعہ بات کی تو اس نے اس قدر اجنبیت سے جواب دیا جیسے ماضی میں تمہارے اور اس کے درمیان کبھی کوئی رشتہ تھا ہی نہیں... وہ شاید سب کچھ بھول گئی ہے۔'' سعدیہ نے بتایا۔

''اگر وہ سب کچھ بھول چکی ہوتی تو تمہارے ساتھ پارٹی میں نہ آتی۔ پرانی گزری باتوں کو نہ دہراتی... مجھے اس طرح جان بوجھ کر نظر انداز نہ کرتی... شاید وہ اپنے صبر و ضبط کو کھونا نہیں چاہتی۔'' سعد نے اداس سے لہجے میں کہا۔

''سعد! کہیں ایسا نہ ہو... کہ تم سے مل کر واقعی وہ اپنا صبر و ضبط کھو دے کہیں اس کی زندگی اور مشکل نہ ہو جائے... اس نے جس مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا ہوا ہے، کہیں بکھر کر ریزہ ریزہ نہ ہو جائے۔'' سعدیہ نے اندیشوں کا اظہار کیا۔

''میں... میں پھر بھی اس سے ایک بار ملنا چاہتا ہوں۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ پلیز سعدیہ! مجھے ناامید مت کرنا۔'' سعد کا لہجہ بھی نم ہو گیا۔

''اچھا اچھا... دیکھو میں کوشش کروں گی... ابھی وہ اپنی امی کے گھر پر ہی ہے، میں اسے بلانے کی کوشش کرتی ہوں... اگر اس نے حامی بھر لی تو میں تمہیں فون کر کے بتا دوں گی، تم آ جانا۔'' سعدیہ نے ہتھیار ڈال دیے۔

''تھینکس۔'' سعد نے شکریہ ادا کیا۔

''میں بے چینی سے تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔'' اس نے فون رکھ دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی بے قراریوں کو امید کا حوصلہ مل گیا تھا۔ وہ کم از کم ایک بار تو شزہ سے ضرور مل سکے گا۔ اسے سعدیہ پر پورا بھروسا تھا۔

☆☆☆

"غلام مصطفٰی بس کرو۔ بہت دیر ہوگئی۔ اب تم تھک گئے ہو گے۔ جاؤ جاکر سو جاؤ۔" مولانا جبار نے آنکھیں موندے موندے غلام مصطفٰی سے کہا جو پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے ان کی موٹی چربیلی پنڈلیاں دبا رہا تھا اور وہ بھی اس قدر پیار اور توجہ سے کہ ان کو سرور آنے لگا۔

"نہیں عالی جاہ! جب تک آپ جاگ رہے ہیں، میں کیسے سوسکتا ہوں اور آپ کے پیر دبانا تو میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے۔ اس میں تھکن کا کیا سوال ہے۔" نوجوان غلام مصطفٰی کے لہجے میں انتہا درجے کی عقیدت تھی۔

"اچھا... پھر ایسا کرو... ذرا میری کمر بھی دبا دو... سارے دن کی بھاگ دوڑ بُری طرح تھکا دیتی ہے۔" مولانا جبار نے کروٹ لیتے ہوئے غلام مصطفٰی سے کہا تو وہ ان کی کمر دبانے لگا اور اس کی آنکھوں میں ایک ناقابلِ فہم تصور ابھر آیا۔

غلام مصطفٰی کو اس درس گاہ میں آئے ہوئے چند روز ہی ہوئے تھے۔ شاید پندرہ یا شاید بیس دن... اس سے پہلے وہ پنڈی کے مضافات میں ہی پڑھتا رہا تھا۔ وہاں وہ درس نظامی کا طالب علم تھا اور اب اس کی خواہش پر اسے یہاں اس شاخ میں داخلہ دیا گیا تھا۔ وہ کون تھا کیا پڑھ رہا تھا... اور ایسی ہی تمام تفاصیل ان کاغذات میں درج تھیں جو وہ اس درس گاہ سے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔

"یہاں کیوں آئے ہو... وہیں پڑھتے رہتے۔" احسان اللہ نے اس کے کاغذات دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"محترم! اس کی دو تین وجوہات ہیں، پہلی تو یہ ہے کہ میرے گھر والے یہاں قریب ہی شفٹ ہوگئے ہیں۔ والد صاحب کی نوکری کے سلسلے میں۔ دوسری بات یہ ہے کہ میری طرزِ فکر جو ماحول چاہتی ہے وہ یہاں میسر ہے... اور تیسری بات یہ ہے کہ میں محترم مولانا جبار کا بہت زیادہ معتقد ہوں۔" غلام مصطفٰی نے نظریں جھکائے جھکائے دھیمے لہجے میں بتایا تھا۔

پھر غلام مصطفٰی تیزی سے وہ مدارج طے کرنے لگا جو اس کے مقصد کے حصول کے لیے بے حد ضروری تھے۔ درس گاہ کے طلبا میں تو ویسے ہی اسے منفرد مقام مل گیا تھا۔ مولانا جبار کی نیازمندی کے طفیل... چنانچہ اسی سبب وہ ہوسٹل میں دوسرے طلبہ کے ساتھ رہنے کے بجائے مولانا کے آفس میں ہی رہتا تھا۔ بقول اس کے مولانا کے قدموں میں رہنا اور ان کی خدمت کرتے رہنا، اس کے لیے بہت بڑی سعادت ہے۔

اب غلام مصطفٰی کی باقاعدہ ٹریننگ کا آغاز ہوگیا تھا اور اس کے دن کا بیشتر حصہ ٹریننگ کیمپ میں گزرنے لگا تھا۔ ابھی وہ ابتدائی مراحل میں تھا کہ ایک دن کیمپ میں بڑی گہما گہمی نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ آج سرفروشوں کے ایک دستے کو رخصت کیے جانے کی تقریب ہے۔

فجر کے فوراً بعد ان پانچ سرفروشوں کا خصوصی تعارف کروایا گیا۔ باریش کیمپ انچارج نے ان کا مختصر تعارف کروایا اور ایک تقریر کی جس میں جان نثار کردینے کے حوالے سے دینی اور دنیاوی انعامات کا تذکرہ کیا گیا۔

غلام مصطفٰی کیمپ انچارج کی تقریر سنتا رہا اور غور سے ان سرفروشوں کے چہروں کو دیکھتا رہا جن کی آنکھوں میں ایک عجب سی بے حسی اور جمود کی سی کیفیت نظر آرہی تھی۔ وہ اپنے اطراف سے بیگانہ نظر آرہے تھے۔ ان کی باڈی لینگویج بتا رہی تھی کہ کچھ ہے ان میں جو نارمل سے ہٹ کر ہے۔

انہیں ہار پہنائے گئے پھر کیمپ میں موجود تمام لوگ ایک ایک کرکے ان سے گلے ملے اور مبارک باد دی۔ غلام مصطفٰی بھی ان پانچوں سے گلے ملا اور ایک عجیب سے احساس کا شکار ہوگیا۔ وہ انہیں بار بار غور سے دیکھتا رہا اور بے چینی سے کبھی اپنی گھڑی پر ہاتھ پھیرتا... کبھی گلے میں پہنے تعویذ کو بلاوجہ چھیڑتا... غرض اس کی بے چینی اس کی حرکتوں سے صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ چنانچہ احسان اللہ نے محسوس کی اور اس سے پوچھا۔

"غلام! تم کچھ بے چین سے ہو... کیا بات ہے؟"

"آپ بجا فرما رہے ہیں محترم! دراصل ان سرفروشوں کی رخصتی دیکھ کر میرے اندر ایک محرومی کا سا احساس ابھر رہا ہے۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میں کب اس اعزاز کا مستحق ٹھہروں گا۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تو احسان اللہ بھی مسکرایا۔

"تمہاری تمنا بھی ایک نہ ایک دن پوری ہوجائے گی... بس تھوڑا انتظار اور کرنا ہوگا۔"

اسی دوران میں غلغلہ سا اٹھا اور تمام حاضرین میں جوش کی ایک لہر سی اٹھی۔ مولانا جبار ایک معروف وفاقی وزیر کی ہمراہی میں کیمپ میں داخل ہوئے اور سیدھے سرفروشوں کی جانب بڑھتے چلے گئے۔ انہوں نے گرم جوشی کے ساتھ ان پانچوں کو گلے لگایا اور پھر وفاقی وزیر سے ان کا تعارف کروایا۔ وفاقی وزیر صمد رحمٰن نے بھی ان پانچوں سے ہاتھ ملائے اور انہیں اتنے بڑے مقصد کی تکمیل پر دلی مبارک باد پیش کی۔

مولانا جبار اسی دوران میں ایک ایک لفافہ وزیر موصوف کو پکڑاتے رہے جو وہ ایک ایک کرکے ان سرفروشوں کو دیتے رہے۔

اس دوران میں کیمپ انچارج مسلسل نعرے لگواتا رہا اور کیمپ سے اٹھنے والی ان پرجوش نعروں کی آوازوں سے ویرانہ گونج اٹھا۔ نعرۂ تکبیر... اللہ اکبر... اور ایسے ہی دوسرے نعرے دیر تک گونجتے رہے۔

پھر کیمپ انچارج نے سرفروشوں اور دوسرے لوگوں کو بتایا کہ ان لفافوں میں دس دس لاکھ کی رقم ہے جو ان سرفروشوں کے لواحقین کے لیے ہے اور پہلی فرصت میں انہیں پہنچا دی جائے گی۔

احسان اللہ نے سرفروشوں کی قطار میں کھڑے اس لڑکے کو دیکھا جس سے چند روز پہلے رات میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اپنی ماں کو اپنی زندگی کی قیمت پر دنیا کی کچھ راحتیں نذر کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ رقم کے بارے میں سن کر اس کی منجمد سی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے لہرانے والی زندگی کو احسان اللہ نے بخوبی دیکھا لیکن یہ بس ایک لمحے کے لیے تھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں وہی بے حسی کا پتھریلا سا تاثر بکھر گیا۔

تھوڑی دیر میں وزیر اور مولانا کیمپ سے چلے گئے اور سب اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے۔ ظہر سے کچھ پہلے سرفروشوں کو بڑے اہتمام سے کھانا کھلایا گیا اور ظہر کی نماز کے فوراً بعد ایک گاڑی کیمپ کے باہر آکر رکی اور وہ پانچوں سب سے گلے مل کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ وہ سیاہ شیشوں والی ایک بند سوزوکی وین تھی۔ وہ سب دیر تک کھڑے لحظہ بہ لحظہ دور ہوتی وین کو دیکھ کر ہاتھ ہلاتے رہے۔ تیز رفتاری سے دوڑتی وین نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ وہ سب کچھ دل گرفتہ سے تھکے تھکے قدموں کے ساتھ واپس کیمپ میں آئے اور خاموشی سے اپنے اپنے خیموں میں جاکر گم ہوگئے۔

غلام مصطفٰی، مولانا جبار کی تلاش میں ان کے آفس کی طرف چل دیا۔ کیونکہ وہ یہاں کیمپ میں بس تھوڑی دیر کے لیے آئے تھے اور وزیر صاحب کی ہی معیت میں واپس چلے گئے تھے۔ وہ ان کے آفس پہنچا تو وزیر صاحب تو جاچکے تھے، مولانا اکیلے بیٹھے کچھ رجسٹروں اور کاغذوں میں سر کھپا رہے تھے۔ وہ ان سے اجازت لے کر اندر داخل ہوا۔

"حضرت! آپ بہت مصروف نظر آرہے ہیں اگر آپ اجازت دیں تو آپ کے کام کا کچھ بوجھ بانٹنے کی سعادت حاصل کرلوں۔" غلام مصطفٰی نے اس طرح کہا کہ مولانا مسکرا پڑے۔

"ارے بھئی! اس سے اچھی کیا بات ہے۔ یہ ادارے کی آمدنی و خرچ کے کچھ اندراجات ہیں جنہیں لکھنا ضروری ہوتا ہے۔ وہی لکھ رہا تھا اب اگر تم میری مدد کرنا ہی چاہتے ہو تو آؤ میرے پاس بیٹھو... میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ کس طرح اندراج کرنا ہے۔"

پھر غلام مصطفٰی ان کے سمجھانے پر جلد ہی سمجھ گیا کہ اسے یہ سب کچھ کس طرح لکھنا ہے۔

"بس اعلیٰ حضرت! آپ آرام فرمایئے... میں یہ کام پورا کرلوں گا۔" پھر تھوڑی دیر میں مولانا کے خراٹے گونجنے لگے اور وہ گھنٹوں ان کے دیے ہوئے کام میں مصروف رہا۔ بڑی توجہ اور محنت سے اس نے وہ کام کیا... اور عصر کی اذان کی آواز گونجنے پر جب مولانا کی آنکھ کھلی تو وہ اسی طرح اپنے کام میں مصروف تھا۔ رجسٹروں پر سر جھکائے انگلیوں پر گن گن کر جمع تفریق کرکے تمام حسابات ٹھیک کرکے لکھ رہا تھا۔

غلام مصطفٰی کی آمد کے بعد اس کی مولانا کی نظروں میں اہمیت حاصل کرنا اور حساب کتاب کا سارا کام سنبھال لینے کے چند روز بعد ایک عجیب بات ہوئی۔ غلام مصطفٰی اچانک غائب ہوگیا۔

احسان اللہ نے ہر جگہ اسے تلاش کیا۔ درس گاہ میں، مسجد میں، ہوسٹل میں اور کیمپ میں بھی... لڑکوں سے بھی پوچھا کہ کسی نے اسے کہیں جاتے دیکھا تو نہیں... یا وہ کسی سے کچھ کہہ کر تو نہیں گیا... لیکن سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

ان میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ رات کے آخری پہر مدرسے سے تھوڑی دور ایک سیاہ شیشوں والی لینڈ کروزر آکر رکی تھی اور غلام مصطفٰی رات کے اندھیرے میں دیوار پھلانگ کر بھاگا تھا اور سیدھا لینڈ کروزر میں پہنچ گیا تھا۔ اس کے کاندھے پر ایک بیگ بھی تھا۔ اس کے لینڈ کروزر میں داخل ہوتے ہی دروازہ بند ہوا اور وہ چل پڑی تھی۔

"سب ٹھیک ہے نا؟ کوئی پرابلم تو نہیں ہوئی منصور؟" ہارون پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا اور اسے دیکھ کر دانت نکال رہا تھا۔

"ہاں، ابھی تک تو سب کچھ ٹھیک ہے۔" غلام مصطفٰی عرف منصور نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"کچھ میٹر ملا یہاں سے یا تیری یاترا بیکار گئی۔" ہارون نے اس کا پھولا ہوا بیگ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ارے ہم کہیں جائیں اور کچھ حاصل کرکے نہ آئیں... ایسے تو حالات نہیں ہیں۔" اس نے اپنے کالر کھڑے کرتے ہوئے پوچھا۔

"اس کا مطلب ہے... تیرے ہاتھوں میں یہ بیگ نہیں... بم ہے... ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں؟" ہارون نے پوچھا۔

"ہاں یار! بہت کچھ ہے اس میں... اور اتنا خاص ہے کہ تم لوگ دیکھ کر بھی یقین نہیں کر پاؤ گے... ہم بڑے عجیب لوگ ہیں۔ خود اپنے آس پاس کے لوگوں سے ایسے ایسے دھوکے کھاتے ہیں کہ بعد میں خود کو یقین نہیں آتا۔" منصور نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ایسی کیا بات ہوگئی... جو اس قدر رونی صورت بنا کر بول رہا ہے۔ جوتے کھا کر آیا ہے کیا؟" ہارون نے اسے جھاڑا۔

"یار ہارون! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ ساری انفارمیشنز... خوباں کے علم میں نہ آئیں... یا کم از کم ایک خاص حصہ ہے... جو وہ نہ دیکھ سکے۔" منصور نے نہ جانے کیا سوچتے ہوئے کہا۔

"ایسا کیوں کہہ رہا ہے... تجھے معلوم ہے وہ ہماری گروپ لیڈر ہے... ہر چیز ہم سب آپس میں شیئر کرتے ہیں۔ اور اب تو کہہ رہا ہے کہ اسے یہ سب کچھ نہ بتایا جائے... کیا تو اس کا کریڈٹ اکیلے لینا چاہتا ہے؟" ہارون کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ارے یار، گولی مار کریڈٹ کو... یہ ہمارا ٹیم ورک ہے اور جو بھی کریڈٹ یا ڈیبٹ ہے... وہ سب کا مشترکہ ہے میں تو صرف اس لیے کہنا چاہ رہا تھا کہ ان ساری معلومات میں کچھ ایسا بھی ہے... جو خوباں کے لیے بہت زیادہ تکلیف دہ ہوگا اور میں اسے اس تکلیف سے بچانے کے لیے ایسا کہہ رہا تھا۔" منصور نے وضاحت کی۔

"صرف خوباں کے لیے کیوں تکلیف دہ ہوگا؟" ہارون نے پوچھا۔

"بس کچھ ہے ایسا ہی اس میں۔" منصور نے جواب دیا۔

اسی طرح سوتے جاگتے... باتیں کرتے وہ جب اسلام آباد میں داخل ہوئے تو زندگی پوری طرح بیدار ہو چکی تھی۔ چڑھتے سورج کی دھوپ میں اچھی خاصی حدت پیدا ہو چکی تھی اور سڑکوں پر گاڑیاں رواں دواں تھیں۔ ان کی گاڑی بھی مختلف سڑکوں پر دوڑتی آخرکار اس بلڈنگ میں داخل ہوگئی جہاں منصور کا فلیٹ تھا۔

منصور کا یہ فلیٹ ان کا مشترکہ ٹھکانا تھا۔ وہ اپنے سارے کام یہیں کرتے تھے۔ تین کمروں کا یہ اپارٹمنٹ ان کی تمام ضروریات پوری کرتا تھا۔

وہ دونوں جیسے ہی اندر داخل ہوئے تو بڑی گرم جوشی سے انہیں خوش آمدید کہا گیا۔

زینی اور خوباں دونوں موجود تھیں۔

"کیسے ہو منصور...! سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہا نا؟ کوئی پرابلم تو نہیں ہوئی؟" خوباں نے منصور کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، سب کچھ بالکل ٹھیک رہا۔" منصور نے سیدھے ہاتھ کا انگوٹھا اٹھا کر کامیابی کا اظہار کیا۔

"او کے... تم تھوڑا فریش ہو جاؤ... ہم دونوں ناشتا بناتے ہیں۔ تم لوگوں کے انتظار میں ابھی تک ہم نے بھی ناشتا نہیں کیا تھا۔ پھر تم سے ساری تفصیل سنیں گے اور دیکھیں گے کہ تم کیا تیر مار کر آئے ہو۔" خوباں اور زینی کچن کی طرف چلی گئیں اور وہ اپنے بیڈروم کی طرف۔

ہارون نے ٹی وی لگایا اور لاؤنج میں ہی کشن کھینچ کر دراز ہوگیا۔ نیوز کا وقت ہونے والا تھا اور وہ اسی انتظار میں تھا کہ اچانک بریکنگ نیوز آئی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور ریموٹ اٹھا کر اس نے ٹی وی کا والیوم بڑھایا۔

شہر کے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں دھماکا ہوا تھا۔ خودکش نے آتش گیر مادے سے بھری ہوئی سوزوکی ہوٹل کی پارکنگ میں دیوار سے ٹکرادی تھی۔

ٹی وی چینل کی رپورٹنگ ٹیم اس جگہ کے لائیو مناظر دکھا رہی تھی جو بہت ہی ہولناک تھے۔ ہر طرف آگ، خون اور دھواں پھیلا ہوا تھا... ہر طرف بدحواسی اور افراتفری کے مناظر نظر آرہے تھے۔

"اوہ گاڈ!" زینی کی آواز پر ہارون نے نظر اٹھا کر دیکھا کسی وقت وہ سب ہی وہاں آگئے تھے اور یہ بریکنگ نیوز دیکھ رہے تھے۔

"ہارون! بس اب اسے بند کر دو... ایسے مناظر دیکھ کر مجھے اندر سے کچھ ہونے لگتا ہے۔ اگر یہ ٹی وی چلتا رہا تو سب سے بھی ایک کپ چائے بھی نہیں پی جائے گی۔ منصور کو اس وقت یقیناً چائے اور ناشتے کی ضرورت ہوگی۔"

زینی نے چائے اور سینڈوچ کی ٹرے قالین پر رکھتے ہوئے کہا اور وہ سب بڑی بے دلی سے ناشتے میں مصروف ہو گئے۔ آخر چائے کے کپ ہاتھوں میں لے کر سب ہی منصور کی طرف متوجہ ہوئے۔

"ہاں، تو تمہارے پاس بریکنگ نیوز کیا ہیں منصور؟ بس اب شروع ہو جاؤ کیونکہ ہم لوگوں میں زیادہ صبر نہیں ہے۔" خوباں نے منصور کو مخاطب کیا۔

"بتاؤں کیا؟ سب کچھ لے آیا ہوں... سی ڈیز ہیں، پرنٹ آؤٹ ہیں، ریکارڈنگز ہیں، تصویریں ہیں، دیکھ لینا تم لوگ بھی۔" منصور نے کچھ اس انداز میں کہا کہ وہ سب پہلے تو حیران ہو کر اسے خاموشی سے دیکھتے رہے پھر خوباں نے ہی اس کے چہرے کے سامنے چٹکی بجا کر اسے متوجہ کیا۔

"اے... اے مسٹر منصور! کیا بات ہے؟ تمہارا فیوز کیوں اڑا ہوا ہے... ہمیشہ ہر اسائنمنٹ کی کامیابی پر تم ہی سب سے زیادہ ایکسائیٹڈ ہوتے ہو... اور آج اتنے بیزار نظر آرہے ہو... کیا کچھ کام ہوا نہیں... یا کوئی اور بات ہے؟"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے... میرا اسائنمنٹ کبھی نامکمل نہیں ہوتا، تم جانتی ہو... بس ساری بات یہ ہوتی ہے کہ کبھی کبھی ہمارے سامنے... ایسی غیر متوقع صورتِ حال آجاتی ہے کہ وہ دل ہلا دیتی ہے یا بہت مایوسی طاری کر دیتی ہے... خیر چھوڑو... میں بتاتا ہوں۔" منصور نے کشن کے سہارے نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"حسبِ پروگرام میں پوری تیاری سے وہاں پہنچ گیا تھا، مسجد اور مدرس گاہ کے کافی حالات و معاملات تو ہم سب پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ مسئلہ تھا کیمپ کا... مجھے اس دفعہ وہیں گھسنا تھا۔ سو میں ایک سرفروش کی حیثیت سے وہاں پہنچا... ظاہر ہے وہاں اوروں کے ساتھ میری بھی ٹریننگ ہوئی۔ اس ٹریننگ کے تین اہم حصے ہوتے ہیں۔ ذہنی تربیت، عملی تربیت اور پاسداریِ عہد۔"

"اس کا مطلب ہے تو پوری ٹریننگ کے بعد ایک مکمل سرفروش بن چکا ہے؟" ہارون نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، میں نالائق طالب علم ثابت ہوا اور ٹریننگ ادھوری چھوڑ کر بھاگ نکلا ہوں۔" منصور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور اس نامکمل ٹریننگ میں تم نے کیا سیکھا؟" زینی نے سوال کیا۔

"دیکھو بھئی، ایک بات ہے... کوئی بھی چیز حد سے گزر جائے تو ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔ یہاں ہماری اخلاقی اقدار اسلام سے اخذ کی گئی ہیں اس لیے... اسی کا نمونہ ہونا چاہیے... سو فیصد نہ سہی... کچھ تو ہوں لیکن ہماری اخلاقی بے راہ روی اور ہر شعبے میں تنزلی اور اقدار کی تباہی... یہ بھی تو ہم پر زبردستی مسلط کی گئی ہیں۔ جو لوگ اسلامی ذہن رکھتے ہیں ان کے لیے بھی تو یہ سب ناقابلِ برداشت ہیں تو تنگ آمد بجنگ آمد والی بات تو ہوگی۔ طریقۂ کار سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ مقصد سے اختلاف نہیں ہو سکتا۔ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں دو شدت پسند عناصر یا گروپ... ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں اور جو اعتدال پسند ذہن رکھتے ہیں وہ سوائے بے بسی سے دونوں کو دیکھنے کے اور کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے پاس دونوں کو اعتدال پر لانے کے وسائل نہیں ہیں۔ وہ صرف دونوں طرف سے بھڑکائی جانے والی آگ کا ایندھن بن سکتے ہیں جیسے ہم اور ہمارے جیسے دوسرے لوگ... سب کچھ جانتے بوجھتے بھی... خاموش رہنے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ ہمیں بُرے کو سزا دینے کا اختیار نہیں ہے اور اچھے کی حوصلہ افزائی کرنے سے ہم ڈرتے ہیں۔ ہمیں یہ خوف اس لیے ہے کہ ہم یہ جان ہی نہیں سکتے کہ آج ہم جسے اچھا سمجھ رہے ہیں، کل وہ کسی بُرے کا سرپرست نکل آئے یا آج ہم جس شخص کو برا سمجھ رہے ہیں وہ کل ہمارا رہبر و راہنما نہ ثابت ہو جائے... تو بس...

تم مریضِ دانائی، مصلحت کے شیدائی
راہِ دلبراں کیا ہے، تم نہ جان پاؤ گے

تو دراصل یہ خودکش حملہ آور یہ سرپھرے سرفروش، راہِ دلبراں، کے مسافر بن کر نکلتے ہیں اپنا سر دینے... بقول ان کے... "یہ نیکی اور بدی کی جنگ ہے۔"

تو یہ ہے کہانی کی بوٹم لائن۔" منصور ایک لمبی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

"بہت خوب... بات تو واقعی ٹھیک ہے کوئی تو ہو جو برائی کے خلاف آواز اٹھائے اور ایسی آواز جو ہر جگہ سنی بھی جائے۔" زینی نے کہا۔

"ہاں، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جہاں ان نیک لوگوں کے گروہ کو تھوڑی طاقت ملتی ہے تو ان کی ساری توانائیاں ٹھوس اور مثبت اقدامات کے بجائے جزئیات پر خرچ ہونے لگتی ہیں۔"

"یہ معاشرے کی فلاح کی ابتدا ہے۔" منصور نے کہا۔

"تو ان کے معاشرے کی فلاح اس سے آگے کیوں نہیں بڑھتی... حضرت عمرؓ کے فرائض اور قوانین کیوں نہیں اپنائے جاتے۔ اتنی درس گاہیں ہیں جن میں بلاشبہ لاکھوں طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں کیا ان میں سے کسی نے بھی اسلامی معیشت کے نظام پر کوئی اتھارٹی حاصل کی کیا کسی نے بھی اس دور کی ضرورت کے مطابق اسلامی قوانین کے نفاذ کا کوئی جامع منصوبہ پیش کیا۔ بیت المال کا قابلِ عمل منصوبہ بنایا، اسلامی نظامِ تعلیم کا بنیادی اور اعلیٰ مدارج کا خاکہ بنایا۔ کیا کوئی خارجہ

پالیسی اور امور پر اتھارٹی ہے... کیا کسی نے عام انسان کی زندگی کو بہتر بنانے کا کوئی منصوبہ بنا کر نافذ کیا؟"

"ایسا کچھ نہیں ہوا... ان مخصوص تعلیمی اداروں میں اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے خاص نوجوان تیار کیے گئے ہیں۔ ایک ایسی طاقت اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لیے انہیں تیار کیا ہے جن سے وہ اپنے مفادات کے مطابق کام لے سکیں... میرے خیال سے تو یہ بھی کچھ اتنا ٹھیک نہیں ہے۔" خوباں نے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کیا۔

"مگر سوال یہ ہے کہ وہ ایسا کر کیوں رہے ہیں؟" ہارون نے کہا تو منصور نے فوراً کہا۔

"یس... یہی تو ہے ملین ڈالر والا سوال... کہ آخر وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں اور اس کا جواب چھپا ہے اس سارے میٹر میں... جو میں وہاں سے لایا ہوں... یہ بیگ تم لوگوں کے حوالے ہے۔ دیکھو اس میں کیا کیا ہے جو تمہارے لیے کارآمد ہے اور تمہاری ایکسکلوسیو اسٹوری کو کتنا مفید بنا سکتا ہے اور اگر مجھے اجازت دو تو میں تھوڑی دیر سونا چاہتا ہوں... بہت تھکن ہو رہی ہے اور بہت نیند بھی آ رہی ہے۔ وہاں میں نے کئی راتیں بغیر سوئے گزاری ہیں۔ جب وہ سب خراٹوں سے سو رہے ہوتے تھے تو میں اپنے کام میں لگا ہوتا تھا۔ سو فرینڈز! ملتے ہیں بریک کے بعد۔" منصور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور دروازہ بند کر کے سو گیا۔

☆☆☆

"اچھا... تو سعدیہ نے اس قدر اصرار کر کے مجھے اس لیے بلایا تھا۔" سعد کو دیکھ کر شزہ نے زیرِ لب کہا لیکن سعد نے سن لیا۔

"ہاں، تمہارا خیال بالکل درست ہے۔ میں نے ہی اسے مجبور کیا تھا کہ وہ تمہیں بلائے... کیونکہ میں کم از کم ایک بار... صرف ایک بار تو ضرور ملنا چاہتا تھا تم سے۔" سعد نے اسے بتایا۔

"کیوں ملنا چاہتے تھے مجھ سے؟ کوئی کام تھا کیا؟" شزہ نے اس قدر بیگانگی اور تغافل سے پوچھا کہ سعد کو غصہ آ گیا۔

"ہاں، بہت ضروری کام تھا وہ جو تمہارا توپ سسر اور اس کا گندہ انڈا ہے نا... اس سے سفارش کروانی تھی کہ مجھے کہیں کوئی منسٹر لگوا دیں۔" سعد نے اس قدر چبا چبا کر کہا کہ شزہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ سعدیہ جو ڈرنک لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہی تھی، حیران ہو کر وہیں دروازے پر رک گئی۔

"ارے یہ کیسا انقلاب میں دیکھ رہی ہوں... سورج ٹوٹ کر گر نہ پڑے... کہیں پھول خودکشی نہ کر... آج تو شزہ مسکرا رہی ہے۔" اس نے پُرمزاح انداز میں... کی اس خوش گوار تبدیلی پر خوشی کا اظہار کیا تو شزہ... چونک کر سنجیدہ ہو گئی جیسے کوئی غلطی کرتے پکڑی گئی ہو۔

"اوہ نو، آئی ایم سوری شزہ... مجھے تو کہنا چاہیے تھا۔ تمہیں اتنے عرصے بعد مسکراتے دیکھ کر میں خوشی کے اظہار کو روک نہیں پائی۔ لیکن سچ ہے تم مسکراتے ہوئے بہت پیاری لگتی ہو... میری جان! میرا یہ گھر تم... زندگی کے طوفانی سمندر میں بالکل الگ تھلگ ایک جزیرہ ہے جہاں تمہارا مسکرانا، ہنسنا اور کھلکھلانا... تمہارے لیے ہے یا ہم لوگوں کے لیے خوشی کا... ہے... جو تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔ میرا جی چاہتا... کہ جب تک تم میرے گھر میں ہو اپنی زندگی کی بدصورتی... بھولی رہو... اور وہی پرانی شزہ بن کر... ہماری دو... بن کر ہنسو بولو... تو سب کچھ کتنا اچھا لگے۔"

"کاش ایسا ہو سکتا۔" شزہ کے ہونٹوں سے نکل... گلے میں اتر جانے والے آنسوؤں کو اندر دھکیلنے کے لیے... نے ڈرنک کا گلاس منہ سے لگا لیا۔

اس کی بات سن کر سعدیہ افسوس میں سر ہلاتی... واپس چلی گئی۔

"شزہ! تمہارے ساتھ اتنا ظلم ہوا، تم نے مجھے کچھ... نہیں بتایا۔" سعد نے شکایت کی۔

"بیکار تھا سعد، اگر میں تمہیں بتا بھی دیتی تو تم کیا... لیتے... سوائے اس کے کہ جذبات میں آ کر کچھ ایسا کر ڈا... جو میرے لیے اور خود تمہارے لیے تمہارے گھر والوں... لیے... اور عذاب ناک ہو جاتا۔" شزہ نے فرش پر د... ہوئے کہا۔

"کیا تمہیں معلوم تھا کہ اس طرح تمہیں برباد... جانے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ کیا اس شادی... لیے تم سے تمہارے ماں باپ نے پوچھا تھا؟" سعد... جانے کیوں، کس امید کے سہارے اس سے ایسے سو... پوچھ رہا تھا۔

"ہاں، میں جانتی تھی کہ میرے ڈیڈی اور میرے... کے درمیان میرے متعلق کیا معاہدہ طے پایا ہے کیونکہ با... میرے سامنے ہی ہوئی تھی۔ رہا سوال پو... کا... تو جو صورتِ حال تھی اس میں مجھ سے میری مرضی پو... کا تو سوال ہی نہیں تھا لیکن میں نے احتجاج کی ایک کمزور...

کوشش کی تو ڈیڈی نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر میں نے ان کے حکم سے سرتابی کی تو وہ ممی کو طلاق دے کر... ہم دونوں کو گھر سے نکال دیں گے... میں کیا کر سکتی تھی پھر۔" شزہ نے بے تاثر لہجے میں بتایا۔

"شزہ! کیا اب کچھ نہیں ہو سکتا؟ تم کسی طرح اپنے شوہر سے جان چھڑا لو... ہم دونوں یہاں سے کہیں بہت دور چلے جائیں گے کسی دوسرے ملک میں... ایک اچھی اور پُرسکون زندگی گزاریں گے۔" سعد نے جانے کس آس کے تحت پوچھا تو شزہ نے بھرپور نظروں سے اسے دیکھا۔

"سوچنے میں تو یہ سب بہت اچھا لگتا ہے سعد! مگر ممکن نہیں ہے۔ میرا شوہر مجھے کبھی طلاق نہیں دے گا۔ اور اگر وہ مجھے طلاق نہیں دے گا تو ہم کبھی شادی نہیں کر سکیں گے پھر کیا فائدہ ہے اس میں... اور پھر تمہاری فیملی ان لوگوں کے انتقام کا نشانہ بنے گی۔ میرے ڈیڈی ممی کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیں گے اور یہ لوگ ہم دونوں کو دنیا کے کونے کونے میں پاگلوں کی طرح ڈھونڈیں گے۔ ہم کبھی کہیں ان کے خوف کی وجہ سے سکون سے نہیں رہ سکیں گے۔"

شزہ کے لہجے میں اس قدر مایوسی تھی کہ اس نے اپنے حالات سے مکمل طور پر شکست کھائی ہے اور یہی احساس اس کے الفاظ میں بول رہا تھا۔ سعد اس کی باتوں سے اس قدر دل گرفتہ ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ضبط کرتے کرتے بھی اس کے لبوں سے شاید کوئی سسکی نکل گئی تھی جو شزہ کے کانوں تک پہنچ گئی۔ اس نے چونک کر سر اٹھا کر سعد کو دیکھا اور اٹھ کر آہستہ آہستہ اس کے پاس آئی۔ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس کا جھکا ہوا چہرہ دیکھنے کے لیے نیچے فرش پر اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ اس کی آنسو بھری آنکھوں کو دیکھا۔ ہاتھ بڑھا کر ان کے آنسو پونچھنے کی کوشش کی۔

"سعد! میں نے اپنے اردگرد ضبط کے مضبوط بندھن بڑی مشکل سے باندھے ہوئے ہیں، تمہارے آنسو اسے توڑ رہے ہیں پلیز! اس طرح مت کرو۔ ورنہ میں ٹوٹ جاؤں گی... بکھر کر ریزہ ریزہ ہو جاؤں گی۔ مجھے ہارنے مت دو۔ پلیز مجھے ٹوٹنے سے بچا لو پلیز۔" اور یہ کہتے کہتے وہ واقعی اپنا ضبط کھو بیٹھی تھی۔ اس طرح ٹوٹ کر روئی کہ سعد سے بھی برداشت نہیں ہوا۔ اس نے اٹھا کر اس کا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا۔ وہ اس طرح بلک بلک کر روئے جا رہی تھی اس کے رونے کی آواز سن کر سعدیہ بھاگ کر آئی اور دروازے پر ہی رک گئی۔

وہ سعد کے گلے لگ کر بُری طرح رو رہی تھی جیسے نہ جانے کب کب کے جمع کیے ہوئے آنسو آج ہی بہا دے گی۔ سعد کی بھی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ اور یہ منظر دیکھ کر خود سعدیہ بھی آنسو بہاتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی۔ "چلو... آج اس کے رو لینے سے کچھ تو بے حسی کی برف پگھلے گی... شاید اس طرح کچھ بہتری آئے۔" وہ سوچتی رہی اور کچن میں کھانا بنانے میں مصروف رہی۔

کافی دیر رو لینے کے بعد بمشکل ان دونوں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

"شزہ! مجھے بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کروں کہ ان عذابوں سے تمہارا پیچھا چھوٹ جائے۔ تم اس جہنم میں زندہ جلنے سے بچ جاؤ۔" سعد نے بڑی امید سے پوچھا۔

"تم کچھ نہیں کر سکتے سعد! میں ان کے چنگل میں اس طرح گرفتار ہوں کہ کوئی مجھے ان سے چھٹکارا نہیں دلا سکتا۔" شزہ نے بے بسی سے کہا۔

"پھر تم خود ہی ہمت کرو... تم اپنے شوہر سے علیحدگی کے لیے خلع کی اپیل کرو کورٹ میں... میں تمہارا کیس لڑوں گا... میں تمہیں انصاف دلاؤں گا۔" سعد نے اسے راہ دکھائی۔

"کس انصاف کی بات کر رہے ہو سعد! وہ انصاف جو میرے ڈیڈی اور میرے سسر کی جیب میں پڑا رہتا ہے۔ میرے شوہر نے پچھلے دنوں ایک کال گرل کو قتل کر دیا۔ اس کے لواحقین نے میرے شوہر کے خلاف قتل کی ایف آئی آر درج کروانے کی کوشش کی جانتے ہو ان کا انجام کیا ہوا۔ اسی رات کسی نے ان کے گھر میں گھس کر... گھر کے سارے افراد کو قتل کر دیا۔ ان میں چار بچے بھی تھے جن کی عمریں ڈیڑھ سے آٹھ سال کے درمیان تھیں آج تک قاتلوں کا پتا نہیں چلا۔" شزہ نے تلخی سے کہا۔

"ان لوگوں میں... اور مجھ میں بہت فرق ہے شزہ... میرا باپ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ وفاقی وزیر ہے وہ اور اتنے اختیارات ہیں اس کے کہ تمہارے باپ اور سسر جیسے لوگوں سے نمٹ سکے۔ اور سب سے بڑھ کر میں خود ہوں۔ میں اپنی ساری طاقت لگا دوں گا اور تمہیں ان کے پنجے سے چھڑا لوں گا۔" سعد نے اسے آمادہ کرنے کے لیے زور دے کر کہا تو شزہ نے اپنی اداس آنکھیں اٹھا کر اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سعد! میرے لیے کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ نہ تم... نہ کوئی اور... میں جب بالکل تھک جاؤں گی اپنی زندگی

سے لڑتے لڑتے... تو ایک دن چپ چاپ بہت سی سلیپنگ پلز کھا کر سو جاؤں گی... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔''

''ایسا مت کہو شزہ... میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا میں تصور بھی نہیں کر سکتا کہ تم اس طرح دوسروں کے کرتوتوں کی خاطر اپنی جان دو... سزا برائی کرنے والے کو ملنی چاہیے... تمہاری جیسی معصوم لڑکی ان کے حصے کی سزا کیوں بھگتے... تم کبھی ایسا سوچنا بھی مت... اگر تم نے ایسا کیا تو سمجھ لینا... اپنے ساتھ ساتھ تم نے سعد کی موت کا سامان بھی کر دیا ہے۔ میرے لیے بھی زندگی بے معنی ہو جائے گی۔'' سعد نے صاف الفاظ میں شزہ سے کہا تو وہ کچھ بول نہیں پائی بس خاموش ہو کر سر جھکا لیا۔

''لنچ از ریڈی گائیز!'' سعدیہ کی آواز آئی تو وہ دونوں اٹھے اور مرے مرے قدموں سے ڈائننگ ٹیبل پر جا کر بیٹھ گئے۔ دونوں کے چہروں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کوئی امید افزا صورت نظر نہیں آئی ہے۔

سعدیہ نے دونوں پر ایک نظر ڈالی اور بولی۔

''سعد! میرا خیال تھا کہ اتنے برسوں کے بعد تم دونوں ایک دوسرے سے مل کر خوش ہو گے لیکن مجھے لگ رہا ہے میرا اندازہ غلط تھا۔''

''سعدیہ! تمہارا شکریہ کہ تم نے یہ کوشش کی اور ہم دونوں کو ایک دوسرے کا حال احوال پوچھنے کا موقع فراہم کیا لیکن حقیقت یہی ہے کہ زخم پر مرہم لگانے کے بجائے ہم دونوں نے اپنے اپنے لیے اور نئے زخم سمیٹ لیے ہیں... شزہ کچھ ایسے حالات کی قیدی ہے کہ اس کو نکالنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی... اور مجھ سے یہ بے بسی برداشت نہیں ہو گی۔'' سعد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا تو شزہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

سعد! آج کا دن میرے لیے ہمیشہ یادگار رہے گا۔ آج مجھے کم از کم وہ کاندھا تو ملا جس پر سر رکھ کر میں دل بھر کر رو تو سکوں... ورنہ میری مجبوریوں میں سے ایک تو یہ بھی ہے کہ میں رو بھی نہیں سکتی کیونکہ کسی کو بھی میرے آنسو برداشت نہیں ہیں۔ سعدیہ! اس کے لیے میں بھی تمہاری شکر گزار ہوں۔'' شزہ نے کہا۔

''ارے یار! میں نے تم دونوں کو اس لیے ملوایا تھا کہ تم دونوں ایک دوسرے کی پرابلم کا کوئی حل نکالو اپنی مشکلوں کا کوئی راستہ تلاش کرو... اور تم لوگ ہو کہ آہیں بھرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر رہے ہو... آج کا دن غنیمت سمجھو... اگر کچھ ہو سکتا ہے تو سوچو اس کے بارے میں یہ لیلیٰ مجنوں کا زمانہ نہیں ہے کہ تم ماتم منانے صحرا میں نکل جاؤ۔ اور یہ آہیں بھر[تی] اپنے شوہر کی خدمت کرتی رہے... تم دونوں بالکل خود[غرض] بن کر سوچو... صرف اپنے بارے میں... اور سب کو [بھول] جاؤ... تو ممی ڈیڈی... نو پاپا اور پتی... یہ سب ہیں... دھوکے ہیں ان سب نے مل کر تمہارے ساتھ [کیا] ہے شزہ؟ کیا لوگ اپنی بیٹی کے ساتھ ایسا کرتے ہیں؟ تم[ہیں] پورا حق ہے کہ تم اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی اور ظل[م کے] خلاف ڈٹ جاؤ۔'' سعدیہ کے لہجے میں دوستوں کی محبت اور جھنجلاہٹ کی شکل میں بول رہی تھی۔

''میں تیار ہوں سعدیہ!'' شزہ نے صاف لہجے م[یں کہا] تو وہ دونوں چونک کر حیرانی سے اسے دیکھنے لگے۔

''میں تیار ہوں اگر مجھے کوئی یقین دلا دے کہ [جب] میں آگ کا دریا عبور کروں گی تو دوسرے کنارے پر مجھے [سعد] ملے گا۔ اس کے ساتھ ایک باعزت اور محبت بھری زن[دگی] میری منتظر ہو گی۔ اگر مجھے اس بات کا یقین ہو جائے تو آج ابھی... میں آگ میں کودنے کے لیے تیار ہوں... لیکن تم جانتی ہو سعدیہ... اور سعد بھی... کہ یہ ممکن نہیں... میرا ش[وہر] کسی قیمت پر مجھے طلاق نہیں دے گا اور نہ ہی میرا سسرا[ل] چنگل سے آزاد کرے گا۔ میں اگر ان دونوں کو گولی بھی [مار] دوں... تو خود میرا باپ اور بھائی میرے دشمن ہو جائیں۔ کیونکہ میرے اس اقدام سے ان کی عزت کی پگڑی عدالت میں اچھلے... یہ ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گا۔ ان [میں] سے کوئی بھی مجھے گولی مار کر اپنی عزت اور غیرت کی سرخروئی [کی] داد نہ صرف اپنے جیسے دوسروں سے... بلکہ قانون [و] انصاف سے بھی حاصل کر لے گا ہم جس معاشرے میں ر[ہتے] ہیں، یہ مکمل طور پر قبل از اسلام کا وہی قبائلی معاشرہ ہے جہا[ں] عورت بھیڑ بکریوں کی طرح بیچی اور خریدی جانے والی [چیز] ہوتی ہے، اس کے کاندھوں پر سب کی عزتوں کا بوجھ ہوتا [ہے] لیکن جس کی اپنی کوئی عزت نہیں ہوتی... وہ ہر طرح سے محروم، مجبور اور بے بس بنا دی جاتی ہے ایسے میں میرے جیسی کمزور لڑکی کیا کر سکتی ہے؟ بتاؤ۔'' شزہ نے سب کچھ کھل کر [کہا] جو اس کے دل میں تھا۔

اس کے سوال پر نہ تو سعدیہ کچھ بول سکی اور نہ ہی سعد... سعدیہ نے چپ چاپ برتن سمیٹے اور کچن میں چلی گئی۔ سعد نمناک آنکھوں سے اس کے پتھرائے ہوئے چہرے کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اس کے قریب سے گزر کر جانے لگا تو شزہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''سعد! تم اور تمہاری محبت... میری زندگی میں دو[ر] تک چپکے چلتے صحرا میں ایک چھوٹا سا نخلستان ہے... میں اس صحرا میں جلتے جلتے آج اچانک اس نخلستان میں پہنچ کس طرح ٹھنڈک کے سرور سے آشنا ہوئی ہوں، اس احساس کو میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی لیکن اس کے لیے میں دل کی گہرائیوں سے تمہاری شکر گزار ہوں... تھینکس آ لاٹ۔'' شزہ نے کہا تو سعد نے شکایت آمیز نظروں سے اسے دیکھا کاش میں بھی ایسا کہہ سکتا شزہ... کاش کوئی امید میرے دل میں بھی خوشیوں کا احساس جگا سکتی... تو آج میں بھی بہت خوش ہوتا... مگر میری ہر امید... ہر آس... آج ختم ہو گئی ہے مجھے لگ رہا ہے میرے وجود سے زندگی الگ ہو گئی ہے آج سے زیادہ مایوس میں کبھی نہیں ہوا تھا۔'' سعد کی آواز بھرانے لگی تو وہ خاموش ہو گیا۔

''سعد! امر بیل دیکھی ہے نا تم نے... جس درخت سے چمٹ جائے اس سے زندگی نچوڑ لیتی ہے میں تمہاری زندگی کی امر بیل نہیں بننا چاہتی۔ مجھ سے تم جتنا دور ہو سکو ہو جاؤ... کیونکہ تمہیں ایک گھنا اور سایہ دار درخت بننا ہے جس کی چھاؤں لوگوں کو جلتی دھوپ سے بچائے۔ انہیں سکون اور آسودگی دے۔'' شزہ نے اسے راہ دکھانے کی کوشش کی۔

''اور خود درخت کیا کرے؟ کیا اسے کچھ نہیں چاہیے۔'' سعد نے بھاری لہجے میں سوال کیا۔

''درخت کا تو کام ہی دھوپ میں جل کر لوگوں کو پھول، پھل اور سایہ فراہم کرنا ہوتا ہے۔''

''لیکن میں درخت نہیں ہوں... انسان ہوں... اور انسان درخت کی طرح دل سے محروم نہیں ہوتا۔ اس کی خواہشیں اور آرزوئیں ہوتی ہیں جو اس کی زندگی میں اس کی جستجو کا سبب ہوتی ہیں۔ اگر خواہش اور آرزوئیں مر جائیں تو انسان خود بھی زندگی سے محروم... ایک چلتی پھرتی لاش بن جاتا ہے تمہاری طرح۔'' سعد نے شزہ کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''جانے دو سعد! اوپر والے نے ہمارا ساتھ نہیں لکھا ہمیں الگ الگ اپنی اپنی زندگی جینا ہے۔ اس طرح جلتے کڑھتے رہنے سے حالات بدلنے والے نہیں ہیں بلکہ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں نے مل کر اپنی زندگی میں دشواریاں اور بدحالی ہیں اس لیے بہتر ہے کہ ہماری آج کی یہ ملاقات آخری ملاقات ہو... بہتر ہے کہ آئندہ ہم ایک دوسرے سے نہ ملیں۔'' شزہ نے کہا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''آخری ملاقات؟ شزہ! کیا میں آئندہ تمہیں کبھی دیکھ نہیں پاؤں گا کبھی تم سے مل نہیں پاؤں گا کیوں؟'' سعد مایوس ہو گیا۔

''اس لیے کہ ہم دونوں کے حق میں یہی بہتر ہے۔'' شزہ نے بے تاثر سے لہجے میں کہا اور وہیں سے سعدیہ کو خدا حافظ کہتی ہوئی باہر نکلتی چلی گئی۔ سعد اس کے نازک سراپا کو دل شکستہ انداز میں جاتے ہوئے چپ چاپ دیکھتا رہ گیا۔ اس نے اس کی باڈی لینگویج سے اندازہ لگایا کہ اس وقت وہ خود اپنے آپ کو بمشکل سنبھالتی ہوئی جا رہی ہے۔ وہ اسے پکارنا چاہتا تھا لیکن اس کے ہونٹ کھلے اور بازو اٹھا رہ گیا، وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

سعد نڈھال سا ہو کر کرسی پر گر گیا۔ پھر سعدیہ کی نہ جانے کتنی تسلیوں اور ڈانٹنے ڈپٹنے کے بعد وہ اپنے آپ کو سنبھال پایا۔ ''وہ میرے پاس تو آتی رہتی ہے تم فکر نہ کرو... میں آہستہ آہستہ اسے اس بات پر راضی کر لوں گی کہ وہ ان ظالموں سے نجات کے لیے قانون کا سہارا لے ہم سب اس کا ساتھ دیں گے، پریشان مت ہو سعد... اپنے آپ کو سنبھالو۔'' سعدیہ نے کہا تو وہ اس جھوٹی امید کے سہارے واقعی اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا وہ مایوسی کی دھند سے باہر آ رہا تھا۔ شاید اور بہتر ہو جاتا اگر وہ اس دن صبح کا اخبار نہ دیکھ لیتا۔

فرنٹ پیج پر تصویروں کے ساتھ نمایاں خبر تھی۔ بیوی نے شوہر اور سسر کے مظالم سے تنگ آ کر دونوں کو گولی مار کر خودکشی کر لی۔ شزہ ملک نے نیب کے اعلیٰ افسر اور اس کے نشے باز اور جنونی بیٹے کے کرتوت مع ثبوتوں کے پولیس اور مشہور اخبارات کو بھیج کر... دونوں کو گولی ماری اور خود بھی گولی مار کر خودکشی کر لی۔

فریم میں شزہ، اس کے سسر اور شوہر کے فائل فوٹو اور مرنے کے بعد کی تصویریں چھاپی گئی تھیں۔

سعد کے ہاتھ سے اخبار گر گیا اور وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر کرسی پر جھول گیا۔

اسی دوران اس کے فون کی گھنٹی بجتی رہی۔ مسلسل اور بار بار بجتی رہی لیکن اسے ہوش ہی کب تھا کہ وہ فون اٹھاتا۔

☆☆☆

خوباں اپنے کام پورے کر کے نکل ہی رہی تھی کہ اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ اسکرین پر کوئی اجنبی سا نمبر دیکھ کر اس نے فون اٹینڈ کیا۔

''دیکھیے میں سعدیہ بول رہی ہوں۔ سعد کی پرانی کلاس فیلو اور دوست... میں بہت دیر سے اسے فون کر رہی ہوں لیکن وہ فون اٹینڈ نہیں کر رہا ہے مجھے اندیشہ ہے...

کہ۔۔۔ کہ شاید اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ آپ اس کی بہن ہیں نا۔۔۔ خوباں؟'' اس نے سوال کیا تو خوباں نے اثبات میں جواب دیا۔

''آپ کا نمبر مجھے سعد نے ہی دیا تھا کافی عرصہ پہلے۔۔۔ کہ اگر کوئی ضروری بات ہو اور مجھ سے رابطہ نہ ہو رہا ہو تو خوباں سے بات کر کے جو بھی کہنا ہو کہہ سکتی ہو اس لیے میں کوئی تمہید اور نہیں باندھ سکتی۔۔۔ آپ کو صاف الفاظ میں کہنا چاہ رہی ہوں کہ اس وقت سعد بہت نازک صورتِ حال میں ہے اور اس کی ذہنی کیفیت بہت بڑے شاک سے متاثر ہو سکتی ہے اس لیے آپ فوراً اسے جا کر دیکھیے۔۔۔ پلیز ہری اَپ۔''

خوباں کچھ پوچھتی ہی رہ گئی لیکن سعدیہ نے فون بند کر دیا۔

خوباں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھائی کے کمرے کی طرف دوڑی اور دروازہ کھولتے ہی اس نے بھائی کو ابتر حالت میں کرسی پر بے ہوش پڑا دیکھا تو اس کے لبوں سے چیخ نکل گئی۔ اس نے دوڑ کر سعد کو جھنجوڑا اور آوازیں دیں اور جب اس کی طرف سے کوئی تحریک نہ ہوئی تو اس نے زور زور سے نوکروں کو آوازیں دیں اور سعد کو لے کر اسپتال بھاگی۔

منسٹر کا بیٹا تھا۔ اسپتال کی ایمرجنسی میں بڑے بڑے ڈاکٹرز جمع ہو گئے۔ فوری طور پر اس کو بہترین ٹریٹمنٹ دیا گیا۔ اندر سب ڈاکٹرز سعد کی حالت سدھارنے کی کوششوں میں مصروف تھے اور خوباں باہر ویٹنگ روم میں بیٹھی اپنے موبائل پر سعدیہ کا نمبر تلاش کر رہی تھی تا کہ اس سے پوچھ سکے کہ یہ سب کیا ماجرا ہے؟ پھر نمبر مل گیا۔

''سعدیہ! کیا تم بتا سکتی ہو کہ بھائی کو یہ کس قسم کا شاک پہنچا ہے جس سے اس کی یہ حالت ہو گئی ہے؟''

''ہاں، میں یہی بتانا چاہتی تھی بات تھوڑی لمبی ہے وہاں سعد کے پاس کوئی ہے تو تم میرے گھر آ جاؤ تا کہ میں تمہیں ٹھیک سے بتا سکوں۔ میرے شوہر عاصم کا آفس وہیں اسپتال کے پاس ہے۔ وہ سعد کو دیکھنے آ رہے ہیں، تم انہی کے ساتھ آ جاؤ۔''

سعدیہ نے اصرار کیا تو خوباں نے بات مان لی۔ کیونکہ اس کو خود بے تابی تھی یہ جاننے کی کہ آخر اس کے پیارے بھائی کے ساتھ ایسا کیا ہوا ہے کہ صدمے کی شدت سے وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے۔ امی اور تاباں وہاں پہنچ چکی تھیں۔ سعد کو ہوش آ گیا تھا اور وہ دونوں اس کے پاس تھیں۔ خوباں اس کو تھوڑی دیر میں آنے کا کہہ کر نکل آئی۔

سعدیہ نے کافی ٹیبل پر پہلے ہی کچھ چیزیں سجا رکھی تھیں۔ بسکٹ اور کیک وغیرہ۔۔۔ خوباں کے آتے ہی وہ کافی بھی تیار کر کے لے آئی۔ عاصم کو جلدی واپس جانا تھا اس وہ دونوں خوباں کو جلدی جلدی شنزہ اور سعد کے معا بتاتے چلے گئے۔ ان کی آخری ملاقات کے بارے م سعدیہ نے خوباں کو بتایا۔

''اس دن وہ دونوں بہت جذباتی ہو رہے تھے بالکل مایوس اور شنزہ سنگین کیفیت میں یہاں سے گئے یہ صرف ایک دن پہلے کی تو بات ہے۔ اور کل رات شنزہ غضب کر ڈالا۔۔۔ صبح اخبار میں اس بارے میں پڑھ کر بہت پریشان ہوئی اور میں یہی سوچ رہی تھی کہ اگر سعد اخبار دیکھ لیا ہو گا تو اب تک نہ جانے کیا ہو چکا ہو گا۔ کیونکہ نے میرے سامنے شنزہ سے کہا تھا کہ اگر اس نے مر کوشش کی تو وہ بھی زندہ نہیں رہے گا۔ بس میں اسی لیے تھی کہ خدانخواستہ کہیں۔۔۔'' سعدیہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی

''تمہیں یہاں بلا کر ساری تفصیل بتانے کا مقص ہے کہ تم سارے حالات سے واقف ہو جاؤ اور خصوصا کے اس ارادے سے کہ اگر شنزہ مر گئی تو وہ بھی زندہ نہیں گا تم اس کی بہن ہو۔۔۔ اور اس کے کافی قریب بھی۔۔۔ کچھ چھوڑ کر صرف اس کی دلجوئی کرو۔۔۔ اور خدانخواستہ ہو والے کسی بڑے حادثے کو روک لو۔'' عاصم نے خوبا صاف الفاظ میں سمجھایا۔

خوباں کے چہرے پر دکھ اور پریشانی کا نمایاں تھا۔ سعدیہ نے اسے تسلی دی۔

''خوباں! بھائی بہت پیارے ہوتے ہیں بہنوں کو تمہارا بھی ایک ہی بھائی ہے اور اس وقت بہت مایوس او گرفتہ ہے۔ وہ اپنی زندگی کے شاید بدترین دور سے گز ہے۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسے زندگی کی طرف لا کوشش کرو۔ اس کے دل کا دکھ بانٹ لو۔ تا کہ وہ اس سا برداشت کرنے کا حوصلہ اپنے اندر پیدا کر سکے اور ہمیں ہے کہ تم ایسا ضرور کر لو گی۔''

''آپ دونوں کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے بھ کی اصل کیفیت سے مجھے آگاہ کیا۔ مجھ سے جو بھی پڑے گا، میں کروں گی۔۔۔ تھینکس آ لاٹ۔'' خوباں نے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے۔۔۔ کافی تو پی لو۔'' سعدیہ نے اسے اٹھتے د کر کہا۔

''پھر کبھی سہی۔۔۔ ابھی میں ذرا جلدی میں ہوں، عاصم! کیا آپ مجھے اسپتال واپس پہنچا دیں گے پلیز!'' خو نے عاصم سے کہا تو وہ گاڑی کی چابی اٹھا کر اسے آنے کا اش

کر کے بیرونی دروازے کی طرف مڑ گیا۔

اسپتال پہنچ کر معلوم ہوا کہ سعد کو بخار کے سوا اور کوئی تکلیف نہیں ہے۔ ڈاکٹرز نے اچھی طرح چیک کر لیا تھا، کچھ ضروری ٹیسٹ بھی ہو گئے تھے۔ انہوں نے کچھ دوائیں اور ٹانک وغیرہ دے دیے تھے اور ساتھ ہی گھر لے جانے کی اجازت بھی دے دی تھی۔

وہ سب اسے گھر لے آئے۔ امی بہت پریشان تھیں لیکن سعد کی کیفیت سنبھل جانے کے بعد اب کافی مطمئن ہو گئی تھیں، انہوں نے اپنے ہاتھ سے تھوڑا بہت سوپ پلایا تھا اور دوا کھلا کر اسے بیڈ پر آرام سے لٹا دیا تھا۔ وہ دونوں بہنیں بھی اس کے آس پاس ہی تھیں۔

تاباں نے اس کا ٹمپریچر لیا۔ تو بخار بہت ہلکا ہو گیا تھا۔ خوباں نے ان دونوں کو یہ بتایا تھا کہ بھائی بہت تیز بخار ہو جانے کے سبب بے ہوش ہو گئے تھے۔ ڈاکٹروں نے یہی بتایا تھا۔ چنانچہ اب کیونکہ بخار بہت کم تھا اس لیے امی اور تاباں تو چلی گئیں۔۔۔ پر خوباں وہیں بیٹھی رہی۔ بھائی کے پاس۔۔۔ اس کا سر دباتی رہی اور اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی جس کا وہ ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا۔

''بھائی! کیا تم تقدیر پر یقین رکھتے ہو؟'' اچانک خوباں نے اس سے پوچھا تو اس نے پوری آنکھیں کھول کر بہن کو دیکھا، اس کی الجھی ہوئی نظروں میں یہی تھا کہ اس قسم کے سوال کا یہ کون سا موقع ہے لیکن پھر بھی اس نے ایک موہوم سی سر کی جنبش سے اثبات میں جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم اس بات پر یقین رکھتے ہو کہ ہم انسانوں کی تقدیر بنانے والا وہ اوپر بیٹھا ہے وہی لکھتا ہے کہ ہماری زندگی میں ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔۔۔ بھائی! پھر اتنا ملال، اتنا دکھی ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔۔۔ جو کچھ ہو رہا ہے یا جو کچھ ہوا ہے۔۔۔ ہمیں اسے بدلنے کا اختیار نہیں ہے۔۔۔ تو صبر کی تلقین بھی تو اس اوپر والے کا ہی حکم ہے۔'' خوباں نے سچ کہا۔

''مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا بھائی! مجھے بڑا افسوس ہے اس بات کا۔۔۔ کہ اتنا بڑا دکھ تم اکیلے جھیلتے رہے اور تم نے مجھ تک کو خبر نہیں ہونے دی۔ میں جو بہن سے زیادہ تمہاری دوست تھی۔۔۔ تم نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔۔۔ اکیلے اتنا بڑا صدمہ دل پر سہہ گئے۔۔۔ بھائی ایسا کیوں کیا تم نے؟'' خوباں کے لہجے میں نمی اتر آئی۔

''کسی سے کچھ بھی کہنے سننے کی نوبت ہی کہاں آنے دی اس نے۔۔۔ ایک ہی ملاقات میں اس نے آخری فیصلہ کر لیا۔ میں سوچتا ہی رہ گیا کہ اس کی مدد کس طرح کی جا سکتی ہے اور وہ ہر مدد سے بیگانہ ہو گئی۔ اتنی جلدی کرے گی وہ۔۔۔ یہ تو میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔'' سعد کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''بس بھائی! شاید یہی اس کی تقدیر تھی اور شاید یہی تمہارا بھی مقدر تھا۔ لمحہ بھر کا ساتھ۔۔۔ پھر ہمیشہ کے لیے جدائی۔۔۔ اوپر والے نے تم دونوں کا ساتھ نہیں لکھا تھا اس لیے دوسروں کی۔۔۔ تمہاری اور شاید خود اس کی بھی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکی۔'' خوباں نے تسلی دینے کے لیے کہا۔

''یہی تو افسوس ہے کہ کم از کم مجھے اپنی سی کوششیں کر لینے کی مہلت تو دیتی وہ۔۔۔ شاید۔۔۔ شاید کچھ بہتر ہی ہو جاتا۔'' سعد مایوس تھا۔

''بھائی! تم نے حضرت علیؓ کا وہ قول سنا ہے نا کہ ''میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کی ناکامی سے پہچانا ہے۔'' اگر انسان اپنی کوششوں سے وہ سب کچھ کر لیتا جس کا وہ خواہش مند ہے تو اللہ کی قدرت کو کون مانتا۔۔۔ اور یہی تقدیر ہے۔۔۔ بھائی! صبر اختیار کرو اور اپنے آپ کو اتنا دکھی مت کرو کہ زندگی تمہارے لیے بوجھ بن جائے۔۔۔ ورنہ کیسے جیو گے تم؟'' خوباں نے بھائی کو سمجھانے کی کامیاب کوشش کی۔

''جینا کون کم بخت چاہتا ہے اب۔۔۔ میرے لیے زندگی بوجھ بن گئی ہے جسے میں اپنے ناتواں کاندھوں سے اتار پھینکنا چاہتا ہوں۔'' سعد نے تھکے ہوئے لہجے میں اپنی بات ختم کی۔ اور یہ نہ دیکھ سکا کہ خوباں کے چہرے پر کس طرح زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ ہونٹوں کو دانتوں میں دبا دبا کر ضبط کی کوشش کر رہی تھی لیکن آخر کار وہ ضبط کھو بیٹھی۔ بھائی کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگایا اور بری طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''بھائی! تم نے بات کرتے ہوئے میرے، امی اور تاباں کے بارے میں ایک لمحے کو بھی نہیں سوچا کہ تمہاری اس طرح کی باتوں سے ہمارے دل پر کیا گزرے گی اور تمہارے بغیر ہم تینوں کا کیا ہو گا؟''

خوباں کی بات سن کر سعد نے ایک لمحے کو اسے غور سے دیکھا پھر پوچھا۔

''خوباں! تم نے اپنا، امی اور تاباں کا تو نام لیا لیکن بابا کے نام کا کہیں تذکرہ نہیں کیا؟''

خوباں ایک لمحے کو کچھ جھجکی پھر اپنے لہجے کو سنبھال کر بولی۔

''ہاں۔۔۔ بابا بھی۔۔۔ ہم سب کی امیدوں اور خوشیوں کا واحد مرکز تمہاری ذات ہی تو ہے بھائی۔۔۔ اگر تم اس طرح

سوچنے لگے تو ہم کس کے سہارے جئیں گے۔ تم اپنے گھر والوں کو اچھی طرح جانتے ہو... سب کا آپس میں مضبوط رشتہ ہونے کے باوجود... کوئی خاص ذہنی ہم آہنگی نہیں ہے... سوائے تمہارے... اور میرے... بھائی تمہارے بغیر تو میں اپنے آپ کو بالکل اکیلا محسوس کرنے لگتی ہوں... آج... جب میں نے تمہیں بے ہوشی کی حالت میں پایا تو جانتے ہو میری کیا حالت ہوئی تھی... مجھے ایسا لگا کہ میرے دماغ کا فیوز یکلخت اڑ گیا ہو... اور میرے ہاتھ پاؤں بالکل بے جان سے ہو گئے۔ مجھ سے کھڑا نہیں رہا گیا اور میں نے کس طرح اپنے آپ کو سنبھالا... تم سوچ بھی نہیں سکتے۔“ خوباں کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”میں سوچ سکتا ہوں... مجھے اندازہ ہے... تم پریشان نہ ہو... میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچنے دوں گا۔“ سعد نے کھوکھلے سے لہجے میں کہا تو خوباں اس کی طرف شک آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اچھا... تمہیں ڈاکٹر نے نیند کی دوا دی ہے شاید... تمہاری آنکھوں سے لگ رہا ہے تم آرام کرو... میں شام کو پھر آؤں گی... اوکے اللہ حافظ... مجھے دراصل آفس جانا ہے بہت ضروری کام ہے... ورنہ میں کہیں نہ جاتی... یہیں تمہارے پاس بیٹھی رہتی... لیکن جتنی دیر میں تم سو کر اٹھو گے... میں واپس آجاؤں گی... بائے۔“ وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

☆☆☆

پچھلے کئی دنوں سے وہ اپنے وقت کا اچھا خاصا حصہ اس تنظیم کے لوگوں کے ساتھ گزار رہا تھا۔ اسے اس تنظیم کا نام اور کام کا حوالہ بابا کے خفیہ ڈاکومنٹس سے ملا تھا جو کمپیوٹر کی ایک فائل میں محفوظ تھا۔ وہ وہاں ان کے ایک ادارے میں عربی زبان کا کورس کرنے داخل ہوا تھا لیکن مقاصد کچھ اور بھی تھے۔ وہ انہیں اور ان کے اصل مقاصد کو کھنگالنا چاہتا تھا اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا جارہا تھا اور جیسے جیسے معلومات بڑھ رہی تھیں اس کے ڈپریشن میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ ایسے ایسے ہولناک حقائق سامنے آرہے تھے کہ وہ ان کی سنگینی تلے دبا جارہا تھا... پسا جارہا تھا... وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کیسے کیسے لوگ... کیسے کیسے ریکٹ چلا رہے تھے اور ان سب کو طاقت فراہم کرنے والے تمام وسائل کا منبع ایک ہی جگہ سے پھوٹ رہا تھا اور وہ تھا صمد رحمن۔

وہ عربی اور عبرانی دونوں زبانیں تیزی سے سیکھ رہا تھا اور اب اس قابل ہو گیا تھا کہ لکھی ہوئی تحریر کا مفہوم سمجھ سکے... بولنا بہت مشکل تھا لیکن لکھنا پڑھنا اور سمجھنا اب کافی آسان ہو گیا تھا اور اس آسانی نے اس کو بہت کچھ سمجھنے کے قابل بنا دیا تھا۔

وہ تمام تحریریں جو اس نے بابا کے کمپیوٹر سے کاپی کر کے چرائی تھیں، اب وہ انہیں پڑھ پڑھ کر اور سمجھ کر بڑی حد تک اس ریکٹ کو سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا جو بین الاقوامی طور پر چلایا جارہا تھا اور جس میں یہودی لابی بڑے پُرجوش طریقے سے سرگرمِ عمل تھی۔

اسے معلوم ہو چکا تھا کہ یہودی اسکالرز، اپنے تشخص کو سپر پاور کے طور پر دنیا سے منوانے کے لیے جی جان سے محنت کر رہے ہیں اور اس کے لیے ہر وہ حربہ استعمال کر رہے ہیں جو ان کے مقاصد کی تکمیل کے لیے کارگر ہو...

عمومی طور پر ان کا سب سے بڑا مخالف گروہ مسلمان ہیں اور وہ تمام مسلم ممالک میں اپنی خفیہ ایجنسیوں کے ذریعے انارکی پھیلانے کے لیے چند لوگ خرید کر... ان پر اپنی عنایات کی برسات کر دیتے ہیں جن میں پیسا سب سے اولین حیثیت رکھتا ہے۔ جسے وہ پانی کی طرح بہاتے ہیں اور ان کی خفیہ ایجنسی موساد امریکا اور انڈیا کی مدد سے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے کسی کو بھی ڈھال بنا کر اس کا استعمال کرتی ہے۔

مختلف ممالک کی کمزوریاں ان کے ہاتھوں میں ہیں اور انہی کمزوریوں کی مدد سے وہ انہیں اپنی انگلیوں پر نچاتے رہتے ہیں۔ یہ کھیل ان عرب ممالک میں خصوصی طور پر کھیلا جارہا ہے جس کی سرحدیں اسرائیل سے ملتی ہیں۔

”خدا کی پناہ! اتنا سا اسرائیل اپنے سے کئی گنا بڑے مسلمان ممالک میں گھرا ہوا ہے جو اگر چاہیں تو اسے چٹکی میں مسل دیں لیکن حالات کی ستم ظریفی یہ ہے کہ وہی اتنا سا اسرائیل ان تمام ممالک کو تنگ کر رہا ہے اور کوئی اس پر فیصلہ کن ضرب لگانے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔“ سعد نے اخبار میں چھپنے والے نقشے کو دیکھتے ہوئے خود سے کہا۔

”اور ذرا پاکستانیوں کو دیکھیے... ان کی مت کیوں ماری گئی ہے۔ اسلام کے نام پر قائم ہونے والا ملک، اسلام کے نام پر ہی غیروں سے کس طرح دھوکے کھا رہا ہے۔ یہودیوں نے ان کی سب سے تیز دھار تلوار پر اپنا ہاتھ رکھا ہوا ہے۔ کتنے بڑے بڑے اسلامی گروپ اور تنظیمیں ان کے دیے ہوئے پیسوں اور ان کے خریدے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں کس طرح یرغمال بنی ہوئی ہیں۔ معصوم لوگوں کو کس طرح غلط مقاصد کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ لعنت ہے

ایسے گمراہ لوگوں پر... جو دین اسلام کے نام پر... معصوم ذہنوں کو گمراہ کر کے اپنے غلط مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔“ سعد نے بڑبڑاتے ہوئے اپنا سر تھام لیا۔

وہ کچھ دیر آنکھیں بند کر کے کچھ سوچتا رہا پھر تھوڑی دیر بعد سر ہلاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

”مجھے بابا سے آخری مرتبہ بات کرنی پڑے گی۔“ وہ سوچتا ہوا اٹھا اور بابا کے آفس کی طرف چل دیا۔

دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو وہ سامنے ہی ٹیبل پر نظر آئے۔ اسے اندر داخل ہوتا دیکھ کر وہ کمپیوٹر پر کام کرتے کرتے رک کر سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگے۔

”مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“ اس نے ان کے سامنے کھڑے کھڑے کہا تو انہوں نے اسی سنجیدگی سے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”بابا! میں آپ سے آخری بار پوچھنے آیا ہوں کہ آپ یہ سب کیوں کر رہے ہیں؟“ اس نے بھی سنجیدگی سے پوچھا۔

”اور میں بھی تمہیں آخری مرتبہ بتا رہا ہوں کہ مجھے اپنے معاملات چلانے کے لیے... تمہاری رضامندی کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے لیے کیا ضروری ہے اور کیا غیر ضروری... اس کا فیصلہ میں خود کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اس میں کوئی بھی اپنی ٹانگ نہ اڑائے... تم بھی نہیں۔“ انہوں نے سنگین لہجے میں اس کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے تنبیہ کی۔

”اور آپ... جو دوسروں کی زندگی اور موت کے معاملات میں ٹانگ اڑا رہے ہیں... کیا یہ صحیح ہے؟“ سعد نے بھی انہی کے انداز میں پوچھا۔

”کس کی زندگی اور موت کے معاملات؟“ صمد رحمن نے نہایت ناخوش گوار انداز میں پوچھا۔

”بہت سے معصوم اور بے گناہ لوگوں کو... آپ انہیں آگ میں جھونک رہے ہیں اور پیچھے رہ جانے والے... زندہ رہ جانے والے ان کے لواحقین کو زندہ درگور کر رہے ہیں... کیا مل رہا ہے اس سے آپ کو؟ مت کیجیے ایسا... اوپر والے کا احتساب بہت سخت ہوتا ہے۔“ سعد نے ان کے لہجے کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔

”شٹ اپ! تم میرے بارے میں جانتے ہی کیا ہو جو مجھے اس طرح کی نصیحتیں کر رہے ہو... جانتے ہو میں صرف گیارہ سال کی عمر میں اس بھری دنیا میں بے سہارا ہو گیا تھا۔ ماں باپ مر گئے تو چچا تایوں نے مجھے ٹارچر کر کر کے گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ اور میرے ماں باپ کی ساری دولت اور جائداد پر قبضہ کر لیا۔ میں کس کس طرح در در بھٹکا ہوں اور کیا کیا سہا ہے میں نے... تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے... کڑکڑاتے جاڑوں کی طویل راتیں... میں نے ٹھنڈی فٹ پاتھوں پر... اور گرمیوں کی جلتی ہوئی دھوپ کو اپنے سر پر سہا ہے... کئی کئی دن بھوکا رہا ہوں...

”اور ایسے میں جب میرا کوئی آسرا... کوئی سہارا نہیں تھا... تو انہی لوگوں نے مجھے سہارا دیا... انہوں نے مجھے جانور بننے سے بچا کر... انسان بنایا... تعلیم، سہولتیں، سر چھپانے کا ٹھکانا اور شرف و عزت... مجھے انہی کی سرپرستی کی وجہ سے ملی۔ ان لوگوں نے مجھے سب کچھ دیا اور اب تک دے رہے ہیں اور جواب میں انہوں نے مجھ سے صرف ایک وعدہ مانگا۔ صرف ایک وعدہ کہ میں ان کے احکامات کی تعمیل کروں گا۔ اتنے سارے احسانوں کا بدلہ... صرف یہی کہ میں ان کے معاملات ان کے مفادات کا تحفظ... ان کے احکامات کے مطابق کروں... تو کیا غلط ہے یہ...؟ ہاں... بتاؤ... کیا غلط ہے؟“ صمد رحمن نے آج اسے اپنی حقیقت بتا ہی دی تھی اور وہ سن کر حیران تھا۔

”غلط... غلط تو ہے بابا! پر آپ کو نہیں لگے گا۔ کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ اگر آپ ہی جیسا کوئی شخص... مجھے یعنی آپ کے بیٹے کو... اسی طرح مروا دے... خودکش دھماکے کے ذریعے... تو کیا آپ اس کے عمل کو درست سمجھیں گے... آپ کو کوئی پچھتاوا... کوئی دکھ محسوس نہیں ہوگا۔ انہوں نے آپ پر احسان کر کے... آپ کو ایک قاتل کا درجہ دے دیا۔ آپ نے اپنی زندگی کے لیے... دوسروں کو موت بانٹنی شروع کر دی۔ اپنے اس عمل کو آپ خود کس طرح جسٹی فائی کرتے ہیں... میں نہیں سمجھ سکتا۔“ سعد حیران تھا۔

”برخوردار! یہ جو دنیا ہے نا... یہ ایک جنگل ہے۔ انسانوں کا جنگل... اور یہاں جنگل کا ہی قانون نافذ ہے۔ وہی چل رہا ہے۔ یعنی طاقتور بااختیار ہے اور کمزور شکار... ہر شخص جانتا ہے کہ اگر اسے سروائیو کرنا ہے تو اسے طاقتور بننا پڑے گا۔ ورنہ کوئی نہ کوئی طاقتور اسے شکار کر کے کھا جائے گا۔ ایک بے آسرا، کمزور اور پریشان حال لڑکے سے تم کیا توقع رکھتے ہو کہ جب وہ ہر طرف سے آفتوں اور مصیبتوں میں گھرا ہو... جان کے خوف سے چھپتا پھر رہا ہو اور کئی دن کا فاقہ زدہ... نہ سر پر چھت ہو... اور نہ کوئی پناہ گاہ... تو ایسے میں وہ اخلاقیات کا سبق پڑھے گا... یا جینے کی راہ ڈھونڈے گا...

”دوسروں کو اخلاقیات کا درس دینا بہت آسان ہے لیکن خود کو ان اخلاقیات کا پابند بنانا... خصوصاً

نامصائب حالات میں... وہ مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا ہے... تم نے ایک پُرآسائش گھر میں آنکھ کھولی ہے، تم نہیں جانتے کہ حالات کا جبر کیا ہوتا ہے۔ تمہیں سب کچھ بغیر کسی جدوجہد کے حاصل ہے اس لیے تم مجھے اخلاقیات پر درس دے سکتے ہو... لیکن مشکل حالات میں جینا کیا ہوتا ہے یہ تم نہ جانتے ہو... اور نہ تصور کر سکتے ہو۔'' صمد رحمن غصے میں ابل رہے تھے۔

''شاید آپ ٹھیک سمجھتے ہوں لیکن اس وقت آپ جس پوزیشن پر ہیں آپ کو کوئی مجبوری نہیں ہے تو اب کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ ان لوگوں سے کہہ دیں کہ ان کے احسانوں کا بدلہ آپ اتار چکے... اب آپ کو بخش دیں وہ لوگ... کیونکہ اس طرح بے گناہوں کو موت کی بھٹی میں جھونکتے جھونکتے... آپ تھک گئے ہیں آپ کے ضمیر نے آپ کو اس قدر ملامت کیا ہے کہ اب آپ یہ سب کچھ نہیں کر سکتے۔'' سعد نے امید بھرے لہجے میں بابا کو راستہ دکھانے کی کوشش کی تو صمد رحمن بے اختیار ہنس پڑے۔

''میں پاگل ہوں کیا جو زندگی کی ساری آسائشوں سے دستبردار ہو کر موت کو گلے لگا لوں... تمہارے کہنے سے بھی سب کچھ میں انہیں کہہ تو دوں گا پر ایک دو روز میں ہی کسی سڑک سے گزرتے ہوئے میری گاڑی پر فائرنگ ہوگی اور میرا چھلنی چھلنی جسم بڑے احترام کے ساتھ تمہیں بھیج دیا جائے گا... نہیں برخوردار! میری زندگی اتنی سستی نہیں ہے۔'' صمد رحمن نے اس کی جانب گھورتے ہوئے کہا۔

''یعنی... کوئی راستہ نہیں ہے کوئی طریقہ نہیں ہے کہ آپ آگ اور خون کے اس کھیل سے دستبردار ہو جائیں... کیونکہ آپ ایسا چاہتے ہی نہیں ہیں ٹھیک ہے... میں کل ہی ایک پریس کانفرنس کرتا ہوں اور وہ سارے حقائق جو مجھے معلوم ہیں ان کے سامنے بیان کر دیتا ہوں... دیکھتے ہیں اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کے اس طرح ایکسپوز ہو جانے پر... آپ کے سرپرست... سرپرستی سے ہاتھ اٹھا لیں۔'' سعد نے حتمی لہجے میں کہا اور اٹھنے لگا تو پیچھے سے آواز آئی:

''بیٹھے رہو... تم اس وقت گن پوائنٹ پر ہو...'' یہ فیضان حسن کی آواز تھی۔ بابا کا سیکریٹری جس کی بے وقوفانہ حرکتوں پر وہ ہمیشہ ہنستا رہتا تھا۔ وہ چند قدم چل کر اس کے سامنے آ گیا۔ سعد نے اسے دیکھا تو اس کا چہرہ جس پر حماقتوں کے ڈونگرے برستے رہتے تھے، اس وقت مکمل طور پر بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ اس پر سفاکی اور اشتعال کا اتنا واضح تاثر تھا کہ سعد کو تھا کہ اگر اس نے ذرا بھی حرکت کرنے کی کوشش کی تو واقعی اسے گولی مار دے گا۔

''جس قسم کی حماقت کا تم نے ذکر کیا ہے نا... اس بارے میں کبھی بھولے سے بھی مت سوچنا... میں تمہارے باپ کو گولی نہیں ماروں گا کیونکہ یہ ہمارے کام کا آدمی ہے ہاں البتہ تمہاری ممی... دونوں بہنوں کو ہم عبرت کا نشان دیں گے اور تم کو زندہ رکھیں گے، انہیں دیکھتے رہنے کے لیے... میڈیکل سائنس نے بڑی ترقی کر لی ہے تمہیں ایسی دوائیں دی جائیں گی کہ دماغی طور پر تو تم زندہ رہو گے اور کچھ دیکھنے اور سننے کے لیے... لیکن جسمانی طور پر تمہاری حالت کیچوے سے بھی بدتر بنا دی جائے گی۔ تم کچھ نہیں کر سکو گے... اگر یہ سب منظور ہے... تو ضرور کوئی بیوقوفی کرنے کی کوشش کرنا۔'' اس نے سفاک لہجے میں دھمکی دی۔

''بابا! یہ آپ کا سیکریٹری بھی...؟'' سعد نہ جانے کیا کہتے کہتے خاموش ہو گیا لیکن مفہوم واضح تھا۔

''یہ صرف دوسروں کی نظر میں سیکریٹری ہے ورنہ اصل میں یہ انہی قوتوں کا نمائندہ ہے جو ہر ہر کام میں اور ہر لمحے میری نگرانی کرتا ہے کہ میں کچھ ان کے خلاف نہ کر سکوں، اور جو کچھ کرنا ہوتا ہے اس کا سارا انفرا اسٹرکچر یہی تیار کرتا ہے۔'' صمد رحمن نے بے تاثر آواز میں جواب دیا۔

''اوہ ٹھیک ہے بابا! آئی ایم سوری... مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اس قدر مجبور ہیں۔'' اس نے مری مری آواز میں کہا اور اٹھ کر خاموشی سے باہر آ گیا۔

''بابا! آپ مجبور ہیں لیکن میں مجبور نہیں ہوں... میں یقیناً کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔'' وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ کئی دنوں کے بعد پھر اسے اپنی خفیہ ڈیوائسز کی ضرورت پڑی۔ اس نے جلدی جلدی انہیں فنکشن میں لا کر آفس میں لگائے ہوئے بگز سے منسلک کیا تو اسے بابا اور فیضان کی باتوں بلکہ بحث کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں... اس نے جلدی سے ریکارڈنگ کا بٹن دبایا۔ ان کی گفتگو سننے کے ساتھ ساتھ وہ اسے ریکارڈ بھی کر رہا تھا۔

ان دونوں کے درمیان موضوعِ گفتگو خود اسی کی ذات تھی۔ فیضان بہت ہی چراغ پا تھا۔ وہ صمد رحمن سے صاف صاف کہہ رہا تھا کہ وہ سعد کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دینے کا ارادہ رکھتا ہے کیونکہ اب وہ ہمارے لیے خطرہ بنتا جا رہا ہے۔ جواب میں وہ اسے پھٹکار رہے تھے کہ وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ اگر تم نے اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو وہ کسی بھی مصلحت کا خیال کیے بغیر اسے گولی مار دیں گے۔

''اور اگر اس نے وہی کیا جیسا کہ وہ کہہ رہا تھا یعنی اخبارات کو ہمارا سارا ریکٹ بتا دے گا... پھر... پھر کیا ہوگا مسٹر رحمن؟'' فیضان نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''میں اسے سمجھا لوں گا۔ وہ اپنی ماں اور بہنوں سے بہت محبت کرتا ہے۔ ان کی دھمکی اسے کبھی بھی ہمارے خلاف کچھ کہنے نہیں دے گی اور ہاں... آئندہ اس کے منہ لگنے کی کوشش مت کرنا کیونکہ اگر کبھی ایسا موقع آیا کہ تم اور وہ دونوں میرے سامنے ہوئے اور مجھے دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑا تو میں بلاتامل گولی مار دوں گا... تمہیں... سمجھے تم؟'' انہوں نے غصے سے کہا۔

سعد نے یہ سب ریکارڈ کر لیا تھا۔ پھر اس نے کانوں سے ہیڈ فون اتارے اور الماری کھول کر اس سے پہلے جو بھی ریکارڈنگز کی تھیں ان کی سی ڈیز نکالیں اور کمپیوٹر پر بیٹھ گیا۔ اب اسے یہ ریکارڈ شدہ سارا ڈیٹا اپنے آئی پوڈ (I-Pod) پر کاپی کرنا تھا۔ کام تھوڑا لمبا تھا لیکن وہ اسے جلدی جلدی اس طرح نمٹانے کی کوشش کر رہا تھا جیسے اس کے پاس وقت بہت کم ہو اور آخرکار وہ ساری ریکارڈنگز کو اپنے آئی پوڈ پر منتقل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اب اس نے وہ سارا پرنٹڈ میٹریل نکالا جو اس نے بابا کے کمپیوٹر سے پرنٹ کر کے نکالا تھا۔ وہ پرنٹ شدہ کاغذات کی ایک خاصی ضخیم فائل تھی۔ اس نے اسکینر آن کیا اور ان کاغذات پر پرنٹ شدہ سارا ڈیٹا پہلے کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک پر کاپی کیا اور پھر اسے بھی اپنے آئی پوڈ پر منتقل کر دیا۔ بعض تصاویر اور چھوٹی چھوٹی موویز جو اس نے مختلف مواقع پر خود بنائی تھیں، وہ بھی ان سارے سازشی تانے بانے کو جوڑنے اور اس میں شامل اصلی چہروں تک پہنچنے میں بہت مددگار تھیں۔ تمام ضروری چیزیں اس چھوٹے سے آئی پوڈ پر بہت اچھی طرح محفوظ ہو چکی تھیں۔

''بابا! یہ آپ کی تباہی کا ایٹم بم ہے۔ اگر کوئی اسے صحیح طور پر استعمال کر سکے تو... اور مجھے امید ہے کہ یہ آپ کو اپنے انجام تک ضرور پہنچائے گا۔'' اس نے اپنے چھوٹے سے آئی پوڈ کو ہتھیلی پر رکھ کر دیکھتے ہوئے زیرِلب بڑبڑا کر کہا۔ وہ تھوڑی دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس کا ایک چھوٹا سا پیکٹ بنایا۔ اسے خوب صورت سے کاغذ میں لپیٹ کر ایک پیپر ربن سے باندھا اور اس پر نمایاں حروف میں لکھا۔

اپنی پیاری بہن اور دوست
خوبہاں کے لیے
سعد کی طرف سے...

اور اس پیکٹ کو اس نے اپنے ٹیبل کی دراز میں پیچھے کی طرف رکھ دیا۔ باقی چیزوں کو بھی اچھی طرح پیک کر کے انہیں بھی اسی طرح رائٹنگ ٹیبل کے نچلے حصے میں ڈال دیا۔ پورے کمرے میں ایک سرسری سی نظر ڈالی۔ بیڈ کے کراؤن کے پیچھے لگی اپنی بڑی سی تصویر کو چند لمحے اداس سی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس تصویر میں وہ نہ جانے کس بات پر کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ کسی اجنبی شخص کی تصویر کو دیکھ رہا ہے۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ آخری مرتبہ وہ کب اس طرح کھل کر ہنسا تھا۔ اس نے کچھ عجیب سے جذبات کو محسوس کیا اور اپنے اندر کے خالی پن سے گھبرا کر وہ کمرے سے نکل آیا۔ لاؤنج میں پہنچا تو حسبِ معمول ممی رات کے کھانے کے لیے خانساماں کو ہدایات دے رہی تھیں۔

سعد ٹیبل پر جا کر بیٹھا تو اسے دیکھ کر ممی بھی کچن سے باہر آ کر اس کے قریب بیٹھ گئیں۔

''کیسے ہو بیٹا؟ اب طبیعت کیسی ہے؟'' انہوں نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا تو نہ جانے کیوں سعد کا دل بھر آیا اور وہ جواب میں کچھ کہہ نہ پایا... بلکہ صرف اثبات میں سر ہلا کر ٹھیک ہونے کا اقرار کیا تو انہوں نے غور سے بیٹے کو دیکھا۔

''سعد! مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میرا بیٹا... اکیلا... تنہا نہ جانے کن کن طوفانوں سے لڑ رہا ہے اور مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ کیا بات ہے سعد؟ تم اتنے اداس، تھکے تھکے اور نڈھال سے کیوں نظر آنے لگے ہو... نہ جانے کب سے میں نے تمہیں ہنستے بولتے نہیں دیکھا۔ کھاتے پیتے بھی برائے نام ہو... مجھے بتاؤ تو میری جان... مسئلہ کیا ہے؟'' انہوں نے تشویش آمیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنی فکرمندی کا اظہار کیا۔

''نہیں ممی! ایسا کچھ بھی نہیں ہے جس کے لیے آپ پریشان ہو رہی ہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس ذرا بلڈ پریشر لو ہو رہا ہے شاید... دوائیں لے رہا ہوں چند دن میں ٹھیک ہو جاؤں گا... آپ بالکل فکرمند نہ ہوں۔ ویسے مجھے ڈاکٹرز نے آب و ہوا کی تبدیلی کا بھی مشورہ دیا ہے تو میں سوچ رہا ہوں کہ کچھ دنوں کے لیے کہیں چلا جاؤں۔ ناردرن ایریاز کی طرف... اگر آپ کی اجازت ہو تو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا لیکن اس کی مسکراہٹ نے انہیں اور بھی سنجیدہ کر دیا۔ وہ ایک اجنبی مسکراہٹ تھی۔ مضمحل اور اداس مسکراہٹ۔

''اکیلے جاؤ گے کیا؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''نہیں، چار پانچ دوست جا رہے ہیں۔ انہی کے ساتھ جانے کا سوچ رہا تھا۔ چلا جاؤں... یا نہیں؟'' اس نے ماں

سے پوچھا۔

وہ اس کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے نہ جانے کیا سوچ رہی تھیں کہ کچھ بولیں نہیں۔ پھر اس نے دوبارہ پوچھا تو انہوں نے چونک کر اس کی بات سنی۔

”ہاں... لیکن پہلے تو تم نے کبھی اس طرح مجھ سے اجازت نہیں لی۔ اب کیوں پوچھ رہے ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔

”ممی! اس سے پہلے کبھی اس طرح... اتنی دور... اپنی مرضی سے گیا بھی تو نہیں۔“ اس نے کہا تو اس کی ممی نے اٹھ کر اسے چمٹا لیا اور اس کی پیشانی چومتے ہوئے بولیں۔

”جیتے رہو... اللہ تعالیٰ تمہاری ہر پریشانی دور کرے۔ بیٹا! جا تو تم رہے ہو سیر و تفریح کے لیے... دوستوں کے ساتھ... لیکن پتا نہیں کیوں... میرا دل چاہ رہا ہے کہ تم میری نظروں کے سامنے رہو... میرے پاس رہو۔“ فرزانہ نے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے ممی! اگر آپ اجازت نہیں دیں گی تو نہیں جاؤں گا میں۔“

”نہیں، تمہاری صحت کے لیے شاید یہ بہتر ہو... اسی لیے ڈاکٹر نے تمہیں یہ مشورہ دیا ہے... چلے جاؤ۔“ انہوں نے اجازت دے دی۔

”تھینکس ممی۔“

پھر وہ دونوں کافی دیر وہاں بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ چائے پیتے رہے۔

پھر سب کو خدا حافظ کہہ کر الوداعی نظروں سے دیکھتا ہوا روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

پھر وہی منظر تھا۔ وہ پانچ سرفروش تھے۔ سیاہ ڈھیلے ڈھالے لباسوں میں ملبوس، سر پر کفن باندھے ہوئے۔ وہ اپنے اپنے مشن پر جانے کے لیے تیار تھے۔ ایک نوجوان میگا فون پر ان کے عظیم جذبے کی تعریف میں زمین آسمان کی قلابے ملا رہا تھا اور انہیں دنیاوی اور اخروی انعامات کی ایک لمبی لسٹ گنوا رہا تھا جن کے حق دار نہ صرف وہ ہوں گے بلکہ ان کے ماں باپ، بہن بھائی اور سارے عزیز رشتے دار بھی ان انعامات سے فیض یاب ہوں گے۔

”اب میں دست بستہ گزارش کروں گا اپنے رہبر و رہنما محترمی و مکرمی جناب انعام اللہ جبار سے کہ وہ تشریف لائیں اور ان سرفروشانِ توحید کے سر پر اپنا دستِ شفقت رکھتے ہوئے انہیں ابدی زندگی پانے کی کوششوں پر مبارک باد دیں۔“ اس نوجوان نے مولانا جبار کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔

مولانا اپنی گنبد نما توند کو سنبھالتے ہوئے کرسی سے اٹھے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اسٹیج پر پہنچ گئے۔

مولانا نے پہلے تو اسٹیج پر پہنچ کر ان پانچوں کو ایک ایک کر کے گلے لگایا اور ان کی پشت تھپک کر انہیں مبارک باد دی پھر وہ مائک تھام کر تقریر کرتے رہے جس میں ان کے اغراض و مقاصد کی تفصیل تھی۔

سفید کرتہ شلوار پر کالی واسکٹ پہنے... ہاتھ میں موبائل فون پکڑے صمد رحمن اٹھے تو ان کا سیکریٹری فیضان بھی ان کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا اسٹیج تک آیا۔ اسٹیج پر پہنچ کر صمد رحمن نے لائن سے کھڑے سرفروشوں میں سے پہلے نمبر والے سے ہاتھ ملایا ان کے سیکریٹری نے ایک موٹا سا لفافہ انہیں پکڑایا جو انہوں نے اس سرفروش کے ہاتھ میں تھما دیا۔ پھر اسی طرح دوسرے... تیسرے اور چوتھے نمبر والے سرفروش نے بھی ہاتھ ملا کر لفافہ لے لیا۔

جب انہوں نے پانچویں اور آخری سرفروش کی طرف ہاتھ بڑھایا مصافحے کے لیے تو اس نے اپنا ہاتھ ان کی طرف نہیں بڑھایا بلکہ اپنے ہاتھ پیچھے باندھے خاموش کھڑا رہا۔ صمد صاحب نے چونک کر اس سرفروش کا چہرہ دیکھا۔ دبلا پتلا... زردی مائل چہرہ... اس پر چھوٹی چھوٹی سیاہ داڑھی... اور وہ براؤن خوب صورت آنکھیں جنہیں وہ لاکھوں میں پہچان سکتے تھے۔ وہ حیران ہو کر چلائے۔

”تم...؟“

”جی... جناب صمد رحمن صاحب! میں... بات دراصل یہ ہے کہ میرا باپ بہت دولت مند آدمی ہے اس کے پاس اتنی زیادہ دولت ہے کہ ایسے کئی دس لاکھ تو وہ یونہی بانٹ دیتا ہے۔ میں تو اس جگہ اس لیے موجود ہوں کہ شاید اس طرح کسی ایک برائی کو ختم کر سکوں اور برائی کرنے والے کو سزا دے سکوں۔ ایک ایسے شخص کو جس نے میرے لیے یہ دنیا تو خراب کی ہی ہے، میں جانتا ہوں کہ میری وہ دنیا بھی بگڑ گئی۔ جہاں میں اب جانے والا ہوں۔ لیکن میرے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ چھوڑا ہی نہیں گیا۔ میرے نام کے اس لفافے میں جو رقم ہے اس سے میرے لیے کچھ نیک لوگوں کی طرف سے دعائے مغفرت کا انتظام کروا دیجیے گا... شاید میری سختیاں کچھ کم ہو جائیں۔“

صمد رحمن بھونچکا ہو کر اس کی شکل دیکھ رہے تھے اور اس کی باتیں کانوں سے تو سن رہے تھے لیکن دماغ تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ مولانا جبار نے آگے بڑھ کر ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

”صمد صاحب! کیا مسئلہ ہے؟“

”یہ... یہ... وہ... لڑکا نہیں جا سکتا۔ یہ اپنی جان دینے کے لیے نہیں جا سکتا۔ کبھی بھی نہیں۔“ وہ ہکلا ہکلا کر بول رہے تھے۔

”کیوں صمد صاحب! کیوں نہیں جا سکتا؟“ مولانا جبار کچھ پریشان سے ہوئے۔

”نہیں جا سکتا... کیونکہ یہ...“ صمد صاحب کچھ کہہ ہی رہے تھے کہ فیضان نے ان کی بات اچک لی۔

”یہ شاید صمد صاحب کے معیار پر پورا نہیں اتر رہا ہے۔ شاید اس کے بارے میں کچھ خدشات ہیں سر کو... مولانا صاحب! ہم ایسا کرتے ہیں کہیں بیٹھ کر اس بارے میں بات کرتے ہیں... پھر صاحب بتائیں گے کہ مسئلہ کیا ہے؟“ فیضان نے صمد صاحب کے کاندھے پر دباؤ ڈال کر انہیں کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔

”جی جی... ضرور... آیئے سر... آیئے آفس میں چل کر کچھ دیر بیٹھتے ہیں۔ احسان اللہ! تم ذرا یہ سب دیکھ لو۔“

”جی محترم! آپ بے فکر رہیں۔“ احسان اللہ نے احترام آمیز لہجے میں کہا۔

مولانا کے آفس میں فرشی نشست تھی۔ موٹا اور دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور بڑے بڑے گاؤ تکیے اور فلور کشن دیوار کے ساتھ ساتھ رکھے ہوئے تھے۔

صمد رحمن کے اندر ایک شدت کی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اور اپنی اس کیفیت سے وہ نڈھال سے ہو رہے تھے۔ آفس میں جا کر وہ ایک کونے میں بیٹھے لیکن شاید ان سے بیٹھا نہیں گیا۔ وہ گاؤ تکیے پر ڈھیر ہو گئے۔ مولانا جبار نے جلدی سے ایک گلاس میں کوئی مفرح القلب قسم کا کوئی شربت پیش کیا جس کے چند گھونٹ پی کر وہ نسبتاً کچھ بہتر ہوئے۔

”کیا بات ہے صمد صاحب! آپ کو اس سرفروش کے بارے میں کیا خدشات ہیں؟ کچھ بتائیں تو سہی۔“ مولانا نے پوچھا۔

”میرا بیٹا ہے وہ... میرا بیٹا... جبار! یہ یہاں تک کیسے پہنچا؟“ ان کی بات سن کر مولانا خود حیران رہ گئے۔

”کیا؟ وہ آپ کا بیٹا ہے؟ آپ کا تو شاید ایک ہی بیٹا ہے؟ یہ وہی ہے؟“ مولانا حیرت کی زیادتی کے سبب صحیح طرح بول نہیں پا رہے تھے۔

”ہاں... اور میں نے پوچھا ہے... کہ یہ یہاں تک پہنچا کیسے؟“ صمد صاحب نے آتشیں لہجے میں پوچھا تو مولانا کی نظروں کا زاویہ بدلا۔

”یہاں تک ہر ہما شما نہیں پہنچ سکتا جس میں صحیح جذبہ ہوتا ہے وہی پہنچتا ہے... اور اس لڑکے میں یہ جذبہ اتنا شدید تھا کہ وہ ڈیڑھ ماہ کی مختصر مدت میں اس مقام تک جا پہنچا... کل ان پانچوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے... اپنے آپ کو فنا کر دینا ہے۔ انہیں ان کے مقاصد سے آگاہ کر دیا گیا ہے ابھی کچھ ہی دیر میں ان کی روانگی ہونے والی ہے۔“ مولانا نے روکھے سے لہجے میں کہا تو صمد صاحب چیخ پڑے۔

”نہیں... وہ نہیں جائے گا... وہ میرا بیٹا ہے... اور میں اسے مرنے کی اجازت نہیں دے سکتا... میں اسے نہیں جانے دوں گا... جاؤ روک لو اسے... یہاں لے کر آؤ... میں اسے اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔“ صمد صاحب نے چلا چلا کر کہا تو مولانا بڑی سرد سی نظروں سے انہیں دیکھنے لگے۔

”صمد صاحب! اس کے ساتھ جو دوسرے چار لڑکے ہیں۔ وہ بھی کسی کے بیٹے ہیں اور ان سے پہلے جو اسی مہم پر جاتے رہے ہیں وہ بھی کسی نہ کسی کے بیٹے تھے۔ تو اگر آپ کا بیٹا اس عظیم مقصد کے لیے اپنی جان دینے جا رہا ہے تو آپ پریشان کیوں ہیں؟ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ اس کے شہادت کے عظیم مرتبے پر فائز ہونے کا ثواب آپ کو بھی ملے گا۔ بخشے جائیں گے آپ... اور آپ کے سب گھر والے۔“

”شٹ اَپ، فضول باتیں مت کرو... میں جانتا ہوں کہ خودکشی کا کوئی ثواب نہیں... بلکہ گناہ ملنے کا پورا امکان ہے جاؤ اور اسے لے کر آؤ۔“ صمد صاحب نے پھر چلا کر کہا۔

”آپ بیٹھیے... اتنے پسینے آ رہے ہیں آپ کو... آپ کی حالت ٹھیک نہیں ہے... میں بلواتا ہوں کسی سے۔“

پھر نہ جانے فیضان نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا اشارہ کیا مولانا کو... اور اٹھتے ہوئے بولا۔

”مولانا! آپ سر کو گلوکوز وغیرہ پلایئے... میں خود لے کر آتا ہوں ان کے بیٹے کو۔“

”جی ضرور۔“ مولانا اٹھے۔ انہوں نے ایک الماری کھول کر گلوکوز کا ڈبا نکالا۔ ڈسپنسر سے ٹھنڈا پانی لیا۔ اس میں گلوکوز ملایا اور مٹھی میں دبی نہ جانے کیا چیز چپکے سے گلاس میں ڈال کر اسے چمچے سے اچھی طرح حل کیا اور وہ گلاس صمد کو پکڑا دیا۔

”یہ لیں صمد صاحب! گلوکوز پی لیں۔ آپ کی طبیعت

بحال ہو جائے گی۔" انہوں نے اصرار کر کے وہ پورا گلاس صمد صاحب کو پلا دیا۔

"تھوڑی دیر آرام کریں، لیٹ جائیں۔ فیضان آپ کے بیٹے کو لے کر آتا ہی ہوگا۔" انہوں نے ان کی مندتی ہوئی آنکھیں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ لیٹے اور لمحوں میں آنکھیں بند کر کے سو گئے۔

مولانا جبار نے کچھ طنزیہ نظروں سے انہیں گھورا اور خود دوسرے کشن پر سر رکھ کر لیٹ گئے۔ لیٹ کر وہ نہ جانے کیا کیا سوچتے رہے، بار بار وہ سوئے ہوئے صمد صاحب کو دیکھتے تو ان کی آنکھوں میں بغض و عداوت کی جھلکیاں صاف نظر آتیں پھر وہ اپنی نظریں ہٹا لیتے اور اپنی سوچوں میں گم ہو جاتے... پھر آخر کار انہوں نے بڑے تلخ لہجے میں زیرِ لب بڑبڑا کر کہا۔

"ہونہہ... دوسروں کے بیٹوں کو بھیجتے رہے موت کے راستے پر... تو کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ آج اپنے بیٹے کو اس راستے پر جاتا دیکھتے ہوئے کس طرح حواس باختہ ہو رہے ہیں۔ یہی ہے اس اوپر والے کا احتساب... اب تم تڑپتے رہنا... اپنی باقی زندگی... تو پتا چلے گا کیا ہوتا ہے اولاد کا دکھ۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے کروٹ بدل لی۔

ادھر فیضان کافی دور پیدل چل کر واپس وہیں کیمپ کے میدان میں پہنچا اور طلبہ کے اس ہجوم میں سے اس نے احسان اللہ کو ڈھونڈ کر بلوایا۔

"ہاں بھئی، کب روانگی ہے ان سرفروشوں کی؟" اس نے پوچھا۔

"بس گاڑی تو آگئی ہے انہیں لے جانے کے لیے... سب لوگ کھانا کھا رہے ہیں کھانے کے فوراً بعد روانگی ہے۔"

"اندازاً کتنی دیر لگے گی؟" فیضان نے پوچھا۔

"شاید آدھا گھنٹا... ویسے صمد صاحب نے جس سرفروش کو روکا ہے، اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟" احسان اللہ نے پوچھا۔

"کیا اس سرفروش نے کچھ کہا ہے؟" فیضان نے پوچھا۔

"نہیں، اس نے تو کچھ نہیں کہا۔ میں صمد صاحب کی وجہ سے پوچھ رہا ہوں۔" احسان اللہ نے فیضان کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، جانے دو سب کو... کسی کو روکنے کی ضرورت نہیں ہے جب آج تک اس آخری مرحلے پر پہنچ کر کسی کو نہیں روکا گیا تو اب بھی کسی کو نہیں روکا جائے گا۔" فیضان نے صاف لفظوں میں کہا تو اس کے لہجے سے سفاکی جھلک رہی تھی۔

☆☆☆

"نہیں... نہیں... یہ نہیں ہو سکتا... نہیں..." زور زور سے چیخ رہی تھی۔

تاباں اور ممی دونوں اس کی چیخیں سن کر دوڑتی ہوئی اس کے کمرے میں آئیں تو خوباں پریشان حالی میں ٹی وی کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں ٹی وی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں اور چہرے پر وحشت پھیلی ہوئی تھی۔

"خوباں! کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟ کیوں چلائی تم... کیا ہو گیا؟" فرزانہ نے پریشانی میں بہت سارے سوال کر ڈالے جن کے جواب میں خوباں نے اپنے لرزتے ہاتھ کی انگلی اٹھا کر ٹی وی کی طرف اشارہ کیا۔ اس اشارے پر ان دونوں نے ٹی وی کی طرف دیکھا۔

دو خودکش بم دھماکے ہوئے تھے۔ ایک کراچی میں اور ایک کوئٹہ میں۔ حملہ آور نے اپنے آپ کو دھماکے سے اڑا لیا جس کے نتیجے میں تقریباً پندرہ افراد ہلاک ہو گئے تھے اور بے شمار زخمی ہوئے تھے۔

دوسرا دھماکا کراچی میں ہوا تھا۔ حملہ آور ایک سیاسی رہنما کو دھماکے میں اپنے ساتھ مار دینا چاہتا تھا لیکن اس کے جسم سے بندھا دھماکا خیز مادہ وقت سے پہلے پھٹ پڑا۔ نتیجے میں کئی لوگ زخمی ہوئے لیکن حملہ آور کے جسم کے چیتھڑے اڑ گئے۔

"بیٹا! اس طرح کی خبریں تو آتی رہتی ہیں تم دہشت زدہ کیوں ہو؟" فرزانہ نے بیٹی کی وحشت اور خوف دیکھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر تسلی آمیز لہجے میں کہا تو اس نے سر جھٹک کر اسی وحشت آمیز پھٹی پھٹی سی آواز میں کہا۔

"نہیں... نہیں... وہ وہ سر... ممی... اس کو دیکھو... غور سے دیکھو تاباں... اس سر کو دیکھو۔" وہ بریکنگ نیوز تھی اور ٹی وی چینل پر تسلسل کے ساتھ اس کا فوٹیج دکھایا جا رہا تھا ایک مرتبہ پھر ٹی وی کیمرے نے زوم کر کے دھڑ سے الگ ہو جانے والا سر دکھایا۔ تو فرزانہ کا دل بھی دھڑک کر جیسے حلق میں آکر اٹک گیا۔

"یہ... یہ تو... سعد سے مل رہا ہے۔" انہوں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں جیسے خود سے کہا۔

"ہاں... ہاں ممی... یہ تو... بالکل بھائی جیسا ہے... بھائی کہاں ہے؟ خوباں! بھائی کہاں ہے... فون کر... جلدی... فون کر... معلوم کرنا جلدی... بھائی کہاں ہے؟" تاباں نے بے تابی سے دہشت زدہ خوباں کو جیسے

خواب سے جگاتے ہوئے کہا۔

"مجھے... مجھے نہیں معلوم... وہ کہاں ہے... وہ خود ہی کبھی کبھی فون کر کے اپنی خیریت کی اطلاع دے دیتا ہے... کبھی کہتا ہے میں آج کل سوات میں گھوم رہا ہوں... کبھی کشمیر سے فون آتا ہے اس کا... ایک ہفتے پہلے فون آیا تھا... کہہ رہا تھا میں راستے سے فون کر رہا ہوں... ہم لوگ کاغان کی طرف جا رہے ہیں... میں کہاں سے پتا کروں؟" خوباں نے بے بسی سے کہا اور اس کی آواز رندھ گئی۔

پھر وہ اپنے فون کی طرف لپکی... کوئی نمبر پنچ کیا۔

"ہیلو... ہیلو منصور! ہاں سنو... مجھے ابھی اسی وقت کوئی بھی فلائٹ ملے... اس سے کراچی جانا ہے... پلیز میری ہیلپ کرو... نائٹ کوچ سے میری سیٹ اوکے کروا کے مجھے فون کرو... اٹس ویری ارجنٹ... تو... تو... پلیز! مجھ سے ابھی کچھ مت پوچھو... میں کچھ بتا نہیں پاؤں گی... پلیز! ہری اپ... ہاں... بس میں تیار ہوں جیسے ہی تمہارا فون ملتا ہے میں نکل آؤں گی... فار گاڈ سیک... مجھ سے سوال مت پوچھو... یس اوکے... آئی ایم ویٹنگ۔"

خوباں کا لہجہ اور انداز دونوں حواس باختہ سے تھے۔

تاباں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے صرف یہی کہا۔

"مجھے خود نہیں معلوم... میں وہاں کیوں جا رہی ہوں۔ لیکن میں ہر صورت میں اس سر کو قریب سے دیکھنا چاہتی ہوں... تم لوگ کوشش کرو... بھائی کا پتا لگانے کی اس کے جتنے دوست ہیں... سب کو فون کر کے پتا کرو... شاید کسی کو معلوم ہو کہ وہ اس وقت کہاں ہے... شاید ہمارے اندیشے بے بنیاد ہی ثابت ہوں۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" تاباں نے کہا۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ خوباں نے فون ریسیو کیا اور بیگ اٹھا کر پلٹی۔

"ممی! میں کراچی جا رہی ہوں... دعا کرنا کہ ہمارے خدشات بے بنیاد ثابت ہوں اور بھائی کے ہر دوست کو فون کر کے پوچھو۔" خوباں تیزی سے باہر نکلتی چلی گئی۔ باہر منصور اس کا منتظر تھا۔ وہ دونوں ہی کراچی کے لیے نائٹ کوچ سے روانہ ہو گئے۔

تاباں نے سعد کے ہر دوست سے رابطہ کیا لیکن کسی سے اس کی کوئی خبر نہ مل سکی۔ ہاں البتہ یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ اس کا کوئی دوست اس کے ساتھ نہیں گیا۔

"تو کیا بھائی اکیلا ہی گھومنے گیا تھا؟ لیکن وہ تو دوستوں کا ذکر کرتا رہا ہے تو کیا وہ غلط بیانی کرتا رہا ہے؟" یہ سوچ کر تاباں کے دل میں ایک بھونچال سا اٹھا۔

"یا اللہ! میرے بھائی کو خیریت سے رکھنا۔" اس نے آنکھیں بند کر کے ہاتھ جوڑ کر اللہ کے حضور التجا کی۔

لیکن ایسا ہوا نہیں... اس کی دعا قبول نہیں ہوئی۔ تمام رات وہ دونوں ماں بیٹیاں سعد کی زندگی اور خیریت کی دعائیں مانگتی رہیں لیکن وہ دعائیں قبولیت کے مرحلے تک پہنچ نہیں پائیں، کیونکہ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا۔

صبح نو بجے کے قریب خوباں گھر میں داخل ہوئی تو اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں اور اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔ وہ سیدھی اپنے کمرے کی طرف گئی تو تاباں اور اس کی ممی بھی اس کے پیچھے دوڑیں۔

"خوباں... خوباں... کیا ہوا؟ بتاؤ... تم نے دیکھا تھا وہ سر قریب سے... کوئی اور تھا نہ وہ... سعد تو... نہیں تھا نا... خوباں... کچھ تو بولو؟" فرزانہ نے بے تابی سے خوباں کے ستے ہوئے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر جھنجوڑ ڈالا۔

خوباں کی آنکھیں نم تھیں اور وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہاں... میں نے دیکھا تھا مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں تھا۔ اس لیے میں نے ان ہاتھوں سے اسے چھو کر دیکھا تھا۔ ان ہاتھوں سے... اور ان ہاتھوں نے... اس کے لمس کو پہچان لیا تھا... وہ لمس جو میرے اپنے خون کا تھا میرے اپنے ماں جائے کا تھا۔ میرے بھائی کا تھا... ممی... وہ... وہ میرا بھائی تھا۔" یہ کہہ کر خوباں اس طرح پھوٹ کر روئی کہ جیسے کوئی بادل ٹوٹ کر برسے۔

فرزانہ پہلے تو سکتے کی سی حالت میں کھڑی رہیں۔ پھر سنبھلتے سنبھلتے بھی گر گئیں۔ تاباں بھی ان سے لپٹ کر بری طرح رو رہی تھی۔

"بھائی! تم نے یہ کیا کر ڈالا..." خوباں کو ایک پل چین نہیں آ رہا تھا۔

مگر اس نازک وقت میں بھی انہیں اس بات کا پوری طرح خیال تھا کہ ان پر گزرنے والے اس سانحے کا کسی کو پتا نہ چلے۔ تاباں نے دروازہ بند کر دیا تھا تاکہ کوئی نوکر ملازم ادھر نہ آجائے اور وہ تینوں اس طرح روتی رہیں کہ انہیں خود شاید اسی دن پتا چلا کہ خون کے آنسو کیسے بہتے ہیں۔ کیسے کلیجہ کٹ کٹ کے آنکھوں کے راستے پھوٹتا ہے اور کیسے سانسوں کے بہانے دو دھاری تلوار سینے پر چلتی ہے۔ وہ دکھ اور اذیت کے

احساس سے نڈھال... اپنے آپ سے بیگانہ ہو رہی تھیں۔

"آخر سعد نے ایسا کیا کیوں؟ وہ تو ایسا نہیں تھا۔ میرا بیٹا تو بہت پیار کرنے والا تھا۔ وہ اس طرح حرام موت کیوں گلے لگائے گا؟ اسے کس نے مجبور کیا ایسا کرنے پر...؟" وہ اپنے آپ سے سوال کیے جا رہی تھیں۔

"خوباں! تیری بہت دوستی تھی بھائی سے... تجھے کچھ تو بتایا ہوگا اس نے... کچھ تو خبر ہوگی تجھے؟" انہوں نے خوباں سے پوچھا۔

"مجھے اگر اس کے ارادوں کی خبر ہوتی... تو کیا میں جانے دیتی اسے موت کے راستے پر... میں اپنی جان دے کر اس کا راستہ روک لیتی ممی۔" خوباں نے آزردگی سے کہا۔

"پھر مجھے تیرے بابا سے پوچھنا ہوگا... انہیں ضرور معلوم ہوگا۔" فرزانہ نے کہا۔

"بابا سے آپ کو ہی نہیں... مجھے بھی بہت کچھ پوچھنا ہے ممی۔" لیکن بابا ہیں نہیں... کہیں آؤٹ آف سٹی گئے ہوئے ہیں... میں دیکھتی ہوئی آئی ہوں۔" خوباں نے سوچتے ہوئے کہا۔

ممی کی حالت زیادہ بگڑ رہی تھی۔ تاباں نے انہیں ایک سکون آور انجکشن لگا دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ روتے روتے سو گئیں۔ تاباں بھی انہی کے نزدیک قالین پر کشن رکھ کر لیٹ گئی۔ ایک خوباں تھی جو کرسی پر بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھائی کے ساتھ گزاری زندگی کے لمحے لمحے کی تصویریں جیسے جل بجھ رہی تھیں۔

وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر نکلی اور سیدھی سعد کے کمرے میں گئی۔

اندر داخل ہوتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے... یہاں اس کی مانوس اور من پسند خوشبو بسی ہوئی تھی۔ ڈریکر ہمیشہ سے ہی اس کو بہت پسند تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے بیڈ تک گئی۔ اس کا تکیہ اٹھا کر چہرے کے سامنے کیا تو یوں لگا جیسے بھائی سامنے ہی کھڑا ہے۔ اس کی مانوس مہک اس کے تکیے میں بسی ہوئی تھی۔ وہ تکیے کو بھینچ کر اور اس میں منہ چھپا کر سسک سسک کر رونے لگی۔

پھر تکیہ بیڈ پر ڈال کر اس کی رائٹنگ ٹیبل پر آ گئی۔ ایک طرف اس کا کمپیوٹر تھا۔ کونے میں ٹیبل لیمپ تھا۔ کچھ میگزین اور کتابیں تھیں۔ ڈائری بھی رکھی تھی۔ خوباں نے ڈائری سب سے پہلے اٹھا کر جلدی جلدی اس کے سارے صفحے پلٹ ڈالے۔ اس میں سے بھائی اور شزہ کی یونیورسٹی کے زمانے کی ایک تصویر نکل کر گری۔ اس نے آنکھوں سے قریب کر کے اس تصویر کو دیکھا۔ یونیورسٹی کی طرف سے شاید کوئی ٹر[illegible] تھا وہاں پر ان دونوں کی یہ تصویر تھی۔

"کیسے پیارے لوگ تھے۔ ایسے گئے کہ دنیا [illegible] کر گئے۔" خوباں نے تصویر کو چوم لیا اور بھری بھری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اسے واپس ڈائری میں رکھ دیا۔

اب وہ درازیں کھول کھول کر دیکھ رہی تھی۔ جانے کیا کباڑ بھرا ہوا تھا۔ دراز آدھی کھلی اور اس کے اندر کوئی [illegible] اٹک گئی تو وہ پوری کھل نہیں پا رہی تھی۔ خوباں نے دراز کو جھٹکا دے کر اسے مزید کھولنا چاہا تو وہ پوری کی پوری نکل کر باہر قالین پر گر گئی اس میں بھری ہوئی ساری چیزیں بکھر گئیں۔ اسی میں ایک خوب صورت ریپنگ میں ایک گفٹ رکھا ہوا ملا۔

خوباں حیران ہو کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔ ایک طرف بھائی کی خوب صورت رائٹنگ میں لکھا ہوا تھا:

اپنی پیاری بہن اور دوست

خوباں کے لیے

سعد کی طرف سے۔

خوباں کے چہرے پر سنسنی پھیل گئی۔ اس نے جلدی جلدی دراز کی باقی چیزیں اس میں واپس ڈال کر دراز اپنی جگہ فکس کی اور بے تابی سے اس پیکٹ کو کھولا تو اس میں سے ایک بڑا خوب صورت آئی پوڈ نکلا۔ وہ تحسین آمیز نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ الٹ پلٹ کر کے... اسے آن کیا۔ اسکرین پر آنے والے نشان بتانے لگے کہ اسے چارج کی ضرورت ہے۔

خوباں نے اسے کمپیوٹر آن کر کے چارج پر لگا دیا۔ تھوڑی دیر میں چارج ہوتے ہی اس کی ننھی سی اسکرین جاگ سی پڑی۔ اس پر کچھ اجنبی سے میسج نظر آ رہے تھے۔ کچھ مختلف ڈیٹا کی سمری۔

خوباں نے اسے کمپیوٹر سے کنیکٹ کیا اور پلے کر دیا۔ دو چار الٹے سیدھے بلینک سے فریم نظر آئے پھر سعد کا چہرہ سامنے آ گیا۔ وہ شاید اپنے ہاتھ میں پکڑے کیمرے کا رخ اپنے ہی چہرے کی طرف کر کے ریکارڈنگ کر رہا تھا۔ خوباں نے بے چین ہو کر ہیڈ فون کانوں سے لگایا تو اسے سعد کی آواز سنائی دی۔

"خوباں! میں جانتا ہوں، تم میری بہت محبت کرنے والی اور بہادر بہن ہو لیکن میری اور تمہاری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم ایک ایسے گھر میں پیدا ہوئے ہیں جس گھر کا سائبان ناقابل اعتبار ہے۔ میری زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح تمہارے سامنے ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ایک بڑے گھر کا اکلوتا بیٹا... جس کو زندگی کے وہ تمام وسائل حاصل تھے جو کسی بھی ٹاپ کلاس جینٹری کو حاصل ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود... میری زندگی میں محرومیاں، ناکامیاں اور مایوسیاں اتنی زیادہ رہی ہیں کہ میرا ضبط، برداشت اور صبر... ہمیشہ آزمائش میں مبتلا رہا ہے۔

"میری سب سے بڑی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ میں ایک ایسے باپ کا بیٹا ہوں جس کا کردار میری نظر میں انتہائی قابل اعتراض ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ بابا کو ان کے راستے سے ہٹا کر ان کی غلطی کی اصلاح کر دوں... اس سلسلے میں کئی دفعہ میں نے ان سے بات بھی کی لیکن انہوں نے ممی اور تم دونوں بہنوں کی دھمکی دے کر مجھے منہ اور آنکھیں بند رکھنے کی ہدایت کی۔

"تب میں مایوس ہو گیا... اور محض انہیں سزا دینے کے لیے... اب میں اس راستے پر قدم بڑھا رہا ہوں جہاں وہ اب تک نہ جانے کتنے بیٹوں کو دھکیل چکے ہیں۔ اس موہوم سی امید پر کہ شاید... شاید اپنے دل پر پڑنے والی چوٹ انہیں راہ راست پر لے آئے۔

"خوباں! یہ آئی پوڈ اس لحاظ سے بہت زیادہ اہم ہے کہ اس میں وہ سارا ڈیٹا موجود ہے جو میں نے مختلف طریقوں سے بابا اور فیضان حسن کے کرتوتوں کے بارے میں جمع کیا ہے۔ اس میں تمہیں ایسی ایسی چیزیں نظر آئیں گی کہ تمہیں خود اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آئے گا۔ لیکن بدقسمتی سے... یہ سب کچھ بالکل سچ ہے۔

"خوباں! یہ سارا ریکارڈ تمہارے حوالے کرتے ہوئے مجھے کچھ ڈر بھی لگ رہا ہے کیونکہ اگر کسی کو اس بات کی بھنک بھی پڑ گئی کہ سارے ثبوت تمہارے پاس ہیں... تو تمہاری جان کو خطرہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں احتیاطاً ان سارے ریکارڈز کی ہارڈ کاپیز اپنے کمرے میں ہی دوسری جگہ چھپا کر رکھ دی ہیں۔ اگر کسی کو شبہ ہوا تو وہ میرے کمرے کی تلاشی ضرور لے گا اور اسے جب یہ سب ہارڈ کاپیز مل جائیں گی تو مطمئن ہو جائے گا کہ اب کوئی ثبوت نہیں رہا، اس سے تمہارے لیے خطرات کم ہو جائیں گے اور تمہیں خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ تمہیں سب سے بڑا خطرہ فیضان اور بابا سے ہے۔ فیضان کو انڈر اسٹیمیٹ مت کرنا بابا اس کے ہاتھوں میں ایک مہرہ ہیں۔

"میں جانتا ہوں کہ میری بہن بہت سمجھ دار اور بہادر ہے۔ ممی اور تاباں کا خیال رکھنا... اور مجھے معاف کر دینا کہ جو ذمے داری میری تھی، وہ میں تمہیں سونپ کر جا رہا ہوں لیکن اس امید پر کہ میں نے تم لوگوں کی راہ کے کانٹے چن لیے ہیں اور تمہاری آئندہ زندگی کا سفر خوشگوار رہے گا... اللہ حافظ۔"

سعد کا چہرہ گم ہو گیا۔ خوباں کے تو دل کو پنکھے سے لگ گئے۔ بھائی نے کیا دیکھ لیا... کون سے ثبوت جمع کر لیے۔

اس نے اٹھ کر دروازے کو لاک کیا۔ اور مزید آگے دیکھنے لگی۔ وہ دیکھ رہی تھی۔ سن رہی تھی۔ نہ جانے کیا کیا لکھا ہوا تھا۔ کیا کیا وہ سن رہی تھی۔ خصوصاً بابا ٹیلی فون پر مختلف لوگوں سے جو باتیں کر رہے تھے وہ سن سن کر خوباں کے ذہن میں اصل بابا کی جو تصویر بن رہی تھی وہ بہت ہیبت ناک تھی اگرچہ وہ اپنے طور پر بھی کافی کچھ بابا کے بارے میں جان گئی تھی۔ خاص طور پر پچھلے دنوں منصور نے مدرسے اور ان کے کیمپ میں گھس کر جو معلومات اکٹھا کیں... ان میں بابا کی موجودگی جس طرح ظاہر ہوئی وہ خود اس کے لیے ناقابلِ یقین تھی لیکن یہاں تو ایک دفتر بھرا پڑا تھا۔

"تمہیں اپنوں نے مار دیا بھائی!" خوباں بری طرح روئی اور بڑی دیر تک روتی رہی پھر اپنے آپ کو سنبھالا۔ آنسو پونچھے۔

"میں تمہارا خون رائگاں نہیں جانے دوں گی بھائی... بابا کو تمہارے خون کا حساب دینا پڑے گا۔" خوباں نے اپنے آپ سے عہد کیا۔

پھر اس نے کمپیوٹر آف کیا۔ آئی پوڈ اٹھا کر واپس نکلنے لگی تو بیڈ کے سرہانے لگی سعد کی بڑی سی تصویر نے اس کے قدم روک لیے۔ وہ مڑ کر گئی۔ دوپٹے کے پلو سے اس نے سعد کے کھلکھلاتے چہرے سے گرد صاف کی۔

"کس قدر زندہ اور زندگی سے بھرپور تصویر ہے۔ کسے معلوم تھا کہ اتنی جلد اس میں سے زندگی نکل جائے گی۔ خدا تمہاری اس زندگی میں... تمہارے درجات بلند کرے بھائی! تم نے کتنی جلدی کی۔ ہم لوگوں کے بارے میں خصوصاً میرے بارے میں بالکل نہیں سوچا کہ میں تمہارے اور کتنی اکیلی رہ جاؤں گی۔ اپنے دکھ سکھ کس کے ساتھ شیئر کروں گی۔ ایک تم ہی تو دوست تھے میرے۔"

خوباں آنسو پونچھتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے دروازے کے قریب کی ہولڈر سے چابی اٹھائی اور دروازہ بند کر کے لاک کر دیا۔

رات کافی گزر چکی تھی۔ وہ باہر نکل کر ساری لائٹیں بند کرتی ہوئی کچن میں گئی۔ پھر واپس مڑ کر کچن کی لائٹ بھی بند کر دی۔ اب صرف لاؤنج میں ایک چھوٹی سی لائٹ جل رہی تھی

جس کی بہت ہلکی روشنی محدود سے حصے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے کچن کے اندر کاؤنٹر کے پیچھے اونچا اسٹول اس طرح رکھا کہ سعد کے کمرے کا دروازہ وہاں سے صاف نظر آرہا تھا۔ اب وہ کچھ دیر اندھیرے میں بیٹھ کر دیکھنا چاہتی تھی کہ کیا ہوتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی بھائی کے کمرے میں گھسنے کی کوشش ضرور کرے گا۔

کافی دیر وہ اسی طرح ساکت اندھیرے کا حصہ بنی سعد کے کمرے کے دروازے کو گھورتی رہی۔ پھر اس پر ہلکی ہلکی نیند کے حملے ہونے لگے۔ اچانک اس پر نیند طاری ہوتی... آنکھیں بند ہوتیں اور سر جھکتے جھکتے ایک جھٹکا کھاتا... تو وہ پھر ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیتی اور دروازے پر نظریں جمائے رکھنے کی کوشش کرتی۔ ایسی کئی کوششوں کے بعد آخر کار اسے کامیابی ہوئی۔ ایک مرتبہ جو اس نے نیند سے لڑتے ہوئے آنکھیں کھولیں تو اسے سعد کے کمرے کے دروازے پر ایک انسانی سایہ نظر آیا جو دروازہ کھولنے کی کوشش میں اس کے لاک کا لٹو گھمائے جارہا تھا۔

اپنی کوششوں میں ناکامی پر وہ مڑا اور جانے کے لیے قدم بڑھائے تو اس کے چہرے کے ایک حصے پر پڑنے والی ہلکی سی روشنی نے بتادیا کہ وہ فیضان حسن کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ وہ مڑ مڑ کر دروازے کو دیکھتا ہوا لاؤنج کے بیرونی دروازے سے باہر نکل گیا۔

لیکن اس کے الجھن بھرے تاثرات اور اس کی باڈی لینگویج نے صاف بتادیا کہ وہ ابھی پھر واپس آئے گا اور سعد کے کمرے میں گھسنے کی کوشش کرے گا۔ اسے دیکھ کر خوباں کے اندر نفرت کی ایک شدید لہر اٹھی۔

"ٹھیک ہے مسٹر فیضان! اصل فساد کی جڑ تم ہی ہو۔ تمہیں جب تک اکھاڑا نہیں جائے گا، بربادیوں کا شجر اسی طرح ہمارے گھر میں پھلتا پھولتا رہے گا۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھی اور اپنے آپ کو روشنی سے بچاتی ہوئی تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھی اس نے آہستگی سے ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا تو امی اور تاباں دونوں سو رہی تھیں۔ دونوں کی پلکوں پر اب تک آنسوؤں کی نمی نظر آرہی تھی۔ اسے اپنی ماں کی حالت دیکھ کر اور بھی دکھ ہوا۔

"آپ کتنی بدنصیب ماں ہیں ممی! جب آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ آپ کے لاڈلے اکلوتے بیٹے کا قاتل... آپ کا شوہر ہی ہے تو اس دہرے دکھ کو آپ کس طرح جھیلیں گی۔" اس نے افسوس میں سر ہلایا اور تیزی سے دراز کھول کر اپنا پرس دیکھا۔ جلدی جلدی اس میں پڑی چیزوں کو ٹٹولا تو مطلوبہ چیز حاصل ہوگئی۔

یہ ایک چھوٹا سا پسٹل تھا۔ یہ اس نے پشاور سے خریدا تھا۔

"تمہارے لیے یہی کافی ہے مسٹر فیضان!" خوباں نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے باہر واپس اپنے ٹھکانے پر آنے میں دیر نہیں کی اب وہ پھر اندھیرے میں اسٹول پر بیٹھی اس کی واپسی کا انتظار کررہی تھی اور کچھ دیر بعد اس کا اندازہ درست ثابت ہوگیا۔

وہ فیضان ہی تھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ عجیب سا ٹول تھا جس کا نوک دار سرا اس نے کی ہول میں ڈال کر اس کے اوپر لگا ہوا ایک بٹن دبایا۔ گھرررر کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ جیسے کوئی چھوٹی سی ڈرل مشین چل رہی ہو اور فوراً ہی فیضان نے بٹن پر سے ہاتھ ہٹالیا۔ پھر اس نے ٹول دوسرے ہاتھ میں لے کر دروازے کی ناب گھمائی تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اس نے پھرتی سے اندر داخل ہوکر دروازہ بند کرلیا۔

خوباں بڑی اچھی طرح اندازہ کرسکتی تھی کہ اس وقت فیضان اندر کیا کررہا ہوگا۔ وہ کچھ دیر انتظار کرتی رہی پھر بڑے مضبوط ارادے سے اٹھی۔ اس نے سیدھے ہاتھ میں پسٹل کو ٹھیک طرح سے تھاما اور اس پر دوپٹا ڈال لیا تاکہ وہ نظر نہ آئے۔ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے ہلکے سے ناب گھمایا تو وہ بے آواز گھوم گیا۔ آہستگی سے دروازہ دھکیلا اور اندر داخل ہوگئی۔ فرش پر دبیز قالین ہونے کے سبب اس کی کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔

اس نے دیکھا کہ فیضان نے سعد کی الماری سے کافی چیزیں نکال کر بیڈ پر ڈالی ہوئی ہیں اور وہ پاگلوں کی طرح الماری میں کچھ تلاش کررہا ہے۔

وہ چپ چاپ کھڑی دیکھتی رہی پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہوئی وہ اس کے سر پر پہنچ گئی۔ پستول اس کے سر سے لگایا اور نہایت سرد آواز میں اسے مخاطب کیا۔

"یہ پستول ہے اور میری انگلی ٹریگر پر... چپ چاپ ہاتھ اوپر کرکے کھڑے ہوجاؤ... بس... الماری سے بالکل چپک جاؤ... نو... نو... دونوں ہاتھ اسی طرح اوپر رکھو۔" خوباں نے پستول کا دباؤ اس کے سر پر بڑھاتے ہوئے اسے زور سے دھکا دیا۔

"خوباں بی بی! میں... میں... فیضان ہوں۔" فیضان نے بوکھلاہٹ میں کہا۔

"جانتی ہوں۔ بہت اچھی طرح جانتی ہوں اور اسی لیے پوچھ رہی ہوں کہ تم جیسا نوکر... اپنے مالک کے کمرے میں گھس کر کیا چرانے کی کوشش کررہا ہے؟" خوباں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"میں کچھ چرا نہیں رہا تھا۔ وہ تو صمد صاحب نے کچھ کاغذات سعد بابا کو دیے تھے، وہ بہت ضروری ہیں اور صاحب کو ان کی ابھی اسی وقت ضرورت ہے۔ اس لیے... میں... وہ... ڈھونڈ رہا تھا۔" اس نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں... میں جانتی ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ تم صرف ایک چور... بلکہ ایک ڈاکو ہو جو اپنے ہی مالک کے گھر میں ڈاکا ڈال رہا ہے اور اس گھر کے مالکوں کو پورا حق ہے کہ وہ اپنے تحفظ کے لیے اس ڈاکو کو گولی ماردیں۔ اس لیے میں کیوں نہ گولی تمہاری کھوپڑی میں اتاردوں؟" خوباں نے حتمی لہجے میں کہا تو فیضان اور گھبرا گیا۔

"نہیں... نہیں خوباں بی بی... ایسا مت کیجیے۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ مجھے تو مالک جو حکم دیں گے پورا کرنا پڑے گا۔ میں یہاں اپنی مرضی سے تو نہیں آیا ہوں... آپ اپنے بابا سے پوچھ لیں... انہوں نے ہی مجھے یہاں بھیجا ہے۔" فیضان کا لہجہ فریاد کرنے والا تھا۔

"ان سے بھی پوچھ لوں گی۔ پہلے تم سے تو پوچھ لوں... نہ نہ نہ... ملنے یا پیچھے مڑنے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ میں کوئی رعایت نہیں کروں گی۔ تم بتاؤ یہاں کیا چیز تلاش کرنے آئے ہو۔ اور اگر وہ کاغذات ہیں بقول تمہارے تو کس قسم کے کاغذات ہیں؟ بس... شروع ہوجاؤ..." خوباں نے دھمکی آمیز انداز میں کہا تو اچانک ہی فیضان نیچے جھک کر پلٹا اور اس نے خوباں کو پکڑنے کی کوشش کی۔ خوباں نے بلاتکلف گولی چلادی جو اس کے گھٹنے میں لگی اور وہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

"میں نے کہا تھا نا... پیچھے مڑنے کی کوشش مت کرنا۔" خوباں نے سرد لہجے میں کہا تو فیضان حیران نظروں سے اسے گھورتا رہ گیا۔

"آپ نے... سچ مچ... گولی چلادی۔" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"مسٹر فیضان! میرا اکلوتا، پیارا اور جوان بھائی مارا گیا ہے میں اس کے لیے تم جیسے دس لوگوں کو بھی ماردوں تو کم ہے۔ مجھے اس کے خون کا حساب لینا ہے اور جن سے لینا ہے ان میں سے ایک نام تمہارا بھی ہے..."

"کیا جاننا چاہتی ہیں آپ؟" اس نے پوچھا۔

"ان کاغذات میں کیا ہے جو تم چرانے آئے تھے؟" خوباں نے دوبارہ سوال کیا۔

"اس میں آپ کے بابا کے کچھ پرسنل اور کانفیڈنشل معاملات کا ذکر ہے اور وہ میرے لیے نہیں آپ کے بابا کے لیے ہی اہم ہیں۔"

"تم ان معاملات سے واقف ہو؟"

"کسی حد تک۔"

"تو جس حد تک واقف ہو... اتنا ہی بتاؤ۔" خوباں نے اطمینان سے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اگر میں آپ کو سب کچھ سچ سچ بتادوں تو... تو آپ میری جان بخش دیں گی...؟" اس نے شکستہ لہجے میں پوچھا۔

"دل تو نہیں چاہتا... میرا دل تو یہ چاہتا ہے کہ اپنے بھائی کے قاتلوں کو تڑپا تڑپا کر مارڈالوں... مگر مجبوری یہ ہے کہ میں پورا سچ بھی جاننا چاہتی ہوں۔ اس لیے وعدہ کرنا پڑے گا تم سے تمہاری جاں بخشی کا..."

"تم میڈیا سے تعلق رکھنے والی ایک باخبر صحافی ہو۔ تمہیں اچھی طرح علم ہوگا کہ افغانستان کی جنگ کے بعد جو دو بڑے کاروبار پھولے پھلے... وہ اسلحہ اور منشیات تھے۔ کلاشنکوف اور ہیروئن پاکستان میں پہلی مرتبہ متعارف ہوئیں اور اس نے ایسی مقبولیت حاصل کی کہ اسلحہ اور منشیات کے کاروباری رات ورات کروڑپتی... بلکہ ارب پتی ہوگئے جن لوگوں نے ان چیزوں کی اسمگلنگ سے فائدہ اٹھایا ان میں ہماری اشرافیہ کے بیشتر لوگ بھی شامل تھے۔"

"تم اور بابا بھی اس میں شامل رہے ہو؟" خوباں نے سوال کیا۔

"ہاں۔"

"ان درس گاہوں کو فنڈز کس طرح پہنچائے جاتے ہیں۔ انہیں اس قدر ظالمانہ تربیت کس طرح دی جاتی ہے؟" خوباں کے ذہن میں سوالوں کا انبار تھا۔

"اس کے بے شمار ذرائع ہیں۔ جماعتوں کے رہنما بہت سے حکومتی عہدیدار، وزیر، سفیر اور نیچے سے لے کر اوپر تک بہت سے معروف لوگ... جن کے بارے میں کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا کہ یہ ایسے معاملات میں ملوث ہوں گے... جیسے تمہارے بابا... رہا سوال تربیت کا... تو ابتدا میں پاکستان اور برطانیہ کی خفیہ ایجنسیوں نے مل کر یہ سارا سیٹ اَپ تیار کیا اور بہت سے مذہبی ذہن رکھنے والے پرجوش نوجوانوں کا انتخاب کرکے انہیں باقاعدہ تربیت کے لیے امریکا بھیجا گیا۔ خیال رہے کہ تربیت کا یہ سارا اہتمام امریکن سی آئی اے کے زیرِ نگرانی ترتیب دیا گیا تھا۔ جہاں باقاعدگی

سے مستقبل کے کارکن تیار کیے جاتے رہے۔ ان کو نہ صرف دہشت گردی کی باقاعدہ تربیت دی گئی بلکہ بڑے بڑے ماہرین نفسیات نے ان کی تحلیل نفسی کر کے ان کے ذہنوں کو اپنی مرضی کے مطابق ٹیون بھی کرلیا۔ مختلف ہتھیار چلانے کی تربیت، دھماکا خیز مواد کی تیاری کے طریقے اور ان کا استعمال... مختلف ترغیب کا استعمال جس سے ایک جیتے جاگتے انسان کو خود اپنے چیتھڑے بکھیر لینے پر آمادہ کرلینے کی صلاحیت... یہ کوئی چھوٹا یا آسان کام نہیں ہے۔ دنیا کے طاقتور ترین ملک کے مفادات ہیں جن کے حصول کے لیے وہ لوگ کہیں تک بھی جاسکتے ہیں۔" پتا نہیں کیوں فیضان کے لہجے میں تلخی سی اتر آئی۔

"اٹس ہوریبل... ہم کہاں جارہے ہیں اور ہماری بدنصیبی کا یہ سفر کب تک چلتا رہے گا؟" خوباں نے آنکھیں بند کر کے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر بولی۔

"تم نے اور بابا نے وہی راستہ اختیار کیا جسے دونوں ٹھیک سمجھتے تھے... تو ٹھیک تھا لیکن بھائی کی جان کیوں لی... اس کا قصور کیا تھا؟ اب یہ مت کہنا کہ تمہیں کچھ نہیں معلوم؟" خوباں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"وہ راستے میں آگیا تھا۔ اسے تمہارے بابا کے خفیہ کارناموں کا سراغ مل گیا تھا اور وہ سب کچھ جاننے کی کوشش میں بہت کچھ جان گیا تھا۔" فیضان نے آہستگی سے کہا تو خوباں بھڑک اٹھی۔

"اس کا یہ مطلب تھا کہ اسے جان سے ماردیا جائے۔ اپنے ہی بیٹے کو... اکلوتے بیٹے کو موت کی اندھی کھائیوں میں دھکیل دیا جائے؟"

"اسے تمہارے بابا نے نہیں مارا... اس نے اپنے بابا کو سزا دینے کے لیے یہ اقدام خود اٹھایا۔" فیضان نے وضاحت کی۔

"سزا دینے کے لیے... سزا دینے کے لیے اپنی جان دے دی... بجائے ان کی جان لینے کے؟" خوباں حیران ہوگئی۔

"ہاں، اس نے اپنی زندگی دے کر تم بہنوں اور تمہاری ماں کے سر کا سائبان خریدا ہے۔"

"بابا کہاں ہیں؟" خوباں نے سوال کیا تو فیضان نے بمشکل سر اٹھا کر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ریسٹ ہاؤس میں..."

اس کی بات سن کر خوباں پستول کو اسی طرح دوپٹے میں چھپا کر باہر نکلی۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی تو ایک کمرے کے نیم وا دروازے سے سگریٹ کی بو آتی ہوئی محسوس ہوئی... دروازے کو کھول کر اندر داخل ہوگئی۔

کونے میں پڑے ہوئے صوفے پر بابا بیٹھے ہوئے تھے اور سگریٹ کے بجھے ہوئے ٹکڑوں کا ڈھیر ایش ٹرے پر پڑا تھا۔ اور خود ان کی انگلیوں میں بھی ایک سگریٹ سلگ رہا تھا۔ کمرے میں باہر سے آنے والی روشنی کے انعکاس کے سبب ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

خوباں نے کمرے میں داخل ہوکر لائٹ جلائی تو صمد رحمن نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ شاید تیز روشنی ان کی آنکھوں میں چبھ گئی تھی۔

"تم... تم اس وقت یہاں کیا کررہی ہو؟" انہوں نے بھاری لہجے میں پوچھا۔

"یہاں میں یہ دیکھنے آئی ہوں کہ اپنے ہی بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے موت کے حوالے کردینے والے باپ کا کیا حال ہے۔" خوباں نے نفرت زدہ انداز میں انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا... کیا بکواس کررہی ہو؟ چلی جاؤ یہاں سے۔" انہوں نے خوباں کو ڈانٹنے کی کوشش کی مگر جن زہریلی نظروں سے وہ انہیں دیکھ رہی تھی وہ انہیں نروس سا کررہی تھیں۔

"جاؤں گی... بالکل جاؤں گی... پہلے اپنے بھائی کے خون کا حساب تو لے لوں۔ یہ تو پوچھ لوں آپ سے کہ کہاں سے لائے اتنا سخت پتھر کا دل اپنے سینے میں... کہ اکلوتے بیٹے کو موت کے سخت جبڑوں میں اپنے ہاتھ سے دھکیل دیا۔ کس دل سے یہ ظلم کیا بابا! کس دل سے؟ کیوں کیا آپ نے ایسا...؟ کیوں کیا؟"

"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ جیسا تم سمجھ رہی ہو۔ میں ایک باپ ہوں۔ کیسے اپنے بیٹے کو موت کے منہ میں دھکیل سکتا ہوں؟" صمد رحمن نے کچھ پریشان ہوکر جواب دیا۔

"اگر دھکیلا نہیں... تو اسے اس طرف جاتا دیکھ کر روک تو سکتے تھے... روکا کیوں نہیں... اسے بچایا کیوں نہیں؟" خوباں نے چلا کر پوچھا۔

"میں نہیں بچا سکتا تھا اسے... میں نے بہت کوشش بھی کی لیکن میں اسے بچا نہیں سکا... میرے سامنے وہ بالکل آخری لمحات میں آیا۔ بس وقت ہی میری مٹھی سے ریت کی طرح پھسل گیا اور وہ ہاتھ چھڑا کے موت کے اندھیروں میں کھوگیا۔" صمد رحمن کی شخصیت کا مضبوط خول کمزور ہوکر ٹوٹ رہا تھا۔

"میں جانتی ہوں بابا! بھائی کو آپ کے گھناؤنے کرتوتوں کی خبر مل گئی تھی۔ اس نے آپ کو روکنا چاہا تو آپ نے اسے دھمکی دے کر اس کی زبان بند کردی۔" خوباں غصے میں بول رہی تھی۔

"کیسی دھمکی...؟ کیسے کرتوت؟ کیا فضول باتیں کررہی ہو... شاید تمہارا دماغ ٹھکانے پر نہیں ہے... جاؤ جاکر آرام کرو۔" انہوں نے اسے ڈانٹا۔

"شاید آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ مجھے کچھ نہیں معلوم؟ تو آپ بالکل غلط سمجھ رہے ہیں۔ آپ جو ریکٹ چلارہے ہیں اس کے بارے میں ایک ایک بات جانتی ہوں میں... وقت آنے پر مع ثبوتوں کے ہر چیز سامنے رکھ دوں گی اور جو کچھ میں جانتی ہوں... ان سب باتوں کی تصدیق... میں آپ کے دم چھلے مسٹر فیضان سے ابھی کرکے آرہی ہوں... ایک ایک بات بتادی ہے اس نے۔"

"فیضان تمہیں کچھ بھی کیسے بتاسکتا ہے؟" صمد رحمن نے تشویش سے پوچھا۔

"میں نے اسے جھوٹ بولنے کے قابل ہی کہاں چھوڑا... سچ بولنے مجبور کردیا۔ تب ہی وہ سچ بولا ہے... سب کچھ سچ سچ۔" خوباں نے زور دے کر اپنی بات کہی۔

"اس نے تمہیں کیا بتایا ہے؟" صمد نے پوچھا۔

"یہ بھی معلوم ہوجائے گا۔ پریشانی کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ اس میں کم از کم اتنی اخلاقی جرأت تو ہے کہ وہ سچ بول سکے۔"

"اخلاقی جرأت... مائی فٹ... وہ اور سچ... وہ اور اخلاقی جرأت... اس سے یہ توقع حماقت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس کی کمینگی اور شیطانیت کے آگے... خود شیطان بھی شرمندہ ہوجائے۔

"تمہیں شاید معلوم نہ ہو اس لیے بتادیتا ہوں کہ فیضان کا اصلی نام میکال شمعون ہے۔ اور یہ کوئی مسلم نہیں... بلکہ اصلاً یہودی ہے۔ پاسپورٹ اس کے پاس امریکا کا ہے لیکن اس کے سب رشتے دار اسرائیل میں رہتے ہیں۔ یہ بھی وہاں آتا جاتا رہتا ہے..." صمد کے انکشاف پر خوباں حیران ہوگی پھر سوال کیا۔

"آپ اس کے چنگل میں کیسے پھنس گئے؟"

"میرے والدین کے ائر کریش میں انتقال کے بعد میرے چچا اور تایا نے میرے باپ کی ساری جائداد اور اثاثوں پر قبضہ کرکے مجھے گھر سے بالکل خالی ہاتھ نکل جانے پر مجبور کردیا۔ میں کتنے ہی دن بھوکے پیٹ، بے یار و مددگار بھٹکتا رہا۔ ایسے ہی ایک رات ایک گھر کے کار پورچ میں سورہا تھا۔ بدقسمتی سے اس گھر میں فیضان اور اس جیسے کئی لوگ رہائش پذیر تھے۔ کچھ غیر ملکی اور کچھ ملکی... فیضان نے مجھے بے سہارا دیکھ کر سہارا دیا اور اپنے اور گھر کے چھوٹے موٹے کاموں کے عوض مجھے تین وقت کھانا اور سر چھپانے کو ایک سرونٹ کوارٹر دے دیا گیا۔

"پھر نہ جانے کیا دیکھ کر اس نے مجھے اپنے ساتھ لکھنے پڑھنے کے کاموں میں لگالیا۔ شاید میری اچھی انگریزی کے سبب اس نے مجھ سے کچھ کام لینے کی پلاننگ کی۔ ایک دو این جی اوز میں کام دلوایا دیا۔ طرح طرح کی زبانیں سکھائیں اور ٹریننگ کروائی۔ اور پھر یہ سلسلہ چل پڑا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں کب اور کس طرح اس کے چنگل میں پھنس کر اس کا آلۂ کار بن گیا۔ اور وہ سب کچھ کرنے لگا جس کے لیے عام حالات میں شاید میرا ضمیر کبھی مجھے اجازت نہ دیتا۔ انہی میں ایک کام یہ بھی ہے۔ یعنی خودکش بمبار تیار کروانا۔ ٹارگٹ کلنگ کروانا۔"

"اور یہ سب کرتے ہوئے تمہیں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ جن نوجوانوں کو تم اس طرح فنا کی آگ میں جھونک رہے ہو۔ ان میں کبھی دوسرے بیٹوں کی جگہ تمہارا اپنا بیٹا بھی ہوسکتا ہے اور جب وہ تمہارے سامنے آگیا تب بھی تمہارے دل پر کوئی قیامت نہیں گزری۔ اسے موت کے راستے پر دھکیل کر تم اطمینان سے جاکر سوگئے؟" ان کی بیوی فرزانہ اور دوسری بیٹی تاباں نہ جانے کب آکر دروازے کے پاس کھڑی ہوگئی تھیں۔ ان دونوں نے بھی صمد کا وہ اعتراف سن لیا جو وہ خوباں کے سامنے کررہے تھے۔

"میں خود کیسے سو سکتا تھا... میں تو اسے ہر قیمت پر واپس لانے کے لیے اڑ گیا تھا۔ میں اسے موت کے منہ میں کیسے دھکیل سکتا تھا۔ مجھے ہر قیمت پر بچانا تھا اسے..." صمد اپنی بیوی کے لہجے میں شعلوں کی لپک محسوس کرکے کچھ بوکھلا سے گئے۔

"تمہارے ساتھ کیا ہوا؟ اور تم نے کیا کیا؟ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں... میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میرا اکلوتا بیٹا قتل ہوا ہے اور اس قتل کے جرم میں... میں تمہیں سزائے موت دیتی ہوں... یہ ممتا کی عدالت ہے اور ایک ماں تمہیں تمہارے جرم کی سزا سنارہی ہے... سزائے موت۔ خوباں! پستول مجھے دو۔" فرزانہ نے خوباں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

"ممی! کیا صرف اکیلے بابا کو سزا... اور ان کے باقی ساتھی... جو ان کے جرائم میں برابر کے شریک ہیں کیا انہیں

کوئی سزا نہیں ہوگی اور انہیں بھی اتنے آرام کی موت... کہ بس ایک گولی... جو لمحہ بھر میں کام تمام کردے... نہیں ممی... میرے بھائی نے جو اذیت اٹھائی ہے، اس کے جسم کے چیتھڑے بکھر گئے ہیں۔ اس کی گردن ٹوٹ کر الگ ہوگئی ہے اس کا وجود ریزہ ریزہ ہوکر اس طرح بکھرا ہے کہ اس کا نشان تک نہیں رہا۔

نہیں ممی! اتنے بڑے جرم کی ایسی آسان سزا... نہیں... ان سب کا وہی حشر ہونا چاہیے... جو یہ دوسروں کا کرتے آرہے ہیں؟"

"تاباں! انہیں کم از کم چوبیس گھنٹے بے ہوش رکھنا ہے... جا... اپنا میڈیکل باکس لے کر آ۔" خوباں کے لہجے میں اتنی نفرت تھی کہ صمد اندر سے کچھ خوف زدہ سے ہوگئے۔

"تم... تم کیا کرنا چاہ رہی ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"میں... آپ کے اور آپ کے ساتھیوں کے ساتھ وہی کرنا چاہ رہی ہوں... جو آپ لوگوں نے میرے بھائی کے ساتھ کیا۔" خوباں نے صاف الفاظ میں انہیں ان کے انجام سے آگاہ کردیا۔

پھر اس نے مڑ کر دیکھا تو تاباں انجکشن لگا چکی تھی اور بابا پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

وہ بڑی دیر سے تاریک فضاؤں میں سفر کر رہے تھے۔ جگہ جگہ جلتی بجھتی چنگاریاں رقص کرتی محسوس ہوتیں اور اگلے ہی لمحے معدوم ہوجاتیں۔ وہ روشنی کی تلاش میں ان جلتے بجھتے جگنوؤں کے پیچھے قدم بڑھاتے اور جونہی انہیں ہاتھ میں تھامنے کی کوشش کرتے وہ چمک کر بجھ جاتے۔

اندھیروں اور چنگاریوں کے اس کھیل میں وہ بُری طرح تھک رہے تھے۔ تھکن کا یہ احساس اتنا شدید تھا کہ انہیں لگ رہا تھا کہ بس اب وہ گرنے والے ہیں اور اگر گرے تو ہمیشہ کے لیے تاریکیوں کا حصہ بن جائیں گے۔ اس لیے اپنے پیروں پر کھڑے رہنے کی جان توڑ کوشش کر رہے تھے لیکن کب تک... آخر کار ان کی ہمت جواب دے گئی اور وہ دھڑام سے گر گئے۔ شاید کہیں چوٹ لگی تھی جس کے سبب ان کے منہ سے کراہ نکلی۔ پھر انہیں لگا کوئی انہیں جھنجوڑ رہا ہے، کوئی ان کا نام لے کر پکار رہا ہے۔

صمد نے آنکھ کھولی تو یہ سب لوگ ان کے آس پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ اور بالکل برابر میں فیضان گٹھڑی سا بنا پڑا ہوا تھا۔ اس کے گھٹنوں کے زخم ایسی اذیت دے رہے تھے جس نے اسے بالکل نڈھال کردیا تھا۔ اس لیے وہ بے سدھ سا پڑا ہوا تھا۔ صرف کبھی کبھی اس کے منہ سے کراہ نکل جاتی ورنہ وہ بالکل خاموش تھا۔

صمد اور ان کے سب ساتھی تیز روشنی کی زد میں تھے اور یہ روشنی کسی ویڈیو کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ صمد نے ذرا غور سے دیکھا تو روشنی کے پیچھے کرسیوں پر کچھ لوگ موجود تھے۔ جو ناکافی روشنی میں ہیولے سے لگ رہے تھے تاہم بغور دیکھنے پر انہوں نے خوباں، تاباں اور اپنی بیوی فرزانہ کو تو اندازے سے پہچان لیا لیکن باقی افراد انہیں بالکل اجنبی لگے۔

پھر انہیں خوباں کی آواز سنائی دی۔

"آپ سب لوگ آپس میں ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے ہوں گے اس لیے کسی تعارف کی ضرورت نہیں لیکن ہم لوگوں کو آپ سب سے تعارف حاصل کرنے میں بڑی مشکلیں اٹھانی پڑیں۔ آپ لوگوں نے جو چہرے لگائے ہوئے ہیں ان کے پیچھے آپ کے اصل چہرے کیا ہیں، یہ معلوم کرنے کے لیے ہمیں بڑی جدوجہد کرنا پڑی۔ بظاہر آپ کیا ذمے داریاں نبھا رہے ہیں اور اصل میں آپ کی کیا ذمے داریاں ہیں، ان کے ثبوت اکٹھے کرنے میں ہمیں کس طرح پل صراط کا سفر کرنا پڑا ہے۔ یہ آپ لوگ نہیں جان سکتے... لیکن بہرحال آج ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے کوشش کر کے چند آدم خوروں کو تو پکڑ ہی لیا ہے اور ان کے لیے ایسا پنجرہ بھی تیار کرلیا ہے جس میں ہر طرف آئینے لگے ہیں۔ ان آئینوں میں آپ سب کو اپنے اصلی چہرے مع اپنے کرتوتوں کے نظر آئیں گے یہ الگ بات ہے کہ آپ لوگوں جیسے اور نہ جانے کتنے لہو پینے والے ابھی موجود ہیں... لیکن میں آپ لوگوں کو واضح الفاظ میں بتا دیتی ہوں کہ یہ ہم چند سر پھرے لوگوں کا گروپ ہے جن کے جینے کا مقصد ہی اب تمہارے جیسے لوگوں کو نیست و نابود کرنا ہے۔

"یہ ہماری عدالت ہے... اور اس کا فیصلہ ہے کہ تم جیسے لوگوں نے جس طرح معصوم اور مجبور لوگوں کے خون سے ہولی کھیلی ہے تم سب کو ان کے خون کا حساب دینا ہے... اور یہ حساب اپنے خون سے دینا ہے۔"

"کیا بکواس اے... تم کون لوگ اے؟ کیا عدالت... کیسا فیصلہ ام کو زبردستی لا کے فیصلہ سناتا ہے تم اوتا کون ہے؟" افغان ساتھی کو شاید خطرے کی بو محسوس ہوئی تو اس نے چلا کر کہا۔

"تم جیسے لوگوں کو زبردستی ہی لانا پڑتا ہے۔ تم خود سے کب آتے ہو اور ہم کون ہوتے ہیں فیصلہ سنانے والے... یہ ضرور بتائیں گے ہم۔ اس لیے کہ ہم نے بہت کچھ کھویا ہے... جنہوں نے اپنا پیارا بھائی... ماں نے اپنا اکلوتا بیٹا... اور یہ صرف کسی ایک کی کہانی نہیں ہے تم جیسے درندوں نے تو نہ جانے کتنے گھروں میں قیامتیں برپا کی ہیں۔" خوباں کی آواز میں دکھ کے ساتھ ساتھ غضب بھی تھا۔

"سب بکواس ہے... اس طرح کے الزام لگا کر تم لوگ ہمیں زبردستی مجرم ٹھہرا رہے ہو... کم از کم میں یہ الزام قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں... میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔" مولانا جبار بھی اپنی گونج دار آواز میں زور سے بولے۔

"اچھا! تم نے کچھ نہیں کیا؟ ابھی پتا لگ جاتا ہے... منصور! ذرا دکھانا اس جعلی آدمی کی کارستانیاں..."

ایسے میں ہی دیوار پر لگا پلازما ایل سی ڈی اسکرین روشن ہوگیا اور لمحے بھر میں اس پر کوئی موویِ چلنا شروع ہوگئی۔

جبار ایک ایسی جگہ موجود تھے جو ایک جنگی کیمپ نظر آرہا تھا۔ وہ پہلے اپنے ہاتھ سے ڈائنامائٹ قسم کی چیزوں کا جائزہ لیتے رہے۔ پھر کچھ اور دھماکا خیز کو دیکھا اور پھر ایک ایسی جیکٹ ہاتھ میں لے کر دیکھی جس پر دھماکا خیز مواد لگایا گیا تھا۔ یہ طرح طرح کی اسٹکس تھیں اور مختلف تاروں سے جڑی ہوئی تھیں پھر انہوں نے اپنے ہاتھ سے وہ جیکٹ ایک لڑکے کو پہنا کر دیکھی اور تعریفی انداز میں سر ہلایا۔

جبار کی پیشانی سے پسینا پھوٹ بہا۔

"اتنا کافی ہے یا اور ثبوت درکار ہیں۔ کیونکہ ہمارے پاس ثبوتوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔" خوباں کی آواز گونجی۔

"ٹھیک ہے۔ تمہارے پاس ثبوت موجود ہیں تو اصلی عدالت میں پیش کرو۔ وہاں کھلی عدالت میں مقدمہ چلنے دو۔ جو بھی اس عدالت کا فیصلہ ہوگا ہمیں منظور ہوگا۔" سیکشن افسر نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

"تمہارا سسٹم... اور تمہاری عدالتیں... اور تمہارا انصاف... اگر ان سے کچھ مل سکتا تو شاید ہماری جیسی عدالت کی کبھی نوبت ہی نہیں آتی۔ ہمیں معلوم ہے کسی بھی عدالت میں تم پر مقدمہ چلے... کیسے ہی ثبوت ہم پیش کردیں سب بیکار ہو گا کیونکہ تمہارے سسٹم میں سب ایک دوسرے کو بچانے والے ہیں۔ چاہے کوئی کتنا ہی بڑا مجرم کیوں نہ ہو۔ اسے صرف اس لیے بچایا جاتا ہے کہ کل اگر وہ خود پھنس جائیں تو دوسرے انہیں بچائیں... ہمارے پاس نہ تو اتنا وقت ہے اور نہ ہی بھروسا اس لیے مجبوری ہے... تمہارا فیصلہ ہوچکا ہے اور سزا بھی تمہیں یہیں ملے گی۔" خوباں کی آواز بند ہوئی تو ان سب کو اپنی طرف بڑھتی ہوئی آہٹیں محسوس ہونے لگیں... موت کی آہٹیں۔

"دیکھو! مجھے گولی مت مارنا پلیز! میرا گھر... میرا خاندان برباد ہوجائے گا۔" مولانا کا ساتھی گھگھیا کر بولا۔

"منصور! پلیز انہیں ان کا تحفہ تو دکھادو۔" اس نے کہا تو منصور ایک ایسی ہی جیکٹ لے کر آگے بڑھا جس میں دھماکے دار مادے کی لمبی لمبی اسٹکس بندھی ہوئی تھیں اور انہیں تاروں کے ایک گنجلک سلسلے سے جوڑا گیا تھا۔

"تم میں سے کون ہے جو اس اعزاز کو حاصل کرنا پسند کرے گا... کس کو پہناؤں؟" منصور ان سب کے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا۔ اور ان سب کے چہرے خوف سے بگڑ رہے تھے۔ وہ جس کی طرف بڑھتا... وہ چیخنے چلانے اور اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرنے لگتا۔

"خوباں! ان میں سے تو کوئی بھی تیار نہیں ہے... جان دینے کے لیے... سیدھا جنت میں جانے کے لیے... اپنے خاندان کے لیے اپنی قربانی دینے کے لیے... اب کیا کیا جائے؟"

اسی وقت ان سب نے دیکھا کہ فرزانہ یعنی صمد رحمن کی بیوی آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی ہوئی منصور تک پہنچیں۔ اس کے ہاتھ سے جیکٹ لی اور اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں اس قدر شدید نفرت تھی کہ صمد کو جھرجھری آگئی۔ وہ آہستہ آہستہ شوہر کی طرف بڑھتی گئیں۔

ان کے قریب پہنچ کر وہ رک گئیں۔ سنگین اور سپاٹ چہرہ یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ وہ جو فیصلہ کرچکی ہیں، اس سے انہیں دنیا کی کوئی طاقت ہٹا نہیں سکتی۔ انہوں نے جھک کر شوہر کا ہاتھ اوپر اٹھایا اور جیکٹ پہنادی۔

صمد بُری طرح گھبرا گئے۔ وہ زور سے چلائے۔

"فرزانہ! پاگل ہوگئی ہو۔ میں تمہارا شوہر ہوں... مجھے مار رہی ہو۔"

"نہیں... تم میرے شوہر نہیں ہو۔ تم صرف میرے بیٹے کے قاتل ہو۔ ایسی ہی نیست و نابود کردینے والی جیکٹ تم نے اسے پہنائی تھی نا۔ آج تم کو بھی پہننی پڑے گی۔" انہوں نے سرد لہجے میں کہا تو صمد مدافعت کرنے لگے۔

"منصور ان سب لوگوں کو اس طرح باندھ رہا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بھاگ نہ سکیں۔" تھوڑی دیر میں یہ کام بھی مکمل ہوگیا۔ اب وہ سب اپنے اپنے انداز میں منت سماجت کررہے تھے۔ اپنے بے گناہ ہونے کا راگ الاپ رہے تھے۔ غصے میں گالیاں بک رہے تھے یا رو رہے تھے... کیونکہ انہیں یقین ہوگیا تھا کہ اب کوئی معجزہ ہی انہیں بچا سکتا۔

"یہ سارے ریموٹ کنٹرولڈ ہیں۔ اب ہم اجازت چاہیں گے۔ تھوڑی دیر میں بس ایک دھماکا ہوگا اور آپ لوگ اس دنیا سے نجات پاجائیں گے۔ اور اس عظیم مرتبے پر فائز ہوجائیں گے جس پر آپ نہ جانے کتنے بے گناہ اور معصوم لوگوں کو بھیجتے رہے ہیں۔" خوباں نے تلخ لہجے میں الوداعی الفاظ کہنے کی کوشش کی۔

"ہاں، ایک بات بتادوں... ہم میں سے کوئی آپ لوگوں کے لیے... کبھی دعائے مغفرت نہیں کرے گا۔ کیونکہ آپ کو اس کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔" انہیں زہریلی نظروں سے دیکھتے ہوئے خاموش ہوئی اور واپسی کے لیے مڑی۔

انہوں نے اپنا کیمرا آف کیا۔ وہاں سے ضروری سامان سمیٹا... اور باہر نکل آئے۔ آگے آگے خوباں اور منصور تھے پھر تاباں... اس کے پیچھے منصور کے ساتھی ہارون اور انور... اور سب سے پیچھے فرزانہ تھکے تھکے قدم اٹھاتی آرہی تھیں۔ خوباں کے ہاتھ میں ریموٹ تھا۔ اور وہ دونوں اس کی رینج کے بارے میں بحث کرتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔

وہ سب اندر آگئے تھے۔ خوباں نے اس بات کا یقین ہوتے ہی کہ اب وہ سب محفوظ فاصلے پر ہیں۔ ریموٹ سیدھے ہاتھ میں لیا۔ اس پر لگا ہوا سرخ بٹن چنگاری کی طرح دہک رہا تھا۔ اس نے طویل اور اندھیرے کوریڈور پر نظر ڈالی جس کے آخری سرے پر ریسٹ ہاؤس کا وہ دروازہ تھا جہاں کچھ لوگ اپنی موت کا انتظار کررہے تھے اس موت کا... جو ابھی تک وہ دوسروں کو بانٹتے آرہے تھے... آج ان کی باری آگئی تھی۔

"خدا حافظ بابا! کاش یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا... جو ہوا اور اب ہورہا ہے۔" اس نے آنکھوں میں بھر آنے والے آنسوؤں کی اوٹ سے ریموٹ کو دیکھا اور انگوٹھا اس پر رکھ کر پوری طاقت سے بٹن دبادیا۔

دور ریسٹ ہاؤس کی عمارت میں ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا... شیشے، پتھر اور دھات کے بڑے بڑے ٹکڑے گولی کی رفتار سے اڑے۔ ٹوٹتی... اور ملبہ ہوتی ہوئی عمارت کے پیش منظر میں ان سب نے ایک عجیب بات دیکھی۔ کوئی عورت کوریڈور میں تیزی سے بھاگتی ہوئی اس تباہ ہونے والی جگہ کی طرف جارہی ہے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے پہچاننے کی کوشش کررہے تھے کہ تاباں کی چیخ سنائی دی۔

"ممی!" وہ فرزانہ تھیں جو پے در پے برپا ہونے والے دھماکوں اور قاتل تیزی سے اڑتے ہوئے دھات اور [..] ٹکڑوں سے بے نیاز اس طرف دوڑی چلی جارہی تھیں [..] وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر آئی تھیں۔

خوباں نے بھی ہاتھ سے ریموٹ پھینکا... دونوں بہنیں تیزی سے آگے بڑھیں... اپنی ماں کو بچا[نے] کے لیے ان کی یہ بے ساختہ حرکت تھی۔ وہ ان کے پیچھے [..] انہیں موت کے منہ میں جانے سے روکنا چاہتی تھیں لیکن [..] کے ساتھیوں نے انہیں پکڑلیا۔

"ممی... ممی!" وہ دونوں چلارہی تھیں۔

"پاگل ہوگئی ہو کیا... وہ تو گئیں... تم دونوں [..] مرنا چاہتی ہو کیا؟" منصور نے خوباں کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

"اسٹاپ اٹ خوباں! اسٹاپ اٹ!" منصور خود [..] زور زور سے چلارہا تھا۔

اس ساری چیخ و پکار، دھماکوں اور ٹوٹ پھوٹ [کی] آوازوں کے ساتھ... ایک اور قیامت خیز آواز آئی۔ ریسٹ ہاؤس اور ملحقہ آفس کی پوری عمارت ایک سا[تھ] ہولناک دھماکے سے بیٹھ گئی۔ گرد و غبار کے بادلوں م[یں] سب کچھ چھپ گیا۔ ریسٹ ہاؤس میں داخل ہوتی ہو[ئی] فرزانہ بھی۔

سب کچھ ختم ہوگیا۔ شور، دھماکے، چیخ پکار، رونا چلانا۔ بس ایک خاموشی رہ گئی۔ خاموشی جو ایک قیامت خیز شور [کے] بعد بہت ہولناک لگ رہی تھی۔

وہ سب ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہوجانے والی عمار[ت] کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے۔ پھر سب پر جیسے شد[ید] تھکن اور کمزوری کا غلبہ ہوا اور وہ جہاں کھڑے تھے... و[ہیں] بیٹھتے چلے گئے۔

منصور کے دل میں ایک خواہش ابھری کہ لابی کی اس [..] میں... لابی جتنی گہری دفن ہوجائے اتنا ہی اچھا ہے۔

"منصور! ممی وہاں کیوں چلی گئیں؟" خوباں کی آواز جیسے کنویں سے ابھری۔

"وہ بیٹے کی محبت... اس کے قاتل سے انتقام تو [لے] چکیں۔ پھر اچانک انہیں یاد آیا کہ بیٹے کا قاتل... ان کا شوہر بھی تو ہے۔ وہ اپنے شوہر کو بچانے کی کوشش میں... اپنی جان بھی دے بیٹھیں... یہ رشتوں کی محبتیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ کب کیا کروادیں... کوئی اندازہ نہیں کرسکتا۔" منصور نے دکھی لہجے میں جواب دیا اور کھنڈر سے اٹھنے والے غبار کے بادلوں کو دیکھتا رہا۔

صفحوں پر مشتمل ایک ہیرا کہانی

آنکھ اوجھل

سلیم انور

وقت کی اہمیت سے کسی طور انکار ممکن نہیں... وقت کا ہر ہر لمحہ اپنی ایک قیمت رکھتا ہے... اس نے بھی طویل انتظار کے بعد وقت کی کروٹیں لیتی گھڑیوں سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ باندھ لیا تھا...

قیمتی زیورات کے غیاب کا انوکھا اور پیچیدہ معاملہ

"یہ ہمارے جیولری اسٹور کی نگرانی کرنے والے کیمرے کا ٹیپ ہے۔" چارلس لچورتھ نے پولیس انسپکٹر ہاورتھ کو بتایا۔ "اسے پوری توجہ سے دیکھنا۔ تم جو کچھ دیکھو گے تمہیں اس پر یقین نہیں آئے گا۔"

انسپکٹر ہاورتھ کی نظریں ٹی وی اسکرین پر جم گئیں۔ اسکرین پر لچورتھ جیولری اسٹور کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ کاؤنٹرز میں ڈھیر ساری جیولری موجود تھی۔ اسکرین پر اوپر بائیں جانب کونے میں ایک چھوٹا سا پیغام تھا جس پر لکھا تھا۔ "پیر، 26 اکتوبر۔"

اسکرین کے اوپر داہنی جانب ایک ڈیجیٹل گھڑی تھی جو وقت بتارہی تھی۔ رات ایک بج کر انسٹھ منٹ چھپن سیکنڈ، رات ایک بج کر انسٹھ منٹ ستاون سیکنڈ، رات ایک بج کر انسٹھ منٹ اٹھاون سیکنڈ، رات ایک بج کر انسٹھ منٹ انسٹھ سیکنڈ، رات دو بجے، رات دو بج کر ایک سیکنڈ۔

اور اس آخری سیکنڈ میں ایک حیرت انگیز واقعہ رونما ہوگیا۔ اسٹور کے کاؤنٹرز میں رکھی ہوئی تمام جیولری غائب ہوگئی!

"یہ!" چارلس ٹی وی اسکرین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے چیخ پڑا۔ "تم نے دیکھا؟ کسی اَن دیکھے چور نے ایک سیکنڈ میں میرے اسٹور کا صفایا کردیا۔"

"ناممکن!" انسپکٹر نے غراہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ "اسٹور میں موجود دیگر سیکیورٹی کیمروں کے ٹیپ بھی دیکھ لیتے ہیں۔"

مختلف زاویوں سے فلم بند کیے گئے تمام ٹیپس میں ایک ہی منظر دکھائی دیا۔ ایک سیکنڈ پہلے جو جیولری کاؤنٹرز پر رکھی دکھائی دے رہی تھی، وہ اگلے سیکنڈ میں غائب تھی اور تمام کاؤنٹرز خالی نظر آرہے تھے۔

انسپکٹر ہاورتھ کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر ہنس دیا۔

"یہ تو بالکل آسان اور سامنے کی بات ہے۔" اس نے کہا۔ "کسی نے تمام کیمرے بند کردیے، جیولری سمیٹی اور پھر کیمروں کو دوبارہ آن کردیا۔"

"ناممکن۔" چارلس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ تمام کیمرے ایک کمپیوٹر سے کنٹرول ہوتے ہیں جو شہر میں واقع بیکر سیکیورٹی کمپنی میں لگا ہوا ہے۔ ہم یہاں سے ان کیمروں کو آن یا آف نہیں کرسکتے۔"

"تو پھر کسی نے ان کیمروں کے ٹیپس میں تحریف کی ہے۔" انسپکٹر ہاورتھ نے کہا۔

"یہ بھی ناممکن ہے۔" چارلس نے جواب دیا۔

"وہ کیسے؟"

"اس لیے کہ جب چور دیگر کیمروں میں تحریف کررہا ہوتا تو کوئی ایک کیمرا تو اس کی اس حرکت کو ٹیپ پر فلم بند کرلیتا۔" چارلس نے کہا۔ "نہیں، انسپکٹر! مجھے خدشہ ہے کہ میرے اسٹور کو کسی نظر نہ آنے والے چور نے لوٹا ہے۔"

"ایسا ہوسکتا ہے۔" انسپکٹر ہاورتھ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں تو صرف ان مشکوک افراد سے پوچھ گچھ کرنے کا عادی ہوں جو نظر آسکتے ہیں۔ نظر نہ آنے والوں سے کس طرح تفتیش کی جاسکتی ہے؟ چونکہ تمہارے اسٹور کا

برگلر الارم بالکل بھی نہیں بجا، اس لیے میں ہراس ...... فرد پر شبہ کرسکتا ہوں جو تمہارے سیکیورٹی کوڈ سے واقف ہے، وہ کون ہوسکتا ہے؟"

"اس اسٹور میں میرے علاوہ شیلی جونسن، لوئس فریمین اور شیرون پروڈر کام کرتے ہیں لیکن تم ان پر شبہ نہیں کرسکتے۔"

"کیوں نہیں کرسکتا؟" انسپکٹر نے ایک نوٹ بک میں ان تمام کے نام لکھتے ہوئے کہا۔ "میں ان سے باری باری بات کرنا چاہتا ہوں، پلیز!"

شیلی زلفوں والی ایک شوخ چشم حسینہ تھی جس نے گول شیشوں والی عینک پہنی ہوئی تھی۔

"یہ میں تھی جس نے یہ سیکیورٹی سسٹم خریدا تھا۔" اس نے انسپکٹر ہاورتھ کو بتایا۔ "میں نے اس کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ اسے بائی پاس نہیں کیا جاسکتا۔ اس سسٹم کی ہر شے آٹو میٹک ہے اور اسے ایک بیرونی کمپنی کنٹرول کرتی ہے۔"

"بیکر سیکیورٹی کمپنی؟"

"ہاں، وہ ایک انتہائی شہرت یافتہ اور نامور کمپنی ہے اور اچھی ساکھ کی حامل ہے۔"

"اگر اس عمارت کی بجلی کی سپلائی بند کردی جائے تو پھر کیا ہوگا؟" انسپکٹر ہاورتھ نے جاننا چاہا۔

"وہ ایک لمحے کے لیے شٹ ڈاؤن ہوجائے گا۔ پھر بیک اپ سسٹم کام شروع کردے گا۔" شیلی جونسن نے بتایا۔

"کیا یہاں کبھی ایسا ہوا ہے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"اگر کبھی ایسا ہوا ہوگا تو جب کیمرے دوبارہ آن ہوئے ہوں گے تو آپ کو ٹائم ریکارڈر میں ایک جھٹکا دکھائی دے گا کیونکہ وقت کا تعین بیکر سیکیورٹی کمپنی میں ہوتا ہے۔"

"اور ایسا نہیں ہوا۔" انسپکٹر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمام سیکیورٹی کیمروں کے ٹیپ چیک کرلیے ہیں۔"

پھر انسپکٹر ہاورتھ نے لوئس فریمین کو طلب کیا۔ وہ ایک جیولر ہی دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا قد پستہ اور سر کے بال اڑے ہوئے تھے۔ آنکھوں پر دبیز شیشوں کی عینک تھی۔

"یہ کام جس کسی نے بھی کیا ہے، میں اس کی تعظیم کرتا ہوں۔" اس نے انسپکٹر سے کہا۔ "یہ تمام ہائی ٹیک آلات مجھ پر خوف طاری کیے رہتے ہیں۔ جو بھی ان مشینوں سے زیادہ اسمارٹ تھا اور اس نے جتنی بھی جیولری چوری کی ہے، وہ اس کا حق بنتا ہے۔"

"تم زیادہ اپ سیٹ نظر نہیں آرہے؟" انسپکٹر ہاورتھ نے کہا۔

"دیل، لچورتھ جیولری کے تمام مال و اسباب کے دام بے حد مہنگے ہیں اور وہ ہم سے حد درجہ مشقت کا کام لیتا ہے۔" لوئس نے بتایا۔ "اس کے علاوہ یہاں پر موجود ... بیمہ شدہ تھی اس لیے چارلس کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔"

آخر میں انسپکٹر ہاورتھ نے شیرون پروڈر کو طلب ... وہ ایک نازک اندام عورت تھی۔ چوری ہونے والی ... شے کے بارے میں مکمل تفصیل بتانے کے بعد وہ ...

"میں نہیں سمجھتی کہ یہ کیونکر ممکن ہوسکتا ہے۔ ہمارا ... سسٹم ملک میں سب سے بہترین سسٹم مانا جاتا ہے۔"

"بہرحال، کسی نے اس سسٹم کو مات دے ..." انسپکٹر ہاورتھ نے کہا۔

ملازمین سے بات چیت کرنے کے بعد انسپکٹر ... اسٹور کے مالک لچورتھ چارلس کے پاس پلٹ گیا۔

"کچھ پتا چلا؟" چارلس نے پوچھا۔

"کچھ کچھ۔" ہاورتھ نے کہا۔ "لیکن مجھے یہ ... دینے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ تمہارے اسٹور کو کس ... تھا اور اس چور نے یہ چوری کس طرح کی ہے۔"

☆☆☆

انسپکٹر ہاورتھ کو اچانک اس بات کا احساس ہوا کہ ... اکتوبر وہ تاریخ ہے جب دن میں روشنی کی بچت کے اوقات ... اختتام ہوجاتا ہے اور تمام گھڑیاں ایک گھنٹا پیچھے کردی جاتی ہیں ... چونکہ لچورتھ جیولری اسٹور کا سیکیورٹی سسٹم مکمل طور ... ایک کمپیوٹر سے کنٹرول ہوتا تھا تو اس نے یہی منطقی نتیجہ اخذ کیا ... رات دو بجے پورا سسٹم ایک گھنٹے کے لیے شٹ ڈاؤن ہو ... تھا اور پھر تمام گھڑیوں کو موثر طور پر سیٹ کرنے کے ... دوبارہ آن ہوگیا۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے ... سیکیورٹی ٹیپ کی گھڑیوں نے وقت کے فرق یا بے ربطگی ... کیوں ظاہر نہیں کیا۔

یہ اسی ایک گھنٹے کی بات ہے جب سیکیورٹی سسٹم کام نہیں کررہا تھا تو اس دوران جیولری اسٹور کو لوٹ لیا گیا تھا ... جب سیکیورٹی کیمرے دوبارہ فعال ہوئے تو بس یہی لگا جیسے ... اس واردات میں صرف ایک سیکنڈ کا وقت لگا۔

لچورتھ جیولری اسٹور میں جو واحد فرد اس سیکیورٹی سسٹم کے بارے میں بھرپور معلومات سے واقف تھا، وہ شیلی جونسن تھی جس نے یہ سسٹم خریدا تھا۔ دیگر ملازمین اس سسٹم کے بارے میں قطعی ناواقف تھے۔

جب شیلی جونسن کے گھر کی تلاشی لی گئی تو چوری کیے گئے تمام زیورات اور دیگر اشیا اس کے گھر سے برآمد ہوگئیں اور اسے حراست میں لے لیا گیا۔

ایک زاویہ بدل جانے سے خوش گمانیاں بھی بدگمانیوں میں بدل جاتی ہیں... وہ خوش گمان تھا اور انہی خوش گمانیوں کی دنیا میں رہنا پسند کرتا تھا مگر اچانک ہی موسم بدلا اور اس کے اردگرد کی دنیا بھی بدل گئی...

آنکھوں میں غبار بھر دینے والی ایک احسان فراموش کہانی

احسان فراموش

جمال دستی

جولیس کمپیوٹر پر بیٹھا کچھ معلومات حاصل کررہا تھا۔ اس کا شمار بوسٹن کے ذہین ترین پرائیویٹ سراغ رسانوں میں ہوتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ کچھ سست بھی واقع ہوا تھا اور عام طور پر اس وقت ہی کوئی کیس ہاتھ میں لیتا جب اس کے بینک اکاؤنٹ میں کمی واقع ہونے لگتی اور وہ یہ خطرہ محسوس کرتا کہ اب اسے چار ستاروں والے ہوٹل کے بجائے تین ستاروں والے ہوٹل میں ڈنر کرنا پڑے گا۔ لیکن فی الحال اس کا کوئی امکان نہیں تھا کیونکہ حال ہی میں اسے کنگسٹن کیس

میں ٹھیک ٹھاک آمدنی ہوئی تھی۔ اسی لیے جب ایک معزز کلائنٹ کا فون آیا جو جولیس سے بات کرنے کا خواہاں تھا تو میں شش و پنج میں پڑ گیا لیکن وہ شہر کا نامی گرامی شیف تھا اور اسے نظرانداز کرنا ممکن نہ تھا۔ میں نے انٹرکام پر جولیس سے بات کرتے ہوئے کہا۔

"وہ تم سے ملنے کے لیے بے چین نظر آرہا ہے۔ میں تمہیں کبھی زحمت نہیں دیتا کیونکہ جانتا ہوں کہ آج تم کمپیوٹر پر اپنی پسندیدہ شراب کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے ہو لیکن وہ شخص عالمی شہرت یافتہ شیف ہے اور نو مرتبہ گولڈن چین ایوارڈ جیت چکا ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس سے ملنا تمہارے لیے سودمند رہے گا۔ کیا میں اسے ایک بجے کا وقت دے دوں؟"

"ہاں، یہ ٹھیک رہے گا آرچی۔" اس کا جواب سن کر مجھے خاصی حیرت ہوئی۔ میں نے اپنی ٹانگ پر ہلکی سی چٹکی لی کہ کہیں مجھ سے سننے میں غلطی تو نہیں ہوئی اور جب اطمینان ہو گیا تو میں نے ہنری اسکاٹ سے پوچھا کہ وہ کس سلسلے میں جولیس سے ملنا چاہتا ہے تو اس نے غراتے ہوئے کہا کہ اسے جولیس سے ایک ضروری کام ہے۔ اسی لیے وہ اس سے جلد از جلد ذاتی طور پر ملنا چاہ رہا ہے اور کام کی نوعیت کے بارے میں اسے ہی بتائے گا۔ میں نے اس سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور ملاقات کے لیے ایک بجے کا وقت دے دیا۔

اس کے بعد میں نے پرانے اخبارات اور مختلف ویب سائٹ کو کھنگالنا شروع کر دیا تاکہ اسکاٹ کے بارے میں تفصیلی معلومات اکٹھا کر سکوں اور جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اسکاٹ کو جولیس سے ملنے کی اتنی بے تابی کیوں تھی ---- اور یہ کہ جولیس نے بھی اس ملاقات پر فوراً ہی آمادگی کیوں ظاہر کر دی۔ دراصل اسکاٹ کے ذاتی شراب خانے میں ایک قیمتی اور نایاب وائن ایسی بھی تھی جسے جولیس برسوں سے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اسے موقع مل رہا تھا کہ وہ فیس کے ایک حصے کے طور پر اسکاٹ سے وہ وائن مانگ لے۔ اور اسکاٹ کے آنے کی وجہ یہ تھی کہ دو روز قبل اسے اپنے ایک ساتھی شیف جان کوائل پر حملہ کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ جب میں نے کیمبرج پولیس ڈپارٹمنٹ کے کمپیوٹر سسٹم تک رسائی حاصل کی تو معلوم ہوا کہ یہ واقعہ کوائل کے ہوٹل کے باہر پیش آیا تھا لہٰذا میں نے پولیس رپورٹ کی ایک نقل بھی ان دستاویزات میں شامل کر دی جن میں اسکاٹ کے بارے میں مکمل معلومات موجود تھیں۔ میں نے وہ تمام دستاویزات جولیس کو ای میل کر دیں۔ گو کہ اس کا امکان کم تھا کہ وہ اپنی موجودہ مصروفیت کے سبب ان ڈالنے کی زحمت گوارا کرے گا۔

ٹھیک ایک بجے دروازے کی گھنٹی بجی۔ آنے وقت کا پابند معلوم ہوتا تھا جبکہ جولیس نے ابھی تک دستاویزات کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ اسکاٹ کے ساتھ مورلے بھی تھی۔ میں نے ان دونوں کو پہچان لیا کیونکہ ہی ان کے بارے میں ریسرچ کر چکا تھا۔ ان کا جو عجیب سا لگ رہا تھا۔ اسکاٹ اڑسٹھ سال کا بھاری بھر تھا۔ اس کے چوڑے چہرے اور مضبوط بازوؤں کو دی اسے انگلش بل ڈاگ سے تشبیہ دی جا سکتی تھی جبکہ ا مورلے ستائیس سال کی تھی۔ اس کی ستواں ناک، بھ آنکھیں اور لمبے سیاہ بال دیکھ کر کسی ہالی ووڈ اداکارہ کی تص ذہن میں آتی تھی۔

جولیس نے انہیں دفتر میں بلالیا اور اپنے ہاتھ بنائی ہوئی گوشت کی ڈش اور پنیر پیش کی لیکن اسکاٹ نے کہہ کر معذرت کرلی کہ وہ اس وقت کچھ کھانے کے موڈ نہیں ہے۔ ایرل نے بھی اس کی تقلید کی۔ جن لوگوں نے ا سے پہلے میری کہانیاں نہیں پڑھیں، انہیں یہ بتادینا ضرور سمجھتا ہوں کہ میں جولیس کے لیے ایک آل راؤنڈر کے طو پر کام کرتا ہوں اور بیک وقت اس کا اسسٹنٹ، سیکریٹری، اکاؤنٹنٹ اور نہ جانے کیا کچھ ہوں۔ وہ اپنی ہر مشکل م میری مدد طلب کرتا ہے اور اکثر و بیشتر میرے مشوروں کی بدولت ہی اسے انتہائی پیچیدہ معاملات میں کامیابی ہوئی ہے لیکن مجھے اس کا کریڈٹ شخص نہیں ملا۔ دور ہونے کے باوجو بھی میں اس سے رابطے میں رہتا ہوں۔ ہم دونوں نے اپنی ٹائی میں ایک جدید آڈیو سسٹم نصب کر رکھا ہے جس کے ذریعے ہم ایک دوسرے کی بات سن سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں اپنے موبائل پر اس کے کمرے میں ہونے والی کارروائی بھی دیکھ سکتا ہوں۔

جولیس نے اسکاٹ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اسے مرعوب کرنے کے لیے کہہ دیا کہ وہ وہاں اس لیے گیا تھا کیونکہ کوائل نے اس کی ایک کھانا پکانے کی ترکیب چرالی تھی۔ یہ سن کر مورلے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور اسکاٹ کے نتھنے بھی پھڑکنے لگے۔ میں نے جولیس سے پوچھا کہ اسے اس بارے میں کیسے معلوم ہوا تو اس نے اپنی چھوٹی انگلی اوپر اٹھائی جس کا مطلب تھا کہ میں خاموشی سے سب کچھ سنتا رہوں۔

"کیا یہ بات لوگوں کو معلوم ہوگئی ہے؟" اسکاٹ نے ہکلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

جولیس نے کندھے اچکائے اور بولا۔ "یہ میرا اندازہ ہے۔ میں نے اخبار میں یہ خبر پڑھی تھی کہ تم نے کوائل کے ہوٹل کے باہر اس پر حملہ کیا۔ اس سے میں نے یہی سوچا کہ اس نے ضرور تمہاری کوئی ترکیب چرائی ہوگی اسی لیے تم وہاں گئے تھے۔"

اسکاٹ نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ "تمہارا اندازہ درست ہے۔ وہ شخص قابلِ نفرت ہے اور اس پیشے کو بدنام کر رہا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ میرے لیے اس ترکیب کی کیا اہمیت ہے؟"

میں پہلے ہی ابتدائی تحقیق سے معلوم کر چکا تھا۔ یہ اس کی خاص ڈش تھی جس پر اسے گولڈن چین ایوارڈ مل چکا تھا۔ اسکاٹ نے اس ڈش کو اپنی بیٹی کے نام منسوب کر دیا تھا جو نو سال کی عمر میں انتقال کر گئی تھی۔

اسکاٹ ایک بار پھر بدحواس نظر آنے لگا۔ اس کی سانس زور زور سے چل رہی تھی۔ ایرل نے اس کی جانب فکرمندی اور پریشانی سے دیکھا۔ اس نے اپنا نرم و نازک ہاتھ اس کی بھدی کلائی پر رکھا۔ اس کے ساتھ ہی اسکاٹ کی حالت معمول پر آنے لگی۔ اس نے جولیس سے کہا۔ "تم بھی اس ڈش کی اہمیت سے بخوبی واقف ہو گے اور تم نے کئی بار میرے ریستوران میں اس کا ذائقہ چکھا ہوگا۔"

"میں سال میں ایک مرتبہ اس طرح کے ریستوران میں جاتا ہوں اور مجھے وہ ڈش واقعی پسند آئی تھی۔ البتہ ابھی تک مجھے کوائل کے ریستوران میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

اسکاٹ نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے اور بولا۔ "تم سال میں ایک سے زیادہ مرتبہ بھی آسکتے ہو۔ ہمارے یہاں اس کے علاوہ بھی کئی ڈشیں تیار ہوتی ہیں جنہیں لوگ شوق سے کھاتے ہیں۔"

جولیس نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ اس نے تمہاری ترکیب چرالی ہے جبکہ ابھی تک اس کے مینیو میں اس کا ذکر نہیں ہے؟"

"وہ سور کی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔" اسکاٹ غراتے ہوئے بولا۔

اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا جیسے وہ اس سوال کا جواب نہ دینا چاہ رہا ہو۔ اس نے ایرل کو اشارہ کیا تو وہ بولی۔ "دو ہفتے پہلے یہ واقعہ پیش آیا۔ اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ کوئی چیز چرائی گئی ہے اور نہ ہی یہ جانتی تھی کہ اسکاٹ نے اس ترکیب کو کاغذ پر منتقل کر دیا ہے....."

"یہ میری غلطی تھی۔" اسکاٹ مداخلت کرتے ہوئے بولا۔ "اس سے پہلے تمام ترکیبیں یہاں محفوظ ہوتی تھیں۔" اس نے اپنی انگلی دماغ پر مارتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں نے سوچا کہ ایرل کی آسانی کے لیے ان ترکیبوں کو کاغذ پر لکھنا شروع کر دوں۔ مجھے چاہیے تھا کہ انہیں کاغذ پر لکھنے کے بجائے ایرل کو ذہن نشین کرواتا۔ میں بھی کتنا احمق ہوں۔"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ کوائل نے اس کام کے لیے کسی شخص کی خدمات حاصل کی ہوں گی کہ وہ تمہارے دفتر میں نقب لگا کر وہ تحریر چرا لے؟"

اسکاٹ کا چہرہ ایک بار پھر سرخ ہو گیا اور اس نے ایرل سے کہا۔ "انہیں بتادو کہ اس سور نے کیا کیا؟"

لمحہ بھر کے لیے یوں لگا جیسے ایرل ابھی رو دے گی۔ اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "دو دن پہلے کوائل نے اپنا ایک آدمی اس ڈش کے ہمراہ بھیجا جس نے بتایا کہ اس ترکیب کو آنے والے اتوار کے مینیو میں شامل کر لیا گیا ہے۔ میں نے وہ ڈش اس کے ہاتھ سے لی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں اس میں زہر نہ ملا دیا گیا ہو کیونکہ جانتی تھی کہ کوائل شیف اسکاٹ سے کتنا حسد کرتا ہے لیکن میں اسے چکھے بغیر بھی نہ رہ سکی۔ لیکن اس ڈش کے ذائقے سے نہیں لگ رہا تھا کہ یہ وہی ترکیب ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟" جولیس نے کہا۔

"ترکیب تو وہی تھی لیکن اس میں شیف اسکاٹ کی مہارت اور صفائی نظر نہیں آرہی تھی۔"

"یہ انتہائی قابلِ نفرت عمل ہے۔" اسکاٹ غصے سے بولا۔ "اس نے میری ترکیب کا ستیاناس کر دیا۔ اگر تم اسے چکھ لیتے تو فوراً ہی تھوک دیتے جیسا میں نے کیا۔"

"پھر تم اس سے ملنے چلے گئے؟" جولیس نے پوچھا۔

"فوراً ہی نہیں۔ پہلے میں نے عمدہ قسم کی فرانسیسی برانڈی سے اپنے منہ کا ذائقہ ٹھیک کیا پھر اس کے بعد اس کے نام نہاد ریستوران کی طرف چلا گیا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ شاید وہ اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اس نے گہری سانس لی اور بولا۔ "میں نے ہوٹل کے باہر ہی اسے گردن سے پکڑ لیا اور اسے سڑک پر گھسیٹنے لگا۔ وہ کسی زخمی سور کی طرح چلا رہا تھا پھر میں نے اسے اٹھا کر گٹر میں پھینک دیا۔ اس اقدام پر پولیس کو گرفتار کرنے کے بجائے میری تعریف کرنا چاہیے تھی۔"

ایک لمحے کے لیے وہ خاموش ہو گیا جیسے کچھ سوچ رہا ہو پھر اپنے خیالوں سے باہر آتے ہوئے بولا۔ "میں اس

ترکیب کے غیر قانونی استعمال کو روکنے کے لیے تمہاری خدمات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ یہ ڈش میرے لیے کتنی اہم ہے اور میں کوائل کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ اس انداز میں اس ڈش کی بے قدری کرے۔ اور اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو گیا تو یہ میرا بہت بڑا نقصان ہوگا اور میں یہ سوچ کر بھی یہ ڈش دوبارہ تیار نہیں کر سکوں گا کہ وہ منحوس انتہائی بھونڈے انداز میں اس کی نقل تیار کر چکا ہے۔"

میں جانتا تھا کہ جولیس اس کیس کو لینے سے انکار کر دے گا کیونکہ کوائل پہلے ہی اس چرائی ہوئی ترکیب کی ڈش بطور نمونہ بنا کر اسکاٹ کو بھیج چکا تھا۔ اب جولیس اسے روکنے کے لیے کیا کوشش کر سکتا تھا؟ بلیک میلنگ، دھمکی یا ناجائز دباؤ... وہ ان ہتھکنڈوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب جولیس نے یہ کیس لینے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ اس کے باوجود بھی اسکاٹ کی پریشانی ختم نہ ہوئی اور وہ پہلے کی طرح بے چین و مضطرب نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایرل کو جانے کا اشارہ کیا تاکہ وہ ریسٹوران پہنچ کر رات کے کھانے کی تیاری کرے۔ جولیس اسے بیرونی دروازے تک چھوڑنے آیا حالانکہ عام طور پر یہ خدمت میرے سپرد تھی۔ شاید وہ ایرل کی بے پناہ خوب صورتی سے متاثر ہو گیا تھا۔ اس کی یہ حرکت میری سمجھ سے باہر تھی۔ گو کہ ماضی میں وہ خاصا دل پھینک واقع ہوا تھا لیکن لی روسٹن سے ملنے کے بعد اس کی زندگی بہت بدل گئی تھی۔

جب وہ ایرل کو رخصت کرنے کے بعد اپنے کمرے میں واپس آیا تو اسکاٹ اسی طرح پریشان بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے جولیس سے اس کی فیس کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے یہ کہہ کر ایک بار پھر مجھے حیران کر دیا کہ وہ اس کیس کی کوئی فیس نہیں لے گا۔

اسکاٹ کو یہ سن کر غصہ آ گیا اور وہ غراتے ہوئے بولا۔ "میں کسی کا احسان نہیں لیا کرتا۔ اگر تم میرے لیے کام کرو گے تو اس کا معاوضہ بھی لینا ہوگا۔"

"یہ کوئی اتنا اہم مسئلہ نہیں۔ ہم اس پر بعد میں بھی بات کر سکتے ہیں۔"

اسکاٹ کے چہرے کی سختی فوراً ہی دور ہو گئی اور وہ قدرے نرم لہجے میں بولا۔ "مس مورلے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

جولیس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور محتاط انداز میں بولا۔ "اچھی لڑکی ہے۔"

"اس کا سارا دن کچن میں گزر جاتا ہے۔" اسکاٹ کے لہجے میں ہمدردی جھلک رہی تھی۔ "جبکہ اس جیسی لڑکی کو وقت کسی مرد کی رفاقت میں گزارنا چاہیے۔" پھر وہ اپنا [illegible] صاف کرتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ تم بھی ابھی تک کنوارے ہو؟"

اسکاٹ کی یہ بات سن کر میں چونک گیا۔ وہ ایرل مورلے سے کم از کم اکتالیس سال بڑا تھا اور کوئی بھی یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی قلبی تعلق ہوگا۔ پھر میں نے ان کے بارے میں مزید معلومات کیں اور ان کے رشتے کی نوعیت سے آگاہ ہو گیا۔ میں یہ معلومات جولیس کو پہنچانا چاہ رہا تھا لیکن فی الحال ایسا کرنا ٹھیک نہ ہوتا۔ پھر میرے کانوں میں جولیس کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "کنوارا تو ہوں لیکن میرے جملہ حقوق محفوظ ہو چکے ہیں۔"

یہ سنتے ہی اسکاٹ کے چہرے پر مایوسی چھا گئی اور وہ جانے کے لیے اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ عام طور پر جولیس اپنے کلائنٹس کو دروازے تک چھوڑنے نہیں جاتا تھا لیکن اسکاٹ کا معاملہ مختلف تھا۔ وہ عالمی شہرت یافتہ شیف تھا اور اسے پورے احترام کے ساتھ رخصت کرنا جولیس کے لیے لازم ہو گیا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ وہ ایرل کے لیے اتنا فکرمند کیوں ہے؟" میں نے جولیس سے پوچھا۔

"نہیں۔" جولیس نے کہا۔ "تم اس بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"اگر اسکاٹ کی بیٹی صوفی زندہ ہوتی تو وہ تقریباً ایرل کی ہم عمر ہی ہوتی۔ میں نے اسکاٹ کے ریسٹوران کی ویب سائٹ پر اس کی تصویر دیکھی ہے۔ اس کی شکل کافی حد تک ایرل سے ملتی ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر صوفی زندہ ہوتی تو ہو بہو ایرل جیسی ہی ہوتی اور شاید اسی لیے اسکاٹ اسے اپنی مرحومہ بیٹی کا نعم البدل سمجھتا ہے۔"

"ممکن ہے کہ تمہارا اندازہ درست ہو۔" جولیس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"اب تم کوائل کے ساتھ کیا کرو گے؟ اس کے طرز عمل سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی بلیک میلنگ یا دباؤ میں آنے والا نہیں۔"

جولیس نے ایک گہری سانس لی اور خاموشی اختیار کر لی۔ میں سمجھ گیا کہ فی الحال وہ اس بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا البتہ اس نے یہ ضرور کہا کہ اسے کوائل کے بارے میں مکمل معلومات درکار ہیں۔ ان معلومات پر مبنی دستاویزات

کا پلندا میں پہلے ہی تیار کر چکا تھا جب جولیس اور اسکاٹ باتوں میں مصروف تھے اور اس کا پرنٹ جولیس کی میز پر موجود تھا۔ اس نے ایک حسرت بھری نگاہ اپنے وائن میگزین پر ڈالی اور اسے بند کرکے کوائل کی فائل پڑھنے لگا جو تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل تھی۔ ایک گھنٹے بعد بھی وہ اسے پڑھنے میں مصروف تھا۔ اس نے بیزاری سے نتھنے سکیڑے اور حسرت سے کمپیوٹر کی جانب دیکھنے لگا۔ شاید وہ سوچ رہا ہو کہ اس منحوس فائل سے جلد از جلد جان چھڑا کر ایک بار پھر اپنے محبوب مشغلے کی طرف لوٹ جائے۔ میں نے اس مرحلے پر مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ اگر وہ چاہے تو یہ فائل بند کرکے کمپیوٹر پر وائن میگزین کھول سکتا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ پولیس رپورٹ کے مطابق کوائل کو قتل کردیا گیا ہے اور تمہارا کلائنٹ ہنری اسکاٹ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔

دو دن بعد جولیس اپنے کلائنٹ اسکاٹ سے ملنے مڈل سیکس کی جیل گیا۔ میں نے جولیس سے مذاق نہیں کیا تھا۔ کوائل کو اس کے اپنے ریستوران کے کچن میں قتل کردیا گیا۔ کسی نے اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپا تھا جو عام طور پر قصائی استعمال کرتے ہیں۔ کوائل کا ریستوران بھی صرف ڈنر کے لیے ہی کھلتا تھا اور یہ واقعہ سہ پہر میں پیش آیا تھا۔ اس وقت ریستوران کا عملہ وہاں موجود نہیں ہوتا تھا، اس لیے موقع کا کوئی گواہ نہیں تھا لیکن جب پولیس موقع واردات پر پہنچی تو انہوں نے اسکاٹ کو گھٹنوں کے بل لاش پر جھکا ہوا دیکھا۔ اس کا بایاں ہاتھ خون میں لت پت تھا اور چہرے پر بھی اس کی انگلیوں کے نشانات موجود تھے۔ اس کی ضمانت نہیں ہوسکی تھی لیکن وہ اپنے آپ کو بے قصور کہہ رہا تھا۔ اسی لیے جولیس اس سے ملنے پر آمادہ ہوگیا۔ دو دن جیل میں گزارنے کے باوجود وہ ہشاش بشاش نظر آرہا تھا۔ اسے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ اب کوائل اس کی ترکیب استعمال نہیں کرسکے گا اور یہ اتنی بڑی خوشی تھی کہ اس کے عوض وہ ساری عمر جیل میں رہ سکتا تھا۔ میں نے جولیس کو بڑے مشکل اور پیچیدہ کیس جیتتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اس کیس میں اسکاٹ کی بے گناہی کا کوئی معمولی سا ثبوت بھی نہیں تھا۔ اس لیے جولیس کی کامیابی کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔

اسکاٹ نے جولیس کو بتایا کہ دو دن پہلے اس سے ملنے کے بعد وہ سیدھا کوائل کے ریستوران گیا۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ اسے قتل کرنے کی نیت تھی یا اس سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ مانتا ہوں کہ میری طرف سے یہ ایک اضطراری حرکت تھی۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ کسی نے مجھے اس کی وہاں موجودگی کی اطلاع نہیں دی تھی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس وقت مجھ پر جوش غالب آگیا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو ریستوران کا بیرونی دروازہ مقفل تھا۔ میں نے گھنٹی بجائی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔“

”تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ صرف ڈور بیل بجائی تھی اور اسے باہر لانے کے لیے کوئی شور شرابا نہیں کیا اور نہ ہی دروازہ کھٹکھٹایا؟“

”ہاں کیونکہ اگر کوائل اندر موجود ہوتا تو وہ میری آواز سن کر کبھی دروازہ نہ کھولتا۔ میں نے اسی لیے ڈور بیل بجائی اور جب کوئی جواب نہ ملا تو میں نے عقبی دروازے سے ریستوران میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ وہ دروازہ مقفل نہیں تھا اس لیے میں بہ آسانی اندر چلا گیا۔ وہاں کچن میں کوائل فرش پر لیٹا ہوا تھا اور اس کی کمر میں چاقو پیوست تھا، وہ مرچکا تھا۔ اس کے باوجود میں اسے دیکھنے کے لیے جھکا اور اس طرح چاقو پر میری انگلیوں کے نشانات آگئے اور میرے ہاتھ پر بھی خون لگ گیا۔ اسے مردہ حالت میں دیکھ کر مجھے خوشی نہیں بلکہ افسوس ہوا۔ کاش وہ میرے ہاتھوں مارا جاتا۔“

”تمہارے پہنچنے کے کتنی دیر بعد پولیس آئی؟“

”ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگا۔ میں نے کوائل کو نہیں مارا لیکن پولیس مجھے ہی قصوروار سمجھ رہی ہے۔ اب تم ہی میری آخری امید ہو، اگر تم نے بھی میری بات کا یقین نہ کیا تو میں ہی مجرم گردانا جاؤں گا۔“

جولیس نے اپنے موبائل پر مجھے ایس ایم ایس کیا۔ ”یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ پولیس کو اس قتل کی اطلاع کس نے دی؟“

میں اس سے پہلے ہی کیمبرج پولیس اسٹیشن کے فون ریکارڈ اور کمپیوٹر سسٹم میں گھس کر تمام معلومات حاصل کرچکا تھا جو میں نے جولیس کو پہنچادیں۔

”قتل کے آٹھ منٹ بعد پولیس کو ایک گمنام کال وصول ہوئی جس کے مطابق تمہیں کوائل کی لاش پر جھکے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ اس کے باوجود میں تمہاری بے گناہی تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ یہ یقین ہوجائے کہ تم جھوٹ نہیں بول رہے کیونکہ اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“

”میں جھوٹ نہیں بول رہا۔“ اسکاٹ غصے سے بولا۔

”ان واقعات کی روشنی میں پولیس تمہیں ہی مجرم ٹھہرائے گی اور استغاثہ کو بھی اسے ثابت کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ شاید ہی جیوری اس آٹھ منٹ کے وقفے پر دھیان دے جس کے دوران تم اس کی لاش کے قریب پائے گئے تھے اور غلطی سے تمہاری انگلیوں کے نشان چاقو کے دستے پر آگئے۔“

”اب ہم کیا کریں؟“ اسکاٹ نے بے تابی سے پوچھا۔

جولیس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ بولا۔ ”مجھے کوائل کے قاتل کا پتا لگانا ہوگا۔“

اس نے اپنے مفروضے کی بنیاد اس واقعے پر رکھی جس میں اسکاٹ نے کوائل پر حملہ کیا تھا جس کی وجہ سے قاتل کو یقین ہوگیا کہ پولیس سب سے پہلے اسکاٹ پر ہی شک کرے گی کیونکہ وہ کھلم کھلا کوائل کو جان سے مارنے کی دھمکی دے چکا تھا۔ قاتل کی خوش قسمتی تھی کہ اس نے جائے وقوعہ سے فرار ہوتے وقت اسکاٹ کو ریسٹورنٹ کی طرف آتے ہوئے دیکھ لیا۔ چنانچہ اس نے پولیس کو فون کرکے اسے اسکاٹ کے پیچھے لگا دیا اس لیے اس مفروضے کو ذہن میں رکھتے ہوئے جولیس اور اسکاٹ نے ممکنہ مشتبہ افراد کی فہرست تیار کی جو کوائل کو مردہ دیکھنا چاہتے ہوں گے۔ ابتدا میں یہ فہرست بارہ افراد پر مشتمل تھی لیکن نظرِ ثانی کے بعد جولیس نے صرف تین ناموں کے گرد سرخ نشان لگایا جنہیں مشتبہ سمجھنے کی معقول وجوہات موجود تھیں۔ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا اس لیے جولیس کو رخصت ہونا پڑا۔ چلتے وقت اسکاٹ نے ایک مرتبہ پھر اس سے فیس کے بارے میں پوچھا تو جولیس نے کہا کہ وہ اس بارے میں بعد میں بات کرے گا۔

وہاں سے آنے کے بعد جولیس نے ایک بار پھر مجھ سے رابطہ کیا اور کہا کہ میں ان تین مشتبہ افراد کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کروں جس پر میں نے اسے یاد دلایا کہ وہ ان تین افراد کے ساتھ ساتھ اس فائل کا بھی بغور مطالعہ کرے جو میں نے کوائل کے حوالے سے تیار کی تھی۔ اس کے علاوہ اسے ونڈسر ہوٹل کو کوائل کے کریڈٹ کارڈ کے ذریعے کی گئی ادائیگیوں کو بھی چیک کرنا ہوگا۔ کہیں گزشتہ دنوں اس کا کوئی معاشقہ تو نہیں چل رہا تھا۔

”شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو آرچی۔“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ٹام ڈورکن سے بات کراؤ۔“

ٹام ایک فری لانس سراغ رساں تھا اور جولیس خاص خاص مواقع پر اس کی خدمات حاصل کیا کرتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جولیس نے سرد آہ کیوں بھری تھی۔ دراصل ٹام کا معاوضہ بہت زیادہ تھا اور اس کیس میں ابھی تک جولیس کو فیس کے نام پر ایک دھیلا بھی نہیں ملا تھا لیکن ٹام سے کام لینا

اس کی مجبوری تھی، چنانچہ میں نے اس سے رابطہ کیا اور یہ جاننے کے بعد کہ فی الوقت وہ ہمارے لیے کام کرسکتا ہے، اس کا رابطہ جولیس سے کروادیا۔ جولیس نے اس سے کہا کہ وہ کوائل کے بارے میں معلوم کرکے بتائے، وہ گزشتہ دنوں ونڈسر ہوٹل میں کس سے ملتا رہا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔ اس کے بعد میں نے کوائل کی ایک حالیہ تصویر ٹام کو ای میل کردی اور اسے ان تاریخوں سے بھی آگاہ کردیا جن میں ونڈسر ہوٹل کو اس کے کریڈٹ کارڈ سے ادائیگی ہوئی تھی۔ اس کے بعد جولیس نے مجھے ایرل مورلے سے رابطہ کرنے کے لیے کہا۔ وہ اس وقت ریسٹورنٹ میں رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ میں نے اسے بتادیا کہ جولیس تھوڑی دیر بعد اس سے ملنے کے لیے آرہا ہے۔

وہ جب اسکاٹ کے ریستوران پہنچا تو ایرل کچن یونیفارم میں ملبوس تھی۔ اس نے جولیس کی تواضع عمدہ قسم کی فرانسیسی شراب سے کی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں جیسے وہ دیر تک روتی رہی ہو۔ اس کے چہرے پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ جولیس نے شراب کا گھونٹ لینے کے بعد اس کی تعریف کی تو وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولی۔ ”شیف اسکاٹ نے مجھے ریستوران کھلا رکھنے کی ہدایت کی تھی، حالانکہ اس وقت میں اس قابل نہیں لیکن ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہے۔ کم از کم اس طرح میرا دھیان بٹا رہے گا۔“

”میں تمہارا دکھ سمجھتا ہوں۔“ جولیس نے ہمدردی سے کہا۔ ”کیا تمہیں یقین ہے کہ اسکاٹ نے ہی کوائل کو قتل کیا ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے بے لچک انداز میں کہا۔ ”شیف کبھی کسی کی پیٹھ میں چھرا نہیں گھونپ سکتا۔ اگر اسے کوائل کو مارنا ہوتا تو وہ چاقو کے بجائے اپنے ہاتھوں کا استعمال کرتا۔“

جولیس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ”میں بھی کچھ وجوہات کی بنا پر سمجھتا ہوں کہ وہ بے قصور ہے اور اسی لیے اصل قاتل تک پہنچنے کی کوشش کررہا ہوں۔“

ایرل نے اس خبر پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ شاید اسے بھی امید نہیں تھی کہ جولیس اپنے مقصد میں کامیاب ہوسکے گا۔ جولیس نے اسے تین مشتبہ افراد کی فہرست دکھائی تو اس نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے اس میں ایک نام کا اور اضافہ کردیا۔

دوسرا گلاس ختم ہونے کے بعد ایرل اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی کہ اسے شام کی تیاری کے لیے کچن میں جانا ہے۔ وہ جولیس کو دروازے تک چھوڑنے آئی اور اسے

اندر سے بند کر کے کچن میں چلی گئی۔ دفتر پہنچنے کے بعد جولیس نے مجھ سے کہا کہ میں اگلے روز ان چاروں مشتبہ افراد سے اس کی ملاقات کا بندوبست کروں۔

''تم ان سے ایک ساتھ ملنا چاہو گے یا علیحدہ علیحدہ؟''

''میرا خیال ہے کہ انفرادی ملاقات ٹھیک رہے گی۔''

جولیس سمجھتا تھا کہ ساری دنیا اس کے قدموں کے نیچے ہے اور ہر کوئی اس کے حکم کی تعمیل کرنے کا پابند ہے جبکہ مجھے بالکل بھی یقین نہیں تھا کہ وہ چاروں میری ایک فون کال پر دوڑے چلے آئیں گے۔ ان میں سے دو تو گھبراہٹ یا تجسس کی وجہ سے جولیس سے ملنے کے لیے تیار ہو گئے لیکن کوائل کی بیوہ چھتے سے اکھڑ گئی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ جولیس اس کے شوہر کے قتل کے سلسلے میں ملنا چاہتا ہے تو اس نے غصے میں آ کر پولیس کو فون کرنے کی دھمکی دی کہ میں اسے ہراساں کر رہا ہوں۔

''میں سمجھتا ہوں کہ جولیس سے ملنا تمہارے لیے فائدہ مند رہے گا۔'' میں نے اس کی دھمکی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے اس کی پروا نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ دس منٹ بعد اس کے وکیل کا فون آیا کہ وہ اس معاملے میں قانونی چارہ جوئی کا حق محفوظ رکھتا ہے۔ آخر جولیس کس حیثیت میں اس کی مؤکلہ سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہے جس پر میں نے اسے بتایا کہ شیف اسکاٹ اپنے آپ کو بے قصور سمجھتا ہے اور اس نے اصل قاتل کو تلاش کرنے کے لیے جولیس کی خدمات حاصل کی ہیں۔ اس حوالے سے اس کا حق بنتا ہے کہ وہ متعلقہ افراد سے ضروری معلومات حاصل کرے۔ اس کے باوجود بھی اگر کوائل کی بیوہ جولیس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنا چاہتی ہے تو بے شک اپنا شوق پورا کر لے۔

میری بات اس وکیل کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے کہا کہ وہ اپنی مؤکلہ کو قائل کرنے کی کوشش کرے گا۔ دس منٹ بعد ہی کوائل کی بیوہ کا فون آ گیا اور اس نے بتایا کہ وہ جولیس سے ملاقات کے لیے تیار ہے۔

اس کے برعکس جیسن ہیکل سے معاملہ طے کرنا آسان رہا۔ وہ ایک سرمایہ کار تھا جس کے ساتھ کوائل نے ایک لمبی رقم کی بے ایمانی کی تھی۔ معاملہ عدالت میں گیا۔ کوائل نے انتہائی قابل وکیلوں کی خدمات حاصل کیں اور وہ اسے بچانے میں کامیاب ہو گئے جس کی وجہ سے ہیکل کے دل میں کوائل کے لیے نفرت پیدا ہو گئی اور جولیس نے اس کا نام مشتبہ قاتلوں کی فہرست میں شامل کر لیا۔

جب میں نے اسے فون کیا تو اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔ ''کیا اس طرح جولیس مجھے کوائل کا قاتل ثابت کر سکے گا؟''

''کیا تم نے اسے قتل نہیں کیا؟''

''اگر میں نے ایسا کیا ہے، تب بھی تمہیں نہیں بتاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ یہ تو تمہیں معلوم ہو ہی گیا کہ جولیس تم سے کیوں ملنا چاہتا ہے۔ کیا تم اس ملاقات کے لیے تیار ہو؟''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس معاملے میں مجھے کیوں ملوث کر رہا ہے؟ میرا کوائل کے ساتھ رقم کے لین دین پر تنازعہ ضرور ہوا تھا لیکن اسے دشمنی نہیں کہہ سکتے پھر میں اسے کیوں قتل کرتا؟''

''تم جولیس سے مل کر اپنی بے گناہی ثابت کر سکتے ہو۔''

''میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔'' اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

اس کے انکار نے مجھے مشتعل کر دیا اور میں نے فوراً ہی اس کے مالی معاملات کی چھان بین شروع کر دی۔ اس کے بینک اکاؤنٹس اور انکم ٹیکس ریکارڈ کی چھان بین کے بعد یہ انکشاف ہوا کہ اس نے بعض معاملات میں شدید نوعیت کی بے قاعدگیاں کی ہیں جن کی بدولت وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند ہو سکتا ہے۔ میں نے اسے فون کر کے ان .... بے قاعدگیوں کی نشاندہی کی تو اس کا لہجہ بالکل بدل گیا اور اس نے پوچھا کہ مجھے یہ معلومات کیسے حاصل ہوئیں جس پر میں نے سختی سے کہا۔

''یہ جاننا تمہارے لیے ضروری نہیں۔ بس اتنا بتا دو کہ میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا؟''

''اس کا مطلب ہے کہ اب تم مجھے بلیک میل کرو گے۔''

''تم اسے جو چاہے نام دو۔ اب یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ انکم ٹیکس حکام کا سامنا کرو گے یا جولیس سے ملنے کو ترجیح دو گے۔''

چند لمحے خاموشی طاری رہی پھر اس نے مری ہوئی آواز میں جولیس سے ملنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔

ان چاروں مشتبہ افراد سے ملاقات کا وقت طے کرنے کے بعد میں نے ان کے بارے میں تفصیلات اکٹھا کرنا شروع کر دیں اور ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ فائل بنا کر

جولیس کو ای میل کر دی۔ مجھے شک تھا کہ یہ قتل کسی رقابت کا نتیجہ ہو سکتا ہے اور رقیب اس عورت کا شوہر یا محبوب ہی ہوگا جس سے کوائل ونڈسر ہوٹل میں ملا کرتا تھا۔ لیکن جب تک نام کی رپورٹ نہ آ جاتی، اس سلسلے میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل تھا۔

کیمبرج پولیس اسٹیشن کے سراغ رساں مارک کریمر کو جب معلوم ہوا کہ جولیس اس قتل کے مرکزی ملزم اسکاٹ کو بچانے کی کوشش کر رہا ہے اور اصل قاتل کی تلاش میں ہے تو وہ بھنا گیا۔ اس سے پہلے بھی گزشتہ دو برسوں میں اس کا جولیس کے ساتھ تین مرتبہ ٹکراؤ ہو چکا تھا اور ہر بار جولیس کی تحقیق نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ لیکن اس مرتبہ کریمر کو یقین تھا کہ جولیس اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوگا لہٰذا وہ اسے سمجھانے چلا آیا۔

''کیا یہ سچ ہے کہ تم اسکاٹ کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟''

''میں صرف حقائق کی چھان بین کر رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر جولیس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔

''اس بار تمہیں منہ کی کھانی پڑے گی۔'' کریمر نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''میں نے یہ کب کہا کہ وہ ملزم نہیں ہے۔'' جولیس نے بڑے محتاط انداز میں کہا۔

''پھر کیا تم مچھلیاں پکڑ رہے ہو؟'' کریمر نے طنزاً کہا۔

''بظاہر ایسا ہی لگتا ہے۔ اگر میں تو گیارہ کو ہونے والی وہ فون کال سن سکتا جس کی بنیاد پر پولیس کوائل کے ریستوران گئی تو مجھے صورتِ حال کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی۔''

یہ سنتے ہی کریمر اپنی جگہ سے اچھل پڑا اور حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں اس کال کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟ ہم نے ابھی تک کسی پر یہ بات ظاہر نہیں کی۔''

جولیس مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اب سے ایک منٹ پہلے تک یہ محض میرا اندازہ تھا کیونکہ پولیس کو یقیناً کسی نے اس قتل کے بارے میں اطلاع دی ہوگی تبھی وہ کوائل کے ریستوران کی جانب روانہ ہوئی۔ اب تم نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی ہے۔ کیا تم مجھے اس کی ریکارڈنگ سنوا سکتے ہو؟''

کریمر نے کافی کی پیالی میز پر رکھ دی اور کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''اسے بھول جاؤ۔ ہم نے اسکاٹ کو رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔ آلۂ قتل پر اس کی انگلیوں کے نشانات موجود ہیں۔ اس کے بعد بھی کسی ثبوت کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟ میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔''

یہ کہہ کر وہ غصے میں پیر پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے جولیس سے کہا۔ ''لگتا ہے کریمر کو گمنام کال والی بات پسند نہیں آئی۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' جولیس نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے گوگل پر اس ریستوران کا محلِ وقوع دیکھا ہے۔ اس کے عقبی حصے والی گلی میں پیدل چلنے والوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لیے اس بات کا بہت کم امکان ہے کہ کسی راہ گیر نے کوائل کی چیخ سن کر پولیس کو کال کر دی ہو اور کریمر بھی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے۔ اس وجہ کو جاننے کے بعد میں بھی قائل ہو گیا ہوں کہ اسکاٹ بے قصور ہے۔'' میں نے اپنا تجزیہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

جولیس نے بے پروائی سے سر ہلایا جیسے کہہ رہا ہو کہ ہمارے قائل ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ جیوری ناقابلِ تردید ثبوت کی موجودگی میں اس دلیل کو کیسے تسلیم کرے گی۔ اس لیے ضروری تھا کہ وہ چاروں مشتبہ افراد سے مل کر حقائق جاننے کی کوشش کرے۔

دوسری صبح سب سے پہلے کوائل کی بیوہ میگان کوائل آئی۔ اس نے سیاہ رنگ کا ماتمی لباس پہن رکھا تھا اور تینتالیس سال کی عمر میں بھی خاصی پُرکشش دکھائی دے رہی تھی۔ البتہ چہرے پر چھائی ہوئی سختی نے اس کی دلکشی کو خاصا متاثر کیا تھا۔ اس نے بیٹھتے ہی میری شکایت لگا دی۔

''تمہارا اسیکریٹری بہت بدتمیز اور گستاخ ہے۔ ایسے شخص کو تو فوراً فارغ کر دینا چاہیے۔''

''ہاں، بعض اوقات وہ ایسی حرکت کر جاتا ہے۔'' جولیس نے معذرت خواہانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''میرا شوہر قتل کر دیا گیا۔ میں اس کا سوگ منا رہی ہوں اور وہ بے ہودہ شخص مجھے یہ بتانے کے لیے تیار نہیں کہ تم مجھ سے کیوں ملنا چاہ رہے تھے۔''

''واقعی یہ ناقابلِ معافی جرم ہے۔'' جولیس نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

''تم جانتے ہو کہ یہ میرے لیے کتنا مشکل وقت ہے۔''

''میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔'' جولیس نے دھیمے انداز میں کہا۔ ''اور اگر یقین ہو گیا کہ کوائل کے قتل سے

تمہارا کوئی تعلق نہیں تو واقعی مجھے تمہارے یہاں آنے پر افسوس ہوگا۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔" وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

"مادام! میں تم سے صرف اس لیے ملنا چاہ رہا تھا تاکہ جان سکوں کہ کیا تم نے ہی اپنے شوہر کو قتل کیا ہے۔ لہٰذا کوئی لمبی چوڑی تمہید باندھنے کے بجائے براہِ راست یہ سوال کررہا ہوں کہ کیا تم نے اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپا تھا؟"

"تمہیں یہ کہنے کی جرأت کیسے ہوئی؟" وہ غضب ناک لہجے میں بولی۔

"تم نے یہ قدم اس لیے اٹھایا کیونکہ وہ تم سے بے وفائی کررہا تھا۔" جولیس اس کے غصے کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔"

جولیس نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں اور بولا۔ "تمہارا شوہر گزشتہ مہینے کسی دوسری عورت سے ونڈسر ہوٹل میں ملتا رہا۔" یہ کہہ کر اس نے کوائل کی بیوہ کو ان تمام رسیدوں کی نقول پکڑادیں۔

یہ اس رقم کی رسیدیں تھیں جو کوائل نے مختلف تاریخوں میں کمرا بک کرانے کے لیے ادا کی تھی۔ مسز کوائل کا چہرہ سفید پڑ گیا اور وہ کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ "اب مجھ میں کچھ اور سننے کا حوصلہ نہیں۔ مجھے اب چلنا چاہیے۔"

جولیس نے اس سے یہ جاننے کی کوشش کی کہ کیا وہ اس عورت کو جانتی ہے جس سے اس کا شوہر ہوٹل میں ملنے جایا کرتا تھا لیکن اس نے جولیس کی بات کو نظرانداز کردیا اور پیر پٹختی ہوئی چلی گئی۔ جولیس نے پہلے ہی ایک ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر ڈیوڈ پریز کو بلالیا تھا اور اس کے ذمے یہ ڈیوٹی لگائی کہ مسز کوائل کا تعاقب کرے۔ اسے شک تھا کہ مسز کوائل اس عورت کو جانتی ہے اور ڈیوڈ پریز اس کا تعاقب کرتا ہوا اس عورت تک پہنچ سکتا ہے۔

میں جولیس سے بہت کچھ پوچھنا چاہ رہا تھا لیکن اسے کسی گہری سوچ میں غرق دیکھ کر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈور بیل بجی۔ یہ اسٹیفنی تھی جس کا مشتبہ افراد کی فہرست میں دوسرا نمبر تھا۔ اس عورت کی وجہ سے کوائل اور اس کی بیوی کے درمیان جھگڑا ہوا تھا۔ اسٹیفنی اب چھتیس برس کی ہوچکی تھی۔ وہ چھریرے بدن کی پُرکشش عورت تھی۔ تین سال پہلے اسے طلاق ہوئی اور شوہر دوسری شادی کرکے کیلی فورنیا چلا گیا۔ اسکاٹ نے اس کے با میں جولیس کو بتایا تھا کہ اس عورت کے کوائل سے گہ مراسم تھے اور اسے یہ بات بالکل پسند نہیں آئی کہ وہ وا اپنی بیوی کی طرف لوٹ جائے۔ اسکاٹ کا کہنا تھا کہ ا معلومات کے مطابق وہ عورت کوائل سے اکثر و بیشتر رہتی تھی اور کم از کم چار مرتبہ اس نے ریستوران میں موج لوگوں کے سامنے اپنی بھڑاس نکالی۔ میں نے اسکاٹ بیان کی تصدیق کے لیے کمپیوٹر میں گھس کر ریکارڈ کی چ بین کی تو مجھے کیمبرج کورٹ کا نو مہینے پہلے والا وہ حکم نا آگیا جس میں اس عورت کو کوائل سے دور رہنے کی ہدایت گئی تھی۔

جولیس نے اس سے بھی یہی سوال پوچھا کہ کیا اس کوائل کو قتل کیا ہے تو اس عورت نے نفی میں سر ہلاتے ہو کہا۔ "پولیس پہلے ہی قاتل کو گرفتار کرچکی ہے اور غالباً وہ کوئی شیف ہی ہے۔"

جولیس نے اسے مرعوب کرنے کی خاطر کہا۔ "م نے تم سے یہ نہیں پوچھا کہ پولیس نے کسی دوسرے شخص اس جرم میں گرفتار کیا ہے یا نہیں بلکہ میں تو یہ جاننا چا ہوں کہ کیا تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق ہے یا تم اسے قتل کیا ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا لیکن اس کے انداز سے لگ تھا کہ اسے اس سوال پر کوئی حیرانی نہیں ہوئی اور یہی با جولیس نے بھی محسوس کی۔ اس نے کہا۔ "تمہیں میرے سو پر حیرانی نہیں ہوئی؟"

اس عورت کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہ اور وہ جولیس سے نظریں ملاتے ہوئے بولی۔ "مجھے یقین کہ تم میرے اور کوائل کے تعلق کے بارے میں جانتے لیکن یقین جانو میں نے اسے کوئی دھمکی نہیں دی تھی۔ ا مجھے اس پر غصہ ضرور آیا تھا کیونکہ اس نے مجھ سے شاد کرنے کا وعدہ کیا اور بعد میں مکر گیا۔ گو کہ اسے اپنی بیوی محبت نہیں تھی لیکن وہ اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ ریستوران اس کی بیوی کے نام تھا اور علیحدگی کی صورت م کوائل کو اس سے محروم ہونا پڑتا۔ میں ہی بے وقوف تھی جو ا کی باتوں میں آگئی۔"

جولیس نے اس سے پوچھا کہ وہ گزشتہ جمعرات ڈھائی بجے کے قریب کہاں تھی۔ اسٹیفنی نے چونک کر ا دیکھا اور سمجھ گئی کہ یہی وہ وقت تھا جب کوائل کا قتل ہوا۔ سنبھلتے ہوئے بولی۔ "اس وقت میں اپنی گاڑی میں ساحل طرف جارہی تھی لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ کسی نے مجھے دیکھا ہوگا۔"

"تم نے اپنی گاڑی کوائل کے ریستوران کے باہر کھڑی نہیں کی تھی؟" جولیس نے پوچھا۔

اسٹیفنی نے نفی میں سر ہلایا تو جولیس نے اگلا سوال کیا۔ "کیا تم نے پولیس کو فون نہیں کیا تھا؟"

اسٹیفنی نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلادیا۔ اگلے آدھ گھنٹے تک جولیس اس سے یہ معلوم کرنے کی کوشش میں لگا رہا کہ کیا وہ اب بھی اکثر و بیشتر کوائل کا تعاقب کیا کرتی تھی یا اس کی کار کوائل کے ریستوران کے باہر کھڑی ہوتی تھی؟ اس نے اعتراف کیا کہ ایسا اکثر ہوتا تھا لیکن جمعرات والے روز وہ اس جانب نہیں آئی۔ اسی طرح اس نے اس عورت کے بارے میں بھی لاعلمی کا اظہار کیا جس سے ملنے کے لیے کوائل ونڈسر ہوٹل جایا کرتا تھا۔

اس عورت کے جانے کے بعد میں نے ایک بار پھر کیمبرج پولیس اسٹیشن کے کمپیوٹر ریکارڈ میں گھس کر اس فون نمبر کے بارے میں جاننے کی کوشش کی جس کے ذریعے پولیس کو اطلاع دی گئی تھی لیکن وہ اجنبی نمبر تھا۔ غالباً وہ کسی ایسے سیل فون کا نمبر تھا جو عام دکانوں پر مل جاتے ہیں اور کسی کے نام پر رجسٹرڈ نہیں ہوتے۔

اس کے بعد آنے والا تیسرا مشتبہ شخص شیف ایڈمنڈ گورنیر تھا۔ وہ باسٹھ سال کا چھوٹے قد اور فربہ جسامت والا شخص تھا جس کا سر درمیان سے گنجا ہوچکا تھا اور اطراف میں سفید بالوں کی جھالر لٹک رہی تھی۔ اس نے اپنے سے آدھی عمر کی عورت سے شادی کررکھی تھی۔ اس کی تصویر دیکھنے سے ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ وہ اپنے شوہر سے مطمئن نہیں ہے اور موقع ملنے پر ادھر اُدھر تاک جھانک کرتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ گولڈن پین ایوارڈز کے موقع پر جب کوائل نے اس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تو اس عورت نے بھی جواب میں اس کی حوصلہ افزائی کی جس پر بوڑھا ایڈمنڈ مشتعل ہوگیا اور اس نے کوائل کو برا بھلا کہنا شروع کردیا۔ جب تک دوسرے لوگ بیچ بچاؤ کراتے، وہ مکے مار مار کر کوائل کا چہرہ لہولہان کرچکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جولیس نے اس کا نام مشتبہ افراد کی فہرست میں شامل کرلیا تھا۔

ایڈمنڈ نے کرسی پر بیٹھتے ہی پہلا جملہ یہ کہا۔ "میں ہنری اسکاٹ کو مبارک باد دینا چاہتا ہوں کہ اس نے کوائل جیسے ناپاک انسان کو قتل کردیا جو دوسروں کی بیویوں پر نظر رکھتا تھا۔ اسے تو اس کارنامے پر تمغہ ملنا چاہیے۔ کوائل نے اس کی ترکیب چرائی۔ اس کے باوجود اسکاٹ نے بڑے ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس پر چاقو کا ایک ہی وار کیا۔ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو قصاب کا بغدا استعمال کرکے اس کی لاش کا قیمہ بنادیتا۔"

"گویا اگر تم کوائل کے کچن میں ہوتے تو اسے قتل کردیتے؟"

ایڈمنڈ کی آنکھوں میں چمک ابھری اور وہ بولا۔ "بالکل، وہ اپنے آپ کو بہت بڑا شیف سمجھتا تھا جبکہ اس میں ایک عام باورچی جتنی بھی اہلیت نہیں تھی۔ اس نے جو کچھ میری بیوی کے ساتھ کیا، اس کی سزا میں موقع پر ہی دے چکا تھا لیکن اگر اس نے میری کوئی ترکیب چرائی ہوتی تو میں بھی اس کے ساتھ وہی سلوک کرتا جو اسکاٹ نے کیا۔"

ایڈمنڈ کے پاس جائے واردات سے دور رہنے کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ البتہ اس کا کہنا تھا کہ سہ پہر میں وہ سو جاتا ہے اور اس کی بیوی عموماً شاپنگ کے لیے چلی جاتی ہے۔ نام پہلے ہی اس عورت کی تصویر ہمیں دکھا چکا تھا جو کوائل سے ملنے ونڈسر ہوٹل آتی تھی لیکن اس وقت تک ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ یہی ایڈمنڈ کی بیوی ہے۔

ایڈمنڈ کے بعد جیسن ہیکل کا نمبر تھا جس کے بارے میں مجھے شبہ تھا کہ اس نے کوائل کی بیوی کے ساتھ مل کر یہ قتل کیا تھا۔ وہ سینتالیس سال کا طویل قامت اور بھاری بھرکم شخص تھا۔ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہی میرے خلاف لمبی چوڑی تقریر کرڈالی۔ اس کا کہنا تھا کہ دھمکی دینے کے الزام میں مجھے حوالات میں بند کردینا چاہیے۔ جولیس نے اس کی تقریر بڑے تحمل سے سنی اور آخر میں صرف اتنا کہا۔ "گو کہ مجھے آرچی کے طریقۂ کار سے اتفاق نہیں ہے لیکن میں حیران ہوں کہ اس نے کیا دھمکی دی ہوگی۔"

"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اس نے مجھ سے کیا کہا تھا؟" ہیکل بھناتے ہوئے بولا۔

"میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس نے تمہیں ایک قتل کی تحقیقات کے سلسلے میں مجھ سے بات کرنے کے لیے کہا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی سرکاری وکیل تمہارے الزام پر سنجیدگی سے توجہ دے گا۔ بہرحال، اب ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ میں جاننا چاہوں گا کہ تم نے کوائل کو قتل کیوں کیا اور آرچی سے گفتگو کے دوران اس کا اعتراف بھی کرلیا؟"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں نے غصے میں آکر اس سے کیا کہہ دیا تھا۔" وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔

”پولیس نے شیف اسکاٹ کو جائے واردات سے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ تم اچھے کھانے اور عمدہ شراب کے شوقین ہو اور اسکاٹ ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ شیف ہے جس سے دوستی کر کے تم اپنا یہ شوق بہ آسانی پورا کر سکتے ہو۔ اسی لیے تمہیں کسی ایسے شخص کی تلاش ہے جس پر کوائل کے قتل کا الزام ڈال سکو اور اس کے لیے میں ہی تمہیں مناسب ترین فرد نظر آیا۔“

”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ صرف اصل مجرم کو تلاش کر رہا ہوں اور تمہیں یہاں بلانے کا مقصد بھی یہی ہے کیونکہ تم نے کوائل کو کھلم کھلا دھمکیاں دی تھیں۔“

”اس لحاظ سے تو میں خوش قسمت ہوں کہ پولیس نے اسکاٹ کو موقع پر ہی گرفتار کر لیا ورنہ وہ مجھے بھی اس الزام میں پکڑ سکتے تھے۔ میں نے کوائل کو بلاوجہ ہی دھمکی نہیں دی تھی۔ اس نے میرے ساتھ دو لاکھ ڈالرز کا فراڈ کیا تھا۔ اس نے مجھ سے ایک نئے منصوبے میں سرمایہ کاری کے لیے کہا جو بعد میں منسوخ کر دیا گیا۔ اس طرح وہ میری ساری رقم ہڑپ کر گیا۔“

”مجھے اس کہانی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ صرف اتنا بتا دو کہ کیا تم نے کوائل کو قتل کیا ہے؟“

”نہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”البتہ میری خواہش تھی کہ ایسا کر سکتا۔“

”جمعرات کے روز ڈھائی بجے تم کہاں تھے؟“

”اس وقت میں سینما ہال میں فلم دیکھ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہاں بہت سے لوگوں نے مجھے دیکھا ہوگا لیکن میں کسی کو نہیں جانتا اور نہ ہی ان کی نشاندہی کر سکتا ہوں۔“

اس کے بعد جولیس مزید آدھ گھنٹے تک اس سے پوچھ گچھ کرتا رہا لیکن کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوئی۔

ہیکل کے جانے کے بعد جولیس نے الماری سے ایک قیمتی شراب کی بوتل نکالی اور پیگ بنا کر پینے لگا۔ ایسا وہ اس وقت کرتا تھا جب اس کا ذہن کسی مسئلے میں بری طرح الجھا ہوا ہو۔

پانچ دن اسی طرح گزر گئے لیکن اس کیس کے حل ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ تام ابھی تک یہ معلوم کرنے میں ناکام رہا تھا کہ کوائل ونڈسر ہوٹل میں کس عورت سے ملنے کے لیے جاتا تھا۔ ڈیوڈ نے مسلسل کوائل کی بیوہ پر نظر رکھی ہوئی تھی لیکن وہ اس دوران کسی عورت سے ملنے نہیں گئی۔ میں بھی اپنے طور پر ان چاروں مشتبہ افراد کے ریکارڈ کی چھان بین کرتا رہا لیکن کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوئی البتہ جولیس بڑی محنت اور تندہی سے گتھی کو سلجھانے میں لگا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پہلے اسے کسی کیس پر اتنی محنت کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اس دوران میں وہ اپنے دوسرے مشاغل سے دور رہا اور اس نے ذہن پوری طرح اس جانب مرکوز کر رکھا تھا لیکن اس کے ہاتھ کوئی ”سرا“ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ہر کوشش کر کے دیکھی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ چھٹے روز دو بجے کے قریب اس نے آدھ گھنٹے کا وقفہ لیا اور ایک بار پھر کمپیوٹر کھول کر شراب کی مختلف اقسام تلاش کرنے لگا۔ میں نے اس سے پہلے جولیس کو کسی کیس سے دستبردار ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ یہ اشارہ تھا کہ اس نے پسپائی اختیار کر لی ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی اور میں بول پڑا۔ ”ذرا سی آزمائش آئی اور تم نے ہاتھ کھڑے کر دیے؟“

”ایسا ہی سمجھ لو۔“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

”مان لیا کہ تم ایک بے گناہ شخص کو آزاد نہیں کرا سکتے لیکن کیا اس ڈش کو بھی بھول جاؤ گے جو تمہیں بہت پسند ہے؟“

”مجھے یقین ہے کہ ایرل مورلے بہت اچھی طرح ڈش بنا سکے گی۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے کان سے ہیڈ فون ہٹایا اور بولا۔ ”بہتر ہوگا کہ تم کچھ دیر کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔“

اس کے بعد دو گھنٹے تک میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ جولیس نے ایرل کا نام لے کر مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں اپنا کام کرتا رہا اور جب نتیجہ سامنے آیا تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے اس سے رابطہ کیا اور بولا۔

”میں نے معلوم کر لیا ہے اور ابھی ابھی تمہیں ایک ای میل بھی بھیجی ہے جو اس کیس کو حل کر دے گی۔“

”میں اس وقت کوئی ای میل دیکھنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

”اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو اپنی ای میل چیک کر لو۔“

جولیس نے کمپیوٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اچانک ہی اس کے چہرے پر سختی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش رہا جیسے کسی گہری سوچ میں غرق ہو پھر وہ زیر لب بڑبڑانے لگا جیسے کہہ رہا ہو کہ اسے یہ خیال پہلے کیوں نہ آیا، ورنہ وہ چار دن پہلے ہی اصل قاتل تک پہنچ جاتا۔ پھر اس نے مجھے کچھ ہدایات دیں جن پر عمل کرنا بظاہر ناممکن نظر آ رہا تھا۔

پولیس سراغ رساں کریمر کو قائل کرنا میرے

اندازے سے زیادہ مشکل ثابت ہوا۔ اسے یقین کر لینا چاہیے تھا کہ اگر جولیس اصل قاتل کو بے نقاب کرنے کے لیے کہہ رہا ہے تو وہ ایسا کر گزرے گا لیکن اس کا خیال تھا کہ جولیس محض تماشا کرنا چاہ رہا ہے اور اس کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی زیرِ حراست ملزم کو لے کر اس تماشے میں شریک ہو۔ اس پر میں نے اپنا دھمکی آمیز انداز اختیار کیا اور کہا۔ ”جولیس کی خواہش ہے کہ اصل قاتل کی گرفتاری تمہارے ہاتھوں انجام پائے تاکہ لوگوں کی نظر میں پولیس کا وقار بڑھ جائے لیکن اگر تم ایسا نہیں چاہتے تو جولیس خود ہی میڈیا کے لوگوں کو بلا کر اصل قاتل کو بے نقاب کر دے گا۔ اس کے بعد تمہارے ساتھ جو سلوک ہوگا، وہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔“

”اگر ایسی بات ہے تو وہ مجھے اس قاتل کا نام کیوں نہیں بتا دیتا؟“ کریمر نے طنزاً کہا۔

”اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ تم کچھ بھی ثابت نہیں کر سکو گے۔ یہ صرف جولیس ہی جانتا ہے کہ دودھ اور پانی کو کس طرح الگ کیا جاتا ہے۔ بہرحال اگر تم اس کھیل کا حصہ نہیں بننا چاہتے تو تمہاری مرضی۔“

اس نے پہلے تو دل کھول کر جولیس کی شان میں گستاخی کی پھر اس کے کہنے پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اسی رات ٹھیک آٹھ بجے وہ ہنری اسکاٹ، کوائل کی بیوہ، اسٹیفنی، ایڈمنڈ گودمیر، جیسن ہیکل اور کچھ پولیس والوں کے ہمراہ جولیس کے دفتر پہنچ گیا۔ ایرل مورلے کو جولیس نے پہلے ہی کسی بہانے سے بلا لیا تھا۔ اس نے جب ان سب لوگوں کو دیکھا تو اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ خاص طور پر ہنری اسکاٹ کو دیکھ کر اسے بہت حیرانی ہوئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ پولیس ایک زیرِ حراست ملزم کو جولیس کے دفتر تک لا سکتی ہے۔ سب لوگ اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے جبکہ اسکاٹ کو جولیس کی میز کے دائیں جانب رکھے ہوئے صوفے پر بٹھایا گیا۔ اس کے ایک جانب پولیس سراغ رساں کریمر اور دوسری جانب کرخت چہرے والا پولیس سارجنٹ لیوس تھامسن بیٹھا ہوا تھا۔ اسکاٹ کے چہرے پر چھائی خفگی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس انتظام سے خوش نہیں ہے۔ شاید وہ ہتھکڑیوں کی وجہ سے بھی بے آرامی محسوس کر رہا تھا۔ ایرل مورلے جس کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی، اس کے عقب میں چار پولیس والے کھڑے ہوئے تھے لیکن ایرل نے ان کی موجودگی کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

جولیس نے تمام مہمانوں کی تواضع مشروب سے کی پھر سب لوگوں پر طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد اس نے کوائل کی بیوہ سے پوچھا کہ کیا عام طور پر اس کا شوہر روزانہ ڈھائی بجے کے قریب ریستوران میں موجود ہوتا تھا؟ کوائل کی بیوہ نے بتایا کہ عموماً ایسا نہیں ہوتا تھا کیونکہ ریستوران وقفے کے بعد رات کے کھانے کے لیے دوبارہ چھ بجے کھلا کرتا ہے۔ اس لیے وہ چار بجے سے پہلے وہاں نہیں جاتا تھا۔ یہ سن کر جولیس نے برا سا منہ بنایا جیسے اسے اس جواب کی پہلے سے توقع تھی۔ پھر اس نے حاضرین کو بتایا کہ وہ بھول بھلیوں میں پھنس کر ایک اہم نکتے کو فراموش کر بیٹھا ورنہ چار دن پہلے ہی یہ معما حل ہو چکا ہوتا۔

اس نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”معذرت خواہ ہوں کہ کچھ باتیں میرے ذہن سے نکل گئیں جن میں سب سے اہم یہ کہ مقتول خلافِ معمول ڈھائی بجے ریستوران میں کیوں گیا تھا۔ اس کے علاوہ میں قتل کے وقت کو بھی اہمیت دینے میں ناکام رہا۔“ پھر اس نے اسکاٹ کو براہِ راست مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میری نااہلی کی وجہ سے تمہیں جیل میں چار دن مزید گزارنا پڑے جس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ دراصل میرا شک ان چار مشتبہ افراد پر تھا جن کے پاس کوائل کو قتل کرنے کی کوئی نہ کوئی وجہ تھی اور ان کے چکر میں پڑ کر میں اصل قاتل کو نظر انداز کر بیٹھا اور اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس قتل میں اسکاٹ کے ارادے کو دخل نہیں تھا۔“

کریمر کو غصہ آ گیا اور وہ چلّاتے ہوئے بولا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟ تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ قاتل کا ارادہ کوائل کی کمر میں چاقو گھونپنے کا نہیں تھا اور یہ محض ایک حادثہ تھا؟“

”ہرگز نہیں، کوائل کی حیثیت شطرنج کے مہرے سے زیادہ نہیں تھی اور قاتل نے اسے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہلاک کیا تاکہ اسکاٹ کو تباہ کیا جا سکے۔“

اسکاٹ نے بے چینی سے پہلو بدلا اور جولیس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں جیسے پوچھ رہا ہو کہ کوائل کے علاوہ اور کون اس کی تباہی کے بارے میں سوچ سکتا ہے؟ جولیس اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ گیا اور بولا۔ ”جب میری توجہ ممکنہ قاتل پر مرکوز ہوئی تو ساری گرہیں کھلتی چلی گئیں اور اس کا چہرہ پوری طرح میرے سامنے آ گیا۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ اس نے اپنا کام بڑی ہوشیاری سے کیا اور کوئی ایسا نشان نہیں چھوڑا جس کے ذریعے اس تک پہنچا جا سکے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی نظریں ایرل مورلے کے چہرے پر گاڑ دیں۔ سب لوگوں نے چونک کر اسے دیکھا لیکن وہ اسی طرح لاتعلق بنی بیٹھی رہی۔ جولیس نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم اس حقیقت سے انکار کر سکتی ہو کہ اسکاٹ کے ریستوران سے کوئی ترکیب نہیں چرائی گئی تھی بلکہ تم نے مسٹر اسکاٹ کو یہ کہانی سنائی کیونکہ تمہیں معلوم ہو گیا تھا کہ اسکاٹ نے اپنی ترکیبوں کو تحریری شکل دے دی ہے۔ تم نے ہی کوائل کو بتایا کہ تمہاری رسائی اس کی مطلوبہ ترکیب تک ہے۔ اس کے دل میں لالچ آ گیا اور اس نے تمہیں بہلا پھسلا کر وہ ترکیب حاصل کر لی۔ میرا اندازہ ہے کہ تم نے ہی کوائل کی بنی ہوئی ڈش اسکاٹ تک پہنچانے کا بندوبست کیا تھا تاکہ وہ مشتعل ہو جائے۔“

ایرل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ بھرّائی ہوئی آواز میں اسکاٹ کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ”وہ ترکیب چوری ہوئی تھی، یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے کوائل کو کوئی ترکیب نہیں دی۔“

”بند کرو یہ ڈراما۔“ جولیس نے تیز آواز میں کہا۔ ”اس اداکاری سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔“ جولیس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ”ممکن ہے کہ تمہارا مقصد اسکاٹ کو اشتعال دلانا ہوتا کہ وہ غصے میں آ کر کوائل کو قتل کر دے یا ایسے حالات پیدا کر دیے جائیں کہ اسے ہی قاتل سمجھا جائے..... اور تم وقتی طور پر اپنے مقصد میں کامیاب رہیں۔ جب تم اپنے باس کے ساتھ میرے دفتر آئیں تو تمہارا خیال تھا کہ میں اس کیس کو لینے سے انکار کر دوں گا کیونکہ مجھ جیسے سراغ رساں کے لیے یہ ایک غیر اہم بات تھی۔ لیکن جب میں نے تمہاری توقع کے برعکس اسکاٹ کی مدد کرنے اور کوائل سے ملنے پر آمادگی ظاہر کی تو تم نے فوراً ہی اپنے منصوبے میں تبدیلی کر لی کیونکہ تم نہیں چاہتی تھیں کہ کوائل مجھ سے بات کرنے کے لیے زندہ رہے۔ یہ تمہاری خوش قسمتی تھی کہ اسکاٹ نے تمہیں ریستوران واپس جا کر شام کے کھانے کی تیاری کی ہدایت کی اور کہا کہ وہ مجھ سے کچھ ضروری باتیں کرنے کے بعد ریستوران پہنچ جائے گا۔ تم اس کا ارادہ بھانپ گئیں کہ وہ ایک بار پھر کوائل سے الجھنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ لہٰذا تم نے فون کر کے کوائل کو اس کے ریستوران پر بلایا اور اسے قتل کر کے اسکاٹ کی آمد کا انتظار کرنے لگیں اور جیسے ہی وہ وہاں پہنچا تو تم نے پولیس کو فون کر دیا۔“

ایرل مورلے مسکرائی اور طنزیہ انداز میں بولی۔ ”کہانی تو بہت اچھی گھڑی ہے لیکن مجھے شک ہے کہ تمہارے پاس اس کے حق میں کوئی واحد ثبوت بھی نہ ہوگا۔“

جولیس نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ تم اتنی ہوشیار اور ذہین نہیں جتنا کہ خود کو سمجھتی ہو۔ میرے پاس تمہارے جرم کے کافی ثبوت موجود ہیں۔ تم نے ونڈسر ہوٹل میں کوائل کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کو خفیہ رکھنے کی کوشش کی لیکن وہاں موجود ایک مہمان نے تمہیں کوائل کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔ میرے ایک معاون ٹام نے اس کا پتا لگایا اور اس وقت وہ یہاں موجود ہے۔“

عین اسی وقت ڈور بیل بجی۔ ایک پولیس والے نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور ٹام جس شخص کے ساتھ اندر داخل ہوا، وہ کوئی اور نہیں بلکہ ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر ڈیوڈ تھا جسے جولیس نے مسز کوائل کی نگرانی پر مامور کیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ٹام کو کوئی ایسا فرد نہیں ملا جس نے ایرل مورلے کو ونڈسر ہوٹل آتے ہوئے دیکھا ہو۔ اس لیے وہ جولیس کے کہنے پر ڈیوڈ کو فرضی گواہ بنا کر لے آیا۔ مورلے اسے نہیں پہچانتی تھی لہٰذا وہ جولیس کے جھانسے میں آ گئی۔ ڈیوڈ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایرل مورلے کو دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ مورلے کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور وہ تیز آواز میں بولی۔ ”گویا تمہیں معلوم ہو گیا کہ میرا کوائل کے ساتھ تعلق تھا؟ لیکن اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ میں نے اسے قتل کیا ہے۔“

جولیس نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ”تمہیں کوائل کے ریستوران کے باہر اسکاٹ کا انتظار کرتے ہوئے دیکھا گیا تاکہ اس کے آنے پر تم پولیس کو گمنام فون کر سکو۔“

”یہ جھوٹ ہے۔ میں اسکاٹ کی ہدایت کے مطابق سیدھی اپنے ریستوران گئی تھی۔“

جولیس نے کریمر کو اشارہ کیا جو اپنے ساتھ ایم پی تھری پلیئر لے کر آیا تھا۔ جولیس نے اس کا پلگ اپنی میز پر رکھے ہوئے اسپیکر سے جوڑ کر پلیئر آن کر دیا۔ چند لمحوں بعد ہی ہال میں بیٹھے ہوئے سب لوگ وہ گمنام فون کال سن رہے تھے اور اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا کہ فون کرنے والی ایرل مورلے ہی تھی۔

جولیس نے پلیئر آف کیا اور بولا۔ ”اب کیا کہتی ہو؟“

ایرل مورلے کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ وہ ایک بے جان مورتی کی طرح ساکت ہو گئی۔ اسکاٹ سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ چلّاتے ہوئے بولا۔ ”یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے؟“

جولیس نے اسے رحم طلب نگاہوں سے دیکھا اور بولا۔ ”تم نے اپنی وصیت میں یہ ریستوران ایرل مورلے

کے نام کردیا تھا؟"

اسکاٹ نے اثبات میں سر ہلایا تو جولیس بولا۔ "یہ ریستوران جس علاقے میں واقع ہے، وہاں جائداد کی قیمت بیس لاکھ ڈالرز سے کم نہیں ہے۔ اگر تم پر جرم ثابت ہو جائے اور تمہیں عمر قید کی سزا سنا دی جائے، تب بھی وصیت کے مطابق یہ جائداد مس مورلے کو چلی جائے گی۔"

اسکاٹ نے ایرل مورلے کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔ "میں نے ہمیشہ تمہارے ساتھ اپنی بیٹی جیسا سلوک کیا۔"

یہ سنتے ہی وہ پھٹ پڑی اور بولی۔ "کیا میں نے تم سے اس کے لیے کہا تھا؟ میرے لیے ایک بوڑھا بے وقوف باپ ہی کافی ہے پھر میں کسی دوسرے کی خواہش کیوں کرتی؟"

دو پولیس والے ایرل کے مزید قریب ہو گئے کیونکہ اب اس میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہا تھا کہ ایرل نے ہی کوائل کو قتل کیا تھا۔ اس سے پہلے کہ اسے ہتھکڑی لگائی جاتی، جولیس نے مناسب سمجھا کہ اس سے قتل کی وجہ بھی معلوم کر لی جائے۔ اس نے ایرل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "بہتر ہوگا کہ تم قتل کی وجہ بھی بتا دو تاکہ تمہیں غیر ضروری تفتیش کے عمل سے نہ گزرنا پڑے۔"

اپنی ٹیلی فون کال کی ریکارڈنگ سننے کے بعد ایرل کی ساری تیزی ختم ہو چکی تھی۔ اس نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔ "ایوارڈ کی تقریب کے موقع پر اس سے میرے مراسم ہو گئے تھے۔ رفتہ رفتہ ہماری ملاقاتیں بڑھنے لگیں اور میں اس سے ملنے کے لیے ونڈسر ہوٹل جانے لگی۔ اس نے مجھ سے شادی کا وعدہ کر لیا اور کہا کہ اگر میں اسے اسکاٹ کی بیش قیمت اور مشہور ترکیب چرا کر لا دوں تو یہ بہت بڑا احسان ہو گا۔ میں اس کے جھانسے میں آ گئی اور میں نے وہ ترکیب اسے فراہم کر دی۔ مطلب نکل جانے کے بعد وہ اپنے وعدے سے مکر گیا اور کہنے لگا کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کر سکتا کیونکہ ایسی صورت میں اسے ریستوران سے ہاتھ دھونا پڑ جائیں گے جو اس کی بیوی کے نام پر ہے۔ یہ سن کر مجھے شدید غصہ آیا اور میں نے اسے اس وعدہ خلافی کی سزا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ میرا منصوبہ تھا کہ مسٹر اسکاٹ کو مشتعل کر کے انہیں اس کے مقابلے پر لے آؤں اور میں اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب رہی۔ مسٹر اسکاٹ کو جب ڈش ملی تو وہ طیش میں آ گئے اور انہوں نے غصے کے عالم میں اس پر حملہ کر دیا۔ پھر انہوں نے تمہاری خدمات حاصل کیں تاکہ تم کوائل کو اتوار کے مینیو میں وہ ڈش شامل کرنے سے باز رکھ سکو۔ جب مسٹر اسکاٹ نے مجھے ریستوران جا کر شام کے کھانے کی تیاری کرنے کے لیے کہا تو میں سمجھ گئی کہ وہ ایک بار پھر کوائل کے ریستوران جائیں گے۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے اپنے منصوبے کے آخری حصے پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا اور ٹیلی فون کر کے کوائل کو اس کے ریستوران میں بلا لیا پھر اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر عقبی گلی میں چھپ کر کھڑی ہو گئی اور جیسے ہی مسٹر اسکاٹ وہاں پہنچے، میں نے پولیس کو فون کر دیا۔"

ایرل کے اس اعتراف کے بعد سارا معاملہ آئینے کی طرح صاف ہو گیا۔ پولیس سراغ رساں کریمر کے اشارے پر پولیس والوں نے ایرل کو ہتھکڑی لگا دی۔ کریمر اپنی جگہ سے اٹھا اور ہنری اسکاٹ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تمہیں زحمت اٹھانا پڑی۔ کل صبح عدالت سے احکامات حاصل کرنے کے بعد تمہیں باعزت طور پر بری کر دیا جائے گا۔"

ان لوگوں کے جانے کے بعد میں نے جولیس سے کہا۔ "اگر میں وہ ای میل نہ بھیجتا تو تم کبھی بھی ایرل مورلے تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس کیس کو حل کرنے کا کریڈٹ مجھے جاتا ہے۔ اس لیے تمہیں جو فیس ملے گی، اس میں آدھا حصہ میرا ہوگا۔"

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔ میں نے کوئی ای میل نہیں دیکھی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"پھر تمہارے ذہن میں ایرل مورلے کا نام کیسے آیا؟"

"مسلسل محنت اور کوشش کے باوجود اس کیس کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا اور میں تقریباً نا امید ہو گیا تھا۔ تب تم نے مجھے یہ کہہ کر اکسایا کہ اگر ایک بے گناہ شخص کو سزا سے نہیں بچا سکتا تو کیا اس ڈش کو بھی بھول جاؤں گا جو مجھے بہت پسند ہے اور میں نے جواب میں کہا تھا کہ ایرل مورلے بہت اچھی طرح یہ ڈش بنا سکے گی اور اسی وقت یہ نام میرے ذہن میں چمک کر رہ گیا۔ مجھے اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی کہ چند مشتبہ افراد کے چکر میں پڑ کر میں نے ایرل مورلے کو کیوں نظر انداز کر دیا۔ پھر جب میں نے اس پہلو سے سوچنا شروع کیا تو کئی حقائق سامنے آئے اور یوں ایرل مورلے کو انصاف کے کٹہرے تک لانا آسان ہو گیا۔ اس چکر میں پڑ کر تمہاری ای میل دیکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ میری ساری محنت اس کی ذہانت کے مقابلے میں صفر ہو کر رہ گئی۔ وہ واقعی جینئس ہے۔

ترکیب

امجد رئیس

وہ جاسوس نہیں تھا... مگر حالات و واقعات نے ایسی کروٹ لی کہ اسے وہ کچھ کرنا پڑا... جسے کرنے کا وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا... دشمنوں کے کیمپ میں ایک سیدھے سادے شخص کی کارروائیاں...

جاسوسیت اور تجسس سے بھرپور ایک اعصاب شکن کہانی کے آہنگ...

"پاپا! جنگ کے دوران میں آپ کیا کام کرتے تھے؟" تھامسن نے آج پھر اپنا پرانا سوال دُہرایا۔

رینی ڈائس نے کھانے کی میز پر کرسی پیچھے کی اور دانتوں میں خلال کرنے لگا۔

"پاپا! آج آپ کو بتانا پڑے گا۔" تھامسن مصر تھا۔

رینی، نوعمر بیٹے کی جانب دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

"بھئی کچھ چھوٹا موٹا کر ہی لیتا تھا۔"

"آپ لڑے تھے فوج کے ساتھ؟"

''نہیں، اس سے پہلے کہ مجھے آرمی جوائن کرنے کا موقع ملتا، جرمن قبضہ کر چکے تھے۔''

''اس وقت آپ کہاں تھے؟''

''یہیں، کین (فرانس) میں۔''

''پھر آپ کو جنگ کے بعد تمغہ کس بات پر ملا؟''

''بیٹا، پاپا ''انڈر گراؤنڈ'' کے ساتھ تھے۔'' اوڈیٹا ڈائس نے مداخلت کی۔

''نہیں میں ''انڈر گراؤنڈ'' کے ساتھ نہیں تھا۔'' رینی نے تردید کی۔

''آپ بتاتے کیوں نہیں آخر؟'' تھامسن نے منہ پھلالیا۔

''تمہارے پاپا جاسوس تھے۔ اگر پکڑے جاتے تو کان کے پیچھے گولی کھانی پڑتی۔'' ماں نے بتایا۔

رینی نے اپنی بیوی اوڈیٹا کی طرف دیکھا۔ ادھر تھامسن کے کان کھڑے ہوگئے۔ ''واقعی، پاپا؟'' وہ ہیجان کا شکار ہوگیا۔

''میں جو کرسکتا تھا، میں نے کیا۔'' رینی بالآخر آمادہ نظر آنے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھ میز پر پھیلا دیے۔

''تو پھر بتایئے۔''

''کوئی خاص کہانی نہیں ہے میرے پاس۔'' رینی نے لطف محسوس کیا۔

''بس کرو ڈیئر۔'' اوڈیٹا نے پھر دخل اندازی کی۔ ''تم ہر بار اسے ٹال دیتے ہو۔ تم نے جو خفیہ منصوبہ چرایا تھا، اس کی کہانی سنا دو۔''

''اچھا بھئی، لگتا ہے آج کچھ نہ کچھ سنانا ہی پڑے گا۔'' رینی نے وائن کا گلاس لبریز کیا...

''تم جانتے ہو کہ میں ڈیکوریشن کا کام کرتا تھا۔ مجھے جب موقع ملتا، میں جرمنوں کو اپنی خدمات پیش کر دیتا۔ اس امید پر کہ کام کے دوران میں مجھے کسی خاص بات کی بھنک مل جائے... یا مجھے ان کے ہیڈ کوارٹر اور کیمپ میں گھسنے کا موقع مل جائے تو میں ''انڈر گراؤنڈ'' تنظیم کو کوئی مفید اطلاع پہنچا دوں... میرے چند دوست کیفے ڈی ٹورسٹ میں مجھ سے ملتے رہتے تھے اور ان کا رابطہ انڈر گراؤنڈ سے رہتا تھا۔''

''خفیہ منصوبے والی کہانی کیا تھی؟''

''وہیں آرہا ہوں۔'' رینی نے بات آگے بڑھائی۔ ''یہ کہانی اس وقت شروع ہوئی جب اخبار میں ایک اشتہار میری نظر سے گزرا جس کے مطابق جرمنوں کو اپنے کمانڈ آفس میں کوئی کام کرانا تھا۔ کام کی نوعیت میرے پیشے سے مطابقت رکھتی تھی۔ میں وقت ضائع کیے بغیر آفس انچارج سے ملنے جرمن کیمپ چلا گیا۔

''تمہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ ملاقات اتنی آسان نہ تھی۔ وہاں سیکیورٹی سخت تھی۔ جرمنوں کی فرنچ اور میری جرمن زبان ٹوٹی پھوٹی تھی۔ لہٰذا دونوں کو ایک دوسرے کی بات کو سمجھانے میں دشواری کا سامنا تھا۔ بدقسمتی سے عجلت میں، میں اشتہار کا تراشہ ساتھ لے جانا بھول گیا تھا۔ مجھے کچھ اور نہ سوجھا تو ایک طرف دیوار پر ہاتھ سے رنگ کرنے کی اداکاری کی... بس غضب ہوگیا۔ وہ میری ایک خطرناک غلطی تھی۔''

تھامسن ہنس رہا تھا لیکن باپ کے آخری فقرے سے چونک اٹھا۔ ''میں سمجھا نہیں؟'' اس نے سوال کیا۔

''مسلح سپاہیوں نے مجھے دبوچ لیا۔ کسی نے میرے منہ پر شدید ضرب لگائی اور میں زمین بوس ہوگیا۔''

''لیکن کیوں؟''

''بیٹا! وہ سمجھے کہ میں ان کے لیڈر ایڈولف ہٹلر کا مذاق اڑا رہا ہوں... کیونکہ ہٹلر اپنی ابتدائی عملی زندگی میں آرٹ سے دلچسپی رکھتا تھا اور اس نے غالباً دو مرتبہ آرٹ اکیڈمی میں داخلے کی ناکام کوشش کی تھی۔ کچھ عرصے اس نے واٹر کلر پینٹنگ بھی کی تھی۔ میری تو شامت ہی آگئی۔ وہ مجھے ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے ایک کیپٹن کے پاس لے گئے۔ اتفاق سے یہ وہی شخص تھا جس سے ملنے کے لیے میں کوشش کر رہا تھا۔ اسے فرنچ زبان میں خاصی دسترس حاصل تھی چنانچہ میری مشکل آسان ہوگئی۔ میں اپنی چوٹیں سہلاتے ہوئے اسے سمجھانے لگا کہ معاملہ کیا ہے۔ اس نے جواباً مجھے بتایا کہ آفس میں وال پیپر لگانے کی اچھی آفر پہلے ہی آچکی ہے جو کافی سستی ہے۔ میں نے مذکورہ آفر کے بارے میں استفسار کیا اور بتایا کہ میں یہی کام تین ہزار فرانک سستا کرسکتا ہوں۔ اگرچہ میں اسے جو پیشکش کر رہا تھا، اس میں مجھے مالی نقصان اٹھانا پڑتا لیکن میرا اصل مقصد کچھ اور تھا۔ اگر مجھے یہ کام مل جاتا تو مجھے جرمنوں کے اہم ترین مقام تک رسائی حاصل ہو جاتی۔''

''پاپا! آپ خوف زدہ نہیں تھے؟''

''ابتدا میں تو نہیں تھا کیونکہ میں بظاہر ایک بے ضرر پینٹر تھا جو اشتہار کے جواب میں وہاں آیا تھا۔ پھر میری ملاقات بھاری بھر کم گنجے میجر شریڈر سے کرائی گئی۔ میجر کے ایک رخسار پر زخم کا لمبا نشان تھا۔ بشرے سے وہ ایک درشت اور گرم مزاج افسر معلوم ہوتا تھا۔ میں مزید محتاط ہو گیا۔ بہرحال میں نے اپنی معصومیت کو برقرار رکھا اور کوئی ایسا اشارہ نہیں دیا جو گنجے میجر کو مشتعل کرنے کا باعث بنتا۔

معاملات طے ہوتے ہی میں نے فی الفور کام شروع کر دیا۔ ساتھ ہی میری آنکھیں اور کان موقع کی تلاش میں تھے۔

''اگلے ہی روز مجھے امید سے بڑھ کر ایک شاندار موقع ہاتھ آگیا۔ اس دن میں، میجر شریڈر کے لیے وال پیپرز کے نمونوں کی کئی کتب ساتھ لایا تھا۔ اس نے وہ کتابیں کھنگالنی شروع ہی کی تھیں کہ اسے ایک پارسل موصول ہوا۔''

''خفیہ خطوط۔'' تھامسن کی دلچسپی بڑھتی جارہی تھی۔

''نہیں، وہ نقشہ جات تھے۔ میجر ان کے مطالعے کے لیے کھڑکی کے قریب چلا گیا۔ میں اضطرابی کیفیت سے دوچار تھا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ وہ نقشے نارمنڈی کی ساحلی پٹی پر جرمن دفاع سے متعلق تھے۔ نقشے انگریزوں اور امریکیوں کی ضرورت کے عین مطابق تھے۔ انہیں نارمنڈی کی ساحلی پٹی پر اترنا تھا۔ میرے لیے ایک سنہری موقع پیدا ہوگیا تھا۔ میرے ذہن میں سوچ کا گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی۔ میجر نے ٹاپ سیکرٹ نقشے میز پر رکھے اور دروازے کی جانب گیا۔ میرا ذہن بار بار مجھے ترغیب دے رہا تھا کہ میں ان میں سے ایک نقشہ اٹھالوں۔ لیکن اس میں خطرہ بہت تھا۔ میں نقشہ ساتھ نہیں لے جاسکتا تھا۔ باہر نکلتے ہوئے تلاشی کے دوران پکڑا جاتا تو وہیں دفن کر دیا جاتا۔ میں سرسری انداز میں ٹہلتا ہوا دروازے کی جانب گیا۔ میجر دروازہ کھلا چھوڑ کر ملحقہ کمرے میں سیکریٹری کے ساتھ محو گفتگو تھا۔''

''یقیناً آپ ڈر گئے تھے؟''

''ڈر گیا تھا؟'' رینی نے جواب دیا۔ ''میں دہشت زدہ تھا۔ میجر اتنا بھولا نہیں تھا۔ نقشے بھی کھلے چھوڑ دیے تھے اور دروازہ بھی کھلا تھا۔ میرے ذہن میں سوال ابھرا کہ کیا وہ مجھے چیک کرنا چاہتا ہے؟ میری قمیص پسینے سے بھیگ کر پشت کے ساتھ چپک گئی تھی۔ حلق خشک ہوگیا تھا۔ بدن غیر محسوس انداز میں کانپ رہا تھا۔ میں شدید کشمکش کا شکار تھا۔

''میں تمام نقشے اٹھا نہیں سکتا تھا نہ انہیں لے کر صحیح سلامت نکل سکتا تھا۔ مجھے میجر پر بھی شک تھا کہ وہ مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ لے گا۔ یہ نہایت فیصلہ کن اور قیمتی گھڑیاں تھیں۔ میں اس بات سے بھی بخوبی آگاہ تھا کہ مجھے بار بار موقع نہیں ملے گا۔ میں اتنا تو دیکھ چکا تھا کہ اگرچہ نقشوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی تاہم پھر بھی میجر کو پوری طرح انہیں دیکھنے کا وقت نہیں ملا تھا۔ لہٰذا میں نے ایک داؤ کھیلنے کا فیصلہ کرلیا۔

''اگر وہ ایک ہی نقشے کی نقول تھیں تو میری بچت تھی لیکن اگر وہ مختلف نقشے تھے تو ایک نقشے کی غیر موجودگی فوراً

پکڑی جاتی۔ یہ جوا تھا... خطرناک جوا۔"

"پھر آپ نے کیا کیا؟" تھامسن کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔

"یہ بات طے تھی کہ میں نقشہ لے کر نکل نہیں سکتا تھا۔ دوسری بات اندھیرے میں تھی کہ میجر شریڈر نے میرے لیے جال بچھایا ہے یا یہ میری خوش قسمتی ہے؟ میں نے کمرے کا بھرپور جائزہ لیا اور ایک بار پھر میجر کو تاڑا۔ اسے میری جانب دیکھنے کے لیے صرف سر گھمانا پڑتا اور کہانی ختم ہو جاتی۔

"قصہ مختصر میں نے اوپر والا نقشہ اٹھالیا۔ کمرے کے جائزے کے دوران میں واحد مناسب مقام منتخب کر چکا تھا۔ آتش دان کے اوپر بھاری فریم کا شیشہ نصب تھا۔ میں نے پھرتی سے نقشہ آئینے کے عقب میں تنگ جھری میں گھسا دیا۔ اس کام میں فقط چند سیکنڈ لگے۔ تاہم چند سیکنڈ بھی مجھے پہاڑ جیسے محسوس ہوئے تھے۔ میری پیشانی عرق آلود ہو چکی تھی۔ میں واپس اپنی جگہ پر آگیا اور خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ میں نے میجر کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ منطقی طور پر اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں تو اپنا کام کر چکا تھا۔ اس نے دیکھا یا نہیں، یہ آنے والے وقت نے بتانا تھا۔" یہ کہہ کر رینی نے اپنی سانسیں ہموار کیں اور پھر گویا ہوا۔

"مجھے امید تھی کہ آئندہ چند روز میں، مناسب موقع ملنے پر نقشہ وہاں سے نکال لے جاؤں گا اور کام کی رفتار کو سست رکھوں گا۔

"میجر شریڈر تھوڑی دیر بعد ہی واپس آگیا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میں نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ تاہم میری نگاہ میجر پر تھی۔ اس نے نقشے ایک طرف کیے اور وال پیپرز کی کتب میں سے ایک نمونہ پسند کر کے مجھے اشارہ کیا۔ میں نے سکون کا گہرا سانس لیا اور اس کے پسندیدہ نمونے کا جائزہ لیا۔"

"میں پیر کو اس نمونے کا بندوبست کر کے آتا ہوں اور کام شروع کرتا ہوں۔" میں نے اسے بتایا۔

"جب تک میں دیواریں صاف اور تیار حالت میں کروا دوں گا۔" اس نے کہا تو میرا دل ایک بار پھر اچھل پڑا۔

"اوہ، میجر! آپ کو پریشانی کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے آدمی اپنے طریقے سے یہ کام بہ آسانی کر لیں گے۔"

"میجر نے رضامندی ظاہر کی اور میں نے رخصت کی اجازت طلب کی۔ میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور میں بمشکل کیمپ سے باہر آیا۔"

تھامسن پلکیں جھپکائے بغیر ساکت بیٹھا اس کی کہانی سن رہا تھا۔ رینی اس کی سنسنی کو محسوس کر رہا تھا۔

رینی نے بات آگے بڑھائی۔ "میں ایک بہ[ت] ... کام کی ابتدا کر چکا تھا اور کامیابی، ناکامی کا دارومدار اگلے دنوں پر تھا۔ میرے قدم کیفے ڈی ٹورسٹ کی جانب ... تھے۔ تاہم حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے اچانک رخ [بدل] لیا اور وہاں جانے کے لیے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ وہاں [پہنچ] کر سب سے پہلے میں نے برانڈی کا ایک گلاس لیا۔"

اوڈیتا، شوہر کے قریب میز پر بیٹھ گئی۔ "... تمہارے والد نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کیا کر کے آئے ہیں۔ اس رات میں سو نہیں سکی تھی۔ مجھے یہی خیال ستاتا رہا کہ گستاپو والے آئیں گے اور ہمیں باہر نکال کر شوٹ کر دیں گے۔"

"مجھے بھی کر سکتے تھے کیا؟" تھامسن نے بے چینی سے سوال کیا۔

"ہاں، اگرچہ تم اس وقت بہت چھوٹے تھے لیکن کین کے فرانسیسی باشندوں کو اس طرح ایک سبق دے دیا جاتا تھا۔ ان کا طریقۂ کار ایسا ہی ہوتا ہے۔"

تھامسن کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آئے۔ "پھر کیا ہوا؟" اس کا تجسس عروج پر تھا۔

"میں نے پیر کی صبح جا کر میجر شریڈر کے بارے میں پوچھا تو پتا چلا کہ اچانک شریڈر کا ٹرانسفر ہو گیا ہے اور وہاں انچارج اب کوئی کیلر نام کا فوجی ہے۔ یہاں نیا ہونے کی وجہ سے وہ بہت مصروف تھا چنانچہ ملاقات ممکن نہیں تھی۔ بات بدھ پر چلی گئی اور میری دو راتیں مزید خراب ہو گئیں۔"

اوڈیتا نے جملہ پھینکا۔ "جب بھی گستاپو کا کوئی آدمی ہمارے گھر کے سامنے سے گزرتا، میری حالت ابتر ہو جاتی۔"

"بدھ کے روز کیلر کے آفس میں جانا بڑا دل گردے کا کام تھا۔ ہو سکتا تھا اس نے نقشہ برآمد کر لیا ہو اور میرا انتظار کر رہا ہو۔ تاہم ایسا کچھ نہیں ہوا... میں نے اپنا سامان کھولنا شروع کیا اور مصروف ہو گیا۔ ایک سرسری نگاہ میں نے چمنی کے اوپر والے آئینے پر ڈالی۔ جیسے ہی مجھے تنہائی ملی، میں نے آئینے کا عقبی حصہ چیک کیا۔ نقشہ اپنی جگہ پر تھا۔ مجھے پھر اندیشوں نے گھیر لیا کہ کہیں یہ کیلر کا منصوبہ تو نہیں اور وہ مجھے نقشے کے ساتھ گھیرنا چاہتا ہو۔

"میں سارا دن مصروف رہا۔ رخصت ہوتے وقت لپٹا ہوا نقشہ میری جیکٹ کی اندرونی جیب میں تھا۔ میں نے کیلر کو شب بخیر کہا۔ جواباً اس نے سر کو خفیف سی جنبش دی اور میں نکل

گیا۔ گارڈ کے قریب سے گزرتے ہوئے میں "گڈ نائٹ" بولتا ہوا گزر گیا۔ بظاہر میں بہ آسانی نکل آیا تھا۔ تاہم مرکزی سڑک پر چلتے ہوئے مجھے ہر دم دھڑکا لگا رہا کہ اب کوئی آواز آئے گی... "ہالٹ!" تاہم ایسا کچھ نہیں ہوا اور میں راستہ بدل بدل کر کیفے ڈی ٹورسٹ میں اپنے دوستوں سے آن ملا۔ مجھے فتح مندی کا احساس ہو رہا تھا۔

"کیفے میں داخل ہوتے وقت میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا۔ میرے دوست ایک میز پر موجود تھے لیکن ان کے قریب کاؤنٹر پر ایک جرمن سپاہی بھی کھڑا تھا۔"

"آپ کو پکڑنے کے لیے؟"

"وہ ایسا کر سکتا تھا۔ اور کین لمحے میں، میں اسے بھی جاسوس سمجھا لیکن نہیں... وہ عمر رسیدہ البرٹ تھا۔ ڈیوٹی سے فارغ ہو کر اکثر وہ وہاں آجاتا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اس کا آرمی اوور کوٹ، دروازے کے قریب ہی چند دیگر ملبوسات کے ساتھ لکڑی کے ایک اسٹینڈ پر لٹک رہا تھا۔ میں اسٹینڈ کے پاس سے گزرتا ہوا اپنی مطلوبہ میز تک پہنچ گیا۔ وہاں میرے تینوں خاص دوست موجود تھے۔

"رسمی بات چیت کے بعد ہم چاروں گھل مل گئے۔ کچھ دیر بعد ہم مطلب کی بات پر آگئے۔ انہوں نے اشارتاً نقشے کے بارے میں پوچھا۔ میں نے بتا دیا کہ ساتھ لایا ہوں۔ میری آواز دھیمی تھی۔ اگرچہ ہم جانتے تھے کہ البرٹ کو فرانسیسی زبان نہیں آتی، تاہم اس کی نظر پڑ سکتی تھی کہ ہم کس چیز کا تبادلہ کر رہے ہیں۔ خطرہ تھا۔ اس میں اضافہ اس وقت ہوا جب ایک پولیس کار کیفے کے باہر آکر رکی۔ دو آدمی برساتیوں میں عقبی نشست پر تھے۔ یہ فرنچ پولیس نہیں تھی۔ بدنام زمانہ جرمن سیکرٹ اسٹیٹ پولیس، گستاپو تھی۔ وہ کسی بھی وقت اندر آکر ہماری تلاشی لے سکتے تھے۔ ان کو روکنے والا کوئی نہیں تھا۔"

"تو آپ وہاں سے نکل گئے؟" تھامسن نے جلدی سے کہا۔

"نہیں یہ تو اور خطرناک بات ہو جاتی۔"

"پھر آپ نے کیا کیا؟"

"میں دوستوں کے ساتھ تاش کھیلتا رہا۔ گستاپو کے آدمی کچھ دیر رک کر وہاں سے چلے گئے۔"

"وہ اندر نہیں آئے؟"

"نہیں۔"

"تو آپ نے نقشہ، دوستوں کو دے دیا؟"

"نہیں، تم بھول رہے ہو کہ البرٹ وہاں موجود تھا پھر البرٹ نے اپنا جام خالی کیا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ ساتھ ہی میں بھی فوراً حرکت میں آیا۔ جب وہ کوٹ اسٹینڈ تک پہنچا تو اس سے پہلے میں پہنچ گیا اور... اوور کوٹ پہننے میں اس کی مدد کی۔"

"ڈانکے شون۔" اس نے جرمن زبان میں شکریہ ادا کیا اور چلا گیا۔

میرے ایک ساتھی نے کہا۔ "کوئی قیمتی چیز ہے تو نکالو۔ آج پیرس کے لیے ایک ٹرین ہے... میں اس میں سفر کروں گا اور سفر کے دوران میں یہ چیز انڈر گراؤنڈ تک پہنچ جائے گی۔"

"اس سے زیادہ قیمتی چیز تم نے پہلے ترسیل نہیں کی ہو گی۔ میں نے نقشہ اس کے حوالے کر دیا۔ ایک ہفتے کے اندر نقشہ انگریزوں کے پاس تھا۔"

"خطرناک۔" تھامسن نے تبصرہ کیا۔ "اگر گستاپو کے آدمی اندر آجاتے...؟"

رینی نے مسکراتے ہوئے بیوی کی جانب دیکھا۔ "اگر وہ سب کی یا میری تلاشی لیتے، مجھے عریاں بھی کر دیتے تو ان کے ہاتھ کچھ نہ آتا... کچھ بھی نہیں۔"

"کیا مطلب؟" تھامسن کے چہرے پر الجھن نظر آئی۔ "کیا وہ آپ کے پاس موجود نہیں تھا یا کچھ جادو ٹاپ کا چکر تھا۔"

"نہیں۔" رینی نے جواب دیا۔

"آپ نے نقشہ میز کے نیچے چھپا دیا تھا؟" تھامسن نے اندازہ لگایا۔

"نہیں۔" رینی نے انکار کیا۔

"کیوں تنگ کر رہے ہو؟ بتا بھی دو۔" اوڈیتا نے کہا۔

"میں نے نقشہ کیفے کی واحد محفوظ ترین جگہ پر چھپایا تھا۔ گستاپو کی تمام فورس بھی اسے تلاش نہیں کر سکتی تھی۔" رینی نے کرسی سے پشت لگا کر ٹانگیں پھیلا دیں۔

"کہاں؟" تھامسن کا منہ کھلا رہ گیا۔

"جب میں کیفے میں داخل ہو رہا تھا تو میں نے نہ صرف البرٹ کو دیکھ لیا تھا بلکہ گستاپو کی کار بھی آتے دیکھ لی تھی۔ میں نے نقشہ اسی وقت کوٹ اسٹینڈ پر البرٹ کے اوور کوٹ میں ڈال دیا تھا۔ جب البرٹ جانے لگا تو میں نے خوشامدانہ انداز میں اسے کوٹ پہناتے ہوئے نقشہ دوبارہ نکال لیا۔" رینی فاتحانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔

تھامسن ہکا بکا سا اپنے باپ کو دیکھتا رہ گیا۔

جواری

احمد اقبال

قسط :3

زندگی کی بساط پر اندھا جوا کھیلنے والے کھلاڑی کی ہوش ربا داستان

شیکسپیئر کا کہا ہوا ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ زندگی ایک اسٹیج ہے جس پر ہم سب اداکار ہیں جو اپنا اپنا کھیل دکھا کے چلے جاتے ہیں... یہی اداکار زندگی کے آغاز سے انجام تک ایک جوا کھیلتا ہے... جس میں خطرات اور حادثات کی بازی پہلی سانس کے ساتھ لگتی ہے اور آخری سانس تک جاری رہتی ہے... تخلیق کے نقائص ہوں یا بیماریاں... وہ زندگی کے ہر نومولود کو شکست سے دوچار کرنا چاہتے ہیں مگر زندگی مقابلہ کرتی ہے اور یہ کھیل انسانی تدبیر اور نوشتۂ تقدیر کے ساتھ زندگی کے تمام اہم اور غیر اہم فیصلوں میں جاری رہتا ہے... خوشی... غم... نفع... نقصان... دوستی... دشمنی... محبت اور نفرت... سب ہار جیت کے وہ روپ ہیں جن سے ہر انسان ایک جواری بن کے سامنا کرنے پر مجبور ہوتا ہے... جواری... انسانی جذبوں کے ردعمل سے جنم لینے والی وہ کہانی ہے جو نگر نگر گلی گلی اور گھر گھر نئی بھی لگتی ہے اور پرانی بھی... آپ بیتی بھی اور جگ بیتی بھی... تجسس اور حیرانی کے سارے رنگ دکھلاتی جادو اثر تحریر...

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ایم اے پاس خاور سکھر جیل میں سزائے موت کا منتظر تھا۔ اس پر قتل کا جھوٹا الزام ایک گینگ لیڈر نادر شاہ کے ایما پر عائد کیا گیا تھا۔ وہیں ڈاکوؤں کے گروہ کا سردار گامارستم بھی پھانسی کا منتظر تھا... اس کے ساتھی جیل پر حملہ کرکے اسے چھڑا لے جاتے ہیں۔ گاما، خاور کو ساتھ لے جاتا ہے۔ خاور ایک پرانی غیر آباد حویلی میں پناہ لیتا ہے۔ خاور کو اس حویلی کے کھنڈر میں نورین ملی جو لباسِ عروسی میں تھی اور اپنے شوہر کو قتل کرکے آئی تھی۔ اس کی پرورش کرنے والے چچا نے نورین کی تمام جائداد اور دولت پر قبضہ کرلیا تھا اور زبردستی اس کو اپنے پاگل بیٹے سے بیاہ دیا تھا۔ پاگل چچازاد کی دست درازی سے بچنے کے لیے نورین نے اسے قتل کردیا اور کھڑکی کے راستے آسیب زدہ مشہور حویلی میں آگئی۔ کسی نے اسے دیکھا تو بدروح سمجھ کے بھاگ گیا... نورین یہاں سلمان خان نامی ایک شخص سے چھپ کر ملتی تھی۔ اسے پتا تھا کہ وعدے کے مطابق وہ یہاں موجود ہوگا لیکن وہ نہیں آیا تھا۔ نورین پریشان تھی کہ صبح پولیس اسے قتل کے الزام میں گرفتار کرلے گی۔ وہیں اس کی ملاقات خاور سے ہوئی۔ اس کھنڈر کی دوسری منزل پر خاور کو سلمان کی لاش نظر آئی۔ وہ اپنا وعدہ نبھانے پہنچا تھا لیکن قتل ہوگیا تھا۔ تلاشی پر خاور کو اس کی جیب سے دس لاکھ نقد ملے۔ خاور نے اپنے کپڑے اسے پہنائے اور خود اس کے کپڑے پہن کے رقم جیب میں ڈال لی۔ سلمان کے پاس ایک ریوالور بھی تھا جو خاور نے چھپا کے رکھ لیا۔ اس نے نورین سے یہ بات چھپائی، اپنا حلیہ بدلا اور نورین کو برقع میں چھپا کرلے گیا۔ وہ اکیلا نورین کے گھر گیا تو اسے علم ہوا کہ نورین پر شوہر کے قتل کا الزام ہے جبکہ نورین نے نکاح نہ ہونے کے باعث اسے تسلیم نہیں کیا تھا۔ خاور نے نورین سے جھوٹ بولا کہ سلمان جو پہلے سے بے روزگار تھا نوکری مل جانے پر دبئی چلا گیا تھا۔ باہر جانے میں خطرہ تھا کیونکہ فریدالدین (خاور) کے جیل سے فرار کی اطلاع کے بعد نادر شاہ نے اپنے کارندے اسے تلاش کرنے پر لگا دیے تھے جو کتوں کی طرح ہر جگہ اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ دوسرا خطرہ پولیس سے تھا جن کو خاور کے علاوہ نورین کی بھی تلاش تھی۔ خاور، نورین کو لے کر نکلا اور ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ تاہم وہاں غیر محفوظ ہونے اور نورین کی اچانک طبیعت خراب ہونے پر وہ ایک اسپتال میں آگئے۔ نورین کو ایڈمٹ کرلیا گیا۔ اچانک وہاں پولیس آگئی۔ خاور اس صورت حال پر پریشان ہوگیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ایک لمحے کے لیے تو میرے بھی حواس گم ہوگئے تھے۔ شامتِ اعمال نے اچانک یوں راستہ روکا تھا کہ جان بچاکے نکل جانے کے بارے میں سوچنا بھی ممکن نہ رہا تھا۔ مجھے اپنی اور اپنے ساتھ نورین کی ساری جدوجہد جو ہم نے سلامتی کے راستے پر ساتھ نبھانے کے لیے مل کے کی تھی، رائگاں جاتی محسوس ہونے لگی تھی مگر اپنی فطرت کا تقاضا تھا کہ ہارنے سے پہلے ہار نہ مانوں۔

یہ صرف چند لمحوں کی فرصت تھی جس میں عقل نے مجھے سارے بند دروازوں میں امید کا ایک روزن دکھا دیا۔ نورین بیڈ پر ساکت پڑی پلک جھپکائے بغیر اپنی خوف زدہ ہرنی جیسی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور اس کی خاموشی کا سوال خود میرے ذہن میں گونج رہا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ میرے پیچھے بہت بڑی کھڑکی تھی جس پر خوب صورت گلابی پھولوں والے سنہری جھلک دیتے ریشمی پردے پھیلے ہوئے تھے مگر میں جانتا تھا کہ ان کے پیچھے سے کوئی چور کسی مہمان کے کمرے میں داخل نہ ہوسکے گا مگر اس کا ایک مقصد ہوٹل کی انتظامیہ کے اطمینان کے لیے بھی تھا کہ کوئی "معزز" مہمان بل کی پوری رقم ادا کیے بغیر کھڑکی کے راستے باہر نہ نکل جائے۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال واش روم کی تھی جہاں بہت بلندی پر ہوا کو باہر نکالنے والے ایک پنکھے کا روشن دان تھا مگر اس میں سے ہم صرف مکھی بن کے گزر سکتے تھے۔

عقل نے ایسے نامساعد حالات میں بھی میرا ساتھ دیا اور مجھے کوشش کی ایک اور راہ دکھائی جب میرے پاس مشکل سے دس سیکنڈ تھے۔ میں نے اعتماد کے ساتھ غرا کے کہا۔ "کیا کام ہے... اچھا ایک منٹ ٹھہرو۔" پھر میں نے ہاتھ کے خاموش اشارے سے نورین کو رضائی میں گم ہوجانے کے لیے کہا اور وہ سر تک لحاف کھینچ کے مردے کی طرح سیدھی لیٹ گئی۔ میں نے ریموٹ اٹھا کے ٹی وی چلایا اور اس کی آواز ایک دم بڑھا کے کم کی۔ معلوم نہیں وہ کون سا چینل تھا، وہ کسی ڈرامے کی ہیروئن تھی جو کسی ہیرو یا ولن پر چلا رہی تھی اور کچھ کہہ رہی تھی... آواز کو کم کرکے میں خود نورین پر چلانے لگا۔ "ارے بابا میرے کو کیا پتا پولیس کیوں آئی ہے۔ ابھی تو میں نے قتل بھی نہیں کیا تم کو۔" اور پھر دروازے کی طرف بڑھا۔ "ان کا بھی دماغ خراب ہے۔ شریف آدمی کہیں سکون سے نہیں رہ سکتا۔" پھر میں نے دروازہ کھول دیا۔

دس پندرہ سیکنڈ کی تاخیر کے اس وقفے میں کوئی شک

پیدا کرنے والی بات نہیں تھی۔ ظاہر ہے ہوٹل یا گھر میں کوئی بھی دروازے سے لگا کھڑا نہیں ہوتا کہ دستک کی آواز کے ساتھ ہی کنڈی کھول دے۔ قانون کے رکھوالوں کی آنکھ نے تصور میں ایک ہی منظر دیکھا ہوگا۔ ایک ساتھ سوئے ہوئے میاں بیوی یا مرد عورت کو اچانک دستک پر ہڑبڑا کے اٹھنے... سنبھلنے اور دروازے تک آکے کنڈی کھولنے سے پہلے قابلِ اعتراض نظر نہ آنے میں کچھ وقت تو لگتا ہے۔

دروازہ کھول کے میں کیا کروں گا یا کہوں گا، اس کا خود مجھے اندازہ نہ تھا۔ اس سے آگے عقل میری راہنمائی کے لیے موجود ہی نہ تھی۔ اب تکیہ تھا تو ایک اللہ پر کہ وہی چاہے گا تو آتشِ نمرود کو بھی گلستاں بنادے گا۔ نیم جارحانہ، نیم مہذب رویے کے ساتھ میں نے نیم خوابیدہ نظروں سے پولیس کی وردی میں کھڑے ہوئے انسپکٹر کو دیکھا۔ "کیا مسئلہ ہے تھانیدار صاحب۔"

انسپکٹر نے میرے لباسِ شب خوابی کو اور پھر مجھے غور سے دیکھا۔ "یہ چیخ کس عورت کی تھی؟"

چیخ میں اب خوشی سے ہی مار سکتا تھا کہ اس قانون کے رکھوالے کی آنکھ نے مجھے پہچانا نہیں تھا مگر میں نے حواس اور اپنی متانت کو برقرار رکھتے ہوئے پلٹ کے دیکھا۔ "چیخ...؟"

"ہاں... یہاں سے گزرتے ہوئے میں نے کسی عورت کی چیخ سنی تھی۔"

میں نے اسے یوں دیکھا جیسے وہ تھانیدار نہیں کوئی نشے میں دھت شرابی ہے۔ "کیا میں بیوی کو جگا کے پوچھوں؟ دوسری عورت تو کوئی ہے نہیں یہاں۔" پھر میں نے ٹی وی کی طرف دیکھا اور ہنس پڑا۔ "سمجھ گیا میں... ٹی وی پر ڈراما چل رہا ہے سائیں... میں بند کرنا بھول گیا تھا۔ آپ کیا سمجھے، ادھر کوئی قتل ہوگیا ہے جو ادھر لاش کی طرح منہ چھپا کے پڑی ہے... اپنی گھر والی ہے... پردہ کررہی ہے۔"

تھانیدار نے سر ہلایا۔ "معاف کرنا چانڈیو صاحب۔"

میں نے اصرار کیا۔ "آپ بے شک اپنی تسلی کرلو... بھیس... ذرا چہرہ تو کراؤ اپنا..."

تھانیدار اس وقت تک پلٹ گیا تھا مگر خوف دور ہوجانے کے بعد میں دروازے سے باہر نکل کر آگیا۔ "تھانیدار صاحب...! آپ کیا ادھر ہی پھرتے رہتے ہو اسپتال میں۔ ادھر تو مریض ہوتے ہیں، کوئی مجرم نہیں۔"

وہ مسکرایا۔ "آپ کو نہیں پتا چانڈیو صاحب... آپ نے سنا ہوگا جیل توڑ کر کچھ ڈاکو اپنے ساتھیوں کو نکال لے گئے۔"

میں نے سر کھجا کے کہا۔ "یہ کب کی بات ہے...؟"

"پرسوں رات کی۔ ڈاکوؤں کے ساتھ دوسرے مجرم بھی نکل بھاگے۔ کچھ مارے گئے، کچھ کو ہم نے پکڑ لیا مگر بہت سے غائب ہیں۔ ان میں سے ایک کل رات ادھر ایک ہوٹل میں چھپا ہوا تھا۔ وہ مقابلے میں ہلاک ہوا۔ کچھ کے بارے میں پتا چلا ہے کہ زخمی ہوکے پرائیویٹ اسپتالوں میں پہنچے اور فرضی نام سے داخل ہیں۔ پیسا بھی ہے اور ان کے ساتھیوں کا ڈر بھی۔ ڈاکٹر علاج کررہے ہیں مجبوراً... پولیس کو بھی نہیں بتاسکتے۔"

میں نے بڑے معاملہ فہم انداز میں سر ہلایا اور واپس کمرے میں آکے دروازہ بند کردیا۔ بے اختیار میرے سینے سے ایک گہری سکون کی سانس خارج ہوئی۔ اللہ نے بڑا بچایا۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔ چند منٹ کے اس پُردہشت ڈرامے نے جیسے اندر سے مجھے بے جان اور کھوکھلا کردیا تھا۔ ہر لحظہ ایک خوف میرے وجود سے توانائی کو کھینچ رہا تھا کہ کہیں اچانک تھانیدار کی نظر میری صورت میں بھی اس فرید کے خدوخال کو تلاش نہ کرلے جو ڈاکوؤں کے ساتھ فرار ہوا تھا اور قتل کے جرم میں سزائے موت پانے والا مجرم تھا۔ میں نے میز پر رکھی بوتل سے منہ لگا کر تھوڑا سا پانی پیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

نورین نے رضائی میں سے تھوڑا سا منہ نکال کے مجھے دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اعصابی کشیدگی نے ہمارے درمیان خاموشی کی ایک خلیج حائل کردی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو اخلاقاً ہی میں نورین سے اپنی زیادتی پر شرمندگی کا اظہار کرکے اسے منا لیتا مگر اس کی طرف سے میرے دل میں غصے کا الاؤ ابھی سرد نہیں ہوا تھا۔ اس نے مسلسل مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ ایک جھوٹ کا سلسلہ دوسرے زیادہ بڑے جھوٹے سے جاملتا تھا اور میں خود اپنی نظر میں سخت احمق بن گیا تھا جو ہر جھوٹ پر یقین کرتے ہوئے اس سے ہمدردی کرتا رہا۔ اس کی مدد کے لیے خود کو خطرے میں ڈالتا رہا۔ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ میں اب مزید بے وقوف بننے کے لیے تیار نہیں تھا اور جھوٹ کے اس سلسلے کے ساتھ ہی نورین سے تعلق ختم کرنا چاہتا تھا۔ وہ جو چاہے کرے... میری طرف سے جہنم میں جائے۔

نورین نے آنکھوں میں آنسو بھر کے میری طرف دیکھا۔ "خاور... مجھے اور مارو... جتنا چاہو مار لو مگر میری بات کا یقین کرو... خدا کی قسم میں جھوٹ نہیں بول رہی

ہوں۔"

"قسمیں کھانے والے تو ویسے ہی جھوٹے سمجھے جاتے ہیں۔ مجھے بتاؤ آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے کہ تم ایک کے بعد دوسرا جھوٹ بولتی ہو اور پھر کہتی ہو کہ یہ سچ ہے۔" میں نے اٹھ کر کمرے میں ٹہلتے ہوئے غصے میں کہنا شروع کیا۔ "میں تو مان گیا تمہیں نورین... کیا دماغ پایا ہے تم نے۔ ایسی مہارت سے جھوٹ گھڑتی ہو... ایسی کہانیاں بناتی ہو کہ خامی کوئی نہیں... واقعات، ڈائیلاگ، سچویشن... ہر چیز مکمل۔"

وہ کہنیوں میں منہ چھپا کے اور گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگی۔

میرے دل پر کچھ اثر تو ہوا مگر میں نے دل کو پتھر کرلیا۔ "الٹا تم مجھے جھوٹا بنا رہی ہو۔ میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کے آیا ہوں تمہارے اس مقتول کی لاش۔ لوگوں سے بات کی میں نے۔ سب کی بات بھی سنی۔ وہ طبعی موت نہیں مرا تھا۔ اس کا پوسٹ مارٹم ہوا تھا۔ اب تک وہ قبر کی چھ فٹ گہرائی میں گاڑ دیا گیا ہوگا۔ ہمت ہے تو چلو میرے ساتھ۔ تمہیں بھی معلوم ہو جائے گا۔ پوچھ لینا کسی سے بھی۔ قبرستان جا کے قبر دیکھ لینا اس کی۔"

اب اس نے آنسو پونچھ لیے تھے اور کچھ سوچ رہی تھی۔ اچانک وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے بھی بوتل سے منہ لگا کے پانی پیا اور پھر بڑے بدلے ہوئے مضبوط لہجے میں بولی۔ "یہ تو کرنا پڑے گا خاور۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "کیا کرنا پڑے گا؟"

"وہی جو ابھی تم کہہ رہے تھے۔ راحت کو میں نے قتل نہیں کیا تھا۔ اگر اس کا قتل ہوا ہے تو بعد میں کسی نے کیا ہوگا۔ اپنا جرم کسی نے میرے سر ڈالا ہے۔"

میں اسے گھورتا رہا۔ "کس نے؟ آپ کا خیال یہ ہے کہ ابھی آپ واپس اپنے پرانے گھر اور محلے جا کے ہر دروازے پر دستک دیں گی، سب سے پوچھیں گی کہ یہ کس کی حرکت ہے اور مجرم فوراً آپ کے قدموں میں گر کے اعتراف کرلے گا کہ یہ جرم مجھ سے سرزد ہوا۔ اب میں جیل جانے کے لیے تیار ہوں۔ تم سے کوئی کچھ نہیں کہے گا، کوئی سوال نہیں کرے گا... تم پاگل تو نہیں ہو۔"

وہ پھر بیٹھ گئی۔ "خاور... پلیز میری مدد کرو... ورنہ میں واقعی پاگل ہو جاؤں گی... ایک طرف تم مجھ پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں ہو، دوسری طرف میں دنیا میں بالکل اکیلی رہ گئی ہوں۔ نہ کوئی میری بات سننے والا ہے نہ سمجھنے والا۔ دھوکا مجھے قسمت نے نہیں اس کمینے سلمان خان نے دیا ہے۔ کیا تھا اگر وہ جانے سے پہلے ایک بار مجھ سے مل لیتا اور اپنے ساتھ لے جاتا..." وہ پھر رونے لگی۔

میں نے کہا۔ "دیکھو، رونا کسی مسئلے کا حل نہیں ہے اور نہ سلمان خان کو گالیاں دینے سے کچھ ہوگا۔ اسے اچانک جانا پڑ گیا۔ وہ کیا کرتا..."

"کیا کرتا؟" وہ روتے روتے چلّائی۔ "بہت وقت ملا تھا ہمیں... یہ مجبوری تو آج آگئی جب میں نہ دین کی رہی نہ دنیا کی، نہ گھر رہا میرا نہ ٹھکانا۔ اس سے پہلے کیا تھا؟ کتنا عرصہ ہو گیا وہ مجھے مسلسل ٹال رہا تھا۔ کب سے آج کل کر رہا تھا۔ اور دیکھو، ایک حادثے کو بہانہ بنا کے بھاگ گیا۔ مجھے تمہارے حوالے کر گیا۔ میرے سامنے آجائے تو تھپڑ ماروں اس کے منہ پر... ایسا کرتے ہیں محبت کرنے والے؟ کیا جانتا تھا وہ تمہارے بارے میں؟ تم کیا کرو گے میرے ساتھ... کیسے آدمی ہو تم... مجھے کسی کے ہاتھ بیچ کر بھاگ تو نہیں جاؤ گے... سب ہوتا ہے دنیا میں..."

ہچکیوں سے روتے روتے اس کی حالت غیر ہوگئی۔ وہ ایک دم بیڈ پر پیچھے گری اور بے ہوش ہوگئی۔ میں گھبرا کے اٹھا۔ "نورین... نورین۔" میں نے اس کا شانہ ہلایا مگر اس کا جسم اکڑ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور وہ پلک جھپکائے بغیر چھت کو گھور رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں بند تھیں اور جبڑے مضبوطی سے ایک دوسرے پر جم گئے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے اٹھا کے بستر پر سیدھا لٹایا۔ اس کے مڑے ہوئے ہاتھ پیر سیدھے کرنے کی کوشش کی اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوا مگر اسے ہوش میں لانے کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ اسے پانی پلانا مشکل ہی نہیں خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ پانی اس کی سانس کی نالی میں اتر جاتا تو وہ مر بھی سکتی تھی۔

اس کا جسم بالکل ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ میں نے زور زور سے اپنے دونوں ہاتھوں کو رگڑ کے اس کے تلوے سہلائے، اس کی ہتھیلیوں کو رگڑا۔ چند منٹ بعد میری کوشش کامیاب ہونے لگی۔ اس کا اکڑا ہوا جسم ڈھیلا پڑ گیا اور اس نے پلکیں جھپکائیں۔ میں نے اس پر کمبل ڈال دیا اور روم سروس والوں سے گرم بلیک کافی منگوائی۔ میرے لیے خود اپنے اعصاب پر قابو رکھنا ایک آزمائش کا مرحلہ بن رہا تھا۔ یہ بھی ناممکن تھا کہ میں ڈاکٹر کو طلب کروں اور انہیں بتا دوں کہ نورین کے اس دورے کا سبب کیا تھا۔ انہیں میرے جھوٹ سچ سے غرض نہ تھی لیکن ان کی عقل و نظر، ان کا مشاہدہ اور تجربہ حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کے لیے کافی تھا۔ وہ پھر نورین کو سکون آور انجکشن لگاتے اور سلا دیتے۔ آج کا سارا دن میں الّو کے پٹھوں کی طرح کرسی پر بیٹھا اسے دیکھتا رہتا اور سوچتا رہتا کہ آخر اس عذاب سے میری رہائی کب اور کیسے ہوگی۔ ایمان مجھے کھینچے تو بلائے ہے مجھے کفر... عقل تو کہتی ہے کہ لعنت بھیج اس لڑکی پر... دنیا میں اس سے بھی بڑھ کر مصیبتیں موجود ہیں۔ اس کی قسمت میں جو ہوگا ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ تو کیوں جہنم میں جل رہا ہے۔ اپنی زندگی کی فکر کر... تو خود اپنے جہنم کے عذاب میں ہے۔

لیکن دوسری طرف ایک ناقابلِ فہم مجبوری تھی کہ میں عقل کی آواز کو بہت واضح طور پر سننے کے باوجود نظر انداز کرتا جا رہا تھا۔ میں وہ سب نہیں کر سکتا تھا جو کرنا چاہتا تھا، جو ٹھیک تھا اور میرے مفاد میں تھا۔ اب وقت آگیا تھا کہ میں اپنی بے بسی کا اعتراف کرلوں۔ مان لوں کہ میرے لیے نورین کو چھوڑ کے بھاگ جانا بالکل ناممکن ہو گیا ہے۔ اس کے حالات کی دکھ بھری بے چارگی نے... اس کی معصوم بے بسی نے... اس کی مجبوری اور اس کے آنسوؤں کی فریاد نے مجھ جیسے بے بس کر دیا تھا۔ میں کسی کو نظر نہ آنے والی غیر مرئی شعاعوں یا لہروں کے جال میں گرفتار ہو گیا تھا جس کا منبع میرا دل تھا۔

شاید اب وقت آگیا تھا کہ میں اعترافِ حقیقت کرلوں۔ اب یہ ممکن ہی نہیں رہا تھا کہ میں نورین کو چھوڑ کے جا سکوں۔ وہ میری زندگی میں شامل ہو چکی تھی لیکن ابھی تک خود اس حقیقت سے بے خبر تھی۔ وہ اپنے آنے والے وقت میں سلمان خان کو سب کچھ سمجھتی تھی۔ شریکِ زندگی سے مجازی خدا تک جبکہ وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ صرف اس کا تصور اور اس کا خیال تھا جو نورین کے لیے ایک وجود رکھتا تھا۔ آنے والے وقت میں اس کا ذہن کیسے اس حقیقت کو تسلیم کرے گا کہ وہ محض اس کے تصور میں زندہ تھا؟ ایک فریبِ خیال تھا جس سے وہ دل کو بہلاتی رہی ورنہ وہ کب کا پیوندِ خاک ہو چکا۔ وہ تو اس رات بھی نہیں تھا جس رات وہ اس کے ساتھ مستقبل کے خوابوں کو بغیر دیکھے نکلی تھی۔ وہ تو اس سے پہلے ہی ماضی کا حصہ بن چکا تھا۔ جسے وہ اپنا سمجھ رہی ہے، وہ دنیا کے لیے مقتول ہو چکا... مرحوم اور مدفون ہو چکا۔

دروازے پر دستک سن کے میں چونکا۔ یہ اسپتال کے کینٹے ٹیریا کا بیرا تھا جو میرے آرڈر پر بلیک کافی لے کر آیا تھا۔ میں نے دروازے کے باہر سے ہی ٹرے وصول کی اور پھر کنڈی لگالی۔ کپ میں کافی انڈیلتے ہوئے میں نے نورین کی طرف دیکھا۔ حواس بحال ہو جانے کے بعد وہ پلک جھپکائے بغیر میری طرف دیکھ رہی تھی اور آنسو اس کی آنکھوں کے دونوں کناروں سے بہہ کر تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام کے نرمی سے پوچھا۔ "کیسی ہے اب طبیعت...؟"

اس نے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ "زندہ ہوں۔ میری بدقسمتی..."

میں نے پیار سے اس کے بالوں کو سہلایا۔ "پلیز نورین۔ ایسی باتیں مت کرو۔ تمہیں زندہ رہنا ہے۔"

"کس کے لیے اور کیوں...؟" وہ آہستہ سے بولی۔ "کتنا اچھا ہو... اگر میں مر جاؤں... کیا فرق پڑے گا کسی کو۔"

"مجھے فرق پڑے گا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "ہاں... یہ سچ ہے۔"

"تمہاری زندگی آسان ہو جائے گی۔ جان چھوٹ جائے گی مجھ سے۔ تم ایک احسان کرو مجھ پر خاور... کہیں سے مجھے زہر لا دو اور میرے مرنے سے پہلے چلے جاؤ... کسی کو کچھ بتائے بغیر... اپنی زندگی میں لوٹ جاؤ۔ بھول جاؤ کہ تم نورین نام کی کسی لڑکی سے کبھی ملے بھی تھے۔ یہاں کسے ضرورت ہے میری؟ سلمان کو بھی نہیں..."

میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ "بس یا اور بھی بکواس فرمانی ہے آپ کو۔"

اس نے غیر ارادی طور پر اپنا سر میرے کندھے سے لگا دیا۔ "مجھ میں اب ہمت نہیں رہی جینے کی خاور... میں کیا کروں، کہاں جاؤں... نہ میں اس جانور کے ساتھ زندگی گزار سکتی تھی... نہ سلمان میرا سہارا بنا۔ واپسی کے راستے بھی بند ہیں اور آگے میرا ساتھ دینے والا کوئی نہیں۔ موت کے خیال میں بڑی عافیت نظر آتی ہے مجھے۔"

میں نے کافی کا کپ اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ "لو پہلے یہ پیو... بے شک یہ کڑوی ہوگی مگر تم تو ابھی میرے ہاتھ سے زہر کھانے کی بات کر رہی تھیں، اسے زہر سمجھ کے ہی پی لو۔ دراصل میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں اور تم ابھی پوری طرح ہوش میں نہیں ہو۔"

اس نے کپ مجھ سے لے لیا اور سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔ "میں ٹھیک ہوں... تم کہو۔"

میں بیڈ کے قریب کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا۔ "دیکھو... یہ اسپتال ہے، کوئی ہوٹل نہیں۔ ہمارا بے وجہ قیام شکوک پیدا کرے گا۔ پولیس پہلے ہی یہاں مجرموں کو تلاش کرتی پھر رہی

ہے۔ ابھی تمہاری ایک چیخ میرے اور تمہارے گلے کا پھندا بن جاتی۔ وہ تو خیریت گزری کہ اس پولیس افسر کی نظر چوک گئی۔ میرے نام نے اس کے ذہن کو شک سے دور رکھا۔ وہ مفرور مجرموں کو ہی تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ خدا جانے کیوں وہ میری صورت کو نہ پہچان سکا۔ میں اسے تائیدِ ایزدی کے سوا کیا کہوں... مگر ایسا بار بار تو نہیں ہوسکتا۔"

"تم... کیا چاہتے ہو..."

"صرف میرے چاہنے سے تو کچھ نہیں ہوگا نورین۔ اب مجھے تمہارے سامنے بھی اعتراف کرنا پڑے گا کہ میرے لیے تمہیں چھوڑ کے جانا میرے اختیار کی بات نہیں رہی۔ اسے تم کچھ بھی کہو... میری کمزوری یا بے وقوفی... میں بری طرح پھنس گیا ہوں۔ اس دلدل میں اترتا جارہا ہوں۔ معلوم نہیں کیوں... اس لیے اب ایک بات تو اچھی طرح سمجھ لو۔ نہ ہی تمہیں مرنے دوں گا اور نہ کہیں جانے دوں گا۔ میں نے ایک فلم دیکھی تھی۔ اس میں دو مجرم جن کے ہاتھ ایک ہی ہتھکڑی سے بندھے ہوئے تھے، پولیس کی تحویل سے فرار ہوجاتے ہیں مگر نہ ان کے پاس ہتھکڑی کھولنے والی چابی ہے، نہ وہ اسے توڑ سکتے ہیں یا کاٹ سکتے ہیں۔ نہ اپنی مرضی سے اپنی اپنی راہ پر جاسکتے ہیں۔ ایسے ہی خود کو اور مجھے سمجھ لو۔ ہم دونوں مجبوری کی ہتھکڑی سے بندھ گئے ہیں اور اس کی صرف ایک چابی ہے... وہ چابی نہ ملی تو کیا ہوگا نورین۔"

وہ چونکی۔ "چابی... میں سمجھی نہیں تم کس چابی کی بات کررہے ہو؟"

"صرف سلمان خان ہے جو یہ ہتھکڑی کھول سکتا ہے۔ اس کے سوا میں تمہیں کسی اور کے حوالے نہیں کروں گا، نہ کہیں جانے دوں گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کب آئے گا... اور اس وقت ہم کہاں ہوں گے۔"

"وہ ضرور آئے گا۔"

میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ "نورین... ایک لمحے کے لیے... ناممکن کو ممکن سمجھ کے سوچو... اگر وہ نہ آیا پھر...؟"

وہ برہمی سے بولی۔ "کیوں... کیا تم ایسا چاہتے ہو...؟ تمہاری نیت خراب ہورہی ہے؟"

"تمہیں دیکھ کر کس کی نیت خراب نہ ہوگی مگر میں بدنیت ہوتا تو... بہت کچھ ہوجاتا جو نہیں ہوا... میرے سوال کو اپنے ذہن میں ضرور رکھو نورین... قیامت نہ آج آرہی ہے نہ کل لیکن اس پر ایمان تو ہے ہمارا... ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ جو ہم نے نہیں سوچا... وہ ہو بھی نہیں سکتا۔

حادثات آخر کیا ہوتے ہیں... خیر... میں اس فلسفے پر مزید وقت ضائع نہیں کرسکتا۔ فیصلہ میں نے تمہیں سنا دیا۔ تمہیں میرے ساتھ رہنا ہے... جہاں میں لے جاؤں جانا ہے اور وہی کرنا ہے جو میں کہوں... جب تک سلمان آکے تمہیں لے نہ جائے... رائٹ؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور تھوڑا سا مسکرائی۔

"دوبارہ میں تمہارے منہ سے یہ مرنے مارنے کی بات سننا نہیں چاہتا۔ تم جینے کے لیے میرے ساتھ جدوجہد کروگی۔ میں ایک بار پھر کہوں گا... سلمان یا تو سلمان... تمہیں زندہ رہنا ہوگا اپنے لیے... جیسے اب تک رہی ہو... تمہارے پاس کیا نہیں ہے آخر... بقول فلمی شاعر... جینے والوں کے لیے لاکھ بہانے ہیں۔ آخر وہ بھی تو زندہ ہیں جو ہاتھوں پیروں سے معذور فٹ پاتھوں پر پڑے بھیک مانگ رہے ہیں۔ اب اٹھو... ہمیں یہاں سے جانا ہے۔"

"کہاں... میرا مطلب ہے... میں تیار ہوں۔" وہ ہنسی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری محنت رائگاں نہیں گئی۔ اس نے میرے دل کی بات کو سمجھ لیا تھا۔ یا شاید یہ بھی میری خوش فہمی تھی ورنہ میں اس کی مجبوری تھا، اس کا انتخاب نہیں تھا۔ اس کا سوال میرے دماغ میں گونج رہا تھا۔ کیا تم ایسا چاہتے ہو کہ سلمان واپس نہ آئے؟ کیا تمہاری نیت خراب ہورہی ہے؟ سلمان کے بارے میں میرے چاہنے نہ چاہنے سے کوئی فرق نہیں پڑسکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اب نہیں آسکتا۔ رہی نیت کی بات تو وہ ابھی تک سلامت تھی۔ میرے کنٹرول میں تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب نورین میری تحویل میں ہے اور اس کا میرا ساتھ اسی لمحے سے نوشتۂ تقدیر کا حصہ بن گیا تھا جب ہم ملے تھے... مگر اس کے باوجود بھی میں اس کی حفاظت کررہا تھا، کسی امانت کی طرح۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نورین سے علیحدگی کا تصور کرتے ہوئے ڈرنے لگا تھا۔ میں آنے والے کسی دن کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا جب وہ میرے ساتھ نہ ہو۔ اسے تو میرے ساتھ ہی رہنا تھا۔ یہ میں جانتا تھا اور مانتا تھا۔

جو سوال میرے ذہن کی ایک خلش بنا ہوا تھا، اس کا جواب مجھ پر رفتہ رفتہ واضح ہوا تھا اور میرے لاشعور کے کمپیوٹر میں پراسیس ہوکے آخری حل کی صورت اختیار کرگیا تھا۔ جیل سے میں ایک آسیب زدہ حویلی میں پہنچا تھا، وہاں سے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں... پھر اس اسپتال میں اور اب مجھے یہاں سے بھی جانا تھا۔ دو دن پہلے میں نے جو کچھ سوچا تھا، وہ جیسے غبار بن کے ہوا میں تحلیل ہوگیا تھا۔ اس وقت نہ

کہیں نورین تھی اور نہ اس کا تصور تھا۔ بہت عجلت اور ہنگامی صورت حال میں اپنے ساتھ نورین کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے میں نے جو قدم اٹھایا، اس نے میرے مسائل میں اضافہ ہی کیا۔

کچھ حقائق ہمارے ماحول اور نظام کا نتیجہ تھے مقصد یہ کہ سہارا بنے گا تو مرد... عورت ہمیشہ کمزور اور سہارے کی طلبگار ہوگی۔ یہاں جو کرنا تھا، مجھے کرنا تھا۔ نورین کو میرے لیے کچھ کرنے کا سوچنا ہی نہیں تھا۔ پھر یہ کہ میں نورین کے بغیر بھی محفوظ تھا مگر وہ کسی مرد کے بغیر ایک کھلا شکار تھی۔ یہ لازم تھا کہ میں پہلے خود کو بچاؤں تاکہ میں نورین کے محافظ کا کردار ادا کرسکوں۔ کچھ مسائل جذباتی تھے۔ مرد کے لیے رونا ممکن ہو تو باعثِ شرم بھی ہوجاتا ہے۔ عورت جب چاہے اپنے آنسوؤں سے مشکلات کھڑی کردے۔ اسی معاشرے کا مرد ہونے کے باعث میں یہ بھی مانتا تھا کہ عقل کا استعمال بھی صرف مرد پر لازم ہے۔ عورت نے خود اپنے آپ کو عقل کے معاملے میں کم تر سمجھ رکھا ہے۔ مرد اسے ناقص العقل کہے تو مجرم۔

اسپتال سے نکلتے ہوئے میرے ذہن میں کوئی الجھن نہیں تھی۔ نورین کے رویّے میں بھی مجھے پہلے سے زیادہ اعتماد کی طاقت کا احساس ہوا۔ میں نے باہر کھڑی پرائیویٹ ٹیکسی کاروں میں سے ایک کا انتخاب کیا اور اس سے دن بھر کی بات کی۔ میں نے منہ مانگا معاوضہ دینا قبول کیا تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ شاید میں اس کی توقع سے بڑھ کر بے وقوف ثابت ہوا تھا، ورنہ آدھے کی بات کرتا اور پونے پر مان جاتا۔ دوپہر گزر چکی تھی۔ کچھ وقت ہم نے باہر سے آنے والوں کی طرح گھومتے پھرتے گزارا۔ نورین نے مجھے وہ گیسٹ کی دکان بھی دکھائی جو کبھی اس کے والد کی ملکیت تھی۔ میں صرف خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے نورین کو اس کے چچا کے گھر کی طرف بھی لے گیا۔ وہ ادھر جاتے ہوئے ڈر رہی تھی لیکن میں نے اسے تسلی دی کہ اس شٹل کاک برقع میں بھلا اسے کون پہچان سکتا ہے۔ وہاں گلی میں دری چاندنی بچھا کے تھمبر کے بعد سوئم کے انتظامات کیے جارہے تھے۔ ڈرائیور کی موجودگی میں کوئی بات کرنا تو مشکل تھا مگر اپنے گھر کے سامنے منظر دیکھنے کے بعد نورین کے لیے شک کی گنجائش ہی نہ رہی تھی کہ اس نے اپنے چچازاد اور ہونے والے شوہر کو قتل نہیں کیا مگر وہ مرچکا ہے۔ میں نے واقعی اس کے گھر جاکے یہ معلومات حاصل کی تھیں کہ اسے قتل کردیا گیا ہے۔ نورین خود اپنے بیان سے لاکھ بے گناہ ثابت ہو، پولیس اسے ہی قاتل سمجھتی تھی۔ یہ سوال اپنا کوئی جواب نہیں رکھتا تھا کہ نورین کو قاتل بنانے کے لیے یہ قتل کس نے کیا تھا اور کیوں؟

برقع کے اندر نورین پر کپکپی طاری تھی مگر میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں رکھا اور اشاروں کی زبان میں سمجھاتا رہا کہ وہ اپنی ہمت برقرار رکھے۔ کرائے کی کار جب آسیب زدہ حویلی کی طرف سے گزر رہی تھی تو میری نظر نے ایک کانسٹیبل کو دیکھا جو بڑی کاہلی سے دروازے کے خلا میں رائفل کے سہارے کھڑا تھا۔ پھر دوسرا کہیں اندر سے برآمد ہوا۔ نورین کی نظر دوسری طرف تھی چنانچہ اس نے کچھ نہیں دیکھا لیکن میں سمجھ گیا کہ یہاں نہ وہ میری واپسی کے انتظار میں ہیں اور نہ نورین کے منتظر ہیں۔ سلمان کی لاش یقیناً اٹھا لی گئی تھی اور پولیس کا پہرا محض ضابطے کی کارروائی کے مطابق جائے واردات کی حفاظت کے لیے تھا۔ مجھے کار ڈرائیور کے سامنے ڈیش بورڈ پر کوئی شام کا اخبار نظر آرہا تھا لیکن نورین کے سامنے میں نے اس کو دیکھنے سے گریز کیا۔ میں تو اب پوری طرح سے یہ چاہتا تھا کہ نورین کو اخبار بھی نہ دیکھنے دوں۔ اگر میں بات کرتا تو شاید ڈرائیور خود مجھے شہر کی اہم خبروں پر اپ ڈیٹ کردیتا۔ فرار ہونے والے کتنے ڈاکو مارے گئے اور کتنے پکڑے گئے۔ قاتل دلہن کی نئی کہانی کیا ہے۔ آسیب زدہ حویلی سے کس کی لاش ملی ہے اور اس پُراسرار قتل پر پولیس کا موقف کیا ہے۔ سکھر ایک چھوٹا شہر تھا جہاں یہ واقعات بہت بڑے تھے اور مقامی اخباروں کی سرخی بنے ہوں گے۔ دوپہر دو بجے کے بعد میں نے گاڑی کو کھانے کے لیے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے روک لیا۔

اس ریسٹورنٹ میں بھی کیبن تھے۔ برقع اتارنے کے بعد میں نے نورین کا چہرہ دیکھا تو وہ دہشت کا شکار تھی۔ "تم نے ٹھیک کہا تھا۔ میرے گھر میں..."

میں نے اسے ٹوک دیا۔ "جو ہوا اس پر ہم بات نہیں کریں گے۔ پُرسکون ہوجاؤ۔ آرام سے کھانا کھاؤ۔"

"خاور! میری کھانے کی خواہش بالکل مرگئی ہے۔"

"میں نے کیا کہا تھا؟ تمہیں زندہ رہنا ہے... اس کے لیے کھانا ضروری ہے۔ اور صرف باتیں کرنے سے ہمارے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ آگے پیچھے کسی کیبن میں بیٹھے ہوئے لوگ ہماری باتیں سن لیں یا تمہاری آواز پہچان کے کوئی یہاں جھانکنے آجائے۔"

"میں آہستہ بول رہی ہوں۔ مجھے بتاؤ... کیا تم نے دل سے مجھے بے گناہ تسلیم کرلیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں... میرا خیال ہے کہ تم جیسی لڑکی

قتل نہیں کر سکتی... عام حالات میں۔“

”مگر اس کے قتل کا الزام تو مجھ پر عائد کر دیا گیا ہے۔ کیا تم نے یہ بات بھی سلمان خان کو بتا دی تھی؟“ وہ پریشانی سے بولی۔

”مجبوری تھی۔ نہ بتاتا تب بھی اسے معلوم ہو جاتا...“

”آخر کس نے ایسا کیا... مجھ سے تو خیر دشمنی تھی... مگر راحت کا قتل کون کر سکتا ہے؟“

”یہ تم خود سوچو۔“ میں نے کہا اور عین اسی وقت ویٹر نے کھانا لگانا شروع کیا۔ نورین کے پیچھے والے کیبن میں کوئی فیملی نہیں تھی۔ ایک مرد کے علاوہ دو عورتوں اور دو بچوں کی آواز صاف سنی جا سکتی تھی۔ انہوں نے اچانک دلہن کے ہاتھوں ہونے والے دولہا کے قتل اور دلہن کے فرار کی واردات پر بحث شروع کر دی۔ اصل واقعات میں بہت کچھ رنگ آمیزی تھی۔ کچھ پرانی روایات تھیں۔ کچھ اخباری رپورٹس اور کچھ زبانِ خلق کے ذریعے پھیلنے والی باتیں... ہم کھانا کھاتے ہوئے چپ چاپ سنتے رہے۔ پھر دوسری طرف والے کیبن میں جو فیملی آ کے بیٹھی، اس میں عورت ایک ہی تھی، مرد تین تھے۔ وہ جیل سے فرار ہونے والے ڈاکوؤں کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ ان سے مجھے معلوم ہوا کہ پولیس نے ہر جگہ ناکا بندی کر رکھی ہے۔ شہر سے باہر جانے کے تمام راستوں پر نظر رکھی جا رہی ہے۔ پولیس روہڑی سے گزرنے والی ہر ٹرین کو دیکھ رہی ہے اور ان کے پاس تمام مفرور مجرموں کی تصویریں ہیں۔ ان کی باتوں سے میرا خون خشک ہو رہا تھا کہ کہیں وہ آسیب زدہ حویلی سے ملنے والی سلمان خان کی لاش پر تبصرہ شروع نہ کر دیں مگر ایسا لگتا تھا کہ ابھی تک وہ خبر عام نہیں ہوئی تھی۔

جو میں نے سنا تھا، وہ سب نورین نے بھی سنا تھا۔ کھانے کے دوران وہ خاموش تھی اور اس کے حسین اور معصوم چہرے پر خوف و ملال کے ساتھ تفکرات کے گہرے سائے تھے۔ ہماری حادثاتی ملاقات کو اب اڑتیس گھنٹے سے بھی زیادہ ہو چکے تھے مگر ابھی تک ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہی تھے۔ نہ وہ میرے ماضی کے حوالے سے کچھ جانتی تھی اور نہ مجھے ان حالات کا پورا علم تھا جو اس نے سرسری طور پر بیان کیے تھے۔ میں نے اسے نہیں بتایا تھا کہ میں دراصل چودھری فریدالدین ہوں۔ شاید ایسے ہی اس نے بھی مجھے اپنا اصل نام نہ بتایا ہو۔ جیل سے فرار ہوتے وقت میرے سامنے ایک واضح لائحہ عمل تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ نورین سے ملنے کے بعد اس پر عمل درآمد ممکن نہیں رہا۔ نورین کے مستقبل کا انحصار سلمان خان پر تھا۔ وہ نور[ین کو] اپنے ساتھ لے جاتا تو وہ مستقبل کی تمام فکروں سے [آزاد] ہو جاتی اور ایک عام مشرقی عورت کی طرح اپنی زندگی [کے] سارے فیصلوں کا اختیار اپنے شوہر کو دے کر بے فکری [سے] اس کے گھر میں رہتی۔ اس کی خدمت کو اپنا شعار بنا[تی] اس کے بچوں کو پال کے ہنسی خوشی ان کی شادیاں کر[تی] پوتے نواسوں کے ساتھ بڑھاپے میں ایک بھرپور زندگی [گزار کے] اطمینان کے ساتھ مر جاتی۔

تقدیر نے بے خبری میں اس کی زندگی کی گاڑی دوسری پٹڑی پر ڈال دیا تھا لیکن وہ ابھی تک اس حقیقت [سے] بے خبر تھی۔ اسے بظاہر کوئی فکر نہ تھی کہ ایک غاصب چچا [وہ] سب حاصل کرے جو قانونی طور پر اس کا تھا۔ پہلے ا[سے] صرف سلمان خان کی فکر تھی اور اب یہ پریشانی لاحق تھی [کہ] اس پر اپنے کزن اور نامزد شوہر کے قتل کا الزام عائد کر دیا [گیا] ہے اور وہ اس پوزیشن میں بھی نہیں ہے کہ اپنی صفائی میں عدالت کے سامنے جا سکے اور اپنی بے گناہی ثابت کر سکے جس کا سہارا اس نے لیا تھا، وہ خود ایک سزا یافتہ مجرم تھا۔ حالات نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ اس کے ساتھ خود [بھی] روپوش ہو جائے اور جب تک سلمان خان اسے لینے آ جائے، وہ بھی مفرور رہے... سلمان خان کو شاید پہلے [ہی] نہیں آنا تھا اور نورین نے اس کے وعدوں پر بھروسا کر کے گھر چھوڑا تھا تو بہت بڑی غلطی کی تھی۔ اب تو وہ اتنی دور جا [چکا] تھا کہ نورین کے خیال کی بھی وہاں تک رسائی نہ تھی۔ ا[سے] کب تک میرے ساتھ رہنا تھا... یہ میں بھی نہیں جانتا تھا۔

کھانے کے دوران میں نے کہا۔ ”مس نورین... ایک فیصلہ کیا ہے میں نے۔“

اس نے سوالیہ نظریں اٹھائیں۔ ”مجھے نہیں بتاؤ گے۔“

”بتا تو رہا ہوں... دیکھو، اس شہر میں ہمارے دشمن تو ہر جگہ ہیں۔ ایسے ہم کب تک خود کو چھپائیں گے اور بچ کے کہاں جائیں گے؟ میرا خیال ہے کہ ہمیں یہ شہر فوراً چھوڑ دینا چاہیے ورنہ میرے ساتھ تم بھی پکڑی جاؤ گی کسی روز... تمہاری وجہ سے میں... ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔“

”مگر ہم جائیں گے کہاں؟ یہ سوچا ہے تم نے... مستقبل...“

”نورین! پہلا مرحلہ ہے زندہ رہنے کا۔ زندگی ہو گی تو مستقبل بھی ہو گا۔ اگر زندہ رہنے کی خواہش نہ ہوتی تو میں ہتھیلی پر رکھ کے جیل سے کیوں فرار ہوتا؟ کسی نئے اجنبی شہر میں روپوش رہنا آسان ہو گا جہاں نہ کوئی مجھے جانتا ہو اور نہ تمہیں۔“

”تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو آخر؟“

”ابھی تک میں نے کچھ طے نہیں کیا۔ میں خود بے یقینی کا شکار ہوں۔ تمہیں کیسے ضمانت دوں کہ میرے ساتھ تم محفوظ رہو گی۔“

اس کی صورت اتر گئی... ”مگر تمہیں چھوڑ کے میں کہاں جاؤں۔“

”دیکھو... سوچو نورین... اس شہر میں تمہاری ساری زندگی گزری ہے۔ یہاں تمہارے عزیز رشتے دار ہیں... تم یہاں اسکول کالج گئی ہو... تمہاری ایسی کوئی سہیلی ضرور ہو گی جو تمہاری مدد کر سکے۔ کہیں نہ کہیں تمہیں پناہ مل جائے گی۔“

وہ رونے پر آ گئی۔ ”ان حالات میں میرا ساتھ کون دے گا خاور... میرا ساتھ چھوڑنے کی مت سوچو۔“

میں نے کہا۔ ”تمہارا ایک چچا لندن میں ڈاکٹر ہے۔ اگر کسی طرح میں تمہیں اس کے پاس پہنچا دوں...“

”میں نے صرف اس کا نام سنا تھا... نہ اسے کبھی دیکھا اور نہ یہ معلوم ہے کہ وہ رہتا کہاں ہے... پہچاننا تو دور کی بات ہے، اسے تو یہ بھی معلوم نہیں ہو گا کہ نورین نام کی کوئی بھتیجی ہے۔“

میں نے سر کھجا کے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں... ایسا ہوتا ہے آج کل... بیٹے جو سمندر پار چلے گئے، ان کے لیے تو ماں باپ کا رشتہ بھی بے معنی ہو جاتا ہے۔ باپ کا نام کاغذات میں رہ جاتا ہے۔ ماں کی صورت بھولا بسرا خیال بن جاتی ہے۔ بہن بھائی یاد بھی نہیں رہتے۔“

وہ کچھ دیر بعد بولی۔ ”تمہارا تو گھر اور خاندان ہو گا؟“

”پہلے تھا... اب سوچتا ہوں کاش میرا دنیا میں کسی سے کوئی رشتہ نہ ہوتا۔ میں بالکل اکیلا ہوتا۔“ میں نے بے خیالی میں کہا۔ یہ نورین کی بات کے جواب سے زیادہ میرے اپنے خیالات تھے جو الفاظ بن گئے تھے۔ پھر میں نے دیکھا کہ میری باتوں سے نورین دکھی اور مایوس ہو رہی ہے۔ میں نے سنبھل کے اپنے لہجے میں یقین اور اعتماد کو شامل کیا۔ ”لیکن تم کیوں فکر کرتی ہو؟ مجھ پر بھروسا رکھو... اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”تم پر بھروسا نہ کروں تو اور کیا کروں... اوپر اللہ ہے اور نیچے تم سے ہر امید باندھ لی ہے۔“

میں نے اس کے ہاتھ پر پیار سے تھپکی دی۔ ”میں تمہارے ساتھ ہوں لڑکی۔“

”دل اب بھی ڈرتا ہے میرا... ایک اجنبی پر اتنا بھروسا... اگر یہ غلط ثابت ہوا... پھر...“

میں نے مسکرا کے کہا۔ ”پھر کیا کرو گی تم؟“

وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھتی رہی۔ ”جان سے مار دوں گی تمہیں... یا اپنے آپ کو۔“

میں نے کہا۔ ”بس بس... دھمکیاں مت دو... چلو، بہت دیر سے بیٹھے ہیں ہم... مگر باہر کچھ لوگ تھے جو ہمارے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ چلے گئے ہیں۔“ میں نے پردہ ہٹا کے جھانکا۔

ویٹر دوڑا ہوا آیا۔ ”اور کچھ چاہیے سر... چائے...“

”نہیں، بس پیسے بتاؤ۔“ میں نے پرس میں سے تین نوٹ نکالے۔

”دو سو ساٹھ سر!“

میں نے باقی رقم اسے ٹپ دے دی تو خوشی سے اس کا چہرہ دمکنے لگا۔ ہال اب خالی تھا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت گزر چکا تھا۔ کار ایک پیڑ کے سائے میں ہی کھڑی تھی اور سیٹ پر سوئے ہوئے ڈرائیور کے دو پیر کھڑکی سے نکلے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ میں اپنے ذہن میں اس شہر سے نکلنے کا پورا پلان بنا چکا تھا۔ کراچی یہاں سے قریب تھا اور مجھے بھی روہڑی کے جنکشن سے کوئی ٹرین ضرور مل جاتی لیکن میں ایسا کرتا تو یہ فرار کا سیدھا راستہ ہوتا۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا... میرے ساتھ جیل سے نکلنے والے بہت سے قیدی سوچے سمجھے بغیر روہڑی سے کراچی جانے کے لیے کسی ٹرین پر سوار ہوئے تو سفر کے آغاز سے پہلے ہی یا راستے میں گرفتار ہو گئے۔

میں نے ڈرائیور کو جگا کے رانی پور چلنے کے لیے کہا تو اس نے کچھ تامل کا اظہار کیا۔ ”گاڑی کو شہر کی حد سے باہر لے جائیں تو مالک ناراض ہوتے ہیں سر۔“

میں نے کہا۔ ”انہیں کچھ بتانا ضروری تو نہیں۔ یہ اپنا انعام رکھو۔“

پانچ سو کے نوٹ نے ڈرائیور کے جذبات کو خوشی میں بدل دیا۔ ”رائٹ سر... بس دعا کریں آج پولیس تنگ نہ کرے۔“ اس نے گاڑی کو سوئچ گھما کے اسٹارٹ کیا۔

”پولیس کیوں تنگ کرے گی... کاریں تو ہائی وے پر سے گزرتی ہی رہتی ہیں دونوں طرف۔“

"وہ دراصل آج ناکے بہت لگے ہوئے ہیں، جیل توڑ کے جو ڈاکو فرار ہوئے تھے ان کی وجہ سے... آپ نے بھی دیکھا ہوگا اخبار میں۔" اس نے ڈیش بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

میں نے اسے روک دیا۔ "اخبار میں سب دیکھا تھا میں نے۔"

"سنا ہے تین پکڑے گئے ناکے پر... دو برقع میں تھے... ایک نے داڑھی لگائی تھی۔ پولیس کو شک ہوا، کھینچی تو ہاتھ میں آگئی... ویسے تو جناب بندہ سامنے قتل کرے اور پولیس کی مدد سے نکل جائے مگر یہ معاملہ کچھ اور ہے۔ کراچی سے سندھ کے آئی جی صاحب پہنچ گئے ہیں۔ اسلام آباد سے وزیرِداخلہ نے یہاں آکے مصیبت ڈال دی ہے۔"

اگر میں اسے نہ ٹوکتا تو وہ بولتا رہتا۔ "پلیز خاموشی سے سامنے دیکھ کے گاڑی چلاؤ۔"

اس کی آواز بند ہوگئی۔ "سوری سر!"

پرانے سکھر شہر کے بعد نئی آبادی کی سڑکیں نسبتاً کشادہ تھیں اور یہاں ٹریفک کا شور تھا نہ بازار کا اژدحام۔ آگے ہائی وے پر پہنچنے کے بعد بھی رانی پور تک ایک ڈیڑھ گھنٹے کا راستہ ضرور تھا۔ جو کچھ میرے ذہن میں تھا، وہ نورین کو بھی معلوم نہ تھا۔ ابھی تو میں یہ سوچ رہا تھا کہ رانی پور پہنچ کے میں کہاں جاؤں گا۔ بروقت مجھے ایک ہوٹل کا نام یاد آگیا جس کا تذکرہ میں نے جیل میں گامارستم سے سنا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سمیت اسی ہوٹل سے گرفتار ہوا تھا۔ وہاں بیٹھ کے وہ مالِ غنیمت کی تقسیم کر رہے تھے کہ مخبری ہوگئی اور پولیس نے انہیں دھر لیا تھا۔

میں نے ڈرائیور کو اسی ہوٹل کا نام بتا دیا۔ "ہم تاجدار ہوٹل جائیں گے۔"

اس نے کچھ حیرت کا اظہار کیا۔ "تاجدار ہوٹل... وہ تو کوئی شریفانہ جگہ نہیں ہے سر... میرا مطلب ہے آپ کے ساتھ فیملی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اچھا... پھر تم کسی اچھے ہوٹل میں لے چلو۔"

وہ خوش ہوگیا۔ لیکن اس کے کچھ بولنے سے پہلے گاڑی کے سامنے ایک کانسٹیبل یوں آگیا کہ ڈرائیور بریک نہ لگاتا تو وہ گاڑی کی ٹکر سے گر جاتا۔ بریک کے ساتھ ٹائروں کے جام ہونے سے سماعت پر گراں گزرنے والی چیخ سی سنائی دی اور ڈرائیور غصے میں بھول گیا کہ پیچھے برقع میں ایک عورت بھی ہے۔ اس نے بے اختیار کانسٹیبل کو گالی دی اور دروازے کو دھڑ سے بند کر کے اترا۔ "کیا بات ... تھا تو کسی ٹرک کے سامنے آتے۔"

کانسٹیبل نے غرا کے کہا۔ "بھونک مت ... ناکا لگا ہوا ہے۔"

"گاڑی روکنے کا یہ کون سا طریقہ ہے... جاتی تو میں اندر ہو جاتا۔"

میں نے فوراً اتر کے معاملے کو مزید خراب ہونے سے بچا لیا۔ پولیس کے دو سینئر اہلکار سڑک سے ذرا ہٹ کے جھاڑی کی اوٹ میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے سڑک کے دوسری طرف ایک بڑی بڑی مونچھوں والا چھوٹا سا کانسٹیبل اپنے سائز کی رائفل اٹھائے مستعد ... کہ کوئی فرار ہونے کی کوشش کرے تو نا کام بنا دے۔ ... قسم کی ناکا بندی محض خانہ پُری کے لیے تھی۔ جس قسم کے خطرناک مفرور مجرموں کو پکڑنے کے لیے یہ ناکا لگایا گیا ... وہ اگر نکلنا چاہتے تو فائرنگ کرتے ہوئے یا ایک دستی بم پھینک کے ان سب کو واصلِ جہنم کرتے گزر جاتے۔

بادلِ ناخواستہ سب انسپکٹر نے اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "سرجی... آپ کا نام؟"

میں نے خفگی سے کہا۔ "مولا بخش چانڈیو... پہچانتے نہیں، کب سے ہو یہاں؟"

اب انسپکٹر اٹھ کے آگے آیا۔ "سائیں نیا بندہ ہے... خیر سے کدھر تشریف لے جارہے ہو؟"

"رانی پور۔" میں نے کہا۔ "اپنے ڈیرے جارہا ہوں اور کہاں... روز جاتا ہوں... گھر والی کیا کہے گی... عزت ہے میری... کیوں روکا ہے مجھے؟"

"معاف کرنا سائیں... آپ کو تو پتا ہوگا، جیل ... ڈاکو اپنے بندے نکال کر لے گئے ہیں۔ کچھ مارے گئے تو کچھ ہم نے پکڑ لیے ہیں۔ ناکا بندی ہے ہر جگہ... آئی جی صاحب کا آرڈر ہے۔"

ناگواری کے جذبات میری صورت سے عیاں تھے ... میں نے فراخ دلی سے اسے معاف کیا اور پلٹ کے گاڑی کی طرف آگیا جہاں ڈرائیور ہنوز خفا بیٹھا تھا۔ وہ کیسے اندازہ کرسکتا تھا کہ میرے دل کی حالت کیا تھی۔ پولیس کے پاس تمام مفرور قیدیوں کی تصاویر تھیں۔ اگر وہ ایک سرسری نظر بھی ڈالتے تو ایک تصویر سے مجھے شناخت کر لیتے لیکن ... سے عوامل نے مجھے محفوظ رکھا۔ ایک تو میری گاڑی شاندار تھی اور اسے ایک شوفر چلا رہا تھا۔ محض نمبر سے اندازہ نہیں ... جاسکتا تھا کہ کار کرائے کی ہے۔ پھر میرے تیور ... اس

وڈیرے سے کم جارحانہ نہیں تھے جس کو فیملی کے ساتھ جاتے ہوئے سڑک پر مشکوک سمجھ کے روک لیا جائے۔ انہوں نے بعد میں خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ میں ایک معاملہ فہم یا فراخ دل وڈیرا تھا جس نے اس گستاخی کو نظرانداز کر دیا ورنہ ان کی شامت آجاتی۔ مجھے بچانے میں برقع پوش "گھر والی" بھی معاون ثابت ہوئی جو ایک عزت دار گھرانے کی عورت کی طرح سرتاپا برقع میں روپوش تھی۔ یہ صرف ایک لمحے کا کھیل تھا۔ ناکا بندی والے واقعی فرض شناس ہوتے اور ایک نظر مفرور مجرموں کی تصویروں پر ڈال لیتے جو انہیں ادائیگیِ فرض کے لیے فراہم کی گئی تھیں تو میری ساری اداکاری دھری رہ جاتی مگر وہ علاقے کے وڈیروں کی نفسیات کو سمجھنے والے حکم کے غلام تھے جن کو اپنی نوکری اور زندگی دونوں (نعوذباللہ) خدا سے زیادہ وڈیرے کے ہاتھ میں نظر آتی تھیں۔

گاڑی پھر چلی تو ڈرائیور بڑبڑانے لگا۔ "حرام خور گدھ... پیسا بٹورنے کے لیے چھپ کے بیٹھے ہیں۔ میری گاڑی ذرا چھو جاتی اسے تو ہزار پانچ سو وصول کر لیتے اور مارتے الگ۔ آپ نے دیکھا وہ کیسے اچھل کے سامنے آیا تھا؟"

میں نے کہا۔ "چلو اب غصہ تھوک دو۔ کچھ بھی نہیں ہوا... ان کی فطرت سے کون واقف نہیں۔"

"کیا میں انتظار کروں؟" ڈرائیور نے گاڑی کو ہوٹل کے سامنے روک دیا۔

میں نے کہا۔ "نہیں، تم جاؤ... ابھی کچھ پتا نہیں ہم یہاں دو دن قیام کریں گے یا زیادہ۔"

وہ انعام کے بعد مزید ٹپ لے کر رخصت ہوا تو میں اسے دیکھتا رہا۔ جب اس کی گاڑی نظر سے اوجھل ہوگئی تو میں نے ہوٹل کے اندر جانے کے بجائے ایک گزرتے ہوئے رکشا کو روک لیا اور اسے ریلوے اسٹیشن چلنے کو کہا۔ نورین نے خاموشی سے سب دیکھا اور کوئی سوال نہیں کیا کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کیوں کر رہا ہوں۔ صرف دس منٹ میں رکشا نے ہمیں ریلوے اسٹیشن پر اتار دیا۔ اس چھوٹے سے اسٹیشن پر وہ گہما گہمی نہیں تھی جو لاہور کراچی جیسے بڑے شہروں کے اسٹیشن تو کیا روہڑی اور نواب شاہ میں بھی محسوس ہوتی ہے۔ ایک طرف چار چھ خستہ حال تانگے کھڑے تھے اور ان کے مالک بھی گھوڑوں کی طرح اونگھ رہے تھے۔ ایک درخت کے نیچے کچھ پرانی لال قمیصوں والے قلی ایک ہی سگریٹ سے باری باری کش لگا رہے تھے۔ ایک ضرورت مند نظر آنے والا بوڑھا قلی کھانستا ہوا میری طرف آیا۔ "سامان اٹھائے گا وڈا سائیں۔"

محض اس پر ترس کھاتے ہوئے میں نے اپنا اور نورین کا سوٹ کیس اس کے حوالے کر دیا ورنہ ہم انہیں پہیوں پر چلا کے بھی پلیٹ فارم تک جاسکتے تھے۔ میں نے پوچھا۔ "کراچی والی گاڑی ہے کوئی؟"

اس نے ہانپتے ہوئے سر ہلایا۔ "ابھی سائیں دو گھنٹا ہے۔ شالیمار لیٹ ہے۔ آپ فکر مت کرو، ہم آپ کو خود بوگی میں بٹھائے گا۔ گاڑی آئے گا تو ہم آجائے گا... آپ بوگی کا نمبر بولو۔"

میں نے اسے سو روپے دیے۔ "ابھی مجھے ریزرویشن لینی ہے... تم جاؤ۔"

قلی سلام کر کے چلا گیا تو میں ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ "بیٹھو۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

نورین میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ "کیا مجھے نہیں بتاؤ گے؟"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "سب بتا دوں گا... لیکن ابھی تو مجھے چائے کی سخت طلب ہو رہی ہے اور ریلوے اسٹیشن پر ملنے والی چائے کی تو بات ہی مت پوچھو... امریکا یورپ کا کوئی ڈرنک ایسا نشہ آور نہیں ہوتا۔"

اس نے برقع اوپر اٹھا کے ایک گہری سانس لی۔ "دم گھٹ گیا میرا تو... سنو، یہاں کچھ کھانے کو ملے گا؟ بھوک لگی ہے مجھے... پکوڑے... وہ دیکھو..." اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔

میں نے دو پھیرے کیے، پہلے پھیرے میں اخباری کاغذ میں دیے جانے والے پکوڑے نورین تک پہنچائے جو کڑھائی سے نکال کے مجھے تھما دیے گئے تھے چنانچہ کاغذ سے رِسنے والے تیل کا درجۂ حرارت وہی تھا جو کڑھائی کا... پھر میں نے دو میلے کچیلے کپ دو ہاتھوں میں تھامے اور سامنے سے آنے والوں سے بچتا بچاتا چائے چھلکائے بغیر نورین تک پہنچنے میں کامیاب رہا۔ اس وقت تک وہ پچاس فیصد پکوڑے اور سو فیصد چورن والی کھٹی چٹنی حلق سے اتار چکی تھی۔ اس کی زبان اور تالو جلے ہوں گے مگر وہ سی سی کرتی آنسو بہاتی بقیہ نصف پکوڑوں کو بھی حلق سے اتارنے میں مگن تھی۔ جس تیل میں پکوڑے تلے جارہے تھے وہ بھی ڈیزل کی طرح کالا تھا اور پکوڑے تلنے والا بھی۔ اس کا تو پسینا بھی سیاہی کے طور پر استعمال کے قابل ہوگا۔ تاہم نورین کے اصرار پر میں نے دو پکوڑے کھائے۔

نورین نے کاغذ کو چرمر کر کے پھینکا اور ایک ڈکار لی۔ اس نے بینچ پر سے چائے کا کپ اٹھایا اور شڑپ شڑپ پینے

لگی۔ ”مزہ آگیا...“ وہ بولی۔

میں نے کہا۔ ”میں ایک کلولانے کا سوچ رہا تھا۔“

وہ طمانیت سے مسکرائی۔ ”تمہیں پھر بھی دو ہی پکوڑے ملتے۔“

”جتنا تم کھاتی ہو... آخر وہ کہاں جاتا ہے؟ تمہارے وجود کو تو لگتا نہیں۔“

”یہ سب اس کا کرم ہے۔“ اس نے اوپر انگلی اٹھائی۔ ”خوب کھاؤ پیو بے فکری سے... کچھ نہیں ہوگا... جن کے نصیب میں نہ ہو، وہ فاقے کر کے بھی ڈھول بنتے جاتے ہیں۔ اب بتاؤ کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

میرے جواب دینے سے پہلے ایک ٹرین سامنے آرکی۔ نورین کو جواب دینے کے بجائے میں کھڑا ہوگیا۔ ”اٹھو... گاڑی یہاں زیادہ دیر نہیں رکتی۔ آؤ میرے ساتھ۔“

”مگر یہ تو واپس روہڑی جا رہی ہے۔“ اس نے برقع چہرے پر ڈال کے اپنا سوٹ کیس کھینچنا شروع کیا اور میرے پیچھے پیچھے دوڑنے لگی۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور ایک نسبتاً خالی کمپارٹمنٹ میں داخل ہوگیا۔ یہ لوئر اے سی والی بوگی تھی جس میں چھ کیبن تھے۔ چار میں فیملی تھی... پانچویں میں کسی کالج کی ٹیم کے لڑکے غل غپاڑا کر رہے تھے۔ انہوں نے احتجاج کیا۔ ”یہ ریزرو ہے... ہم سب کی لاہور تک برتھ ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ہوگی... مگر برتھ ریزرویشن رات کے لیے ہوتی ہے... آٹھ بجے کے بعد... دن میں ہر برتھ پر چار مسافر بیٹھ سکتے ہیں۔ چلو اٹھ کر بیٹھو... تمہیں تعلیم نے بھی سکھایا ہے کہ ایک عورت کھڑی ہے اور تم اسے بیٹھنے کی جگہ بھی دینے پر راضی نہیں... میں یہ بدتہذیبی برداشت نہیں کر سکتا۔“

میرے جارحانہ لہجے اور تیور کو دیکھ کر وہ لڑکا سیدھا بیٹھ گیا۔ میں نے ایک برتھ پر نورین کو بٹھایا اور دوسری پر خود بیٹھ گیا۔ اس وقت تک گاڑی چل پڑی تھی۔ کیبن کے پانچوں نوجوان اب مجھے پُرمخاصمت نظروں سے تول رہے تھے کہ مجھ سے مزید پھڈا کرنا مناسب ہوگا یا نہیں۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اس کشیدگی والی فضا کو ختم کردوں۔

میں نے کہا۔ ”آپ سب مجھے کسی کالج کے اسٹوڈنٹ لگتے ہیں۔ میں خود بھی یہاں گورنمنٹ کالج میں انگلش پڑھاتا ہوں۔ اور ہمیں صرف روہڑی تک جانا ہے، آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔“

میری بات کا اثر جادو کی طرح ہوا۔ وہ سب بڑے سعادت مند شاگرد بن گئے۔ ”نہیں سر! غلطی ... تھی۔ آپ اطمینان سے بیٹھیے۔“

دوسرے نے اوپر سے کہا۔ ”اور ہماری بد... معاف کردیجیے۔“

میں نے مسکرا کے کہا۔ ”اس عمر میں ہم نے بھی غلطیاں کی ہوں گی۔ نو ہارڈ فیلنگ ناؤ۔“

اب وہ مجھے اپنے بارے میں بتانے لگے، کون ... کلاس میں ہے۔ وہ سب کراچی میں قائداعظم ٹرافی کا ... کے واپس لاہور جا رہے تھے۔ اسی گفتگو کے دوران ٹکٹ ... نازل ہوا۔ میں نے بڑی اتھارٹی کے ساتھ کہا۔ ”میری وائف کا ٹکٹ روہڑی تک بنا دیں۔ جرمانہ ہے تو لگا ... وہاں مجھے وقت نہیں ملا تھا۔“

لڑکے شور مچانے لگے۔ ”پروفیسر صاحب! ... ہو سکتا... ٹکٹ ہم لیں گے۔“

میں نے شفقت سے کہا۔ ”تم بچے ہو ابھی... باپ کی ذمے داری ہو۔“

ٹکٹ چیکر ڈھیلا پڑ گیا۔ ”کوئی بات نہیں سر... ہمارے بھی استاد ہیں۔“ اور آگے بڑھ گیا۔

زندگی میں پہلی بار میں نے کسی استاد کی یہ تکریم ... تھی اور شرمندہ تھا کہ جھوٹ بول کر میں نے اپنے ... عزت حاصل کی تھی۔ اگر اس وقت انہیں میری حقیقت ... چل جاتا کہ میں جیل سے فرار ہونے والا ایک مجرم اور ... ہوں تو ان کا رویہ کتنا مختلف ہوتا۔

ہم دو گھنٹے بعد روہڑی کے ریلوے اسٹیشن پر ... اب رات ہو چکی تھی اور فضا میں معمولی سی خنکی غالب آ... تھی۔ پلیٹ فارم پر معمول سے زیادہ ہجوم تھا۔ اس کی ... وجہ یہ تھی کہ صرف تیزگام ہی نہیں، اس سے پہلے روانہ ہو... والی گاڑی بھی لیٹ آرہی تھی ورنہ اس کے مسافر جا... ہوتے۔ دو ٹرینوں پر سوار ہونے والے مسافروں کو چھوڑ... کے لیے آنے والوں کی تعداد ان سے آٹھ دس گنا ہو... الوداع کہنے کے لیے آنے والوں کا ٹرین کی روانگی کے ... بھی دیر تک ہاتھ ہلاتے رہنا ہماری روایات میں شامل ... ریلوے تو ہر صورت فائدے میں رہتی ہے کہ اسے ... فارم ٹکٹ بیچ کے اضافی آمدنی ہو جاتی ہے مگر گوروں کے ... میں بنائے گئے پلیٹ فارم آج کی آبادی کے لیے چھو... پڑتے ہیں۔ مجھے بھی بیٹھنے کے لیے کسی بینچ پر جگہ نظر نہ ...

جولوگ ان پر قابض تھے، وہ بڑی ڈھٹائی سے مطمئن بیٹھے تھے اور کسی بوڑھے یا بیمار اور کسی عورت کو اخلاقاً جگہ دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں رہے تھے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ مسلسل حرکت کرتے مسافروں اور سامان بردار قلیوں کی دوڑ بھاگ میں کہیں سکون سے کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہ تھی۔ میں نورین کے ساتھ ایک دیوار سے لگ کے کھڑا ہوگیا۔ اپنی اس محفوظ جائے پناہ سے میں نے اچانک انہیں دیکھا۔

میرے دماغ کو الیکٹرک شاک سا لگا اور بے اختیار میں نے کہا۔ ''یا میرے خدا...''

نورین کی نظر اٹھی تو اسے میرے چہرے پر وحشت، خوف اور پریشانی کے آثار دکھائی دیے۔ ''خاور... کیا ہوا... خیریت تو ہے نا؟'' اس کے ہاتھ کا دباؤ مجھے اپنے کندھے پر محسوس ہوا۔

میں نے سر ہلایا۔ ''ہاں، ابھی تک تو تھی... اب نظر نہیں آتی۔''

''کیوں... اچانک ایسی کیا بات ہوگئی؟''

میں نے کہا۔ ''ابھی میرے سامنے سے دو چہرے گزرے ہیں۔ وہ نادر شاہ کے آدمی تھے۔ ان کا یہاں نظر آنا بے مقصد نہیں ہوسکتا۔ وہ مجھے تلاش کررہے ہیں۔''

''نادر شاہ...؟ وہی جس نے تمہارے بھائی کو قتل کروادیا تھا؟''

''ہاں... اور اب اس کی زندگی کا واحد مقصد ہے مجھے اپنے راستے سے ہٹانا۔ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ میں بھی جیل سے فرار ہونے والوں میں شامل ہوں، اس نے اپنے شکاری کتے میرے پیچھے لگا دیے ہوں گے۔''

''اگر تمہیں یقین ہے کہ وہ نادر شاہ کے آدمی تھے تو پھر کھڑے کیوں ہو یہاں... وہ پھر آئیں گے۔ اس سے پہلے کہ کوئی تمہیں دیکھے، ہم یہاں سے نکل جاتے ہیں۔''

''اگر وہ مجھے ہی تلاش کررہے ہوں گے تو لوٹ کے آئیں گے۔ ورنہ یہاں ان کا نظر آنا اتفاق بھی ہوسکتا ہے۔''

''یہ رسک لینے کی کیا ضرورت ہے خاور...؟''

''یہاں رسک سب سے کم ہے کیونکہ اس ہجوم میں ان کی نظر مجھے نہیں دیکھ سکتی۔ میں ایک کنارے پر اور اندھیرے میں ہوں۔ پھر تم میرے ساتھ ہو... میرا حلیہ بھی بہت بدلا ہوا ہے۔ باہر ان کا میرا آمنا سامنا ہوگیا تو وہ میرے پیچھے لگ جائیں گے۔''

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے خاور۔''

میں نے چڑ کے کہا۔ ''میرے پاس تمہارے ڈر کا کوئی علاج نہیں۔''

''اگر ہم اپنی روانگی مزید ایک دن کے لیے [illegible] کردیتے...''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں ڈیئر... میر[illegible] میں یہی بہتر ہے کہ جلد از جلد اس ڈینجر زون سے [illegible] جاؤں۔ یہاں نادر شاہ کے چیلے ہی نہیں، پولیس وا[illegible] میری تلاش میں ہیں۔ معلوم نہیں اب تک کسی کی نظر [illegible] نہیں پڑی۔''

''اب تک تم بڑی ہوشیاری سے سب کو ڈاج [illegible] آئے ہو۔''

میں نے مسکرا کے اسے دیکھا۔ ''مجھے میری ہو[illegible] نے نہیں، تم نے بچایا۔ کسی کو شک نہیں ہوا کہ ایک پردہ[illegible] عورت کے ساتھ قیدی نمبر ون ٹو تھری بھی ہوسکتا ہے۔''

''تم نے شیو کرنا چھوڑ دیا ہے۔ مہینے بھر میں [illegible] سے تمہاری صورت ہی بدل جائے گی، اگر مونچھیں [illegible] ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''تم مہینا بھر بعد کی بات کرتی ہو[illegible] مجھے ابھی کی فکر ہے۔''

وہ جواب دیے بغیر ایک طرف سرک گئی۔ میں[illegible] اسے سندھی اجرک ٹوپی، شکار پور کے اچار اور ملتان کے [illegible] کا حلوہ بیچنے والی ایک دکان پر سودا کرتے دیکھا۔ دس [illegible] میں وہ میرے لیے ایک اجرک اور ٹوپی لے آئی۔ ''یہ ل[illegible] اس سے کافی فرق پڑے گا۔''

اس کا دل رکھنے کے لیے میں نے ٹوپی اوڑھ کے [illegible] شانوں پر ڈال لی۔ میری نظر ادھر دیکھتی رہی جدھر میر[illegible] دشمن ہجوم میں گم ہوئے تھے۔ اچانک پلیٹ فارم پر جھگڑ[illegible] اور قلی چلانے لگے۔ ایک ٹرین آگئی تھی مگر یہ تیز گام نہیں [illegible] اس کی آمد کا ابھی تک کوئی اعلان نہیں ہوا تھا۔ میرے پا[illegible] ٹکٹ تھا اور نہ ریزرویشن۔ یہ خطرہ اب بڑھ گیا تھا کہ ٹر[illegible] ہوجانے کے بعد مجھے تلاش کرنے والوں کے لیے آسانی [illegible] ہوجائے گی۔ اچانک میرے پاس سے ایک قلی بڑ[illegible] گزرا۔ ''تیز گام... برتھ سیٹس... لاہور پنڈی۔'' بظاہر [illegible] کسی سے بھی مخاطب نہیں تھا مگر درحقیقت وہ ضرورت مند[illegible] کے لیے اعلان کرتا جارہا تھا کہ اگر انہیں سیٹ یا برتھ [illegible] حصول میں دشواری کا سامنا ہو تو وہ فرشتۂ غیب انہی کی [illegible] کے لیے بھیجا گیا ہے اور اس کے خفیہ اعلان کا مقصد اس [illegible] سوا کچھ اور نہیں کہ وہ بلیک میں دستیاب سیٹ اور برتھ فرا[illegible] کرنے والوں کا نمائندہ ہے۔

میں نے اسے روک لیا۔ ''بات سنو، مجھے لاہور کے لیے دو برتھ درکار ہیں۔'' وہ ادھر ادھر دیکھ کے رک گیا۔ ''ملے گا سر... اکانومی یا بزنس کلاس... پانچ اوپر... دس اوپر...''

میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا۔ اکانومی کی دو برتھوں پر مجھے پانچ سو زیادہ دینے ہوں گے۔ بزنس کلاس کی برتھ پر ہزار۔ ظاہر ہے یہ ایک برتھ کا ریٹ تھا اور میں سودے بازی سے کچھ رعایت حاصل کرسکتا تھا لیکن مجھے بروقت ایک اور خیال آگیا۔ میں نے کہا۔ ''اگر اے سی سلیپر ہو پھر؟''

قلی کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ صرف تیز گام اب مین لائن کی وہ گاڑی رہ گئی ہے جس میں اے سی سلیپر کی بوگی لگائی جاتی ہے مگر اس کا کرایہ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ بیشتر دور اندیش مسافر جہاز کو ترجیح دیتے ہیں جس کا کرایہ ہزار دو ہزار زیادہ سہی مگر وہ ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچاتا ہے تو تیز گام ڈیڑھ دن میں... یہ الگ بات ہے کہ کچھ لوگ آج بھی ٹرین کے سفر کو انجوائے کرنے کے لیے ترجیح دیتے ہیں۔

''پتا کرے گا سر... چار سیٹ والا چار کمپارٹمنٹ ہوتا ہے۔ شاید مل جائے۔'' وہ بڑی پھرتی سے ہجوم میں غائب ہوگیا۔ وہ قلی ایک معمولی کارندہ تھا، ان چیل کوؤں اور گدھوں کا جو ریلوے کی مردہ لاش کو بھی نوچ رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر رکی ہوئی ٹرین کے گارڈ نے وسل دی۔ پھر دوبار ٹرین کے انجن کا ہارن گونجا اور ٹرین جو بیس منٹ سے کھڑی تھی، حرکت میں آئی۔ ایک دستور کے مطابق روہڑی پر ہر ٹرین میں پانی بھرا جاتا ہے ورنہ اس کا اسٹاپ ادھر چند منٹ کا ہوتا۔ بہت سے الوداع کہنے والے اب واپس جارہے تھے۔ میری نظر غور سے ہر چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ میں یہ فرض کرنے لگا تھا کہ میرے دشمن بھی ٹرین ٹائم پر مجھے تلاش کرنے کی ذمے داری پوری کرکے نکل گئے۔ شاید وہ دوبارہ اگلی ٹرین کی آمد پر آئیں گے۔

قلی اچانک نمودار ہوا۔ ''آپ کا قسمت ہے سر... دو برتھوں والا چھوٹا کمپارٹمنٹ خالی ہے۔ کراچی سے بک تھا... مسافر نہیں آیا۔''

مجھے یوں لگا جیسے یہ بھی قدرت کی طرف سے مجھے تحفظ فراہم کرنے کا انتظام ہے۔ ہم بھاگ کر شادی کرنے والا جوڑا تو نظر آتے نہیں تھے۔ قلی نے ہمیں نیا شادی شدہ جوڑا سمجھا ہوگا جن کی جیب میں ہنی مون کے لیے سلامی میں ملنے والا پیسا بھی تھا۔ اس نے پانچ اوپر مانگے اور چار پر خوشی خوشی مان گیا۔ میں اسے پوری رقم دینے والا تھا کہ نورین نے مجھے روک دیا۔ ''اتنی جلدی کیا ہے... یہ ٹکٹ لے آئے اور پیسے لے جائے۔''

''یہ بھی ٹھیک فرمایا تم نے۔'' میں نے کسی سعادت مند شوہر کی طرح دانت نکالے۔

''میں غلط کب کہتی ہوں۔'' وہ بیویوں والے غرور سے بولی۔ ''اعتبار کا زمانہ نہیں ہے۔''

قلی نے خفت سے اس کی تائید کی۔ ''ہم ابھی ٹکٹ لاتا ہے سر!'' اور پھر بھاگ گیا

''اگر اعتبار کا زمانہ نہیں ہے خاتون... تو آپ نے اس مفرور قتل کے مجرم پر کیوں اعتبار کرلیا؟''

وہ ہنسی۔ ''میں نے تو قلی کے لیے کہا تھا۔''

''سلمان خان کے بارے میں کیا خیال ہے... اس پر اعتبار کرنا ٹھیک تھا؟''

معلوم نہیں برقع کے اندر اس کی صورت کے تاثرات کیا تھے۔ نورین نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہمارے درمیان خاموشی کے اس ناخوشگوار وقفے کا خاتمہ قلی نے کیا۔ ''سر! آپ کا ریزرویشن... اصلی والا ہے جو لاہور کے لیے کراچی سے ہوا تھا۔''

میں نے کاغذ کے ایک پرزے پر لکھے ہوئے نام کو دیکھا۔ ''ملک عبدالقیوم اور مسز قیوم... یہ کون ہیں؟''

''مجھے کیا معلوم سر... ان کی ریزرویشن تھی۔ کینسل کراکے آپ کے نام سے ہوتی تو آپ کو میرے ساتھ جاکے اپنا شناختی کارڈ بھی دینا پڑتا اور بیگم صاحبہ کا بھی... کوئی آپ کو نہیں پوچھے گا۔''

نورین نے پھر دخل دیا۔ ''اس کاغذ کے پرزے کی کیا حیثیت ہے کہ ہم تمہیں دس ہزار دے دیں۔''

''ابھی ٹرین آنے دو۔ آپ کی گارڈ سے بات کرادے گا... ہم فراڈ نہیں کرتا سر... روز کا دھندا ہے۔ ہمیں تو بس دو سو ملے گا۔ باقی سب اوپر جائے گا۔'' وہ فریادی بن گیا۔

میں نے کہا۔ ''اب ٹرین آنے میں کتنی دیر ہے؟''

''ڈیڑھ گھنٹا... آپ آؤ... میں اپر کلاس ویٹنگ روم میں آپ کو بٹھاتا ہے۔''

یہ ایک اور فائدہ ہوا کہ انتظار کا وقت ہم نے آرام کرتے گزارا۔ نورین نے نام نہاد اپر کلاس ویٹنگ روم کے ٹوٹے ہوئے واش بیسن کے بہتے نلکے سے منہ دھویا۔ ٹوٹے ہوئے آئینے میں اپنی صورت کے حسن میں چار چاند لگائے

اور پھر میرے ساتھ بیٹھ کے وہ ڈنر کیا جو ایک ویٹر نے ہمیں ریسٹورنٹ سے لا کے دیا تھا۔ ویٹنگ روم کی خستہ حال کرسیوں پر اکثریت ایسے لوگوں کی براجمان تھی جو حلیے سے نچلے درجے کے مسافر لگتے تھے مگر کسی کی مٹھی گرم کر کے یہاں آبیٹھے تھے۔ میں مطمئن تھا کہ اب مجھے کوئی خطرہ نہیں اور میں تلاش کرنے والوں کی نظر سے محفوظ ہوں۔ یہ اطمینان اس وقت اچانک رخصت ہوگیا جب تیز گام کی آمد کا اعلان ہوا۔ اچانک میں نے انہی دو چہروں کو دروازے سے جھانکتا پایا جو نادر شاہ کے حکم پر مجھے تلاش کر رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے تو میرا خون خشک ہوگیا تھا کیونکہ ویٹنگ روم میں گنتی کے دس بارہ افراد تھے مگر ان کی نظر مجھ پر سے گزر کے لوٹ گئی۔ شناخت کا لمحہ سرچ لائٹ کی طرح مجھ پر سے گزر گیا۔ متلاشی نگاہوں کے کیمرے مجھے فوکس نہ کر پائے... وہ دونوں پلٹ گئے۔

خطرہ جس کے وجود کا احساس گزرے ہوئے ڈیڑھ گھنٹے میں باقی نہ رہا تھا، ایک دم پھر میرے اعصاب پر مسلط ہوگیا۔ وہ بہت زیادہ مستعد نہیں تھے تو انہیں بہت زیادہ غافل فرض کرنا بھی غلط تھا۔ ویٹنگ روم کی ہلچل میں وہ مجھے غور سے نہ دیکھ پائے تھے مگر ٹرین میں صورتِ حال مختلف ہوگی۔ اے سی سلیپر کے اس پُرتعیش کمپارٹمنٹ میں تو ان کے سامنے صرف میرا ہی چہرہ ہوگا۔ ایک موہوم سا امید دلانے والا آسرا یہ خیال تھا کہ شاید وہ ادھر نہ آئیں۔ اکانومی اور بزنس کلاس تک محدود رہیں گے مگر اس امکان پر میں اپنی زندگی داؤ پر لگا دوں، میں اتنا بے عقل جواری نہیں تھا۔

دو برتھوں والے مختصر سے کمپارٹمنٹ کا دروازہ بند ہوا تو میں نے اور مجھ سے بڑھ کر نورین نے سکون کا سانس لیا۔ نورین کے سکون میں یقین تھا کہ اب وہ محفوظ ہے اور ٹرین کے پہیے حرکت میں آئیں گے تو گزرتے وقت کے ہر لمحے کے ساتھ وہ خطرے کی زد سے دور ہوتی جائے گی۔ میرا سکون وقتی تھا۔ فرشتۂ اجل کی طرح دو قاتل میرے تعاقب میں تھے۔ میں نے انہیں دیکھ لیا تھا اور دیکھنا یہ تھا کہ وہ مجھے دیکھ پاتے ہیں یا نہیں۔ نورین برقع پھینک کے برتھ پر لیٹ گئی تھی اور تحفظ کے اس احساس سے طمانیت حاصل کر رہی تھی۔

چند سیکنڈ بعد اس نے آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا اور مسکرائی۔ ”تم کیا گھوڑے کی طرح رات بھر کھڑے رہوگے۔“

میں نے اس کے سوال سے اندازہ کیا کہ میں کتنی ٹینشن میں ہوں۔ ”مجھے سوچنے کی بیماری ہے۔ موقع محل... میرا دماغ بھٹک جاتا ہے۔“ میں اس کے پیروں کی خالی جگہ پر بیٹھ گیا۔

اس نے پیر سمیٹ لیے۔ ”اس وقت دماغ کدھر نکل گیا تھا؟“

”بس ایسے ہی مجھے خیال آیا کہ حالات... ہیں... تمہارے بھی اور میرے بھی... لیکن وقت... فٹ بال کی طرح کھیل رہا ہے۔ کبھی ادھر کبھی اُدھر۔ ہم... کوئی مہینے یا ہفتے نہیں بیتے۔ صرف دو دن ہوئے ہیں... سے پہلے نہ تمہارے ذہن میں میرا کوئی خیال تھا، نہ میں... تصور بھی کر سکتا تھا۔ مگر صرف دو دنوں میں ہم کہاں سے... نہیں گئے۔ اس آسیب زدہ حویلی کا تصور کرو اور پھر... پُرتعیش کمپارٹمنٹ کا جو ویسے تو جیل کی اس کال کوٹھری سے... نہیں ہے جس میں مجھے رکھا گیا تھا۔“

وہ اٹھ بیٹھی۔ بڑی اپنائیت اور خلوص کے ساتھ... نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ”خاور... اتنا... سوچو، پُرسکون ہو جاؤ۔ آنے والے وقت پر ہمارا کوئی... نہیں۔ اللہ پر بھروسا رکھو۔“

میں نے محبت سے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی۔ ”... بھروسا تم نے مجھ پر کیا... اس نے مجھے بہت... نورین۔“

وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ ”میں نے تو کچھ بھی... کیا۔ جو ہوا خود بخود ہوتا چلا گیا۔ معلوم نہیں کیوں اور کیسے... اور دیکھو، میں اس مختصر سے ڈبے میں تمہارے ساتھ ہوں... نہ جانے کہاں جارہی ہوں۔“

ٹرین رفتار پکڑ چکی تھی لیکن شیشے کے باہر صرف تار... تھی چنانچہ حرکت کا احساس صرف فولادی پٹڑی پر دوڑ... پہیوں کی آواز سے ہوتا تھا۔ میرے لیے یہ خواب جیسا... تھا۔ جیل کی تاریک بدبودار منحوس کوٹھری یکلخت جیسے... عروسی بن گئی تھی۔ سرخ مخمل سے ڈھکی نرم اور دبیز... برتھ پر ایک لڑکی میرے ساتھ میرے اتنے قریب تھی کہ... اس کے وجود کی مہک اور حدت کو بھی محسوس کر سکتا تھا او... لڑکی میرے خواب و خیال اور قیاس و تصور کی دلہن سے... کہیں زیادہ حسین تھی۔ میں اس کے ناز آفریں پیکر کی... دل آویزی کو دیکھ سکتا تھا اور کچھ دیر پہلے اس کے نازک... نے میرے وجود میں جس ریشمی لمس کا سرور جگایا تھا وہ... برقرار تھا۔ فرش پر پھول دار قالین تھا اور اوپر ایک... روشنی... مکمل خلوت اور سکون۔ اس کے باوجود دل کی...

میں خوف کنڈلی مار کے بیٹھے ہوئے سانپ کی طرح موجود تھا۔ خوف کہ کہیں یہ سچ مچ خواب نہ ہو... خوف کہ اچانک سب ختم بھی ہو سکتا ہے۔ خوف کہ اجل کے نامہ بر بن کے میری تلاش میں پھرنے والے کسی بھی لمحے نمودار ہو کے مجھے ایک خون آلود لاش بنا سکتے ہیں۔ خوف کہ نورین مجھ سے چھن جائے گی، مجھے چھوڑ جائے گی... حقیقت کے سامنے آتے ہی... اور ایسا سوچتے ہوئے میرا دل ڈوب جاتا تھا، دھڑکنا بند کر دیتا تھا مر جاتا تھا۔

پھر اس وقت جب میں اپنے خیالوں کی خاموش دنیا میں تھا ایک زبردست دھما کا ہوا۔ میں اچھل پڑا۔ نورین کا ہاتھ ایک دم اپنے برقع کی طرف گیا۔ ”یہ کون آگیا؟“ اس نے پُرخوف سرگوشی میں کہا اور منہ دوسری طرف پھیر کے بیٹھ گئی۔

میں نے خود کو سنبھالا اور اے سی سلیپر کے مسافر کی رعونت کے ساتھ غرا کے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”ٹکٹ چیکر۔“ باہر سے مؤدبانہ جواب ملا۔

”اچھا۔ ایک منٹ ٹھہرو...“ میں نے اسی لہجے میں کہا۔ نورین کو اشارے سے سمجھایا کہ فکر اور پریشانی کی کوئی بات نہیں اور دروازہ کھول کے بڑی بڑی مونچھوں والے لمبے چوڑے گول مٹول ٹکٹ چیکر کو دیکھا۔

”ملک عبدالقیوم صاحب؟“ ٹکٹ چیکر نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا۔

”تم کو شک ہے کوئی؟“ میں نے بہتر سمجھا کہ یہ سوال ایک دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ کیا جائے۔

”نہیں سر! وہ تو مجھے فقیر بخش... اس قلی نے بتا دیا تھا۔ میں صرف یہ کہنے آیا تھا کہ آپ تسلی رکھیں... میری ڈیوٹی رات کو ختم ہو جائے گی خانپور پر... ادھر سے دوسرا کنڈکٹر گارڈ آئے گا۔ میں اسے بتا دوں گا۔“

میں نے وردی کی جیب کے اوپر لکھا ہوا نام پڑھا۔ ”حبیب اللہ... تمہاری وجہ سے ہمیں یہ آرام ملا۔“ اور جیب سے ایک ہزار کا نوٹ نکال کے اس کی جیب میں ٹھونس دیا۔

اس نے رسمی عاجزی اور تکلف سے کہا۔ ”تھینک یو سر...“

عین اس وقت جب میں کیبن سے باہر ڈھائی فٹ چوڑے کوریڈور پر تھا، میں نے سامنے والے آخری حصے کا دروازہ کھلتا دیکھا۔ دونوں پیچھے والی بوگی سے گزر کے ہی یہاں تک آئے تھے اور اگر میں کیبن کے اندر ہوتا تو شاید وہ کوریڈور سے سیدھے گزر جاتے۔ ان کے لیے یہ مشکل ہوتا کہ وہ ہر کیبن کے بند دروازے پر دستک دے کر اندر جھانک سکیں۔ ان دونوں کی صورت میں نے روہڑی پر دیکھی تھی جب وہ میرے سامنے سے گزر کے ہجوم میں گم ہو گئے تھے۔ یہاں کوئی ہجوم نہیں تھا۔

میں نے ایک خود کار دفاعی انداز میں خود کو ٹکٹ چیکر کے پیچھے چھپانے کی کوشش کی اور اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کے گھوم گیا۔ عین اس وقت وہ میرے سامنے سے گزرے۔ ایک نے گالی دے کے کہا۔ ”وہ... آخر گیا کہاں... ہے وہ اسی گاڑی میں۔“

دوسرے نے بیٹھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”ہم تو نادر شاہ کو بھی بتا چکے ہیں... وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

ٹکٹ چیکر کو میری حرکت نے خاصا حیران کیا تھا۔ کسی وجہ کے بغیر میں اس سے تقریباً چمٹا ہوا تھا اور اس کے شانے پر سے جھانک کر ان دونوں کو دیکھ رہا تھا جو سیدھے گزر گئے تھے۔ ”یہ... یہ آپ کیا کر رہے ہیں سر!“ ٹکٹ چیکر نے کہا۔

”وہ... کچھ نہیں... دراصل مجھے بلڈ پریشر ہے۔ چکر سا آگیا تھا۔“ میں نے اس سے الگ ہو کے کہا اور گارڈ کو چھوڑ دیا۔ اس کے آگے جاتے ہی میں نے پلٹ کے کیبن کا دروازہ بند کیا لیکن غیر ارادی طور پر میری نظر دوبارہ کوریڈور کے آخری حصے تک گئی۔ میرا خیال تھا کہ اب تک وہ دوسری بوگی میں پہنچ چکے ہوں گے مگر وہ واپس آرہے تھے۔ ان دونوں نے کوئی چکر چلا کے ڈائننگ کار کے ویٹرز کی وردی حاصل کر لی تھی۔ اس طرح انہیں پوری ٹرین میں بلا روک ٹوک ہر جگہ جانے کا اختیار حاصل ہوگیا تھا مگر وہ میری آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتے تھے۔ میں نے انہیں پہچان لیا تھا اور میرے دماغ میں اپنے دفاع کے تمام جارحانہ اقدام سوچنے کی مشین چل پڑی تھی۔

وہ دونوں پیشہ ور قاتل تھے اور اس میں شک کی کوئی بات نہیں تھی کہ نادر شاہ نے انہیں میرے قتل کا معاوضہ پیشگی ادا کر دیا ہوگا اور انہیں یہ اطمینان بھی دلایا ہوگا کہ اس کیس میں قتل کوئی جرم نہیں ہوگا۔ ان کا اصل کام مجھے تلاش کرنے کا ہوگا۔ اس کے بعد وہ بے خوف ہو کے مجھے سب کے سامنے بھی گولی ماردیں تو یہ کوئی جرم شمار نہیں ہوگا۔ نادر شاہ خود اپنے علاقے کی پولیس کے افسرِ اعلیٰ کو بلا کے ایک مفرور مجرم کی لاش کا تحفہ پیش کرے گا کہ اب تمہاری مرضی ہے... اس کارنامے پر اپنے جس ماتحت کو چاہو ترقی کے لیے نامزد کرو۔ پولیس والے خود اپنی کارکردگی کی ایک رپورٹ میڈیا کے

سامنے پیش کر دیں گے کہ ہم نے کس طرح مجرم کا سراغ لگایا۔ کیسے اس کا تعاقب کیا۔ کیسے اس نے گرفتاری سے بچنے کے لیے پولیس پارٹی کا مقابلہ کیا۔ پولیس نے کتنی بہادری سے اسے محصور کیا اور بالآخر وہ مارا گیا۔ اس مقابلے میں چند پولیس والے بھی زخمی ہوئے جو اسپتال میں زیرِ علاج ہیں۔ انچارج کے لیے ترقی اور باقی سب کے لیے سند کارکردگی اور انعام کی سفارش کی گئی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی ہر پریس کانفرنس کم سے کم ڈی آئی جی لیول کا افسر تمام اخبارات کے کرائم رپورٹرز کو مدعو کرنے کے بعد کرتا ہے۔ بعض اوقات اچھی کہانی بنانے پر چند پسندیدہ کرائم رپورٹرز کو وہ لفافہ بھی پیش کیا جاتا ہے جس نے لفافہ جرنلزم کی اصطلاح کو فروغ دیا۔

مجھے اندازہ تھا کہ یہاں وہ ہر بوگی کا دروازہ کھلوا کے اندر جھانک نہیں سکتے چنانچہ انہوں نے بڑی چالاکی سے کام لیا تھا۔ وہ اس وقت ہر کیبن کے اندر نگاہ ڈال لیتے تھے جب ٹکٹ چیکر دستک دے کر دروازہ کھلواتا تھا۔ ڈائننگ کار کے ویٹر کی وردی میں یہ ان کا فرض تھا کہ ہر معزز مسافر سے چائے کھانے کے لیے پوچھیں۔ ٹکٹ چیکر کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ وہ تو نظر اٹھا کے ان کی صورت بھی نہیں دیکھتا ہوگا۔ بظاہر ایسا نظر آتا تھا کہ میں بروقت ٹکٹ چیکر کے پیچھے خود کو چھپانے میں کامیاب رہا تھا اور وہ کیبن میں برقع پوش نورین کو دیکھ کر مطمئن ہوگئے تھے کہ ان کا شکار یہاں نہیں ہوسکتا۔

ٹرین کی ساری بوگیاں آپس میں ایک سرنگ نما راستے سے ملی ہوئی تھیں۔ ریلوے کا عملہ، مسافر اور ڈائننگ کار کے ملازم سب اسی سے گزر کے آتے جاتے تھے۔ مجھے بھی یقین تھا کہ اے سی سلیپر والی بوگی میں میری غیر موجودگی ثابت ہونے کے بعد وہ آگے چلے گئے ہوں گے۔ میں نے دروازے کو تھوڑا سا کھول کے کوریڈور میں جھانکا تو میرا سر خود بخود اندر آگیا۔ میں نے آہستہ سے دروازے کو بند کیا تاکہ آواز انہیں متوجہ نہ کرے۔ ان میں سے ایک دائیں طرف والے گیٹ میں کھڑا چلتی ٹرین سے باہر کا نظارہ کرنے میں مصروف تھا تو دوسرا کوریڈور کے بائیں جانب والے گیٹ پر پوزیشن سنبھالے کھڑا تھا۔ آہستہ آہستہ میرا شک بھی یقین میں بدل رہا تھا کہ ہو نہ ہو انہوں نے میری صورت کی جھلک دیکھ لی تھی مگر وہ اچھے ایکٹر تھے اور انہیں کوئی جلدی بھی نہ تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مجھے خبردار ہونے کا موقع ملے۔ شاید ان کے اور میرے دماغ کی سوچ ریلوے لائن کی طرح متوازن خطوط پر چل رہی تھی۔ انہوں نے بھی سوچا ہوگا کہ میری جگہ وہ ہوتے تو کیا کرتے۔ کیا وہ عوام کی بھیڑ میں یا خواص کی طرح اپنی خلوت میں... اور جواب وہی جو میرے ذہن میں آیا تھا۔ خوش قسمت جواری کی انہوں نے تیز گام کی بائیس بوگیاں چھوڑ کے صرف پر داؤ لگایا تھا اور بازی جیت لی تھی۔

لیکن بازی ابھی تمام نہیں ہوئی تھی۔ ہار جیت کا ہونا ابھی باقی تھا۔ آہستہ آہستہ میرے ذہن میں اپنے کے لیے ایک خطرناک جارحانہ منصوبہ جنم لے رہا فرار کے سارے راستے بند تھے چنانچہ "مرو یا مارو" حکمتِ عملی اپنانے کے سوا چارہ نہ تھا۔

نورین بہت دیر سے میری صورت کے تغیرات کو رہی تھی۔ اس نے میرا بازو ہلا کے کہا۔ "خاور... کیا ہے؟"

میں چونکا۔ "کیا بات ہے... تم کچھ پریشان ہو؟"

"ہاں... میں نے تمہیں آواز دی تھی۔ تم نے سنی نہیں۔ پریشان میں نہیں، تم ہو۔ اس ٹکٹ چیکر نے کچھ کہا تم سے؟ کہیں وہ بلیک میل کر کے تم سے مزید پیسے اینٹھنے چکر میں تو نہیں تھا؟ اگر ایسا ہے تو..."

"پلیز شٹ اپ نورین۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ کب کا چلا گیا۔"

"پھر کیا پریشانی ہے ۔ مجھے نہیں بتاؤ گے؟"

"ہر بات بتانے کی نہیں ہوتی۔ مجھے اپنا یہ برقع دو" میں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

اس نے برقع پیچھے چھپالیا۔ "برقع کی کیا ضرورت پڑ گئی تمہیں... آخر کیا کرنا چاہتے ہو تم؟"

میں نے برہمی سے کہا۔ "یہ بحث کا موقع نہیں ہے ادھر لاؤ برقع۔ مجھے معلوم ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔"

وہ میرے سامنے کھڑی ہوگئی۔ "مجھے بھی حق حاصل ہے یہ جاننے کا۔"

"تمہیں بھی معلوم ہوجائے گا لیکن ابھی وقت نہیں ہے بے وقوف۔" میں نے جھلا کے کہا۔

"آخر ایسی کیا آفت آرہی ہے؟ اور خطرے کی بات ہے کوئی تو تم مجھے کیوں نہیں بتا رہے ہو؟"

میں نے ہتھیار ڈال دینا بہتر سمجھا۔ "نورین! میرا تعاقب کرنے والے وہ دشمن جن کو میں نے روہڑی کے پلیٹ فارم پر دیکھا تھا، اب اسی بوگی میں موجود ہیں۔ وہ باہر کے دونوں دروازوں پر ویٹر کی وردی پہنے کھڑے ہیں۔ مجھے اس میں ذرا شک نہیں کہ وہ مسلح بھی ہوں گے اور موقع ملتے ہی مجھے گولی مار کے نکل جائیں گے۔ تم میری لاش پر روتی رہ جاؤ گی۔"

"خدا کے لیے ایسی باتیں مت کرو۔" وہ تقریباً مجھ سے چمٹ کے بولی۔

میں نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کے اسے دور کیا۔ "دیکھو... انسان کی عقل سے بڑا کوئی اسلحہ ابھی ایجاد نہیں ہوا۔ لاؤ یہ برقع مجھے دو۔ وہ مناسب موقع کے انتظار میں نظر آتے ہیں۔ یہاں بیٹھ کے انہیں موقع فراہم کرنے سے بہتر ہے کہ میں موقع سے فائدہ اٹھالوں۔ تم دروازہ بند کرلو۔ وہ کچھ دیر بعد دستک دیں گے۔ دروازہ مت کھولنا۔ ڈرنا مت۔ وہ تم سے میرے بارے میں کوئی سوال کریں تو اعتماد سے بات کرنا۔ بتا دینا کہ یہاں صرف تم ہو اور تمہاری والدہ۔"

"وہ یقین نہیں کریں گے۔"

"نہ کریں یقین لیکن زبردستی دروازہ بھی نہیں کھلوا سکتے۔ وہ شریف آدمی نہیں ہیں۔ دھمکی دیں تو جواب میں ان کو ایسی زنانہ گالیاں دینا کہ انہیں نانی یاد آجائے۔ کہنا کہ میں زنجیر کھینچ لوں گی... رائٹ..."

"خاور... یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن..." نورین نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی مگر میں اس کا ہاتھ جھٹک کے تیزی سے باہر نکل گیا۔

بوگی کے کوریڈور میں بائیں دروازے پر کھڑے ہوئے شخص نے مجھے پہلے دیکھا۔ اس کا اصل نام تو کچھ اور تھا لیکن جرائم کی دنیا میں وہ نازی کہلاتا تھا۔ اس کے ماضی کے بارے میں شاید کوئی بھی کچھ نہیں جانتا تھا اور جاننا چاہتا بھی نہ تھا۔ وہ سب آج کے حقائق سے سروکار رکھتے تھے۔ کون کیا کرتا ہے اور کیا کرسکتا ہے، کب تک کرسکتا ہے، یہی اہمیت رکھتا تھا۔ معمولی چوری چکاری یا جیب تراشی سے جرم کی راہ پر قدم رکھنے والے پولیس کے جبر اور جیل خانوں کی تربیت سے خطرناک مجرم بن جاتے تھے۔ اگر وہ پکڑے نہیں جاتے تھے تو اسے وہ اپنی ہوشیاری سے ملنے والی کامیابی سمجھتے رہتے تھے۔ ہر بازی ان کے یقین کو پختہ کرتی تھی کہ وہ جیتنے والے خوش قسمت جواری ہیں جن کے لیے کوئی ہار نہیں۔ زندگی کی مہلت تمام ہوتے ہی ڈیڑھ انچ کی ایک گولی انہیں یوں منظر سے غائب کر دیتی تھی جیسے پن کی نوک سے صابن کا ہوا میں اڑتا غبارہ غائب ہوتا ہے۔ اگلے دن ان کی جگہ کوئی اور لے لیتا ہے۔ کسی کو ان کا نام بھی یاد نہیں رہتا۔

دوسرے گیٹ پر آلو کھڑا تھا... اس کا نام علاؤالدین تھا اور وہ نادر شاہ کا معتمدِ خاص سمجھا جاتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے اس سے پہلے کوئی ہوگا اور اس سے پہلے بھی۔ بقول شاعر... وہ شخص جو کل تک یہاں تخت نشیں تھا... اس کو بھی خدا ہونے کا اتنا ہی یقین تھا۔ میں نے اپنی چال کو ایک بوڑھی عورت کی طرح بنایا۔ میں بہت جھک کے اور پیر گھسیٹ کر چلتا رہا۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ برقع نے میرے پیروں کو پوری طرح چھپائے رکھا ورنہ وہ شرعی حد کے مطابق ٹخنوں سے اوپر ختم ہوجاتا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میں کوریڈور کے آخری حصے تک پہنچا۔ وہ میرے دائیں ہاتھ پر کھڑا تھا۔ میں بائیں طرف باتھ روم میں گھس گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اتنی دیر میں وہ دونوں پوری طرح مطمئن ہوچکے ہیں کہ کیبن میں اب صرف چودھری فریدالدین ہوگا۔ جو عورت اس کے ساتھ تھی وہ تو باتھ روم میں ہے۔

میں نے برقع اتار کے باتھ روم میں چھوڑا اور دروازے کو آہستہ سے کھول کے جھانکا۔ ان میں سے ایک باہر ہی کھڑا تھا اور کیبن کا دروازہ کھلوانے کی ذمے داری شاید اس نے اپنے ماتحت نازی کو سونپ دی تھی۔ اس کے نزدیک دروازہ کھلوانے کے بعد سائلنسر لگے ریوالور سے ایک فائر کر کے چودھری فریدالدین کو واصل جہنم کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اسے بالکل خبر نہ ہوئی اور میں نے دبے پاؤں پیچھے سے ایک ہاتھ اس کے منہ پر رکھا اور دوسرے سے خود آلو کو پیچھے کھینچ لیا۔ نازی اس وقت کیبن کا دروازہ کھلوانے کے لیے نورین سے مذاکرات میں مصروف تھا اور اس کا چہرہ یقیناً دوسری طرف تھا ورنہ وہ دیکھ لیتا کہ باز نے جھپٹا مار کے کس طرح بے خبری میں شکار کو دبوچا ہے۔

میں آلو کو کھینچ کے باتھ روم میں لے گیا۔ جسمانی طور پر وہ میرا ہمسر نہ تھا چنانچہ اس کی مزاحمت رائگاں گئی۔ میں نے بڑی بے رحم قوت کے ساتھ اس کا سر واش روم کے کموڈ پر کئی بار مارا لیکن اس کے حلق سے آواز نہ نکلنے دی۔ اگر وہ فریاد و فغاں کرتا بھی تو ریل کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ میں کون سنتا۔ بہت جلد وہ ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے اسے چھوڑا تو وہ باتھ روم کے فرش پر منہ کے بل ڈھیر ہوگیا۔ وہاں ایسی کوئی بھی چیز دستیاب نہ تھی جس سے میں اسے باندھ کے ڈال سکتا۔ اس کی قمیص پھاڑ کے شاید میں اسے حرکت کے اور آواز نکالنے کے ناقابل بنا سکتا تھا مگر اس کے لیے وقت نہ تھا۔ میں نے سب سے پہلے اس کی تلاشی لی اور یہ اندازہ کیا کہ شاید ابھی چند منٹ تک وہ ایسے ہی بے سدھ پڑا رہے گا۔ اس کی ناک سے خون بھی بہہ رہا تھا۔

جس چیز کی مجھے تلاش تھی، وہ فوراً ہی میرے ہاتھ میں آگئی۔ یہ اعشاریہ چار پانچ والا ریوالور تھا جو عموماً پولیس استعمال کرتی ہے۔ باتھ روم کا دروازہ بند کرکے میں دبے پاؤں کوریڈور میں آیا۔ تیزگام پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی اور کوریڈور میں سناٹا تھا۔ مجھے نازی کہیں نظر نہ آیا تو میرے بدن میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ کیا وہ کسی طرح کیبن کا دروازہ کھلوانے میں کامیاب رہا تھا؟ نورین نے میرے سمجھانے کے باوجود یہ غلطی کی تھی۔ اپنے کیبن کے دروازے پر پہنچ کے میں نے نورین کے چلّانے کی آواز سنی۔

نازی نے ایک گالی دے کر کہا۔ ”بکتی ہے تُو... وہ تیرے ساتھ تھا۔“

نورین چلّائی۔ ”میں زنجیر کھینچتی ہوں۔“

”میں تیرا گلا گھونٹ دوں گا کرائے کی کتیا...“

میں ایک دم کیبن میں داخل ہو کے برقع سے باہر آگیا۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا اور اس کا رخ نازی کے سر کی طرف تھا۔ ”ہلنا مت ورنہ تمہارے سر میں سوراخ ہوجائے گا۔ میں نے کہا تھا دروازہ مت کھولنا۔“

نورین کانپتے ہوئے بولی۔ ”اس نے... اس نے باہر سے چابی لگا کے دروازہ کھولا... اور اندر آگیا۔“

میں نے نازی سے کہا۔ ”ریوالور نیچے گرادو۔ ہاتھ سے چھوڑ دو... ہاتھ اوپر اٹھایا تو ٹریگر پر میری انگلی دب جائے گی۔“

اس نے تعمیل کی، ریوالور فرش پر گرگیا۔ نورین نے بدحواس ہونے کے باوجود اتنی ہمت اور عقل سے کام لیا کہ ریوالور اٹھالیا حالانکہ اس کا ہاتھ ہی نہیں، پورا جسم کانپ رہا تھا۔ نازی پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتا رہا۔ ”تم... تم آلو سے بچ نہیں سکتے۔“

میں نے کہا۔ ”آلو پہنچ گیا جہنم میں... اپنے اعمال کا حساب دینے۔ اس کی فکر مت کرو۔ یہ ریوالور اسی کا ہے۔“

نازی نے بے یقینی سے ریوالور کو دیکھا۔ ”کیا ثبوت ہے؟“

میں نے ہاتھ گھما کے ریوالور کو اس کے سر پر مارا۔ ”ثبوت کے بچے... میں تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں ورنہ تمہاری لاش کو چلتی گاڑی سے باہر پھینکنا میرے لیے زیادہ آسان تھا۔ سب اپنے اپنے کیبن میں سوئے پڑے ہیں۔ سائلنسر والے ریوالور کے فائر کی آواز تو دن میں بھی باہر نہ جاتی۔“

اس کا چہرہ موت کے خوف سے پیلا پڑگیا۔

”دیکھو... میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ مجھے تو حکم ملا تھا...“

”اسی لیے تمہیں یہ رعایت مل رہی ہے۔ آلو کی... میلوں پیچھے پڑی ہوگی۔ دیکھو، اس وقت گاڑی کی رفتار... ہوگئی ہے۔ شاید کوئی اسٹیشن آنے والا ہے۔ خاموشی سے چلو اور گاڑی سے چھلانگ لگادو۔“

”چلتی گاڑی سے؟“ وہ چلّایا۔

میں نے اس کے منہ پر ریوالور مارا۔ ”آواز نکالنا۔ چانس نہیں لیتا تو پھر مرنے کے لیے تیار ہوجاؤ... رہنے کے لیے جواری بننا منظور نہیں تو تمہاری مرضی۔“

وہ تیزی سے باہر نکل کے دروازے تک گیا اور گاڑی سے کود کے غائب ہوگیا۔ میں اس کے پیچھے دوڑا مگر میرا مقصد کچھ اور تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ کسی دوسرے... میں نہ گھس جائے یا کوریڈور میں شور نہ مچادے کہ اسے... جارہا ہے۔ غالباً اسے میرے عزائم کی پختگی کا یقین آ... کہ میں کسی صورت اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا اور کوئی حرکت کرکے وہ میری دی ہوئی رعایت سے بھی... ہوجائے گا۔ گاڑی سے کود کر اس کے بچ جانے کے امکانات کم تھے مگر تھے۔ اس کی ہڈی پسلی ٹوٹ جاتی مگر وہ زندہ... یا کوئی معجزہ رونما ہوجاتا کہ اسے معمولی خراشیں آتیں اور صحیح سالم اٹھ کھڑا ہوتا۔ یا شاید اس کے دماغ نے کام چھوڑ دیا تھا اور اس نے کسی مایوس جواری کی طرح زندگی داؤ پر لگادی تھی۔

وجہ کچھ بھی ہو۔ جب میں نے اندھیرے میں... سے منزل کی جانب دوڑتی تیزگام کے دروازے سے جھانکا تو مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ باہر ایک سنسناتی بھیانک رات تھی جس میں درختوں کے تاریک سائے مخالف سمت میں بھوتوں کی طرح دوڑتے محسوس ہوتے تھے۔ میں اس کا خیرخواہ نہیں تھا اور یہ دعا نہیں کرسکتا تھا کہ خدا کرے کسی گھاس کے ڈھیر یا کسی نرم جھاڑی، کسی ریت کے ڈھیر... پانی سے بھرے گڑھے میں گر کے سلامت رہا ہو۔ میں... خدا کا شکر ادا کیا جس نے مجھے ایک قاتل سے نجات دلائی... زندہ رہنے کی مہلت عطا کی۔

نورین کو میں نے کیبن کے دروازے سے سر نکال... کے جھانکتے دیکھا اور انگوٹھا کھڑا کرکے مسکرایا۔ یہ اشارہ... کہ میں جیت گیا۔ فتح مند رہا۔ نورین میرے اشارے... اندر غائب ہوگئی تو میں نے باتھ روم کا رخ کیا۔ میرا دوسرا دشمن ابھی وہیں الٹا پڑا تھا جہاں میں اسے چھوڑ گیا تھا۔... درمیان میں کوئی باتھ روم استعمال کرنے نہیں آیا تھا تو اس...

وجہ یہ تھی کہ اس بوگی کے ہر کیبن کا باتھ روم اندر ہی تھا۔ ایک بات مجھے عجیب لگی کہ کھانے کا وقت تھا اور کوئی ویٹر کھانا... کھانا گرم کی آواز لگاتا نہیں آیا تھا حالانکہ ہر ٹرین میں وہ رات پڑتے ہی چکر لگانا شروع کردیتے ہیں اور رات دس گیارہ بجے تک اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ کچھ مسافر کھانا سرِشام کھاتے ہیں تو کچھ دیر سے... اے سی سلیپر والے تو ان کے وی آئی پی گاہک ہوتے ہیں۔

سوال کا جواب بھی فوراً ہی میری سمجھ میں آگیا۔ شاید اس بوگی میں چائے کھانا فراہم کرنے والے وہی تھے جن سے آلو نے اور نازی نے وردی چھینی ہوگی۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ انہوں نے ویٹر سے عارضی استعمال کے لیے وردی مانگی ہو۔ انہوں نے خوشی خوشی اپنی وردی اتار کے دے دی ہو اور خود ان کے کپڑے پہن کر بیٹھ گئے ہوں۔ وردی کے بغیر وہ اپنا کام کیسے کرتے۔ آلو یا نازی انہیں ایک ہزار دے کر صرف ایک گھنٹے کے لیے وردی مانگتے تب بھی وہ نہ دیتے۔ یہ بھی ناقابلِ تصور تھا کہ وردیاں وہ اپنے ساتھ لائے ہوں۔

صاف ظاہر تھا کہ انہوں نے یہ وردی گن پوائنٹ پر چھینی تھی۔ ٹرین میں یہ کام آسان نہ تھا۔ وہ کسی کو ناک آؤٹ کرتے تو پھر کہاں لے جاکر اپنے کپڑے اتارتے اور خود اس کی وردی پہنتے۔ چلتی ٹرین میں یہ کام نہ کسی بوگی میں کیا جاسکتا تھا جو سب فل تھیں اور نہ کوریڈور میں جہاں سے ہر وقت لوگ گزرتے رہتے تھے۔ سمجھ میں آنے والی بات یہ تھی کہ انہوں نے اچانک ریوالور کی مدد سے کسی ویٹر کو ناک آؤٹ کیا اور واش روم میں لے جاکے اس کی وردی اتاری۔ اپنی وردی اسے پہنانا ضروری نہیں تھا۔ لیکن یہ کام خطرناک تھا۔ آخر ایک ویٹر کتنی دیر باتھ روم میں پڑا رہ سکتا تھا؟ وہ خود ہوش میں آجاتا یا کوئی مسافر اسے دیکھ لیتا تو شور مچاتا، زنجیر کھینچ کے گاڑی روکتا اور گارڈ یا پولیس کو بتاتا کہ باتھ روم میں کوئی ننگا پڑا ہے۔ بے ہوش ہے یا مر گیا ہے۔ نہیں... میرے قتل پر مامور دونوں پیشہ ور لوگ تھے۔ وہ ایسی حماقت کے مرتکب نہیں ہوسکتے تھے۔ انہوں نے آسان کام کیا ہوگا۔ دو ویٹرز کو ناک آؤٹ کرکے ان کی وردی اتاری ہوگی اور اپنے کپڑوں کے بنڈل کی طرح انہیں بھی چلتی ٹرین سے باہر پھینک دیا ہوگا۔

یہی وجہ تھی کہ کوئی ویٹر کھانا گرم کی صدا لگاتا ادھر نہیں آیا تھا۔ ایک کو میں نے باہر کودنے پر مجبور کردیا تھا۔ دوسرا یہاں میرے سامنے بے ہوش پڑا تھا۔ مجھ سے پہلے یہی سلوک ان دونوں نے ڈائننگ کار کے دو ویٹرز کے ساتھ کیا ہوگا۔ رات کا اندھیرا چھٹے گا تو روہڑی خانپور کے درمیان تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ریلوے ٹریک کے ساتھ تین لاشیں ملیں گی۔ ممکن ہے اپنی خوش نصیبی سے نازی صرف زخمی ہو۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ اس تیز رفتاری سے دوڑتی تیزگام سے کود کے زمین پر قدم جمانا اس کے لیے ناممکن ثابت ہوا ہوگا۔ وہ بھی لڑھکتا ہوا گیا ہوگا اور اس کے جسم کا جوڑ جوڑ کھل گیا ہوگا۔ اگر ڈائننگ کار کے دو ویٹر قتل ہوئے تھے تو ایک کے قاتل کو بھی قضا لے گئی تھی۔ دوسرا یہاں میرے سامنے پڑا تھا۔ نہیں زیادہ آسان اور بہتر یہ ہوگا کہ میں آلو کو گرفتار کرادوں۔ وہ آلو کو لے جائیں گے تو سنسنی خیز انکشافات کا ایک سلسلہ شروع ہوگا۔ پہلے ڈائننگ کار والے اسے اپنا ملازم تسلیم کرنے سے انکار کریں گے۔ معلوم نہیں یہ کون ہے جس نے ویٹر کی وردی پہنی ہے۔ پھر معلوم ہوگا کہ دو ویٹر غائب ہیں۔ صبح نازی کی لاش ملے گی تو تینوں قتل آلو کے کھاتے میں ڈالے جائیں گے۔ وہ اپنی صفائی میں کیسے کہہ سکتا ہے کہ اس نے پہلے دو قتل وردی حاصل کرنے کے لیے کیے کیونکہ تیسرا قتل اسے چودھری فریدالدین کا کرنا تھا جو ایک عورت کے ساتھ اے سی کے دو برتھوں والے کمپارٹمنٹ میں سفر کررہا تھا۔ اس کی بات کا یقین کون کرے گا۔ خود کنڈکٹر گارڈ بتائے گا کہ اس میں تو ملک عبدالقیوم صاحب اپنی بیگم کے ساتھ سفر کررہے تھے۔ خود میں نے ان کا ٹکٹ چیک کیا تھا۔ نازی کا قتل خود بخود اس کے سر منڈھ دیا جائے گا۔ اب میں دیکھتا ہوں نادر شاہ اسے کیسے بچاتا ہے۔ وہ اپنے دفاع میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اسے تو قتل کا حکم دینے والا نادر شاہ تھا۔ ایسا کہنے کے بعد اسے عدالت سے سزائے موت ہوتی نہ ہوتی، نادر شاہ ضرور مروادیتا۔

میں نے باتھ روم کا دروازہ بند کیا اور واپس اپنے کیبن میں آگیا۔ گھڑی میں رات دس بجے کا وقت تھا مگر میری صورت پر شاید بارہ بجے ہوئے تھے کہ نورین نے مجھے غور سے دیکھا۔

”تم مجھ سے کیا چھپا رہے ہو... اور کیوں؟“ اس نے خفگی کا اظہار کیا۔

میں نے کم سے کم الفاظ کا انتخاب کیا اور اسے بتادیا۔ ”نادر شاہ نے جن کو میرے قتل پر مامور کیا تھا، انہوں نے دو ویٹرز کو مارا اور باہر پھینک کے خود ان کی وردی چڑھالی۔ ایک میرے مشورے پر چلتی ٹرین سے کود گیا تھا۔ دوسرا باتھ روم میں پڑا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں اسے پولیس کے حوالے کردوں۔ تینوں قتل اس کے کھاتے میں...“

"اور اس نے تمہارے بارے میں بتا دیا... پھر؟"
"اس کی سنے گا کون اور اس پر یقین کون کرے گا؟ مسئلہ صرف ایک ہے... نہ میں مدعی بننا چاہتا ہوں اور نہ گواہ کیونکہ میں ہوں ملک عبدالقیوم۔"
"پھر کیا سوچا ہے تم نے؟"
"سوچنے کا موقع کب دیا ہے تم نے۔ میں چاہتا ہوں آلو کے ہوش میں آ کر فرار ہونے سے پہلے پولیس اسے پکڑ لے۔ لیکن یہ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے والا کیس ہے۔ پولیس کو کیسے معلوم ہوگا کہ فلاں باتھ روم میں ایک پیشہ ور قاتل ریلوے کی ڈائننگ کار کے ویٹر کی وردی میں بے ہوش پڑا ہے۔ میں بتاؤں گا تو پولیس پوچھے گی کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا، آپ کا باتھ روم تو آپ کے کیبن میں ہے۔ آپ باہر والے باتھ روم میں کیوں گئے تھے۔ اس کے بعد میرا بیان، نام پتا اور شناختی کارڈ کا چکر۔"
"یہ تو وہی مسئلہ ہے، ایک کشتی میں شیر، بکری اور گھاس کو لے جانے کا۔ خود پولیس پر تو الہام ہونے سے رہا کہ فلاں جگہ سے بندہ پکڑ لو۔ تم کسی چکر میں پڑنا نہیں چاہتے... اور کسی کو معلوم نہیں۔"
میں نے سوچ کے کہا۔ "یہ کام تم کر سکتی ہو نورِ چشم۔"
وہ چیخ مار کے اچھل پڑی۔ "میں... پاگل ہو گئے ہو کیا؟ میرا ویسے ہی بھوک سے دم نکلا جا رہا ہے۔"
"دم کو روکو۔ تمہیں ہمت سے کام لینا ہوگا... پلیز... میری خاطر... میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں۔"
اس نے اپنے پیر پیچھے کر لیے۔ "ڈراما مت کرو۔"
اس کے لہجے سے واضح تھا کہ اس کی قوتِ مزاحمت ختم ہو گئی ہے اور اب وہ میری بات سننے پر تیار ہے۔ "ڈراما تمہیں کرنا ہے۔ ایک ایکٹ کا شارٹ پلے جس میں تمہیں صرف ایک ڈائیلاگ بولنا ہے اور ڈراما ختم۔"
وہ جھنجلائی۔ "سیدھی طرح بات نہیں کر سکتے۔"
میں نے کہا۔ "بس پانچ منٹ کی بات ہے۔ اس کے بعد میں خود ڈائننگ کار سے تمہارے لیے پورا کچن اٹھا لاؤں گا۔ دیکھو... ہم ایک دوسرے کی مدد کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ ہمیں زندہ رہنا ہے اور اس کے لیے دنیا سے مل کے لڑنا ہے جو ہمیں زندہ رہنے کے مواقع سے محروم کرنا چاہتی ہے۔ تم یہ برقع اتار کے رکھو... باتھ روم میں جانا ضروری نہیں... تم ساتھ والی بوگی میں جاؤ... اچھا چھوڑو... چلتی ٹرین میں یہ تمہارے لیے مشکل ہوگا۔"
"درمیان کی جگہ تو ایسے ہلتی ہے جیسے زلزلہ آ رہا ہو۔"
"تم دروازے سے جھانک کے دیکھو... پیچھے بوگی اکانومی کلاس ہے۔ اس کی کھڑکیاں کھلی ہوں گی۔ ممکن ہے کوئی کھڑکی سے منہ نکالے باہر جھانک یا دروازے میں کھڑا ہو... ایک طرف نہیں ہوا تو دوسری طرف ہوگا۔ تمہیں میں پیچھے سے پکڑے رکھوں گا۔ تم ایک چیخ مار کے کہو باتھ روم میں لاش پڑی ہے... اور بس... واپس اپنے کیبن میں دوڑ کے آؤ اور برقع اوڑھ کے بیٹھ جاؤ۔ کسی نے تمہاری صورت دیکھی تو یہی بتائے گا کہ ایک خوب صورت جوان لڑکی چیخ رہی تھی۔ وہ کہاں سے آئی کہاں گئی... یہ کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی نے ہمارے کیبن پر ناک کیا تو میں اس سے نمٹ لوں گا کہ میری پردہ نشین بیوی تو سوئی پڑی ہے۔ مقصد پورا ہو جائے گا۔ گاڑی رک جائے گی اور پولیس یا کوئی اور باتھ روم میں جا کے دیکھ لے گا۔ یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ چیخنے والی لڑکی غلط نہیں تھی۔ وہ لاش نہیں تھی مگر وہ لڑکی کون تھی؟ کہاں سے آئی اور کہاں گئی؟ یہ کسی کو معلوم ہو ہی نہیں سکتا۔ گاڑی کے رکتے ہی میں چلا جاؤں گا ڈائننگ کار والوں کو ڈانٹنے کے شام سے کسی ویٹر نے نہ چائے کو پوچھا ہے اور نہ کھانے کو... جو ہو سب تمہارے لیے آ جائے گا۔ بات سمجھ میں آئی؟"
اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "آ گئی۔"
وہ برقع وہیں چھوڑ کے اٹھی اور مجھ سے آگے آگے کوریڈور میں چلنے لگی۔ اس نے پہلے ایک دروازہ کھولا اور آگے جھک کے پیچھے والی بوگی کو دیکھا۔ اس کا ایک بازو میرے ہاتھ میں تھا۔ دوسرے لمحے میں نے اس کی ہسٹریائی چیخ سنی۔ "باتھ روم میں لاش پڑی ہے... لاش... کسی دو... کی..." اس نے نہ جانے کس سے چلا کے کہا۔ پھر ہم ایک ساتھ واپس لپکے اور اپنے کیبن میں بند ہو گئے۔ جب میں نے دروازے کو اندر سے لاک کیا تو نورین کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور سانس پھولی ہوئی تھی لیکن اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں ایک شوخ چمک... میں نے بے اختیار اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ یہ اضطراری حرکت تھی، بالکل غیر ارادی۔ میں نے اپنے جسم کے ساتھ اس کے جسم کی کپکپی محسوس کیا۔ پھر وہ ایک جھٹکے سے الگ ہو گئی۔
"بس... ٹھیک ہے... تم یہی چاہتے تھے نا..." وہ ہانپ کے بولی۔
میں نے کہا۔ "معاف کرنا، میں جذبات سے بے قابو ہو گیا تھا۔ تم نے واقعی کمال کر دیا... ونڈرفل۔"
گاڑی کو ایک جھٹکا لگا اور اس کی رفتار کم ہونے لگی۔

نورین پکڑے جانے سے بال بال بچی تھی کیونکہ اس کی چیخ پیچھے والی بوگی سے زیادہ ہماری بوگی میں سنی گئی تھی۔ کسی کیبن سے نکل کے کوئی پوچھ رہا تھا۔ "کیا ہوا؟ کون چلا رہا تھا یہاں... کوئی عورت تھی۔" کسی اور نے کہا۔ "آواز تو میں نے بھی سنی تھی... مگر یہاں تو کوئی نہیں۔"
اب میرے باہر نکلنے میں بھی کوئی حرج نہ تھا۔ میں نے بھی کیبن سے سر نکال کے دیکھا۔ دو مرد کوریڈور میں کھڑے تھے۔ میں نے بھی یہی سوال کیا۔ "یہ کون چیخ رہا تھا؟ کوئی عورت تھی..." انہوں نے سر ہلا کے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اگر وہ ذرا پہلے نکل آتے تو نورین کو اندر داخل ہوتا دیکھ لیتے۔
ٹرین رک گئی۔ ایک دم پیچھے والی بوگی سے کچھ لوگ اندر آئے۔ میں کسی کی طرف دیکھے بغیر مخالف سمت میں چل پڑا۔ میرا رخ ڈائننگ کار کی طرف تھا۔ "دروازہ بند کر لو۔" میں نے روایتی شوہروں کے لہجے میں نورین کو حکم دیا۔ "میں دیکھتا ہوں کھانے کے لیے کچھ بچا بھی ہے یا نہیں۔"
کوریڈور میں کھڑے ایک مرد نے بھی گلہ کیا۔ "آج ہمارے ویٹر نہ جانے کدھر مر گئے ہیں۔"
ویٹر واقعی مر گئے ہیں، اسے یہ بات کچھ دیر بعد معلوم ہو جانی تھی۔ میں بے پروائی سے ایک کے بعد دوسری بوگی سے گزرا اور ڈائننگ کار میں پہنچ گیا۔ میں نے وہاں ہنگامہ کیا۔ "کیا بات ہے... مجھے خود آنا پڑا... آج چائے کھانے کو پوچھنے والا کوئی نہیں۔"
جب میں آرڈر دے کر واپس آیا تو بہت کچھ ہو چکا تھا۔ تاریک جنگل میں کھڑی ٹرین کے باہر دوسری بوگیوں کے مسافر جمع تھے۔ سب کے لبوں پر لاش کی بات تھی۔ ریلوے کا عملہ اور پولیس کسی کو قریب نہیں آنے دے رہے تھے۔ انہوں نے باتھ روم میں بے ہوش پڑے آلو کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ میں نے لوگوں کی باتیں ظاہری بے توجہی سے سنیں۔ وہ سب اس لڑکی کے بارے میں سوال کر رہے تھے جو سخت دہشت زدہ تھی اور جس نے چیخ کر اکانومی کلاس کے ایک نوجوان سے کہا تھا کہ باتھ روم میں لاش پڑی ہے۔ وہ نوجوان دروازے میں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے لڑکی کا حلیہ صحیح بیان کر دیا تھا مگر بڑی مشکل میں پڑ گیا تھا کیونکہ وہ لڑکی غائب ہو گئی تھی۔ ریلوے پولیس اب اس پراسرار لڑکی کو تلاش کر رہی تھی۔
جب میں لوٹ کے کیبن میں داخل ہوا تو نورین نے بتایا۔ "پولیس آئی تھی۔"
"اور تم نے انہیں اندر آنے دیا؟"
"اندر کوئی نہیں آیا۔ میں نے برقع اوڑھ کے دروازہ کھولا اور ان کے سوال کا جواب دے دیا۔ لڑکی؟ کون لڑکی... یہاں تو میں ہوں اور میرے میاں ملک عبدالقیوم۔ ابھی باہر نکلے ہیں... میں نے زیادہ عمر کی عورت کی آواز بنا کے بات کی تھی۔ وہ چلے گئے... تم بتاؤ خالی ہاتھ واپس آ گئے؟"
میں نے کہا۔ "کیا خود ٹرے میں تمہارے لیے کھانا لے کر آتا؟ آرڈر دے دیا ہے... ویٹر لائے گا۔"
"آخر کب آئے گا کھانا؟ میرے مرنے کے بعد؟ فاتحہ پڑھ کے تم کھا لینا۔"
اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے ویٹر سے کھانے کی ٹرے لے لی۔ ہمارے کھانا ختم کرنے تک ٹرین پھر چل پڑی تھی۔ آلو پولیس کی تحویل میں تھا اور تہرے قتل کی فردِ جرم اس کے لیے نوشتۂ تقدیر بن گئی تھی۔ مجھے یقین ضرور تھا کہ ہوش میں آنے کے بعد بھی وہ میرا نام نہیں لے سکتا مگر ایک اندیشہ ضرور تھا کہ کہیں اپنے ساتھ وہ مجھے بھی نہ گھسیٹ لے۔ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔ وہ بک نہ دے کہ اے سی سلیپر کے دو والے کیبن میں کوئی مسٹر اور مسز عبدالقیوم نہیں... وہ تو خود جیل کا مفرور مجرم چودھری فریدالدین ہے۔
ٹرین کی رفتار کم ہوئی۔ اس وقت آدھی رات کا وقت تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہاں سے گارڈ کی ڈیوٹی بدلے گی۔ اچانک میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ نئے گارڈ کے آنے سے پہلے مجھے یہ کیبن چھوڑ دینا چاہیے کیونکہ میں واقعی ملک عبدالقیوم نہیں۔ نورین اب اونگھ رہی تھی، میں نے اسے جھنجوڑا۔ "اٹھو... ہم یہاں اتر رہے ہیں۔"
وہ بوکھلا گئی۔ "یہاں... کون سی جگہ ہے یہ؟"
"خانپور... یہاں گاڑی میں پانی ڈالا جائے گا۔ اٹھو... جلدی کرو... وجہ بعد میں بتا دوں گا۔"
چند منٹ بعد میں نورین کے ساتھ پلیٹ فارم پر تھا جہاں حدِ نظر تک ویرانی تھی۔ خالی پلیٹ فارم کی ہر بینچ پر کوئی سو رہا تھا۔ دیوار کے ساتھ کوئی دیہاتی فیملی بکھری پڑی تھی۔ شاید انہیں صبح جانے والی کسی ٹرین سے سفر کرنا تھا۔ آدھی رات کے وقت ٹی اسٹال بھی بند تھے۔ ریلوے کا عملہ اپنی معمول کی کارروائی میں مصروف تھا۔ چند بے خواب مسافر نیچے اتر کے ٹہل رہے تھے۔ میں اپنا اور نورین کا ٹرالی سوٹ کیس کھینچتا ہوا باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھا۔ گیٹ پر کوئی چیکر نہیں تھا۔ گیٹ کے باہر والے حصے میں بھی روشنی

بہت کم تھی اور کچھ دیہاتی فرش پر پاؤں پسارے سو رہے تھے۔ باہر کوئی تانگا رکشا نہ تھا۔ آدھی رات کے وقت یہاں اترنے والا ہی کون ہوتا تھا۔ خود مجھے اس ویرانی میں اترنا ایک حماقت محسوس ہو رہی تھی مگر نہ اترنا شاید ایک خطرناک غلطی بن جاتا۔

نورین نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ''خاور... ہم کہاں جائیں گے... یہاں تو کچھ بھی نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ٹرین نکل جائے... پھر معلوم کرتا ہوں... کوئی ویٹنگ روم ہے یا نہیں۔''

مجھے وہ گارڈ نظر آیا جس نے مجھے ملک عبدالقیوم کی حیثیت سے ٹرین پر جگہ دی تھی۔ اس کی ڈیوٹی ختم ہو چکی تھی مگر اس وقت وہ واپس کراچی نہیں جا سکتا تھا۔ وہاں ڈیوٹی بدلنے والوں کی رہائش کے لیے کمرے تھے جہاں وہ رات سو کر گزار سکتے تھے۔ وہ عملے کے کسی آدمی کے ساتھ باتیں کرتا جا رہا تھا۔ میں پیچھے ہٹ کر تاریکی میں ہو گیا تا کہ اس کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔ ٹرین ابھی روانہ نہیں ہوئی تھی کہ نہ جانے کہاں سے ایک کار کی ہیڈ لائٹس نمودار ہوئیں اور کار اس جگہ آ کے ٹھہر گئی جہاں تانگا اسٹینڈ لکھا ہوا تھا مگر تانگا کوئی موجود نہیں تھا۔ کار سے اترنے والا ڈرائیور شلوار قمیص اور سندھی ٹوپی میں تھا۔ وہ ہماری طرف غور سے دیکھتا ہوا اندر گیا۔ اسی وقت ٹرین نے دوسری وسل دی اور اس کے پہیے حرکت میں آئے۔

ٹرین کے جاتے ہی ویرانی کا تاثر اور گہرا ہو گیا۔ ٹرین سے اترنے والا عملہ بھی اب اپنے اپنے کوارٹرز میں جا چکا تھا۔ اس جگہ جہاں شاید بیس بائیس مرد عورت اور بچے سوئے پڑے تھے، صرف ہم دو تھے جو سامان کے ساتھ کھڑے تھے۔ کار کا ڈرائیور دوبارہ ہمارے پاس سے گزرا تو اس نے پھر ہمیں غور سے دیکھا۔ وہ کچھ پریشان اور مایوس نظر آتا تھا۔

میں نے اسے روک لیا۔ ''بات سنو بھائی... یہاں کوئی ہوٹل ہے؟''

وہ رک گیا۔ ''ہوٹل تو ہے۔ آپ کس کے پاس آئے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''معلوم نہیں، وہ لوگ ہمیں لینے کیوں نہیں آئے۔ میں کراچی سے آیا ہوں۔ ملک خدا بخش میرا رشتے کا ماموں ہے۔ اس نے بیٹے کی شادی میں بلایا تھا۔ اس کی دکان ہے مین بازار میں۔''

''میں خود نیا آیا ہوں ورنہ لوگ یہاں ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ مجھے ایس ڈی او صاحب کی فیملی کو لینا تھا مگر وہ آئے نہیں۔''

''کیا تم ہمیں رات گزارنے کے لیے کسی ہوٹل پر چھوڑ سکتے ہو؟ صبح وہ ہمیں تلاش کر لیں گے۔''

''آپ ادھر ویٹنگ روم میں کیوں نہیں ٹھہر جاتے... آپ کو لینے آئے تو یہاں آئیں گے۔'' نوجوان نے مشورہ دیا۔

''یہ تو ٹھیک ہے... مگر یہاں ویٹنگ روم کہاں ہے؟''

''آپ آؤ میرے ساتھ۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''چوکیدار ہو گا... اس کو بولنا صبح کی گاڑی سے جانا ہے۔ ہو روپے اس کے ہاتھ پر رکھو گے تو وہ خوش ہو جائے گا۔ میں کہوں گا کہ میں لایا ہوں۔ ایس ڈی او کی فیملی ہے۔''

نہیں معلوم وہ ناآشنا مددگار کون تھا جو فرشتۂ غیب کی طرح نمودار ہوا اور ہمیں ویٹنگ روم کے چوکیدار کے حوالے کر کے چلا گیا۔ اس نے ہم پر نہ شک کیا نہ احسان۔ ہماری پریشانی دیکھی تو سرِ راہ مدد کی اور اپنی راہ لی۔ کچھ لوگ کسی کا کوئی کام کر دیتے ہیں اور انہیں خیال بھی نہیں آتا کہ وہ کوئی نیکی کر رہے ہیں۔ چوکیدار بھی اس کا آشنا نہ تھا۔ اس نے ہمارے لیے ویٹنگ روم کھولا اور ہم نے اسے سو روپے دیے تو اس نے ہمیں سو دعائیں دیں۔ پھر مزید انعام کی امید میں اس نے ہم سے پوچھا کہ ہمیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ میں نے ویٹنگ روم کو دیکھا تو اس کے پرانے اسپرنگ والے صوفوں پر گرد تھی اور ہمارے پاس اوڑھنے بچھانے کے لیے کچھ نہ تھا۔

''میں اپنے گھر سے لا دیتا ہوں سائیں۔ میرا کوارٹر قریب ہے۔'' وہ بولا۔ ''اور کچھ...''

نورین نے کہا۔ ''گھر سے چائے بھی لا دو تو بڑی مہربانی۔''

جسمانی تھکن کے ساتھ ذہنی دباؤ اور خوف کی تکان سے میرا حوصلہ جواب دینے لگا تھا۔ نورین تو پھر ایک نازک اندام لڑکی تھی۔ میں نے حالات کی دشمنی اور جیل کی سختی جھیلی تھی لیکن نورین اپنے جرم کا بوجھ اٹھائے پہلی بار ایک اجنبی کے ساتھ دربدر ہوئی تھی۔ اس ریسٹ روم کی ویرانی میں رات گزارنے کا تجربہ اس کے اعصاب کے لیے سخت آزمائش تھا۔ چوکیدار کے جاتے ہی وہ ایک کرسی پر گر گئی۔ میں مردانہ وار سکون کا مظاہرہ کرتا ہوا اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''یہ کیسا ریلوے اسٹیشن ہے، نہ آدمی نہ آدم زاد۔ یہاں تو پینے کا پانی بھی نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''جانِ من... مت بھولو کہ یہ آدھی رات کے بعد کا وقت ہے اور یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ کوئی بڑا شہر نہیں۔ صبح ہونے کے بعد یہاں بھی آبادی نظر آئے گی۔ ویسے تو مین لائن کی ہر ٹرین یہاں سے گزرتی ہے اور رکتی ہے۔''

''پتا نہیں کیوں، مجھے اب ڈر لگ رہا ہے۔ پہلے نہیں لگا تھا۔''

میں نے اسے تسلی دی۔ ''تھوڑی دیر آرام کر لو پھر صبح ہو جائے گی۔''

''صبح کیا ہو گا؟ فرار کا اگلا مرحلہ شروع ہو جائے گا۔ آخر ہم کب تک یوں بھاگتے رہیں گے خاور؟''

میں نے کہا۔ ''تم بہت جلد گھبرا گئی ہو... سمجھو یہ تو آغاز ہے۔ ہم زندہ رہنے کی جدوجہد کر رہے ہیں کیونکہ ہم بے گناہی کے جرم میں مرنا نہیں چاہتے۔''

''مجھے احساس ہے کہ تمہاری جدوجہد میری وجہ سے کتنی مشکل ہو گئی ہے۔ تم اکیلے ہوتے تو جیل سے نکل کے جو کرتے صرف اپنے لیے کرتے۔ میں ایک بوجھ بن گئی ہوں تم پر جو تمہیں زبردستی ڈھونا پڑ گیا۔''

''دیکھو... اب تم ڈپریشن کی طرف جا رہی ہو... ابھی رونا شروع کر دو گی۔ ہسٹریا کا شکار ہو جاؤ گی تو مزید مشکل ہو گی۔ خود کو سنبھالو نورین... ایسی باتوں سے کچھ حاصل نہیں۔ ہم اس لیے ساتھ ہیں کہ یہ ساتھ ہمارے نصیب میں لکھ دیا گیا تھا۔ کیا تم میرے ساتھ آ کے پچھتا رہی ہو؟ یا اپنے حالات کی خرابی کا ذمے دار مجھے سمجھنے لگی ہو؟ حالانکہ اچھی طرح جانتی ہو کہ قصوروار کون تھا...؟'' میں نے جانتے بوجھتے سلمان خان کا نام نہیں لیا۔

میرے جارحانہ انداز نے نورین کو سنبھل کر پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ ''آئی ایم سوری خاور... میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ تم نے ہی تو بچایا ہے مجھے... میری حفاظت کی ہے۔''

''پھر اعتماد کی جگہ ڈر کا کیا جواز ہے؟'' میں نے خفگی سے کہا۔

''شاید یہ ڈر نہیں ہے، بے یقینی ہے... تم اپنے بارے میں سوچ سکتے ہو۔ میں خود کو دیکھتی ہوں کہ کہاں تھی اور اس وقت کہاں ہوں۔ ایک پوری زندگی تھی جو پیچھے رہ گئی ہے، گم ہو گئی ہے۔ ماں باپ نہ سہی... ایک گھر تھا میرا... ایک شہر تھا... اور مجھے مستقبل کا یقین تھا۔ سلمان خان کی صورت میں میری آنکھوں نے سوتے جاگتے جو خواب دیکھا تھا، وہ کہاں گیا۔ آس پاس جو ہے، وہ اَن دیکھا ہے... اجنبی ہے... پرایا اور خوف زدہ کرنے والا ہے۔ نہ کوئی مجھے جانتا ہے، نہ میں کسی کو جانتی ہوں۔ میرا کسی سے رابطہ نہیں۔ مجھے کچھ پتا نہیں کہ اس دنیا میں کیا ہو رہا ہے، جو کبھی میری تھی...''

وہ بولتی جا رہی تھی اور اسے احساس نہ تھا کہ آنسو خود بخود اس کی آنکھوں سے نکل کر رخساروں پر بہنے لگے ہیں۔

یہ اس کا ہسٹریا تھا مگر میں نے پیش بندی سے اس کا زور توڑ دیا تھا۔ آنسو اس کے دل کا غبار تھے جو نکلنا ہی تھا۔ چوکیدار کے نمودار ہونے سے وہ ایک دم سنبھل گئی۔ اس نے یہ ظاہر ہی نہیں ہونے دیا کہ ابھی چند سیکنڈ پہلے وہ رو رہی تھی۔ وہ اٹھ کے کونے میں بنے ہوئے واش بیسن کی طرف چلی گئی اور منہ دھونے لگی۔ چوکیدار نے چائے کی کیتلی اور دو مگ میز پر رکھے جو اس نے انگلی میں ڈال کے لٹکا رکھے تھے۔ پھر کندھے پر سے لپٹا ہوا بستر کا بنڈل اتارا۔ صوفے جھاڑ کے ایک کپڑے سے صاف کیے اور دو لمبے صوفوں پر دو چادریں بچھا کے دو تکیے رکھ دیے۔ دونوں تکیے تیل اور میل سے چکٹ ہو رہے تھے۔ چادر کناروں سے پھٹ رہی تھی لیکن اس وقت آرام کا یہ انتظام کسی انعام سے کم نہ تھا۔ چوکیدار اوڑھنے کے لیے دو کھیس لایا تھا جو کھڈی کے بنے ہوئے اور نسبتاً صاف تھے۔

میں نے کہا۔ ''چاچا... تم نے بڑی نیکی کمائی اس وقت ہماری مدد کر کے۔''

وہ دانت نکالنے لگا۔ ''سائیں ہمارا کام ہے خدمت کرنا۔''

''یہ بتاؤ کہ اسٹیشن اتنا سنسان کیوں ہے؟''

وہ بولا۔ ''رات کو ہوتا ہے... ٹرین سے اس وقت اترنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ صبح پسنجر ٹرینوں سے لوگ آتے ہیں ورنہ بس ویگن میں آنا جانا کرتے ہیں۔''

''اس کے بعد بھی کوئی ٹرین ہے؟''

''ہاں جی... کراکرم لیٹ ہے... دو بجے آتی ہے... صبح چار بجے آئے گی۔ کراچی ایکسپریس ادھر سے لیٹ روانہ ہوئی ہے۔ اب سنا ہے صبح آٹھ نو بجے گزرے گی... پھر خیبر میل...''

میں نے کہا۔ ''کراچی ایکسپریس کے لیے ادھر سے برتھ ملے گی... لاہور کے لیے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ تو ٹرین پر گارڈ ہی دے گا۔ ٹرین سے ایک گھنٹا پہلے ہی میں آپ کو جگا دوں گا۔''

چوکیدار چلا گیا تو نورین میرے پاس آ بیٹھی۔ اس کا

چہرہ دھل کر تروتازہ اور شگفتہ نظر آنے لگا تھا۔ اس نے اپنے بال سنوارنے کے بجائے کھول دیے تھے۔ گھنے سیاہ بالوں کے فریم میں اس کا دمکتا، گلابی میں سنہرے پن کی جھلک رکھنے والا چہرہ، اس کی بڑی بڑی کاجل بنا کالی کجراری آنکھیں اور سرخ گلاب جیسے ہونٹ جن پر اس نے زنانہ عادت کے مطابق لپ اسٹک پھیرلی تھی... ایک نظر نے پل بھر کے لیے مجھے مسحور کردیا مگر جذبات پر احساسِ ذمے داری غالب رہا۔ یوں بھی حسین عورت کو خراجِ تحسین کے لیے الفاظ کی ضرورت کہاں ہوتی ہے۔ وہ تو مرد کی ایک پُرستائش نظر میں اپنے لیے پوری غزل پڑھ سکتی ہے۔ نورین نے مسکرا کے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ ''ناراض ہو مجھ سے...؟''

میں مگ میں چائے ڈال رہا تھا۔ کیتلی کی ٹونٹی سے تھوڑی سی چائے باہر میرے ہاتھ پر گری۔ ''اپنی زندگی سے کون ناراض ہوسکتا ہے۔'' میں نے بے اختیار کہہ دیا۔ ''میرا مطلب ہے... تم سے میں کیسے ناراض ہوسکتا ہوں... ناراض ہو کے میں کہاں جاؤں گا... لو چائے پیو۔''

اس نے چائے مجھ سے لے لی مگر اس کی ایک حیا آلود سنجیدگی نے مجھے احساس دلایا کہ میرے الفاظ نے اس پر میرے دل کا راز افشا کردیا ہے۔ شاید جذبات کا یہ اظہار فطری تھا۔ آخر کیسے ممکن تھا کہ وہ اتنی حسین ہوتی... میرے ساتھ ہوتی... میرے اتنے قریب ہوتی اور میں کچھ بھی محسوس نہ کرتا۔ خود اپنے آپ سے انکار ناممکن تھا کہ میں ذمے داری کو ڈھال بنا کے اس سے بچنے کی پوری کوشش کررہا تھا مگر اس کے دامِ حسن اور اس کی قربت کے احساس نے مجھے اس حقیر کیڑے کی طرح جکڑ لیا تھا جس کے گرد مکڑی جالا بُن دے اور عنبتی چلی جائے... یہ کہنا مشکل تھا کہ اسے میری بات اچھی لگی یا بری... مگر میں نے آئندہ زیادہ محتاط رہنے کا فیصلہ کیا۔

''چائے پی کے اچھا لگا۔'' وہ مجھے سوچ میں گم پا کے بولی۔ ''میں کوشش کرتی ہوں کہ نیند آجائے... تم بھی سوجاؤ۔''

میں نے صوفے پر لیٹ کر سونے کی کوشش کی مگر کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ میں صرف نورین کے بارے میں سوچ رہا ہوں اور میرے سامنے اس کا وہ روپ ہے جو کسی نئی تصویر کی طرح میرے تصور میں جم گیا تھا۔ نورین کے اندیشے غلط نہ تھے۔ وہ اپنی پرانی دنیا سے بے تعلق ہو کے میرے ساتھ ایک نئی دنیا میں پہنچ گئی تھی۔ سلمان خان اب کسی دنیا میں نہ تھا۔ نورین کو ابھی اس کی خبر نہ تھی مگر بالآخر گزشتہ زندگی سے خیال کا یہ آخری رشتہ بھی ٹوٹ کے ختم ہونا تھا۔ پھر اس کو میرے ساتھ رہنا تھا۔ اس کے پاس اور کوئی چوائس ہی نہیں تھی اور میرے لیے تو وہ پہلی اور آخری چوائس ہوتی۔ خواہ میرے پاس دس چوائس اور ہوتیں... جلد بدیر... یہ ہونا تھا اور ایسا ہی ہونا تھا۔ پہلی بار میں نے اطمینان محسوس کیا کہ میرا حریف یا رقیب سلمان خان اب موجود ہی نہیں۔

میری آنکھ چوکیدار کے ہلانے سے کھلی۔ ''صاب... جانا ہے تو تیاری کرو... ابھی آدھا گھنٹا ہے کراچی ایکسپریس میں۔''

میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا اور میری نظر کلائی کی گھڑی پر گئی۔ ''ساڑھے سات بجے ہیں۔ اچھا کیا تم نے جگا دیا۔''

میری آواز پر نورین نے چادر سے سر نکالا اور دوپٹا سر پر لے کر اٹھ بیٹھی۔ پہلے میں نے ہاتھ منہ دھویا پھر نورین نے۔ باہر اس وقت رات کے مقابلے میں بہت چہل پہل تھی۔ دو ٹی اسٹال بھی کھل گئے تھے۔ چوکیدار نے چائے کے ساتھ ہمیں پوری حلوہ بھی لاکے دیا اور بتایا کہ یہ اس کی گھر والی روز بناتی ہے... وہ چائے والے کے پاس رکھوا دیتا ہے۔ سو پچاس کی آمدنی ہو جاتی ہے۔

ناشتا کرتے ہوئے نورین نے پوچھا۔ ''یہاں سے کہاں جائیں گے ہم؟''

''جہاں تقدیر لے جائے... اس کے سوا میں کیا کہوں... کس شہر کا نام لوں۔'' میں نے کہا۔

''کل رات جو تیز گام میں ہوا... وہ اخبار میں بھی آیا ہوگا۔''

میں نے مسکرا کے کہا۔ ''ابھی چند گھنٹے گزرے ہیں ان واقعات کو... خبر ملنے سے خبر کے شائع ہونے تک کتنا وقت لگتا ہے، اس کا انحصار پولیس پر ہے... اور اس بات پر کہ واقعہ کہاں پیش آیا ہے... لاہور، کراچی یا اسلام آباد کی خبر رات بارہ بجے کی ہو تو صبح اخبار سے مل جاتی ہے ورنہ خبر کا سفر سست ہوتا ہے۔ بعض اوقات خبر کی قبر وہیں بنادی جاتی ہے اور کسی کو پتا نہیں چلنے دیا جاتا۔''

وہ جیسے خیالوں سے نکل کے بولی۔ ''راحت کے قتل کی خبر تو بنی ہوگی۔''

''ہاں، سکھر کوئی گاؤں نہیں ہے۔ لیکن اس رات ایک بڑی خبر نے سب چھوٹی خبروں کو نگل لیا تھا۔''

اس نے سوالیہ نظر اٹھائی۔ ''کون سی خبر؟''

''جس کا خالق آپ کا یہ خادم تھا۔'' میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کے سر جھکایا۔ ''جیل توڑ کے ڈاکوؤں اور دیگر

قیدیوں کے فرار کرانے کی خبر۔''

''وہ بھی چھوٹے شہر کی خبر تھی۔''

''مگر اس جیل میں صرف سکھر کے قیدی نہیں تھے۔ خطرناک قیدیوں کو ادھر سے اُدھر کردیا جاتا ہے۔ میں نے بلوچستان میں مچھ کی جیل دیکھی ہے... ویران ریگستان ہے چاروں طرف۔ کوئی بھاگ کے کہاں جائے گا۔ جیل کے واقعے میں پولیس، جیل خانے کے حکام اور خود وزارتِ داخلہ والے ملوث ہوگئے ہیں۔ بڑے شہر کے اخباروں کو مسالا مل گیا ہے۔ ایسے میں چھوٹے شہر کی بڑی خبر بھی پیچھے رہ جاتی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کچھ نہیں چھپا ہوگا میرے بارے میں؟''

''یار! میں دیکھے بغیر کیا بتاؤں۔ قتل تو آج کل خبر ہی نہیں۔ ہر جگہ، ہر شہر قصبے اور گاؤں میں وہی جھگڑے ہیں زر، زن، زمین کے۔ لوگ بھی انٹرسٹ نہیں لیتے۔ شاید کسی نے چٹپٹی بنا کے لگادی ہو کہ دولہا کو قتل کرکے دلہن فرار... آشنا کی تلاش میں پولیس کے چھاپے۔''

وہ چونکی۔ ''کیا مطلب... قتل کا شک سب سے پہلے کس پر ہوگا... سلمان نے تو کچھ نہیں کیا۔''

''کیا چچا نے انہیں بتایا نہیں ہوگا، اخبار والوں کو اور پولیس کو... کہ تمہارے سلمان خان سے مراسم تھے اور تم اسی سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔ عام طور پر انجام یہی ہوتا ہے۔ لڑکی اپنے آشنا کے ساتھ مل کر قتل کراتی ہے اور دونوں بھاگ جاتے ہیں۔''

''لیکن سلمان تو دبئی گیا ہے، کاروبار کے سلسلے میں... وہ فرار تو نہیں ہوا ہے۔'' نورین نے کہا۔

''یہ مجھے معلوم ہے یا تمہیں... پولیس تو اسے فرار ہی قرار دے گی نا... جب وہ نہیں ملے گا۔''

''اس کا مطلب ہے دبئی سے واپس آیا تو وہ گرفتار کرلیا جائے گا؟''

''یہ ہوسکتا ہے لیکن فکر کی کیا بات ہے۔ وہ اپنی بے گناہی ثابت کرسکتا ہے۔''

وہ چلائی۔ ''بے گناہی ثابت ہونے تک تو پولیس اس سے اقبالِ جرم کرالے گی۔''

میں نے کہا۔ ''چلانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تم اسے بچانا چاہتی ہو تو خود کو پولیس کے حوالے کردو اور سچ بتادو۔ میرے ساتھ خوار پھرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر کیا اب اس کے بعد سلمان تمہیں بچائے گا۔ تم سے شادی کرے گا؟ وہ تو تمہیں بھی کچھ بتا کے نہیں گیا۔ میرا خیال ہے مجھ سے بھی جھوٹ بولا اس نے۔ وہ واقعی بھاگ گیا ہے اور اب لوٹ کے نہیں آئے گا۔''

''ایسا مت کہو خدا کے لیے۔'' اس کی آنکھوں میں ایک دم آنسو امڈ آئے۔

''دیکھو، حقائق سے نظر چرانے والے بے وقوف ہوتے ہیں اور وہی مارے جاتے ہیں۔ دیکھو خود کو... صرف اس پر بھروسا کرکے تم نے کیا پایا۔ جذبات سے میں بھی مغلوب ہوجاؤں تو عقل سے کون کام لے گا۔ میں نہ تم پر کوئی احسان کررہا ہوں نہ سلمان پر۔ میں مجبور ہوں، تمہیں چھوڑ سکتا ہوں اور نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گا اور ہم ایسے ہی بھاگتے رہیں گے۔''

''تمہارا احسان ہے مجھ پر۔ تم نے ہی بچایا ہے۔ سلمان نے واقعی بڑی زیادتی کی... مجھے بلایا اور خود بتائے بغیر نکل گیا۔ اب میں اس سے رابطہ بھی کروں تو کیسے؟''

''کسی سے رابطہ کیا تو سمجھو ہم پکڑے گئے۔ فون کال فوراً ٹریس کرلی جائے گی۔'' میں نے اسے ڈرانے کے لیے کہا ورنہ خود اپنی پولیس کی سراغ رسانہ صلاحیت کا مجھے اندازہ تھا۔ کوئی مخبری کرے تو مجرم کو پکڑ لیتے ہیں ورنہ سراغ لگانا انہیں نہیں آتا۔

''سنو، کل پرسوں کے اخبارات اگر مل جائیں...''

''کہاں سے مل جائیں... پرانے اخبار صرف اخبارات کے آفس سے ملتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''سکھر کے اخبارات میں خبر ضرور ملے گی۔ اگر تم کوشش کرو...''

''مجھے تو سکھر کے کسی اخبار کا نام نہیں معلوم... اور وہ ملے گا بھی صرف سکھر میں۔ یا شاید کسی لائبریری میں۔'' میں نے کہا۔ مجھے ڈر تھا کہ نورین کا تجسس یا خوف اسے اخبار دیکھنے پر اکسائے گا۔ کسی حد تک میں نے اس امکان کو ختم کردیا تھا کہ وہ سکھر کے اخبار میں قتل کی خبر تلاش کرے اور اسے سلمان کی لاش دریافت ہونے کی خبر مل جائے۔ میں کافی حد تک اسے سلمان سے بدظن کرنے کی کوشش میں بھی کامیاب ہوا تھا۔ خفا اور برہم وہ پہلے سے تھی کہ سلمان وعدہ کرکے نہیں آیا تھا اور میں نہ جاتا تو وہ کہاں جاتی۔ میری ذمے داری اور ''شرافت'' نے اسے یقیناً متاثر کیا تھا۔ اب میں اپنے منہ سے اپنی مردانہ وجاہت اور پرکشش شخصیت کی کیا تعریف کروں لیکن سابقہ تجربات ایسے ہی تھے کہ لڑکیاں مجھ سے متاثر ہوجاتی تھیں۔ میرا ماضی کا ریکارڈ کوئی پاک

بازی کی سند نہیں بنتا تھا۔ دل میں نے ایک بار لگایا تھا مگر دل لگی کم نہ کی تھی۔

اپنی پہلی محبت کو میں بھولا نہیں تھا جو اب پرانی بات ہو چکی تھی۔ اتنی پرانی کہ اب نہ وہ خیالوں میں آتی تھی اور نہ خوابوں میں۔ یہ خبر ضرور آتی تھی کہ وہ دوسرے بچے کی ماں بن چکی ہے اور بچوں کی تعداد کے ساتھ اس کے وزن میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کا ثبوت کسی تقریب میں اس کی تازہ تصویر دیکھ کے ملا تھا۔ نورین دوسری لڑکی تھی جس نے کمانڈوز جیسی برق رفتاری سے میرے جذبات کی دنیا پر قبضہ کیا تھا۔ اگرچہ عقل کا قبضہ پوری طرح ختم نہیں ہوا تھا لیکن اب مجھے اپنی نیت پر شک ہونے لگا تھا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں، بے سبب نہیں۔ میں اپنی شرافت، کردار اور ذمے داری کے جذبے سے اس کو متاثر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ چاہتا ہوں کہ وہ سلمان کے فریب خیال سے نکل آئے اور اس کی جگہ مجھے خیالوں میں بسالے۔

ایسا سوچنا یا چاہنا کسی طرح بھی غلط نہ تھا۔ سلمان کا وجود صرف نورین کے خیال میں رہ گیا تھا اور میں اسے وہاں سے نکال سکتا تھا۔ پھر میری جگہ کون لے سکتا تھا؟ وہ میرے ساتھ تھی۔ پوری طرح میری تحویل میں تھی اور میرے تابع تھی۔ بات صرف وقت کی تھی جو گزر جاتا ہے اور گزر رہا تھا۔ انتظار مجھے اس وقت کا تھا جب میری خواہش ایک حقیقت بن جائے۔ نورین خود مجھے سلمان کی جگہ دے دے۔ نورین کو نہ سہی مجھے یہ ناگزیر نظر آتا تھا۔ تب تک صبر اور ضبط کا مظاہرہ میرے مفاد میں تھا۔

چوکیدار نے میرے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ ”اور کچھ لا دوں سر؟“

چائے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔ ”اگر چائے مل سکے بالکل گرم...“

”کیوں نہیں سر! ابھی آپ آرام سے بیٹھو، ادھر کوئی آنے والا نہیں ہے۔ ٹرین کا ابھی کچھ پتا نہیں اور کتنا لیٹ ہو گا۔“ وہ چائے کے برتن سمیٹ کر نکل گیا۔

نورین نے اپنے خیالوں سے نکل کے پوچھا۔ ”خاور! ان کی لاشیں تو اب تک اٹھالی گئی ہوں گی؟“

”ظاہر ہے۔“ میں نے گھڑی دیکھ کے کہا۔ ”دن چڑھے دیر ہوئی۔“

”وہ کیا نام تھا اس کا... آلو... بڑا عجیب لگتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اصل نام تو علاؤ الدین تھا۔“

نورین بولی۔ ”کیا وہ ہوش میں آنے کے بعد تمہارا نام نہیں بتائے گا... تمہیں اس سے خطرہ محسوس نہیں ہوتا؟“

میں نے کہا۔ ”نورین جان... خطرہ محسوس کیا تھا تو اسی لیے ٹرین سے اتر گیا تھا۔“

”خطرہ تو اب بھی ہے۔ کیا لاہور یا کراچی کی پولیس مفرور قیدیوں کی گرفتاری کے لیے زیادہ مستعد نہیں ہو گی؟“

میں نے کہا۔ ”یاد رکھو... خطرہ ہمیشہ اور ہر جگہ ہمارے ساتھ ہو گا۔ لیکن تمہاری بات غور طلب ہے۔ کیوں نہ ہم پہلے ہی اتر جائیں۔“

”پہلے کہاں... مجھے تو کچھ پتا نہیں اس راستے کا۔“

میں نے کہا۔ ”لاہور سے پہلے ساہیوال یا اوکاڑہ ہے۔ لاہور چھاؤنی کا اسٹیشن بھی ٹھیک ہے۔ اب یہ معلوم نہیں کہ تیز گام کا وہاں اسٹاپ ہے یا نہیں۔“

”تم کسی کو جانتے ہو وہاں؟“

”اگر جانتا تب بھی اس سے دور رہتا۔ لیکن تم اس آگے کی مت فکر کرو۔ پہلے ہم کہیں سیٹل ہو جائیں۔“

اس نے اپنا بیگ میری طرف بڑھایا۔ ”اس میں جو نقد رقم ہے اور میرا زیور ہے... یہ تم لے لو۔“

میں ہنس پڑا۔ ”کیا کروں تمہارے زیور کا... پہن لوں؟ بابا مجھے ضرورت پڑے گی تو کہہ دوں گا۔ ابھی میرے پاس بہت ہے اور یہ مت بھولو کہ تم میری ذمے داری ہو۔ میں تمہاری ذمے داری نہیں ہوں۔“

”اس لیے مجھے تمہاری فکر زیادہ ہے۔ میں کیا کروں گی... کہاں جاؤں گی اگر تم پکڑے گئے۔“

چوکیدار پھر اندر آیا۔ ”لو صاب! ایک دم تازہ اور گرم چائے لایا ہے آپ کے واسطے۔“

میں نورین کے اور اپنے لیے چائے انڈیل رہا تھا کہ باہر والا دروازہ آہستہ سے چرچرا کے اندر کی طرف کھلا۔

”شاید ہوا ہو گی۔“ میں نے کہا اور نظر اٹھا کے دیکھا۔ دروازے سے نازی اندر آ گیا۔ وہ نازی جس کو میں نے چلتی گاڑی سے باہر کودنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کیتلی کی ٹونٹی سے گرنے والی گرم چائے میرے ہاتھ پر گری۔ پھر نورین نے ایک چیخ ماری اور سلور کی کیتلی میرے ہاتھ سے گر گئی۔

”نازی...“ میں نے کہا اور بے اختیار میرا ہاتھ اپنی پاکٹ سے ریوالور نکالنے کے لیے بڑھا۔ ”یہ... تم ہو...“

وہ پلک جھپکائے بغیر میری طرف بڑھتا رہا۔ ”ہاں، ایسے مت دیکھو مجھے۔ میں نازی کا بھوت نہیں ہوں۔“

یکلخت مجھے ہوش آ گیا۔ ”رک جاؤ وہیں ورنہ میں گولی مار دوں گا۔“

وہ اسی طرح سوئے ہوئے شخص کی طرح چلتا گیا۔ ”ایک دفعہ تو مار چکے ہو پھر مار دو... ڈرتے کیوں ہو... چلاؤ گولی۔“

نورین نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”نہیں خاور! گولی مت چلانا، خدا کے لیے...“

وہ ہم سے چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ ”کیوں روکتی ہو اسے بہن... میں اس کا مجرم ہوں۔ تمہارا شوہر ایسا ہی سمجھتا ہے۔ بدلہ لینا اس کا حق ہے۔“

میں نے نفرت سے پھنکار کے کہا۔ ”تم ایک سفاک قاتل ہو۔ میرے بھائی کی موت کا زخم آج بھی تازہ ہے۔ میں نے اس کے بے گناہ خون کی قسم کھائی تھی کہ کسی قاتل کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”میں مرنے کے لیے تیار ہوں۔ بس سزائے موت دینے سے پہلے میری ایک بات سن لو۔ مجھے پانچ منٹ کی مہلت رحم کی بھیک سمجھ کے دے دو۔ اسے میری آخری خواہش سمجھ لو۔“

نورین نے ایک دم میرے ریوالور والے ہاتھ کو پکڑ لیا۔ ”خدا کے لیے اس کی بات سن لو۔“

”یہ جھوٹا اور مکار شخص ہے۔ میں اس کو زندہ نہیں چھوڑ سکتا۔“ میں نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر نورین نے اب میرے بازو کو گرفت میں لے لیا تھا اور بری طرح مجھ سے چمٹی ہوئی تھی۔ یہ ایک خطرناک صورت حال تھی جس میں گولی چل جاتی تو نورین کو بھی زخمی کر سکتی تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے اپنی جگہ کھڑا تھا۔

”دیکھو، گولی چلے گی تو... دوسرے لوگ آ جائیں گے۔ یہ قتل کر کے تم بچ نہیں سکتے۔“ اچانک نورین نے میرے بازو پر کاٹ لیا تھا۔ اس کے باوجود میں نے ریوالور نہیں چھوڑا مگر اس کا رخ نیچے کی طرف رکھا۔

میں نے دوسرے ہاتھ سے نورین کے بال پکڑ لیے۔ ”چھوڑ مجھے الو کی پٹھی... کتیا...“ میں نے اسے جھٹکے دے کے کہا۔

نورین کے دانت تو جیسے میرے گوشت میں گڑ گئے تھے۔ ”میں... میں نہیں چھوڑوں گی۔ مارنا ہے تو مجھے مار دو۔ تم اس طرح کسی کو میرے سامنے قتل نہیں کر سکتے۔ تم اس کی بات تو سنو۔ وہ بہن کہہ رہا ہے مجھے کتنی عاجزی سے۔“

”یہ سب اس کی ریاکاری ہے۔ اس سفاک قاتل کے لیے کسی رشتے کی اہمیت نہیں۔ خدا کے لیے چھوڑو مجھے۔“ میں نے درد کی اذیت سے تڑپ کے کہا۔

اس نے ریوالور پر ہاتھ ڈال دیا۔ ”یہ... یہ مجھے دے دو۔“

اس کی دیوانگی اور وحشت کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ جب اس نے لب کھولے تو اس کے ہونٹوں پر میری رگوں سے پھوٹنے والے خون کی لالی تھی۔ میری گرفت کمزور پڑ گئی تھی۔ ریوالور نیچے گرا تو اس نے اٹھا لیا۔ نورین کے سارے بال بکھر گئے تھے۔ میں نے اسے بڑی بے رحمی سے جھٹکے دیے تھے۔ اس کشمکش میں شانے پر سے اس کی قمیص بھی پھٹ گئی تھی۔ جب اس نے میری طرف دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں کسی آدم خور درندے جیسی وحشت نظر آئی۔ پھر وہ چکرا کے گری اور میں نے اسے بڑی مشکل سے سنبھال کر صوفے پر لٹایا۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ نازی پتھر کا بت بنا یہ سب کچھ پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔

”خاور! یہ تمہارا خون ہے... میں نے، میں نے تمہیں زخمی کر دیا۔“ نورین نے ایک دم میرا ہاتھ چوم لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ”معاف کر دو مجھے... میں نے تمہیں زخمی کر دیا۔“ وہ اب شدید ہسٹریا کے دورے کا شکار ہو چکی تھی۔

”نورین! مجھے کچھ نہیں ہوا۔ خود کو سنبھالو۔ دیکھو میں ٹھیک ہوں۔“ مگر وہ میرے بازوؤں میں جھول گئی۔

نازی نے آہستہ سے کہا۔ ”اسے لٹا دو، یہ ابھی ہوش میں آ جائے گی۔“

میں نے اس پر ایک زہر آلود نگاہ کی۔ وہ اپنی جگہ پر سکون سے کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے نورین کو لٹا دیا۔ اس نے میز پر سے پانی کا گلاس اٹھایا اور جھک کر نورین کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ ”اس کا منہ صاف کرو۔“

نفرت اور انتقامی جذبات کی اس آگ کے باوجود جو مجھے جلا رہی تھی، میں نے گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر نورین کے دوپٹے کا ایک کونا تر کیا اور آہستہ آہستہ اس کے ہونٹ صاف کرنے لگا۔ پھر اسی بھیگے ہوئے کونے سے میں نے اپنا ہاتھ بھی صاف کیا جس کی پشت پر دو جگہ دانت گڑ جانے سے ننھے ننھے زخم بن گئے تھے اور ان سے رسنے والا خون وہیں جم گیا تھا۔

میں نے قریب کھڑے نازی کو دور دھکیلا۔ ”جاؤ... دفع ہو جاؤ... اس سے پہلے کہ میرے انتقام کی آگ کے شعلے پھر بھڑکنے لگیں۔“

وہ تلخی سے مسکرایا۔ ”اب تم کچھ نہیں کر سکتے۔ فیصلے کا لمحہ گزر گیا۔“

"شٹ اپ۔ ایک عورت آج تمہارے اور میرے درمیان حائل ہوگئی اور تم بچ گئے۔ قسمت نے آج تمہارا ساتھ دیا۔"

"قسمت نے تمہارا ساتھ دیا۔ تم بچ گئے۔" وہ بولا۔ "ورنہ اس پانی کے گلاس کی جگہ کیا میں ریوالور نہیں اٹھا سکتا تھا؟"

میں نے بے وقوفوں کی طرح فرش پر پڑے ریوالور کو دیکھا۔ "پھر تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟"

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ "تم خود سوچو... تم تو مجھے مار چکے تھے۔ تم نے مجھے چلتی ٹرین سے چھلانگ لگانے پر مجبور کیا تھا۔ جانتے ہو اس وقت تیز گام کی رفتار کیا تھی۔ ان دونوں ویٹرز کی ہڈیاں چور چور ہوگئی ہوں گی جن کو ہم نے وردی چھیننے کے بعد ننگا کر کے باہر پھینکا تھا۔ مگر تم دیکھ سکتے ہو، میرے جسم پر وہی وردی ہے اور کوئی خراش نہیں ہے۔"

"یہ... یہ سب کیسے ہوا؟" میں نے ایک گہری سانس لی۔

"میں نے دوڑ لگائی تھی... چند سیکنڈ کی مہلت حاصل کرنے کے لیے ورنہ تم خود مجھے دھکا دیتے۔ پھر میں نے واقعی جوا کھیلا تھا اور زندگی کو داؤ پر لگا دینے والا میرے جیسا گناہ گار جواری اس لیے جیت گیا تھا کہ خدا کی طرف سے دی جانے والی زندگی کی مہلت ابھی تمام نہیں ہوئی تھی۔"

وہ ذرا سی دیر کے لیے خاموش ہوا تو مجھے ایک احساسِ شرمندگی و پشیمانی نے گھیر لیا۔ اس کی بات میرے احساس پر تازیانہ بن کے لگی۔ آخر کس زعم میں تھا میں کہ میں نے اس کی جان خود نہیں لی۔ اسے شوٹ نہیں کیا کیونکہ اس طرح قتل کا گناہ اور عذاب مجھ پر آتا، میں نے اسے خودکشی کا حکم دیا۔ اس یقین کے ساتھ کہ میں نے اس کے لیے زندگی کو ناممکن بنا دیا ہے۔ اسّی میل فی گھنٹا کی رفتار سے دوڑنے والی ٹرین سے اندھیری رات کی ویرانی میں چھلانگ لگانے کے بعد اس کے زندہ بچ جانے کے امکانات صفر تھے۔ لیکن وہ زندہ سلامت میرے سامنے موجود تھا۔ یہ احساس دلا رہا تھا کہ (نعوذ باللہ) میں خدا نہیں ہوں جو زندگی دیتا ہے تو لے بھی سکتا ہے۔

میں نے شکست خوردہ لہجے میں اس سے سوال کیا۔ "آخر یہ کیسے ہوا... تم کیسے بچ گئے؟"

اس نے کہا۔ "جیسے ابھی بچ گیا۔ تم خواہش اور ارادے کے باوجود مجھ پر گولی نہیں چلا سکے۔"

میں نے برہمی سے کہا۔ "تم نے ایک سیدھی [illegible] عورت کی جذباتی کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔ اسے [illegible] کے۔"

وہ مسکرایا۔ "تم بھول رہے ہو۔ پہلی بار شاید [illegible] ہوگیا۔ حالانکہ یہ میری نیت نہیں تھی مگر دوسری بار تمہارا [illegible] پکڑنے والا کون تھا؟ ریوالور نیچے پڑا تھا اور میں [illegible] اٹھا سکتا تھا۔ جو گولی تم مجھ پر چلانا چاہتے تھے، وہی تمہارا [illegible] تمام کر سکتی تھی۔ تمہیں مان لینا چاہیے کہ تم کوشش اور خواہش کے باوجود مجھے قتل نہ کر سکے۔ اور میں نے نادر شاہ کے حکم [illegible] مجبوری کے باوجود ایسا نہیں کیا۔"

اس کی دلیل نے مجھے لاجواب کر دیا۔ اس حقیقت سے انکار ممکن ہی نہ تھا۔ میں نے ہارے ہوئے جواری کی طرح کہا۔ "اچھا... اب یہ بھی بتا دو کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

وہ کچھ دیر نورین کو دیکھتا رہا۔ "تم چاہے نہ مانو، میں جذباتی ہوگیا تھا اس لڑکی کو دیکھ کر۔ اور اب بھی ہوں۔ آج تک میں نے کسی کو اپنی بہن نہ کہا، نہ سمجھا۔ ہر لڑکی میرے لیے صرف لڑکی تھی۔ ہر عورت صرف عورت لیکن اسے دیکھ کر... کیا نام ہے اس کا؟"

"نورین..." میں نے کہا۔

"نورین کو دیکھ کے ایک دم مجھے کچھ ہوگیا۔ مجھے ایسا لگا کہ میری وہ بہن میرے سامنے آکھڑی ہوئی ہے جسے میں نے برسوں پہلے خود قبر میں اتارا تھا۔ تم شاید یقین نہیں کرو گے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ ایک جذباتی تجربے سے تم کبھی گزرے ہی نہیں تو تم اسے کیسے سمجھ سکتے ہو۔ لیکن یہ دیکھو، کون ہے یہ؟" اس نے پتلون کی جیب میں سے اپنا پرس نکالا جو نوٹوں سے پھولا ہوا تھا۔ اس نے ایک پاکٹ میں شفاف پلاسٹک کے فریم سے جھانکتی نورین کی تصویر میرے سامنے کر دی۔

میں نے اس سے پرس لے لیا اور نورین کی اس تین انچ لمبی اور دو انچ چوڑی رنگین تصویر کو گھورتا رہا جس میں وہ اپنی معصوم ادائے حسن کی شوخی کے ساتھ مسکرا رہی تھی۔ اس کے بال دوپٹے میں چھپ گئے تھے جو اس کے حسین چہرے کے گرد ایک مقدس سرخ ہالے کی طرح لپٹا ہوا تھا۔ تصویر کے رنگ کچھ مدھم پڑ گئے تھے لیکن اس کے نقوش وہی تھے جو آج کی نورین کے تھے۔ میں نے تصویر کو دیکھا پھر صوفے پر آنکھیں بند کیے خاموش لیٹی نورین کی صورت کو دیکھا اور نازی کے سچ کو تسلیم کر لیا۔

"یہ تمہاری بہن ہے۔" میں نے پرس اسے واپس کیا۔

"یہ نہیں... تھی۔ اس کا نام تھا پروین۔ میں اسے پری کہتا تھا اور وہ ننھی سی پری، پرستان چلی گئی۔ یہ کمینی، بے رحم اور ہوس پرست دنیا اس کے لائق نہیں تھی۔ تم کہتے ہو میں نے اس کی جذباتی کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔ جذباتی کمزوری کا شکار تو میں خود ہوا۔ مجھے تو تمہارے قتل پر مامور کیا گیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ نادر شاہ مجھے حکم عدولی کی سزا کیا دے گا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ نادر شاہ سے زیادہ تم میرے خون کے پیاسے ہو۔ اس کے باوجود میں نے موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا اور تمہاری جان لینے کی کوشش بھی نہیں کی۔ کیوں؟ کوئی تو وجہ ہوگی۔"

میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا کیونکہ اس کا سچ ناقابلِ تردید تھا۔

وہ کچھ دیر بعد بولا۔ "میں نے دیکھا کہ نورین تم سے محبت کرتی ہے۔ دیوانگی کی حد تک۔ اس نے اپنی جان کا خطرہ مول لیا مگر تمہیں قتل سے روکا۔ دیوانہ وار جان کی بازی لگا کے تم سے ریوالور چھین لیا۔ تمہاری بیوی..."

میں نے کہا۔ "نورین میری بیوی نہیں ہے... اور مجھ سے محبت بھی نہیں کرتی۔"

"تمہاری بات میں پہلا آدھا سچ ہے... دوسرا محض جھوٹ۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" میں نے کہا۔

وہ بولا۔ "جھوٹ نظر نہیں آتا، سچ نظر آتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ تمہیں ایک جرم کے ارتکاب سے روک رہی تھی۔ وہ تمہیں ایک قاتل دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ آغاز سے نہیں، انجام سے ڈرتی تھی۔ ہر سہاگن کو اپنا سہاگ اتنا پیارا ہوتا ہے کہ اس کے لیے وہ جان ہتھیلی پر رکھ کے کچھ بھی کر سکتی ہے۔ وہ جس سے پیار کرتی ہے، تصور میں بھی اس کو پھانسی کے تختے پر نہیں دیکھ سکتی۔ نورین نے بھی یہی کیا۔ وہ تمہارے اور تختۂ دار کے درمیان دیوار بن گئی کہ مارنا ہے تو پہلے مجھے مار دو۔ پھر جو چاہو کرو۔ اور یہ میں نے دیکھا تو مجھے بڑی شرم آئی کہ میں اس عورت کا سہاگ اجاڑ دوں؟ اپنی بہن کو بیوہ کر دوں؟ لعنت ہو مجھ جیسے بھائی پر۔ وہ پھر لٹی ہے تو کیا اس لیے کہ اس بار کوئی غیر نہیں، خود اس کا اپنا بھائی اس کا بدترین دشمن بن جائے۔"

نورین آہستہ سے کراہی۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کے مجھے اور نازی کو دیکھا۔ آنسوؤں کا ایک قطرہ اس کی پلکوں پر اٹک گیا۔ مجھ سے پہلے نازی اٹھا اور اس کے پاس گیا۔ "کیسی ہو تم پری؟ میرا مطلب ہے... نورین۔"

"ٹھیک ہوں۔" وہ آہستہ سے اٹھی۔ "تم میرا نام بھی جانتے ہو؟"

"ایک نام جانتا تھا، ایک اس نے بتایا میری بہن۔" نازی نے میری طرف اشارہ کیا۔ "اللہ کا شکر ہے کہ تمہیں کچھ نہیں ہوا۔ کسی کو بھی کچھ نہیں ہوا۔ اب میں جا رہا ہوں۔"

نورین نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "کہاں جا رہے ہو بھائی۔ بہن کہتے ہو تو جانے کی بات مت کرو۔"

وہ شخص جسے میں ایک عادی مجرم اور پتھر دل قاتل کی حیثیت سے جانتا تھا، موم کی طرح پگھل گیا۔ آدمی جو دیکھنے میں پتھر کی ناقابلِ تسخیر، ناقابلِ شکست دیوار لگتا ہے اندر کہیں سے اتنا کمزور بھی ہو سکتا ہے، اس کا مجھے پہلے اندازہ نہ تھا۔ نورین کی بات پر وہ اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "اچھا... تو کہتی ہے تو... رک جاتا ہوں... کچھ دیر۔"

"کچھ دیر کیوں... آخر کہاں جانا ہے تمہیں بھائی؟" نورین نے کہا۔

"کہاں جانا ہے؟" اس نے زیرِ لب دہرایا۔ "یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔ مگر جانا تو ہوگا۔ جانا تمہیں بھی ہے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم ہمارے ساتھ چلو۔" میں نے کہا۔

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا۔ "تمہارے ساتھ؟ یہ تم کہہ رہے ہو؟"

"ہاں... کیونکہ مجھے معلوم ہے حکم عدولی کے بعد اب تم واپس نادر شاہ کے پاس نہیں جا سکتے۔ میرے اور نادر شاہ کے درمیان عداوت کی ایک سرحد ہے۔ اسے تم نے جانتے بوجھتے عبور کیا۔ اب تمہاری واپسی کا کیا سوال۔ تم ادھر ہی رہو ہمارے ساتھ۔"

"کیا ایسا ہو سکتا ہے... تم اپنے بھائی کا خون معاف کر سکتے ہو؟"

"جب تم نے مجھے زندگی سے محروم کرنے کا موقع جانتے بوجھتے گنوا دیا تو پھر میں کیسے تمہیں معاف نہ کروں... اب تو میں بھی مجبور ہوں۔ ایک تمہارا احسان ہے تو دوسرا پری کا رشتہ۔" میں نے نورین کی طرف اشارہ کیا۔

نورین چونکی۔ "کون ہے پری... تم نے مجھے پری کیوں کہا تھا بھائی؟"

نازی نے پھر اپنا پرس نکالا اور تصویر دکھانے کے لیے نورین کے سامنے کر دیا۔ "یہ ہے پری... میری بہن۔"

نورین نے حیران ہو کے کہا۔ "یہ تو میری تصویر ہے۔"

"یہ پروین کی تصویر ہے۔ اس کی آخری تصویر جب وہ کالج میں انٹر کا امتحان دے چکی تھی۔ تین سال پرانی کی ایک اور تصویر یہاں ہے۔" اس نے اپنے سر کو انگلی سے بجایا۔ "اس سے بھی زیادہ حسین اور معصوم... اس کے چہرے کے گرد دوپٹا نہیں کفن تھا جب میں نے آخری بار اسے دیکھا۔ وہ تصویر میرے خیال میں محفوظ ہے۔ بہت کوشش کی میں نے کہ اسے حافظے سے کھرچ دوں مگر کامیاب نہیں ہوا۔ کہاں جا رہے ہو تم لوگ؟"

یہ سوال اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ میرے منہ سے نکل گیا۔ "لاہور..."

"اس لڑکی کے ساتھ؟ اگر یہ تمہاری بیوی نہیں تو کون ہے؟" وہ کچھ فکر مند ہو گیا۔

"یہ... میری ذمے داری ہے... اس سے زیادہ ابھی میں کچھ نہیں بتا سکتا۔"

اس نے سر ہلایا۔ "بہت بڑی بے وقوفی بلکہ خودکشی کرو گے تم لاہور جا کے۔ ریلوے اسٹیشن پر قدم رکھتے ہی تمہیں پولیس دھر لے گی۔ نادر شاہ کے بندے وہاں پہلے سے تمہارا استقبال کرنے کے لیے موجود ہیں۔ وہاں بھی اور کراچی میں بھی۔"

نازی کی بات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے پاس زیادہ قابلِ اعتماد انفارمیشن تھی۔

نورین نے فوراً کہا۔ "یہی بات میں انہیں سمجھا رہی تھی۔"

"مگر یہ نہیں فرمایا تھا آپ نے کہ لاہور نہیں تو پھر ہمیں کہاں جانا چاہیے۔" میں نے کہا۔

نازی بولا۔ "دیکھو، اگر مجھ پر بھروسا کرو تو یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اندر کا آدمی ہوں۔ تمہارے دشمنوں سے غداری کر کے تم سے آملا ہوں لیکن ابھی ان کو خبر نہیں۔"

میں نے نورین کی طرف دیکھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ سالے صاحب کی حمایت نہ کرتی۔ اس نئے قائم ہونے والے رشتے کے معاملے میں میرے جذبات قدرے مختلف تھے۔ نورین نے کہا۔ "تم بتاؤ بھائی ہم کہاں محفوظ رہیں گے۔"

"مجھے نادر شاہ کے دماغ کا کچھ اندازہ ہے۔ وہ سوچے مغرب میں تو تم جاؤ مشرق میں۔ جب تک اسے معلوم ہو کہ نمک حرام نازی اس کا ساتھ چھوڑ چکا ہے، میں اسے مس گائیڈ کر سکتا ہوں۔ مثلاً ابھی میں اسے بتا سکتا ہوں کہ وہ لاہور جانے کے لیے ہی تیز گام پر سوار ہوا تھا، ملک عبدالقیوم کے نام سے اور اس کے ساتھ ایک بوڑھی عورت تھی۔ اس کی

چاچی ہوگی یا خالہ۔"

نورین ہنسنے لگی۔ "کیا میں کسی کی چاچی یا خالہ لگتی ہوں؟"

نازی صرف مسکرایا۔ "میں بتاؤں گا کہ وہ اچانک خانپور پر اتر گئے تھے۔"

"اور تمہارے باس علاؤالدین عرف آلو کے بیان کا کیا ہوگا؟ اس نے کہا ہوگا کہ نازی تو مارا گیا۔"

"ظاہر ہے جھوٹا وہ بنے گا۔ میں تو سو فیصد زندہ ہوں اور باس کی ہدایات کے مطابق دشمنوں کے پیچھے لگا ہوا ہوں۔ میں بھی خانپور پر اتر گیا تھا۔ لیکن یہاں سے وہ غائب ہو گئے... میں ان کا پتا چلا لوں گا۔ نادر شاہ کے سامنے ایک بیان آلو کا ہوگا اور ایک اطلاع میری طرف سے۔ یقین کرنے کے لیے وہ تصدیق کرے گا، اس چوکیدار سے ضرور پوچھا جائے گا۔ وہ بتا دے گا کہ ہاں، ایک مرد اور ایک برقع پوش عورت رات کو ریسٹ ہاؤس میں رکے تھے۔ یہ نہیں معلوم کہاں گئے۔"

"ہم اسے کہہ چکے ہیں کہ کراچی ایکسپریس آئے تو ہمیں سوار کرا دے۔" میں نے کہا۔

"گولی مارو کراچی ایکسپریس کو۔ پہلے میں نکلتا ہوں۔ مجھے تمہارے ساتھ جاتے کوئی نہ دیکھے۔ جیسے تم یہاں رکے تھے، میں بھی رک گیا تھا۔" نازی نے کہا۔ "میں نکل کے باہر جاتا ہوں، تم دس منٹ بعد آؤ۔"

نورین نے پوچھا۔ "آخر ہم کہاں جائیں گے بھائی؟"

اس نے نورین کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "پری! بھائی پر بھروسا رکھ۔ وہ تجھے غلط جگہ نہیں لے جائے گا۔"

پھر وہ باہر نکل گیا۔ نورین اور میں کچھ دیر چپ بیٹھے صورتِ حال میں اس ڈرامائی تبدیلی پر غور کرتے رہے۔ نورین شاید میرے گرین سگنل کے انتظار میں تھی لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا۔ میں نازی پر اعتماد کر سکتا تھا۔ اس کی وجہ کتنی بھی جذباتی کیوں نہ ہو، میری عقل تسلیم کرتی تھی۔ دس منٹ بعد میں نے باہر جا کے دیکھا تو چوکیدار کا کہیں پتا نہ تھا۔ ایک ٹی اسٹال والے نے بتایا کہ وہ اپنے کوارٹر کی طرف گیا ہے۔ اس کی بیوی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔

میں چوکیدار کی واپسی کا زیادہ دیر تک انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ نازی نے مجھے دس منٹ بعد باہر ملنے کا کہا تھا۔ میں پندرہ منٹ بعد سوٹ کیس لے کر نکلا اور ٹی اسٹال والے کو پانچ سو روپے دیے کہ میری طرف سے چوکیدار کو دے

دے۔ چوکیدار کے بہت دیر سے نظر نہ آنے کی وجہ اب مجھے معلوم ہوئی تھی۔ ایک طرح سے ہمارے لیے اچھا ہی تھا کہ وہ ہمیں رخصت کرنے باہر تک ساتھ نہیں گیا تھا۔

صبح ساڑھے دس بجے خانپور اسٹیشن کا منظر رات کے منظر سے یکسر مختلف تھا۔ وہاں ٹی اسٹالوں کے علاوہ بھی بہت سے اسٹالز نظر آ رہے تھے جو تقریباً ہر اسٹیشن پر مسافروں کی تمام ضروریات کا سامان رکھے بیٹھے ہوتے ہیں لیکن زیادہ رونق خانپور کے پیڑے بیچنے والوں نے لگا رکھی تھی جن کی آوازوں کا شور مجھے ویٹنگ روم میں بھی سنائی دے رہا تھا۔ یہ شہر میں سویٹ شاپس پر ملنے والے عام سفید رنگ کے پیڑوں سے قدرے مختلف تھے۔ ان کا رنگ کچھ براؤن سا تھا جیسا کہ میں نے بدایوں کے پیڑوں کو دیکھا تھا۔ نورین نے ایک خالص زنانہ حرکت کی جب برقع کے اندر سے اس نے مجھے کہنی مار کے کہا۔ ''ذرا دیکھیں تو سہی، کیسے پیڑے ہیں؟'' اور کسی محبت کرنے والے (فرمانبردار) شوہر کی طرح میں انکار نہ کرسکا۔ پیڑوں کے زنانہ خیمے میں غائب ہونے سے پہلے میں نے ایک پیڑا چکھا تو خانپور کی وجۂ شہرت بے وجہ نہ لگی۔

ہم گیٹ سے نکلنے ہی والے تھے کہ ایک اخبار فروش صدا لگاتا، اخبار لہراتا سامنے آگیا۔ نورین نے مجھ سے پوچھے بغیر اسے روک لیا۔ ''کون کون سے اخبار ہیں؟''

اخبار والے نے تین چار نام لیے جو سب ملتان سے شائع ہونے والے اخبارات تھے۔

''کراچی کا جنگ، ڈان یا ایکسپریس کوئی نہیں؟'' وہ مایوسی سے بولی۔

''کراچی لاہور کے اخبار دیر سے آتے ہیں۔''

نورین نے اچانک پوچھ لیا۔ ''سکھر تو قریب ہے... سکھر کا اخبار ہے کوئی؟''

''سکھر؟ آپ نام بتاؤ... میرے پاس تو کوئی نہیں مگر بازار میں شاید مل جائے۔'' وہ آگے بڑھ گیا۔

نورین نے سکھر کے تین اخبارات کے نام لیے جو سب غیر مانوس تھے۔ ظاہر ہے انہیں صرف مقامی ریڈرشپ میسر تھی۔ وہ ہر جگہ نہیں مل سکتے تھے۔ ''یہ کیا طریقہ ہے؟ تم جیسی برقع پوش عورتیں ہاکر سے یوں بات نہیں کرتیں۔ مجھ سے کہا ہوتا۔''

''اچھا، اب کہہ رہی ہوں۔ بازار میں کسی اسٹال سے پوچھنا۔ پیڑے اچھے ہیں۔''

باہر کا منظر بھی اس وقت مختلف تھا۔ تانگا اسٹینڈ پر چھ سات تانگے ساتھ ساتھ کھڑے تھے اور ان [illegible] پائلٹ ایک درخت کے نیچے حلقہ بنائے ایک [illegible] سے اسموکنگ کا شغل کر رہے تھے۔ ان کے پیچھے [illegible] اور خستہ حال گھوڑے قدیم تانگوں سے منسلک [illegible] کھڑے خاصے مغموم نظر آتے تھے۔ پھر ایک تانگا [illegible] جھومتا آیا جس میں تین تانگوں کی سواریاں لدی [illegible] تھیں۔ ایک گھوڑا شاید انہیں اپنی قوتِ ارادی سے [illegible] رہا تھا۔ اس کے ہر پہیے کی چال شرابی تھی اور لگتا تھا کہ [illegible] وقت وہ اپنے مرکز سے جدا ہو کے زمین پر لیٹ جا[illegible] گے۔ جب سواریوں نے اترنا شروع کیا تو ایک بچہ آ[illegible] سے گرا، دوسرا پیچھے سے۔

میری نازی کو تلاش کرنے والی نظر سب دیکھ ر[illegible] تھی۔ وہ ایک ''ڈبے'' کے ساتھ نمودار ہوا۔ ڈبا [illegible] ہمارے سامنے آ کے رکا تو نازی نے بڑی مستعدی سے ا[illegible] کا دروازہ کھولا اور کہا۔ ''بیٹھو...'' اور ہمارے بیٹھتے [illegible] سلائڈنگ ڈور کو کھینچ کے ایک دھماکے سے بند کردیا۔ [illegible] مقامی زبان میں ''سوزوکی ہائی روف کیری'' کا نام تھا جو میں نے کئی شہروں میں سنا۔

اس وقت میں نے ڈبے کی سخت غیر آرام دہ اور تنگ جگہ والی سیٹ کو نظر انداز کردیا۔ ''نازی! ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

نازی سے پہلے حد درجہ لاغر اور لمبے ڈرائیور نے ا[illegible] چھت سے لگنے والا سر گھمایا اور میں نے اس کی سوا نو بجانے والی چھ انچ لمبی کلف لگی مونچھوں کو دیکھا۔ ''اپنے یار کے ڈیرے اور کہاں۔ بس اب آپ بے غم ہو کے بیٹھو۔ بھرجائی سے بولو شیشے بند کر کے بے شک برقع کو ہٹا دے۔''

''کھڑکی بند کی تو دم گھٹ جائے گا۔'' نورین نے کہا اور فوراً سامنے سے برقع اٹھا دیا۔ ''بھائی، کہیں اخبار کا اسٹال نظر آئے تو پوچھنا سکھر کے اخبار ہیں۔ اگر پچھلے دو تین دن کے مل جائیں۔''

پائلٹ نے دوبارہ سر گھمایا۔ ''بھرجائی... گڈی ایک وار کھڑی ہو گئی تو بازار میں دھکا لگانا مشکل ہو جائے گا۔ اخبار اندر والے بازار میں ملتا ہے۔ ہم باہر باہر سے جا رہے ہیں۔''

نورین کو مایوسی اور مجھے خوشی ہوئی۔ نہ جانے کیوں اب مجھے ایک عجیب سی بے اطمینانی کی خلش محسوس ہو رہی تھی۔ میں سو فیصد مطمئن نہیں تھا کہ یوں نازی پر اندھا اعتبار کر کے میں نے عقل مندی کا ثبوت نہیں دیا۔ ایک بھرا ہوا ریوالور میں نے نورین کے بیگ میں رکھوا دیا تھا۔ دوسرا میری جیب میں تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اگر خدانخواستہ میں کہیں محصور ہو گیا تو یہ اسلحہ میرے کام نہیں آئے گا۔ گاڑی اب خانپور کے قصبے سے نکل آئی تھی اور دونوں طرف سے آنے جانے والے ٹریفک کو دیکھ کے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ہم جی ٹی روڈ پر ہیں اور غالباً ملتان کی سمت میں سفر کر رہے ہیں۔

رات بھر کی تھکن اور نیند کی کمی اب نورین کے ساتھ مجھ پر بھی اثر انداز ہو رہی تھی۔ نورین تو کچھ دیر مجھ پر گر کے سنبھلتی رہی اور بالآخر میرے سہارے پر سو گئی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اسے پوری سیٹ پر لٹا دوں اور خود پیچھے والی سیٹ پر چلا جاؤں۔ میں چاہتا تھا کہ آنکھیں کھلی رکھوں تاکہ پوری طرح باخبر رہوں کہ ہم واقعی سلامتی اور تحفظ کی طرف جا رہے ہیں۔ لیکن وہ محاورہ عملی طور پر پہلی بار درست ثابت ہوا کہ نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔

میری آنکھ اس وقت کھلی جب خود نازی نے مجھے ہلا کے کہا۔ ''اٹھو یار... کیا بھو کے سوئے رہو گے؟''

میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ ہماری لگژری کوچ سرِ راہ کسی کیفے ڈی پھوس کے سامنے کھڑی تھی۔ کلف دار مونچھوں والا پائلٹ بڑی مستعدی سے سیاہ بان والی ایک جھلنگا چارپائی پر جا کے لیٹ گیا تھا اور برقع میں روپوش نورین نیچے کھڑی تھی۔ میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی تو سہ پہر کے ڈھائی بجے تھے۔ ہم تقریباً تین ساڑھے تین گھنٹے کی مسافت طے کر چکے تھے اور نہ جانے کہاں تھے۔ بیشتر چارپائیوں پر ٹرک ڈرائیور حضرات براجمان تھے۔ ایک بس جیسی چیز کی قید سے رہا ہونے والے دیہاتی مسافر بھی لنچ بریک سے مستفید ہو رہے تھے۔ نازی بھی ڈرائیور والی چارپائی پر پاؤں سمیٹ کے بیٹھ گیا۔ درمیان میں ایک میز تھی۔ اس کے دوسری طرف والی چارپائی میرے اور نورین کے حصے میں آئی۔ یہ قطار کی آخری چارپائی اس لحاظ سے باپردہ تھی کہ نورین مخالف سمت میں دیکھنے کے لیے نقاب اٹھا سکتی تھی لیکن اس کے حسن و جمال پر کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ ایسا نہ ہوتا تو اچھی بُری ہر نظر اسی کے چہرے پر مرتکز ہو جاتی۔

ڈبے کا بانس جیسا پتلا سوکھا چھ انچ کی سیدھی نوک دار مونچھوں والا پائلٹ اور نازی آپس میں خاصے بے تکلف نظر آتے تھے جو میرے لیے خاصی حیرانی کی بات تھی اور تشویش ناک بھی۔

موقع پاتے ہی میں نے نازی سے کہا۔ ''آخر ہم کہاں جا رہے ہیں... اور اس وقت کہاں ہیں؟''

''اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم ملتان سے آگے ہیں۔ رات تک لاہور پہنچ جائیں گے۔''

''لاہور؟ تم نے تو کہا تھا کہ وہاں خطرہ زیادہ ہے؟''

''میں نے ریلوے اسٹیشن کی بات کی تھی۔ اب ہم مضافات میں قیام کریں گے۔ رائے ونڈ سے بھی پہلے۔''

''وہاں کیا ہے؟ میرا مطلب ہے کس کا گھر ہے؟''

''اپنا ہی سمجھو... اس سے زیادہ محفوظ جگہ ہم سب کے لیے کوئی نہیں ہو سکتی۔ میں نے پاس کو تو بتا دیا ہے کہ چودھری فرید... اور اس کی ہم سفر واپس کراچی جانے والی گاڑی میں سوار ہو گئے ہیں۔ مجھے پتا چلا ہے۔''

''اس نے پوچھا نہیں کہ تم خود کہاں ہو؟''

''میں نے بتا دیا کہ وہ مجھے ڈاج کر کے نکل گئے لیکن میں ان کے پیچھے ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ چالاکی کریں اور راستے میں پھر کہیں اتر کے پٹری بدل لیں۔''

نازی کی وضاحت بظاہر تسلی بخش تھی۔ شاید میرے دماغ میں فتور تھا کہ شک اور بے اطمینانی کا کیڑا بدستور کلبلاتا رہا۔ ''یہ ٹیلی فون کے کھمبے جیسا ڈرائیور تمہارا دوست ہے؟ نام کیا ہے اس کا؟''

''چھوٹو پرانا سنگی، بیلی ہے۔ ابھی بتا نہیں سکتا کہ بچپن اور پھر جوانی میں ہم نے مل کے کیا کارنامے سرانجام دیے۔ یہ مجھے چھوٹے قد کی وجہ سے لمبو کہتا تھا۔''

''یہ خانپور میں کیا کر رہا تھا؟''

''یہ وہیں رہتا ہے۔ خانپور کی سواریاں صادق آباد بہاولپور اور ملتان تک لے جاتا ہے۔ میرے کہنے سے لاہور جا رہا ہے مگر ظاہر ہے کرایہ لے گا۔'' نازی نے کہا اور اٹھ کے چھوٹو کے ساتھ جا بیٹھا۔

نورین نے شکایتی انداز میں کہا۔ ''تم کچھ ضرورت سے زیادہ پریشان نہیں ہو؟''

میں نے بگڑ کے کہا۔ ''پریشان ہوں تو کس کی وجہ سے؟ کس کے لیے؟ اپنی فکر نہیں ہے مجھے۔ تمہیں زیادہ بھروسا ہے اس نئے رشتے کے بھائی پر تو اسی کے ساتھ چلی جاؤ۔ میں ایسے اندھا اعتماد نہیں کرسکتا۔ خواہ تمہارا سگا بھائی ہوتا۔ یہ تو دشمن ہے... تھا۔''

وہ روہانسی ہو گئی۔ ''طعنے کیوں دیتے ہو؟ میں نے تو نہیں مجبور کیا تھا کہ اس کی مانو۔ مجھے کہاں سے کہاں لے

آئے بھرڑ سے میں۔ اور اب کہتے ہو جہاں چاہو جاؤ۔"
"اف... خدا کے لیے یہاں آنسو بہانے مت بیٹھ جانا۔ او کے آئی ایم سوری۔ کبھی پریشانی میں کوئی بات منہ سے نکل جائے تو معاف بھی کر دیا کرو۔"

سفر کے اگلے مرحلے کا آغاز ہوا۔ رات آٹھ بجے آبادی کے آثار روشنیوں کی صورت میں نمودار ہوئے تو چھوٹو نے مژدہ سنایا کہ "لہور آ گیا۔" ڈبا پھر بھی چلتا رہا۔ بڑی سڑک چھوڑ کے دوبارہ چھوٹی سڑک پر مڑا۔ پھر ایک گلی سے گزرا اور گلی جہاں ختم ہوئی وہاں ایک مکان کے سامنے رک گیا۔ اس کچی پکی اور نئی پرانی بستی کی گلی میں یہ آخری مکان تھا۔ اس کے بعد کھیت نظر آ رہے تھے۔ میں ایکشن کے لیے تیار ہو گیا۔ اب چھوٹو یا لبو کی دستک پر دروازہ کھلنے کے بعد کون آتا ہے اور ہمیں کیسے اندر لے جاتا ہے، یہ دیکھنا ضروری تھا مگر ہوا یوں کہ نازی نے دروازے میں پڑا ہوا قفل ایک چابی سے کھولا اور اندر جا کے لائٹ جلانے کے بعد بولا۔ "آجاؤ اندر۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔"

میں نے اس دعوت کو نیم دلی سے قبول کیا یعنی نورین کو اندر بھیج دیا اور نازی سے کہا کہ وہ سامان لے جائے۔

نازی نے ہمیں اپنا کمرا دکھا دیا۔ اس میں ہمارا سامان رکھ دیا گیا تھا اور نورین اکلوتے تخت نما بیڈ پر برقع اتارے پریشان اور خوف زدہ سی بیٹھی تھی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "ٹیک اٹ ایزی۔ ہم ابھی تک محفوظ ہیں۔ اور اللہ نے چاہا تو تو...."

میری بات مکمل ہونے سے پہلے وہ میرے کندھے پر سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ "یہ میں کہاں آ گئی؟"

نازی اچانک نمودار ہوا۔ "کیا بات ہے پری... پریشان کیوں ہوتی ہے؟ اسے اپنے بھائی کا گھر سمجھ۔"

میں نے کہا۔ "چلو اٹھو جا کے فریش ہو جاؤ۔ ہاتھ منہ دھو کے کپڑے بدلو۔ کب سے نہیں بدلے۔"

"ہاں، میں کچھ کھانے کے لیے لاتا ہوں۔ ساری فکریں بھول جاؤ۔ تمہارے میرے کسی دشمن کا خیال بھی یہاں نہیں پہنچ سکتا۔ ابھی کچھ کھا پی کے آرام کرو۔ صبح چھوٹو چلا جائے گا تو بات کریں گے۔"

وہ کچھ دیر بعد آیا تو اس کے ساتھ سامان کے دو بھرے ہوئے تھیلے تھے۔ "میں کچھ اور چیزیں بھی لے آیا۔ اب کون بار بار جا کے بازار سے ہر چیز لائے۔ چائے تو خود بنا کے پی لے۔ برتن بھانڈے سب ہیں۔"

نازی نے کھانا ہمارے ساتھ کھایا۔ فرش پر ایک دری تھی اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس پر اپنا تکیہ رکھ کے سو جاؤں گا۔ نورین کے لیے چارپائی تھی اور اس پر بستر بھی بچھا ہوا تھا۔ کھانے کے بعد اسے چائے کی طلب محسوس ہوئی تو نورین نے کچن کا جائزہ لیا اور اطلاع دی کہ چائے بنائی جا سکتی ہے اور صبح کا ناشتا بھی کہیں سے لانے کی ضرورت نہیں۔ اگر میں کوشش کروں تو سو جاتا لیکن چائے پینے کے بعد نورین نے وہ سوال کر دیا جو اس کے ذہن میں اب تک سے کلبلا رہا ہو گا مگر اس کا جواب فرصت اور مہلت مانگتا تھا۔

"نازی بھائی! تمہاری جو بہن پری تھی، ایک ہی بہن تھی؟"

نازی نے سر ہلایا۔ "ہم دو ہی تھے مگر جب میری ماں کا انتقال ہوا تو وہ بہت چھوٹی تھی۔ میری عمر تھی بیس سال اور وہ تھی آٹھ سال کی۔ مجھ سے تیرہ سال کم۔ پھر اسے میں نے پالا بیٹی کی طرح۔"

"کیوں... تمہارا باپ بھی تو ہو گا... خاندان کے دوسرے لوگ؟"

"دوسرے لوگ؟" وہ تلخی سے بولا۔ "دوسرے تو دوسرے ہی ہوتے ہیں جب باپ اپنا نہ ہو۔ میری ماں بڑی دکھی رہی۔ وہ پہلے کام کرتا تھا، کراچی شپ یارڈ میں ڈیلی ویج پر۔ دہاڑی پر مزدوری کرتا تھا مگر ادھر ادھر سے اچھی کمائی کر لیتا تھا۔ شپ پر آنے جانے والوں سے کچھ اینٹھ لیتا تھا۔ کچھ سودے کراتا تھا۔ کبھی خود بھی کچھ منگوا لیتا تھا۔ پھر اسے نہ جانے کس سے نشے کی لت پڑ گئی۔ جیسا کہ ہوتا ہے، نشے نے اسے نچوڑ لیا۔ وہ مزدوری کے لائق نہ رہا تو وہیں بھٹکتا رہا۔ لوگ ترس کھا کے تھوڑا بہت دیتے رہے مگر کب تک۔ اس نے چوری چکاری شروع کی تو اس کا داخلہ کے پی ٹی کی حدود میں بند کر دیا گیا۔ ماں پہلے ہی ٹی بی کی مریض تھی مگر علاج ہو رہا تھا اور جاری رہتا تو کسی دن وہ صحت یاب بھی ہو جاتی مگر آمدنی بند ہو گئی تو ہم سب مشکل میں گھر گئے۔ یہ غنیمت ہوا کہ مکان اپنا تھا۔ ناجائز تجاوزات میں آتا تھا مگر پھر بھی آبادی میں آ گیا۔ وہاں کی عورتیں گھروں میں کام کرنے جاتی تھیں۔ ڈیفنس اور کلفٹن کی طرف۔ میری ماں بھی جانے لگی لیکن اس کی صحت ایسی مشقت کی اجازت کہاں دیتی تھی۔ پھر جیسے ہی اس کی کھانسی پر گھر والوں کو شبہ ہوتا تھا، وہ اسے بے عزت کر کے کوڑی کی طرح گھر سے نکال دیتے تھے۔ ٹی بی کی ماری ہماری گھر میں بیماری پھیلانے آ گئی۔ باپ کو نشے کی لت لے کر بیٹھ گئی۔ وہ کئی بار پکڑا گیا اور ایک دن تھانے میں ہی تشدد سے مر گیا۔ اس نے کسی بڑے آدمی کی گاڑی کے وہیل کپ اتار لیے تھے اور بیچنے گیا تھا کہ پولیس نے دھر لیا۔ چوری اس بڑے آدمی کے لیے اتنی بڑی نہ تھی مگر سب کا زور تو لاوارث پر ہی چلتا ہے۔ اس کے کہنے پر پولیس نے میرے باپ کو اتنا مارا کہ وہ مر گیا۔ ہم کیا کرتے۔ شور بھی کرتے تو عتاب کا شکار ہوتے۔ میں اس وقت چودہ سال کا تھا اور پری صرف دو سال کی۔ ابھی اس نے چلنا اور بولنا شروع کیا تھا۔ میں نے بھیک نہیں مانگی اور سارے کام کیے۔ کچرے بیچنے سے اخبار بیچنے تک۔ اس سے گزر بسر تو ہو جاتی تھی لیکن ماں کا علاج کیسے ہوتا۔ کسی کے کہنے سے اس کو اوجھا سینی ٹوریم میں داخل کر لیا گیا جہاں وہ چھ مہینے بعد مر گئی۔ میں پری کے ساتھ اتوار کے اتوار اسے دیکھنے جاتا تھا۔ ایک اتوار کو گیا تو اس کا بیڈ خالی تھا۔ میرے پوچھنے پر ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ مر گئی۔ گھر کا جو پتا لکھا تھا، وہاں کوئی ملا نہیں۔ ملتا کیسے... میں سگنل پر اخبار بیچنے جاتا تھا تو پری کو ساتھ رکھتا تھا۔ ایک بار کسی کار والے نے اسے بھکاری سمجھ کے پانچ کا نوٹ دے دیا تھا تو میں نے واپس کرا دیا تھا۔ وہ دور فٹ پاتھ پر بیٹھی کھیلتی رہتی تھی۔ اسپتال والوں کے پاس مجھے مطلع کرنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ میں نے کسی اور کا فون نمبر دے دیا ہوتا تو شاید خود ماں کو دفنا دیتا۔ یہ کام ایدھی والوں نے کیا۔ لاوارث لاش ان کے حوالے کر دی گئی تھی۔ انہوں نے تین دن وارثوں کا انتظار کیا پھر لاوارثوں کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے جگہ دکھا دی۔ میں ایک بار گیا پری کو ساتھ لے کر اور پھول ڈال کے لوٹ آیا۔ نہ میں بار بار جا سکتا تھا، نہ اس کا کوئی فائدہ تھا۔ آٹھ سال کی پری کے ساتھ شہر کے دوسرے آخری کنارے تک میں کیسے جاتا۔ جاتا تو کام کیسے کرتا۔ پری کی پرورش اب میری ذمے داری ہو گئی تھی۔

"میں نے اسے اسکول بھیجا۔ خود میں نے آٹھویں تک گورنمنٹ اسکول میں پڑھا تھا۔ پھر حالات بھی ایسے نہ رہے اور میں فکر معاش میں لگ گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کے شوق کے باعث میں نے پرائیویٹ میٹرک کا امتحان دیا۔ پھر انٹر کا اور بی اے کا۔ مجھے ایسے لوگ ملتے رہے جو میرے شوق کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ایک پرائیویٹ کالج کے مالک نے مجھے فیس ادا کیے بغیر کلاس میں بیٹھنے کی اجازت بھی دی تھی۔ پری کو میں نے ایک دن بھی اسکول سے غیر حاضر نہ ہونے دیا۔ ایک تو یہ میری ذمے داری تھی پھر مجھے آدھا دن فری مل جاتا تھا۔ دوپہر دو بجے تک میں بہت سے کام کرتا تھا۔ صبح میں گھروں میں اخبار ڈالتا تھا۔ پھر میں ایک فلیٹس کے کمپاؤنڈ میں کھڑی گاڑیاں دھوتا تھا۔ اس کے بعد گھروں سے ردی اکٹھی کرتا تھا۔ میں نے ایک نیا طریقہ اختیار کیا تھا۔ جن گھروں میں اخبار ڈالتا تھا، وہاں سے پرانے اخبار ردی کے بھاؤ اٹھا لیتا تھا۔ کچھ میری مدد کے لیے مجھے دوسرے دن ہی اخبار دے دیتے تھے۔ جب میں نیا اخبار ڈالتا تھا تو پرانا دروازے پر رکھا ہوتا تھا۔ بالکل صاف اور سنبھال کر رکھے گئے اخبارات سے پری اسکول سے آجانے کے بعد شام تک کاغذ کے لفافے بناتی تھی اور میں وہ لفافے دکانوں پر بہت سستے سپلائی کر دیتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میری نیت اور محنت دیکھ کر اکثر لوگوں نے میری مدد اور حوصلہ افزائی کی۔ وہ ایک نیکی کا ثواب بھی کماتے تھے اور میں بھیک نہیں مانگ رہا تھا۔ اس طرح مہینے بھر میں اچھی آمدنی ہو جاتی تھی۔ جب پری نے میٹرک پاس کیا تو میں ایک پرانی ہنڈا ففٹی خرید چکا تھا۔ صبح اخبار ڈالنے کے بعد میں دکانوں پر مختلف چیزیں سپلائی کرتا تھا۔ ایک وقت آیا جب میری لگن اور محنت کو دیکھ کر ایک شخص نے کہا کہ تم نے بی ایس

نہلے پہ دہلا

☆ اگر آپ کے ہاتھ الہ دین کا چراغ آ جائے تو اسے رگڑ کر جن کو طلب کرنے کے بعد اس سے کونسا کام لیں گے؟

نوکری دلوانے کا۔

☆ اگر دن کو چین اور رات کو نیند نہ آئے تو کون سی بیماری آپ کو لاحق ہو سکتی ہے؟

دماغی خلل کا...

☆ شاپنگ بیگ کس نے ایجاد کیے تھے؟

جس کے گھر میں دودھ دہی لانے کے لیے برتن نہیں تھے۔

☆ دیگچی ہانڈی پکانے کے علاوہ اور کس کام آتی ہے؟

جہاں سے چھت ٹپک رہی ہو۔ اس کے نیچے رکھ دیں۔

(ریاض بٹ، حسن ابدال)

بھی کیا ہوتا تو میں تمہیں کسی دوا ساز کمپنی میں میڈیکل ریپ لگوا دیتا۔ اس شخص نے میری سفارش کی تو بی اے کے بعد ایک کمپنی نے مجھے سائنس کی شرط سے مستثنیٰ کرتے ہوئے میڈیکل ریپ کی نوکری دے دی اور میں معزز ہو گیا۔ معزز یوں کہ میرے لیے قمیص پتلون کے ساتھ ٹائی لگانے کی پابندی تھی۔ ہم اپنے اسی پرانے محلے میں رہتے تھے۔ اکثر محلے دار اس ترقی کو اچھی نظر سے دیکھتے تھے اور ہمارا خیال رکھتے تھے لیکن ہم سے حسد رکھنے والے بھی کم نہ تھے۔ جب پری گھر میں ہوتی تھی تو مجھے اس کی فکر نہیں ہوتی تھی۔ پڑوس کی ایک عورت رات تک اس کے پاس رہتی تھی۔ وہ جوان ہو گئی تھی اور جب میں نے اسے کالج میں داخل کرایا تو مجھے اندازہ ہوا کہ صرف مجھے ہی وہ بہت خوب صورت نہیں لگتی۔ فرسٹ ایئر میں ہی وہ کالج کی لڑکیوں میں ہونے والا مقابلۂ حسن جیت گئی اور اس نے خوشی سے دمکتے چہرے کے ساتھ مجھے بتایا کہ سال بھر وہ کالج کی بیوٹی کوئین کہلائے گی۔ یہ اعزاز اسے دوسرے سال بھی حاصل ہوا۔ وہ مجھے بتاتی تھی کہ مقابلے میں پچھلے سال پچاس لڑکیاں تھیں تو اس سال ان کی تعداد سو ہو گئی تھی۔ سب کا حسد سے برا حال تھا۔ کچھ تو وہیں رو پڑیں۔ بعد میں میرے خلاف زہر اگلنے لگیں کہ میرے مراسم ہیں اور جو میں کرتی ہوں، وہ نہیں کرتیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس مقابلے کے ججوں میں ایک بیوٹی پارلر کی مالک، ایک فیشن ڈیزائنر کے علاوہ ایک ٹی وی پروڈیوسر بھی ہے تو میں نے پری کو مقابلے میں حصہ لینے سے روک دیا۔ لیکن اس کے حسن کے چرچے ہونے لگے تھے۔ اس ٹی وی پروڈیوسر نے اسے ایک سیریل میں رول کی پیشکش کی مگر میں نے پری کو سختی سے منع کیا۔ اسے سمجھایا کہ اس چکر میں نہ پڑے، ورنہ شوبزنس میں سوائے بدنامی اور خواری کے کچھ نہیں ملتا مگر شکاری جال پھیلا چکے تھے۔ ان کی نظریں پری پر تھیں۔ ایک چینل کی خاتون مالک نے اسے طلب کیا اور پھر مجھے بلایا۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ ان کے چینل پر ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ خود عورت ہے چنانچہ اس بات کا خاص خیال رکھتی ہے کہ کسی کی عزت پر حرف نہ آئے۔ میں اس کی باتوں میں آ گیا۔ دراصل میں نے دیکھ لیا تھا کہ شاید اب پری کو روکنا میرے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ وہ میری اجازت کے بغیر بھی کنٹریکٹ سائن کر لے گی۔ یہ تو ہر لڑکی کا خواب ہوتا ہے۔ عزت، شہرت، دولت۔ گلیمر کی دنیا کی چکاچوند۔ پری جیسی لڑکی کے لیے سب سے بڑا جال پیسا تھا اور وہاں پیسے والے شوقین مزاج ہی راج کرتے تھے۔ ایک لڑکی جو ردی اخبار کے لفافے بناتی جوان ہوئی ہو، پچاس ہزار روپے کے کنٹریکٹ کو ٹھکرانے کا حوصلہ ہی نہیں رکھتی۔۔۔ اس کے لیے فیشن کے جلوے، ستاروں کی دنیا کی چمک دمک۔ مداحوں کے اور پرستاروں کے اور آٹو گراف مانگنے والوں کے ہجوم۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ آگے جا کے وہ کتنی بڑی ماڈل یا اسٹار بنتی۔ کتنی بدنامی یا کتنا پیسا کماتی۔ قسمت اسے دو کمروں والے اس پرانے مکان سے جس میں ہر وقت مچھلیوں کی بو اور سمندر کی باس رہتی تھی، کلفٹن کے کس بنگلے میں پہنچاتی اور وہ کراچی سے لندن پیرس نیویارک جاتی یا نہیں۔ مگر وہ آغازِ سفر میں ہی لٹ گئی۔ اس غریب کی طرح جس کا ایک کروڑ کا پرائز بونڈ نکل آئے۔۔۔ اس کی دولت اس کا حسن تھی۔ یہی حسن اس کا دشمن ثابت ہوا۔ سیریل کی دو قسطوں کی ریکارڈنگ ہو چکی تھی اور میں دیکھ رہا تھا کہ پری کی دلچسپی پڑھائی میں کم ہو گئی ہے۔ میں نے اجازت دیتے وقت شرط رکھی تھی کہ وہ کالج نہیں چھوڑے گی مگر ریکارڈنگ اور ریہرسل کے چکر میں کالج چھوٹ گیا۔ اس نے مجھ سے بھی صاف کہہ دیا کہ وہ انٹر کے سالانہ امتحان کے لیے وقت نہیں نکال سکتی۔ میں خفا ہوا اور چیخا چلایا۔ مگر اس پر اثر نہ ہوا۔ ماں باپ اپنی اولاد پر سختی کر سکتے ہیں، میں صرف بھائی تھا اور سچ بات تو یہ ہے کہ میں نے ہی اسے لاڈ پیار میں بگاڑا تھا۔ وہ سمجھتی کہ مجھ سے ہر بات منوائی جا سکتی ہے۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ اس محلے کے لوگ اس کے بارے میں کیا باتیں کرنے لگے ہیں۔ اس کا حلیہ، لباس اور میک اپ۔ وقت بے وقت آنا جانا۔ مختلف لوگوں کے ساتھ کاروں میں نظر آنا۔ وہ کہتی تھی کہ کاریں اسٹوڈیو کی ہیں اور سب کو گھر سے لاتی لے جاتی ہیں۔ مگر یہ غلط تھا۔۔۔ وہ پروڈیوسر کے علاوہ ایکٹرز کے ساتھ بھی پھرتی تھی۔ ایک دن اس نے خود ہی کہا کہ بھائی اب ہم اس محلے میں نہیں رہیں گے۔ ہمیں کیا ضرورت ہے اس غلیظ ماحول اور گندی ذہنیت والے لوگوں میں رہنے کی۔ اب ہمیں کوئی مجبوری بھی نہیں۔ اور میں نے اس کی بات سے اتفاق کیا کیونکہ خود میں ڈسٹری بیوشن کے کام میں اچھا کما رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کوئی پرانی کار لے لوں تو پری کو بھی آنے جانے کی آسانی ہو جائے۔ مگر کار ان گلیوں میں کیسے آتی جہاں سے میری موٹر سائیکل بھی مشکل سے گزرتی تھی۔

اس بات کے چند دن بعد ہی پری غائب ہو گئی۔ وہ ریکارڈنگ کے لیے گئی اور لوٹ کے نہیں آئی۔ میں نے رات تک انتظار کیا پھر اسٹوڈیو جا کے پوچھا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کر دیا اور کہا کہ شوٹنگ تو دو بجے ہی ختم ہو گئی تھی۔ وہ تین بجے چلی گئی تھی۔

”میں ساری رات موٹر سائیکل لیے پھرتا رہا۔ میرا دل کسی انہونی کے خیال سے لرزتا تھا۔ بدنامی میں پہلے ہی سے برداشت کر رہا تھا۔ اب مجھے ڈر تھا کہ میں پری کو کھو دوں گا۔ وہ بہت سیدھی اور بھولی بھالی تھی۔ یا مجھے لگتی تھی۔۔۔ میں ڈرتا تھا کہ کوئی اسے اپنے جال میں پھنسا کے مجھ سے دور لے جائے گا۔ میں سب کچھ قبول کر سکتا تھا، پری سے جدائی مجھے منظور نہ تھی۔ وہ اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ شادی کے لیے کہتی تو میں اس کی خوشی دیکھتا۔ ابھی میں پولیس کے پاس جانے سے ڈر رہا تھا۔ وہ بھی چوبیس گھنٹے گزرنے سے پہلے کسی کی گمشدگی کی رپورٹ نہیں لکھتے۔ لڑکی کے معاملے میں ان کی قیاس آرائیاں شرمناک اور اشتعال انگیز ہوتی ہیں۔

اگلے روز میں اس چینل کے دفتر گیا۔ میں نے پروڈیوسر سے لے کر چینل کی مالک تک ہر ایک کو دھمکی دی کہ میں ان کے خلاف کیس کر دوں گا۔ وہ بڑے اثر رسوخ والے لوگ تھے۔ چاہتے تو مجھے جوتے مار کے نکال دیتے مگر انہوں نے مجھے سمجھایا کہ ایسے بدنامی کے کام وہ نہیں کرتے جس سے ان کا چلتا ہوا کام رک جائے۔ ایکٹر، ایکٹریس سب آتے ہیں اور اپنا کام کر کے چلے جاتے ہیں۔ آج تک نہ کوئی غائب ہوا ہے، نہ کسی نے چینل کے خلاف کیس کیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ میں اپنی بہن کو فرشتہ اور باقی دنیا کو شیطان نہ سمجھوں۔ رپورٹ لکھوانے میں وہ میری مدد کر سکتے ہیں مگر اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے چند روز خاموشی سے انتظار کرنا چاہیے۔ میں پاگل ہو گیا تھا۔ بار بار اسپتالوں کے چکر لگاتا تھا یا مردہ خانے دیکھتا تھا۔ چند روز بعد عید تھی۔ ایک دن میں گھر آیا تو مجھے دروازے کے نیچے سے اندر ڈالا ہوا لفافہ ملا۔ اس پرچے پر کسی گمنام شخص نے مجھے ایک انتہائی روح فرسا اطلاع دی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ بھی اسی سیریل میں کام کر رہا ہے جس میں پروین تھی مگر اس کا رول بہت غیر اہم اور مختصر ہے۔ وہ ایک ایکسٹرا ہے۔ وہ شوٹنگ کے بعد گھر جانے کے لیے نکلا تھا اور بس کے انتظار میں کھڑا تھا کہ اس نے پروین کو اسٹوڈیو سے نکلتے دیکھا۔ وہ شاید سڑک پر کسی ٹیکسی کا انتظار کر رہی تھی جب ایک پجیرو آئی جس کے شیشے سیاہ تھے۔ دو لوگ گاڑی سے اترے اور پلک جھپکتے میں پری کو گاڑی میں ڈال کے لے گئے۔ اس نے گاڑی کا نمبر لکھا تھا اور یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ نمبر غلط بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ اطلاع وہ کسی اور کے ذریعے پہنچا رہا ہے کیونکہ وہ اپنی ہینڈ رائٹنگ بھی پکڑوانا نہیں چاہتا۔ وہ بہت غریب آدمی ہے اور پجیرو جیسی گاڑیوں میں راہ چلتے لڑکیاں اٹھانے والے بہت طاقتور اور بارسوخ لوگ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے اس نے اپنا نام بھی نہیں لکھا تھا۔

میں یہ پرچہ لے کر تھانے گیا تو تھانیدار نے غرا کے کہا۔ ”پاگل کے بچے۔ معلوم ہے یہ کس کی گاڑی کا نمبر ہے؟“

میں نے کہا۔ ”معلوم ہوتا تو سیدھا اس کے پاس نہ چلا جاتا۔“

تھانیدار نے کہا۔ ”سیدھا گھر چلا جا خیریت چاہتا ہے تو۔۔۔ مجھے رپورٹ لکھ کے اپنی نوکری نہیں گنوانی۔ یہ صوبے کے سب سے طاقتور وڈیرے کے بیٹے کی گاڑی کا نمبر ہے۔“

جب میں نے ہنگامہ کیا اور کورٹ جانے کی اور آئی جی کو شکایت کرنے کی دھمکی دی تو تھانیدار نے مجھے حوالات میں بند کرا دیا۔ پھر وہ چلا گیا مگر جاتے جاتے کسی ماتحت سے کہہ گیا کہ یہ کتا بہت بھونکتا ہے۔ اس کی آواز بند کرو۔ اس کا اشارہ کافی تھا۔ سپاہیوں نے مجھے ننگا کر کے الٹا لٹکایا اور میری چمڑی ادھیڑ دی۔ لیکن انہوں نے میرے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا اور بے رحمی سے چھترول کرتے ہوئے ایک دوسرے سے ہنس ہنس کے پوچھتے رہے کہ کیا ہوا، کتے کی آواز تو پلے جیسی بھی نہیں نکل رہی۔ رات کو میں حوالات میں بے سدھ پڑا آنسو بہا رہا تھا کہ تھانیدار پھر آ گیا۔ اس نے مجھے کمرے میں اپنے پاس بٹھا کے کہا۔ ”میں نے تمہارے بارے میں اور تمہاری بہن پروین کے بارے میں معلومات لی ہیں۔ تمہاری بات سو فیصد درست ہے۔ یہ واقعہ دیکھنے والے اور بھی چشم دید گواہ ملے ہیں لیکن میں کیا کروں۔ میں بہت چھوٹا افسر ہوں۔ میرا اختیار صرف تم جیسے لوگوں پر چلتا ہے۔ اس کے خلاف تو خود ڈی آئی جی صاحب بھی تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ وہ ایسی بے وقوفی کریں تو دوسرے دن ان کا ٹرانسفر اندرونِ سندھ کر دیا جائے۔ اسے تو سیشن کورٹ بھی سزا نہیں سنا سکتی۔ سزا تو دور کی بات ہے، ان کی ضمانت نہ لے تو اس کا بھی ٹرانسفر ہو جائے۔ تم کس قانون کے چکر میں ہو؟ وہ جو کتابوں میں لکھا ہے؟ پاگل ہو تم۔ یہاں تو آئین کو بھی ردی کی ٹوکری میں ڈالنے والے حاکم ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”تھانیدار صاحب! آپ کو مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟“

”چھوڑو یہ بات۔ ہم دن رات تماشا دیکھتے ہیں، کھلی آنکھوں سے ظلم ہوتا دیکھتے ہیں مگر انصاف کی بات نہیں کرتے۔ یہ ایسی ہی دنیا ہے اب۔ تم سمجھ جاؤ تو اچھا ہے ورنہ

بارے جاؤ گے۔ بات اس تک پہنچ گئی تو زیادہ خرابی ہوگی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہارا کام ہی تمام کرادے۔ اس کے باپ کی سیاسی اور بدمعاشی کی طاقت کا تمہیں کچھ اندازہ نہیں۔ لیکن کوئی اس کو بُرا کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ کسی میں ہمت نہیں کہ اس کے خلاف زبان کھول سکے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہاری بہن بہت خوب صورت تھی۔ بس یہی خرابی ہوگئی۔ مجھے میرے مخبروں کے ذریعے اطلاع ملی ہے کہ دو چار دن میں وہ آجائے گی۔ جب اس کا دل بھر جائے گا۔ اس کا تو یہ شوق ہے۔ فائدہ اٹھانے والی لڑکیاں اس کے ایک اشارے پر پہنچ جاتی ہیں۔ ہوسکتا ہے تمہاری شریف بہن نے انکار کیا ہو۔ اسی لیے اسے زبردستی اٹھایا گیا۔ بہتر ہے کہ تم بھی اس پر خاموشی اختیار کرو۔ یہ عزت عصمت سب ڈھکوسلے ہیں غریبوں کے۔ اصل طاقت ہے پیسا۔ وہ تمہاری بہن بھی بہت لاسکتی ہے۔ عقل سے کام لے تو بہت فائدے حاصل کرسکتی ہے۔ نہیں تو خاموشی سے یہ شہر چھوڑ دو۔ اس رسوائی کو یہیں چھوڑ جاؤ۔“

میں نے کہا۔ ”آپ کو یقین ہے کہ دو چار دن بعد وہ آجائے گی؟“

”امید تو ہے۔ اب کیا پتا ہفتہ دس دن لگ جائیں۔ وہ بڑے سائیں کے اور ان کے کسی خاص بندے کو دے دی جائے۔ لیکن وہ نہ آئے تو میرے پاس مت آنا۔“

”پھر کہاں جاؤں تھانیدار صاحب!“ میں بلا اختیار رو پڑا۔

معلوم نہیں کیوں وہ تھانیدار مجھے صحیح مشورہ دے رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”ایک بندہ ہے مگر میرا نام مت لینا۔ نادر شاہ... اس کے پاس جاکے اسے سب بتانا۔ شاید وہ کچھ کرے۔“

میری بہن واقعی آخری روزے پر آگئی۔ اگلے روز عید تھی۔ میں باہر سے آیا تو وہ گھر میں موجود تھی۔ اس کی لاش پنکھے سے لٹک رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ میں نے چلّا کے کہا۔ ”پری!“ اور وہیں گر کے بے ہوش ہوگیا۔ ہوش مجھے اس وقت آیا جب پولیس والے اس کی لاش اتار کے پوسٹ مارٹم کے لیے لے جاچکے تھے۔ لاش شام کو ملی، وہ بھی اس نیک دل تھانیدار کی مدد سے۔ ڈاکٹروں نے رپورٹ میں اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا حوالہ نہیں دیا۔ آخری بار میں نے اس کا چہرہ تب دیکھا جب وہ کفن پہن کے آخری سفر کے لیے تیار تھی۔ سب کے ساتھ میں بھی گیا۔ اسے قبر میں اتارا اور لوٹ آیا مگر رات کو مجھے دورہ پڑا تو میں پھر قبرستان چلا گیا اور صبح تک بیٹھا اس کی مٹی کو اپنے آنسوؤں کی نمی دیتا رہا۔“

نورین بت بنی بیٹھی تھی اور نازی کو روتا دیکھ رو رہی تھی۔ آنسو اس کی کھلی آنکھوں سے دو خاموش جھرنوں کی طرح بہہ کر اپنے ہی دامن میں جذب ہو رہے تھے۔ نازی ہمارے سامنے موجود ہوتے ہوئے بھی یادوں کے ساتھ اپنے ماضی کی اس عید کی طرف لوٹ گیا تھا جو اس کے سوا ساری دنیا کے لیے خوشیوں کا پیغام لائی تھی۔ لوگوں نے گلے مل کر اور کارڈ بھیج کر اور نئے کپڑے پہن کر عید مبارک کہا تھا مگر نیا جوڑا صرف اس کی بہن نے پہنا اور تہِ خاک چھپ گئی تھی۔

اس کے آنسوؤں نے میرے دل سے شکوک کا غبار دھو ڈالا۔ یہ اداکاری نہیں تھی۔ فریب کاری نہیں تھی۔ نورین کو دیکھ کر وہ سچ مچ یہی سمجھ بیٹھا تھا کہ اس سے [illegible] کے لیے بچھڑ جانے والی پری کسی معجزے کی طرح پھر اسی [illegible] میں مل گئی ہے۔ جذبات کی زبان کو عقل سے نہیں سمجھا جاسکتا۔ مجھے بھی لگتا تھا کہ کہیں نازی نے ہماری عقل پر جذبات کا جادو نہ پھینکا ہو مگر اب مجھے کوئی شک نہیں رہا تھا کہ وہ خود [illegible] جذباتی کمزوری کے جال میں گرفتار ہے۔ جو اس نے نورین کو دیکھ کر محسوس کیا تھا، وہ مجھے اب محسوس ہو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ آنسو صاف کرکے خفت سے مسکرایا۔ ”معاف کرنا۔ باتوں میں مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ تمہیں [illegible] آرہی ہوگی۔“

نورین سے پہلے میں نے کہا۔ ”نہیں، تم بتا رہے تھے کہ تھانیدار نے نادر شاہ کے پاس جانے کا مشورہ دیا تھا۔“

”ہاں، میں نہیں جانتا تھا کہ نادر شاہ کون ہے اور کہاں ملے گا۔ ظاہر ہے وہ کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ اسے تلاش کرنا مشکل نہیں تھا لیکن اس سے ملنا آسان نہ تھا۔ بہت سے لوگ صرف اس کا نام جانتے تھے۔ یہ نہیں جانتے تھے کہ اس کا ٹھکانا کہاں ہے۔ کچھ یہ جانتے تھے کہ اس کا کوئی ایک ٹھکانا نہیں۔ سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں وہ تین سو پینسٹھ ٹھکانے بدلتا ہے۔ وہ کسی دیومالائی کردار کی طرح تھا۔ خوف اور دہشت، طاقت اور بربریت کے ساتھ رحم دلی اور سخاوت کا پیکر... جس سے منسوب واقعات میں بھی نیکی بدی کا [illegible] تھا۔ بالآخر میں اس تک پہنچنے میں کامیاب رہا۔

ایک دن میں اکیلا پیدل جا رہا تھا کہ ایک جیپ میرے پاس رکی جس میں صرف ڈرائیور تھا۔ اس نے [illegible] نام لیے بغیر کہا۔ ”نادر شاہ نے بلایا ہے تمہیں... بیٹھو۔“

میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور جیپ مختلف راستوں سے گزرتی کم آمدنی والے لوگوں کے علاقے میں ایک چھوٹے سے اسی گز کے مکان کے سامنے رک گئی۔ میں نے ڈرائیور کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ ”بیٹھے کیوں ہو؟ کیا وہ تمہارا استقبال کرنے گا باہر آکے... جاؤ۔“ اور میں نے اتر کے دروازے کو ہاتھ لگایا تو وہ کھل گیا۔ میں اندر گیا تو ایک لمبی چوڑی گہرے سانولے رنگ کی عورت نظر آئی جس نے بالوں میں اور ہاتھوں کی کلائیوں میں سفید موتیے کے گجرے پہن رکھے تھے۔ آنکھوں میں کاجل لگا رکھا تھا اور سرخ جارجٹ کے کپڑے کا عجیب سا لباس پہن رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کچھ بھی نہیں، ڈیڑھ گز لمبے اور چوڑے چادر جیسے کپڑے کے بالکل بیچ میں ایک سوراخ ہے جس میں اس نے سر ڈال رکھا ہے۔ لباس ہونے کے باوجود لگتا تھا کہ اس نے کچھ بھی نہیں پہن رکھا ہے۔ اس کے جسم کی بوٹی بوٹی تھرکتی صاف محسوس ہوتی تھی۔ میری محویت پر وہ کھلکھلا کے ہنسی۔ ”یہاں کیوں جم گئے... اندر جاؤ چندا۔“ اور میں نے جھینپ کر قدم بڑھائے تو ایک کمرے سے آواز آئی۔ ”آجاؤ نازی۔“

نادر شاہ کو میں نے ایک چارپائی پر گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز دیکھا۔ اس کمرے میں صرف ایک بیڈ تھا اور ایک کرسی۔ وہ میری توقع کے خلاف چھوٹے قد کا دبلا پتلا آدمی تھا۔ تم نے خود دیکھا ہے اسے۔ اس کی شخصیت میں کچھ بھی متاثر کرنے والا نہیں۔ نہ کوئی خوف زدہ کرنے والی بات ہے۔ ہاں اس کی آنکھیں پیلی، انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی جو لگتا ہے آدمی کے آر پار ہوجائیں۔ اس نے کہا۔ ”تم مجھ سے ملنا چاہتے تھے، بیٹھو۔“

میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”مجھ سے ایک تھانیدار نے کہا تھا کہ صرف تم میری مدد کرسکتے ہو۔“

اس نے تھانیدار کا نام نہیں پوچھا۔ ”اپنا مسئلہ بتاؤ۔“

میں نے اسے اپنا مسئلہ بتادیا۔ ”میں فلاں شخص کو قتل کرنا چاہتا ہوں، خود اپنے ہاتھوں سے۔ اس کا خون اپنی بہن کی قبر پر عرقِ گلاب کی طرح چھڑکنا چاہتا ہوں۔“

وہ ہنسنے لگا۔ ”اس کے گھر چلے جاؤ۔ پتا تو تمہیں معلوم ہوگا۔“

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اس کا مطلب ہے، میں نے اب تک اپنا وقت ضائع کیا تمہاری تلاش میں۔ تم کچھ نہیں کرسکتے۔“

”ہر شخص کی ہر بات سن کے اعتبار کرلو گے تو کسی دن خود ضائع ہوجاؤ گے۔“ وہ بولا اور مجھے اٹھ کر جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ”بیوی، تم نے مہمان کو چائے کے لیے بھی نہیں پوچھا۔“

میں نے اس عورت کی جھنکار جیسی ہنسی سنی۔ ”چائے بننے میں وقت تو لگتا ہے جی۔ تمہارا مہمان بہت جلدی میں ہے۔“

”اچھا دروازہ بند کردو۔“ میں نے نادر شاہ کی آواز سنی۔ پھر دروازہ میرے پیچھے بند ہوگیا۔ باہر کوئی جیپ نہیں تھی۔ میں خود ہی اندازے سے ایک طرف چل پڑا اور چلتا گیا۔ نادر شاہ نے مجھے سخت مایوس کیا تھا۔ وہ الو کا پٹھا تھانیدار، اس نمونے کے لیے کہہ رہا تھا کہ جو نہ ڈی آئی جی صاحب کرسکتے ہیں اور نہ کورٹ وہ نادر شاہ کرسکتا ہے۔ یہ تھا نادر شاہ۔ میں تو سمجھا تھا وہ ہوگا جس نے دلّی میں قتلِ عام کا حکم دیا تھا تو گلیوں میں خون ایسے بہہ رہا تھا جیسے نہروں میں پانی بہتا ہے۔ کہیں کسی نے میرے ساتھ مذاق تو نہیں کیا تھا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا مگر ایسا نہیں تھا۔ اگلے ہی روز میں پھر سڑک پر تھا کہ ایک چمچماتی لمبی سیاہ کار میرے پاس خاموشی سے ٹھہر گئی۔ نادر شاہ نے پیچھے کا دروازہ کھول کے مجھے اشارہ کیا تو میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

”تمہارا کام ہوجائے گا۔“ اس نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مگر کچھ تمہیں بھی کرنا پڑے گا۔“

میں نے کہا۔ ”میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

وہ مسکرایا۔ ”سب کچھ تم نہیں کرسکتے۔ بڑے کام کی بڑی قیمت ہوتی ہے۔ یہ چھوٹا سا کام ہے، اس کی چھوٹی سی قیمت ہے۔ تمہارا شکار تمہارے حوالے کردیا جائے گا لیکن اس کے بعد ایک قتل تم اور کروگے ہمارے لیے۔“

میں نے کہا۔ ”ایک اور قتل؟ کس کا؟“

وہ بولا۔ ”جس کا میں کہوں، یہ تو ہمارا آپس کا سودا ہے۔ میں تمہارا وہ کام کر رہا ہوں جو کوئی اور نہیں کرسکتا تھا۔ میں کوئی پیشہ ور قاتل ہوتا تو تم سے لاکھوں میں معاوضہ طلب کرتا۔ یہ کاروباری دنیا ہے۔ میری تمہاری نہ دوستی ہے نہ رشتے داری۔ نہ تم نے مجھ پر کوئی احسان کیا ہے جس کا قرض ہو مجھ پر۔ دیکھا جائے تو احسان میرا ہے کہ میں تمہاری وہ خواہش پوری کر رہا ہوں جو لاکھوں کروڑوں خرچ کرکے بھی پوری نہ ہوتی۔ تمہارے پاس پیسا تو ہے نہیں اور نہ دنیا میں تمہارا ایسا کوئی مددگار دوست ہے۔ ضرورت مند بن کے تم میرے پاس آئے تھے۔ میں نے اپنی قیمت بتادی، نہیں دے سکتے تو کوئی بات نہیں۔ میں کسی سے ذکر نہیں کروں گا، تم جاسکتے ہو۔“

”اور کس کے پاس جاؤں میں؟“ میں نے مایوسی

سے کہا۔

”تو پھر یوں کرو، اپنی بہن کی عزت لوٹنے والے کو معاف کردو۔ معافی کا بڑا اجر ہے۔ صبر کرو، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“ اس نے میرا مضحکہ اڑانے کے انداز میں کہا۔

”میں اسے معاف نہیں کرسکتا۔ میں تب تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک میری بہن کا قاتل زندہ ہے۔ میں اس کام کے لیے تیار ہوں، بتاؤ مجھے اور کس کو قتل کرنا ہوگا۔ ایک دو یا دس... قتل پر موت کی سزا تو ایک ہی بار ہوسکتی ہے۔“

گاڑی رک گئی اور اس نے کہا۔ ”تمہیں زیادہ دن انتظار نہیں کرنا ہوگا۔“

اور ایسا ہی ہوا۔ اچانک ایک رات میرے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی اور کسی اجنبی نے مجھ سے کہا۔ ”تمہیں نادر شاہ نے بلایا ہے... ابھی۔“ اور میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ گلی کے باہر جیپ موجود تھی۔ وہ مجھے کورنگی کی طرف کسی کوارٹر میں لے گیا۔ آگے انڈسٹریل ایریا تھا۔ مجھے ساتھ لے جانے والے نے میرے ہاتھ میں بھرا ہوا ریوالور دے دیا اور بولا۔ ”جاؤ۔“

اس بالکل خالی گھر کے ایک کمرے میں وہ اکیلا بیٹھا تھا۔ ایک صحت مند، خوش شکل اور خوش لباس جوان آدمی تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ ”تم... پری کے بھائی ہو؟“

پری کا نام اس کی زبان سے سن کر میرا خون ابلنے لگا اور جنون کی آندھی میرے عقل و ہوش اڑا لے گئی۔ میں نے چیخ کے کہا۔ ”ہاں وحشی درندے، کتے... میں تیری موت ہوں... بہت دن جی لیا تو۔“

وہ گڑگڑانے لگا۔ ”دیکھو... میری بات سنو... پھر جو تمہارا جی چاہے کرنا۔“

میں نے اس پر اندھا دھند فائر کیے۔ ”یہ عدالت نہیں ہے جہاں تیری سنی جائے۔ اپنا اثر رسوخ استعمال کرسکتا ہے تو موت کے فرشتے کو روک لے۔“

وہ میرے سامنے ہی ٹھنڈا ہوگیا۔ اگر میری جگہ تم ہوتے تو تمہاری عقل بھی کام نہ کرتی۔ تھانیدار نے جس با اثر سیاسی شخصیت کا حوالہ دیا تھا، اس کے دو بیٹے تھے۔ میں دونوں کے نام جانتا تھا لیکن دیکھا میں نے کسی کو نہیں تھا۔ کوئی سوال کیے بغیر اور ثبوت مانگے بغیر میں نے جان لیا کہ نادر شاہ نے اصل مجرم کو میرے حوالے کردیا ہے۔ میرے انتقام کی آگ سرد پڑ گئی اور میں اپنی بہن کی موت کے بعد پہلی بار سکون کی نیند سویا۔ اس کے قاتل کو جہنم رسید کرکے میں سیدھا قبرستان گیا اور پری کی قبر پر بیٹھ کے دھاڑیں مار[کر] رہا۔ جب آنسو ختم ہوگئے تو میں گھر آ کے سو گیا۔

اگلے دن ہی نادر شاہ نے مجھے پھر طلب کر[کے] پوچھا۔ ”ہو گیا تمہارا کام؟“

میں نے کہا۔ ”اب میں مطمئن ہوں۔ [...] قاتل...“

”پری نے خودکشی کی تھی۔“ نادر شاہ بولا۔ ”[...] کی موت کا ذمے دار یہ شخص تھا اس لیے تم اسے قاتل [...] ہو۔ تم نے اسے مار دیا۔ تمہارا کام ہوگیا۔ اب تمہیں [...] کرنا ہے۔“

اس نے مجھے بتا دیا کہ کس کی جان لے کر مجھے [...] احسان کا بدلہ اتارنا ہے۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا [...] نے مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ اس نے مجھے فریب [دیا] تھا۔ جب میں نے اس کا کام کردیا تو مجھے معلوم ہوا کہ [...] میں مارنا چاہتا تھا وہ تو زندہ ہے۔ وہ اپنی دولت، طاقت [اور] اثر رسوخ کے حصار میں محفوظ ساری دنیا میں پھر رہا تھا [اور] ابھی پھر رہا ہے۔ اس کا ہر ٹھکانا ایک قلعہ ہے۔ لاہور، [کراچی،] اسلام آباد، مری کے علاوہ... دنیا کے ہر بڑے شہر میں [...] محل نما گھر ہے اور ہر محل ایک قلعہ ہے جس میں اس کی [...] اور اجازت کے بغیر پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ جو قتل میں نے [...] کیا تھا، اس کی پوری ویڈیو ریکارڈنگ نادر شاہ کے پاس [...] جو قتل میں نے اس احسان کا قرض چکانے کے لیے کیا [اس کی] بھی پوری فلم بندی ہو رہی تھی۔ ہر قتل کے گواہ اس کے [...] پہلے ہی موجود تھے۔

میری نادر شاہ سے پھر ملاقات ہوئی تو میں نے [...]

”شاہ جی... وہ سور کا بچہ تو زندہ سلامت پھر رہا ہے [جسے میں] قتل کرنا چاہتا تھا۔ آپ نے میرے ہاتھوں کس کو مروا دیا[؟]“

”تم نے اس کو مارا جو تمہاری بہن کی موت کا ذمے دار تھا۔ اسی نے پروین کو اسٹوڈیو کے باہر سے اٹھا کے گاڑی میں ڈالا تھا۔ بہت لوگ تھے دیکھنے والے۔“

میں نے کہا۔ ”مگر شاہ جی... اصل مجرم تو اس [...] آدمی کا بڑا بیٹا تھا۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟ کیا کسی نے یہ دیکھا کہ [...] اس کے پاس پہنچایا گیا تھا؟ کسی نے تمہیں بتایا کہ پری نے...“

میں چلایا۔ ”شاہ جی! ساری دنیا جانتی ہے [کہ وہ] قماش کا آدمی ہے اور ساری دنیا جانتی ہے کہ میرے [ہاتھوں] مارا جانے والا اس کے حکم کا غلام تھا۔“

”کیا حکم کے غلام فرشتے ہوتے ہیں؟ وہ پری کو نہ اٹھاتا تو کچھ نہ ہوتا۔ میری اطلاع کے مطابق وہ پری کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اسے اپنے گھر میں رکھا تھا اور میری اطلاع غلط نہیں ہوسکتی۔ اصل مجرم وہی تھا۔“

نادر شاہ کے سامنے میں بے بس تھا۔ میں اسے جھوٹا نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میرے ساتھ دھوکا ہوا۔ اس نے میرے ہاتھوں اس کا خون کروا دیا جو جرم میں معاون تھا، شریک تھا لیکن اصل مجرم نہیں تھا۔ اس نے حکم کی تعمیل کرنے والے کو مروا دیا۔ اس خونی درندے کو چھوڑ دیا۔ حقیقت تو یہی ہے کہ نادر شاہ بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ حکم کے غلام ہر جگہ قربانی کے بکرے بنائے جاتے ہیں لیکن اس کے بعد رفتہ رفتہ مجھ پر سب کچھ واضح ہوتا چلا گیا۔ خواہشِ انتقام میری کمزوری بن گئی تھی اور اس نے اسی سے فائدہ اٹھایا۔ میں جرم اور گناہ کے ایک کھیل میں شریک ہوگیا جس کو چھوڑنا میرے اختیار میں نہ تھا۔ پھر میں بلیک میل ہوا اور وہ سب کرتا گیا جو نادر شاہ نے کہا۔“

خاموشی کا ایک وقفہ آیا جس کے بعد نازی نے گھڑی دیکھی۔ ”میرا خیال ہے اب سونے کی فکر کرنی چاہیے۔“

اس کے جانے سے پہلے میں نے کہا۔ ”نازی! ایک سچ اور بول سکتے ہو؟“

وہ رک گیا۔ ”ہاں، میں ہر سچ بتا سکتا ہوں جو میں جانتا ہوں۔“

”کیا وہ دوسرا قتل... جو تم نے پہلے قتل کی قیمت چکانے کے لیے کیا... میرے بھائی کا تھا؟“

وہ اپنی جگہ پر منجمد ہوگیا۔ اس کی آنکھیں خلا میں ٹھہر گئیں اور اس کی صورت پر اعترافِ جرم کی تحریر یوں ابھر آئی کہ میں ہی نہیں، نورین بھی اسے صاف پڑھ سکتی تھی۔ خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد اس نے کہا۔ ”دیکھو... اس وقت نہ میری تم سے کوئی دشمنی تھی نہ شناسائی۔ میں بھی حکم غلام تھا۔“

”یعنی تم اعتراف کر رہے ہو کہ اسے تم نے ہی مارا تھا؟“

”تم چاہو تو مجھے قتل کرکے اس کے خون کا بدلہ لے سکتے ہو۔ جیسے میں نے پری کے خون کا لیا۔ مگر یہ بات میں نے بھی دیر سے سمجھی تھی کہ قتل کون کرتا ہے... ریوالور... وہ ہاتھ جس میں ریوالور دیا جاتا ہے... یا ریوالور دینے والا۔ مہذب مغربی دنیا میں ایک بات کہی جاتی ہے کہ قتل اسلحہ نہیں کرتا... لوگ کرتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”اس کے باوجود سزائے موت گولی چلانے والے ہی کو دی جاتی ہے وہاں بھی۔“

اس وقت نورین نے اپنی مداخلت ضروری سمجھی۔ ”جب ہم اس بات کو ختم کرچکے ہیں تو دوبارہ کیوں کر رہے ہیں؟“

میں نے تلخی سے کہا۔ ”فکر مت کرو... تمہارا بھائی اب محفوظ ہے۔“

نازی خاموشی سے باہر چلا گیا۔ ”مجھے تو سخت تھکن ہے اور نیند آرہی ہے۔“ نورین نے کہا اور بستر پر لیٹ گئی۔ ”یہ لائٹ مت بجھانا۔“

میں نیچے دری پر لیٹ گیا اور نہ جانے کتنی دیر تک چھت کو گھورتا رہا جو ایک سینما اسکرین بن گئی تھی اور جس پر میری عمرِ رفتہ کی کتاب کا ہر صفحہ ایک زندہ منظر کی طرح سامنے آرہا تھا۔ میں اور میرا بھائی جو اسی طرح چھوٹے سے بڑے ہوئے تھے جیسے پری اور نازی۔ نازی کے اور میرے جذبات کی شدت میں فرق نہ تھا۔ اس نے اپنا بدلہ لے لیا تھا۔ میں نادر شاہ کے اس خیال سے متفق تھا کہ اصل مجرم وہی تھا جو نازی کے ہاتھوں مارا گیا۔ اسی اصول پر اصل مجرم تو نازی ہی ثابت ہوتا تھا۔

نہ جانے کب خیالوں کے پُرآسیب جنگل میں بھٹکتے بھٹکتے نیند نے مجھے اپنی مہربان آغوش میں لے لیا۔ میرا جسم اس سے زیادہ ٹینشن اور تھکن برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے دماغ سے نیند کی پناہ مانگ لی۔ صبح نہ جانے کس وقت میری آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ بلب روشن تھا مگر بند دروازے کی جھری سے دن کا اجالا چمک رہا تھا۔ ایک سوراخ سے گزر کر آنے والی دھوپ فرش پر ننھا سا سفید دائرہ بنا رہی تھی اور اس کی گزرگاہ کے سرمئی دھندلکے میں غبار کے ذرات تیرتے نظر آئے۔

”خاور! اٹھو... دیکھو دروازہ باہر سے کیوں بند ہے؟“ نورین کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔

میں نے اٹھ کر دروازے کو کھولنا چاہا۔ وہ واقعی باہر سے بند تھا۔ میں نے چلا کے نازی کو آواز دی مگر میری ہر پکار کا جواب سناٹے نے دیا۔ ”دروازہ باہر سے مقفل ہے۔“ میں نے کہا۔

ہم بے یقینی کے ساتھ نیم روشن کمرے میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔

ہر محاذ پر ایک نئے داؤ کی منتظر
جواری کی تدبیریں اگلے ماہ پڑھیے

ہیرا پھیری

مختار آزاد

ہنرمندی اور عقل مندی سے کاروبار میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ وہ بھی بیک وقت ان دونوں اوصاف پر مکمل دسترس رکھتا تھا... ماحول اور موسم کی سختیوں سے قطعِ نظر اسے صرف اپنی دکان اور دکان داری سے واسطہ رہتا تھا...

ایک چونکا دینے والے انجام سے مزین...... مغرب سے تازہ تر کہانی......!

کیلن نے حسبِ عادت دکان کے قریب اُس مخصوص مقام پر اپنی سیاہ مرسڈیز پارک کی جہاں سے ہیم بروک اسٹریٹ سے گزرنے والے ہر شخص کی نگاہ کیلن سائمن جیولری شاپ کے بڑے اور سنہرے حروف میں لکھی عبارت پر ضرور پڑتی تھی۔ اس نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس آف کیں مگر انجن بند نہیں کیا۔ اس نے ریڈیو کھولا، گھڑی پر نظر ڈالی اور اُس مشتبہ شخص پر اپنی نظریں گاڑ دیں جو اس کی دکان کے سامنے والی فٹ پاتھ پر کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ ریڈیو سے موسم کی خبر نشر ہو رہی تھی۔ اناؤنسر کا کہنا تھا کہ شدید سردی کی لہر بدستور جاری رہنے کا امکان ہے۔ اس نے گاڑی کا ہیٹر ایک بار پھر آن کر دیا۔

اس کہر آلود صبح سڑک خالی تھی اور اِکا دُکا لوگ ہی پیدل آ جا رہے تھے۔ اس دوران میں دو تین لوگ اس کی دکان کے برابر واقع بیکری میں بھی داخل ہوئے۔ کیلن نے آخری بار، دو سال پہلے تب اس بیکری میں قدم رکھے تھے جب اس کی دکان کو چوروں سے محفوظ کرنے کے لیے نیا سیکیورٹی نظام نصب ہو رہا تھا۔ اب اس کی جیولری شاپ مکمل طور پر محفوظ تھی لیکن پھر بھی اس بیکری کی وجہ سے اسے اپنی شاپ ہمیشہ خطرے میں محسوس ہوتی تھی۔ کنکریٹ کی موٹی تہ دار دیوار، ساتھ ہی ڈرل سے محفوظ اسٹیل کی چادر، خفیہ کیمرے اور لیزر ٹارچ جیسی چیزیں نصب کرانے کے بعد چوروں کا کھٹکا تو ختم ہو چکا تھا مگر پھر بھی اس کے ذہن میں خوف بیٹھا تھا کہ اگر کوئی شاطر نقب زن بیکری کے اندر سے نقب لگائے تو با آسانی جیولری شاپ لوٹ سکتا ہے۔

اسی خدشے کے سبب کئی سال پہلے اس نے بیکری کے مالک کو پیشکش کی تھی کہ وہ دونوں رقم ملا کر بیکری کی دیواریں مضبوط کرا سکتے ہیں لیکن اس نے کیلن کی ہنسی اڑا دی۔ اس کے بعد سے وہ اُس کی شکل دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا۔ اس نے جو بھی حفاظتی انتظامات کرائے، اپنی دکان کے اندر سے ہی کرائے تھے۔ کیلن نہ جانے کیوں اس بیکری مالک کو مشکوک سمجھنے لگا تھا حالانکہ کئی سال گزرنے کے باوجود اس کی طرف سے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی جس سے وہ مشتبہ ٹھہرتا۔

ان دنوں وہ کچھ زیادہ ہی فکر مند تھا۔ انشورنس کی مدت پوری ہونے والی تھی اور پالیسی کی تجدید میں کئی دن لگ سکتے تھے۔ اسے خوف تھا کہ اگر انشورنس کی مدت ختم ہونے اور دوبارہ تجدید کے مراحل سے گزرنے کے دوران کسی نے اس کی شاپ لوٹ لی تو پھر سو فیصد یقینی نقصان صرف اس کا اپنا ہوگا۔ وہ انشورنس کی تجدید پہلے ہی کرا لیتا مگر کمپنی نے افراطِ زر کے باعث پریمیم کی رقم بڑھا دی تھی اور اب وہ کسی ایسی کمپنی کی تلاش میں تھا جو گزشتہ پریمیم سے کم نہیں تو کم از کم اتنی ہی رقم میں انشورنس کر لے۔ وہ حفاظتی نظام کی تنصیب پر بہت بڑی رقم خرچ کر چکا تھا، مزید خرچ کرنا اس کے لیے اب بوجھ ثابت ہو رہا تھا پھر بھی اس کی نظر میں انشورنس نہایت سنجیدہ معاملہ تھا جسے وہ قطعی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

آج کل کے دور کے چور بھی حیران کن طور پر ترقی یافتہ ہو گئے تھے۔ کیلن نے سن رکھا تھا کہ وہ کسی خاموش رات میں بند شاپ کا تالا توڑ کر اندر داخل ہوتے ہیں اور مشینوں کی مدد سے، دیوار میں نقب لگا کر سب کچھ لوٹ لیتے ہیں۔ کبھی وہ پولیس افسر کی وردی میں ملبوس ہو کر اندر داخل ہوتے ہیں، پہلے تلاشی کے نام پر اسے گاہکوں سے خالی کراتے ہیں اور پھر مالک سے تجوری کھلوا کر نہایت آرام سے سب کچھ لوٹ کر لے جاتے ہیں۔ کبھی وہ بکتر بند گاڑی میں سوار ہو کر شاپ کے استقبالیہ پر پہنچتے ہیں اور اسلحے کے زور پر اسے خالی کر جاتے ہیں۔ اس طرح کی ہر خبر وہ دلچسپی سے پڑھتا اور اس کے بعد گھنٹوں اپنی جیولری شاپ کی فکر میں غرق رہتا۔ جتنے حفاظتی اقدامات وہ کر سکتا تھا، وہ سب کا کر چکا، اب اسے بڑی حد تک یقین تھا کہ وہ محفوظ ہے مگر پھر بھی چوری کا کھٹکا مکمل طور پر اس کے دل و دماغ سے محو نہیں ہو سکا تھا۔

کیلن نے بیلٹ میں اڑسا بلیک بیری نکالا اور سیکیورٹی کوڈ داخل کر کے دکان میں نصب خفیہ کیمروں سے اندر کا جائزہ لینے لگا۔ اپنی گرم کار سے باہر نکلنے سے پہلے وہ ایک بار پھر اچھی طرح تسلی کر لینا چاہتا تھا کہ گزشتہ شب بھی اس کی شاپ مکمل طور پر محفوظ رہی تھی۔

اندر سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ اس نے بلیک بیری واپس پاؤچ میں رکھا اور ایک لمحے کے لیے پھر سامنے نظر ڈالی۔ سرخ اینٹوں سے بنی جیولری شاپ کے بیرونی حصے پر لکڑی کا نفیس کام تھا ساتھ ہی دیواروں پر سفید رنگ کیا گیا تھا۔ سادہ سا بیرونی منظر پُروقار تھا۔ 'کیلن جیولری شاپ' کے پینٹل سے بنے، سنہرے موٹے موٹے حروف پر کل رات پڑنے والی سفید برف بدستور جمی ہوئی تھی۔ کیلن نے گہری سانس لی اور ایک بار پھر ریڈیو کی آواز اونچی کی۔ اناؤنسر کہہ رہی تھی کہ محکمۂ موسمیات کے مطابق اگلے ایک گھنٹے میں دھند چھٹنا شروع ہو جائے گی۔ اس نے ریڈیو آف کیا۔ ڈیش بورڈ کو ہلکا سا تھپ تھپایا۔ اُس وقت اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی، ایسی پُراسرار مسکراہٹ جس کی بظاہر کوئی وجہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

وہ سیاہ سِلک کے باریک لائن دار سوٹ میں ملبوس تھا۔ قمیص کے کف میں ہیروں کے قیمتی کف لنکس لگے تھے۔ سفید شرٹ پر سنہری ٹائی اس نے کل ہی ایک مہنگے برانڈ کی ڈریس شاپ سے خریدی تھی۔ کیلن وضع قطع کے لحاظ سے قدامت پسند تھا اور اس کے قیمتی اور عمدہ تراش خراش والے سوٹ سے بھی یہی شے جھلک رہی تھی۔ وہ دکان پر آتے وقت نہ صرف ہمیشہ قیمتی لباس پہنتا کیونکہ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔

'شاندار خبر۔' چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے زیرِ

لب کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ ریموٹ کنٹرول سے گاڑی لاک کر کے وہ نپے تلے انداز میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا شاپ کی طرف بڑھا۔ اچانک وہ چلتے چلتے لمحہ بھر کے لیے رکا اور بیلٹ درست کرنے کے بہانے اپنے کوٹ کے بٹن کھول دیے۔ اس کی بغل میں ہولسٹر لٹک رہا تھا جس میں موجود پستول بھرا ہوا تھا۔ اگرچہ وہاں کوئی نہیں تھا لیکن وہ چاہتا تھا کہ اگر کوئی خفیہ طور پر اس کی نگرانی کر رہا ہے تو وہ یہ بھی دیکھ لے کہ شکار خود بھی خالی ہاتھ نہیں۔

اس صبح کیلن کسی کو نشانہ بنانے کے ارادے سے قطعی نہیں نکلا تھا لیکن بھرا پستول لٹکائے رکھنے کا مقصد تھا کہ اگر کوئی اسے یا اس کی شاپ کو لوٹنے کی کوشش کرے تو پھر اس کے بعد وہ لٹیرا کسی دوسرے کو لوٹنے کے قابل ہرگز نہ رہ سکے۔ کیلن کے لیے لٹنے کا خیال ہی سوہانِ روح تھا۔ وہ دل میں ٹھان چکا تھا کہ کبھی خود کو آسان شکار نہیں بننے دے گا۔ وہ اس لیے بھی ہر وقت بھرا پستول ساتھ رکھنے لگا تھا کہ اس نے کئی معروف جیولرز کے قصے سنے تھے جو صرف نہایت معمولی حفاظتی اقدامات نظر انداز کیے جانے کی وجہ سے لٹے تھے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ خود بھی انہی کی طرح کا ایک قصہ بن جائے۔ اس لیے وہ نہایت سوچ سمجھ کر اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا تھا۔ وہ چوروں، لٹیروں کے خوف سے اتنا سنکی ہو چکا کہ تھا گھر سے شاپ اور یہاں سے گھر آنے جانے کے دوران میں پانچ چھ متبادل راستے استعمال کرتا اور کبھی مقررہ وقت پر نہ شاپ سے نکلتا اور نہ ہی گھر سے۔ وہ اسے بنیادی نکتہ سمجھتا تھا۔ اس کے خیال میں شکار جتنا بڑا ہو، لٹیرے اس کی تیاری بھی اتنی ہی زیادہ کرتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتا کہ ممکنہ طور پر اسے لوٹنے کی منصوبہ بندی میں، لٹیرے اس کے روز مرہ معمولات کا فائدہ اٹھائیں۔

بظاہر وہ اطمینان سے آگے بڑھ رہا تھا لیکن کن انکھیوں سے اطراف پر بھی نظریں رکھے ہوئے تھا۔ اس صبح وہاں ایسا کچھ نہ تھا جو اس کے لیے پریشانی کا سبب بنتا۔ اس نے بڑے سکون سے پہلے تالا کھولا اور چابی جیب میں ڈال کر ایک بار پھر چاروں طرف احتیاط سے نظریں گھمائیں اور الیکٹرانک لاک کا کوڈ سیٹ کر کے بٹن دبا دیا، دروازہ کھل چکا تھا معمول کے مطابق۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور اندر داخل ہو گیا۔ دروازے پر کھڑے کھڑے اس نے چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ ہر شے بالکل اُسی طرح تھی جس طرح کل رات چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ آگے بڑھا، جواہرات، جڑاؤ زیورات اور گھڑیوں کے شیلف پر نظریں ڈالتے ہوئے

وہ اس طرح آگے بڑھا جیسے وہ کسی فوجی دستے کا ... کرتے ہوئے سلامی لے رہا ہو۔ ہر چیز اس کے اطمینان کا باعث تھی۔ یہ اس کا برسوں پرانا معمول تھا۔ ہر صبح وہ ... دل کے ساتھ شاپ میں داخل ہوتا اور جب اچھی طرح ... کر لیتا کہ گزشتہ شب بھی شاپ نقب زنوں سے محفوظ رہی ... لمحہ بھر کے لیے مطمئن ہو جاتا لیکن یہ اطمینان صرف ... دیر کا مہمان ہوتا، اس کے بعد وہ اس الجھن میں گرفتار ... کہ پورا دن پڑا ہے، کہیں کوئی لٹیرا نہ لوٹ لے جائے۔

کیلن کے برسوں کے اس معمولات میں صرف ... فرق آیا تھا۔ وہ شاپ کے اندر کا جائزہ لینے کے بعد عقبی ... طرف بڑھتا تھا جب یہ اطمینان ہو جاتا کہ پہاڑی کی ترائی ... کھلنے والا ایمرجنسی عقبی دروازے کا تالا اور زینہ بھی محفوظ ... وہ لاک ایک بار پھر اچھی طرح چیک کر کے پلٹتا مگر چار ... پہلے اس نے علاقے کے فائر مارشل کی خصوصی اجازت سے ... دروازہ نکال کر اینٹوں سے چنوا دیا تھا۔ عقبی دیوار بظاہر ... کی تھی مگر اس کی دو پرتوں کے درمیان اسٹیل کی موٹی چادر ... دی گئی تھی، یوں ویران عقبی حصے سے اگر کوئی نقب لگا... کوشش کرتا، تب بھی یہ آسانی کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔

کیلن نے جیولری شاپ دو حصوں میں بانٹ رکھی ... ایک شوروم تھا جب کہ عقبی حصے میں تجوری، خالی ڈب... پتھروں، جواہرات کی کٹائی اور پالش کا انتظام تھا۔ دکا... دو حصوں میں تقسیم کرنے والی دیوار اس عمدگی سے بنائی ... کہ کوئی اجنبی کافی دیر تک یہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ اس ... حصہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے ایک بار پھر بیرونی دروازے کے الیکٹرانک لاک کو چیک کیا اور عقبی حصے کی طرف بڑ... وہاں تاریکی چھائی تھی۔ اس نے گہری سانس لی۔ ناک ... پالش کی مہک بھر گئی۔ اس نے دیوار کی طرف ہاتھ بڑھ... بٹن دبا دیا اور روشنی ہوتے ہی چاروں طرف دیکھا۔ ہر ... درست جگہ پر تھی۔ اس نے دائیں طرف ہاتھ بڑھا کر ... مخمل کا پردہ اٹھایا، وہاں اس کی بڑی سیاہ تجوری چمک ... تھی۔ اس پر بڑے بڑے سنہری حروف میں لکھا تھا: ...

کیلن فائن جیولری۔

اس تجوری میں بیش قیمت زیورات اور جواہرات ... جن کی قیمت لاکھوں ڈالروں میں تھی۔ اس نے آگے ... تجوری پر نظر جمائی۔ سب کچھ کل جیسا تھا۔ ویسے ... کھولنا آسان کام نہیں تھا۔ اس کا الیکٹرانک لاک ... اگر اسے کھولنے کی کوشش کی جاتی تو اسی وقت بوسٹن ... ڈپارٹمنٹ کے ایمرجنسی ڈیوٹی روم میں گھنٹی بجتی۔

تا کہ پولیس اس الارم پر فوری توجہ دیتی۔ اس کی دو ٹھوس ... تھیں۔ ایک تو یہ کہ پولیس اسٹیشن قریب تھا اور دوسرا یہ کہ اس کی شاپ کے برابر میں بیکری اور ڈونٹ شاپ تھی۔ وقت بے وقت وہاں اکثر پولیس والے اپنی بھوک مٹانے کے لیے چکر لگاتے رہتے تھے لیکن حفاظتی طور پر ہر ہفتے تجوری کے لاک سسٹم کا کوڈ بدل دیتا تھا۔

رات کو شاپ بند کرنے سے قبل وہ بعض قیمتی زیورات و جواہرات تجوری میں لاک کر دیتا تھا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ملازمین کی آمد میں کچھ وقت باقی تھا۔ اس نے کوڈ ملایا اور زیورات نکال کر انہیں شوروم کے اَن بریک ایبل شیشے سے بنے شیلف کے اندر ان کی جگہوں پر سجانے لگا۔ یہ بھی اس کا روز کا معمول تھا۔ وہ ملازمین کے چلے جانے کے بعد انہیں خود تجوری میں رکھتا اور صبح ان کے آنے سے پہلے ہی شیلف میں مخصوص جگہوں پر واپس رکھ دیتا۔

سب کچھ اپنی جگہ سیٹ کر کے اس نے چاروں طرف طائرانہ نظر ڈالی اور اطمینان سے سیاہ چمڑے سے بنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ یہاں سے باہر کا منظر بالکل واضح تھا۔ اس نے ایک نظر کلائی پر بندھی قیمتی گھڑی پر ڈالی اور پھر سامنے کی دیوار پر لگے وال کلاک کو دیکھا۔ ملازمین کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے پہیے والی کرسی کو تھوڑا سا آگے کھسکایا اور پاؤں سے سرخ رنگ کا ایک بٹن دبا دیا۔ بوسٹن پولیس سیکیورٹی سسٹم کو اس الارم کے ذریعے اطلاع مل جاتی کہ گزری رات بھی جیولری شاپ چوروں اور نقب زنوں سے محفوظ رہی تھی۔ یہ اس کی ہر صبح کے آغاز کا آخری معمول کا کرتا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر 'اوپن' کا نشان بھی آن کر دیا، یعنی کی اُس صبح سائمن کیلن فائن جیولری شاپ گاہکوں کے لیے باقاعدہ کھل چکی تھی۔

اسی دوران میں دروازے کی گھنٹی بجی۔ سامنے مارگریٹ اور ہیکسن کھڑے تھے۔ یہ دونوں دکان کے پرانے ملازمین تھے جن کی ذمے داریوں میں ہر صبح معمول کے کام شروع کرنے سے پہلے ضروری صفائی ستھرائی کرنا بھی شامل تھا۔ مارگریٹ کے مقابلے میں وہ ہیکسن کو زیادہ قابلِ بھروسا سمجھتا تھا۔ یہ اس کے پاس گزشتہ پانچ سالوں سے ملازم تھا۔ قابلِ اعتبار سمجھنا اپنی جگہ لیکن کیلن ہر سال پولیس ڈپارٹمنٹ سے اس کا کریمنل ریکارڈ چیک کرنا کبھی نہیں بھولتا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بٹن دبایا اور بیرونی داخلی دروازہ کھل گیا۔

بہت سالوں کے لیے جواہرات اور بیش قیمتی زیورات کا کاروبار نہایت پُرکشش ہے لیکن منافع کا بڑا حصہ بھاری انشورنس کی ادائیگی، حفاظتی انتظامات، سیکیورٹی سسٹم اور گارڈز کی تنخواہوں پر اٹھ جاتا ہے جب کہ اب مارکیٹ بھی اتنی منافع بخش نہیں رہی تھی۔ اصلی جیسے نقلی جواہرات کے باعث لوگوں نے زیادہ پیسا خرچ کرنا چھوڑ ہی دیا تھا۔ ایسے میں اگر کوئی ڈاکا وغیرہ پڑ جائے اور بدقسمتی سے اس دوران میں انشورنس کی چھتری بھی نہ ہو تو سر منڈاتے ہی اولے پڑنا یقینی تھا۔ یہی بات کیلن کی پریشانی بھی بڑھاتی جا رہی تھی۔ انشورنس کی معیاد گزر چکی تھی اور جب تک تجدید نہیں ہو جاتی تب تک ایک ڈاکا بھی اسے سڑک پر لانے کے لیے کافی تھا۔ وہ کئی بار معروف جوہریوں کے ساتھ ایسا ہوتا دیکھ چکا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ ایک ڈاکا جوہری کی زندگی کو کیسے تباہ و برباد کر سکتا ہے اس لیے ان دنوں وہ ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھا رہا تھا۔

ہیکسن دکان کے باہر رات پڑنے والی برف صاف کر رہا تھا جبکہ مارگریٹ عقبی حصے میں تھی۔ اگرچہ شوکیس ہر ہفتے پالش سے اچھی طرح چمکائے جاتے تھے اور مارگریٹ نے آتے ہی فوری طور پر خاص قسم کے رومال سے انہی صاف بھی کر دیا تھا لیکن نہ جانے کیوں بیٹھے بٹھائے کیلن کو اچانک احساس ہوا کہ کاؤنٹر پر کچھ نادیدہ سی دھول جمی ہے۔

اس نے نہایت گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔ بظاہر تو ایسی کوئی بات نظر نہیں آ رہی تھی مگر کیلن کی شکی طبیعت اُن دنوں اپنے عروج پر تھی، یہی بات اسے بے چین کر گئی۔ وہ میز کے نیچے جھکا۔ وہاں اس کی شاٹ گن رکھی تھی۔ اس نے جھکے جھکے گن لوڈ کی اور اسے مزید قریب کھسکا لیا۔ بوسٹن پولیس کے سیکیورٹی سسٹم پر نظر ڈالی اور پھر عقبی حصے کی طرف دیکھ کر آواز دی۔ ”مارگریٹ... کیا یہاں آسکتی ہو؟“

چند لمحوں بعد وہ نمودار ہوئی۔ اس وقت وہ ناخن پالش لگا رہی تھی۔ ”کہیے...“ اس نے قریب پہنچ کر کہا۔ اس کی نگاہیں بدستور ناخنوں پر تھیں۔

”مجھے چند اہم گاہکوں کے آنے کی توقع ہے تو کیا تم انہیں...“

”کیوں نہیں سر بالکل مدد کر دوں گی۔“ اس نے پوری بات سنے بغیر چہک کر جواب دیا۔ ویسے بھی اسے امیر ترین لوگوں سے ملنے کا بہت شوق تھا اور جنہیں کیلن اہم کہے تو پھر ان کے امیر ترین ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔

مارگریٹ کے بات کاٹنے اور چہک کر جواب دینے پر کیلن لمحہ بھر کے لیے تلملایا مگر پھر خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔ ”شکریہ... لیکن میں کہنا چاہ رہا تھا کہ جب وہ یہاں تشریف لائیں اور میں ان کے ساتھ مصروف ہوں تو ایسے میں اگر کوئی

دوسرے گاہک آجائیں تو کیا تم انہیں سنبھال لوگی؟"

یہ سن کر مارگریٹ نے منہ بنایا اور چیونگم چباتے ہوئے بے رخی سے اثبات میں سر ہلایا اور پاؤں پٹختے ہوئے عقبی حصے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کو جاتے دیکھ کر اس نے سوچا کہ اب تک اس تنک مزاج کو ملازمہ کیوں رکھا ہوا ہے۔ اس سوال کا جواب وہ خود اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ چاہتا بھی تو اسے نکال نہیں پاتا۔ کیلن کی طبیعت میں نفاست تھی اور مزاج عاشقانہ تھا مگر وہ شائستگی اور تہذیب کا دامن ہمیشہ تھامے رکھتا۔ مزاج کے لحاظ سے وہ خاصا حُسن پرست واقع ہوا تھا اور مارگریٹ ہر لحاظ سے حُسن کا پیکر تھی۔

دلکش چہرہ نسوانی جاذبیت سے بھرپور تھا، لمبا قد، خوبصورت چال، سنہرے گچھے دار بال، اگر وہ یہاں نہ ہوتی تو ہالی ووڈ کی کوئی حسین ترین اداکارہ ضرور ہوتی۔ کیلن یہ بات جانتا تھا۔ گزشتہ کئی برسوں سے وہ اس کے سارے ناز نخرے ہی اس لیے برداشت کر رہا تھا آج تک اسے اس مارگریٹ سے زیادہ حسین ملازمہ مل نہیں سکی تھی۔ وہ دن بھر دکان میں جو کچھ کرتی تھی، اس وقت کا بڑا حصہ اس کی اپنی آرائش و زیبائش پر ہی صرف ہوتا تھا، ویسے کیلن کو بھی اس کا یوں بنے سنورے رہنے اچھا لگتا تھا۔

دوسری بات یہ بھی تھی کہ اکثر اوقات نئے گاہک جیولری سے زیادہ اس کی دلکش اداؤں اور گچھے دار باتوں میں پھنس کر بھاری خریداری کر لیتے تھے۔ اس لیے وہ نہیں سمجھتا تھا کہ مارگریٹ کی ملازمت اس پر کوئی بوجھ ہے لیکن اس کی یہ عادت ضرور بن چکی تھی کہ دن میں کئی بار وہ اس کی باتوں پر دل ہی دل میں پیچ و تاب ضرور کھاتا تھا لیکن کچھ دیر بعد خود ہی سب کچھ بھلا دیتا۔ مارگریٹ کو سیاہ رنگ بہت پسند تھا اور زیادہ تر وہ صرف سیاہ لباس ہی پہنتی تھی۔ سیاہ رنگ اس کی کھلی کھلی گلابی رنگت پر جچتا بھی خوب تھا۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ کیلن خود دل سے یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ کبھی اسے چھوڑ کر جائے۔

مارگریٹ کو امیر ترین لوگوں سے ملنے کے علاوہ قیمتی زیورات کا بھی بہت شوق تھا۔ وہ ہر وقت گلے میں پرل کا ایک قیمتی نیکلس پہنے رکھتی اور اس کے بلاؤز کے کنارے ہمیشہ قیمتی جواہرات سے مزین مگر خالص سفید سونے کا ایک خوبصورت بروچ جڑا رہتا تھا۔ جواہرات اور زیورات سے اس کی دلچسپی کو کیلن اچھی طرح سمجھتا تھا۔ مارگریٹ جب بھی کوئی ایسا زیور دیکھتی جو اسے پسند آجاتا تو اس کی آنکھیں پھیل جاتی تھیں اور سانسوں کی رفتار تیز ہو جاتی تھی مگر کچھ ہی دیر بعد اس کے چہرے پر اداسی اور درد کے آثار بھی امنڈ آتے تھے۔

لاحاصل پسند کا احساس اس کے چہرے پر صاف ... تھا کیلن بن کے اس کی دلی کیفیات بھانپ جاتا۔

بیویوں اور محبوباؤں کے لیے قیمتی زیورات خریدنے والے اکثر مارگریٹ کو اسے پہنا کر دیکھتے ... اپنی پسند اس میں کیسے جچے گی۔ وہ بخوشی گاہکوں کی ... لیتی اور اس کی گچھے دار باتوں کے علاوہ شاید مارگریٹ ... مسحور کن حُسن بھی تھا کہ گاہک لیے بغیر دکان سے نہ ... امیر ترین شخصیات تو صرف مارگریٹ کی وجہ سے ہی ... گاہک بن چکے تھے۔

کیلن بلا کا جوہر شناس تھا۔ اس کے گاہکوں ... سے لے کر اسٹاک بروکر اور صنعت کاروں تک ... تھے۔ زیادہ تر کی بیویوں اور محبوباؤں سے بھی وہ واقف ... اسے یقین تھا کہ اگر جیولری شاپ پر کوئی حسین ساحرہ ... بزنس پر اثر پڑتا ہے۔ وہ گاہک کا چہرہ دیکھتے ہی سمجھ ... کون کس حد تک جانے کا ارادہ رکھتا ہے اور کیلن اسے ... سکتا ہے۔ جب وہ نئے گاہکوں سے ڈیل کے لیے مارگریٹ ... مدد کے واسطے پکارتا تو وہ بھی سمجھ جاتی تھی کہ اسے کیا ... ہوگا۔ کیلن کو اس کی سب سے اچھی بات یہی لگتی تھی ... نے کبھی کسی گاہک کو خریدے بنا جانے نہیں دیا۔ اگر کوئی ... ہزار ڈالر کا نیکلس خریدنے کی نیت سے داخل ہوتا تو وہ ... پچاس ہزار ڈالر تک کی خریداری کرا دیتی تھی۔ یہ بھی ایک ... تھی کہ اس نے مارگریٹ کی کبھی کوئی فرمائش نہیں ٹالی ... نے جب بھی کچھ کہا، وہ اس نے پورا کیا اور جب اس نے ... بھی نہیں کہا، تب بھی اچھی ڈیل ہونے پر اسے کچھ نہ ... ورنہ ڈنر یا شاپنگ تو ضرور کرائی۔

جہاں تک گاہک شناسی کا تعلق ہے تو کیلن اس میں ... یکتا تھا۔ ڈاکٹر ہیری کی ہی مثال لے لیں۔ اس کا جب ... بار فون آیا تو کیلن کے لیے یہ حیران کن بات تھی۔ اس ... پہلے وہ اس کی شاپ پر کبھی نہیں آیا تھا۔ اس نے کیلن کو ... زیادہ سوالات کرنے کی اجازت نہیں دی، شاید ... ملاقات سے قبل بہت کچھ باتیں ڈھکی چھپی رکھنا چاہتا ... ڈاکٹر کی ہوشیاری اپنی جگہ لیکن کیلن بھی کم کائیاں نہ تھا ... نے ڈاکٹر سے ملاقات سے قبل اس کے بارے میں ... ذرائع سے بنیادی معلومات حاصل کر لی تھیں جن کے ... ڈاکٹر ہارٹ فورڈ میں رہتا تھا لیکن ماس جنرل اسپتال ... مریضوں کے آپریشن کے لیے ہر ہفتے بوسٹن جاتا تھا ... سے اہم بات یہ تھی کہ اس نے شادی کے موقع پر اپنی ... ہیرے کی جو انگوٹھی پہنائی تھی، وہ کئی برس پرانی ہو چکی ...

اب وہ شادی کی آنے والی سالگرہ سے قبل اس ویڈنگ رنگ کو اپ گریڈ کرانا چاہتا تھا۔

جب کیلن اور ڈاکٹر ہیری کی گفتگو شروع ہوئی تو کیلن کے دماغ کا کمپیوٹر اور کلکولیٹر، دونوں بھرپور صلاحیتوں سے کام کرنے لگے۔ اس کا دماغ تیزی سے چل رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر نئی انگوٹھی پر کتنا پیسا خرچ کر سکتا ہے۔ ویسے پرانی انگوٹھی کا سائز کافی چھوٹا ہوگا۔ وجہ کیلن کا یہ یقین تھا کبھی خوبصورت رہنے والے ڈاکٹر ہیری کی بیوی اب بھدی اور موٹی ہو چکی ہوگی۔ ویسے کیلن جانتا تھا کہ جو شوہر بہت زیادہ عرصہ شادی نبھا چکے ہوں، بیویاں ان کے لیے نوادرات کی طرح قیمتی اور اہم ہو جاتی ہیں۔ اس لیے وہ سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر کو کاٹا جا سکتا ہے لیکن کس حد تک، یہ ابھی طے نہیں کر سکا تھا۔ اس کے دماغ میں مختلف ہندسے جل بجھ رہے تھے۔

"پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں مگر انگوٹھی کا جواب نہیں ہونا چاہیے، میرا مطلب ہے کہ ہیرا شاندار ہونا لازمی ہے۔" ڈاکٹر ہیری نے کہا۔

یہ سن کر کیلن نے دل ہی دل میں سکھ کا سانس لیا۔ اب اسے صرف یہ طے کرنا تھا کہ وہ ڈاکٹر کو مطمئن کرنے کے ساتھ ساتھ کتنی رقم کما سکتا ہے۔ وہ یہ بات بخوبی جانتا تھا کہ ہر گاہک کی ایک حد ہوتی ہے بس! وہ یہ تعین کرتا تھا گاہک کو کس طرح اس حد تک لے جا سکے۔ ڈاکٹر کے معاملے میں بھی وہ اسی فارمولے پر غور کر رہا تھا کہ سودے میں اسے کہاں تک کھینچ سکتا ہے۔ اس نے رقم کے بجائے خوش اخلاقی سے انگوٹھی کے سائز اور وزن سے بات شروع کی۔

"میرا خیال ہے کہ ڈھائی سے ساڑھے تین قیراط کے درمیان تک تو ہونی چاہیے۔"

ڈاکٹر ہیری کا جواب سن کیلن کے دل کی دھڑکنیں ذرا سی تیز ہوگئیں۔ "اے جی ایس ڈائمنڈ سب سے بہترین ہے، ویسے وی ایس ٹو بھی کوئی برا نہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ تم آئندہ ہفتے تک چار پانچ مناسب ہیرے منگوا لو، میں اپنی بیوی کو ساتھ لیتا آؤں گا، وہ ان میں سے کسی ایک کو پسند کر لے گی۔" ڈاکٹر ہیری نے کچھ ایسے لہجے میں کہا کہ جیسے وہ انتخاب کے معاملے میں ذرا کمزور ہو۔

"ٹھیک ہے..." کیلن نے خالص کاروباری مسکراہٹ لبوں پر سجاتے ہوئے جواب دیا۔ "گاہک کا اطمینان ہمارے لیے منافع سے زیادہ قیمتی ہے۔" اس نے مسکرا کر بات مکمل کی۔

"ٹھیک ہے تو پھر اگلے ہفتے ہم ملتے ہیں، میں آنے سے پہلے فون کر دوں گا۔"

"بہت بہتر..." کیلن نے بھی خوش دلی سے جواب دیا۔

جیسے ہی ڈاکٹر ہیری نے فون بند کیا، کیلن ریسیور رکھ کر اٹھا اور تیزی سے شیلف کی طرف بڑھا۔ وہ کسٹمر ڈائریکٹری نکال کر انڈیکس کی مدد سے ڈاکٹر ہیری کا ریکارڈ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اسے مطلوبہ معلومات مل گئیں۔ : ڈاکٹر رچرڈ ہیری دوئم، ایف ایس ایم میڈ گرپ، ہارٹ فورڈ۔ اسے اب تک یقین نہیں تھا کہ یہ وہی ڈاکٹر ہو سکتا ہے۔ کیلن نے جلدی سے ریمارکس پر نظر دوڑائی کہ شاید کوئی اور اشارہ مل سکے مگر وہاں صرف ایک لفظ لکھا تھا 'کیوٹ'۔ کیلن ہینڈ رائٹنگ پہچان گیا۔ باقی تحریر تو مارگریٹ کی تھی لیکن وہ ایک لفظ کسی اور ہینڈ رائٹنگ میں تھا۔

کیلن مختلف الفاظ پر سوچنے لگا۔ ایف ایس ایم میڈ گرپ سے کیا مُراد ہو سکتی تھی۔ یہ فیڈرل سروسز میڈیکل گروپ بھی ہو سکتا تھا۔ اس نے فروخت کی رقم کو دیکھا۔ ڈائریکٹری میں لکھا تھا ایک لاکھ سولہ ہزار ڈالر مگر یہ نہیں تحریر تھا کہ اس نے خریدا کیا تھا۔ پھر اس نے لفظ 'کیوٹ' پر غور کیا۔ یہاں اسے کچھ حسد محسوس ہوا۔ فون پر ڈاکٹر کی آواز سن کر اسے لگا کہ اُس کی عمر اچھی خاصی ہوگی، کم از کم مارگریٹ کے مقابلے میں تو لازمی ایسا ہی تھا۔ نہ جانے کیوں اسے یہ ریمارکس پسند نہیں آیا۔ ایک بیوی ہوتے ہوئے دوسری کا دل میں خیال... یہ بات ذہن میں آتے ہی وہ زیر لب بڑبڑایا "لعنت ہو" اور آگے بڑھ کر کسٹمر ڈائریکٹری واپس شیلف میں رکھ دی پھر وہ پلٹا اور روزمرہ کے معمولات انجام دینے لگا۔

دو تین دن میں ہی اس نے پانچ چھ ایسے ہیرے جمع کر لیے جو ڈاکٹر کی مرضی کے مطابق تیار کردہ انگوٹھی میں جڑاؤ کی خاطر مناسب تھے۔ اسی دوران اسے نارتھ اینڈ کے ہول سیلر بیوپاری سگمنڈ نے بھی بیش قیمت چھوٹے ہیروں کی ایک کنسائنمنٹ بھیج دی تھی۔ اب کیلن کو پورا یقین تھا کہ ڈاکٹر ہو یا اس کی بیوی، ان میں سے کم از کم ایک ہیرا انہیں اتنا ضرور پسند آئے گا کہ وہ اسے فوری طور پر خریدے بنا نہیں رہ سکیں گے۔

اسی دوران میں اسے اپنے موبائل فون پر ڈاکٹر اور اس کی بیوی کے بھی دو تین ٹیکسٹ میسج ملے۔ ڈاکٹر نے امید ظاہر کی تھی کہ وعدے کے مطابق ہیروں کا انتظام ہو جائے گا۔ کیلن نے اسے جواب دیا کہ جس وزن میں انہیں ہیرا درکار ہے، وہ انتظام کر چکا بس پالش اور فنشنگ میں ایک دو دن لگیں گے۔ مسز ہیری اپنے شوہر سے زیادہ بے تاب تھیں۔ انہوں نے میسج کیا کہ پیر تک ہیرے تیار ہونے چاہئیں، وہ ہر

حال میں منگل کی صبح پہنچ کر ان میں سے ایک پسند کرے گی۔
اب وہ اس سے زیادہ ایک دن بھی ہیرا خریدے بنا نہیں رہ سکتی۔ میسج پڑھ کر کیلن کو یقین ہو چلا تھا کہ منگل کی صبح دکان داری کا آغاز ایک اچھے سودے کے ساتھ ہوگا۔ منگل آنے میں دن باقی تھے۔ کیلن نے ویک اینڈ سے پہلے ہی ہیرے تیار کر کے، کیس میں سجا کر تجوری میں رکھ دیے تھے۔ ہر ہیرے کا وزن تین سے ساڑھے تین قیراط کے درمیان تھا۔

منگل آیا اور گزر گیا لیکن نہ تو ڈاکٹر ہیری آیا اور نہ ہی اس کا کوئی فون۔ کیلن سارا دن اُن کی آمد کا منتظر رہا۔ اس نے دو تین بار اسے فون کرنے کی کوشش کی لیکن فون آنسر نگ مشین سے منسلک تھا۔ ہر بار اس نے پیغام چھوڑا مگر جوابی فون نہ آیا پھر اسے اگلی دوپہر موبائل پر میسج ملا جس نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔

کیلن کاؤنٹر کے پیچھے اسٹول پر بیٹھا ایک بار پھر وہی میسج کھول کر پڑھ رہا تھا: سوری کیلن، آج لوگن میں بہت دھند ہے اور میں صرف وی ایف آر ہوں۔ اسے کل دوپہر پر چھوڑتے ہیں... ہیری۔

اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ کسٹمر ڈائریکٹری میں جس خریدار کا نام اس نے ڈھونڈا تھا، وہ یہی ہے۔ وہاں بھی اس نے مختلف الفاظ استعمال کیے تھے اور یہاں میسج میں بھی لیکن وہ سمجھ نہ سکا کہ وی ایف آر کا مطلب کیا ہے۔ جب تک یہ نہیں سمجھتا، اسے ڈاکٹر کے پیغام کی پوری بات سمجھ نہیں آسکتی تھی۔

کیلن کے ایک بوڑھے انکل تھے جو جنگِ عظیم دوئم کے دوران میں ائرفورس میں خدمات انجام دے چکے تھے۔ دھند اور وی ایف آر کے درمیان تعلق کا مطلب سمجھنے کے لیے اس نے انکل سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ نشے میں تھے لیکن جب کیلن نے انہیں فون کر کے وی ایف آر کا مطلب معلوم کیا تو انہوں نے جھٹ سے جواب دیا "ویری لو وژول یا بہت کم فاصلے تک نظر آنا۔" یہ سن کر کیلن نے سوچا کہ شاید اس کا چھوٹا موٹا جہاز بھی ہے اور دھند کے باعث وہ اسے اڑانے سے قاصر، شاید وہ اپنے جہاز کے ذریعے بیوی کو یہاں تک لانا چاہتا ہو یا ممکن ہے کہ وہ کہیں اور ہو اور دھند کے باعث اڑان بھرنا اس کے لیے ممکن نہ ہو۔ دھند ہو یا جہاز میں خرابی، کیلن کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا، اسے تو بس ہیرے فروخت کرنے اور مال اپنے بینک اکاؤنٹ میں منتقل کرنے کی فکر تھی۔ یہ سوچ کر اسے خود پر بھی افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے خوانخواہ ڈاکٹر کو کمتر سمجھا، جو پارٹی اپنا جہاز رکھ سکتی ہے، اس موٹی اسامی کو وہ اس سے کہیں زیادہ نچوڑ سکتا ہے، جتنا کہ اس نے اندازہ لگایا تھا۔ کیلن نے نگاہ اٹھا کے شیشے کی دیوار پار جھانکا، باہر بدستور برف باری ہو رہی تھی۔ جب وہ شاپ پر پہنچا، تب بھی گہری دھند چھائی ہوئی تھی اور برف باری ہو رہی تھی لیکن اب صبح کے مقابلے میں برف باری خاصی کم تھی۔

"یہ بھی بہت اچھا ہوا۔" کیلن نے زیرِ لب کہا۔ وہ اسے خوش قسمتی سمجھا، برف باری اور دھند کے باعث اسے اپنا مال سدھارنے کے لیے وقت مل چکا تھا۔

گزشتہ رات دیر گئے برنکس سیکیورٹی کا گارڈ جیمولوجیکل امریکن انسٹیٹیوٹ سے کچھ اعلیٰ درجے کے رنگ لیکن قیمتی اور نہایت چھوٹے ہیرے لے کر پہنچا تھا۔ کیلن نے ہیروں پر ایک نظر ڈال کر انہیں تجوری میں رکھ دیا۔ رات کافی ہو رہی تھی اور شدید سردی اور برف باری کے باعث سڑک پر بھی سناٹا تھا۔ اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اسے تجربہ تھا کہ یہ ماحول لٹیروں کے لیے نہایت سازگار ہوتا ہے اس لیے کیلن کو شاپ بند کرنے کی جلدی تھی مگر اب جب کہ کم از کم ڈاکٹر ہیری کی آمد کا امکان نہ تھا اور دوسرے یہ کہ اب وہ جان چکا تھا کہ اسامی موٹی ہے تو اسے پھانسنے کے لیے اس نے ان ہیروں کا تفصیلی معائنہ کرنے کا سوچا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ڈاکٹر کو ایک کے بجائے کئی ہیرے انگوٹھی میں جڑوانے پر بھی آمادہ کر سکتا ہے۔

وہ اٹھا اور تجوری سے ہیروں کا پیکٹ نکال کر معائنہ کرنے والی مخصوص میز پر جا پہنچا۔ میز پر سیاہ مخمل کا میز پوش بچھا تھا۔ کیس کے اندر مخمل کا ایک پاؤچ تھا۔ اس کے اندر ایک خاکی لفافے میں ہیرے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہیروں کے معیار اور ان کے اصلی ہونے کے بارے میں امریکن جیم ایسوسی ایشن کی لیبارٹری کا تصدیق نامہ بھی منسلک تھا۔ کیلن نے نہایت احتیاط سے چھوٹے اور بے رنگ ہیرے نکال کر ایک ایک کر کے اپنے سامنے سجانا شروع کیے۔ اسی دوران میں نہ جانے کس طرح ایک ہیرا اس کے ہاتھ سے نیچے گرا۔ وہ تراش خراش کے بعد اتنا نازک ہو چکا تھا کہ گرتے ہی اس کے کنارے ٹوٹ گئے۔ اس نے نہایت احتیاط سے اسے اٹھایا اور محدب عدسے سے اس کا تفصیلی معائنہ کیا۔ اگرچہ اس کی حیثیت ابھی برقرار تھی لیکن بطور جوہری وہ جانتا تھا کہ بے رنگ، قیمتی ہیرا اب داغدار ہو چکا جس کا مطلب اس کی قیمت میں یقینی کمی ہے۔

کیلن کی سوچ کے مطابق یقیناً ڈاکٹر ہیری ایک چالاک گاہک تھا۔ وہ دکان دار سے ذاتی تعلقات پیدا کر کے خریداری کرنے کا عادی تھا کہ اس طرح اُس میں کم از کم

آنکھوں کی شرم بیدار کر سکے۔ اسی لیے اس نے ہیرے کی خریداری کے لیے اس شہر کے سب سے معتبر شہرت رکھنے والی جیولرز شاپ کو ہی ترجیح دی تھی۔ وہ اپنے پیسوں کے بدلے اچھا مال خریدنے کا عادی تھا۔ ان میں سے نہیں تھا جو بہت خوبصورت اور سجی سنوری چیزوں کی تصاویر دیکھ کر انٹرنیٹ کے ذریعے گھٹیا مال خرید لیتے ہیں۔ اسے تو چھان پھٹک کر مال خریدنے کی عادت تھی۔

کیلن کو بھی ان گاہکوں سے سخت چڑ تھی جو جیب میں نہیں دھیلا پر دیکھنے چلے میلہ' کی مصداق منہ اٹھائے چلے آتے اور بیش قیمت ہیرے نکلوا نکلوا کر دیکھتے رہتے لیکن جب ان کے دام سنتے تو سارا جوش بلبلے کی طرح بیٹھ جاتا۔ آخر کار خود تو معذرت کر کے چلتے بنتے مگر اس کا وقت برباد کر جاتے، اوپر سے جسمانی اور ذہنی مشقت الگ۔ کیلن کی عادت تھی کہ وہ ہر گاہک کو دیکھتے ہی، دل ہی دل میں حساب کتاب کرنے لگتا کہ ہر گاہک کتنے میں پھنسے گا۔ یہ دماغی مشق تو اب اس کی عادت بن چکی تھی اس لیے ہر گاہک، خواہ وہ کچھ خریدے یا نہ خریدے، اس کے جانے کے بعد وہ ایک کپ بلیک کافی ضرور لیتا تھا۔

اسی دوران میں مارگریٹ آ گئی۔ وہ اس کے لیے کافی لے کر آئی تھی۔ اس نے ایک لمحے کو اسے دیکھا اور مبہوت رہ گیا۔ کھلی کھلی رنگت پر سیاہ اسکرٹ اور سرخ بلاؤز، ساتھ ہی گلاب پنکھڑیوں کے مانند لبوں پر شوخ رنگ کی لپ اسٹک اس کے حُسن کو چار چاند لگا رہی تھی۔ "بہت ہی زیادہ خوبصورت..." مارگریٹ نے اس کے سامنے مگ رکھا تو وہ زیرِ لب بولا۔

"شکریہ..." اس نے مسکرا کر جواب دیا اور پلٹ کر اتراتی ہوئی چلی گئی۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر، مارگریٹ کو ساتھ لے کر کہیں باہر جائے اور کسی کافی شاپ میں اسے سامنے بٹھا کر گھنٹوں دیکھتا رہے مگر اگلے ہی لمحے وہ پھر سے جوہری بن چکا تھا۔ اس نے گرم گرم کافی کا گھونٹ بھر کر ذہن میں مچلتے جذبات کے شعلے سرد کیے اور ایک بار پھر کاؤنٹر پر رکھے ہیروں کی طرف متوجہ ہوا۔

کافی پینے کے بعد اس نے چند ہیرے علیحدہ کیے۔ اسے امید تھی کہ کم از کم دو ہیرے تو وہ ضرور ڈاکٹر کو فروخت کر دے گا۔ اس نے علیحدہ کیے ہیروں کے سوا، باقی تمام ہیرے احتیاط سے پیک کیے اور جو علیحدہ رکھے تھے، انہیں پالش کر کے چمکانے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے ڈاکٹر کے لیے علیحدہ کیے ہیروں کو خوبصورت سے کیس میں پیک کیا اور خالی لفافے میں اسے رکھ کر، باقی ہیروں کے ساتھ احتیاط سے تجوری میں رکھ آیا۔

ان کاموں سے فارغ ہو کر وہ شاپ کے داخلی دروازے پر آیا اور شیشے کے پار آسمان کو تکنے لگا۔ وہ موسم کا اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا کہ موسم صاف ہے اور کم از کم اتنا صاف تو ضرور ہے کہ ڈاکٹر ہیری ائرپورٹ سے اُڑان بھر سکے۔ وہ ڈاکٹر اور اس کی بیوی کی آمد کا شدت سے منتظر تھا۔

باہر دن کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ اسی دوران ایک اوھیڑ عمر شخص آیا اور رک کر، شوکیس میں لگے نمائشی نقلی زیورات تکنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ تیزی سے آگے بڑھا اور سڑک عبور کر کے سامنے والے میڈیکل اسٹور میں گھس گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک نوجوان جوڑا آیا۔ اسے سستی مگر چوکور زرقون جڑی شادی کی انگوٹھی درکار تھی۔ کیلن کا خیال تھا کہ وہ دونوں کسی ہائی اسکول میں پڑھتے ہوں گے، سو اس نے ان پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ مایوس ہو کر خالی ہاتھ ہی لوٹ گئے۔

مارگریٹ شاپ کے عقبی حصے میں بیٹھی مسز ملیری کی منتظر تھی۔ وہ قریب میں ہی رہتی تھیں۔ مارگریٹ کو جانتی تھیں اسی لیے انہوں نے اپنے ہیرے جڑے ٹاپس پالش کے لیے اسے دیے تھے، جنہیں اب ہیکسن پالش کر رہا تھا۔ اس نے مسز ملیری کو بارہ بجے کا وقت دیا تھا۔ ہیکسن نے ٹاپس پالش کر کے واپس اس کے کیس میں رکھے اور زنجیر سے بندھی، کوٹ کی اوپری جیب میں رکھی جیبی گھڑی نکال کر وقت دیکھنے لگا۔ اگرچہ امریکا سمیت پورے یورپ میں جیبی گھڑی کا استعمال متروک ہو چکا لیکن ہیکسن اب بھی جیبی گھڑی استعمال کرتا تھا۔ خود کیلن کے لیے بھی شروع شروع میں یہ تعجب کی بات تھی لیکن اب وہ بھی ہیکسن کی عادت جان چکا تھا۔ کیلن بدستور شیشے کے سامنے کھڑا باہر تک رہا تھا۔ ایک بار پھر برف گرنے لگی تھی۔

وال کلاک، گیارہ بج کر چالیس منٹ کا وقت بتا رہا تھا۔ مارگریٹ، کیلن کے سامنے مسز ملیری کے ٹاپس اور اس کا بل رکھ رہی تھی کہ ڈور بیل بجی۔ سامنے اونی اور کوٹ میں ملبوس، بڑی حد تک جوان نظر آنے والا شخص کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کافی مگ تھا۔ کیلن نے ہاتھ بڑھا کر بٹن دبایا اور دروازہ کھل گیا۔ اگرچہ وہ ڈاکٹر ہیری کی آمد کا منتظر تھا لیکن اس شخص کا حلیہ اور عمر دیکھتے ہوئے بظاہر وہ خود کو یہ باور کرانے پر ہرگز تیار نہ تھا کہ یہی وہ شخص ہو سکتا ہے، جس کا اسے شدت سے

انتظار تھا۔ اسی دوران وہ شخص اندر داخل ہوا۔ مارگریٹ بھی سیدھی کھڑی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ”ایک مرتبہ پھر تم سے مل کر اچھا لگا۔“ اس نے اندر داخل ہوتے ہی مارگریٹ کے چہرے کی طرف تکتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”شکریہ...“ مارگریٹ نے رسماً مسکرا کر کہا مگر اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ اس سے پہلے کبھی اسے دیکھا ہو، خاص کر شاپ میں۔

اس کی آواز خاصی بھاری تھی جسے سنتے ہی کیلن کے دماغ میں جھماکا ہوا۔ وہ فون پر اسے سن چکا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات فوراً بدل گئے، مسکرا کر اٹھا اور گرمجوشی سے نووارد کی طرف اپنا داہنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا۔ ”مجھے یقین ہے کہ آپ کا ہوائی سفر آرام دہ گزرا ہوگا ڈاکٹر ہیری۔“

یہ سن کر نووارد نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا اور چاروں طرف طائرانہ نظر ڈالی۔ ”کہیں میں ذرا جلدی تو نہیں آگیا۔“ اس نے کیلن کی طرف دیکھتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”ایسا لگتا ہے کہ ابھی ابھی دکان کھولی ہے آپ نے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے مگ کاؤنٹر پر رکھا اور اپنے اونی دستانے اتارنے لگا۔

”پلیز...“ کیلن نے کرسی کی طرف اشارہ کر کے بیٹھنے کو کہا۔ اس کے چہرے پر بھرپور کاروباری مسکراہٹ تھی۔

”چاہتا ہوں کہ میری بیوی کے یہاں آنے سے قبل ہی سارے معاملات طے کر لیے جائیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر مگ اٹھایا اور کافی کا گھونٹ بھرا۔ ”تو آپ نے ہیروں کا انتخاب کرلیا ہے!“ اس نے کیلن کی طرف دیکھتے ہوئے استفساریہ لہجے میں کہا۔

”یقیناً...“ کیلن نے نہایت تابعدارانہ انداز سے کہا۔ ”آپ کی پسند کے مطابق میں نے نہایت عمدہ چھ ہیرے منتخب کیے ہیں، مجھے امید ہے کہ جب آپ انہیں دیکھیں گے تو یہی سوچیں گے کہ ایک نہیں، سارے خرید لوں۔“

یہ سن کر ڈاکٹر ہیری نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ پرانا ہیرا ابھی نئی انگوٹھی میں جڑا رہے۔“

”جانتا ہوں۔“ کیلن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”ویسے میرا خیال ہے کہ انگوٹھی کے درمیان ایک بڑا اور دونوں طرف ایک، ایک چھوٹا ہیرا جڑنا چاہیے۔“

”بہت خوب...“ وہ مسکرایا۔ ”خیال اچھا ہے۔“

”مگر تھوڑا خرچ والا بھی...“ کیلن نے لقمہ دیا اور پھر خود ہی اپنی بات پر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

”کوئی بات نہیں، بیگم کے لیے یہ بھی سہی۔“

”لگتا ہے، بہت زیادہ پیار کرتے ہیں اپنی محتر...

”جی ہاں...“ اس نے مصنوعی انداز سے ...

جواب دیا۔ ”اسی لیے چاہ رہا تھا کہ جب وہ یہاں آ...

سجائی تیار انگوٹھی ملے، میں ان کے سامنے لین دین...

نہیں کرنا چاہوں گا۔“

”سمجھ گیا۔“ کیلن پھر مسکرایا۔

”نہیں سمجھے...“ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہو...

”وہ جتنی کفایت شعار ہیں، میں اتنا ہی فضول خرچ...

ذرا سا بھی اندازہ ہوا کہ انگوٹھی کتنی مہنگی ہے تو سمجھو سو...

”اوہ...“ کیلن نے حیرت سے کہا اور دل ہی...

خوش ہوا کہ اچھا ہے کہ وہ محترمہ اس وقت یہاں نہ...

سوچ رہا تھا کہ جب ڈاکٹر کو خود اپنی فضول خرچی کا...

ہے تو میں بھی اسے ذبح کرنے میں کسر نہیں چھوڑ...

”آپ جیسا چاہیں گے، سارے معاملات ویسے ہی...

ہو جائیں گے۔“

”شکریہ۔“ ڈاکٹر ہیری مسکرایا۔

”ایک اچھے جوہری کی خاصیت یہ بھی ہے کہ...

لوگوں کی بیگمات کے مزاج اور ان کے شوہروں کی جی...

اچھی طرح سمجھتا ہو۔“ کیلن نے سنجیدگی سے کہا۔...

مارگریٹ اور ڈاکٹر نے زوردار کا قہقہہ لگایا۔

”میرے خیال میں اب کام کی بات شروع...

ہیں۔“ ڈاکٹر ہیری نے سنجیدگی سے کہا۔

”ٹھیک ہے لیکن ایک منٹ...“ یہ کہتے ہو...

اٹھا۔ ”میں آتا ہوں۔“ وہ دکان کے عقبی حصے کی طرف...

جہاں تجوری میں وہ ہیرے رکھے تھے، جنہیں اس...

ہیری کو دکھانے کے واسطے منتخب کیا تھا۔ کچھ دیر بعد...

اس کے ہاتھ میں ہیروں کا ایک پیکٹ تھا۔ ”ایک تو...

خاص طور پر آپ کے لیے منتخب بھی کرلیا ہے، دیکھیے...

یقیناً پسند کریں گے۔“ وہ کاؤنٹر کی دوسری جانب...

پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”کل چھ ہیرے میں نے منتخب...

دو تین تو آپ کا دل ہی موہ لیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ...

لگا۔ ”ساڑھے تین سے چار قیراط تک کے ہیں۔“

ہیرے کی جانچ پڑتال کے لیے جوہری مخ...

کے ساتھ ایک خاص روشنی خارج کرنے والا...

استعمال کرتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ کیلن لفافہ...

ہیرے باہر نکالتا، ڈاکٹر نے کہا۔ ”سوری... کیا میں...

استعمال کرسکوں گا۔“

”کیوں نہیں۔“ کیلن نے خوش دلی سے جواب دیا اور لیمپ اس کی طرف کھسکایا۔ وہ سمجھ گیا کہ ڈاکٹر بھی کم گھاگ نہیں ہے۔

”اور محدب عدسہ بھی...“

”یقیناً...“ یہ کہتے ہوئے کیلن نے دراز کھولی۔ جیسے ہی اس کی توجہ اس جانب ہوئی، ڈاکٹر نے نہایت تیزی سے جھپٹا مارا اور جس پیکٹ میں چھ ہیرے تھے، اسے اٹھا کر باہر کی طرف دوڑا۔

مارگریٹ بھی وہیں کھڑی تھی۔ وہ دونوں سمجھ ہی نہیں سکے کہ پل بھر میں کیا ہو گیا۔ مارگریٹ کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور کیلن دم بخود دروازے کی سمت دیکھ رہا تھا جو خودکار طریقے سے بند ہو چکا تھا۔ اسے یہ بھی دھیان نہیں رہا کہ کاؤنٹر کے نیچے بھری شاٹ گن رکھی ہے اور اس کے بغلی ہولسٹر میں ریوالور بھی ہے۔ وہ دم بخود تھا۔

پہلی بار اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ باہر سے دروازہ تب ہی کھلتا ہے جب اندر سے بٹن دبا دیا کوڈ ملاؤ لیکن اندر سے یہ عام دروازے کی طرح ہی کھولا جاسکتا تھا۔ بظاہر کیلن سکتے کے عالم میں تھا لیکن اس کا ذہن تیزی سے چل رہا تھا۔ انشورنس، الیکٹرانک لاک، اپنی غلطی، لٹیرا، پولیس، تجوری... وہ مختلف پہلوؤں پر تیز رفتاری سے سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

خود کو بطور ڈاکٹر ہیری متعارف کرانے والا لٹیرا ٹونی سیلن تھا۔ وہ دوڑتے دوڑتے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ریسنگ موٹر بائیک کی طرف بڑھا جہاں اس کی ساتھی ٹینا انجن اسٹارٹ کیے، سر پر ہیلمٹ پہنے چلنے کو تیار تھی۔ موٹر بائیک گھریلو تھی جیسے ہی وہ لپک کر بیٹھا، ٹینا نے کلچ چھوڑ دیا اور محض چند سیکنڈوں کے اندر ہی کیلن کی دکان لٹنے اور لٹیرے کا فرار مکمل ہو گیا تھا۔

ٹونی نے بیٹھتے ہی اپنی بانہیں ٹینا کی کمر کے گرد حمائل کیں اور منہ اس کے کان کے قریب لا کر چلایا۔ ”چھ ہیرے ہیں اور میرے خیال میں اچھے خاصے وزنی بھی۔“ اس کی آواز پرجوش تھی۔ کامیاب واردات کی خوشی اور مال ہتھے لگنے کا جوش اس کی آواز سے ظاہر تھا۔

”زبردست...“ ٹینا نے کہا۔ برف باری کے سبب سڑک پر بہت پھسلن تھی۔ تیز رفتاری کے سبب گرنے کا بھی خطرہ تھا مگر پھر بھی وہ کافی تیز لیکن سنبھل کر بائیک چلا رہی تھی۔

”کہاں جارہی ہو؟“ ٹونی نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔ تیز ہوا تھپیڑے کی طرح اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

”بہتر ہے ڈاکٹر ہیری کو فون کرو، اسی کی طرف چلتے ہیں۔“ ٹینا نے منہ پیچھے کر کے جواب دیا۔

”اوکے۔“ یہ کہہ کر وہ ہاتھ کوٹ کے اندر ڈال کر موبائل فون نکالنے لگا۔ سڑک بالکل خالی تھی اور دونوں کو احساس ہو چکا تھا خطرے سے نکل چکے، شاید اسی لیے ٹینا نے رفتار کچھ ہلکی کر دی تھی۔ ٹونی نمبر ملا رہا تھا۔ اسی دوران اچانک برف باری تیز ہو گئی اور انہیں ایسا لگا جیسے برف کے گولے میں دھنس رہے ہوں مگر ٹینا نے کمال ہوشیاری سے بائیک آگے بڑھائی اور لمحہ بھر میں وہ اس جگہ سے باہر نکل آئے جہاں برف تیزی سے گر رہی تھی۔ ”سنبھل کے...“ ٹونی نے لقمہ دیا۔

”اپنا کام اچھی طرح جانتی ہوں۔“ اس نے منہ پیچھے کر کے چلاتے ہوئے کہا۔ ”نمبر ملا؟“

”رنگ ہو رہی ہے۔“

”اوکے...“

”ہیلو... ڈاکٹر ہیری؟“ فون ملتے ہی ٹونی چلایا۔ وہ اس طرح چیخ چیخ کر بول رہا تھا جیسے ہوا کے تھپیڑوں اور تیز چلتی موٹر بائیک کے شور میں اسے آواز صاف سنائی نہیں دے رہی ہو۔

اچانک ٹینا نے بریک لگائے، ٹونی گرتے گرتے بچا۔

”ہر وقت بکواس مت کیا کرو۔“ یہ کہہ کر اس نے فون چھینا اور موٹر سائیکل سے اتری۔ ”ڈاکٹر ہیری... اب تم چلاؤ، میرے ہاتھ ٹھنڈے ہو چکے۔“

”اوکے... مسز ہیری۔“ یہ سنتے ہی ٹینا نے زور کا قہقہہ لگایا۔ ٹونی بھی زور سے ہنس پڑا۔

☆☆☆

کیلن بدستور سکتے کے عالم میں دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مارگریٹ بھی دم سادھے مگر حواس باختہ اسے ہی دیکھے جارہی تھی۔ اسی دوران وہ زیرِ لب کچھ بڑبڑائی مگر کیلن کچھ نہ سن سکا۔ اس کی نگاہیں کاؤنٹر پر رکھے دستانوں اور اُس کافی مگ پر تھیں جو کچھ دیر پہلے لٹیرے کے ہاتھ میں تھا۔ اب تک مگ سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔

”مارگریٹ...“ کیلن نے خاموشی توڑی۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ”پلیز... پولیس کو فون ملاؤ۔“ یہ کہہ کر وہ خفیہ کیمروں سے دکان کے اندر کی ریکارڈنگ کرنے والے سرویلنس ریکارڈر کی طرف بڑھا، ڈی وی ڈی نکال کر اسے کوڑ میں ڈالا، کیمرے آف ہو چکے تھے۔ دوسری طرف مارگریٹ پولیس اسٹیشن کا نمبر ملا رہی تھی۔

کیلن سوچ رہا تھا کہ پولیس کو یہاں تک پہنچنے میں کم سے کم بھی پانچ سات منٹ لگ سکتے ہیں۔ وہ باہر نکلا اور چاروں طرف دیکھا۔ سڑک خالی تھی، برف باری بدستور جاری تھی۔ اس نے ڈاکٹر کا روپ بدل کر آنے والے لٹیرے کو بائیک پر فرار ہوتے دیکھ لیا تھا لیکن اسے یہ یقین نہیں تھا کہ پولیس کے آنے تک برف پر ٹائروں کے نشانات باقی رہیں گے۔ وہ ٹھیک سوچ رہا تھا۔ گرتی برف ہر شے کو ڈھانپتی جارہی تھی، ایسے میں ٹائروں کے نشانات باقی رہنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ برف کی گرتی دبیز تہ نے ٹائروں کے نشانات بھی مٹا دیے تھے۔ کیلن نے گہری سانس لی۔ ٹھنڈی ہوا سے اس کے پھیپھڑے تک یکدم ٹھنڈے ہوگئے۔

اس نے کھڑے کھڑے اپنے سینے پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے کوٹ کی اندرونی جیب میں دو خاکی لفافے موجود تھے، وہ ان کی کھڑکھڑاہٹ صاف محسوس کررہا تھا۔ ”اچھا ہی ہوا جو میں نے اس ماہ تک انشورنس کمپنی کے تمام واجبات ادا کردیے تھے۔“ اس نے دل ہی دل میں کہا اور گردن موڑ کر دکان کی طرف دیکھا۔ اسے یقین تھا کہ کاؤنٹر کے پالش شدہ شیشے، دستانے اور مگ سے پولیس کو لٹیرے کے واضح فنگر پرنٹس مل جائیں گے۔ وہ مڑا اور دکان کی طرف پلٹا۔ پولیس کے آنے سے پہلے وہ ایک بار پھر دکان کو اچھی طرح دیکھ لینا چاہتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر جیب پر ہاتھ پھیرا۔ ہیرے محفوظ تھے اور لٹیرا جو لوٹ کرلے گیا، اس میں اصل ہیروں کی بھرپور نقل تھی جن کی قیمت چند سو ڈالر سے زیادہ کی نہیں تھی۔ ”میں تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ ڈاکٹر نہیں ہوسکتا۔“ وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

”پولیس پہنچ رہی ہے۔“ مارگریٹ نے اسے دیکھتے ہی افسردہ لہجے میں کہا۔ ہیکسن بھی منہ لٹکائے ساتھ کھڑا تھا۔ سائمن کیلن نے کوئی جواب نہیں دیا اور سیدھا عقبی حصے کی طرف بڑھا۔ نگرانی کرنے والے کیمرے آف ہوچکے تھے۔ اس نے اندر پہنچ کر بٹن دبایا، بلب روشن ہوگیا۔ وہ تجوری کا کوڈ ملا رہا تھا۔ کیلن پولیس کے آنے سے پہلے اصلی ہیرے واپس تجوری میں محفوظ کردینا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ دو ملین ڈالر کی انشورنس رقم ملنے کے بعد وہ کاروبار ختم کردے گا۔ اگر مارگریٹ نے پسند کیا تو ٹھیک ورنہ وہ دو ماہ کی تفریحی چھٹیاں گزارنے اکیلا ہی پیرس چل دے گا۔ اچانک اسے پولیس سائرن سنائی دیا۔ وہ لائٹ آف کرکے آگے بڑھ گیا۔ ”میں نے ٹھیک سوچا تھا، وہ ڈاکٹر ہو ہی نہیں سکتا، مگر اب یہ پتا نہیں کہ بڑا لٹیرا کون نکلا۔“ اس نے دل ہی دل میں کہا اور مسکرادیا لیکن اگلے ہی لمحے اس کا منہ لٹک گیا۔

پولیس شاپ کے اندر داخل ہوچکی تھی۔ لاکھوں
ڈکیتی کے بعد، پولیس والوں کو دیکھنے میں، شاپ کے مالک
منہ ہی سب سے اچھا لگتا، سو اس نے پولیس کی پسند کا خیال

☆☆☆

ٹونی تیز رفتاری سے بائیک چلا رہا تھا۔ بل کھاتا
راستہ شروع ہوچکا تھا۔ ایک طرف پہاڑ، بیچ میں
برف کی ہلکی پرت والی سڑک اور برابر میں گہری کھائی
”آرام سے...“ ایک موڑ پر ٹینا نے گھبرا کر کہا۔ یہ
ٹونی نے بائیک آہستہ کی اور گھوم کر پیچھے دیکھا۔ ”ڈر
”بائیک روکو...“ ٹینا نے غصے سے کہا۔ ”اب
چلاؤں گی۔ کہیں تم اپنے ساتھ مجھے بھی نہ مار ڈالو۔“ اس
لہجے سے خوف جھلک رہا تھا۔

”اوکے...“ یہ کہتے ہوئے ٹونی نے بائیک روک
نیچے اترا۔ ٹینا بھی اتر آئی۔ اسی لمحے ٹونی نے جیب
سگریٹ نکال کر اسے سلگانے کی کوشش کی۔ اس کا رخ
کی طرف تھا۔ ٹینا نے چور نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ
دور دور تک نہ تو کوئی انسان اور نہ ہی کوئی گاڑی نظر آرہی
ٹونی سگریٹ سلگانے کی کوشش کررہا تھا لیکن شدید ٹھنڈ
بعد اس کا گیس لائٹر کام نہیں کررہا تھا۔ اس کی پوری
سگریٹ سلگانے پر مرکوز تھی۔

اس دوران میں ٹینا نے اپنی جیکٹ کی جیب
سائیلنسر لگا پستول نکالا اور اس کے سر کا نشانہ لے کر
چلادی۔ ٹونی کے سر کے پیچھے سوراخ ہوچکا تھا۔ وہ جھٹکا
کر گرنے لگا تو ٹینا نے لپک کر اسے پکڑا۔ وہ گھٹنوں کے
زمین پر تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور گردن
طرف ڈھلک چکی تھی۔ ٹینا نے اس کے اوور کوٹ کی
میں ہاتھ ڈال کر خاکی لفافہ نکال لیا۔ یہ وہی لفافہ تھا جو
سائمن کیلن جیولری شاپ سے لے کر بھاگا تھا۔ اس
لفافہ اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھا اور لاش کو گھسیٹ کر
گیا۔ دوسرے ہی لمحے ٹونی کی لاش ریلنگ کے پار
کھائی میں گرتی جارہی تھی۔ ٹینا نے بائیک اسٹارٹ
”گڈ بائے ڈاکٹر ہیری...“ اس نے کھائی کی طرف
انداز میں ہاتھ ہلایا اور بائیک گیئر میں ڈال کر کلچ چھوڑ

اسی لمحے اچانک برف باری تیز ہوگئی۔ ڈھند
جارہی تھی۔ ٹونی کے سر سے بہہ کر زمین پر گرنے والا
پر برف کی تہ جم رہی تھی، ویسے ہی جیسے برف کی پرتوں
بائیک کے ٹائروں کے نشانات ڈھانپ دیے تھے۔

میلینا سینڈی کی لاش کمرے کے وسط میں پڑی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں بازو پھیلے ہوئے تھے جبکہ شب خوابی کے لباس سے اس کی بائیں ٹانگ نظر آرہی تھی۔ خوب صورت آنکھیں چینل کے چھوٹے سے مجسمے پر جمی ہوئی تھیں جو اس کے پہلو میں پڑا ہوا تھا۔ اس کے سیاہ بال خون میں لت پت تھے۔ روز ابیلی سے یہ منظر نہ دیکھا گیا اور وہ سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔ ہوش میں آئی تو اپنے سامنے ایک پولیس افسر کو دیکھا جو نرم لہجے میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

اس لڑکی کا قصہ جس کی جاں کا ملال معاشرے پر قرض تھا......!

تلاشِ معاش کے سلسلے زندگی کو دشوار تر بنادیتے ہیں... ایک خوبصورت تتلی کے روپ بہروپ... اس کی زندگی کے بہتے دھارے ہر پل اسے ایک نئی دنیا سے روشناس کروارہے تھے...

بے بسی

حمیرا اقبال

"کیا تم بہتر محسوس کر رہی ہے؟"

"ہاں، اب میں ٹھیک ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تم ابھی آئے ہو؟" روزا یلی بڑبڑاتے ہوئے بولی۔ اس نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھول دیں تاکہ پولیس آفیسر کو اچھی طرح دیکھ سکے۔ وہ ایک خوش شکل جوان شخص تھا جس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ ہوگی۔ سیاہ بالوں اور گہری نیلی آنکھوں نے اس کی شخصیت کو اور بھی زیادہ پُرکشش بنا دیا تھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے اس کے سامنے بالکل بے حس وحرکت بیٹھا تھا جیسے کسی فوٹو گرافر کے اسٹوڈیو میں تصویر بنوانے آیا ہو۔ لیکن روزا جانتی تھی کہ پولیس والوں کی خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اس نے اپنا تعارف کمشنر ڈی سوزا کی حیثیت سے کروایا تھا۔

"کیا تم میرے چند سوالوں کے جواب دے سکو گی؟" کمشنر کا لہجہ اب بھی پہلے کی طرح نرم تھا۔

روزا اپنی کرسی میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور چھت کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیا وہ اس کی لاش کو لے گئے؟"

کمشنر نے بھی اس کی تقلید میں چھت کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکی کی لاش ابھی تک اوپر والی منزل میں ان کے سروں کے عین اوپر موجود ہوگی۔ وہ آفیسر سورینٹو کے قدموں کی چاپ سن سکتا تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ لیبارٹری والے جائے وقوعہ کے ایک ایک انچ کا بغور جائزہ لے رہے ہوں گے۔ انہیں تصویریں لینے کے ساتھ بیڈروم کی تلاشی بھی لینا ہوگی جو ستے بھڑکیلے ملبوسات سے بھری ہوئی تھی۔

"وہ اب تک یقیناً اس کی لاش لے جا چکے ہوں گے۔" اس نے جھوٹ بولا تاکہ روزا پُرسکون ہو کر اس کے سوالات کے جواب دے سکے۔ "کیا تم ایک بار پھر شروع سے ساری بات مجھے بتا سکو گی؟"

روزا نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔ "آج صبح میں نے اس کے نیچے آنے کی آواز نہیں سنی کیونکہ ہر روز مجھے اس کے آنے کا پتا چل جاتا تھا لیکن آج ایسا نہیں ہوا۔ یہ ایک خلافِ معمول بات تھی۔ لہٰذا مجھے تشویش ہونے لگی۔"

"کیوں؟" کمشنر نے پوچھا۔ "کیا وہ ہمیشہ اسی وقت پر باہر جاتی تھی؟"

"نہیں۔" روزا کچھ مضطرب ہوتے ہوئے بولی۔ "تم جانتے ہی ہو کہ فلم میں کام کرنے والے لوگوں کے آنے جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔"

"کیا وہ اداکارہ تھی؟"

"یہ میں نہیں جانتی۔" روزا ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "اس نے صرف یہ بتایا تھا کہ وہ فلموں میں کام کرتی ہے۔ اس سے زیادہ مجھے معلوم نہیں۔"

کمشنر نے اسے حیرت سے دیکھا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ایک معمولی سے سوال پر روزا کا چہرہ کیوں سرخ ہو گیا لیکن اس نے زیادہ غور کرنا مناسب نہ سمجھا اور اگلا سوال کر دیا۔ "اگر مس سینڈی اپنے معمول کے مطابق نیچے نہیں آئی اور تم نے اس کے قدموں کی چاپ نہیں سنی تو اس میں خطرے والی کوئی بات نہیں تھی۔ اس کے باوجود تم پریشان ہو کر اوپر چلی گئیں... آخر کیوں؟"

روزا اپنے خشک ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔ "کیونکہ گزشتہ شب میں نے اس کے اپارٹمنٹ سے کچھ آوازیں سنی تھیں۔"

"کیسی آوازیں؟" کمشنر نے صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ اسے کوئی جلدی نہیں تھی، وہ اپنے تجربے کی بنیاد پر جانتا تھا کہ کچھ لوگ فوراً ہی سب کچھ نہیں بتا دیتے بلکہ ان سے تھوڑا تھوڑا کر کے اگلوانا پڑتا ہے۔

"جیسے کوئی بحث یا جھگڑا ہو رہا ہے اور انہی آوازوں سے میری آنکھ کھل گئی۔"

"اس وقت کیا وقت ہوگا؟"

"یہ تقریباً نصف شب کی بات ہے۔ یہ آوازیں ایسی تھیں جیسے کوئی زور زور سے بول رہا ہو۔ فرش پر چیزیں پھینکی جا رہی ہوں پھر کوئی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اترا اور تیزی سے کار چلا کر لے گیا۔"

"اس وقت تم نے کیا کیا؟" کمشنر نے پوچھا۔ "کیا تم کھڑکی کی طرف گئیں... کیا تم نے کچھ دیکھا؟"

"نہیں۔" روزا بڑبڑاتے ہوئے بولی۔ "میں کیسے جان سکتی تھی کہ کیا واقعہ پیش آیا۔ میں یہی کر سکتی تھی کہ خاموشی سے بستر پر لیٹ جاؤں اور دوبارہ سونے کی کوشش کروں۔ پہلے ہی اس لڑکی کو کئی بار سمجھا چکی تھی لیکن جب کوئی میری بات نہ سنے تو کیا کر سکتی ہوں۔ میں اسے بتا چکی تھی کہ سیاہ کار میں آنے والا شخص اچھا نہیں ہے۔ وہ عموماً چمڑے کی جیکٹ پہنا کرتا تھا لیکن سینڈی نے بتایا کہ وہ شخص اس کا بوائے فرینڈ ہونے کے ساتھ ساتھ پروڈیوسر بھی ہے۔ میرے دل میں آیا کہہ دوں کہ اس سے اچھا تو پہلے والا تھا جس کا تعلق اس کے آبائی قصبے سے ہے۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ اپنے دوست کے ساتھ اکثر لڑتی رہتی تھی اور ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ ان کے جھگڑے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی ہو۔"

"تم اس کے بوائے فرینڈ کا نام بتا سکتی ہو؟"

روزا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اس کا حلیہ؟" کمشنر نے پُرامید انداز میں پوچھا۔

"میں نے اسے صرف دو مرتبہ آتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس لیے کیا کہہ سکتی ہوں۔ اس کے حلیے میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جو فوری طور پر ذہن سے چپک کر رہ جائے۔ مثلاً وہ بہت لمبا تھا اور نہ ہی پستہ قد۔ اس کے بال بھی بھورے یا سنہری نہیں تھے البتہ اس کے چہرے اور انداز سے بازاری پن جھلکتا تھا۔"

"کیا تم اس کی کار کا ماڈل یا میک بتا سکتی ہو؟"

"نہیں۔ میں کاروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔" روزا نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں تو اب فیٹ کار کو بھی نہیں پہچان سکتی کیونکہ اس میں بڑی تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ البتہ میں نے اس کی چھت پر نیلی اور سفید بتیاں دیکھی تھیں۔"

"تب وہ بی ایم ڈبلیو ہوگی۔" کمشنر آہستہ سے بڑبڑایا۔ "کیا تم نے گزشتہ شب اس شخص کو دیکھا تھا؟"

"نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہی آیا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔" کمشنر نے کہا۔ "اب ہم ایک بار پھر صبح کے واقعات کی جانب آتے ہیں۔ تم نے بتایا کہ جب اس کے نیچے آنے کی آواز نہیں سنائی دی تو تم پریشان ہو گئیں؟"

"ہاں جب وہ نہیں آئی تو میں وجہ جاننے کے لیے اوپر چلی گئی۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہ رہی تھی کہ کہیں اس کی طبیعت نہ خراب ہو گئی ہو یا اسے کسی چیز کی ضرورت ہو لیکن دروازہ کھٹکھٹانے پر بھی کوئی آواز نہ آئی تو میں چابی لینے کے لیے واپس نیچے چلی آئی۔"

"تمہارے پاس اس کے اپارٹمنٹ کی چابی تھی؟"

"ہاں، جب اس نے یہ جگہ کرائے پر لی تو ایک چابی مجھے بھی دے دی۔ یہ ایک چھوٹی سی عمارت ہے اور اس میں صرف ہم دونوں کے ہی اپارٹمنٹ ہیں، اسی لیے ہم نے کوئی چوکیدار نہیں رکھا اور ویسے بھی بڑھاپے کی وجہ سے میں زیادہ تر گھر پر ہی رہتی ہوں، چنانچہ اس کی غیر موجودگی میں چھوٹے موٹے کام نمٹا دیتی ہوں... مثلاً ڈاک وصول کرنا، دودھ کی بوتل لینا اور بجلی کمپنی والوں کے لیے اپارٹمنٹ کھولنا وغیرہ وغیرہ۔ اسی لیے ایک چابی میرے پاس ہوتی ہے۔"

"کیا تمہارا آپس میں ملنا جلنا تھا؟"

روزا نے اس سوال سے یہ تاثر قائم کیا کہ کمشنر کی آنکھوں میں ایک تجسس پایا جاتا ہے۔ غالباً وہ یہ سوچ کر حیران ہو رہا ہوگا کہ اس جیسی بوڑھی عورت اور ایک نوجوان متحرک لڑکی میں کن موضوعات پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ وہ ابھی کوئی جواب نہ دے پائی تھی کہ کمشنر نے اپنا سوال پھر دہرایا۔

"جب کبھی سیڑھیوں پر آمنا سامنا ہو جاتا یا میں اس کی ڈاک دینے جاتی تو مختصر سی بات چیت ہو جایا کرتی تھی۔ وہ دیکھنے میں اچھی لڑکی لگتی تھی۔ میں نے اس سے پہلے اسے ایک دو مرتبہ دوپہر کے کھانے کی دعوت بھی دی تھی لیکن..."

"لیکن کیا؟"

روزا کا چہرہ ایک مرتبہ پھر سرخ ہو گیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے اس سوال کا جواب نہیں دیا تھا اور کمشنر ڈی سوزا اپنے دفتر کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے یہی بات سوچ رہا تھا۔ اس کی نظریں سڑک پر دوڑتی کاروں اور فٹ پاتھ پر چلتے لوگوں کا

جائزہ لے رہی تھیں۔ یہ سڑک گھوم کر ایک دائرے کی شکل میں قدیم شہر کی طرف نکل جاتی تھی۔ لیکن ڈی سوزا کی توجہ سڑک سے زیادہ ان چار عدد چھوٹی عمارتوں پر تھی جو اس کے پار نظر آرہی تھیں اور انہی میں وہ دو منزلہ چھوٹی سی عمارت بھی تھی جس کا پلاستر جگہ جگہ سے اکھڑ گیا تھا۔

"میں تمہارے لیے کافی لے کر آیا ہوں کمشنر!" آفیسر سوریٹو کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو وہ چونک گیا۔ وہ اپنے خیالات میں اس قدر منہمک تھا کہ اسے سوریٹو کے آنے کا بھی پتا نہیں چلا۔

"ایک اور کافی لے آئے... تم میری عادتیں بگاڑ دو گے۔"

آفیسر نے فدویانہ انداز میں کمشنر کی طرف دیکھا اور کافی کا مگ اس کی میز پر رکھ دیا۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ کمشنر کے لیے قریبی بیکری سے خوش ذائقہ پیزا بھی لے آتا لیکن اسے یقین تھا کہ کسی بھی مشکل کیس کی تحقیقات کرتے وقت کمشنر کو کھانے پینے کا کوئی ہوش نہیں ہوتا۔ اس لیے اس نے صرف کافی لانے پر ہی اکتفا کیا اور بولا۔ "ایک پیالی کافی سے کچھ نہیں ہوگا۔"

"انگلیوں کے نشانات سے کچھ معلوم ہوا؟" ڈی سوزا نے پوچھا۔

"اس لڑکی کے علاوہ روزا کی انگلیوں کے بھی چند نشانات ملے ہیں۔ جب وہ اسے دیکھنے گئی تھی تو یہ نشانات وہاں چھوڑ آئی۔ اس کے علاوہ بھی تین اور نشانات نظر آئے ہیں جو کسی مرد کی انگلیوں کے ہیں۔ اس میں سے کچھ واضح ہیں جبکہ پیتل کے مجسمے پر نظر آنے والے نشانات دھندلے اور غیر واضح ہیں۔ ان سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔"

"میں نے جن معلومات کے لیے کہا تھا، وہ مل گئیں؟" ڈی سوزا نے سوریٹو کی بغل میں دبی فائل پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"کچھ زیادہ معلومات نہیں مل سکیں۔" سوریٹو نے فائل بغل سے نکالتے ہوئے کہا۔

"ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ مقتولہ کہاں کام کرتی تھی۔ روزا کا کہنا ہے کہ وہ فلموں میں کام کرتی تھی لیکن یہ کوئی واضح اشارہ نہیں ہے کیونکہ فلم کی دنیا بہت وسیع ہے اور اس کے کئی شعبے ہیں۔ ان میں اداکاری کے علاوہ گلوکاری، کہانی، ہدایت کاری، انتظامی امور اور کئی دوسرے کام شامل ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کوئی تیسرے درجے کی اداکارہ یا ایکسٹرا گرل ہو ورنہ اتنی معمولی جگہ پر رہائش اختیار نہ کرتی۔ اسے اسٹوڈیو میں کوئی نہیں جانتا اور نہ ہمیں اس کے گھر سے کوئی رسید یا بینک اسٹیٹ منٹ ملا ہے۔ بہر حال، ہم اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"روزا نے اس کے کسی محبوب اور پروڈیوسر کا بھی ذکر کیا تھا جو اکثر و بیشتر اس کے گھر آیا کرتا تھا؟"

"اس شخص کی جو نشانیاں بتائی ہیں، ان کے مطابق وہ چمڑے کی جیکٹ پہنتا ہے۔ اس کے پاس سیاہ رنگ کی بی ایم ڈبلیو کار ہے۔ روزا کو اس کا کردار بھی مشتبہ لگتا ہے۔ میں نے تمام اسٹوڈیوز کھنگال ڈالے لیکن ایسا کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ اب ہم موٹر وہیکل ریکارڈ دیکھ رہے ہیں۔ شاید وہاں سے کچھ معلوم ہوجائے۔"

"ہمیں اس شخص کو ہر قیمت پر تلاش کرنا ہے۔" ڈی سوزا نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "روزا نے اس کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، اسے دیکھتے ہوئے پہلا شک اسی پر جاتا ہے۔ میں آج سارا دن اسی کے بارے میں سوچتا رہا ہوں اور میرا دھیان بار بار ایک ایسے شخص کی طرف جا رہا ہے جس سے کچھ عرصہ پہلے میرا واسطہ پڑ چکا ہے لیکن وہ مجرم ہونے کے باوجود آسانی سے بری ہوگیا کیونکہ اس نے بڑے بڑے وکیلوں کی خدمات حاصل کرلی تھیں جبکہ اسے بدعنوانی اور نابالغوں کا استحصال کرنے کے جرم میں جیل بھیج دینا چاہیے تھا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اب وہ کہاں ہوگا۔ اس کا نام اڈولفو کینی ہے۔"

"میں ریکارڈ میں اس کے انگلیوں کے نشانات چیک کرلوں گا۔ اس میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

"اس کے علاوہ کوئی اور بات؟" کمشنر نے سرسری انداز میں فائل کے صفحے پلٹتے ہوئے کہا۔

"جی جناب! لڑکی کا سابق بوائے فرینڈ رافیل کونٹی باہر بیٹھا انتظار کر رہا ہے۔ اسے پوچھ گچھ کے لیے بلایا تھا۔"

"اچھا۔" ڈی سوزا نے فائل بند کرتے ہوئے پوچھا۔ "دیکھنے میں کیسا لگ رہا ہے؟"

اسے سوریٹو کے مشاہدے پر پورا بھروسا تھا۔ برسوں کے تجربے نے اس میں لوگوں کو پہچاننے کی صلاحیت پیدا کردی تھی اور اس کی کہی ہوئی بات کبھی غلط نہیں ہوتی تھی۔

"اچھا لڑکا ہے۔" آفیسر نے فوراً ہی جواب دیا۔ "اس کا تعلق میگ لیانو سے ہے اور وہ یونیورسٹی میں رات کی ڈیوٹی کرتا ہے۔ وہ خود بھی میڈیکل کا طالب علم ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس سے یہ جرم سرزد ہوسکتا ہے کہ وہ نو پارکنگ

زون میں گاڑی کھڑی کردے لیکن اس کا بھی کوئی امکان نہیں کیونکہ اس کے پاس کار ہی نہیں ہے۔"

"اسے اندر بلالو۔" ڈی سوزا نے کہا۔

رافیل دیکھنے میں واقعی سیدھا سادہ اور معصوم لگتا تھا۔ اس نے شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی۔ کمشنر کے دفتر میں داخل ہوتے ہوئے وہ تھوڑا سا ہچکچایا لیکن جلد ہی اس نے اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔ اب وہ ڈی سوزا کے سامنے بیٹھا اسے سیاہ آنکھوں سے دیکھے جا رہا تھا جو رونے کی وجہ سے ابھی تک سرخ تھیں۔

"تم سینڈی کے دوست تھے؟" کمشنر نے پوچھا۔

"سابق دوست۔" رافیل نے تصحیح کی۔ "سینڈی مجھے چھوڑ چکی تھی۔"

وہ اداس اور غمگین نظر آرہا تھا اور اس نے اپنی کیفیت کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی جسے ڈی سوزا نے فوراً ہی محسوس کرلیا۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ رافیل کے غمگین ہونے کی وجہ صرف یہ تھی کہ اسے چھوڑ کر جانے والی سینڈی مرچکی تھی یا رافیل کو کوئی اور بات پریشان کر رہی تھی۔ اس کے لیے یہ جاننا بہت ضروری تھا۔ وہ اپنی کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور بولا۔ "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس نے تمہیں کیوں چھوڑا تھا؟"

لڑکے نے لاتعلقی سے کندھے اچکائے اور دفاعی انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔ "تم نے یقیناً اس کی میز پر تصویروں کی البم دیکھی ہوگی۔ اس کے پہلے صفحے پر لگی ہوئی تصویر یاد ہے؟"

کمشنر نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ایک بڑے سائز کی تصویر تھی جس میں سینڈی نے تیراکی کا لباس پہن رکھا تھا۔

"وہ پہلے ایسی نہیں تھی لیکن اچانک ہی اس نے فلموں میں کام کرنے کے بارے میں ٹھان لی اور اس سے بھی زیادہ بری بات یہ ہوئی کہ اسے ایک ایسا شخص مل گیا جس نے اسے یقین دلا دیا کہ وہ بہت اچھی اداکارہ بن سکتی ہے۔ اس نے ایک دو فلموں میں چھوٹے موٹے کردار کیے لیکن اس سے آگے نہ جاسکی، لہٰذا اس کی مایوسی بڑھ گئی۔ اس نے ہمارا قصبہ چھوڑ دیا اور یہاں روم چلی آئی پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا۔"

"کیوں؟"

"اس کا کہنا تھا کہ وہ آزاد رہ کر اپنے کیریئر پر توجہ دینا چاہتی ہے۔ اسے نہ جانے یہ وہم کیوں ہوگیا تھا کہ میری دوستی اس کے راستے کی رکاوٹ بن سکتی ہے۔"

"اس دوران وہ کیا کرتی رہی؟" کمشنر نے پوچھا۔

خوشخبری

میجر سنگھ اپنی چھولداری کے باہر، میز کرسی لگائے، شغل میں مصروف تھے۔ ان کے آدمی وقفے وقفے سے خبریں لا رہے تھے کہ ان کے کیمپ کے گرد دشمن فوجیوں کی پراسرار نقل و حرکت میں تیزی آتی جا رہی ہے۔ میجر سنگھ ہر خبر کو خوش دلی سے ٹال کر نیا پیگ بنا لیتے تھے۔

رات کے بارہ بجے آبزرویشن پوسٹ سے خبر آئی کہ دشمن نے ان کے کیمپ کا مکمل محاصرہ کرلیا ہے۔

میجر سنگھ خبر سن کر خوشی سے اچھل پڑے اور اپنے آس پاس موجود فوجیوں سے مخاطب ہو کر بولے۔ "اب آئے گا لڑائی کا مزہ... جدھر سے چاہو، حملہ کردو۔ دشمن مار کھانے کے لیے چاروں طرف موجود ہے۔"

(حافظ شاہد عمران، سینٹرل جیل گوجرانوالہ)

"میرا مطلب ہے کہ اس کا گزارہ کیسے ہوتا تھا؟"

"وہ اسٹوڈیو میں اداکاروں کے لیے ملبوسات کا انتظام کیا کرتی تھی لیکن اس نے مجھے قسم دے رکھی تھی کہ یہ بات گھر میں کسی کو نہ بتاؤں ورنہ اسے بہت شرمندگی ہوگی۔"

ڈی سوزا نے اپنی بھویں اوپر اٹھائیں جیسے اسے رافیل کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔ آفیسر سوریٹو بتا چکا تھا کہ سینڈی کو اسٹوڈیو میں کوئی نہیں جانتا اور کسی ریکارڈ میں بھی اس کا نام موجود نہیں تھا۔ اگر سوریٹو کی معلومات درست تھیں تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ سینڈی اپنی گزر اوقات کس طرح کر رہی تھی؟

"کیا وہ دوسرے لوگوں سے بھی ملا کرتی تھی؟" کمشنر نے پوچھا۔

رافیل یہ سنتے ہی اپنی جگہ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا جیسے کسی نے اس کی کمر میں چٹکی لی ہو۔ کمشنر بغور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نوعیت کے سوالات پوچھنا اس کے فرائض میں شامل تھا۔ گو کہ بعض اوقات اسے خود بھی یہ اچھا نہیں لگتا تھا۔

"ہاں۔" لڑکے نے کچھ دیر توقف کرنے کے بعد کہا۔ "خاص طور پر ایک پروڈیوسر سے اس کا ملنا جلنا بہت بڑھ گیا تھا لیکن اس نے مجھے کبھی اس کا نام نہیں بتایا۔"

"کہیں وہ بھاری بھرکم جسامت والا شخص تو نہیں جو عموماً چمڑے کی جیکٹ پہنتا اور سیاہ رنگ کی بی ایم ڈبلیو میں گھومتا ہے؟"

لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا۔ ڈی سوزا نے گہری سانس لی اور آخری سوال کر دیا۔ ”تم نے آخری بار سینڈی کو کب دیکھا؟“

”گزشتہ شب۔“ رائفل نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ”میں اس سے کہنا چاہ رہا تھا کہ وہ میرے پاس واپس آجائے لیکن اس نے دروازہ نہیں کھولا اور کھڑکی میں آکر مجھ پر چلّانے لگی۔ اس کا کہنا تھا کہ میں فوراً وہاں سے چلا جاؤں۔“

”اس وقت کیا وقت ہوگا۔“

”صحیح وقت کا تو اندازہ نہیں لیکن یہ لگ بھگ نصف شب کی بات ہے۔“

کمشنر ڈی سوزا نے میز پر پڑی ہوئی رپورٹ اٹھائی اور اسے پڑھنے لگا۔ اس میں لکھا ہوا تھا:

”لڑکی کی موت نصف شب کے قریب واقع ہوئی۔ اس کی کھوپڑی چٹخ چکی تھی۔ بازوؤں اور چہرے پر زخموں کے نشانات تھے۔ کھوپڑی سے نکلنے والے حرام مغز کے مادے کے کچھ چھینٹے قریب ہی پڑے ہوئے پیتل کے چھوٹے سے مجسمے پر بھی نظر آرہے ہیں اور زخموں کی نوعیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مجسمے کو آلۂ قتل کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔“

اس نے وہ کاغذ تہ کرکے فائل میں رکھ دیا۔ اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو وہ پہلے سے نہ جانتا ہو۔ پھر اس نے سورینٹو کو طلب کیا۔ وہ بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی جس میں اڈولفو کینی کا ریکارڈ تھا جس میں اس کے تمام جرائم کی تفصیل تھی۔ وہ دھوکا دہی، ڈاکا زنی اور منشیات کی فروخت سمیت کئی جرائم میں ملوث تھا اور اب غالباً اس کے کھاتے میں قتل جیسے جرم کا بھی اضافہ ہونے والا تھا۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اتنا داغ دار ریکارڈ ہونے کے باوجود وہ ایک دن کے لیے بھی جیل نہیں گیا۔

”انگلیوں کے نشانات ریکارڈ میں موجود نشان سے مل رہے ہیں لیکن خود اس کا کوئی پتا نہیں مل رہا۔ لگتا ہے وہ فضا میں تحلیل ہوگیا ہے یا کسی دوسرے نام سے زندگی گزار رہا ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ کمشنر نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”اس کے علاوہ ہمیں ابھی تک اس لڑکی کے ذریعۂ معاش کے بارے میں علم نہیں ہوسکا۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے پرانے پیشے...“

کمشنر نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور تقریباً چلّاتے ہوئے بولا۔ ”اندر آجاؤ۔“ اسے یوں لگا جیسے کسی نے دروازے پر دستک دی ہو۔

اسی وقت روزا بیلی دروازے پر نمودار ہوئی اور بولی۔ ”کیا میں اندر آسکتی ہوں؟“

کمشنر نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے امید بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ یقیناً وہ کوئی نئی بات بتانے کے لیے آئی تھی۔

”کیا تمہیں بی ایم ڈبلیو والے کا نام یاد آگیا؟“

”نہیں، میں تمہیں کچھ اور بتانا چاہ رہی ہوں۔“

ڈی سوزا نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔ ”میں سن رہا ہوں۔“

روزا کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس نے چور نظروں سے سورینٹو کی طرف دیکھا۔ غالباً وہ اس کی موجودگی میں کچھ کہنے سے کترا رہی تھی۔ کمشنر نے سورینٹو کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ ”میں اپنے کمرے میں جاکر اس فائل کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔“

کمشنر کا اشارہ پاتے ہی وہ کمرے سے نکل گیا لیکن اس کے جانے کے بعد بھی روزا کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ اسے پسینا بھی آنے لگا تھا۔ کمشنر نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم کچھ بتانا چاہ رہی تھیں؟“

”ہاں... نہیں... میرا مطلب ہے کہ یہ بڑے شرم کی بات ہے لیکن میں نے سوچا کہ اس سے تمہیں تفتیش کرنے میں مدد ملے گی۔ ویسے تو میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ دل کی اچھی تھی۔“

ڈی سوزا خاموش رہا۔ تجربے نے اسے سکھا دیا تھا کہ بعض اوقات خاموش رہنا بھی دوسرے لوگوں سے کچھ اگلوانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ روزا نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اپنے پرانے پرس سے ٹشو پیپر نکال کر ماتھے کا پسینا خشک کرنے لگی پھر اس نے ایک طویل سانس لی۔ ایک لمحے کے لیے کمشنر کی جانب دیکھا اور فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔ وہ سرگوشی کے انداز میں کہہ رہی تھی۔

”یہ چھ مہینے پہلے کی بات ہے۔ میں اور میری دوست ماریا بدھ کے روز فلم دیکھنے گئے۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ بدھ والے روز روم میں سنیما کا ٹکٹ آدھا ہوجاتا ہے۔ ہم دونوں ریٹائر ہوچکی ہیں اور محدود پنشن میں گزارہ کرنا پڑ رہا ہے اس لیے عموماً بدھ کے روز ہی فلم کا پروگرام ہوتا ہے۔ اس روز ہم نے اخبار میں اس فلم کا اشتہار دیکھا تو تجسس کے مارے اسے دیکھنے چلے گئے۔ ہم مرتے سے پہلے اس طرح کی فلم دیکھنا چاہ رہے تھے۔ اس اداکارہ کو دیکھ کر

تیراکی

پل پر کئی سردار کھڑے دریا کا نظارہ کر رہے تھے۔ دریا بالکل خشک تھا لیکن ایک سردار جی دریا کی ریتیلی تہ میں کشتی چلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

انہیں دیکھ کر پل پر کھڑے ہوئے ایک تماشائی کو بہت غصہ آیا۔ اس نے دوسروں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”ایسے بے وقوفوں نے ہماری قوم کا نام بدنام کیا ہوا ہے۔ جب دریا میں پانی ہی نہیں ہے تو کشتی کیسے چلے گی۔“

سب نے پُرزور انداز میں اس کی تائید کی۔ غصیلے سردار نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”مجھے تیرنا آتا تو میں ابھی دریا میں اتر کر اس گدھے کی گردن مروڑ دیتا!“

(نوشتہ گلزار، بھکر)

شرم سے پانی پانی ہوگئی۔ وہ میری پڑوسن سینڈی تھی جس کے ساتھ میں نے بارہا کھانا کھایا تھا اور وہ اسکرین پر یہ سب کچھ کر رہی تھی۔ اس سے زیادہ شرمناک بات کیا ہوسکتی ہے۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ کمشنر حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”کیا تمہیں پہلے سے معلوم نہیں تھا کہ وہ فلموں میں کام کرتی ہے؟“

”تم میری بات نہیں سمجھ سکے۔“ روزا تعجب کرتے ہوئے بولی۔ ”وہ فحش فلموں میں کام کرتی تھی جن کے بارے میں کوئی شریف آدمی سوچ بھی نہیں سکتا۔“

روزا کے انکشاف نے کمشنر کی مشکل آسان کر دی۔ اسے فلم کا نام، کہانی اور ڈائریکٹر کا نام بھی یاد تھا جس کی مدد سے وہ بالآخر اڈولفو کینی تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا جو کسی اور نام سے اس طرح کی فلمیں بنا رہا تھا۔ جب وہ اس کے سامنے آیا تو کمشنر اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ اپنے لباس، وضع قطع اور چلنے سے کسی طرح بھی جرائم پیشہ نہیں لگ رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ سینہ تانے نخوت بھرے انداز میں کمشنر کو دیکھ رہا تھا۔

”سینڈی اپنی مرضی سے یہ کام کر رہی تھی۔ میں نے اسے مجبور نہیں کیا... اور یہ تو تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ میں اپنا دامن بچا کر کام کرتا ہوں۔“

ڈی سوزا نے اس کی بات کا کوئی اثر نہیں لیا اور بولا۔ ”تم نے جعلی نام کیوں اختیار کیا؟“

”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے کمشنر۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”یہ میرا فلمی نام ہے۔ اس انڈسٹری میں بہت سے لوگ ایسا کرتے ہیں اور کوئی ان سے اصلی نام نہیں پوچھتا اور نہ ہی اس میں مجھے کوئی قانونی مشکل پیش آئی۔“

”اس بار تم نے اچھے کاروبار کا انتخاب کیا؟“ کمشنر اس پر طنز کرتے ہوئے بولا۔

”ہاں، اس میں کئی فائدے ہیں۔ مالی منفعت کے علاوہ خوب صورت لڑکیوں کی قربت بھی نصیب ہوتی ہے۔“

”اسی کاروبار کی وجہ سے تمہیں سینڈی سے بھی قریب ہونے کا موقع ملا؟“

”بالکل، وہ ایسی فلموں کے لیے بہت موزوں تھی بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ وہ ہمارے لیے سونے کا انڈا دینے والی مرغی ثابت ہوئی۔“

”پھر تم نے اسے کیوں مار ڈالا؟“

”میں نے اسے قتل کیا...“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”کمشنر تم مذاق تو نہیں کر رہے؟“

”زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش مت کرو۔“ کمشنر نے تیز آواز میں کہا۔ ”ہمیں معلوم ہے کہ تم اپنا بیشتر وقت اس کے ساتھ گزارتے تھے۔ وقوعہ والی رات بھی اس سے تمہارا جھگڑا ہوا جس کی آوازیں پڑوس میں بھی سنی گئیں۔ اس کے بعد تم راکٹ کی طرح اپنی کار دوڑاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ کیا تمہارے خیال میں یہ ثبوت کافی نہیں ہیں؟“

”اگر میں نے اسے قتل کیا ہوتا تو تم ان ثبوتوں کو بنیاد بنا سکتے تھے لیکن میں نے اسے نہیں مارا... بلکہ اسے ہلکی سی چپت لگائی تھی کیونکہ ایسا کرنا ضروری ہوگیا تھا۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ اسے ایک عام فلم میں کام دینے کا وعدہ کر بیٹھا۔ تب سے وہ میرے پیچھے پڑ گئی تھی اور ہمیشہ سائے کی طرح ساتھ لگی رہتی تھی۔“

”تم نے اس سے جھوٹا وعدہ کیا تھا اور اسے پورا کرنے کا تمہارا کوئی ارادہ نہیں تھا۔“

”سینڈی جیسی لڑکیوں کو قابو میں رکھنے کے لیے اس طرح کے وعدے کرنا پڑتے ہیں۔“ وہ اس طرح بولا جیسے کسی بچے کو سمجھا رہا ہو۔ ”انہیں ایک دن آئس کریم کھلاؤ تو دوسرے روز گاجر پر ٹرخا دو تاکہ وہ ہمیشہ ہمارے اشاروں پر چلتی رہیں۔ ویسے بھی وعدہ خلافی کوئی قانونی جرم نہیں۔“

”میں قتل کی بات کر رہا ہوں۔“ کمشنر غراتے ہوئے بولا۔

"میں کہہ چکا ہوں کہ اسے قتل نہیں کیا۔ بھلا اس کی موت سے مجھے کیا فائدہ ہوسکتا تھا بلکہ الٹا نقصان ہی ہوگیا۔ تم ہی سوچو کہ کوئی اپنے ہاتھ سے سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو ذبح کرسکتا ہے؟ اس کی فلموں سے ہمیں خوب کمائی ہورہی تھی۔ میں نے صرف اس کا منہ بند کرنے کے لیے دو مرتبہ بوسہ لیا اور ایک جھٹکے سے اس کا سرخ لباس پھاڑ دیا جو اس نے صرف مجھے جلانے کے لیے پہنا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ مجھے وہ مختصر سرخ لباس پسند نہیں تھا۔"

آفیسر سورینٹو نے لکھنا بند کردیا اور کمشنر کی جانب دیکھنے لگا۔ ڈی سوزا نے بھی اسے دیکھا اور سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ جب سینڈی کو قتل کیا گیا تو اس نے گلابی رنگ کا شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا جبکہ اس کا پھٹا ہوا سرخ لباس کوڑے دان میں پڑا ہوا تھا۔

اس کے جانے کے بعد کمشنر نے کئی مرتبہ لاش کی تصاویر کو غور سے دیکھا۔ وہ گلابی شب خوابی کا لباس ہی پہنے ہوئی تھی۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "یہ بہت ہی گندہ کام ہے۔"

سورینٹو نے کچھ نہیں کہا۔ اسے رہ رہ کر افسوس ہورہا تھا کہ سینڈی جیسی اچھی لڑکی اس کام میں کیسے پھنس گئی۔

کمشنر نے اسے خاموش دیکھ کے کہا۔ "اڈولفو کینی اتنا ہوشیار نہیں ہوسکتا کہ اپنی بے گناہی ظاہر کرنے کے لیے اس طرح کی کہانی تخلیق کرے۔"

"ہاں۔" سورینٹو نے کرسی کی پشت سے اپنا سر لگاتے ہوئے کہا۔ "میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"وہ اپنے کام میں ہوشیار ہوسکتا ہے لیکن اس طرح کا منصوبہ بنانے یا اس پر عمل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اس کی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ سینڈی سے اسے کوئی خطرہ نہیں تھا پھر وہ اسے کیوں قتل کرتا؟" کمشنر نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "یہ ناممکن ہے... قطعی ناممکن کہ اس نے سینڈی کو اس وقت قتل کیا ہو جب وہ سرخ لباس پہنے ہوئے تھی پھر اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے اور اسے گلابی رنگ کی نائٹی پہنادی اور تحقیقاتی ٹیم کو گمراہ کرنے کے لیے اس پر خون کے چھینٹے ڈال دیے۔"

"تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے؟" سورینٹو نے کہا۔

کمشنر نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور سمجھ گیا کہ وہ دونوں ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ سرخ لباس خون آلود نہیں تھا اور لڑکی نے گلابی نائٹی کے ساتھ سرخ رنگ کے جوتے پہن رکھے تھے۔ اس کا مطلب سمجھتے ہو؟"

"ہاں۔" سورینٹو جلدی سے بولا۔ "کینی کے جانے کے بعد سینڈی نے پھٹے ہوئے کپڑے تبدیل کیے اور گلابی رنگ کی نائٹی پہن لی۔ وہ اپنے جوتے بھی اتارنے والی تھی اگر..."

"اگر قاتل وہاں نہ آجاتا۔" کمشنر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "وہ کوئی اس کا قریبی جاننے والا تھا اسی لیے اس نے شب خوابی کے لباس میں ہونے کے باوجود اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔"

آفیسر سورینٹو کی سمجھ میں ساری بات آگئی۔ معاملہ دو اور دو چار کی طرح صاف ہوچکا تھا۔

"رافیل کونٹی کو بلاؤ۔" کمشنر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ رافیل کی آنکھیں ابھی تک سرخ ہورہی تھیں۔ شاید وہ اپنی محبوبہ کو یاد کرکے مسلسل روئے جارہا تھا۔ جب وہ کمشنر کے سامنے آیا تو اس نے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تمہیں اپنی سابق محبوبہ کے پیشے کے بارے میں علم تھا؟"

رافیل نے ایک گہری سانس لی اور آنکھیں بند کرلیں پھر کانپتے ہوئے بولا۔ "یہ بات مجھے وقوعہ والی رات ہی معلوم ہوئی تھی۔ اسی نے مجھے بتایا تھا۔"

"تم نے تو کہا تھا کہ اس نے تمہیں اوپر نہیں آنے دیا بلکہ کھڑکی میں سے ہی چلا چلا کر واپس جانے کے لیے کہتی رہی۔ کیا یہ بات بھی اس نے تمہیں کھڑکی سے ہی بتائی تھی؟" کمشنر نے تلخ لہجے میں کہا۔

"نہیں، تم مجھ سے اس طرح کا سلوک کرنے میں حق بجانب ہو۔" لڑکے نے کمزور آواز میں کہا۔ "میں نے جھوٹ بولا تھا۔ میں بزدل ہوں اور سچ بولنے سے ڈر رہا تھا لیکن یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ میں خود بھی دہشت زدہ ہوگیا۔"

"جیسے ہی تمہیں یہ بات معلوم ہوئی تو تمہارا دماغ گھوم گیا۔ تم نے اشتعال میں آکر قریب رکھا ہوا پیتل کا مجسمہ اٹھایا اور اس کے سر پر دے مارا۔" سورینٹو نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔

لڑکے نے نفی میں اپنا سر ہلایا اور بولا۔ "ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس رات جب وہ کھڑکی میں کھڑے ہوکر چلا چلا کر مجھے جانے کے لیے کہہ رہی تھی، تب بھی میں وہیں اس کے اپارٹمنٹ کے نیچے کھڑا رہا۔ نہ جانے مجھے کس بات کا انتظار تھا۔ شاید یہ توقع ہو کہ وہ ایک بار پھر کھڑکی میں آجائے اور میں اس کی ایک جھلک دیکھ سکوں۔ شاید مجھے وہاں کھڑا دیکھ کر اس کا دل پسیج جائے اور وہ مجھے اوپر بلالے۔ میں نے ایک شخص کو اس کے اپارٹمنٹ میں جاتے دیکھا تھا۔ وہ آدھ گھنٹے بعد واپس آگیا۔ وہ غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔ شاید اسی لیے اس نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔ میں موقع سے فائدہ اٹھا کر اوپر چلا گیا اور سینڈی کے دروازے پر دستک دی۔ سینڈی نے شاید یہ سمجھ کر دروازہ کھول دیا کہ شاید میں وہی ہوں جو تھوڑی دیر پہلے نیچے گیا تھا۔ اس کی حالت بری ہورہی تھی جیسے اس پر تشدد کیا گیا ہو۔ اس کی ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی اور بازوؤں پر خراشیں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے اس سے کچھ پوچھنا چاہا تو وہ بپھرتے ہوئے بولی کہ مجھے اپنے کام سے غرض ہونی چاہیے اور یہ کہ میں فوراً وہاں سے چلا جاؤں۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور اسے اس حال میں چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگی اور تھوڑی ہی دیر میں اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس نے کہا کہ کیا میں ایک ایسی گھٹیا عورت سے محبت کرسکتا ہوں جو فحش فلموں میں کام کرتی ہو؟ یہ سن کر میں سکتے میں آگیا۔ بتا نہیں سکتا کہ اس وقت میری کیا کیفیت تھی پھر میں نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پالیا اور کہا کہ مجھے اس کی پروا نہیں۔ میں اسے اس ماحول سے نکال کر لے جاؤں گا اور ہم ماضی کو بھلا کر ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔"

"پھر وہ کیا بولی؟" کمشنر نے بے چین ہوتے ہوئے کہا۔

"میری بات سن کر وہ اور بھی پاگل ہوگئی اور اپنے بارے میں ایسی شرمناک باتیں کرنے لگی جو کوئی بھی شریف آدمی نہیں برداشت کرتا۔ اس کے انداز سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ مجھے نہیں بلکہ خود کو تکلیف دے رہی تھی۔ میں نے اسے خاموش کرانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ میں جتنا بولتا، وہ اتنی ہی پاگل ہوتی جارہی تھی۔ لگتا تھا کہ اسے کسی اندرونی جذبے نے مغلوب کررکھا ہے۔ اس کا جسم بری طرح جھٹکے لے رہا تھا۔ میں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر سنبھالنے کی کوشش کی لیکن اس نے ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو آزاد کرالیا۔ پھر وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور پیچھے کی جانب جاگری اور اس کا سر مجسمے سے ٹکرا گیا۔ یہ سب کچھ بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر ہوا۔ جس جگہ چوٹ لگی تھی، وہاں سے خون بہنے لگا۔ یقین نہیں آتا کہ کوئی اس طرح بھی مرسکتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگا۔

☆☆☆

"رافیل کے بیان سے تو لگتا ہے کہ سینڈی کی موت ایک حادثہ تھی۔" لڑکے کے جانے کے بعد سورینٹو نے کہا۔

"میں جانتا ہوں۔ ویسے بھی ابتدائی رپورٹ کے مطابق اس مجسمے پر کسی کی انگلیوں کے نشانات نہیں پائے گئے۔ اس سے دو مطلب لیے جاسکتے ہیں۔ اول یہ کہ رافیل سچ بول رہا ہے اور دوم یہ کہ اس نے قتل کرنے کے بعد مجسمے پر سے انگلیوں کے نشانات صاف کردیے ہوں۔ تم کیا کہتے ہو؟"

"رافیل کی باتوں سے تو یہی لگتا ہے کہ وہ انتہائی بزدل اور کم ہمت شخص ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ قتل جیسے سنگین جرم کا ارتکاب کرسکتا ہے اور نہ ہی محبوبہ کی لاش کو سامنے دیکھ کر اس میں اتنی سکت رہی ہوگی کہ وہ مجسمے پر سے انگلیوں کے نشان صاف کرسکے۔"

"فارنسک رپورٹ سے بھی یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ چوٹ کی نوعیت کیا تھی۔ اگر پوری قوت سے ضرب لگائی جاتی تو اس کا سر کھل جاتا۔ اس حقیقت کو دیکھتے ہوئے مجھے رافیل کے بیان میں سچائی نظر آتی ہے۔"

"اگر عدالت نے اس کی بات پر یقین کرلیا تب بھی اس کی زندگی تو تباہ ہوگئی۔" سورینٹو نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"عدالت ثبوت و شواہد کی روشنی میں فیصلہ کرتی ہے اور رافیل کے پاس اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے سچ کے سوا کچھ نہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر عدالت نے اس کے بیان کو تسلیم نہیں کیا تو اسے قتل کے الزام میں سزا ہوسکتی ہے۔" کمشنر تھکے تھکے انداز میں بولا۔

"اگر ہم نے کینی کی بات پر توجہ نہ دی ہوتی جو اس نے سینڈی کے سرخ لباس کے بارے میں کہی تھی تو وہ اب تک جیل میں ہوتا اور یہ لڑکا گھر میں بیٹھا اپنے زخم چاٹ رہا ہوتا۔"

"اصل مجرم تک پہنچنے کے لیے ہمیں معمولی معمولی باتوں پر بھی توجہ دینا پڑتی ہے ورنہ ہماری ذرا سی بے پروائی سے بہت سے بے گناہوں کو پھانسی ہوسکتی ہے۔"

"ہم کچھ نہیں کرسکتے۔" کمشنر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہمارا کام تفتیش کرکے عدالت میں چالان پیش کرنا ہے۔ ہم کسی ملزم کی صفائی پیش نہیں کرسکتے۔ یہ فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے فائل بند کردی۔ اس وقت اسے اپنی بے بسی کا شدت سے احساس ہورہا تھا۔ ایسے ہی مواقع پر اسے کبھی کبھی اس ملازمت سے نفرت ہونے لگتی۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا اور اس نے تھک کر آنکھیں بند کرلیں۔

✱

اسما قادری

قسط 50

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور با اثر سد... کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظامِ قانون کے بھی کئی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو، محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پُرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرِ نگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چودھری کی نخاست پسند بیٹی کشور، آفتاب سے خفیہ نکاح کر لیتی ہے۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیر آباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آجاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ چودھری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ چودھری، آفتاب اور کشور کا سراغ لگانے کا حکم دیتا ہے۔ چودھری افتخار لندن پہنچتا ہے اور ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب کے قیام والے معاملات طے کر لیتا ہے۔ شہریار کی ملاقات میجر ذیشان سے ہوتی ہے تو وہ اسے بتاتا ہے کہ ایک اسپیشل فورس قائم کر لی گئی ہے اور وہ خود اس میں شامل ہو گیا ہے۔ یہ فورس ایک سیکیورٹی ایجنسی کے طور پر خفیہ کام کرتی ہے۔ واپسی میں شہریار کو ماہ بانو کا فون موصول ہوتا ہے۔ وہ اس سے ایک ریسٹورنٹ میں ملتی ہے اور اسلم سے شادی کی خبر سنا کر اس سے اپنے شناختی کاغذات بنوانے کے لیے اس کی مدد چاہتی ہے۔ اسلم اور ماہ بانو شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔ ماریا، کرنل توحید کو رجھانے کی کوشش میں پکڑی جاتی ہے تاہم راستے میں را کے ایجنٹوں کی فائرنگ سے گاڑی میں آگ لگنے کے سبب ماریا بری طرح جھلس جاتی ہے اور اسپتال میں پوچھ گچھ کے دوران دم توڑ دیتی ہے۔ شہریار اس کی لاش کو لاوارثوں میں شامل کرنے کا حکم دیتا

ہے۔ ادھر نادیا کی ماں سنتھیا جوزف ورما سے انتقامی کارروائی کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ شہریار اللہ آباد اور نور پور دورے کے لیے نکلتا ہے۔ اس کی گاڑی بم سے اڑا دیا جاتا ہے لیکن وہ محفوظ رہتا ہے۔ شہریار کو کرنل توحید اپنی فورس میں شامل ہونے کا کہتے ہیں۔ شہریار فورس میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ شہریار کی شناخت چھپانے اور فورس میں آزادانہ کام کرنے کے لیے طے ہوتا ہے کہ شہریار کے فرضی ایکسیڈنٹ کی افواہ پھیلائی جائے گی۔ شہریار، ماہ بانو، اسلم کو امریکا بھجوا دیتا ہے۔ شہریار انڈر گراؤنڈ ہو جاتا ہے اور اس کی ٹریننگ اور حلیے میں تبدیلی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ کشور اور آفتاب بھی نیویارک پہنچ جاتے ہیں مگر وہاں ایک شاپنگ سینٹر میں ان کی ملاقات مراد شاہ سے ہو جاتی ہے۔ ادھر شہریار کے کہنے پر ذیشان سی ایف پی کے نوجوان کو خواجہ سراؤں کے گروہ میں شامل ہونے کے لیے بھیجتا ہے۔ جاوید علی نامی سی ایف پی کا نوجوان خواجہ سراؤں میں شامل ہو کر کراچی نوازش علی نامی شخص کی کوٹھی میں پہنچ جاتا ہے۔ وہاں تمام ملازم خواجہ سرا تھے۔ وہاں جاوید علی کو پتا چلتا ہے کہ شائنی کسی چکر میں ملوث ہے۔ ادھر جاوید علی شاز مین سے معلومات حاصل کرتا ہے۔ نوازش علی کی کوٹھی پر آپریشن کیا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہاں موجود انتہا پسند کوٹھی کو بارودی مواد سے اڑا دیتے ہیں۔ جاوید علی شدید زخمی ہو کر اسپتال پہنچ جاتا ہے جبکہ نوازش علی زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں البتہ شاز مین اور اس کی دونوں والدہ محفوظ رہتی ہیں۔ ادھر شہریار، ورما کے ٹھکانے پر پہنچ کر اسے قابو کر لیتا ہے۔ شاز مین دارالامان پہنچ جاتی ہے۔ وہ جاوید علی سے ملنے کے لیے اسپتال جاتی ہے۔ را والے شاز مین کی گاڑی کا پیچھا کرتے ہیں اور اسپتال سے واپسی میں اسے اغوا کر لیتے ہیں۔ سنتھیا، شاز مین سے پوچھ گچھ کرتی ہے اور کسی واضح صورت حال سے آگاہ نہ کرنے پر اس پر جنسی تشدد کا حربہ آزماتی ہے۔ پھر اسے ...مردہ سمجھ کر سنسان جگہ پھنکوا دیا جاتا ہے تاہم شاز مین بچ جاتی ہے اور اسپتال میں طبی امداد کے بعد اس کی حالت بہتر ہو جاتی ہے مگر شاز مین وہاں خودکشی کر لیتی ہے۔ مراد شاہ، کشور اور آفتاب کو کھانے پر گھر بلاتا ہے۔ وہاں اچانک واپسی پر ان کا چودھری سے سامنا ہو جاتا ہے اور وہ غصے سے پاگل ہو جاتا ہے مگر مراد شاہ، کشور کو چودھری سے بچاتا ہے۔ چودھری کشور اور آفتاب کو ٹھکانے لگانے کے لیے کرائے کے آدمیوں کا سہارا لیتا ہے۔ تاہم وہ بچ جاتے ہیں اور انہیں مارنے کی نیت سے آنے والے لوگ پکڑے جاتے ہیں۔ شہریار کو بھارت ایک اہم مشن پر بھیجنے کا فیصلہ ہوتا ہے جہاں سے اسے ڈاکٹر فرحان نامی شخص کو رہا کرانے کا مشن سونپا جاتا ہے۔ سلو کو سی ایف پی والے جیل سے نکال کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ سلو کو شہریار کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ اسمگلروں کے ایک قافلے کے ساتھ غیر قانونی سرحد عبور کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ سلو اور شہریار دہلی پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں ان کے مددگار ان کے حلیے میں تھوڑی بہت تبدیلی کرتے ہیں۔ انہیں اب اپنی دستاویزات بنوانی تھیں۔ جاوید علی، رائے چند نامی ہندو کے خلاف کارروائی کرتا ہے جو سینہ را کا ایجنٹ ہوتا ہے۔ ادھر سلو اور شہریار ایک ہوٹل میں کھانا کھانے جاتے ہیں۔ وہاں ایک لڑکی کی عزت بچانے میں ان کا جھگڑا اور نامی بدمعاش سے ہو جاتا ہے۔ وہ وہاں سے نکل کر اپنے مددگاروں کے ذریعے ایک سرائے میں ٹھہر جاتے ہیں۔ جاوید علی، رائے چند سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق ایک مساج سینٹر میں پہنچتا ہے۔ وہاں اسے عالیہ نامی عورت ملتی ہے جو سینہ را کی ایجنٹ ہوتی ہے۔ جاوید علی کے ساتھی وہاں آپریشن کرتے ہیں اور اس عورت کو اٹھا لاتے ہیں۔ ادھر سلو اور شہریار کو گرفتار کر لیا جاتا ہے اور انہیں را کے ایک ٹھکانے پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ تاہم جب پوچھ گچھ کا وقت آتا ہے تو سلو اور شہریار اندو اور اس کے اہلکاروں پر قابو پا لیتے ہیں اور انہیں مار کر وہاں سے نکلتے ہیں۔ وہاں متعدد افراد کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد وہ را کے ٹھکانے کو تباہ کر دیتے ہیں۔ پھر شہریار اور سلو پریم ناتھ پر ہاتھ ڈالتے ہیں اور اسے اغوا کر لیتے ہیں لیکن ان کے پیچھے پولیس لگ جاتی ہے اور انہیں پریم ناتھ کو گاڑی میں چھوڑنا پڑ جاتا ہے اور وہ فرار ہو جاتے ہیں۔ ادھر ماہ بانو چیک اپ کے لیے اسپتال جاتی ہے مگر واپس گھر نہیں پہنچتی۔ اسلم اپنے طور پر ماہ بانو کی تلاش کا کام کرتا ہے۔ اسے پتا چلتا ہے کہ ماہ بانو اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ گئی ہے۔ ادھر شہریار، سلو کو بھائی جی کے آدمی گھیر لیتے ہیں تاہم عبدل سے واقفیت کی بنا پر انہیں رعایت دی جاتی ہے اور انہیں بھائی جی کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے۔ بھائی جی ان کی مدد کرنے کا وعدہ کرتا ہے تاہم وہ چاہتا ہے کہ وہ لوگ اشوک کو قتل کر دیں۔ اسلم، ماہ بانو کا سراغ لگاتے لگاتے اس بات کا پتا لگا لیتا ہے کہ ماہ بانو کو جنگل میں کہیں رکھا گیا ہے۔ وہ جنگل میں نکل پڑتا ہے۔ تاریکی میں قدم اٹھاتے اٹھاتے وہ دلدل میں پھنس جاتا ہے مگر جدوجہد کر کے دلدل سے نکل جاتا ہے۔ ادھر عبدالرحمٰن، شہریار کو ارجن کے بارے میں بتاتا ہے جو را کا سینئر افسر ہوتا ہے۔ وہ اس کے خلاف کارروائی کرتے ہیں اور ڈاکٹر فرحان جمیل کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اسے ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ وہاں سے نکلتے ہوئے ان کا سامنا پولیس سے ہو جاتا ہے اور کلام زخمی جبکہ کئی پولیس والے مارے جاتے ہیں۔ ادھر ماہ بانو کو قید کر لیا جاتا ہے۔ اسے قید میں پہنچانے والا ڈاکٹر طارق ہوتا ہے۔ وہ رو رہی ہوتی ہے جب اس کے پاس کوئی آ کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ اسے دیکھ کر حیرت کے مارے منہ سے کچھ بول بھی نہیں پاتی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وہ جب سے یہاں لائی گئی تھی، کسی نے اس کے ساتھ کسی قسم کی بدتمیزی نہیں کی تھی۔ یہاں تک کہ مختلف ضروریات کے لیے اس کے کمرے میں آنے والے مردوں میں سے کسی نے اسے بے باک نظروں یا بے ہودہ گفتگو تک کا نشانہ نہیں بنایا تھا۔ وہ سب نہایت مشینی انداز میں کام کرتے تھے اور کسی روبوٹ کی طرح اسے وقت پر کھانا، پھل، مشروبات اور ادویات پہنچا کر خاموشی سے پلٹ جاتے تھے۔ یہاں تک کہ کسی ٹیسٹ کے لیے اپنا بلڈ لینے والے شخص کے لمس کو بھی اس نے سرد پایا تھا لیکن اس وقت اس کے جسم پر متحرک لمس بے جان نہیں تھا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ جھٹکے سے اٹھتے ہوئے اس نے کوئی گٹھری سی بستر سے لڑھک کر نیچے گرتی ہوئی محسوس کی اور فوراً ہی دھپ کی آواز بھی سنائی دے گئی۔ کمرے کے فرش پر قالین نہیں بچھا ہوا تھا اس لیے ''دھپ'' کی یہ آواز کافی زوردار تھی۔ اس نے فوراً بستر چھوڑ دیا اور سوئچ بورڈ کے قریب پہنچ کر لائٹ کا بٹن دبایا۔

ہائٹ بلب کی مدھم روشنی میں نیم تاریک محسوس ہونے والا کمرا ایک دم روشن ہو گیا لیکن وہ کسی کو دیکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔

بستر کے دوسری طرف گرنے والی گٹھری تماشے ابھی تک اسی جگہ پڑی ہوئی تھی اور وہ اسے اس وقت تک نہیں دیکھ سکتی تھی جب تک کہ خود گھوم کر اس طرف نہیں جاتی۔ زندگی میں پل پل بدلتے حالات نے اسے فیصل آباد میں بے بے اور ابا کے ساتھ رہنے والی کمزور اور بزدل ماہ بانو نہیں رہنے دیا تھا۔ ماضی کے مقابلے میں وہ بہت مضبوط اور جرأت مند ہو گئی تھی۔ اس وقت بھی اس نے جرأت مندی کا مظاہرہ کیا اور مضبوط قدموں سے چلتی ہوئی گھوم کر بستر کے دوسری طرف گئی۔ وہاں ایک حیرت انگیز منظر اس کا منتظر تھا۔ نیلی نیکر اور سفید ٹی شرٹ میں وہ کوئی چار پانچ سال کا بچہ تھا جو اپنے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر اس انداز میں بیٹھا ہوا تھا کہ اس نے اپنے چہرے کا بیشتر حصہ بھی گھٹنوں میں چھپا رکھا تھا اور وہ بس اس کی سہمی ہوئی نیلی چمک دار آنکھیں ہی دیکھ سکتی تھی۔ سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والے اس بچے نے حقیقتاً اسے ششدر کر دیا تھا۔ وہ ایک شادی شدہ عورت تھی جو اپنے تجربے اور قدرتی حس کے تحت جسم پر محسوس ہونے والے لمس کی زبان سمجھنے کی صلاحیت رکھتی تھی لیکن ایک تقریباً پانچ سالہ بچے کو سامنے دیکھ کر اپنا احساس خود اس کے لیے ایک سوال بن گیا تھا۔

''کون ہو تم؟'' آخرکار اس نے بچے سے بات چیت کر کے اس معمے کو حل کرنے کا فیصلہ کیا اور قدرے سخت لہجے میں اس سے پوچھا۔

''ایڈی۔'' اس کی طرف سے نہایت مختصر جواب آیا لیکن ماہ بانو ایک بار پھر چونک گئی۔ دیکھنے میں چار پانچ سال کے محسوس ہونے والے بچے کی آواز بالکل کسی سترہ اٹھارہ سال کے لڑکے کی طرح قدرے بھاری اور بوجھل تھی۔

''یہاں کیسے آئے ہو؟'' اسے خود ہی اپنی حیرت دور کرنے کا انتظام کرنا تھا اس لیے سوال جواب کا سلسلہ جاری رکھا۔

''میں یہیں رہتا ہوں بیرک نمبر تین میں۔'' اس بار اس کی زبان سے ادا ہونے والے مکمل جملے نے اس کی آواز کو بہت وضاحت کے ساتھ ماہ بانو کے کانوں تک پہنچایا۔

''یہاں میرے کمرے میں کیوں آئے ہو؟'' لاشعوری طور پر اس کا لہجہ کچھ اور بھی سخت ہو گیا جس پر اس نے ایڈی کی آنکھوں کو کچھ اور سہما ہوا محسوس کیا۔

''تم جس دن یہاں آئی تھیں، میں نے تمہیں دیکھا تھا۔ تم وہیل چیئر پر تھیں اور سو رہی تھیں پھر بھی مجھے بہت اچھی لگی تھیں اور میں نے سوچ لیا تھا کہ جیسے ہی موقع ملا، میں تمہارے پاس ضرور آؤں گا۔ آج مارک میرے بیرک کو لاک کرنا بھول گیا تو مجھے موقع مل گیا اور میں تمہارے پاس آ گیا۔'' اس نے جوانوں والی آواز میں بچگانہ معصومیت سے بتایا تو ماہ بانو عجیب الجھن میں مبتلا ہو گئی۔ ایڈی کی صورت میں اس کے سامنے بہت عجیب و غریب کردار آ گیا تھا جس کے متعلق اپنے احساسات کو وہ کوئی واضح نام نہیں دے پا رہی تھی۔ نیم تاریکی میں اپنے جسم پر محسوس ہونے والا لمس، ایڈی کی بھاری آواز، سہمی ہوئی آنکھیں اور معصومانہ اندازِ گفتگو اسے کسی ایک حتمی نتیجے پر نہیں پہنچنے دے رہا تھا۔

''سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔'' یہ محسوس کر لینے کے بعد کہ اس کا مقابل جسمانی طور پر اس کے مقابلے میں بہت کمزور ہے، وہ خوف زدہ نہیں رہی تھی۔ بس حیرت ہی حیرت تھی جسے دور کرنے کا انتظام کر رہی تھی۔ ایڈی کو رعب دار ....آواز میں دیا جانے والا حکم بھی اسی مقصد سے تھا۔ اس کی طرف سے حکم ملنے پر وہ ذرا سا جھجکا تو ضرور لیکن حکم عدولی نہیں کی اور گھٹنوں کے گرد لپٹے بازو کھول کر آہستہ سے کھڑا ہو گیا۔ اب ماہ بانو اسے اچھی طرح دیکھ سکتی تھی اور دیکھ کر حیرت سے ساکت تھی۔ تقریباً تین فٹ قد رکھنے والے ایڈی کی ٹھوڑی پر سنہری بالوں والی چھوٹی سی داڑھی لہرا رہی تھی اور ہونٹوں کے اوپر بھی سنہری رُواں تھا۔ اتنی دیر سے وہ اپنا چہرہ کچھ اس انداز میں گھٹنوں میں چھپا کر بیٹھا ہوا تھا کہ وہ اس کی صرف آنکھیں ہی دیکھ پا رہی تھی اور وہ آنکھیں سو فیصدی ایک بچے کی آنکھیں تھیں لیکن کسی پانچ سال کے بچے کی داڑھی مونچھیں تو نہیں ہو سکتی تھیں۔ کیا وہ کوئی ایسا بالغ نوجوان تھا جس کی جسمانی نشوونما رک گئی تھی؟ اس کے ذہن میں سوال ابھرا لیکن وہ خود کو اس سوال کا کوئی یقینی جواب نہیں دے سکی۔ راہ چلتے اور ٹیلی وژن وغیرہ پر اسے ایسے کئی پستہ قامت افراد کو دیکھنے کا موقع ملا تھا جن کی عمر کے ساتھ ساتھ جسمانی نشوونما نہیں ہو سکی تھی لیکن ان افراد کو غور سے دیکھنے پر ان کے چہروں سے ان کی اصل عمر کا اندازہ بہرحال ہو جاتا تھا۔ یہاں ایڈی کا یہ حال تھا کہ اس کے معصوم چہرے کو دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا کہ ایک پانچ سالہ بچے نے کسی ڈرامے میں بڑے کا کردار نبھانے کے لیے

اپنے چہرے پر داڑھی اور ہلکی سی مونچھیں چپکالی ہیں۔

"اپنی داڑھی پکڑ کر کھینچو۔" دل میں ابھرنے والا شک دور کرنے کے لیے اس نے ایڈی کو حکم دیا جس کی تعمیل میں اس نے داڑھی کے سنہری بال اپنی ننھی ننھی انگلیوں میں جکڑ کر زور سے کھینچ ڈالے لیکن پھر بھی داڑھی اپنی جگہ پر موجود رہی۔ ماہ بانو نے داڑھی کھینچنے کے نتیجے میں اس کے چہرے پر پھیلنے والی تکلیف کی کیفیت کو بغور دیکھا تھا اس لیے داڑھی کے اصلی ہونے میں کسی شک و شبہے میں مبتلا نہیں رہی تھی لیکن اس حیرت کا کیا کرتی جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جارہی تھی۔

"اب میں جاؤں؟" اس کے احکامات کی کسی فرماں بردار شاگرد کی طرح تعمیل کرتے ایڈی نے معصومیت سے پوچھ کر اسے چونکا دیا۔

"نہیں، تم یہاں بیٹھ جاؤ۔ میں تم سے کچھ اور باتیں کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے انگلی سے بیڈ کی طرف اشارہ کیا تو ایڈی اچک کر وہاں بیٹھ گیا۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا۔ ماہ بانو کی دروازے کی طرف پشت تھی لیکن اس نے دروازے کا کھلنا اور ایڈی کے چہرے پر خوف کا چھا جانا محسوس کرلیا تھا۔

"مارک!" وہ دھیمی آواز میں سہمے ہوئے انداز میں بڑبڑایا۔

"ایڈی! شریر لڑکے... تم یہاں کیا کررہے ہو؟" آنے والے نے نہایت سخت لہجے میں ایڈی سے دریافت کیا۔ اس دوران میں ماہ بانو بھی دروازے کی طرف گھوم چکی تھی لیکن وہ اس کے بجائے مکمل طور پر ایڈی کی طرف متوجہ تھا۔

"سوری مارک! مجھے نیند نہیں آرہی تھی اس لیے میں ٹائم پاس کرنے یہاں آگیا۔" معصومیت سے معذرت کرتا ہوا ایڈی واضح طور پر سہا ہوا تھا۔

"جھوٹ مت بولو بدمعاش... میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کس چکر میں یہاں آئے ہو۔ تم بس انتظار میں تھے کہ میں کس روز تمہارے بیرک کو لاک کرنا بھول جاتا ہوں لیکن یاد رکھو کہ اس بار تمہاری حرکت کو ماسٹر معاف نہیں کرے گا اور تمہیں سزا بھگتنی ہوگی۔" مارک، ماہ بانو کے قریب سے گزر کر بولتا ہوا ایڈی تک پہنچا اور اس کا دایاں کان پکڑ کر اسے بستر سے نیچے اتار دیا۔ اس کے لہجے اور گرفت کی سختی، ایڈی کا چہرہ خوف سے سفید کیے دے رہی تھی۔

"سوری میڈم! اس بدمعاش کی وجہ سے آپ کے آرام میں خلل پڑا۔ خوب صورت خواتین کو دیکھ کر یہ ایسی ہی حرکتیں کرتا ہے لیکن آپ فکر مت کریں، آئندہ یہ آپ کو تنگ نہیں کرسکے گا۔ اب آپ اطمینان سے سو جائیے۔" ایڈی کا کان پکڑ کر اسے کمرے سے باہر لے جاتے ہوئے مارک نے ماہ بانو کے قریب رک کر اس سے کہا اور پھر ایڈی کو لیے باہر نکل گیا۔ اس صورتِ حال پر حیران پریشان ماہ بانو گرنے کے انداز میں بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا اور مارک کے الفاظ نے اسے مزید الجھا دیا تھا۔ ایڈی کے متعلق اس کے ریمارکس خاصے معنی خیز تھے اور اس کا اپنا تجربہ بھی بڑا عجیب تھا لیکن کون تھا جو اس کے سامنے اس معمے کا حل پیش کرتا؟

☆☆☆

"تم نے جس آدمی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کو کہا تھا، اپن نے حاصل کرلی ہے۔ وہ پاکستان سے آیا ہے۔ اس کا نام چودھری افتخار عالم شاہ ہے۔ بہت بڑا جاگیردار ہے اور اپنے علاقے میں پیر وغیرہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ اشوک صاحب سے یہ اس کی پکی ملاقات ہے اور جہاں تک اپن کو جانکاری حاصل ہوئی ہے، یہ بندہ کسی خاص سودے کے لیے بھارت آیا ہوا ہے۔ اپن کو سن گن ملی ہے کہ شاید یہ بندہ اشوک سے اسلحہ لے کر پاکستان جانے والا ہے لیکن ابھی اس کی واپسی کی کوئی ڈیٹ پتا نہیں چلی ہے۔ ابھی تو سالہ ممبئی فلم نگری کی پریوں میں گھرا ہوا ہے اور اشوک کی میزبانی کے مزے اڑا رہا ہے۔ مال کب اور کیسے جانے والا ہے، اس کے بارے میں اپن کو کوئی جانکاری نہیں ملی ہے۔" ارجن والے مشن سے واپسی کے بعد عبدالرحمٰن نے ایک بار پھر ناشتے پر ان سے ملاقات کی تھی اور اپنے ساتھ یہ معلومات لے کر آیا تھا۔ شہریار نے ارجن کی شناخت کے لیے دکھائی جانے والی ایک ویڈیو میں چودھری کو اشوک کے ساتھ دیکھا تھا اور اسی وقت عبدالرحمٰن سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی فرمائش کی تھی کیونکہ اتنا تو وہ سمجھتا تھا کہ مشکوک سرگرمیوں میں ملوث چودھری کا اشوک جیسے بدنام گینگسٹر کے ساتھ نظر آنا خالی از علت نہیں ہوسکتا۔ وہ بھارت آیا تھا اور اشوک کے پاس ٹھہرا ہوا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

چودھری کے ہیروئن کے کاروبار سے جڑے ہونے کے کچھ شواہد پہلے بھی ملے تھے لیکن چودھری نے بڑی ہوشیاری سے خود کو اس معاملے سے الگ کرلیا تھا اور ان کے پاس اسے گرفتار کرنے کا کوئی قانونی جواز نہیں رہا تھا۔ اس کے وہ سارے بندے بھی منظر سے غائب تھے جن کے بارے میں شک تھا کہ وہ اس کے اس گھناؤنے کاروبار میں اس کا ساتھ دے رہے ہیں اس لیے وہ لوگ اس پر ہاتھ ڈالنے سے معذور رہے تھے۔ ڈاکٹر فرحان کی رہائی والا مشن سونپے جانے کے بعد اس کی توجہ چودھری کی طرف سے بالکل ہٹ گئی تھی اور وہ یہاں بھارت میں مصروف ہو گیا تھا لیکن عجیب اتفاق تھا کہ چودھری خود بھارت پہنچ گیا تھا اور ایک بار پھر اس کے بارے میں ایسی معلومات حاصل ہوئی تھیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ غدارِ وطن ہے اور ظاہر ہے ایسا شخص اس کے نزدیک ناقابلِ معافی تھا۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ ڈاکٹر فرحان والا معاملہ بھی ایسے اسٹیج پر تھا کہ ان کے لیے تیزی سے اقدامات کرنا ضروری تھے ورنہ ڈاکٹر فرحان ان کے ہاتھوں سے نکل سکتا تھا۔

"ارجن کے بارے میں کیا خبر ہے؟ وہ ہوش میں آگیا ہے یا نہیں؟" چودھری سے متعلق خبروں پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اس نے عبدالرحمٰن سے دریافت کیا۔

"نہیں، ڈاکٹروں نے آپریشن کر کے گولی نکال لی ہے لیکن ابھی تک وہ ارجن کی زندگی کے بارے میں زیادہ آس نہیں دلا رہے ہیں۔"

"اور اس کی فیملی...؟" شہریار نے استفسار کیا۔

"اس کی بیٹی کو بھی علاج کے لیے اسپتال میں رکھا گیا ہے۔ ماں زیادہ تر بیٹی کے ساتھ اسپتال میں رہتی ہے اور کبھی کبھی گھر جاتی ہے جہاں اس کا بیٹا آج کل اپنے گاؤں سے آئی ہوئی بوا اور انکل کے ساتھ رہ رہا ہے۔"

"ارجن کی بیوی کا کوئی نیا بیان تو سامنے نہیں آیا ہے؟" اسے اس طرف سے تشویش تھی کہ کہیں ارجن کی بیوی یہ راز نہ اگل دے کہ ان کے گھر رات کے اندھیرے میں گھسنے والے ڈاکو نہیں تھے اور ارجن سے کسی خاص بات کو جاننا چاہتے تھے۔ اس نے ارجن سے سوال جواب تو اس کی بیوی کی بے ہوشی کے دوران کیے تھے اور وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ لوگ اس سے ڈاکٹر فرحان جمیل کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں لیکن ارجن کا جواب بہرحال اس نے سنا تھا۔ اگر وہ را کے کسی اہلکار کے سامنے گاندھی نگر کا نام لے لیتی تو ان کے لیے یہ جاننا ذرا مشکل نہیں رہتا کہ ڈاکوؤں کے روپ میں ارجن والا میں گھسنے والے کون تھے اور ان کا کیا مقصد تھا۔

"نہیں، ابھی تک وہ اپنے بیان پر قائم ہے اور اس نے یہی بتایا ہے کہ آنے والے نقاب پوش ڈاکو تھے جو بہت سا زیور اور نقد رقم لے کر فرار ہوگئے ہیں۔ اس نے پولیس

کے سامنے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ اس کی بیٹی نشے کی عادی ہے اور اتفاق سے اس نے اسی روز نشے کی طلب سے پاگل ہوکر اپنے کمرے کی کھڑکی کا شیشہ ایک بھاری شوپیس مار کر توڑ دیا تھا جس کی وجہ سے ولا کا سیکیورٹی الارم آف کرنا پڑا تھا ورنہ ڈاکوؤں کے لیے اندر داخل ہونا آسان نہیں ہوتا۔" عبدالرحمٰن نے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا جو اپنی جگہ تسلی بخش تھیں لیکن وہ سمجھتا تھا کہ دماغ سے کام لینے والوں نے چاہے ارجن کی بیوی کے بیان کو غلط نہ سمجھا ہو لیکن یہ ضرور سوچ رہے ہوں گے کہ یہ ڈکیتی کی آڑ میں کچھ اور ہوا ہے اور انہیں شدت سے اس بات کا انتظار ہوگا کہ ارجن ہوش میں آجائے تو اس سے حقیقت معلوم ہو۔ اس دوران میں ممکن تھا کہ وہ اس کی بیوی کو دباؤ میں لے کر اصل بات جاننے میں کامیاب ہوجائیں اس لیے ضروری تھا کہ وہ جلد از جلد اپنا کام مکمل کرلیں۔

"ارجن کو ہوش آئے، اس سے پہلے ہی ہم اپنا کام مکمل کرنا چاہتے ہیں۔ ایک گھنٹے کے اندر ہم یہاں سے روانہ ہوجائیں گے۔ تم ہمیں ہمارا اسلحہ اور دو چار اضافی ہینڈ گرینیڈز دے دو۔" آخر کار حتمی نتیجے پر پہنچتے ہوئے اس نے عبدالرحمٰن سے مطالبہ کیا۔

"اور بھائی جی کے کام کا کیا ہوگا؟"

"وہ کام ہم ڈاکٹر صاحب کی رہائی کے بعد کریں گے۔" اس نے سپاٹ سے لہجے میں عبدالرحمٰن کے سوال کا جواب دیا۔

"اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تم اپنا کام نکل جانے کے بعد بھاگ نہ نکلو گے؟" عبدالرحمٰن اپنا ناشتا مکمل کرچکا تھا اور اب سامنے پڑے سگریٹ کے پیکٹ میں سے اپنے لیے سگریٹ منتخب کررہا تھا۔

"ہمارا بندہ تمہارے پاس ہی رہے گا۔" اس کا اشارہ کلام کی طرف تھا جس کی ٹانگ کا آپریشن کر کے گولی نکال دی گئی تھی لیکن ظاہر ہے ابھی اسے لمبے عرصے تک آرام کی ضرورت تھی۔

"وہ بندہ اب ناکارہ ہوچکا ہے۔ تم اس کی خاطر واپس پلٹ کر کیوں آؤ گے؟" عبدالرحمٰن گویا اس کی دی ہوئی گارنٹی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"تمہاری دنیا میں اپنے معذور ہوجانے والے ساتھیوں کو ناکارہ سمجھا جاتا ہوگا۔ ہمارے لیے وہ ہمارا قابلِ عزت و احترام ہیرو ہے جسے ہم کسی طور غیر محفوظ چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔ ہمیں ہر صورت اسے کسی پُرسکون ٹھکانے تک

پہنچانے کے لیے لوٹ کر واپس آنا ہوگا۔“ بولتے ہوئے شہریار کا چہرہ شدتِ جذبات سے سرخ پڑ گیا تھا۔

”تمہیں اپن کی بات بری لگی اس کے لیے سوری بولتا ہے لیکن تم یہ بات خود بھی سمجھ سکتے ہو کہ کوئی بھی سودا کرنے سے پہلے انسان شیور یٹی چاہتا ہے۔ تم نے جو گارنٹی دی ہے، وہ اپن کے دل کو لگی ہے۔ تم بتاؤ کدھر جانا ہے، اپن ابھی بندوبست کر دیتا ہے۔“ عبدالرحمٰن نے اس کے جذبات کی سچائی کو محسوس کر لیا تھا چنانچہ بُرا مانے بغیر بولا۔

”نہیں، تم صرف اسلحے کا انتظام کر دو... جہاں جانا ہے ہم خود چلے جائیں گے۔“

”کیوں؟ کیا اپن پر بھروسا نہیں رہا ہے؟“ شہریار کے انکار پر وہ مستفسر ہوا۔

”بات بھروسے کی نہیں، احتیاط کی ہے۔ ہمیں یہ سکھایا جاتا ہے کہ کوئی بھی معاملہ جتنے کم افراد کے علم میں ہو اتنا ہی بہتر رہتا ہے۔ تمہارے کسی ذریعے سے سفر کرنا ہمارے لیے یوں بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اگر کسی وجہ سے ہم پکڑے گئے تو ممبئی میں اپنے واحد ہمدرد سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ پولیس یا را میں سے کسی کو یہ پتا نہیں چلنا چاہیے کہ تم ہماری مدد کر رہے ہو ورنہ وہ لوگ ہاتھ دھو کر تمہارے گروہ کے پیچھے پڑ جائیں گے اور اس طرح نہ تم ہماری مدد کر سکو گے، نہ ہی ہم تمہارا کام کر سکیں گے۔“ اس نے بہت سجاؤ سے اپنے فیصلے کی وضاحت کی۔

”ٹھیک ہے... جیسا تمہیں ٹھیک لگتا ہے کرو، پر اتنا یاد رکھنا کہ تمہیں ہر جگہ تلاش کیا جا رہا ہے۔ تم دونوں کے خاکے اور تمہارے ساتھی کی تصویریں ہر نیوز چینل پر دکھائی گئی ہیں اور ہر اخبار میں چھپی ہیں۔ باہر نکل کر تم کسی لفڑے میں نہ پڑ جانا۔“ اس کے لہجے میں ان لوگوں کے لیے تشویش تھی۔

”لفڑے میں تو ہم پڑے ہوئے ہی ہیں، البتہ تم تصویروں اور خاکوں کی وجہ سے پریشان نہ ہو۔ ہمارا ساتھی تو خیر باہر ہی نہیں نکلے گا... اور رہی خاکوں کی بات تو وہ کون سا ہمارے اصل حلیے کے مطابق ہیں اور ہم کون سا اسی حلیے میں باہر نکلنے والے ہیں جو کوئی ہمیں پہچان لے گا۔ تم اس سلسلے میں فکر نہ کرو اور بس یہ دعا کرو کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر واپس لوٹیں۔“ شہریار نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ اب وہ سب ہی ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بس گفتگو کر رہے تھے۔

”انشاء اللہ تم ضرور کامیاب ہو گے کیونکہ تمہاری لگن سچی ہے۔“ وہ ایک غنڈا تھا لیکن ہم مذہب ہونے کے باعث ان کے درمیان ایک عجیب سی یگانگت قائم ہو گئی تھی چنانچہ نہایت خلوص سے انہیں کامیابی کا یقین دلایا۔

”ہماری غیر موجودگی میں تم ہمارے ساتھی کا خیال رکھنا۔ اگر ہو سکے تو پلاسٹک سرجری کے ذریعے اس کے خدوخال میں تھوڑی سی تبدیلی لانے کی کوشش کرنا تاکہ ہمیں اسے یہاں سے نکال کر لے جانے میں آسانی رہے۔“

”تم فکر نہ کرو۔ یہاں وہ بہت آرام سے رہے گا۔ پلاسٹک سرجری بھی کوشش کریں گے کہ ہو جائے۔ تم بس اپنے کام پر دھیان رکھنا۔ ہماری مدد کی ضرورت پڑے تو فون کھڑکا دینا۔ پورے انڈیا میں اپنے بھائی جی کے تعلقات ہیں۔ کسی نہ کسی طرح تمہیں مدد پہنچ ہی جائے گی۔“ اس نے شہریار کی درخواست کے جواب میں اسے نہ صرف بھرپور تسلی دی بلکہ ایک بار پھر مختلف زاویے سے مدد کی پیشکش بھی دہرائی۔

”بہت بہت شکریہ۔ ہم تمہارا یہ سلوک ہمیشہ یاد رکھیں گے اور اس کے بدلے میں اپنا وعدہ بھی پورا کریں گے۔ تم اس دوران میں بس اتنا کرنا کہ اشوک کے ساتھ ساتھ اس کے مہمان پر بھی نظر رکھنا۔ اگر ڈاکٹر صاحب کی رہائی کا معاملہ اتنا اہم نہیں ہوتا تو یقین کرو کہ میں خود بھی پہلے ان لوگوں سے نمٹنا پسند کرتا۔“ اس نے عبدالرحمٰن کی پیشکش کے جواب میں بہت نرمی سے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک اور اہم معاملے کے سلسلے میں ہدایات دیں۔

”بے فکر رہو۔ وہ دونوں مستقل اپنے آدمیوں کی نظروں میں ہیں۔“ اس نے تسلی دی۔

”بس تو پھر ہمیں اجازت دو۔ ہمارے پاس وقت کم ہے۔ نکلنے سے پہلے اپنی تیاری کے علاوہ ہم اپنے ساتھی سے ملاقات بھی کرنا چاہتے ہیں۔“ وہ اپنی کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا تو اس ساری گفتگو کے دوران میں بالکل خاموش بیٹھے سلو نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ شہریار کو اس مشن کے لیے اس کے انتخاب پر ہمیشہ خوشی محسوس ہوئی تھی۔ وہ کسی معاملے میں غیر ضروری مداخلت نہیں کرتا تھا لیکن عمل کے لیے ہر دم تیار اور چاق و چوبند ملتا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ کر وہ سیدھے کلام سے ملاقات کے لیے گئے۔ وہ ہوش میں تھا اور اس بات کی اطلاع انہیں پہلے ہی مل چکی تھی۔ وہ دونوں اس کے کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے اپنی جگہ لیٹے لیٹے ہی گردن گھما کر ان کی طرف دیکھا اور مسکرانے کی کوشش کی لیکن خود ہی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

”بہت سے کام لو یار! کچھ عرصے کی بات ہے، اس کے بعد انشاء اللہ تم اپنے پیروں پر دوبارہ کھڑے ہو سکو گے۔“ شہریار لپک کر اس کے قریب پہنچا اور اس کا بایاں ہاتھ تھام کر اسے تسلی دی۔ خون بہت زیادہ بہہ جانے کے باعث وہ چند گھنٹوں میں ہی بہت نحیف محسوس ہو رہا تھا اور چہرے کی رنگت میں زردی سی گھل گئی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ڈرپ لگی ہوئی تھی جس سے قطرہ قطرہ گلوکوز اس کے جسم میں داخل ہو رہا تھا۔ پیروں سے لے کر سینے تک تنی ہوئی چادر کی وجہ سے وہ اس کی آپریشن شدہ ٹانگ کو نہیں دیکھ سکے تھے لیکن پھر بھی انہیں احساس تھا کہ ان کا ساتھی ایک بڑی تکلیف سے گزر رہا ہے۔

”میں اپنے زخمی ہونے پر افسردہ نہیں ہوں بلکہ اس بات کا افسوس ہے کہ اب میں اس مشن میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔“ کلام نے اپنے دکھ کی وجہ بیان کی۔

”کوئی بات نہیں۔ تم جہاں تک ہمارا ساتھ دے سکتے تھے، تم نے دیا اور بہت اچھی طرح دیا۔ اب یہ ہمارا فرض بنتا ہے کہ تمہاری اس خدمت کے بدلے میں تمہاری حفاظت کا انتظام کریں اور تمہیں یہاں سے محفوظ راستے سے پاکستان واپس پہنچا دیں۔ ڈاکٹر صاحب والا معاملہ نمٹ جائے تو انشاء اللہ یہ کام بھی ہو جائے گا۔ فی الحال تو تم خود بھی سفر کرنے کے لائق نہیں ہو اس لیے بہتر ہے کہ یہاں رہ کر آرام کرو۔“ شہریار نے اسے تسلی دینے والے انداز میں کہا تو وہ محض سر ہلا کر رہ گیا۔ اسے خود بھی اندازہ تھا کہ ان حالات میں اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

”تم یہاں موجود اپنے سیٹ اپ میں سے کسی ذمے دار آدمی کا رابطہ نمبر اور کوڈ مجھے بتا دو تاکہ جب ہم ڈاکٹر صاحب کو رہا کروانے میں کامیاب ہو جائیں تو انہیں یہاں سے نکالنے کا کام ہو سکے۔ یہ کام ظاہر ہے ان سے رابطے کے بغیر نہیں ہو سکے گا۔“ کلام کی خیریت معلوم کرنے کے علاوہ وقتِ رخصت اس سے ملاقات کے لیے آنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ یہاں موجود اپنے مددگاروں سے رابطے کا طریقہ معلوم کر سکے کیونکہ بہرحال انہیں جو بھی کرنا تھا، اس کے لیے ان کی مدد کی ضرورت تھی۔ ان لوگوں کا یہاں پورا ایک سیٹ اپ تھا اور وہی ڈاکٹر فرحان کو یہاں سے خفیہ طور پر نکال سکتے تھے۔ کلام جب تک ٹھیک تھا، کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن اب اس کی جگہ دوسرے بندے سے رابطہ ضروری تھا۔ کلام نے اسے طریقۂ کار بتا دیا۔

”ٹھیک ہے۔ اب تم آرام کرو۔ ہم تھوڑی دیر میں روانہ ہونے والے ہیں۔ اس کے لیے کچھ تیاریاں کرنی ہیں۔“ وہ دونوں کلام سے مصافحہ کرنے کے بعد کمرے سے باہر نکل آئے۔ لباس اور حلیوں کی تبدیلی کا عمل مکمل ہونے تک عبدالرحمٰن نے انہیں ان کے مطلوبہ ہتھیار بھجوا دیے تھے۔ یہ چھوٹے سائز کے لیکن زبردست کارکردگی والے ہتھیار تھے جنہیں وہ آسانی سے اپنے لباس میں چھپا سکتے تھے۔ ہینڈ گرینیڈز بھی انہوں نے مساوی تعداد میں تقسیم کر لیے۔ اب وہ اپنے چھوٹے سائز کے سفری بیگز کے ساتھ روانگی کے لیے بالکل تیار تھے۔ اپنے بیگز ہاتھ میں لیے وہ باہر نکلے تو ہمہ وقت وہاں موجود رہنے والا عبدالرحمٰن کا ایک خاص آدمی ان کے سامنے آ گیا۔

”عبدل بھائی نے کہا ہے کہ آپ لوگ جہاں جانا چاہیں آپ کو وہاں ڈراپ کروا دوں۔ ڈرائیور گاڑی کے ساتھ تیار ہے، آپ بولو کدھر جانا ہے؟“ اس نے مؤدب لہجے میں پیغام رسانی کرتے ہوئے پوچھا۔

”ریلوے اسٹیشن۔“ شہریار نے اسے مختصر سا جواب دیا۔ تھوڑی دیر میں ہی وہ ایک آرام دہ گاڑی میں بیٹھے ریلوے اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔ گاڑی کے شیشے سیاہ تھے اس لیے باہر سے انہیں دیکھ لیے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اگر کوئی دیکھ بھی لیتا تو بالکل بدلے ہوئے حلیوں میں چلتی گاڑی میں شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ اسٹیشن تک کا طویل فاصلہ نہایت سبک رفتاری سے طے ہو گیا۔ ڈرائیور نے نیچے اتر کر پچھلی طرف کے دونوں دروازے کھولے اور مزید کسی حکم کے انتظار میں ذرا پیچھے ہٹ کر مؤدب کھڑا ہو گیا۔

”تم جا کر آگرہ جانے والی ٹرین میں فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ لے آؤ۔ ہم یہیں گاڑی میں بیٹھ کر انتظار کرتے ہیں۔“ شہریار نے ایک بڑا نوٹ نکال کر ڈرائیور کے حوالے کیا تو وہ فوراً روانہ ہو گیا۔ وہ دونوں گاڑی کے دروازے ایک بار پھر بند کر کے پچھلی سیٹ پر آرام سے بیٹھ گئے۔ سلو کو اس کے لائحہ عمل کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا، اس کے باوجود اس نے یہ سوال نہیں کیا تھا کہ جب ان کا مطلوبہ بندہ گاندھی نگر میں ہے تو وہ آگرہ کا ٹکٹ کیوں منگوا رہا ہے؟ اپنی قدرتی صلاحیتوں اور تربیت کے باعث وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ان کے کام میں کبھی بھی کسی کو اصل حقائق سے واقف نہیں ہونے دیا جاتا چنانچہ شہریار کے لیے کیسے ممکن تھا کہ وہ ڈرائیور کو اپنی منزل کا پتا چلنے دیتا۔ ٹکٹ کے پیسے ضائع ہونے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ انہیں یہاں بھیجنے

والوں نے اس بات کا بندوبست کر رکھا تھا کہ انہیں وقتِ ضرورت رقم ملتی رہے۔ ایک خاص اکاؤنٹ کا اے ٹی ایم کارڈ اس وقت بھی شہریار کی جیب میں پڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ارجن کے گھر سے لوٹی جانے والی کثیر رقم اور قیمتی زیورات الگ تھے۔ فی الحال شہریار نے یہ سب چیزیں عبدل کے پاس بطور امانت رکھوا دی تھیں۔ کچھ نقد رقم جو اچھی خاصی ہی تھی، اپنے پاس رکھ لی تھی۔ اس رقم میں سے اچھا خاصا حصہ سلو کے پاس بھی تھا کہ اگر کسی گمبھیر صورتِ حال میں وہ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو دونوں ہی اپنے اپنے طور پر اپنے لیے کچھ کر سکیں۔

ڈرائیور ٹکٹ اور بقایا رقم کے ساتھ کچھ دیر میں واپس لوٹ آیا۔ شہریار نے اس سے صرف ٹکٹ وصول کیے اور بچ جانے والی رقم اسے سونپ دی۔ ٹکٹ جیب میں آجانے کے بعد وہ دونوں نیچے اتر آئے اور ڈرائیور کو واپس جانے کا حکم دے دیا۔ وہ گاڑی لے کر اسٹیشن کی حدود سے دور نکل گیا تو شہریار نے سلو کے ساتھ ایک ٹیکسی کی طرف پیش قدمی کی۔ کچھ دیر بعد ہی وہ واپس شہر کی طرف جا رہے تھے لیکن اس بار انہوں نے زیادہ طویل سفر نہیں کیا اور درمیانے درجے کے ایک ہوٹل میں پہنچ گئے۔ ہوٹل میں انہوں نے صرف ایک دن کے لیے کمرا حاصل کیا اور اپنے سفری بیگ وہیں رکھ کر خود باہر نکل گئے۔ بازار میں دکانیں کھل چکی تھیں۔ ایک چھوٹی سی دکان سے انہوں نے اپنے اپنے سائز کے ملبوسات خریدے اور ہوٹل واپس آگئے۔ ہوٹل پہنچ کر کپڑے تبدیل کرنے کے بعد ایک بار پھر وہ حلیوں کی تبدیلی کے عمل سے گزرے۔ اب انہیں دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی لوگ ہیں جو عبدالرحمٰن کی کوٹھی سے نکلے تھے۔ لباس کی تبدیلی کے علاوہ انہوں نے جوتے اور سفری بیگ بھی تبدیل کر لیے تھے اور ظاہر ہے یہ ساری خریداری بھی اسی بازار سے ہوئی تھی جہاں سے انہوں نے کپڑے خریدے تھے۔

استقبالیہ کلرک کی نظروں سے بچنے کے لیے وہ ایک ساتھ باہر نکلنے کے بجائے الگ الگ ہوٹل سے باہر آئے اور طے شدہ پروگرام کے مطابق کچھ فاصلہ پیدل طے کرنے کے بعد ایک ٹیکسی میں سوار ہو کر اسے بیرونِ شہر جانے والی بسوں کے اڈے پر پہنچانے کو کہا۔ خریداری اور حلیوں کی تبدیلی کے دوران موقع پا کر شہریار نے سلو کو بتا دیا تھا کہ ریلوے اسٹیشن پر حفاظتی انتظامات زیادہ سخت ہوتے ہیں اور وہاں سے اسلحے سمیت نکلنا آسان نہیں ہوتا اس لیے شروع ہی سے اس کی سفر کے لیے پہلی ترجیح بس تھی۔ عبدالرحمٰن کے ڈرائیور کو دھوکا دینے کے لیے اس نے اسے جا کر آگرہ جانے والی ٹرین کے ٹکٹ منگوائے تھے۔ صورتِ حال ہی ایسی تھی کہ وہ اپنے سائے سے بھی بچ کر رہنے پر مجبور تھے۔ عبدالرحمٰن کی کوٹھی سے قیمتی لباس میں روانہ ہونے والوں کو اب یکسر مختلف حلیے اور عام سے لباس میں دیکھ کر وہ ڈرائیور بھی شناخت نہیں کر سکتا تھا جس نے انہیں ریلوے اسٹیشن تک پہنچایا تھا۔

ٹیکسی سے بس اڈے پر اترنے کے بعد شہریار نے سلو کو ٹکٹ خریدنے کے لیے روانہ کیا اور خود ایک چھوٹے سے ہوٹل میں جا بیٹھا۔ وہاں بیٹھ کر دو افراد کے لیے چائے کا آرڈر دیتے ہوئے اس نے اپنی دائیں آنکھ کو مخصوص وقفے سے شہادت کی انگلی سے تین بار مسلا اور زرد گرد سے بے نیاز اخبار سامنے پھیلا کر اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ یہ ہندی اخبار اس نے ہوٹل میں آنے سے پہلے ایک اسٹال سے خریدا تھا۔ اسے ہندی کی کچھ خاص شدبد نہیں تھی لیکن خود کو مقامی ظاہر کرنے کے لیے جان بوجھ کر یہ اخبار خرید لایا تھا اور اب پورے انہماک سے اس میں یوں مصروف تھا جیسے واقعی مطالعہ کر رہا ہو۔ ویٹر نے چائے کی ٹرے لا کر سامنے رکھی تب بھی اس نے اپنا سر اوپر نہیں اٹھایا۔

"آپ کا مطلوبہ سامان لاکر نمبر چھ میں موجود ہے۔" ویٹر نے دھیمی آواز میں اسے یوں پیغام دیا جیسے اس نے چائے کے علاوہ کسی اور شے کو پیش کرنے کے بارے میں پوچھ رہا ہو۔

"ابھی صرف چائے کافی ہے۔ میرا ساتھی آجائے تو میں تمہیں مزید کھانے پینے کے بارے میں بتاؤں گا۔" شہریار نے اخبار سے سر اٹھا کر اسے قدرے بلند آواز میں جواب دیا۔ ویٹر فوراً ہی وہاں سے ہٹ گیا اور دوسری میزوں کے آرڈر پورے کرنے لگا۔ یہاں آنے سے قبل وہ جس ہوٹل میں حلیوں کی تبدیلی کے لیے رکے تھے، وہاں سے باتھ روم جانے کے بہانے اس نے کمرے سے حاصل کیے گئے نمبر پر گفتگو کی تھی۔ اس مختصر گفتگو کا نتیجہ طے شدہ پروگرام کے مطابق بس اڈے پر قائم اس ہوٹل میں ویٹر کی زبانی ملنے والے پیغام اور چائے کی ٹرے میں رکھی سلور چمکتی ہوئی بغیر کی رنگ کی چابی کی صورت میں سامنے آگیا تھا۔ اس نے نہایت خاموشی سے چابی اپنی مٹھی میں دبالی۔ اسی وقت سلو ہوٹل میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بس کے دو ٹکٹ تھے۔ وہ سیدھا شہریار کی ٹیبل پر آیا۔ سلو نے اس کے انتظار میں ابھی تک چائے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ چائے کپوں میں نکالنے لگا اور بولا۔

"کچھ کھانے کا موڈ ہو تو منگوالو۔"

"وہ تو میں ضرور منگواؤں گا۔ بھاگ دوڑ میں صبح کا ناشتا تو کب کا ہضم ہو گیا ہے۔ اب پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔" اس نے ویٹر کو اشارہ کر کے بلایا اور اسے پیٹیز اور سموسے لانے کا آرڈر دیا۔ ویٹر نے پھرتی سے یہ آرڈر پورا کر دیا۔ اس دوران میں شہریار خاموشی سے چائے پیتا رہا تھا۔ سلو نے پیٹیز ہاتھ میں لے کر منہ کی طرف بڑھایا تو وہ اپنی چائے ختم کر کے کپ واپس میز پر رکھ چکا تھا۔

"تم آرام سے کھاؤ پیو۔ اتنی دیر میں، میں سامان بس میں رکھواتا ہوں۔" وہ سلو کے جواب کا انتظار کیے بغیر اپنے ساتھ ساتھ اس کا بیگ بھی اٹھا کر باہر نکل گیا۔ اس کے اس انداز پر سلو نے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن اپنی جگہ سے ہلا نہیں اور اسی اطمینان سے بیٹھا کھاتا رہا۔ ادھر شہریار کا رخ لاکر روم کی طرف تھا۔ ویٹر سے ملنے والی چابی سے اس نے اس کے بتائے ہوئے لاکر کو کھولا۔ وہاں ایک بیگ رکھا ہوا تھا۔ اس نے بیگ باہر نکال کر اس کی زپ تھوڑی سی کھول کر اندر جھانکا۔ سنہری رنگ کی جھلک نے اسے بتایا کہ کام اسی انداز میں ہوا تھا جیسے اس نے کہا تھا۔ مطمئن ہونے کے بعد اس نے زپ دوبارہ بند کی اور بیگ کندھے پر لٹکا کر لاکر روم سے باہر آگیا۔ باہر وہ بس کھڑی تھی جس میں انہیں گاندھی نگر تک جانا تھا۔ بس کا کلینر چیخ چیخ کر دو منٹ بعد گاڑی کے روانہ ہو جانے کا اعلان کرتے ہوئے مسافروں کو جلد سے جلد سوار ہو جانے کی ہدایت کر رہا تھا۔ اس کی پکار پر سیدھے بس کی طرف جانے کے بجائے اس نے ایک کیبن کی طرف رخ کیا جہاں مختلف النوع اشیا فروخت ہو رہی تھیں۔ ان اشیا میں کھانے پینے کے آئٹمز سے لے کر ناخن تراش، کاغذ، قلم وغیرہ جیسی چیزیں بھی شامل تھیں۔ کیبن پر اس کے علاوہ دو تین آدمی اور خریداری کے لیے کھڑے تھے۔ اس نے خریداروں کی اس قطار میں شامل ہو کر جوس کے ڈبے اور ایک چھوٹا تالا خریدا۔ تالا بیگ کی زپ اور اسٹریپ کے کنڈے میں پھنسا کر بند کرنے کے بعد اس نے چابی اپنی جیب میں رکھ لی اور بس میں سوار ہو گیا اور سلو اور اپنے بیگز بس کے سامنے والے حصے میں رکھوا دیے۔

ٹکٹ کے مطابق اپنی سیٹ سنبھالنے کے بعد اس نے لاکر سے نکالا گیا اضافی بیگ پیروں کے قریب رکھا اور خود سیٹ کی پشت گاہ سے سر ٹکا لیا۔ اسی وقت اسے سلو بس کے دروازے سے اندر داخل ہوتا ہوا نظر آیا۔ اندر آنے کے بعد اس نے شہریار کی جانب رخ کرنے کے بجائے دائیں طرف کی رو میں اس سے کچھ آگے سیٹ سنبھال لی۔ یہ ان کے درمیان پہلے ہی طے ہو چکا تھا کہ وہ ایک ساتھ سفر نہیں کریں گے تاکہ کوئی مسئلہ ہو تو ایک دوسرے کی مدد کرنے میں آسانی رہے۔ اسی احتیاط کے باعث اس نے سلو کی طرف زیادہ دیر دیکھنے سے بھی اجتناب کیا اور دروازے سے داخل ہوتے دوسرے مسافروں کو دیکھنے لگا۔ مسافروں کی اکثریت نے عین وقت پر بس میں سوار ہونے کو ترجیح دی تھی چنانچہ ایک کے بعد ایک قدرے عجلت میں اندر داخل ہوتے نظر آ رہے تھے اور بس کی نشستیں تیزی سے پُر ہوتی جا رہی تھیں۔ شہریار کے برابر میں ایک تیس پینتیس سالہ قبول صورت اور متناسب جسم کی عورت براجمان ہو گئی۔ اس نے نیلی جینز کے ساتھ ایک تنگ سی گلابی رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جس پر سامنے کی طرف مشہور گلوکارہ میڈونا کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ ایک نظر میں ہی عورت کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد وہ ایک بار پھر دروازے کی طرف متوجہ ہوا۔ اب وہاں سے پولیس کی یونیفارم میں ملبوس دو افراد اندر داخل ہو رہے تھے۔

"اوہو، اب یہ ایڈیٹس دس پندرہ منٹ ضائع کر دیں گے۔ پہلے ہی گاڑی دس منٹ لیٹ ہو چکی ہے۔" پولیس والوں کو دیکھتے ہوئے اسے اپنے برابر میں بیٹھی عورت کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ مخاطب شاید اسے ہی کیا گیا تھا لیکن وہ متوجہ نہیں ہوا اور ہنوز پولیس والوں پر نظریں جمائے رہا جو اندر داخل ہونے کے بعد طائرانہ نظروں سے مسافروں کا جائزہ لے رہے تھے۔ جائزہ لینے کے بعد انہوں نے شاید اپنے طور پر چند مسافر منتخب کر لیے اور دونوں ایک ایک رو میں منقسم ہو کر اپنی کارروائی کرنے لگے۔ اس کارروائی میں مسافروں سے سوال جواب کے علاوہ ان کے سامان کی تلاشی لینا بھی شامل تھا۔ دائیں طرف کی رو والے نے سلو سے بھی چند ایک سوالات کیے۔ فاصلے کی وجہ سے وہ سلو کے دھیمی آواز میں دیے گئے جوابات نہیں سن سکا لیکن پولیس والے کے اس سے دور ہٹ جانے پر اتنا اندازہ ہو گیا کہ سلو اسے مطمئن کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ اسی اثنا میں اس کی طرف کی رو میں مصروف پولیس والا اس کے سر پر پہنچ گیا۔

"کہاں جا رہے ہو تم لوگ؟" اس نے قدرے تلخ لہجے میں سوال کیا۔

"یہ بس گاندھی نگر جا رہی ہے اس لیے ظاہر ہے کہ سب مسافر بھی وہیں جا رہے ہوں گے۔" اس سے قبل کہ وہ جواب دے پاتا، عورت نے تیزی سے کہا اور اس کا منہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا۔

"اپنی وائف کی زبان کنٹرول کرو ورنہ کبھی اس کی وجہ سے مشکل میں پڑ جاؤ گے۔" عورت کے بالکل منطقی جواب نے پولیس والے کا موڈ خراب کر دیا اور وہ سختی کے ساتھ شہریار سے مخاطب ہوا۔ اس کے اندازے کی اس بدترین غلطی نے اسے بدمزہ کر دیا اور وہ روکھے لہجے میں بولا۔

"یہ میری وائف نہیں ہے بلکہ میں اسے جانتا تک نہیں ہوں۔ یہ صرف میرے ساتھ یہ سیٹ شیئر کر رہی ہے۔"

"اوکے، اب تم یہ بتاؤ کہ تم گاندھی نگر کیوں جا رہے ہو اور وہاں کس جگہ رکو گے؟" اس کے جواب کو سن کر خجل ہو جانے کے باوجود پولیس والے نے اپنی سابقہ ٹون میں نیا سوال کیا۔

"وہاں میرا گھر ہے اور ظاہر ہے میں گھر میں ہی رہوں گا۔" اسے بھی پولیس والے کو چڑانے میں مزہ آنے لگا تھا اور وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے ساتھ بیٹھی عورت پولیس مین کی گت بننے پر مسکرائے چلی جا رہی تھی۔

"اپنا ایڈریس نوٹ کرواؤ۔" وہ بھی کسی صورت بخشنے کو تیار نہیں تھا۔ شہریار نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے سیکٹر فائیو اے کے ایک مکان کا پتا لکھوا دیا۔ ارجن اگروال سے یہ جاننے کے بعد کہ ڈاکٹر فرحان کو گاندھی نگر میں رکھا گیا ہے، اس نے نیٹ پر رات ہی کو اس علاقے کا سارا حدود اربع معلوم کر لیا تھا اس لیے جواب دینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

"سیکٹر فائیو اے میں کہاں؟ شیواجی کے مندر کے پاس...؟" پولیس والا بھی بڑا کائیاں تھا اور گھما پھرا کر اس سے سوالات کر رہا تھا۔

"نہیں، شیواجی کا مندر سیکٹر بی میں ہے۔ میں ہنومان جی کے مندر کے پاس رہتا ہوں۔" وہ بھی کسی طرح پکڑائی دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔

اس بار پولیس والے نے بھی اس کا جواب قبول کر لیا اور قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔ "ممبئی کیوں گئے تھے؟"

"بزنس کے لیے۔ میں آرٹیفشل جیولری کا بزنس کرتا ہوں، ممبئی سے وہی خریدنے گیا تھا۔" اس نے بھی اپنے لہجے میں عاجزی سمو لی کہ پولیس والے کو اشتعال دلانا کسی صورت مناسب نہیں تھا۔

"بیگ کھول کر دکھاؤ۔" اس نے تصدیق کے لیے اس کے قدموں میں پڑے بیگ کو کھولنے کا حکم دیا۔

شہریار نے جیب سے چابی نکالی اور تالا کھول کر زپ بھی کھول دی۔ اندر سے سنہری جھلملاتے ہوئے زیورات اپنی جھلک دکھا کر نظروں کو خیرہ کرنے لگے۔

"ٹھیک ہے۔" بالآخر پولیس والے کو اس کی طرف سے اطمینان ہو ہی گیا اور وہ اس کی سیٹ کے پاس سے ہو کر آگے بڑھ گیا۔ شہریار نے بیگ کی زپ بند کر کے ایک بار پھر احتیاط سے تالا لگایا اور چابی واپس جیب میں رکھ لی۔ پولیس والوں نے بھی بس میں چند منٹ مزید گزارے اور پھر اسے کلیئر قرار دیتے ہوئے نیچے اتر گئے۔ یوں بس کی روانگی عمل میں آئی۔

"میرا نام اوشا ہے۔ ممبئی کی رہنے والی ہوں اور اپنے انکل سے ملنے گاندھی نگر جا رہی ہوں۔" بس چل پڑی تو عورت نے اس سے اپنا تعارف کروایا۔

"مجھے پٹیل کہتے ہیں۔" اس نے بھی ذرا تکلف سے اپنا مختصر تعارف کروایا۔

"آپ مجھے اپنی شاپ کا ایڈریس دینا پسند کریں گے؟" اس نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا اور وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "ایکچوئلی میں کچھ جیولری خریدنا چاہتی ہوں۔"

"آپ تو خود ممبئی کی رہنے والی ہیں۔ یہاں سے ممبئی کی جیولری خرید کر کیا کریں گی؟" شہریار نے تعجب کا اظہار کیا۔

"اصل میں، میں اپنے انکل کی بیٹیوں کے لیے ممبئی سے کوئی گفٹ نہیں لائی ہوں اس لیے سوچ رہی ہوں کہ آپ سے جیولری خرید کر انہیں گفٹ کر دوں۔" اس نے شہریار کی حیرت دور کی۔

"اوکے، میں آپ کا پرابلم سمجھ گیا ہوں۔ آپ ایسا کیجیے گا کہ مین مارکیٹ میں آ کر کسی سے بھی پوچھ لیجیے گا کہ ممبئی جیولرز شاپ کہاں ہے۔ آپ کو میری شاپ تک پہنچا دیا جائے گا۔" اس نے مہذبانہ انداز میں اوشا سے کہا اور پھر قدرے معذرت خواہانہ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ایکسکیوز می... میں بہت تھکا ہوا ہوں اور راستے میں کچھ دیر نیند لینا چاہتا ہوں۔"

"شیور۔" عورت نے مسکرا کر کہتے ہوئے اپنا چہرہ کھڑکی کی طرف کر لیا اور باہر سے گزرتے مناظر کو دیکھنے لگی۔ شہریار نے نوٹ کیا تھا کہ اس عورت کی مسکراہٹ بہت پرکشش لیکن بھید بھری ہے۔ وہ اسے کچھ عجیب سی لگی تھی اس لیے وہ دانستہ اس سے دور رہنا چاہتا تھا۔ طویل راستے میں کسی ناپسندیدہ گفت وشنید سے بچنے کا واحد طریقہ یہی تھا کہ وہ سوتا ہوا بن جائے، چنانچہ اسی طریقے پر عمل کیا۔ اب یہ محض اتفاق تھا کہ سونے کی اداکاری کرتے کرتے اس کے تھکے ہوئے اعصاب خودبخود ہی ڈھیلے پڑ گئے اور سچ مچ اس کی آنکھ لگ گئی۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اس کی نیند کا دورانیہ کتنا رہا لیکن گہری نیند میں بھی اس نے اپنی جیب کے پاس حرکت کو محسوس کر لیا اور خودکارانہ انداز میں بند آنکھوں سے ہی اس حرکت کرتی ہوئی شے کو دبوچ لیا۔ فوراً ہی اسے ایک سسکی سنائی دی۔ اس نے آنکھیں کھول کر آواز کے ماخذ کی طرف دیکھا۔ اس کی ہمسفر کا ہاتھ اس کی گرفت میں تھا اور وہ چہرے پر ذرا تکلیف کے آثار لیے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"میرا ہاتھ چھوڑیے... کیا توڑ ہی ڈالیں گے؟" اس کے چہرے پر گھبراہٹ کا کوئی تاثر نہیں تھا اور وہ بس ذرا سی تکلیف کا اظہار کرتے ہوئے ایک ادا سے اس سے مخاطب تھی۔

"میری پاکٹ میں ہاتھ کیوں ڈال رہی تھیں؟" اس کے انداز سے متاثر ہوئے بغیر شہریار نے سخت لہجے میں لیکن دھیمی آواز سے دریافت کیا۔ وہ جن حالات سے دوچار تھا، وہ احتیاط کے متقاضی تھے۔ کچھ بھروسا نہیں تھا کہ وہ بلند آواز میں عورت پر جیب میں ہاتھ ڈالنے کا الزام لگاتا تو کئی لوگ ان کی طرف متوجہ ہو جاتے اور عورت اپنی جان بچانے کے لیے الٹا اسی پر دست درازی کا الزام لگا دیتی۔ وہ پاک و ہند کے لوگوں کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہاں لوگ ویسے چاہے عورت کو اپنی جوتی تلے رکھنے کو پسند کرتے ہوں لیکن اس قسم کے معاملات میں ان کی ساری ہمدردیاں عورت کے ساتھ ہی ہوتی ہیں۔

"میں تمہاری پاکٹ میں ہاتھ نہیں ڈال رہی تھی بلکہ اس کیڑے کو اڑا رہی تھی جو تمہاری پاکٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔" اوشا نے بھی دھیمی اور درد بھری آواز میں اس کی بات کا جواب دیا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک شہریار کی مضبوط گرفت میں تھا اور یقیناً وہ تکلیف محسوس کر رہی تھی۔

اس کے جواب کو سن کر شہریار نے بےساختہ ہی بس کے اندر ایک طائرانہ نظر دوڑائی۔ ایئرکنڈیشنڈ بس کے تمام دروازے کھڑکیاں بند تھے اور اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ باہر سے کوئی کیڑا اڑ کر اندر آنے کے بعد اس کی جیب پر بیٹھا ہو جسے اڑانے کے لیے اوشا کو تردد کرنا پڑا ہو۔ پھر بھی اس نے اس کی توجیح قبول کر لی اور بااخلاق لہجے میں بولا۔ "سوری، میں نیند میں ہونے کی وجہ سے کچھ اور سمجھا تھا۔" ساتھ ہی اس نے اوشا کا ہاتھ بھی چھوڑ دیا۔ وہ ہاتھ آزاد ہوتے ہی اپنے دوسرے ہاتھ سے اسے آہستہ آہستہ دبانے لگی۔

"بہت سخت پکڑ ہے آپ کے ہاتھ کی۔" ہاتھ کو سہلاتے ہوئے اس نے کچھ ناز سے شکوہ کیا۔

"مردوں کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے۔ آپ کو شاید ایکسپیرینس نہیں ہے۔" اس بار شہریار نے بھی مسکرا کر معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔ اس طرح وہ اس عورت کی ٹائپ کو جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کوئی خفیہ ایجنٹ، کال گرل، نوسرباز کچھ بھی ہو سکتی تھی اور اس بات کا تعین کرنے کے بعد ہی وہ اس سے اپنے بچاؤ کی تدبیر کر سکتا تھا۔

"ایسی بھی بات نہیں ہے لیکن سچ یہ ہے کہ اتنی مضبوط پکڑ کسی کسی مرد ہی کی ہوتی ہے اور آپ تو کام بھی بڑا نازک کرتے ہیں۔"

"کام کتنا ہی نازک ہو، مرد مضبوط ہی اچھا لگتا ہے۔" شہریار نے اسے جواب دیا۔

"یہ تو آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ مجھے بھی مضبوط مرد اچھے لگتے ہیں۔ میں کسی روز ضرور آپ کی شاپ پر آؤں گی اور اگر آپ نے پسند کیا تو ہم ساتھ میں کچھ وقت گزاریں گے۔" اس کے لہجے میں جو ترغیب تھی اس کے مطابق شہریار اس کے کال گرل ہونے کا ہی اندازہ قائم کر سکا تھا لیکن یہ کوئی حتمی اندازہ نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انڈین ایجنسیوں میں بھی عورتوں کو اس طریقے سے استعمال کر کے اپنا کام نکالنے کا چلن عام ہے اور اس کے لیے خود کو اوشا سے بچا کر رکھنا ہی بہتر ہوگا، چنانچہ وہ نہایت ہوشیاری سے یہ کوشش کر رہا تھا۔

"آپ کے ساتھ وقت گزارنا کسے اچھا نہ لگے گا۔ آپ ضرور میری شاپ پر آئیے گا۔ میں کل سے ہی آپ کا انتظار شروع کر دوں گا۔" اس نے دل پھینک انداز میں اسے دعوت دی۔ اس دعوت کے ذریعے وہ اوشا پر یہ تاثر مضبوط کرنا چاہتا تھا کہ وہ واقعی گاندھی نگر کا مقامی ہے اور وہ اس سے اس کی شاپ پر بہ آسانی مل سکتی ہے۔

"آج سے کیوں نہیں؟" اس کا جواب سن کر اوشا نے بےساختہ ہی پوچھا۔

"آج گھر والی نہیں چھوڑے گی۔" اس نے بھی اسی بےساختگی سے جواب دیا۔

"اوہ... تو آپ میرڈ ہیں۔" وہ گویا تھوڑی سی مایوس ہوئی۔

"ہاں ہوں تو سہی پر میری پتنی زیادہ تیز عورت نہیں ہے۔ اس کا سارا ٹائم گھر کے کاموں میں گزر جاتا ہے اور وہ مجھ سے میری روٹین کے بارے میں زیادہ سوال جواب نہیں کرتی لیکن آج کی بات الگ ہے۔ آج ایک تو میں سفر سے واپس لوٹ رہا ہوں، دوسرے آج ہی کے دن ہمارے بیاہ کو ایک سال کمپلیٹ ہو رہا ہے اس لیے میرا اس کے پاس ہونا ضروری ہے۔" وہ بڑی مہارت سے جھوٹ پر جھوٹ بول رہا تھا۔

"اوہ، پھر تو آج سچ مچ تمہارا اپنی پتنی کے پاس موجود ہونا ضروری ہے۔" اس نے ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا اور پھر ذرا معنی خیزی سے بولی۔ "آج تو وہ بڑی شدت سے تمہارا اویٹ کر رہی ہوگی۔"

"وہ تو ہے۔ کیا تمہیں خاص موقعوں پر اپنے پتی کا انتظار نہیں رہتا؟" اوشا نے بے تکلفی دکھاتے ہوئے اسے تم کہہ کر پکارا تو وہ بھی فوراً یہ مرحلہ طے کر گیا۔

"ہمارے ہاتھ کی ریکھا میں پتی کہاں لکھا ہے؟ ہم جیسیاں تو بس بغیر پھیروں کے مردوں کی سیج سجایا کرتی ہیں۔" نہایت اداسی سے بولتی وہ اپنی حقیقت عیاں کر گئی جس پر سو فیصد یقین نہ ہونے کے باوجود وہ چپ سا رہ گیا۔ اس روپ میں عورت اس کے لیے سدا ناقابلِ قبول رہی تھی، چاہے اس کے پیچھے مجبوری کی کوئی بھی داستان رہی ہو۔

"چپ کیوں ہو گئے؟ کیا میں دوستی کے لائق نہیں ہوں؟" اوشا نے سرگوشی میں اسے مخاطب کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔ بس میں کچھ اور سوچنے لگا تھا۔" اس نے تیزی سے خود کو سنبھال لیا اور پھر وہ گاندھی نگر تک مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ شہریار کی کوشش تھی کہ یونہی عمومی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہے جبکہ اوشا اس کی ذات میں زیادہ دلچسپی لے رہی تھی اور وہ اس کے اس قسم کے سوالات کو بھی بڑی خوبی سے نمٹا رہا تھا۔ لیکن بہرحال گاندھی نگر تک پہنچنے تک وہ یہ طے کر چکا تھا کہ اوشا ایک نہایت گھاگ عورت ہے جس سے بچنا ضروری ہے۔ وہ اپنے بارے میں جو انکشاف کر چکی تھی، اس کے بعد اس کے گھاگ ہونے پر تعجب بھی نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن جانے کیوں اس کی چھٹی حس بار بار یہ اشارہ دے رہی تھی کہ وہ اس کے سوا بھی کچھ ہے جو اس نے اپنے آپ کو ظاہر کیا ہے۔

گاندھی نگر پہنچنے کے بعد اس نے بہت خوش اخلاقی سے اوشا کو گڈ بائے کہا اور آنے والی شام اپنی شاپ پر آنے کی دعوت دے کر آگے بڑھ گیا۔ وہ جو بھی تھی مصیبت سے یہیں پیچھا چھڑا لینا مناسب تھا۔ اپنی سواری کا انتظام کر کے اس نے ڈرائیور کو ایس پی ہوٹل کا حکم دیا۔ یہ ہوٹل گاندھی نگر کے سیکٹر 7 میں تھا جبکہ اسپتال میں ارجن نے انہیں ڈاکٹر فرحان کی موجودگی کے بارے میں بتایا تھا، وہ سیکٹر فائیو ڈی اور فائیو اے کے درمیان کہیں واقع تھا۔ سلو کو بھی الگ سواری میں اس کے پیچھے ایس پی ہوٹل ہی پہنچنا تھا۔ وہ دونوں وہاں یکجا ہو کر اور پھر مزید آگے کی کارروائی کرتے۔ ہوٹل کی طرف بڑھتے ہوئے وہ پوری طرح ہوشیار رہا کہ اس کا تعاقب نہ کیا جا رہا ہو لیکن سارے راستے اسے ایسی کوئی مشکوک گاڑی نظر نہیں آئی اور کسی حد تک اس کا اوشا پر شک دور ہو گیا اور اس نے سوچا کہ ممکن ہے وہ وہی ہو جو اس نے خود کو ظاہر کیا تھا ورنہ کوئی سیکرٹ ایجنٹ تو اتنی آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ ہوٹل پہنچ کر اس نے اپنے لیے ایک ڈبل بیڈ کمرا بک کروایا اور کاؤنٹر پر اطلاع دے دی کہ کچھ دیر بعد اس کا ایک دوست بھی وہاں پہنچنے والا ہے۔ اسے فوری طور پر کمرے میں پہنچانے کی ہدایت کرتا ہوا وہ سامان اٹھا کر کھڑے عمر رسیدہ ویٹر کے پیچھے اپنے کمرے تک پہنچا۔ اس کے اندازے کے مطابق سلو کو بھی پانچ دس منٹ کے وقفے سے وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بیس منٹ بعد جبکہ وہ کچھ تشویش میں مبتلا ہونے لگا تھا، اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ابھری۔ وہ اس دستک کو پہچانتا تھا۔ یہ سلو کی دستک تھی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

"بہت دیر لگا دی آنے میں؟" سلو کی شکل پر نظر پڑتے ہی اس نے استفسار کیا۔

"بڑی مشکل سے جان چھڑا کر آیا ہوں۔ کوئی میرا تعاقب کر رہا تھا۔ اسے ڈاج دینے میں ذرا وقت لگ گیا۔" اس نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بتایا اور تپائی پر رکھا پانی کا جگ اٹھا کر گلاس میں پانی انڈیلنے لگا۔

"تعاقب...؟ لیکن کوئی تمہارا تعاقب کیوں کر رہا تھا؟" اس کا تشویش میں مبتلا ہونا لازمی تھا۔

"ظاہر ہے کوئی تو وجہ رہی ہوگی لیکن میں اپنے طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ سفر کے دوران میرا ایسے کسی شخص سے واسطہ نہیں پڑا جس کے بارے میں کہہ سکوں کہ وہ مشکوک تھا۔" اس نے ایک سانس میں پانی کا گلاس خالی کیا۔ شانے اچکاتے ہوئے اپنے مخصوص بے نیاز انداز

جواب دیا۔

"اوکے، یہ اچھا ہے کہ تم اس سے اپنی جان چھڑانے میں کامیاب ہوگئے۔ آؤ آخری بار بیٹھ کر اپنے منصوبے کا جائزہ لے لیتے ہیں تاکہ کوئی خامی ہو تو اس کا حل نکالا جا سکے۔" سلو کا تعاقب اگرچہ اس کے لیے خاصی تشویش ناک بات تھی لیکن اس وجہ سے وہ اپنے اصل کام کو کسی طور پر پس پشت نہیں ڈال سکتا تھا۔ تمام تر خطرات و خدشات کے باوجود انہیں اپنے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا تھا چنانچہ دونوں مل کر پوری عرق ریزی سے اپنے منصوبے کا جائزہ لینے لگے۔ اس دوران میں شہریار نے چند ایک بار فون پر بھی مختصر گفتگو کی اور بالآخر جب وہ دونوں فارغ ہوئے تو دلوں میں اس بات کا یقین تھا کہ آج ڈاکٹر فرحان جمیل کی قید کا آخری دن ہوگا۔

☆☆☆

"کیسے ہو خان؟" ذیشان نے اپنے سامنے بیٹھے مشابرم خان کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

"اللہ کا کرم ہے صاحب... وہ جس حال میں رکھے ہم اس میں خوش رہنے والا بندہ ہے لیکن آج کل بیکاری سے تھوڑا پریشان ہے۔ ایسے بیکار بیٹھ کر روٹیاں توڑنے کا عادت نہیں ہے ہمیں۔" مشابرم خان نے اس کے سوال کا ذرا تفصیلی جواب دیا۔ حقیقتاً وہ فراغت سے تنگ آگیا تھا۔ بلتستان میں یہودی لابی کے سیٹ اپ کو سبوتاژ کرنے کے لیے اس نے پاک آرمی کے ساتھ مل کر بڑا اہم کردار ادا کیا تھا لیکن اس کارروائی کے دوران میں اس کی شناخت بھی منظرِ عام پر آگئی تھی اس لیے فیصلہ کیا گیا تھا کہ فی الحال اسے انڈر گراؤنڈ ہی رکھا جائے اور کسی دوسرے مشن میں شامل کر کے اس کی زندگی کو خطرے میں نہ ڈالا جائے۔ ویسے بھی اس مشن کے دوران وہ اچھا خاصا زخمی ہوگیا تھا اور ریکوری کے لیے اس کا کچھ عرصہ آرام کرنا بہت ضروری تھا۔

"بس تو پھر خوش ہو جاؤ، تمہارے لیے کام نکل آیا ہے اور جلد تم ایک بار پھر ایکشن میں ہوگے۔" اس کا جواب سن کر ذیشان نے مسکراتے ہوئے کہا لیکن مشابرم خان نے نوٹ کیا کہ یہ مسکراہٹ لبوں سے آگے نہیں جاتی ہے اور ذیشان کی آنکھوں سے پریشانی مترشح ہے۔

"کیا ہمیں عمیر صاحب کو دوبارہ جوائن کرنا ہے؟" دل ہی دل میں ذیشان کی پریشانی کے بارے میں اندازہ لگاتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

"نہیں، اس طرف تو فی الحال تمہیں بھیجنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اگر کوئی تمہیں تلاش کر رہا ہوگا تو اس طرف ضرور نظر رکھے ہوئے ہوگا۔ یوں بھی عمیر کی طرف صورتِ حال ابھی اتنی خراب نہیں ہے کہ وہ اکیلا ہینڈل نہ کر سکے۔ میں نے اس کا جگجو سے بھی رابطہ کروا دیا ہے۔ ضرورت پڑنے پر وہ اس کی ٹھیک ٹھاک مدد کر سکتا ہے۔ ابھی بھی اس نے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ وہ ریڈ لائٹ ایریا سے ایک ایسی لڑکی اور لڑکے کو لانے میں کامیاب ہوگیا ہے جن کی مدد سے چودھری پر طوائف کے قتل کا مقدمہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ لڑکا مرنے والی کا بھائی ہے جبکہ لڑکی اس کی محبوبہ ہے۔ عمیر نے ان کی کورٹ میریج کرا دی ہے اور دونوں میاں بیوی کی مدعیت میں چودھری پر کیس بھی کیا جا چکا ہے لیکن آج کل چودھری بھارت میں ہے اس لیے کارروائی کچھ خاص آگے نہیں بڑھی ہے۔ رہی جنگل میں آپریشن کی بات تو ہم اس معاملے کو چھیڑنے سے فی الحال قاصر ہیں۔ ہمارے وسائل ہمیں اس کام کی اجازت نہیں دے رہے ہیں۔"

ذیشان سنجیدگی سے اسے بتاتا چلا گیا جس پر اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ "ٹھیک ہے، آپ جو مناسب سمجھتے ہیں مجھے وہ کام دے دیں۔ ہم تو ہاتھ پیر کھولنے کے لیے کب سے ترس رہے ہیں۔"

"کیوں؟ عمر فاروق صاحب کے ساتھ رہ کر تمہیں ہاتھ پیر کھولنے کا موقع نہیں مل رہا ہے کیا؟ وہ تو خاصے سخت گیر انسٹرکٹر ہیں جو بندے کا تیل نکل جانے تک اس سے مشقت کرواتے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، عمر صاحب نے واقعی ہمیں بہت کچھ سکھایا ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ جنگل کا شیر سرکس میں خوش نہیں رہتا۔ اسی لیے میں بھی چاہتا ہوں کہ مجھے کچھ ہاتھ پیر ہلانے کا موقع ملے۔"

"تو بھئی مل رہا ہے نا موقع... اپنا بوریا بستر سمیٹو اور یہاں سے امریکا جانے کی تیاری کرو۔ تمہارا اگلا مشن وہیں ہوگا۔ اس دوران تمہاری بیوی ہماری مہمان ہوگی اور ہم اس کا ہر ممکن خیال رکھیں گے۔" ذیشان کے جواب نے مشابرم خان کے چہرے پر حیرت دوڑا دی۔

"امریکا... لیکن میں وہاں جا کر کیا کروں گا؟" حیرت نے الفاظ کا روپ بھی اختیار کر لیا۔

"تمہیں ماہ بانو نامی وہ لڑکی یاد ہوگی جسے شہریار صاحب نے چودھری کے پنجوں سے بچائے رکھا تھا۔ اس لڑکی کی بعد میں انہوں نے اسلم نامی ایک شخص سے شادی کرا کر ان دونوں میاں بیوی کو امریکا میں ایک جگہ آرلینڈو شفٹ کر دیا تھا جہاں وہ دونوں بہت سکون سے رہ رہے تھے۔ لیکن اب اچانک ہی ماہ بانو پُراسرار طور پر وہاں سے غائب ہوگئی ہے اور اسلم بھی اس کی تلاش میں نکلنے کے بعد غائب ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم وہاں جا کر ماہ بانو کو تلاش کرو کیونکہ شہریار صاحب کے پیچھے اس مسئلے کو حل کرنا ہمارا فرض بنتا ہے۔" ذیشان بولتا جا رہا تھا اور مشابرم خان کے دل و دماغ گویا آندھیوں کی زد میں آگئے تھے۔

شہریار کے ساتھ کافی عرصے کام کرنے کی وجہ سے وہ ماہ بانو سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہ ماہ بانو ہی تھی جسے پناہ دینے کی پاداش میں اسے اپنے جوان بھائی اور ماں کی قربانی دینی پڑی تھی۔ شہریار کے زبان سے اظہار نہ کرنے کے باوجود وہ جانتا تھا کہ ماہ بانو کی شہریار کے دل میں بہت خاص جگہ ہے اور چاہے وہ اس لڑکی کو اپنی زندگی کا حصہ بنائے یا نہ بنائے، اسے اپنے دل سے نہیں نکال سکتا ہے۔ اس دل سے جو ایک عرصے سے مشینوں کے سہارے زندہ تھا اور مشابرم خان جیسے چند مخلص ہر صبح اس امید کے ساتھ اپنے بستر سے اٹھتے تھے کہ آج کا سورج دیکھنے کے لیے تو شہریار ضرور ہی اپنی آنکھیں کھولے گا لیکن وہ تو سب سے بے خبر طویل نیند سو رہا تھا۔ سی ایف پی کے شہریار کے کوما میں چلے جانے والے ڈرامے کی حقیقت سے بہت کم لوگ واقف تھے اور مشابرم خان سمیت ہر ایک یہی سمجھتا تھا کہ شہریار کوما کی حالت میں اسپتال کے بستر پر پڑا موت اور زندگی کے درمیان اٹکا ہوا ہے۔

"آپ فکر نہ کریں سر جی اور بس امریکا پہنچنے کا بندوبست کر دیں۔ ہم اپنی جان دے کر بھی ماہ بانو بی بی کو ڈھونڈ نکالے گا۔" وہ اس وقت خاصا جذباتی ہوگیا تھا۔ شہریار کی اس کی زندگی میں بڑی اہمیت تھی اور وہ عقیدت کی حد تک اس سے محبت کرتا تھا چنانچہ اس لڑکی کے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے تیار تھا جو اس کے یقین کے مطابق شہریار کی محبت تھی۔

"تمہارے اس خلوص کی وجہ سے ہی میں نے اس کام کے لیے تمہارا انتخاب کیا ہے لیکن تمہارے اوپر کوئی زور زبردستی بھی نہیں ہے۔ اگر نہ جانا چاہو تو انکار بھی کر سکتے ہو کیونکہ میرے اندازے کے مطابق وہاں پہنچنے کے بعد تم آسانی سے واپس نہیں آسکو گے۔ وہاں بہت سے معاملات کافی الجھے ہوئے ہیں اور ظاہر ہے جب ہم یہاں سے ایک بندہ وہاں بھیجیں گے تو اس کو وہ سب بھی دیکھنا پڑے گا۔ تمہاری کچھ عرصے پہلے شادی ہوئی ہے۔ کہیں تمہیں اپنی بیوی کو چھوڑ کر جانا ناگوار تو نہیں گزرے گا؟"

"بالکل بھی نہیں۔ ہماری بیوی بھی ہماری طرح پہاڑوں کی اولاد ہے اور پہاڑ جیسا مضبوط دل رکھتی ہے۔ ہم بولے گا تو وہ خوشی سے ہمیں رخصت کرے گی۔" مشابرم خان نے دو ٹوک لہجے میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے تو پھر جانے کی تیاری کرو۔ تمہیں یہاں سے پہلے دبئی بھیجا جائے گا اور پھر وہاں سے تم آگے جاؤ گے۔ سفر سے متعلق دیگر ہدایات تمہیں عمر فاروق صاحب کے ذریعے پہنچتی رہیں گی۔" یہ جملے مشابرم خان کے لیے اشارہ تھے کہ ملاقات ختم ہو چکی ہے۔ وہ انکساری سے ذیشان کو سلام کرتا ہوا وہاں سے رخصت ہوگیا جبکہ ذیشان اپنی جگہ بیٹھا گہری سوچوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس کی سوچ کا مرکز شہریار عادل تھا جو اپنے بجائے دوسروں کے لیے جینے کو ترجیح دیتا تھا اور اس وقت بھی وطن کے مفاد میں گمنام حیثیت سے جدوجہد میں مصروف تھا اور جدوجہد بھی ایسی تھی کہ جس میں ناکامی کی صورت میں کوئی اس کی لاش کو اون (Own) کرنے والا بھی نہ ہوتا۔ نہ ہی کامیابی پر کسی تمغے یا اعزاز سے نوازا جاتا۔ حقیقی مجاہد ایسا ہی ہوتا ہے۔ انجام کی پروا کیے بغیر صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے جدوجہد کرنے والا۔

☆☆☆

"میرے ساتھی کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔ کیا آپ اسپتال جانے کے لیے کسی گاڑی کا بندوبست کر سکتے ہیں؟" اپنے منصوبے کے پہلے حصے پر عمل پیرا شہریار نے انٹرکام پر ہوٹل کے کلرک سے رابطہ کیا اور نہایت پریشان لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

"شیور سر! میں ابھی ایمبولینس کے لیے کال کرتا ہوں۔" جواب میں کلرک نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے یقین دہانی کرائی اور واقعی چند منٹ کے وقفے کے بعد ایمبولینس حاضر تھی۔ پیٹ پکڑ کر بری طرح کراہتے سلو کو تیزی سے اس میں منتقل کیا گیا۔ شہریار ایک بیگ تھامے اس کے ساتھ تھا اور راستے بھر پسینے میں شرابور، درد سے دہرے ہوتے سلو کو دلاسا دیتا رہا تھا۔ ایمبولینس کے ڈرائیور نے اپنی پیشہ ورانہ مہارت کا استعمال کرتے ہوئے بہت تیزی سے انہیں اسپتال کی ایمرجنسی میں پہنچا دیا جہاں سلو کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس کا معائنہ کرنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹرز مختلف سوالات بھی کرتے چلے گئے تاکہ کیس کی

نوعیت کو سمجھ سکیں۔ سلو تو تکلیف سے اتنا بے حال تھا کہ اس پر نیم غشی طاری ہو رہی تھی اور ڈاکٹرز کے سوالات کے جواب دینے کا فریضہ انجام دیتا شہریار اس کی بھرپور اداکاری پر دل ہی دل میں اسے داد دے رہا تھا۔ یہاں آنے سے قبل اس نے سلو کو ایسی دوا استعمال کروائی تھی جس کی وجہ سے جسم سے پسینے کا اخراج بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ اس طرح ڈاکٹرز کو یہ یقین آنا آسان رہتا کہ واقعی وہ بہت تکلیف میں ہے۔ اسپتال پہنچنے کے لیے پیٹ کے درد کا بہانہ اس لیے اختیار کیا گیا تھا کہ اس جھوٹ کو پکڑنا آسان نہیں ہوتا اور ڈاکٹرز مختلف امکانات کو سامنے رکھتے ہوئے اصل مرض تک پہنچنے کے لیے الجھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ترکیب انہیں اسپتال میں قیام کا ایک اچھا بہانہ فراہم کر سکتی تھی چنانچہ ڈاکٹر کی ہدایت پر نرس کے لگائے جانے والے پین کلر کو بھی سلو نے مسترد کر دیا اور بتایا کہ ہنوز درد اتنی ہی شدت سے ہو رہا ہے۔

"میرا خیال ہے ہمیں انہیں ایڈمٹ کرنا پڑے گا۔ ایڈمٹ کر کے ہم ان کا الٹرا ساؤنڈ اور دوسرے ٹیسٹ کریں گے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اچانک اٹھنے والے اتنے شدید درد کی کیا وجہ ہے۔" بالآخر ڈاکٹر کے منہ سے وہ الفاظ ادا ہوئے جنہیں سننے کے لیے ان دونوں کے کان منتظر تھے۔

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! آپ کو جو کرنا ہے کرو، پر میرے بھرا کو ٹھیک کر دو۔ مجھ سے اس کی اتنی تکلیف دیکھی نہیں جا رہی ہے۔" شہریار نے ایک محبت کرنے والے پریشان حال بڑے بھائی کی طرح ڈاکٹر سے التجا کی۔

"ڈونٹ وری، بھگوان نے چاہا تو یہ جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔" ڈاکٹر نے اسے پیشہ ورانہ انداز میں سپاٹ سے لہجے میں تسلی دی اور اپنے ماتحت عملے کے ساتھ ایک بار پھر سلو کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گیا۔ اس کی ہدایت پر سلو کا ٹریٹمنٹ کیا جانے لگا اور بالآخر جب اسے مزید ایک اور انجکشن کے علاوہ ڈرپ بھی لگا دی گئی تب اس نے اس بات کا اظہار کیا کہ اس کے درد میں بتدریج کمی ہوتی جا رہی ہے۔ اس دوران میں شہریار اس کے اسپتال میں داخلے کی کارروائی نمٹاتا رہا۔ کارروائی مکمل ہوتے ہی سلو کو دوسری منزل پر واقع کمرا نمبر اٹھاسی میں منتقل کر دیا گیا۔ ارجن اگروال سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق ڈاکٹر فرحان کو اسپتال کی تیسری منزل پر رکھا گیا تھا جہاں عموماً ذہنی امراض میں مبتلا افراد کو رکھا جاتا تھا۔

"یہ مرحلہ تو طے ہو گیا۔ اب ہم اطمینان سے یہاں رہ کر جائزہ لے سکتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کو کس طریقے سے یہاں سے نکالا جائے۔" سلو کو یہاں منتقل کرنے والے ماتحت عملے کے علاوہ جب قدرے مطمئن ڈاکٹر اور نرس کمرے سے باہر نکل گئے تو شہریار نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"تمہاری اس ترکیب نے میرا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ کم بختوں نے سوئیاں گھونپ گھونپ کر میرا ہاتھ چھلنی کر ڈالا ہے۔" سلو نے قدرے غصے سے کہتے ہوئے اپنے ہاتھ کی پشت پر ٹیپ کی مدد سے چپکائی گئی، ورید میں گھسی سوئی کھینچ کر باہر نکالا۔ سوئی نکلتے ہی خون بہنے لگا جسے اس نے ایک روئی کے پھائے کی مدد سے دبا کر روکا۔

"مجبوری تھی برخوردار... ورنہ مجھے بھی شوق نہیں تھا کہ تم جیسے ہٹے کٹے آدمی کو اسپتال میں داخل کر کے اس کے نازنخرے اٹھاؤں۔" شہریار نے اسے ترت جواب دیا اور بیگ کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اندر جدید ساخت کی ایک گن تین حصوں میں منقسم صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کے علاوہ چند چھوٹے ہتھیار اور دستی بم بھی موجود تھے۔ یہ اشیا کپڑوں کی تہ کے درمیان رکھی تھیں اور سلو نہیں جانتا تھا کہ شہریار نے ان کا بندوبست کب اور کیسے کیا۔ وہ بہت اشتیاق سے گن کو دیکھ رہا تھا اور انداز کچھ ایسا تھا جیسے اپنے من پسند کھلونے کو ہاتھ میں لینے کے لیے بے چین ہو۔

"اس کے پارٹس جوڑ کر اپنے بستر کے نیچے چھپا لو۔ کھیل شروع ہونے پر اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ویسے تو ہم کوشش کریں گے کہ ڈاکٹر کو خاموشی سے یہاں سے نکال کر لے جائیں لیکن ظاہر ہے دوسری پارٹی کی طرف سے شدید مزاحمت کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے میں یہ بہت کام آئے گی۔" کمرے میں کسی کے موجود نہ ہونے کے باوجود اس نے نہایت دھیمی آواز میں سلو سے کہا اور خود بیگ میں ہی موجود ایک چھوٹے چرمی بیگ میں دو دستی بم رکھ کر اسے بیلٹ کی مدد سے اپنے پیٹ پر باندھنے لگا۔ اندر اس نے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی تھی اور ایسی ہی ایک جیکٹ سلو کے لیے بیگ میں رکھی تھی۔ اسے کیونکہ مریض کا کردار ادا کرنا تھا، اس لیے وہ ہوٹل سے ہی یہ جیکٹ پہن کر نہیں آ سکتا تھا۔ یہ سارا سامان اسی بیگ سے نکلا تھا جو بظاہر آرٹیفشل جیولری سے بھرا ان کے ساتھ ممبئی سے یہاں تک آیا تھا۔

سلو نے اس بیگ کے بارے میں از خود بہت کچھ سمجھ لیا تھا اور شہریار سے کسی قسم کا استفسار کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی تھا اور اس وقت بھی پوری توجہ سے گن کے مختلف حصے جوڑنے میں مصروف تھا۔ ہتھیار اس کے لیے نیا نہیں تھا۔ را سے تربیت حاصل کرنے کے دوران اس نے اس خطرناک گن کو بھی استعمال کر کے دیکھا تھا۔ گن روسی ساختہ تھی، شاید اسی لیے شہریار نے یہ جانے بغیر کہ وہ اسے استعمال کر بھی سکتا ہے یا نہیں، اس کے حوالے کر دی تھی۔ بھارتی اسلحہ شناس اپنے دوست روس کے تیار کردہ اسلحے کو بھی بہت اچھی طرح استعمال کرنا جانتے تھے چنانچہ سلو کا اس سے ناآشنا ہونا مشکل ہی تھا۔ ایک منٹ دس سیکنڈ کے اندر گن کے تینوں حصوں کو جوڑ کر ورکنگ پوزیشن میں لاتے ہوئے سلو نے اپنی واقفیت کو ثابت بھی کر دیا۔ گن اس کے بستر کے نیچے منتقل ہوئی تو شہریار بھی پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔ اس کے جسم پر موجود ڈھیلی ڈھالی شرٹ کچھ اس طرح کی تھی کہ کسی کے لیے اندازہ لگانا مشکل ہوتا کہ اندر بلٹ پروف جیکٹ کے علاوہ بھی بہت کچھ چھپا ہوا ہے۔

"میرے جانے کے بعد اگر کوئی یہاں آئے تو تم اسے سوتے ہوئے نظر آنے چاہیے ہو۔ اس صورت میں کوئی تمہیں مخاطب نہیں کرے گا۔ بالفرض کسی نے تم سے میرے بارے میں دریافت کر لیا تو تم اسے بتاؤ گے کہ میں اپنی اور تمہاری ضروریات کا سامان لینے گیا ہوا ہوں۔ باقی الٹرا ساؤنڈ یا دوسرے ٹیسٹوں کے لیے تو اب وہ صبح ہی کہیں گے اس لیے تمہیں اب یہاں لیٹ کر میری طرف سے اشارہ ملنے کے سوا کچھ نہیں کرنا۔" کمرے سے نکلنے سے قبل اس نے سلو کو ہدایات دیں اور خود چٹخنی کھول کر باہر قدم رکھا۔ یہ چٹخنی اس نے ڈاکٹر اور دیگر عملے کے کمرے سے باہر جانے پر فوراً لگا دی تھی تاکہ کوئی اچانک اندر نہ آ سکے۔

کمرے کے باہر رات کا وقت ہونے کی وجہ سے بالکل سناٹا تھا تاہم طاقتور لائٹس کی وجہ سے ماحول پوری طرح روشن تھا۔ وہ پُراعتماد قدموں سے چلتا ہوا تیسری منزل کی طرف جانے والی سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ وہاں بھی نیچے کی طرح تقریباً سناٹا ہی تھا۔ بس ایک آدمی اس کمرے کے سامنے جہاں ڈاکٹر فرحان کو رکھا گیا تھا، کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ بدستور کی طرح یہاں بھی طبی عملے کے لیے ایک کمرا مخصوص تھا۔ عملے کے تمام افراد اس کمرے میں بیٹھتے تھے اور اس بات کا انتظام تھا کہ جہاں بھی کسی مریض کو ضرورت پیش آئے وہ اپنے بیڈ کے ساتھ لگا بٹن دبا دے۔ عملے کو فوراً پتا چل جاتا تھا کہ انہیں کس کمرے سے کال کیا گیا ہے۔ مریضوں

سے ملاقات کے لیے آنے والے وزیٹرز کو بھی اگر کسی قسم کی معلومات درکار ہوتیں تو وہ بھی اسی عملے سے رابطہ کر سکتے تھے لیکن اس کی ضرورت بہت کم ہی پیش آتی کیونکہ سیڑھیوں اور لفٹ کے عین مقابل موجود دیوار پر ایک بڑا سا بورڈ آویزاں تھا جہاں ہر کمرا نمبر کے ساتھ اس میں داخل مریض کا نام جلی حروف میں درج تھا۔ شہریار نے بورڈ اور کرسی پر براجمان شخص پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور بغیر رکے سیدھا چلتا ہوا ڈاکٹر فرحان کے کمرے کے سامنے سے گزر کر اس کے دائیں جانب موجود کمرے کے سامنے جا پہنچا۔ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے قطعی علم نہیں تھا کہ دروازہ اندر سے بند ہوگا یا نہیں۔ اس نے بس ایک چانس لیا تھا اور خوش قسمتی سے اس کے ہینڈل دبانے پر دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ اس نے پورے اعتماد سے دروازے سے قدم اندر رکھا اور پھر پھرتی سے اسے بند بھی کر دیا۔ باہر کرسی پر سر جھکا کر بیٹھا شخص اس کے انداز کو دیکھ کر یہی اندازہ لگا سکا ہوگا کہ وہ اس کمرے میں داخل مریض کا کوئی رشتے دار ہے جو اس کے ساتھ وہاں ٹھہرا ہوا ہے۔

کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ باہر بورڈ پر نظر ڈالنے پر اسے یہ تو علم ہو گیا تھا کہ اس کمرے میں سنگیتا نامی کوئی عورت داخل ہے، اب باقی تفصیل بھی معلوم ہو گئی۔ بستر پر بند آنکھوں کے ساتھ دراز عورت پچاس کے پیٹے میں تھی اور سوتے ہوئے بھی اس کے چہرے پر وہ وحشت ناک تاثرات نظر آ رہے تھے جو اس کے ذہنی مریض ہونے کا ثبوت تھے۔ عورت کے ساتھ اٹینڈنٹ کے طور پر بیس بائیس سالہ ایک لڑکی موجود تھی جو بیڈ کے قریب رکھے کاؤچ پر نیم دراز تھی اور اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ بلا ارادہ ہی نیند سے مغلوب ہو کر اچانک سو گئی ہے۔ بالوں کی کئی لٹیں اس کی چٹیا سے نکل کر چہرے پر پھیل گئی تھیں اور مناسب نقوش والے گندمی چہرے کو دلکشی عطا کر رہی تھیں۔ اس کا سویا ہوا ہونا شہریار کے لیے باعثِ اطمینان ثابت ہوا ورنہ دوسری صورت میں اسے پھرتی سے کام لے کر پہلے اس لڑکی کو قابو میں کرنا پڑتا۔ اب بھی وہ اس کی طرف بڑھا اور ہاتھ میں تھامی ہوئی چھوٹی سی بوتل کا رخ اس کے چہرے کی طرف کر کے اس پر بے ہوشی کی دوا اسپرے کی۔ دوا کی پھوار سی پڑنے پر لڑکی ذرا سا کسمسائی لیکن آنکھیں کھول کر جائزہ لینے سے قبل ہی اس پر دوا کا اثر غالب آ گیا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ بے ڈھنگے انداز میں کاؤچ پر گر گئی۔ شہریار نے

اسے سنبھال کر صحیح طریقے سے لٹایا اور پائنتی پڑی چادر کھول کر سینے تک اسے اوڑھا دی۔ دیکھنے والے کو یہی لگتا کہ وہ گہری نیند سو رہی ہے۔ لڑکی کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ مریض عورت کی طرف بڑھا۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی اور امکان یہی تھا کہ سکون آور دواؤں کے زیرِ اثر ہو پھر بھی اس نے احتیاطاً اس کے چہرے پر بھی دوا کا اسپرے کر دیا لیکن ذرا کم مقدار میں ورنہ پہلے سے ہی ذہنی مرض میں مبتلا عورت کو کوئی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچنے کا بھی احتمال تھا اور بہرحال وہ اس لڑائی میں کسی بے قصور اور غیر متعلقہ شخص کو نقصان پہنچانے کے حق میں نہیں تھا۔

دونوں خواتین سے فارغ ہونے کے بعد اس نے اپنی قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر تقریباً آٹھ انچ کی برمے نما شے نکالی۔ اس آلے کے ساتھ بجلی کا ایک تار بھی گچھے کی صورت منسلک تھا۔ اس نے تار کے ساتھ منسلک پلگ کو دیوار میں نصب الیکٹرک بورڈ کے ساکٹ میں لگایا اور آلے کی تیز نوک دیوار پر رکھ کر بٹن پش کر دیا۔ ننھے سے آلے نے مضبوط دیوار کو اس طرح کاٹنا شروع کر دیا جیسے وہ محض ہارڈ بورڈ کی بنی ہو۔ کام کے اعتبار سے اس برمے نما آلے کی آواز تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی اور اسے امید تھی کہ کمرے میں پوری رفتار سے چلتے پنکھے کی آواز میں ہی گم ہو جائے گی۔ یہ خاص آلہ بھی اس نے ممبئی میں موجود اپنے ہمدردوں سے ہی منگوایا تھا۔ حقیقتاً اس نے ساری منصوبہ بندی عبدالرحمٰن کے فراہم کردہ بنگلے میں ہی مکمل کر لی تھی اور ایسا، نیٹ سے حاصل کیے گئے اسپتال کے نقشے کو دیکھنے پر ممکن ہوا تھا۔ اس وقت بھی وہ تیزی سے دیوار کو کاٹتا ہوا ٹیکنالوجی کی جدت پر پاش پاش کر رہا تھا جس کی وجہ سے کام آسان اور تیز رفتار ہو گئے تھے۔ اس نے بھی چند منٹوں میں دیوار کو اس طرح کاٹ لیا کہ وہ احتیاط سے کٹے ہوئے حصے کو نکالتا تو اتنا بڑا خلا پیدا ہو جاتا جس میں سے ایک عام جسامت کا آدمی گزر سکتا تھا۔ اس نے ڈاکٹر فرحان جمیل کی تصویر دیکھ رکھی تھی۔ وہ خاصے اسمارٹ آدمی تھے اور امید کی جاسکتی تھی کہ اس خلا میں سے آسانی سے گزر جائیں گے۔ را کی قید میں رہ کر ان کی صحت کے اچھا ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا البتہ اس بات کا امکان ضرور تھا کہ وہ پہلے کے مقابلے میں بہت کمزور ہو گئے ہوں۔

برمے کو واپس اپنی جیب میں رکھ کر اس نے احتیاط سے دیوار کے کٹے ہوئے حصے کو نکالنا شروع کر دیا۔ اس دوران میں اس نے ایک بار پلٹ کر بے ہوش عورت اور لڑکی کو بھی دیکھا۔ دونوں بدستور غافل تھیں۔ اس نے کاٹنے والا چوکھٹا ٹکڑا نکال کر دیوار کی جڑ کے ساتھ رکھ دیا۔ بننے والا خلا روشن تھا اور اس خلا سے روشنی گزر کر کمرے تک بھی آ رہی تھی جس میں وہ خود موجود تھا۔ اس نے خلا میں سے جھانک کر ڈاکٹر فرحان کے کمرے کو دیکھا اور ایک خوش گوار حیرت کا شکار ہوا۔ وہ نہ صرف جاگ رہے تھے بلکہ ایک صاف ستھری چادر کو چار تہ کر کے کمرے کے فرش پر بچھائے بڑے خشوع و خضوع سے محوِ عبادت تھے۔ شہریار نے بہت غور سے ان کا جائزہ لیا۔ وہی کشادہ پیشانی اور روشن آنکھیں تھیں جنہیں اس نے تصویر میں دیکھ کر ان کے ذہین ہونے کا اندازہ لگایا تھا۔ البتہ صحت خاصی خراب ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ بھی کچھ تبدیلیاں آئی تھیں۔ اب وہ باریش ہو گئے تھے اور ریش کھچڑی بالوں پر مشتمل کچھ الجھی الجھی سی تھی۔ ان کے سر کے بال بھی چھدرے اور خاصی حد تک سفید ہو چکے تھے اور ظاہر ہے یہ را کی قید میں ملنے والے تحفے تھے۔ ان کے بائیں رخسار پر زخم کا مندمل ہو جانے والا ایک انچ کا نشان بھی نظر آیا تھا جو یقیناً اس تشدد کی نشانی تھا جو انہوں نے را کی قید میں سہا ہوگا۔

"میں ٹارگٹ پر پہنچ گیا ہوں۔" اس نے سرگوشی میں سلو کو اطلاع دی۔ اس سرگوشی کو حساس آلے کی مدد سے بستر پر لیٹے ہوئے سلو کو کیا کرنا تھا، اسے اچھی طرح معلوم تھا۔ وہ لوگ کسی ہنگامے کے لیے تیاری کر کے آئے تھے لیکن اب تک جتنی سہولت سے ہر کام ہو رہا تھا، امید بندھ چلی تھی کہ بغیر کسی مار ماری کے وہ نہایت صفائی سے ڈاکٹر فرحان کو یہاں سے نکال کر لے جانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ انہیں ان کے کمرے سے اس کمرے میں لانا تھا۔ اگر وہ ان کے حلیے میں معمولی سا ردوبدل کر دیتا اور دونوں خود اعتمادی سے چلتے ہوئے لفٹ میں سوار ہو کر گراؤنڈ فلور اور پھر وہاں سے پارکنگ میں پہنچ جاتے تو کسی کو شک بھی نہیں ہوتا کہ یہاں سے را کے کسی قیدی کو آزاد کروا کر لے جایا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر فرحان کے کمرے کے دروازے پر پہرے داری پر مامور شخص بھی اطمینان سے اپنی جگہ بیٹھا رہ جاتا۔

اتنا سکون کچھ غیر فطری بھی تھا۔ انسپکٹر پریم ناتھ سے ہونے والے ٹاکرے کے نتیجے میں را کے کانوں تک یہ بھنک پہنچ گئی تھی کہ کچھ لوگ ڈاکٹر فرحان جمیل کو رہا کروانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس اطلاع کے بعد انہیں ویسے تو ارلٹ ہو جانا چاہیے تھا۔ اس کے بعد ارجن اگروال کے ولا پر کی گئی ان کی کارروائی بھی خاصی قابلِ غور تھی۔ ارجن اگر واقعی اب بھی اتنا سیریس تھا کہ کوئی بیان نہ دے سکا ہو اور اس کی بیوی نے بھی اپنی زبان نہیں کھولی تھی، تب بھی را جیسی ایجنسی کے کرتا دھرتاؤں کو ٹھٹک جانا چاہیے تھا اور نتیجے میں ڈاکٹر فرحان کو یا تو یہاں سے شفٹ کر دینا چاہیے تھا یا پھر ان کی سیکیورٹی اتنی سخت ہونی چاہیے تھی کہ چڑیا کا بچہ بھی پر نہ مار سکے۔ لیکن وہ تو بس کرسی پر ایک اونگھتے ہوئے اہلکار کو کمرے کے باہر بٹھا کر مطمئن ہو گئے تھے۔ کم از کم نظر تو یہی آ رہا تھا لیکن یہ بھی تو ممکن تھا کہ کچھ نادیدہ وجود یا آلات اتنی خاموشی سے نگرانی پر مامور ہوں کہ دیکھنے والی نظریں دھوکا کھا جائیں۔ شہریار کی آنکھیں بھی یہ دھوکا کھا رہی تھیں۔ دھوکا نہ بھی کھاتیں تو اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ اسے ڈاکٹر فرحان کو ہر صورت یہاں سے نکال کر لے جانا تھا اور اس کام کے لیے وہ ہر طرح کا خطرہ مول لینے کو تیار تھا۔ اوکھلی میں سر دے کر موسلوں سے ڈرنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔

ڈاکٹر کے کمرے میں جانے کی جلدی دکھانے کے بجائے اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنا جائزہ مکمل کیا۔ اسپتال کے مخصوص ماحول والے کمرے میں کوئی بھی ایسی شے موجود نہیں تھی جس کی مدد سے ڈاکٹر خود کو یا کسی دوسرے کو کوئی نقصان پہنچا پاتا۔ یہاں تک کہ بستر کے سرہانے رکھی تپائی اور اس پر دھرا جگ، گلاس تک ہلکی پلاسٹک کے بنے ہوئے تھے جن سے ڈاکٹر قطعی تشدد کے کسی آلے کا کام نہیں لے سکتا تھا۔ کسی قسم کے آرائشی سامان کی موجودگی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ملحقہ غسل خانے میں بھی استعمال کا سامان یقیناً ایسا ہوگا کہ بس ضرورت پوری کی جا سکے، کوئی فائدہ نہ اٹھایا جا سکے۔ غسل خانے کا دروازہ بند تھا اس لیے وہ یہاں بیٹھے بیٹھے اس کا جائزہ نہیں لے سکتا تھا۔ ویسے بھی ڈاکٹر پڑھنے لکھنے والا ایک بے ضرر سا آدمی تھا جس سے یہ امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ لڑائی بھڑائی کے فن سے واقف ہوگا۔ وہ بے چارہ تو بس اپنی ایک تحقیق کی جس سے وطن کو کوئی فائدہ پہنچ سکے، سزا جھیل رہا تھا اور اس قید میں اب تک صرف اس لیے زندہ تھا کہ اس نے تمام تر حربوں کے باوجود زبان نہیں کھولی تھی۔ ڈاکٹر نے سلام پھیرا تو وہ چوکور خلا کو پار کر کے اس کے کمرے میں جا پہنچا اور عین اس کے مقابل جا کھڑا ہوا۔ اسے اپنے سامنے دیکھ کر ڈاکٹر واضح طور پر ٹھٹکا۔

"تعارف کے لیے وقت بہت کم ہے ڈاکٹر صاحب۔ بس اتنا جان لیجیے کہ میں آپ کو پاکستان واپس لے جانے کے لیے آیا ہوں اور آپ کو میرے ساتھ چلنا ہے۔" انہیں اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس نے ان کا ہاتھ تھاما اور تیزی سے آگاہ کیا۔ جواب میں انہوں نے گردن کو دائیں بائیں نفی میں جنبش دی اور شہادت کی انگلی سے باتھ روم کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

شہریار دیکھ چکا تھا کہ ان کے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں سے کسی ایک میں بھی ناخن موجود نہیں ہیں لیکن اس وقت اس بات پر غور کرنے کے بجائے انگلی کے اشارے کو سمجھنا زیادہ ضروری تھا۔ وہ برق رفتاری سے باتھ روم کے دروازے کی طرف پلٹا لیکن اسے دیر ہو چکی تھی۔ چست جینز اور جیکٹ میں ملبوس، خطرناک گن ہاتھ میں تھامے ایک شناسا سی شکل اس کے سامنے تھی۔ وہ اوشا تھی جو ممبئی سے یہاں آتے ہوئے اس کے برابر والی سیٹ پر ہی بیٹھ کر سفر کرتی ہوئی یہاں تک پہنچی تھی۔

"مجھے سامنے دیکھ کر حیران ہو رہے ہو؟" اس نے گویا شہریار کی حالت سے حظ اٹھایا اور مذاق اڑانے والے انداز میں بولی۔ "تم نے کیا سوچا تھا کہ تم اتنی آسانی سے را کے پنجوں سے شکار چھین کر لے جاؤ گے اور کوئی تمہیں روکنے والا نہیں ہوگا۔ یہ تمہاری غلط فہمی تھی مسٹر۔ ہم نے ڈاکٹر کو پورے حفاظتی انتظامات کے ساتھ یہاں رکھا ہوا ہے۔ اس فلور کے کوریڈور اور ڈاکٹر کے کمرے میں نگرانی کے لیے کیمرے لگے ہوئے ہیں اور باہر بیٹھ کر پہرا دیتا احمق محض تم جیسوں کو بے وقوف بنانے کے لیے ہے۔ تمہاری آمد کی اطلاع ہمیں اسی وقت ہو گئی تھی جب تم سیڑھیوں سے اوپر پہنچے تھے۔ تم نے اپنا حلیہ اس حلیے کے مقابلے میں خاصا تبدیل کر لیا ہے جس میں سفر کر رہے تھے لیکن پھر بھی میری نگاہیں بالکل اسی طرح تمہیں پہچان سکتی ہیں جیسے میں نے بس میں تمہارے برابر میں بیٹھ کر یہ جانچ لیا تھا کہ تم میک اپ میں ہو۔ اتفاق سے میں اس ہوٹل میں بھی موجود تھی جس میں بیٹھ کر تم نے اپنے ساتھی کے ساتھ چائے پی تھی اور بس میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس بات پر کھٹک گئی تھی کہ تمہارے برابر کی سیٹ خالی ہونے کے باوجود تم اور تمہارا ساتھی الگ الگ سفر کر رہے تھے۔ میں را کی اسپیشل ایجنٹ ہوں اور ارجن اگروال پر حملے کے بعد خاص طور پر یہاں بھجوائی گئی ہوں۔ چاہتی تو ہیلی کاپٹر سے بھی یہاں آسکتی تھی لیکن بس میں آنے کا فیصلہ صرف یہ سوچ کر کیا کہ تم جیسے مجرم کس ذریعے کو سب سے محفوظ سمجھ کر اس سے سفر کر سکتے ہیں

اور دیکھ لو کہ میں نے پہلے ہی مرحلے پر تمہیں پہچان لیا تھا۔ میں یہ بھی سمجھ گئی تھی کہ تم بہت اسمارٹ ہو اور پیچھا ہونے پر فوراً سمجھ جاؤ گے اس لیے اپنے ایک آدمی کو تمہارے ساتھی کے پیچھے لگا دیا لیکن وہ احمق کامیاب نہ رہا۔ اب ہمارے پاس ایک راستہ یہ تھا کہ شہر کے ہوٹلوں وغیرہ میں تمہیں تلاش کریں لیکن میں نے اس طرف اپنی انرجی ویسٹ کرنے کے بجائے یہاں بیٹھ کر تمہارا انتظار کرنا بہتر سمجھا کیونکہ تمہیں ہر حال میں آنا تو یہیں تھا... اور دیکھو، تم کتنی آسانی سے چوہے دان میں آپھنسے ہو۔ اب تم ہمیں بتاؤ گے کہ تمہارے باقی ساتھی کہاں ہیں؟'' وہ شاید بہت زیادہ بولنے کی عادی تھی اس لیے ایک ہی سانس میں اسے سب کچھ بتاتی چلی گئی لیکن اس دوران میں بھی وہ پوری طرح ہوشیار تھی اور شہریار اس کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر ہتھیار نہیں نکال سکتا تھا۔ نہ ہی براہِ راست اس پر حملہ کر کے اس کی گن چھین سکتا تھا کیونکہ اس صورت میں وہ گولی چلا دیتی اور اسے خود سے زیادہ ڈاکٹر فرحان کو نقصان پہنچنے کا خدشہ تھا جو اس کے بالکل قریب ہی بیٹھے بس خاموشی سے اس ساری سچویشن کو دیکھ رہے تھے۔

''اوکے، میں مانتا ہوں کہ را کی اسپیشل ایجنٹ اوشا دیوی مجھ سے زیادہ انٹیلی جنٹ ثابت ہوئی اور اس نے بہت آسانی سے مجھے گھیر لیا ہے۔ اب آگے بولو کہ کیا کرنا ہے؟'' وہ سمجھتا تھا کہ صورت حال کتنی گمبھیر ہے۔ اوشا اور باہر موجود پہرے پر موجود شخص کے علاوہ بھی کئی افراد ہوں گے جو اسپتال کے اندر اور باہر پھیلے ہوئے ہوں گے اور اوشا کے ایک اشارے پر حرکت میں آجائیں گے۔ وہ ان ساری باتوں سے ڈرنے والا نہیں تھا لیکن مناسب موقع کا انتظار بھی کرنا ضروری تھا۔ ان حالات میں اس کے لیے ایک اچھی بات یہ تھی کہ وہ اس فلور پر آنے کے بعد ٹریس ہوا تھا اور وہ لوگ سلو کی موجودگی کے مقام سے ناواقف تھے۔ سلو جو ظاہر ہے اپنے ایرپیس پر یہاں ہونے والی ساری گفتگو سن رہا تھا، صورت حال کے مطابق اپنا لائحہ عمل طے کر سکتا تھا۔ اوشا خوش تھی کہ اسے چوہے دان میں پھنسا چکی ہے جبکہ وہ اپنی جگہ پُرامید تھا کہ ابھی سب کچھ ختم نہیں ہوا ہے اور جب تک بدن میں سانسیں باقی ہیں، وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے کوشش کر سکتا ہے۔

''آگے جو کچھ ہوگا، وہ خود ہی تمہارے سامنے آتا جائے گا۔ ابھی تم اپنے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھاؤ اور یہاں سے باہر نکلو۔'' وہ مستقل مضحکہ اڑانے والے لب و لہجے میں اس سے گفتگو کر رہی تھی اور شاید خوش تھی کہ پہلے مرحلے میں اس پر اپنی برتری ثابت کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ ایک ایسا شخص جو مبینہ طور پر را کے ایک ٹھکانے کو کُل اسٹاف سمیت نیست و نابود کر دینے کا قصور وار تھا، جس نے پریم ناتھ جیسے پولیس افسر کو اغوا کر کے بُرے حال تک پہنچا دیا تھا اور جوارجن اگروال جیسے حفاظتی حصار میں رہنے والے ایجنٹ کے سینے میں گولی اتار کر اسے انتہائی سیریس حالت میں اسپتال پہنچا چکا تھا، اگر اتنی آسانی سے اس کے قابو میں آگیا تھا تو اس کے لیے یہ خوشی ہی کی بات تھی اور اس خوشی میں ابھی تک اسے یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ کسی بھی قسم کی مزاحمت نہ کرنے والے مقابل کو ان ہتھیاروں سے نہتا کر دے جو بظاہر نظر نہیں آرہے تھے لیکن کوئی بھی عقل مند آدمی سمجھ سکتا تھا کہ اتنے اہم مشن پر آنے والا شخص خالی ہاتھ تو ہرگز بھی نہیں آسکتا۔ وہ خوشی اور جوش میں ہوش کھو بیٹھی تھی۔

''معافی چاہتا ہوں ڈاکٹر صاحب! میں یہاں تک آکر بھی آپ کی مدد نہیں کر سکا۔'' اس نے اوشا کے احکامات پر فوری طور پر عمل کرنے کے بجائے ڈاکٹر کی طرف رخ کیا اور نہایت افسوس بھرے لہجے میں بولا۔ بولتے ہوئے اس نے آنکھوں سے ڈاکٹر کو ایک اشارہ بھی کیا جسے ذہین ڈاکٹر نے فوراً سمجھ لیا۔ چنانچہ جب شہریار اس سے اپنی بات کہہ کر اس انداز میں اوشا کی طرف مڑا کہ اس کا دایاں پہلو ڈاکٹر کی طرف تھا، ڈاکٹر کی انگلیوں نے اپنا کام کر دکھایا۔

''ڈاکٹر صاحب کی چنتا مت کرو۔ یہ بڑے سیانے دیوانے ہیں۔ تمہارے بعد کسی اور کے آنے کی پرارتھنا کرنے کے لیے دوبارہ اپنے خدا کے سامنے جم جائیں گے۔'' اوشا نے ڈاکٹر کا مضحکہ اڑایا اور اسے گن سے اشارہ کیا کہ دروازے کی طرف بڑھے۔ اس وقت وہ اپنی کامیابی کے نشے میں اس قدر خود اعتمادی میں مبتلا تھی کہ باہر موجود اپنے آدمی تک کو اندر بلانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس کا یہ انداز دیکھ کر شہریار بڑے اطمینان سے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔ اوشا گن لیے ہوئے اس کے پیچھے تھی۔

''رگھو! دروازہ کھولو۔'' اس نے بھی یقیناً کسی ایرپیس پر باہر موجود اپنے ساتھی کو حکم دیا۔ جواباً فوراً ہی دروازہ کھل گیا لیکن اس سے پہلے ہی کھیل شروع ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر فرحان نے شہریار کی توقع سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا اور اوشا کے عین عقب میں پہنچ کر اس برے نما آلے کی نوک اس کی گردن کی پشت میں اتار دی جو انہوں نے شہریار کے اشارے پر اس کی جیب سے نکالا تھا۔ اوشا کے ہونٹوں سے وار کھا کر ایک تیز چیخ نکلی اور اس سے قبل کہ اس کا دروازہ کھولنے والا ساتھی کچھ کر پاتا، شہریار بجلی کی طرح پلٹ کر اوشا پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ اس نے سب سے پہلے اوشا کی گن پر ہاتھ ڈالا تھا اور اب وہ گھائل حالت میں خود اس کے نشانے پر تھی۔

''میڈم کو چھوڑ دو۔ تم یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ہمارے درجنوں کمانڈوز نے اسپتال کی پوری بلڈنگ کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔'' رگھو کے نام سے پکارا جانے والا وہ بندہ خلافِ توقع منظر دیکھ کر پہلے تو ہکا بکا رہ گیا پھر اسے دھمکی دینے لگا۔

''ان درجنوں میں سے ایک تو ابھی کم ہو گیا۔'' شہریار نے اس کی دھمکی کے جواب میں سرد لہجے میں کہا اور بلاتکلف گن کا رخ اس کے ماتھے کی طرف کر کے گولی چلا دی۔ گولی کھا کر وہ کسی مردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے زمین پر گر گیا۔

''آپ ہتھیار چلا سکتے ہیں ڈاکٹر صاحب؟'' رگھو کی لاش پر ایک نگاہِ غلط ڈالے بغیر اس نے پشت پر موجود ڈاکٹر فرحان سے دریافت کیا جس کا جواب ان کی طرف سے اثبات میں ملا۔ اس نے فوراً اپنے ہاتھ میں موجود گن انہیں تھمائی اور خود اپنی قمیص کے نیچے سے ایک اور جدید وضع کی گن نکال کر اوشا کو آگے کی طرف دھکیلا۔ ڈاکٹر فرحان کی طرف سے گردن کی پشت پر کیا گیا وار شاید کسی نازک پوائنٹ پر لگا تھا جس نے اوشا کے جسم کو خاصا ڈھیلا کر دیا تھا اور وہ مکمل طور پر بے ہوش نہ ہونے کے باوجود فی الحال ہاتھ پیر ہلانے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ شہریار نے اسے باہر کی طرف دھکیلا تو وہ رگھو کی لاش کو اپنے پیروں میں روندتی ہوئی آگے بڑھی۔ شہریار اور ڈاکٹر فرحان البتہ اس لاش کو پھلانگ کر باہر نکلے تھے۔ جیسے ہی وہ باہر نکلے، لفٹ کا دروازہ کھلا اور چار کمانڈوز دندناتے ہوئے باہر نکلے۔ اس بار ڈاکٹر فرحان نے فائر کرنے میں شہریار سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان کی گن ریٹ ریٹ کی آوازیں نکالتی ہوئی اندھا دھند چلی اور ایک کمانڈو کی زندگی کا چراغ فوراً ہی گل ہو گیا جبکہ دوسرا ٹانگ پر گولی کھا کر نیچے گرا۔ باقی دو کو شہریار نے گولیوں کی باڑھ پر رکھ لیا۔ عین اسی وقت سیڑھیوں کی طرف سے ان پر فائر کیا گیا لیکن ان لوگوں کی مجبوری یہ تھی کہ شہریار نے اوشا کو اپنی ڈھال بنا رکھا تھا اور ڈاکٹر فرحان کو اس طرح اپنے پیچھے رکھا تھا کہ وہ براہِ راست کسی گولی کی زد میں نہ آسکیں۔ چنانچہ سیڑھیوں کی طرف سے آنے والی گولیاں بے اثر ہی گئیں اور ان کے قریب سے گزرتی ہوئی دیواروں میں پیوست ہو گئیں۔

''گراؤنڈ فلور پر میں کور دینے کے لیے موجود ہوں۔'' اس نے سیڑھیوں کی طرف سے آنے والے فائرز کا جواب دیتے ہوئے اپنے کانوں میں سلو کی آواز سنی اور ایک گونا گوں اطمینان محسوس کرتے ہوئے پیٹ پر بندھے چرمی بیگ سے ایک دستی بم برآمد کیا۔ یہ خاص نوعیت کا دستی بم تھا

فلسفی

ایک پُرخیال نوجوان کنوئیں کے گرد گھومتے بیل کو کافی دیر تک دیکھنے کے بعد اس کے مالک کے پاس گیا اور پوچھا۔ ''بیل کی آنکھیں کھوپوں سے کیوں ڈھانپی ہوئی ہیں اور یہ گھنٹی کیوں اس کے گلے میں باندھی ہوئی ہے؟''

بوڑھا زمیندار نوجوان کی بات سے مرعوب ہوا اور اسے بتانے لگا۔ ''پتر! کھوپے آنکھوں پر اس واسطے ہیں کہ یہ کسی دوسرے بیل یا گائے کو دیکھ کے خر مستی نہ کرے اور چپ چاپ کھوہ (کنواں) گھیڑتا (چلاتا) رہے۔''

نوجوان نے اس بات کو سراہا اور کہا۔ ''اور گھنٹی...؟''

''پتر! یہ ٹلی (گھنٹی) اس کے گلے میں اس لیے ہے کہ اگر کھوہ گھیڑتے گھیڑتے یہ رک جائے تو ٹلی کی آواز بند ہو جاتی ہے۔ پھر بیشک بندہ دور بھی ہو تو پتا چل جاتا ہے کہ کھوہ چلنا بند ہو گیا۔''

''لیکن اگر یہ بیل کھڑے کھڑے ہی اپنی گردن ہلاتا رہے اور گھنٹی بجتی رہے تو پھر تو کنواں نہیں چلے گا نا...'' نوجوان نے پُرخیال انداز میں بوڑھے زمیندار کو آگاہ کیا۔

''پتر! اے داند (بیل) اے!.. کوئی فلسفی نئیں۔'' بوڑھے زمیندار نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

(خلیل احمد انجم، دھنی سیداں، کھاریاں)

جس میں دھماکا خیز مواد تو بہت کم تھا البتہ دھواں ڈھیر سارا نکلتا تھا۔ اسپتال جیسی جگہ جہاں بہت سے بے قصور افراد بھی موجود تھے، اس قسم کے بم بہت کارگر تھے کیونکہ یہ بہت محدود پیمانے پر تباہی مچاتے اور انہیں بچ نکلنے کے مواقع فراہم کردیتے۔ بم کی پن کھینچ کر اس نے سیڑھیوں کی طرف پھینکا تو ہلکا سا دھماکا سنائی دیا اور تیزی سے دبیز دھواں پھیلنا شروع ہوگیا۔

"آیئے سر!" وہ تیز لہجے میں ڈاکٹر فرحان سے بولتا ہوا اوشا سمیت لفٹ کے کھلے دروازے کی طرف دوڑا۔ ساتھ ہی سلو سے بھی رابطہ کیا۔ "ہم لفٹ سے نیچے آرہے ہیں۔"

"میں نے ریسپشن کاؤنٹر کے پیچھے دو ڈاکٹرز اور ایک نرس کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ یہاں تقریباً چھ کمانڈوز موجود ہیں۔ دو دو لیفٹ اور رائٹ پر اور دو مین ڈور کے پاس۔ لفٹ کھلتے ہی وہ تمہیں چھاپنے کی کوشش کریں گے، اس سے پہلے ہی تم دونوں طرف بم پھینک دینا۔ میں عین اسی وقت دروازے کے پاس والوں کو نشانہ بنا لوں گا۔" سلو نے اس کے سامنے پلان رکھا جس کی اس نے محض "اوکے" سے منظوری دے دی اور فوراً ہی مصروفِ عمل ہو گیا۔ بازو کے سہارے سے جھولتی اوشا دیوی ڈھال سے زیادہ راہِ عمل میں رکاوٹ محسوس ہو رہی تھی اس لیے سب سے پہلے ایک گولی اس کے سر میں اتار کر اس نے اس بوجھ سے نجات حاصل کی اور پھر دونوں ہاتھوں میں ایک ایک بم تھام لیا۔ اس مقصد کے لیے اسے اپنے پاس موجود گن ڈاکٹر فرحان کو تھمانی پڑی تھی۔ تیز رفتار لفٹ تیزی سے انہیں گراؤنڈ فلور پر لے گئی۔ لفٹ رکتے ہی وہ ڈاکٹر فرحان کو اشارہ کرتا ہوا تیزی سے نیچے بیٹھ گیا۔ لفٹ کا خودکار دروازہ کھلتے ہی اس کے دونوں ہاتھ برق رفتاری سے حرکت میں آئے اور دائیں بائیں دونوں بم بیک وقت اچھال دیے۔ اس عمل میں اس کی ٹائمنگ بہت شاندار تھی۔ دو بموں کی پنیں کھول کر بیک وقت انہیں دو مختلف سمتوں میں اچھال دینا کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ دوسرا کارنامہ ڈاکٹر فرحان نے انجام دیا اور اس کے شانوں سے اوپر سیدھے فائر مارنا شروع کردیے۔ ان حالات میں اس کے لیے یہی بات سب سے خوش گوار تھی کہ ڈاکٹر فرحان کسی بھی مرحلے پر اس کے لیے بوجھ نہیں بنے تھے اور ٹھیک ٹھاک قسم کی معاونت کر رہے تھے۔ حالانکہ ان سے متعلق جو رپورٹ اس کے پاس تھی، اس کے مطابق تو وہ نہایت ابتر حالت میں ہونے چاہیے تھے۔ وہ ان کے جسم پر تشدد کے نشان

بھی دیکھ چکا تھا لیکن تمام تر حقائق کے باوجود وہ ان کو بہت ایکٹیو دیکھ رہا تھا۔

گولیاں ان پر بھی چلائی گئی تھیں اور اگر وہ کھڑے رہنے کی غلطی کرتے تو یقیناً نشانہ بن جاتے۔ "جھک کر زگ زیگ۔" اس نے لفٹ سے قدم باہر رکھنے سے پہلے ڈاکٹر کو ہدایت دی اور ان سے اپنی گن واپس لے کر فائر کرتا ہوا خود بھی اسی انداز میں بھاگنے لگا لیکن بھاگتے ہوئے بھی اس نے یہ خیال رکھا تھا کہ ڈاکٹر فرحان اس کے آس پاس ہی موجود رہیں۔ جن کے لیے جان کی بازی لگائی تھی انہیں بیچ میں چھوڑ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سلو بھی ان لمحوں میں پوری طرح متحرک تھا۔ اپنے کہنے کے مطابق اس نے شہریار کے بالکل ساتھ ساتھ مین ڈور کی طرف بم اچھالا تھا اور اب اسپتال کے وسیع استقبالیہ حصے میں ہر طرف دھواں ہی دھواں پھیلا ہوا تھا۔ ساتھ ہی اندھا دھند برسائی جانے والی گولیوں کا بھی شور تھا۔ ان بہت سے ہتھیاروں میں وہ سلو کے پاس موجود روسی ساختہ خطرناک گن کی مخصوص آواز الگ شناخت کرسکتا تھا اور یہ آواز بتا رہی تھی کہ سلو اس وقت مرکزی دروازے کے قریب ہی موجود ہے۔

"آجائیں، یہاں راستہ کلیئر ہے۔" اپنے کان میں سنائی دینے والی سلو کی آواز نے اس کے اندازے کی تصدیق کی مہر ثبت کردی۔ وہ ڈاکٹر فرحان کا ہاتھ تھام کر تیزی سے اس طرف لپکا۔ وہاں دھواں ہی دھواں تھا جو بصارت کو ناکارہ بنا رہا تھا لیکن یہی دھواں ان کی آڑ بھی بنا ہوا تھا۔ وہ دونوں بغیر کسی رکاوٹ کے آگے بڑھتے چلے گئے کیونکہ اب ان کے لیے راستہ بنانے کی ذمے داری راکی کی تخلیق کردہ اس عفریت نے سنبھال لی تھی جو ان سے منحرف ہو کر شہریار کا دست و بازو بنا تھا تو قدم قدم پر انہیں خاک چاٹنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ اسے ان کے سارے حربے اور ان کے توڑ اچھی طرح معلوم تھے۔ اب بھی اس نے تنہا ہی باہر تباہی مچا کر رکھ دی تھی اور گن کے ساتھ بموں کا بھی بے دریغ استعمال کر رہا تھا۔ اس طرح اس نے اسپتال کے پارکنگ ایریا تک بہت آسانی سے ان کے لیے راستہ بنایا تھا۔ یہ پہلے سے طے تھا کہ وہ یہیں سے کوئی گاڑی لے کر فرار ہوں گے۔ سلو کی ذہانت کہ اس نے ایک بڑی اور مضبوط ساخت کی گاڑی کا انتخاب کیا۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اسے بغیر چابی کے اسٹارٹ کرنے میں اسے چند سیکنڈز سے زیادہ نہیں لگے۔ اس دوران ڈاکٹر فرحان اور شہریار بھی تیزی سے سوار ہو گئے تھے۔ شہریار نے سلو کے

ساتھ والی سیٹ سنبھالی تھی جبکہ ڈاکٹر فرحان پچھلی نشست پر تھے اور شہریار کی ہدایت کے مطابق اپنا سر نیچے کی طرف جھکا رکھا تھا۔

سلو نے غراتے انجن والی گاڑی کو آگے بڑھایا تو انہوں نے اسپتال کے مین گیٹ کو بند پایا۔ اس بند گیٹ کے پار کوئی نصف درجن کمانڈوز کی جھلک وہ یہیں سے دیکھ سکتے تھے لیکن رکنے کو قطعی تیار نہیں تھے چنانچہ جیسے ہی گاڑی اتنے فاصلے پر پہنچی کہ سلاخ دار گیٹ کو دستی بم کے نشانے پر لیا جاسکتا، شہریار نے گاڑی کی کھڑکی سے نصف دھڑ باہر نکال کر ایک بار پھر جان کی بازی لگائی اور قوس کی صورت حرکت کرتے اس کے بائیں ہاتھ میں دبا بم ٹھیک گیٹ سے جا کر ٹکرایا۔ گاڑی کو گولیوں کی زد میں لینے کی کوشش کرتے کمانڈوز جرأت مندی کے اس مظاہرے پر ڈھنگ سے حیرت زدہ بھی نہیں ہو سکے اور الٹ کر پیچھے گرے۔ بم نے پہلے ہی کام دکھا دیا تھا۔ قوی ہیکل گاڑی پوری طاقت سے آگے بڑھی تو لوہے کا مضبوط سلاخ والا دروازہ خس و خاشاک کی طرح بکھر کر رہ گیا اور وہ نہایت کامیابی سے اسپتال کی حدود سے نکلتے چلے گئے۔ ردِعمل میں انہیں بھی کچھ نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ فائرنگ اور اس کے بعد ٹکراؤ سے بکھر جانے والے ونڈ اسکرین کے کئی شیشے فرنٹ پر بیٹھے ہونے کی وجہ سے اڑ کر ان کے جسم کے بعض حصوں میں گڑ گئے تھے اور ان کے پاس فرصت نہیں تھی کہ اپنے ان زخموں پر توجہ دے سکیں۔ گیٹ سے ٹکراؤ کے باوجود سلو نے گاڑی کی رفتار کم نہیں ہونے دی تھی جس کے نتیجے میں انہیں زبردست جھٹکے برداشت کرنے پڑ رہے تھے لیکن رفتار کم کرنے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ اسپتال کے احاطے سے نکلتے ہی دو گاڑیوں نے ان کا تعاقب شروع کر دیا تھا اور ان گاڑیوں سے مسلسل ان پر فائرنگ کی جارہی تھی۔ لگتا تھا، تعاقب کرنے والے ان کی گاڑی کے ٹائروں کو نشانہ بنانا چاہ رہے ہوں لیکن سلو کی مجنونانہ ڈرائیونگ انہیں موقع نہیں دے رہی تھی۔ اس نے گاڑی کی اندرونی اور بیرونی تمام لائٹیں بجھا رکھی تھیں چنانچہ گہرے رنگ کی گاڑی کو رات کی تاریکی بھی پناہ دے رہی تھی۔ تعاقب میں آنے والے اپنی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس کی مدد سے نشانہ لینے کی کوشش بھی کرتے تو ادھر سے ادھر لہرا کر آگے بڑھتی گاڑی ان کی زد پر نہ آپاتی لیکن تعاقب بہرحال انہوں نے جاری رکھا ہوا تھا۔

ان تعاقب کرنے والوں سے پیچھا چھڑوانا ضروری تھا ورنہ ان کے لیے یہاں سے نکلنا ناممکن ہو جاتا۔ گاندھی

نگر میں سوائے اللہ کی ذات کے کوئی ان کا مددگار بھی نہیں تھا۔ بھارت میں پاکستان کے مفاد کے لیے کام کرنے والے ان کے ساتھیوں نے پہلے ہی انہیں بتا دیا تھا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو احمد آباد میں ریسیو کر سکتے ہیں اور ان کے درمیان یہ طے پا گیا تھا کہ وہ احمد آباد ماؤنٹ ابو اسٹیٹ ہائی وے پران کے منتظر رہیں گے۔ یہ ہائی وے نیشنل ہائی وے نمبر 8 سے متصل تھی جو کہ ممبئی سے سیدھی دہلی تک جاتی تھی۔ دہلی سے آگے وہ لوگ ڈاکٹر صاحب کو سرحد پار کروانے کا انتظام کر سکتے تھے کیونکہ اس راستے سے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اسمگلرز کا کثرت سے آنا جانا لگا رہتا تھا اور وہ سرحدی محافظوں سے ساز باز کر کے یا چوری چھپے ایک دوسرے کے علاقوں میں جاتے رہتے تھے۔ لیکن یہ مرحلہ ابھی بہت دور تھا۔ ابھی تو وہ گاندھی نگر میں ہی پھنسے ہوئے تھے۔ گاندھی نگر جو کہ مہاتما گاندھی کا مقامِ پیدائش تھا اور مغربی بھارت کی ریاست گجرات کا دارالخلافہ ہونے کا اعزاز رکھتا تھا۔ ہندوستانیوں نے اپنے لیڈر کی اس جنم بھومی کو خوب سنوار کر رکھا تھا اور پورا شہر بڑی اچھی منصوبہ بندی کے ساتھ بسایا گیا تھا۔ کُل تیس سیکٹرز پر مشتمل اس شہر کو تعمیر کرتے ہوئے اس بات کا پورا خیال رکھا گیا تھا کہ سیکٹر کے لوگوں کے لیے تعلیم، علاج، خریداری اور سواری جیسی زندگی کی بنیادی سہولیات میسر ہوں۔ شہر کو سرسبز، آلودگی سے پاک اور Cosmopolitan بنانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی تھی۔ اپنی ان کوششوں میں وہ خاصے کامیاب بھی تھے لیکن یہ وقت ہندوستانیوں کی صلاحیتوں کو سراہنے کا نہیں تھا، ابھی تو انہیں اپنے تعاقب میں آنے والوں سے پیچھا چھڑانا تھا۔

"اسپیڈ کم کرو۔ میں ان کا بندوبست کرتا ہوں۔" ان کی گاڑی کرکٹ گراؤنڈ کے قریب سے گزر رہی تھی جب شہریار نے ٹھہرے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں سلو سے کہا اور سلو کے پیروں کے پاس پڑی وہ گن تھام لی جو اب تک سلو ہی استعمال کرتا رہا تھا۔ اس کا مقصد سمجھتے ہوئے سلو نے بتدریج گاڑی کی رفتار ہلکی کرنی شروع کردی لیکن اسے زگ زیگ کے انداز میں لہرانا بند نہیں کیا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس صورت میں فاصلہ کم ہونے کی وجہ سے پیچھا کرنے والوں کے لیے ان کی گاڑی کو نشانہ بنانا آسان ہو جائے گا۔ اس ساری صورتِ حال میں انہیں اگر کوئی ایڈوانٹیج حاصل تھا تو وہ یہ کہ گہری رنگت اور بجھی ہوئی بتیوں کے باعث ان کی گاڑی رات کی تاریکی میں نمایاں نہیں تھی جبکہ تعاقب میں آنے والی گاڑیاں اپنی جلتی روشنیوں کی وجہ سے نمایاں

تھیں۔ سلو کے رفتار ہلکی کرنے کے دوران ہی شہریار سیٹ پھلانگ کر گاڑی کے پچھلے حصے میں چلا گیا تھا۔ اس حصے میں ڈاکٹر فرحان بھی برستی گولیوں سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے پائیدان میں دبکے ہوئے تھے۔ ان کے جسم میں بھی شیشے کے چند ٹکڑے پیوست نظر آرہے تھے جو یقیناً گولیوں کے باعث ٹوٹنے والے پچھلے شیشے کے تھے۔ فی الحال ان پر توجہ دینے کے بجائے اس نے شیشے کے ٹوٹے ہوئے حصے پر گن کی نال جمائی اور خود کو بے حد خطرے میں ڈال کر پیچھے آنے والوں پر فائر کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں تھمی گن اس اعتبار سے بہت شاندار تھی کہ سنگل اور برسٹ دونوں صورتوں میں فائر کرنے کی صلاحیت رکھنے کے ساتھ ساتھ بہت وسیع رینج رکھتی تھی اور وہ امید رکھ سکتا تھا کہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ البتہ گاڑی کے لہرا کر چلنے کی وجہ سے خود اسے بھی نشانہ لینے میں بہت زیادہ دشواری پیش آرہی تھی۔

بالآخر چند سیکنڈ کی کوشش کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ باقاعدہ نشانہ لینا ممکن نہیں ہے اور اس کوشش میں وہ خود بھی ان گولیوں کا نشانہ بن سکتا ہے جو رفتار کم ہونے کے نتیجے میں گھٹنے والے فاصلے کی وجہ سے کچھ اور بھی شدت سے آرہی تھیں۔ دل ہی دل میں اللہ کو مدد کے لیے پکارتے ہوئے اس نے محض قسمت کے بھروسے پر اندھا دھند برسٹ دے مارا اور اگلے ہی لمحے اس کا دل یہ دیکھ کر خوشی سے ناچ اٹھا کہ تعاقب میں آتی ہوئی گاڑیوں میں سے ایک بری طرح بے قابو ہوئی اور ڈگمگاتی ہوئی ساتھ ساتھ دوڑتی دوسری گاڑی سے جا ٹکرائی۔ بے حد رفتار سے دوڑتی گاڑیوں کا یہ تصادم ہولناک ثابت ہوا اور دونوں ہی سڑک سے لڑھکتی چلی گئیں۔ کیا ہوا تھا یہ شہریار خود بھی واضح طور پر نہیں دیکھ سکا تھا لیکن اس کا اندازہ تھا کہ اس کے مارے ہوئے برسٹ نے پہلی گاڑی کے ڈرائیور کو نشانہ بنایا تھا چنانچہ گاڑی بے قابو ہو گئی اور ساتھ میں دوسری گاڑی کو بھی لے ڈوبی۔ جو بھی ہوا تھا بہرحال ان کے لیے اچھا ہی ہوا تھا اور فی الحال وہ تعاقب سے جان چھڑانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ لیکن اب یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا وہ شہر سے باہر بھی نکل سکیں گے؟ تو بالکل سامنے کی بات تھی کہ اب تک شہر سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکابندی کا حکم صادر کیا جا چکا ہوگا اور وہ ٹھیک ٹھاک قسم کی جنگ لڑے بغیر یہاں سے نہیں نکل سکیں گے۔

وہ اور سلو اس جنگ و جدل کو برداشت کر سکتے تھے لیکن پائیدان میں دبکے زخمی ڈاکٹر کے لیے شاید یہ مناسب نہیں ہوتا۔ اس طرح نکلنے میں سب سے بڑا رسک تو جان جانے کا ہی تھا۔ اپنی جان کی انہیں پروا نہیں تھی کہ اسے تو وہ خود لٹانے آئے تھے لیکن ڈاکٹر صاحب کی زندگی بہت قیمتی تھی اور کسی صورت ان کی جان کے لیے مزید خطرہ نہیں مول لیا جا سکتا تھا۔ پہلے ہی وہ اچھی خاصی مشکل سے گزر چکے تھے۔ راوالے پہلے سے ان کے استقبال کے لیے اسپتال میں موجود نہیں ہوتے تو وہ لوگ خاموشی سے ڈاکٹر کو نکال کر لے جاتے اور اپنے مددگاروں کے حوالے کر دیتے لیکن اب تو حالات یکسر مختلف تھے۔ شہریار محسوس کر رہا تھا کہ ڈاکٹر کو جنگ و جدل سے گزار کر ان کی جان کو خطرے میں ڈالنے کے مقابلے میں یہ زیادہ بہتر تھا کہ زندہ گرفتاری کا رسک لے لیا جائے کیونکہ زندگی بچ جانے کی صورت میں مزید جدوجہد کی گنجائش رہتی ہے۔ اپنی اسی سوچ کے تحت اس نے یکدم ہی سلو کو گاڑی روک دینے کا حکم سنایا۔ وہ بیک ویو مرر میں پچھلی گاڑیوں کے تباہ ہونے کا منظر دیکھ چکا تھا چنانچہ رفتار زیادہ رکھنے کے باوجود ذرا سکون سے گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کی طرف سے حکم ملنے پر اس نے خاموشی سے گاڑی سائڈ پر کر کے روک لی اور یوں اس کی طرف دیکھنے لگا جیسے اگلے حکم کا منتظر ہو۔

”ہمیں گاڑی یہیں چھوڑنی ہوگی۔“ اس نے سلو کو بتایا اور خود ڈاکٹر فرحان کو نیچے اترنے میں مدد دینے لگا۔ ان کے بازوؤں اور پیٹھ پر شیشے کے ٹکڑے چبھے تھے اور زخموں سے خون رس کر کپڑوں کو بھگو رہا تھا۔ اس نے پچھلی نشست پر پڑا ہوا ایک بڑا تولیا اٹھا کر ان کے بازوؤں کے گرد لپیٹ دیا۔ اس طرح ایک تو ان کا خون آلود لباس چھپ گیا تھا، دوسرے خون ٹپک کر زمین پر گرنے کا خدشہ نہیں رہا تھا۔ تولیا ظاہر ہے اسی گاڑی والے کا تھا جس کی گاڑی وہ لے اڑے تھے۔ اپنے پاس موجود گن اس نے سلو کے حوالے کر دی تھی اور خود ڈاکٹر کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس کے ارادوں کو نہ جاننے کے باوجود بھی قدم قدم پر مستعدی سے اس کا ساتھ دینے والا سلو گن کے علاوہ گاڑی سے وہ بیگ بھی نکال لایا تھا جسے اسپتال میں شہریار کے اپنے حوالے کرنے کے بعد اس نے ایک بار بھی اسے نہیں چھوڑا تھا۔ اب وہ تینوں ہی تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ تعاقب کرنے والوں سے انہوں نے پیچھا چھڑا لیا تھا اور رات کا آخری پہر ہونے کی وجہ سے راستے سنسان پڑے تھے اس لیے کسی کے دیکھ لینے کا خطرہ بہت ہی کم تھا۔

”ہمیں کہیں پناہ لینی ہوگی... جہاں رہ کر زخموں کی مرہم پٹی کی جا سکے اور ڈاکٹر سمیت ہم اپنے حلیوں میں مناسب تبدیلی کر سکیں۔“ چلتے ہوئے اس نے سلو کو مختصراً اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ تب سلو سمجھ گیا کہ ان کی منزل قریب ہی نظر آنے والی ہاؤسنگ اسکیم کا کوئی مکان ہے جس کا انتخاب انہیں اپنے اندازوں کی بنا پر کرنا ہوگا۔ یہ ہاؤسنگ اسکیم ایک وسیع احاطے میں قائم تھی اور اگر وہ وہاں کسی مکان میں پناہ لینے میں کامیاب ہو جاتے تو واقعی اپنے لیے بچت کی کوئی راہ نکالنے کا موقع مل جاتا۔ ہاؤسنگ اسکیم تک رسائی ان کے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوئی۔ احاطے میں آمدورفت کے لیے استعمال ہونے والا بڑا سا گیٹ بند تھا اور گیٹ کے سامنے بوڑھا چوکیدار کرسی ڈالے بے خبر سو رہا تھا۔ اس کے لیے شاید اتنا اطمینان ہی کافی تھا کہ گیٹ بند ہے اور اس کی اجازت کے بغیر کوئی اس گیٹ سے آر پار نہیں ہو سکتا۔

انہوں نے بوڑھے چوکیدار کو اس خوش فہمی میں مبتلا محوِ خواب رہنے دیا اور سلو کی کاریگری کے سہارے بند گیٹ کا قفل کھلا بھی اور بند بھی ہو گیا۔ اب وہ تینوں احاطے کے اندر تھے اور چابک دستی سے اپنے لیے مناسب مکان کا انتخاب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہاں موجود تمام مکانات ایک جتنے رقبے پر قائم تھے اور عموماً سنگل اسٹوری تھے البتہ سب کی بناوٹ ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ احاطے میں روشن بلب کی وجہ سے وہ وہاں موجود مکانات کا اچھی طرح جائزہ لے سکتے تھے۔ بعض مکانات بہت سادہ تھے جبکہ بعض کے فرنٹ ویو کو خوب صورت بنانے کے لیے خاصا پیسا صرف کیا گیا تھا لیکن زیادہ تعداد درمیانے درجے کے مکانات کی تھی۔ انہوں نے ان میں سے ہی ایک مکان کا انتخاب کیا۔ انتخاب کے بعد مکان کے اندر تک رسائی حاصل کر لینا ان کے لیے کیا مشکل تھا۔ مین گیٹ پر لگے آٹومیٹک لاک کو سلو کی ہنرمند انگلیوں نے کھولا اور وہ ڈاکٹر فرحان سمیت اندر داخل ہو گئے۔ مکان نیم تاریک تھا اور صرف ایک کمرے میں روشنی نظر آرہی تھی۔ سلو نے تیزی سے گھر کے مختلف حصوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا جبکہ شہریار روشن کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کمرے کا دروازہ مکمل طور پر بند نہیں تھا اور وہ نیم وا دروازے سے اندر کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ یہ کمرا خواب گاہ کے انداز میں سجا ہوا تھا کمرے کے وسط میں موجود ڈبل بیڈ پر کوئی شخص سر سے پیر تک چادر تانے سو رہا تھا، جو کہ اپنی جگہ ایک حیرت کی بات تھی کیونکہ موسم خاصا گرم تھا اور اس گرمی میں اوڑھ لپیٹ کر سونا تو دور کی بات لوگ کوشش کرتے تھے کہ کھلی جگہوں پر یا پھر ائرکنڈیشنڈ روم میں رہیں۔ ویسے بھی گاندھی نگر کا شمار موسم کے اعتبار سے ان علاقوں میں ہوتا تھا جہاں سال کے بیشتر حصوں میں موسم گرم اور خشک رہتا ہے۔

سوئے ہوئے شخص کے برابر میں ہی ایک عورت تکیے کے سہارے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے اس انداز میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اس نے اپنے گھٹنوں پر ایک ہارڈ بورڈ پر کلپ کیا ہوا رائٹنگ پیڈ رکھا ہوا تھا اور ہاتھ میں پکڑا قلم بائیں رخسار پر ٹکا ہوا تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ لکھتے ہوئے کچھ سوچنے کے دوران نیند سے مغلوب ہو کر سو گئی ہے۔ اسی وجہ سے رات کے اس پہر بھی کمرے کی بتی روشن تھی۔ شہریار اس عورت کے چہرے پر پہلی نظر پڑتے ہی چونک گیا۔ ڈھیلے ڈھالے شلوار قمیص میں دوپٹے سے بے نیاز، بیٹھے بیٹھے ہی سوتی ہوئی اس عورت کا چہرہ اس کے لیے شناسا تھا اور اسے کوئی شک نہیں تھا کہ یہ عورت وہی عائشہ ہے جس سے ان کی دہلی میں ملاقات ہوئی تھی اور یہ ملاقات بھی بڑی عجیب و غریب صورتِ حال میں ہوئی تھی۔ عائشہ کو انہوں نے دہلی کے ایک ہوٹل میں ویٹرس کے روپ میں دیکھا تھا۔ لیکن عائشہ کی یہاں موجودگی بتا رہی تھی کہ خود اس کے لیے بھی دہلی میں رہنا ممکن نہیں ہو سکا تھا اور وہ وہاں سے نقل مکانی کر کے گاندھی نگر آنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ البتہ جس مکان میں موجود تھی، وہ اس سے کئی گنا بہتر تھا جس میں انہوں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا اور اس بات سے شہریار نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ عائشہ اپنے لیے بہتر ملازمت کے حصول میں کامیاب ہو گئی ہے۔

”یہ تو وہی دہلی والی ہے۔“ ابھی وہ کمرے میں داخل نہیں ہوا تھا کہ سلو بھی وہیں چلا آیا اور عائشہ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی بے ساختگی سے بولا جس کے جواب میں شہریار کے لبوں سے بس ایک ”ہوں“ ہی نکلی اور وہ پُرسوچ انداز میں اس سے پوچھنے لگا۔

”ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں؟“

”انہیں میں نے لاؤنج میں صوفے پر لٹا دیا ہے۔ انہیں خاصے زخم آئے ہیں اور اب مرہم پٹی کی ضرورت ہے۔“ سلو نے بھی دھیمی آواز میں اس کی بات کا جواب دیا۔

”ٹھیک ہے... تم انہیں دیکھو، میں ابھی آتا ہوں۔“ اس نے سلو سے کہا تو وہ وہاں سے پلٹ گیا اور خود شہریار

کمرے کے اندر داخل ہوا۔ بیڈ پر بیٹھے بیٹھے سوئی ہوئی عائشہ کے قریب پہنچ کر اس نے اپنی شہادت کی انگلی کی مدد سے اس کے گھٹنوں پر رکھے رائٹنگ پیڈ کو آہستہ سے بجایا۔ یہ ہلکی سی دستک ہی عائشہ کے لیے کافی ثابت ہوئی اور وہ چونک کر نیند سے بیدار ہوگئی۔ آنکھ کھلتے ہی اس نے اپنے سامنے ایک اجنبی کو دیکھا تو بُری طرح چونک گئی۔

"کوئی آواز مت نکالنا۔ اٹھ کر میرے ساتھ خاموشی سے کمرے سے باہر آجاؤ۔" اس نے عائشہ کو پستول کی جھلک دکھاتے ہوئے دھیمی لیکن سخت آواز میں حکم دیا تو وہ کچھ سراسیمہ نظر آنے لگی لیکن اس کے حکم کی تعمیل میں تاخیر نہیں کی اور رائٹنگ پیڈ ایک جانب رکھ کر خود بستر سے نیچے اتر آئی۔ اس ساری کارروائی کے دوران میں چادر تان کر سوئے شخص کے وجود میں ذرا سی بھی حرکت نہیں ہوئی اور وہ ویسے کا ویسا ہی پڑا رہا۔

"یہ...؟" شہریار نے اس کی طرف اشارہ کرکے عائشہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یہ میرے شوہر ہیں لیکن تم فکر مت کرو۔ چار پانچ گھنٹوں سے پہلے یہ ہرگز نہیں جاگیں گے۔" جواب دیتے ہوئے عائشہ کے لہجے میں جو کرب تھا، اسے شہریار سمجھ سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ عائشہ کے اس نام نہاد شوہر کو نشے کی عادت ہے اور اب بھی یقیناً وہ اپنا نشہ پورا کرکے سو رہا تھا اس لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔

"ٹھیک ہے، تم باہر آجاؤ۔" شہریار نے اس بار نرمی سے اسے مخاطب کیا اور وہ بے چون و چرا کمرے سے باہر آگئی۔ شہریار نے خود ہی احتیاطاً کمرے کا دروازہ بند کرکے باہر سے کنڈی لگا دی اور اسے ساتھ لیے ہوئے لاؤنج میں آگیا۔ یہاں سلو اور ڈاکٹر فرحان موجود تھے۔ سلو نے اس دوران ڈاکٹر کے زخموں کو خاصی حد تک صاف کردیا تھا لیکن ان کے پاس مرہم پٹی کا سامان نہیں تھا جس کی وجہ سے وہ شیشے نکالنے کے بعد خون روکنے کا کوئی معقول انتظام نہیں کرسکا تھا اور اب ڈاکٹر فرحان خاصے نڈھال نظر آرہے تھے۔ زخمی تو وہ دونوں خود بھی تھے لیکن ان کے زخم معمولی نوعیت کے تھے۔ ٹوٹنے والے شیشوں کی کرچیاں انہیں اس حد تک نقصان نہیں پہنچا سکی تھیں جتنا ڈاکٹر فرحان زد میں آگئے تھے۔

"او مائی گاڈ! انہیں تو فرسٹ ایڈ کی ضرورت ہے۔ میں ابھی میڈیکل کٹ لے کر آتی ہوں۔" ڈاکٹر فرحان پر نظر پڑتے ہی عائشہ بے ساختہ بولی اور تیزی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ ان دونوں میں سے کسی نے بھی اسے روکا تاہم شہریار وہیں سے اسے اوپن کچن میں حرکت کرتے دیکھتا رہا۔ اس نے ذرا سے پنجے اچکا کر سب سے اوپر کیبنٹ کا پٹ کھولا اور اس میں سے مستطیل شکل کا فرسٹ ایڈ باکس کھینچ کر باہر نکالا اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی لاؤنج میں آئی۔

"میں میڈیکل کے شعبے سے تو تعلق نہیں رکھتی لیکن آپ میں سے کوئی میری مدد کرے تو ان کی تھوڑی بہت مرہم پٹی کرسکتی ہوں۔" اس نے اپنے ابتدائی خوف پر بہت جلد قابو پالیا تھا اور اب بہت نارمل لہجے میں ان سے مخاطب تھی۔ اس کا یہ رویّہ ان کے لیے زیادہ حیرت ناک نہیں تھا۔ وہ اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے۔ شادی سے قبل اس نے کچھ سال ایک اخبار کے دفتر میں ملازمت کی تھی اور ایک صحافی کی حیثیت سے ناگہانی حالات میں خود کو سنبھالے رکھنے کا ہنر جانتی تھی۔ اپنی شخصیت کی اس مضبوطی کی وجہ سے ہی تو اس نے اپنی زندگی کے کئی انوکھے فیصلے کیے تھے جن میں سب سے بڑا فیصلہ دولت مند شوہر کو چھوڑ کر اپنے ایک ایسے کزن کو اپنانے کا تھا جو نشے کی علت میں مبتلا ہونے کے بعد ان کے گھر علاج کی خاطر لایا گیا تھا۔

"کہیں کہیں کانچ کے ذرّے اب بھی گوشت کے اندر ہی موجود ہیں۔" قریب بیٹھ کر زخموں کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے تبصرہ کیا اور فرسٹ ایڈ باکس سے ایک باریک چمٹی نکال کر کانچ کے ٹکڑوں کو صاف کرنے لگی۔ سلو مسلسل اس کی مدد کررہا تھا۔ اسی نے یہ بندوبست بھی کیا تھا کہ لاؤنج کے دروازے کھڑکیوں پر پڑے بھاری پردوں کو اچھی طرح پھیلا دیا تھا تاکہ اندر جلتی تیز روشنی باہر کسی کو متوجہ نہیں کرسکے۔ وہ جس گاڑی میں فرار ہوئے تھے، وہ اس ہاؤسنگ اسکیم سے بہت زیادہ دور نہیں کھڑی تھی اور ڈھونڈنے والے اس گاڑی تک پہنچ جاتے تو ممکن تھا ارد گرد کی آبادیوں کی طرف بھی ان کا دھیان جاتا اور وہ اس ہاؤسنگ اسکیم کی طرف بھی متوجہ ہوجاتے چنانچہ یہی بہتر تھا کہ ہر ممکن احتیاط کی جائے۔

"تمہارے شوہر کے ساتھ کیا پرابلم ہے؟" شہریار جو خاموشی سے ایک طرف بیٹھا ان دونوں کو مرہم پٹی کرتے دیکھ رہا تھا، اچانک ہی عائشہ سے مخاطب ہو کر پوچھنے لگا۔

"وہ ہیروئن کا نشہ کرتا ہے۔" اس نے سر اٹھا کر جواب دیا۔

"اور تم... تم کیا کرتی ہو؟" وہ عائشہ کی

گھر میں موجودگی کے سلسلے میں متجسس تھا۔

"میں یہاں ایک نیوز پیپر میں جاب کرتی ہوں۔"

"کتنے عرصے سے؟"

"کچھ ہی دن ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے دہلی میں تھی۔ وہاں حالات میرے لیے مناسب نہیں تھے اس لیے جب ایک فرینڈ نے یہاں جاب کا بتایا تو میں یہاں شفٹ ہوگئی۔ یہ گھر بھی میری فرینڈ کے ایک عزیز کا ہے۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ دبئی شفٹ کر گئے ہیں اور انہوں نے مجھے یہ پرمیشن دی ہوئی ہے کہ جب تک وہ اس مکان کو سیل نہیں کرتے، میں یہاں رہ سکتی ہوں۔" اس بار اس نے ذرا تفصیل سے شہریار کے سوال کا جواب دیا۔

"گڈ... اس طرح تمہیں اپنے شوہر کے علاج میں مدد ملے گی۔ ایسے مریضوں کے علاج کے لیے اچھا اور پُرسکون ماحول بھی بہت مدد دیتا ہے۔" بے ساختہ ہی ان خیالات کا اظہار کرتا ہوا شہریار سچ مچ خوش تھا کہ عائشہ، کمال کو اس عسرت زدہ ماحول سے نکال کرلانے میں کامیاب ہوگئی ہے جو یقیناً اس کے اعصاب کے لیے سب سے بڑا بوجھ تھا۔ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہونے والے شخص کے لیے غربت بھری زندگی کے تھپیڑے سہنا کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ اسے تو چار دن میں بھول گیا تھا کہ عائشہ وہ عورت تھی جس کے عشق میں وہ دیوانہ ہوا جارہا تھا اور جس نے صرف اس کے علاج کی خاطر اپنا بسا بسایا گھر توڑ کر اس کی زندگی میں شامل ہونا قبول کرلیا تھا۔ اسے عائشہ کی اپنی خاطر دی جانے والی قربانیاں بھی بھول گئی تھیں۔ اس بے چاری نے نہ صرف دنیا بھر کی بدنامی مول لی تھی بلکہ عیش و عشرت کی زندگی چھوڑ کر میدان عمل میں بھی کودنا پڑا تھا۔ کمال کے رویّے کی وجہ سے وہ اپنی اکلوتی بیٹی کو ہاسٹل میں رکھنے پر مجبور ہوگئی تھی اور خود معاشی مسائل کے حل اور کمال کے علاج کے لیے سرگرداں تھی۔

"ان صاحب کی ڈریسنگ تو ہوگئی۔ میرے خیال میں آپ لوگوں کو بھی تھوڑی مرہم پٹی کی ضرورت ہے۔" ڈاکٹر فرحان کے جسم کے مختلف حصوں میں آنے والے زخموں کی مناسب دیکھ بھال کے بعد وہ پوری طرح ان دونوں خصوصاً شہریار کی طرف متوجہ ہوئی۔ اب وہ پوری طرح سے پُرسکون تھی اور اس کا رویّہ ان کے ساتھ ایسا تھا جیسے وہ اس کے گھر مہمان آئے ہوئے ہوں۔

"ہم اپنے زخموں کو خود دیکھ لیں گے۔ تم اس دوران میں ہمارے لیے کچھ کھانے پینے کا انتظام کردو۔" شہریار

نے دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے اس سے کہا۔ صبح بس ہونے ہی والی تھی اور ابھی یہ طے نہیں تھا کہ وہ یہاں سے کس طریقے سے نکلیں گے۔ عبدالرحمٰن نے پیشکش کی تھی کہ اگر انہیں کسی قسم کی مدد کی ضرورت پڑے تو وہ ان سے رابطہ کر سکتے ہیں لیکن ابھی تک وہ حتمی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ اس پیشکش کو قبول بھی کرے یا نہیں۔ اپنے طور پر یہاں سے نکل کر جانا بھی کم خطرناک نہیں تھا کیونکہ یہ یقینی تھا کہ اب تک شہر میں آمد و رفت کے تمام ذرائع پر سخت پہرا لگا دیا گیا ہوگا اور ان کے لیے ڈاکٹر فرحان کو یہاں سے نکال کر لے جانا آسان ثابت نہیں ہوگا۔

''اوکے، میں بریک فاسٹ تیار کرتی ہوں۔ وہ کونے میں واش روم ہے۔ تم لوگ چاہو تو اسے یوز کر سکتے ہو۔'' وہ اطمینان سے چلتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی تو شہر یار نے بھی اس کے مشورے کو قبول کرتے ہوئے واش روم کا رخ کر لیا۔ وہ فرسٹ ایڈ باکس اپنے ساتھ لے گیا تھا چنانچہ حلیے کی درستگی کے ساتھ ساتھ اپنے زخموں کی صفائی اور ان پر مرہم لگانے کا کام بھی کر ڈالا۔ وہ فارغ ہو کر نکلا تو سلو واش روم میں چلا گیا۔ وہ لاؤنج میں ڈاکٹر فرحان کے نزدیک بیٹھ کر کچن میں کام کرتی عائشہ کو دیکھتا رہا۔ اس کی طرف سے یہ خطرہ تو بہت کم تھا کہ وہ انہیں کوئی نقصان پہنچائے گی پھر بھی اپنے طور پر احتیاط ضروری تھی۔ کانسی سی عائشہ بہت پھرتی سے کام کر رہی تھی اور کچن سے آملیٹ تلے جانے کی سوندھی سی خوشبو یہاں تک پہنچ کر معدوں میں ہلچل پیدا کر رہی تھی۔ تھکنہ بھاگ دوڑ کے خیال سے اس نے اور سلو نے رات کا کھانا بہت ہلکا کھایا تھا جو کہ ظاہر ہے اب تک ہضم بھی ہو چکا تھا۔ ہنگامی حالات ہوتے تو شاید انہیں اپنی بھوک کا خیال بھی نہیں آتا لیکن یہاں ایک پُرسکون ماحول میں بیٹھ کر آملیٹ اور توس کی اشتہا انگیز خوشبوؤں کو سونگھتے ہوئے بھوک کا احساس دوچند ہو جانا کچھ عجیب نہیں تھا۔ عارضی ہی سہی لیکن فی الحال وہ ایک پناہ گاہ میں موجود تھے۔

''یہ اچھی لڑکی لگتی ہے۔ اس کے ساتھ کوئی مس بی ہیو مت کرنا۔'' صوفے پر نیم دراز ڈاکٹر فرحان کو نہ جانے کس خدشے نے ستایا کہ انہوں نے دھیمی آواز میں اس سے استدعا کی۔

ان کی بات سن کر وہ چونکا پھر مسکرا کر بولا۔ ''ڈونٹ وری ڈاکٹر! ہم محسن کش نہیں ہیں اور عورت خصوصاً مسلمان عورت کا تو بہت ہی احترام کرتے ہیں۔''

''تمہیں کیسے معلوم کہ یہ مسلمان ہے؟''

''یہ لیں بھئی ناشتا تیار ہے۔ جو کچھ میں بنا سکتی تھی بنا لیا۔ پراٹھے وغیرہ بنانا ذرا مشکل کام ہے اس لیے آپ لوگوں کو ان چیزوں پر ہی گزارہ کرنا پڑے گا۔'' وہ ڈاکٹر فرحان کے سوال کا جواب نہیں دے پایا تھا کہ عائشہ ہاتھ میں ٹرے لیے وہاں چلی آئی۔ اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھی تو شہر یار نے اس میں رکھے ہوئے لوازمات کا جائزہ لیا۔ آملیٹ، توس، مکھن اور جیم کے علاوہ ایک چھوٹی سی ٹوکری میں پھل کاٹنے والی چھری سمیت سیب بھی رکھے ہوئے تھے۔

''آپ لوگ کھانا شروع کریں۔ چائے دم پر ہے۔ میں بس ابھی دو منٹ میں نکال کر لے آتی ہوں۔'' وہ ایک ایسے خوش اخلاق میزبان کا کردار ادا کرنے لگی تھی جو بن بلائے اور بے وقت آنے والے مہمان کے لیے بھی دل کشادہ رکھتا ہے۔

''تھینک یو سو مچ... آپ بھی ہمارے ساتھ ناشتے میں شریک ہو جائیں۔''

شہر یار نے اسے دعوت دی تو وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی اور کھنکتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''اگر آپ کو یہ ڈر ہے کہ میں نے اس ناشتے میں کچھ ملا دیا ہے تو میں ضرور آپ کے ساتھ شریک ہو جاتی ہوں۔''

''نہیں، مجھے ایسا کوئی ڈر نہیں ہے۔ ایک گھریلو عورت اس کھانے میں ملا بھی کیا سکتی ہے۔ آپ کے پاس ملانے کے لیے چوہے مار یا کیڑے مار دواؤں کے علاوہ اور کیا چیز ہوگی اور ہم تینوں میں سے کوئی بھی ایسا بے وقوف نہیں ہے جو کھانے میں اس قسم کی کسی چیز کی موجودگی کو محسوس کیے بغیر اسے حلق سے نیچے اتار لے۔'' شہر یار نے نہایت سنجیدگی سے اس کی بات کا جواب دیا اور خود کچھ لینے سے پہلے ڈاکٹر فرحان کو پلیٹ پیش کی۔ وہ اس کے ملک کا ایک سرمایہ تھے اور وہ دل و جان سے ان کی عزت کرتا تھا۔

''میں چائے لاتی ہوں۔'' عائشہ اس کا بُردبار جواب سن کر جھینپ گئی تھی چنانچہ مزید کچھ کہے بغیر کچن کی طرف چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ خوشبودار چائے کے ساتھ ان کے درمیان موجود تھی۔ اس دوران میں سلو بھی واش روم سے نکل کر ان کے ساتھ شامل ہو چکا تھا اور بڑی رغبت سے ناشتا کر رہا تھا۔ شہر یار کو بھی ناشتا پسند آیا تھا اور اس نے دل میں اعتراف کیا تھا کہ عائشہ ایک سلیقہ مند عورت ہے ورنہ جس طبقے سے تعلق رکھتی تھی وہاں تو عورتیں کم ہی کچن میں جاتی

رکھتی ہیں اور کاروبارِ خانہ گھریلو ملازمین کے ہاتھوں میں ہی رہتا تھا۔ عائشہ نے بھی کمال کے ساتھ گزارے مختصر عرصے میں یہ سب سیکھا تھا تو بڑا کمال کیا تھا۔ ان دونوں کے مقابلے میں ڈاکٹر فرحان نے بہت کم کھایا تھا، البتہ چائے رغبت سے پی تھی اور ایک کے بعد دوسرا کپ بھی طلب کر لیا تھا۔

''اگر تم لوگ کہو تو ٹیلی ویژن آن کر دوں؟'' عائشہ ان کے ساتھ ناشتے میں باقاعدہ تو شامل نہیں ہوئی تھی لیکن ایک سیب تراش کر اس کے ساتھ شغل کر رہی تھی۔ سیب کی ایک قاش کو نزاکت سے کھاتے ہوئے ہی اس نے یہ سوال کیا تھا۔

''کر دو لیکن والیوم کم رکھنا۔'' بریکنگ نیوز کے اس زمانے میں حالات سے باخبر ہونے کے لیے ان کے پاس بھی سب سے مؤثر ذریعہ ٹیلی ویژن ہی تھا چنانچہ شہر یار نے اجازت دے دی۔ موبائل فون کے استعمال سے وہ خود اجتناب کر رہا تھا کہ اگر کال ٹریس ہو گئی تو مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا۔ عائشہ نے اس کی طرف سے اجازت پا کر ٹیلی ویژن کھول دیا۔ حسبِ توقع نیوز چینلز رات پیش آنے والے واقعات کے بارے میں بتا رہے تھے۔ ٹیلی ویژن کی اسکرین پر مختلف فوٹیجز کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر فرحان سمیت دونوں کی تصاویر بھی بار بار دکھائی جا رہی تھیں۔ ڈاکٹر فرحان کی تصویر تو بہت واضح تھی کہ وہ تو یقیناً ان کے ریکارڈ میں بھی موجود ہوگی لیکن سلو اور شہر یار کسی بھی فوٹیج میں بہت زیادہ نمایاں نہیں تھے لیکن پھر بھی اتنا تو تھا کہ وہاں بیٹھی عائشہ ان دونوں کو شناخت کر سکتی تھی۔ خبروں میں یہ بھی بتایا جا رہا تھا کہ اس گاڑی کو تلاش کر لیا گیا ہے جو مفرور ملزمان اسپتال سے لے اڑے تھے لیکن اس سے آگے متعلقہ اداروں کے پاس کوئی معلومات نہیں تھیں کہ وہ تینوں کیسے گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گئے ہیں۔

چلنے والی نیوز رپورٹ میں ڈاکٹر فرحان کو نہایت خطرناک مجرم قرار دیا جا رہا تھا اور بتایا جا رہا تھا کہ اس پاکستانی سائنس دان کو پانچ سال قبل اس وقت گرفتار کیا گیا تھا جب وہ اپنے رشتے داروں سے ملنے کے بہانے خطرناک عزائم کے ساتھ بھارت میں داخل ہوا تھا۔ ایسے مجرم کا فرار ہو جانا بھارتی سالمیت کے لیے سخت خطرناک قرار دیا جا رہا تھا اور پاکستان کے خلاف زہر افشانی کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھارتی حساس اداروں پر بھی تنقید کی جا رہی تھی جنہوں نے ایسے خطرناک ملزم کی حفاظت کے لیے کوئی معقول انتظام نہیں کیا تھا اور پہلے سے اطلاع ہونے کے باوجود کہ ڈاکٹر فرحان کو آزاد کروانے کی منصوبہ بندی کی جا رہی ہے، انہیں اسپتال سے کسی دوسری جگہ منتقل نہیں کیا تھا۔ را والے میڈیا کے سامنے یہ اعتراف کیسے کرتے کہ انہوں نے ڈاکٹر فرحان کو چارے کے طور پر استعمال کر کے ان کے ہمدردوں کو گرفتار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن صرف دو افراد ان کے حفاظتی حصار کو توڑ کر نہ صرف ڈاکٹر فرحان سمیت فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے بلکہ را کے کئی سورماؤں کو بھی موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔

ان کی طرف سے جو بیان جاری کیا گیا تھا اس میں فقط اتنا کہا گیا تھا کہ مجرموں کو کسی صورت چھوٹ نہیں دی جائے گی اور ہر صورت قانون کے شکنجے میں جکڑ لیا جائے گا۔ شہر کے داخلی اور خارجی راستوں پر سخت نگرانی کی بھی اطلاع دی گئی تھی۔ ان ساری خبروں کو ان تینوں کے ساتھ ساتھ عائشہ نے بھی غور سے سنا اور دیکھا تھا اس لیے اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ اس سے ان کی حقیقت پوشیدہ رہتی۔ بس اب سوال اس کے ردِعمل کا تھا۔ وہ بے شک مسلمان تھی لیکن بھارتی شہری تھی جس کی وفاداریاں اس سرزمین کے ساتھ ہونا لازم تھا جہاں وہ پیدا ہوئی اور پلی بڑھی تھی۔ اس کے پل پل رنگ بدلتے چہرے کو دیکھ کر بھی یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اندر سے سخت ہیجان اور اضطراب میں مبتلا ہو گئی ہے۔ شہر یار نے ہاتھ بڑھا کر اس سے ریموٹ لیا اور ٹیلی ویژن بند کر دیا۔

''تم کیا سوچ رہی ہو؟'' ٹیلی ویژن بند کر کے شہر یار نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''میں... میں سوچ رہی ہوں کہ اس وقت میری ہمدردیاں کس کے ساتھ ہونی چاہئیں۔ اس دھرتی کے ساتھ جسے ہم اپنی ماں کہتے ہیں یا اپنے ان محسنوں کے ساتھ جن کی وجہ سے میری عزت اور جان بچی اور آج میں ایک پُرسکون جگہ پر بیٹھی ہوں۔'' اس نے سخت تذبذب کے عالم میں جواب دیا تو شہر یار چونک گیا۔

''محسن... تم ہمیں اپنا محسن کیوں کہہ رہی ہو؟''

''میں نے تم دونوں کو پہچان لیا ہے۔ بے شک تمہارے حلیے بالکل بدلے ہوئے ہیں اور میں صرف شکل کی بنیاد پر تمہیں شناخت نہیں کر سکتی تھی، اس کے باوجود میں تم دونوں کو پہچان چکی ہوں اور میں نے تم لوگوں کی آنکھوں میں بھی اپنے لیے شناسائی دیکھی ہے۔ تم نے اب تک مجھ سے میرے متعلق جو سوالات کیے، ان میں بھی اس بات کی

جھلک تھی کہ تم پہلے سے مجھے جانتے ہو۔ خاص طور پر تمہارا اپنے ساتھی کے سامنے مجھے مسلمان کہنا خاصا معنی خیز تھا۔ اگر تم پہلی بار مجھے ملے ہوتے تو یہ کیسے جان سکتے تھے کہ میں مسلمان ہوں۔ پھر میں نے یہ بھی نوٹ کیا کہ تم مجھ پر اعتماد کررہے ہو حالانکہ جن حالات میں تم گھرے ہوئے ہو، تمہیں اپنے سائے سے بھی بھڑکنا چاہیے۔ اتنی آسانی سے بندہ جب ہی اعتماد کرتا ہے جب دوسرے سے کچھ نہ کچھ واقف ہو۔" وہ ذہین تھی اور صحافت کے شعبے سے تعلق رکھتی تھی چنانچہ اس کے لیے اندازے لگانا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔

"پھر... تم نے کیا سوچا ہے؟ تم ہمارا ساتھ دوگی؟" شہریار نے ایک طرح سے اعتراف کرلیا کہ اس کا ان کے بارے میں اندازہ درست ہے۔

"میں کوئی فیصلہ نہیں کرپارہی۔ میرے لیے تم دونوں مہربان دوستوں کی طرح ہو جنہوں نے ایک نہایت کڑے وقت میں اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری مدد کی لیکن دوسری طرف تم پر دہشت گرد اور پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام لگایا جارہا ہے۔ تم دونوں کئی افراد کی جانیں لینے کے ذمے دار ہو اور مجھے سمجھ نہیں آتی کہ میں قاتلوں کا ساتھ کیسے دوں؟ تمہارے بارے میں پولیس کو اطلاع دے کر محسن کش بھی نہیں کہلانا چاہتی۔ بس سمجھ لو کہ میں بُری طرح کنفیوز ہوں۔" اس نے اپنی دونوں کنپٹیاں ہتھیلی کی مدد سے دباتے ہوئے کہا۔

"تم اپنے اوپر ہمارے احسان کا بوجھ مت لو کیونکہ وہ کوئی احسان تھا ہی نہیں۔ ایک عورت کی عزت خطرے میں دیکھ کر ہم خود کو روک نہیں سکتے تھے۔ وہ عورت تمہارے بجائے کوئی اور بھی ہوسکتی تھی۔ بس اس کا مظلوم ہونا شرط تھا کیونکہ ہم قوم، نسل اور مذہب سے بھی پہلے انسانیت پر یقین رکھنے والے لوگ ہیں۔"

"تو پھر اتنے سارے لوگوں کو کیوں مار ڈالا؟" شہریار کی بات سن کر وہ بے ساختہ ہی پوچھ بیٹھی۔

"یہ معاملہ بالکل مختلف ہے۔ اگر ہم وہ سب نہیں کرتے تو خود مارے جاتے اور ظاہر ہے ہم اپنی جانیں تو نہیں گنوا سکتے تھے۔ ہمیں اپنے ان قابلِ احترام ہیرو کو ہر حال میں وطن واپس لے کر جانا ہے۔ یہ ہمارے ملک کا سرمایہ ہیں اور ہمارے لیے یہ کسی طور قابلِ قبول نہیں کہ ہم انہیں دشمن کی قید میں مسلسل اذیتوں سے گزرتا برداشت کرسکیں۔ تم ان کا حال دیکھ ہی رہی ہو نا۔ ان کی کسی انگلی میں ناخن موجود نہیں ہیں اور ایک ایسے آدمی کو جو علم و تحقیق کے شعبے سے تعلق رکھتا ہو، ایسے تشدد کا نشانہ بنانے کی کیا تُک ہے۔ یہ کوئی جاسوس نہیں ہیں، نہ کسی ایجنسی یا دوسری تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں، بس ایک ریسرچر ہیں جن کا ہر حال میں احترام کیا جانا چاہیے۔" شہریار کا انداز جذباتی تھا۔

"لیکن ان پر تو دہشت گردی کا الزام ہے؟" وہ اب بھی کنفیوز ہی تھی۔

"الزام... صرف الزام ہی ہے لیکن اس الزام میں سچائی نام کو بھی نہیں ہے۔ یہ بے چارے تو بھارت صرف اپنے رشتے داروں سے ملنے آئے تھے اور پھر سازشوں کا شکار ہو کر کہیں سے کہیں پہنچا دیے گئے۔ سوچنے کی بات ہے کہ اگر ہمیں بھارت میں دہشت گردی کرنی بھی ہے تو ایسے کام کے لیے ہم کسی تربیت یافتہ بندے کو بھیجیں گے یا ایک ایسے شخص کی زندگی خطرے میں ڈال دیں گے جو تحقیق کے میدان میں ہمارا قیمتی سرمایہ ہے۔ سچ صرف یہ ہے کہ تمہارے بھارتی ناخداؤں نے پاکستان کو زک پہنچانے کے لیے اس کے ایک قابل فرزند کو ناکارہ بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور اب جو کچھ ہو رہا ہے، وہ صرف اور صرف ردِعمل ہے لیکن اس ردِعمل میں بھی اس بات کا پورا خیال رکھا گیا ہے کہ کسی مظلوم کو نقصان نہ پہنچے اور صرف وہ لوگ نشانہ بنیں جو ہماری راہ میں آرہے ہیں۔" وہ بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا۔ البتہ عائشہ سر گھٹنوں میں چھپا کر اس انداز میں بیٹھ گئی کہ جیسے دل و دماغ پر بہت بوجھ آگرا ہو اور وہ خود کو کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر پارہی ہو۔

"تم اتنی پریشان کیوں ہو؟ تمہارے اوپر ہمارا ساتھ دینے کے لیے کوئی دباؤ تو نہیں ہے۔ یہ تو محض اتفاق ہے کہ ہم پناہ کے لیے جس گھر میں داخل ہوئے، وہ تمہارا ثابت ہوا ورنہ ہم یہاں کچھ اجنبیوں سے بھی ٹکرا سکتے تھے۔ ایسی صورت میں بھی ہم کسی کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ ہمارا واحد مطالبہ بس پناہ ہوتی اور اس کے لیے ہمیں گھر کے افراد کو یرغمال بنانا پڑتا۔ تمہارے ساتھ بھی ہم ایسا کرسکتے ہیں۔ تمہیں، تمہارے شوہر کے ساتھ ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دیتے ہیں اور خود موقع دیکھ کر یہاں سے نکل جاتے ہیں۔ تم دونوں میاں بیوی کو بعد میں کوئی نہ کوئی آزاد کرواہی لے گا۔" اس نے کھل کر عائشہ کو اپنے خیالات سے آگاہ کردیا۔ ڈاکٹر فرحان اور سلو نے اس دوران خاموشی سادھ رکھی تھی اور صرف سامع کا کردار ادا کررہے تھے۔ سلو کے بے نیاز انداز کو دیکھ کر تو یہ لگتا تھا کہ جیسے

اس گفتگو کو سننے کی بھی زحمت نہیں کررہا ہے۔ ناشتے کے تمام لوازمات سے انصاف کرنے کے بعد اب وہ آرام سے بیٹھا ایک سیب ہاتھ میں لیے اس پر دانت ماررہا تھا۔

"مجھے سوچنے کے لیے تھوڑا وقت دو۔" عائشہ نے مطالبہ کیا۔

"ٹھیک ہے، تم سوچ لو لیکن یاد رکھو کہ ہمارے پاس وقت کی کمی ہے اس لیے تمہیں جلد ہی کسی فیصلے پر پہنچنا ہوگا۔" یہ شہریار کا جواب تھا جسے سن کر عائشہ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور خاموشی سے ناشتے کے برتن سمیٹنے لگی۔

☆☆☆

وہ پاگلوں کی طرح جنگل میں بھٹکتا پھر رہا تھا لیکن اب تک ماہ بانو تک رسائی کی کوئی امید نہیں بندھی تھی۔ اس کا دل دیوانہ وار اپنی ماہی کو پکارتا تھا لیکن اس کی ہر صدا جنگل کی وسعتوں میں ہی کہیں کھو جاتی تھی۔ وہ مصطفیٰ خان کی گفتگو سن کر گھر سے نکلا تھا اور کسی حد تک اس بات کا اندازہ تھا کہ جنگل کے کس حصے میں ماہ بانو کے ملنے کا امکان ہے لیکن جنگل اتنا گھنا تھا کہ معمولی تیاری کے ساتھ تنہا وہاں آکر وہ گڑبڑا کر رہ گیا تھا اور کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کہ اب کس جانب جانا چاہیے۔ بس یونہی چلتا رہتا تھا اور اسے پکارتا رہتا تھا۔ کھانے پینے کے لیے اس کے پاس کوئی خاص سامان موجود نہیں تھا۔ وہ گھر سے اپنے ساتھ تھوڑے سے چنے لے کر نکلا تھا اور شدت سے بھوک محسوس ہونے پر ایک مٹھی پھانک لیتا تھا۔ چند ایک بار جنگلی پھلوں کا بھی استعمال کیا تھا لیکن اس معاملے میں سخت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اکثر جنگلی پھل خوش نما اور خوش ذائقہ ہوتے ہوئے بھی انسان کے لیے ضرررساں ہوتے ہیں۔ اس نے کھانے کے لیے پھلوں کا انتخاب کرتے ہوئے یہ دھیان رکھا تھا کہ جنگل میں رہنے والے جانور ان پھلوں کو کھارہے ہیں یا نہیں کیونکہ جانوروں کی حس اس معاملے میں بہت تیز ہوتی ہے اور عموماً وہ کسی زہریلی غذا کو کھانے کی غلطی نہیں کرتے۔ پینے کے لیے پانی بھی اسے جنگل میں ہی کہیں نہ کہیں مل جاتا تھا۔ اس سرسبز و شاداب ریاست میں یوں بھی پانی کے ذخائر کی کوئی کمی نہیں تھی تو پھر جنگل میں کیسے یہ کمی ہوتی۔ وہ اپنے پاس موجود بوتل کو کسی بھی ندی، نالے یا چشمے سے بھر لیتا اور پورا دن آرام سے گزر جاتا۔ یوں بھی وہ جن حالات سے دوچار تھا، اسے کھانے پینے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، بس جسم و جاں کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے اس ایندھن کی ضرورت تھی۔ یہ احساس کہ ماہ بانو کسی مشکل میں ہے اور اسے اس مشکل سے نکالنے کے لیے اسے ہی عملی اقدامات کرنے ہوں گے، اسے زندہ رہنے پر مجبور کرتا تھا ورنہ اپنی ماہ بانو کو دیکھے بغیر تو اسے سانس لینا بھی دشوار محسوس ہوتا تھا۔ سوتا بھی وہ اس وقت تھا جب فطرت اسے ہار ماننے پر مجبور کردیتی تھی اور یہ دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے کہ انسان کتنے ہی بڑے جذباتی حادثے سے کیوں نہ گزرے، فطری احتیاجات بس ایک محدود عرصے تک ہی دبی رہتی ہیں اور آخرکار انسان ان سے مغلوب ہو ہی جاتا ہے ورنہ دوسری صورت زندگی سے ناتا توڑ لینے کی ہوتی ہے۔ جو جذباتی بحرانوں سے گزرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا، وہ موت کی بانہوں میں پناہ ڈھونڈتا ہے لیکن وہ تو مرنے کا بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ ابھی ماہ بانو کے زندہ ہونے کی آس باقی تھی اور اس آس کے سہارے وہ اپنی سانسوں کو قائم رکھے ہوئے تھا۔

"مصطفیٰ خان نے جنگل کے اس حصے کا ذکر کیا تھا۔ اگر مجھے یہاں پہنچنا ہے تو پہلے مشرق کی طرف اور پھر ذرا سا شمال کی طرف جانا ہوگا۔" کمپیوٹر سے نکالے گئے جنگل کے نقشے کا پرنٹ سامنے پھیلائے وہ اپنے آپ سے ہی باتیں کررہا تھا۔ اس عرصے میں اس نے یہ نقشہ اتنی بار دیکھا تھا کہ بار بار کے استعمال سے اس کا کاغذ خراب ہونے لگا تھا۔ سمتوں کے تعین کے لیے وہ اپنے ساتھ ایک چھوٹی سی ڈبیا جتنا کمپاس (قطب نما) بھی لے کر آیا تھا لیکن جانے اس کے ساتھ کیا ہوا تھا کہ وہ صحیح طور پر کام ہی نہیں کررہا تھا اور اس بات کا اندازہ اسے اپنے بار بار بھٹک جانے کی وجہ سے ہوا تھا چنانچہ اب وہ اس کا سہارا لینے کے بجائے اپنی صوابدید پر سفر کررہا تھا۔ سمتوں کے تعین کے لیے سورج سے مدد لینے کی کوشش کرتا تھا لیکن اس گھنے جنگل میں سورج کا دیدار بھی آسانی سے نہیں ہو پاتا تھا اور بعض اوقات تو دن کے وقت بھی اتنا اندھیرا ہوتا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ اچانک شروع ہوجانے والی بارشوں کی آفت الگ بار بار ٹوٹ پڑتی تھی۔ بارش کا تو یہاں پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ ابھی دیکھو تو سورج نکلا ہوا ہے اور پھر منٹوں سیکنڈوں میں موسم اپنے تیور بدل کر ہر طرف جل تھل مچا دیتا تھا۔ گھنے درختوں کے سائے اسے کسی حد تک اس بارش سے پناہ تو دے دیتے تھے لیکن دلدلی زمین پر چلنا پھرنا مزید دشوار ہو جاتا تھا۔

جنگل میں چلتے ہوئے اسے مستقل اپنے ہاتھ میں ایک اسٹک رکھنی پڑ رہی تھی جسے قدم آگے بڑھانے سے پہلے زمین پر ٹکا کر وہ اس بات کا اطمینان کرلیتا تھا کہ اٹھنے

والا قدم اسے کسی دلدل میں نہیں پہنچا دے گا۔ ماہ بانو اس کی زندگی تھی اور اپنی زندگی کی تلاش میں اسے قدم قدم پر حادثات اور موت سے جنگ لڑنی پڑ رہی تھی۔ یہاں موذی جانور بھی تھے۔ خطرناک دلدلیں بھی اور کہیں کسی پناہ گاہ میں چھپے وہ دشمن بھی جنہوں نے اس کی ماہ بانو کو اس سے جدا کر دیا تھا۔ اس دشمن سے وہ خود بھی سامنا چاہتا تھا لیکن ابھی تک کسی سے ٹکراؤ نہیں ہوا تھا۔ ٹکراؤ ہوتا تو وہ اس سے ماہ بانو کا اتا پتا معلوم کرنے کی کوشش کرتا لیکن اس بات کا بہرحال اسے احساس تھا کہ یہاں چھپا وہ دشمن اس سے کہیں بہتر پوزیشن میں ہے اور ذرا سی چوک یا غفلت اس کی زندگی کا چراغ گل کر سکتی ہے۔ زندگی اسے اتنی پیاری نہیں تھی لیکن ماہ بانو کے کام آئے بغیر ضائع ہو جاتی تو مر کر بھی چین نہیں آتا۔ ماہ بانو کے خیال کے ساتھ ساتھ اسے اس ننھی سی کونپل کا بھی خیال آتا تھا جس نے ابھی ماں کے بطن میں اپنی موجودگی کا اعلان کیا تھا اور وہ بہت شوق سے منتظر تھا کہ وہ ننھی جان دنیا میں آئے تو وہ اپنی محبت کی اس نشانی کو دیکھے جسے اس نے بہت چاہت سے اپنی جانِ جاناں کے وجود کا حصہ بنایا تھا۔ محبت کے طاقتور جذبے نے ہی اسے اتنی ہمت اور طاقت دی تھی کہ وہ دنیا کی اتنی بڑی سپر پاور سے ٹکر لینے چلا تھا۔ مصطفیٰ خان کی گفتگو سن لینے کے بعد اس پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ ماہ بانو کو کسی عام امریکی شہری نے اغوا نہیں کیا ہے بلکہ اس کے پیچھے حکومتی سرپرستی موجود ہے۔ دنیا پر راج کرنے کا خواب دیکھنے والی یہ سپر پاور ایک ایسے جنون میں مبتلا تھی کہ انسانوں کو کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھی۔ اسلم کا خون یہ سوچ سوچ کر کھولتا تھا کہ ان جلادوں نے ماہ بانو کو اپنے کسی تجربے کے لیے بالکل ایسے پکڑ لیا تھا جیسے وہ کوئی چوہا، بلی یا گنی پگ ہو۔ امریکی حکومت اور اہم اداروں کے اکابرین خالصتاً امریکی شہریوں کے علاوہ باقی دنیا کے انسانوں کو سمجھتے بھی جانور ہی تھے بلکہ شاید اس سے بھی کم تر کیونکہ جانوروں کی زندگی کی حفاظت کے لیے تو یہاں بڑے سخت قوانین تھے اور سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ کوئی انہیں ضرر پہنچانے کا سوچ بھی سکے۔ غلطی سے بھی کسی سے اگر ایسا جرم ہو جاتا تو اس کا اسے شدید خمیازہ بھگتنا پڑتا۔

ذہن میں بہت سے الجھے ہوئے خیالات لیے اس نے اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔ گھنے درختوں کے درمیان جاری یہ سفر کتنے گھنٹوں پر محیط تھا، اس نے گننے کی زحمت نہیں کی۔ وہ جب سے یہاں آیا تھا وقت کا حساب کتاب کرنا بھول گیا تھا اور اس وقت تک اپنے مقصد کے حصول کے لیے سرگرداں رہتا تھا جب تک ٹانگیں چلنے سے انکاری ہو کر اسے کہیں ڈھے جانے پر مجبور نہیں کر دیتی تھیں۔ فطرت اسے مجبور کر کے سلا بھی دیتی تھی لیکن بس وہ اتنی ہی دیر ہوتی تھا کہ جتنی دیر اپنے جسم پر قابو نہیں رہتا تھا۔ ذرا توانائی آتی تو اس کی تلاش کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو جاتا۔ سفر تھا جو گھنے جنگل میں دشوار گزار راستوں پر تھا اور اس کی ٹھوکروں میں اپنی نشانیاں ثبت کرتا جا رہا تھا۔ چل چل کر اس کے پیروں میں سوجن آ گئی تھی اور بعض اوقات جوتا بے حد تنگ ہو جانے پر اسے پیروں کو جوتے کی قید سے آزاد کر کے ننگے پیر بھی چلنا پڑتا تھا۔ ننگے پیر چلنے کی وجہ سے اسے کئی بار کانٹے بھی چبھے تھے اور ٹھوکریں بھی لگی تھیں۔ اس کے بائیں پیر کی چھوٹی انگلی کا ناخن تو تقریباً اکھڑ ہی گیا تھا لیکن اسے پروا نہیں تھی۔ بعض اوقات اسے خاردار جھاڑیوں کے درمیان سے بھی گزرنا پڑتا تھا اور چونکہ اپنی دیوانگی میں اسے احتیاط برتنے کا خیال کم ہی آتا تھا، اس لیے کئی بار ان کانٹوں سے اپنا دامن الجھا کر جسم کے مختلف حصوں پر خراشیں لگوا بیٹھا تھا۔ اس کے کپڑے کئی جگہ سے پھٹ گئے تھے اور الجھے بالوں اور بے ترتیب داڑھی، مونچھ کے ساتھ وہ حقیقتاً ایسا مجنوں لگ رہا تھا جو گریبان چاک کیے اپنی لیلیٰ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا ہو۔ لیلیٰ لیلیٰ پکارتا وہ دیوانہ اپنے حال سے یکسر بیگانہ تھا، ہوش تھا تو بس اتنا کہ کسی طرح اپنی لیلیٰ تک پہنچنا ہے۔

اندازے سے سمت کا تعین کیے اس نے کتنا سفر طے کر لیا تھا، کچھ نہیں جانتا تھا۔ چونکا اس وقت جب نیکر اور ٹی شرٹ میں ملبوس ایک بچے کی جھلک سی دکھائی دی۔ اس جھلک کو دیکھ کر وہ بُری طرح ٹھٹک گیا کیونکہ اتنے عرصے میں یہ پہلی بار تھا کہ اسے اپنے سوا کسی دوسرے انسان کی جھلک دکھائی دی تھی اور وہ انسان تھا بھی ایک چھوٹا بچہ۔ بے ساختہ ہی اس نے خود کو چوڑے تنوں والے دو ایسے درختوں کے پیچھے چھپا لیا جو اپنی وسعت کی وجہ سے تقریباً ایک دوسرے سے جڑ گئے تھے اور دونوں کے تنوں کے درمیان بس ایک معمولی سی جھری ہی باقی رہ گئی تھی۔ اس جھری میں سے گرد و پیش کا جائزہ لے سکتا تھا چنانچہ خاموشی سے سانس روکے اس سمت دیکھ رہا تھا جہاں اسے اب بھی جاتے ہوئے بچے کی پشت نظر آ رہی تھی۔ بچے کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے گرد و پیش سے بھی پوری طرح چوکنا تھا کیونکہ یہ تو لازم تھا کہ کوئی بچہ تنہا اس جنگل میں موجود نہیں ہو سکتا تھا

بچے کی موجودگی کا مطلب تھا کہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی موجود تھا اور اس کسی دوسرے فرد یا افراد کے بارے میں اسے تعین کرنا تھا کہ وہ اس کے دشمن ثابت ہوں گے یا غیر متعلقہ افراد۔ دوستوں کی تو یہاں اسے سرے سے کوئی امید ہی نہیں تھی۔

”ایڈی... رک جاؤ بدمعاش... ورنہ میں تمہارا حشر خراب کر دوں گا۔“ چند سیکنڈ کا وقفہ نہیں گزرا تھا کہ اسے ہوا کے دوش پر لہراتی ایک کرخت آواز سنائی دی اور پھر فوراً ہی جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس ایک توانا آدمی اس کے سامنے سے گزر کر اس سمت دوڑ گیا جس سمت وہ بچہ بھاگ رہا تھا۔ بچے کا تعاقب کرتے اس آدمی کے ہاتھ میں ہتھیار بھی موجود تھا جس کو لہراتے ہوئے وہ بار بار گولی چلانے کی دھمکی بھی دے رہا تھا لیکن اس دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا اور بچہ مسلسل بھاگتا چلا جا رہا تھا۔

یہ ایک اتفاق تھا کہ اسلم اس وقت ایک ایسی جگہ کھڑا ہوا تھا جہاں سے اسے بہت دور تک دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اسلحہ بردار نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیا اور زوردار آواز سے ہونے والے فائر کے ساتھ ہی جنگل میں ایک انسانی چیخ گونجی۔ اسلم نے خود سے کافی فاصلے پر ایڈی کے نام سے پکارے جانے والے بچے کو لڑکھڑا کر گرتے دیکھا۔ بے ساختہ ہی وہ اپنی کمین گاہ سے نکل پڑا لیکن یک دم ہی ہوش آ گیا کہ جو شخص ایک بچے کو اتنی آسانی سے گولی مار سکتا ہے، وہ اس کے لیے تو اچھا خاصا خطرناک ثابت ہوگا۔ وہ فوراً ہی محتاط ہو گیا اور درختوں کی آڑ لے کر دبے قدموں اس طرف بڑھنے لگا جہاں وہ بچہ گرا ہوا تھا اور اب اسلحہ بردار شخص بھی اس کے سر پر پہنچ گیا تھا۔ آخرکار اسلم بھی ان سے اتنے فاصلے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا کہ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سن سکے۔

”مارک! تم نے مجھے گولی ماری ہے۔ ماسٹر تمہیں اس کی سزا دے گا۔“ زمین پر گرا بچہ زور زور سے روتے ہوئے اس شخص سے مخاطب تھا جواب اپنی گن ایک جانب رکھے بچے کی زخمی ٹانگ پر پٹی باندھ کر خون روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے بچے کے بالائی جسم پر موجود شرٹ اتار لی تھی۔ اسلم کو پہلی حیرت بچے کی آواز سن کر ہوئی تھی کیونکہ وہ آواز ہرگز بھی کسی چار پانچ سالہ بچے کی نہیں لگتی تھی اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی نوجوان لڑکا بات کر رہا ہو۔ قریب سے دیکھنے پر اسے کچھ اور بھی چیزیں نظر آئیں۔ تقریباً تین فٹ کے اس بچے کے چہرے پر چھوٹی سی داڑھی اور ہلکی ہلکی مونچھیں موجود تھیں جبکہ سینہ بھی کسی جوان مرد کی طرح بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ اب تک وہ غلط فہمی کا شکار رہا ہے اور جسے بچہ سمجھتا رہا ہے، وہ بچہ نہیں بلکہ پستہ قامت نوجوان ہے۔ لیکن کسی نوجوان کا گولی کھا کر اس طرح بچوں کی طرح رونا بھی عجیب ہی تھا۔

”ماسٹر کو میں خود سمجھا لوں گا۔ تم اس بات پر بہت اتراتے ہو نا کہ ماسٹر کے لاڈلے ہو لیکن یاد رکھو کہ ماسٹر تم سے کتنی ہی محبت کرتا ہو، اس بات کو بالکل برداشت نہیں کرے گا کہ تم یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرو۔“ مارک نامی آدمی نے پٹی باندھنے کا کام مکمل کرتے ہوئے ایڈی کی دھمکی کا جواب دیا۔

”تم نے خود مجھے بھاگنے پر مجبور کیا ہے۔ تم مجھے کھانے پینے کو نہیں دے رہے تھے اس لیے مجھے وہاں سے نکلنا پڑا۔ کیا میں بھوکا مرنے کے لیے وہاں پڑا رہتا؟“ ایڈی زور سے چیخ کر بولا۔

”تمہارا کھانا پینا بھی مجھے تمہاری حرکتوں کی وجہ سے بند کرنا پڑا تھا۔ تمہارے اس پانچ سال کے وجود میں چوبیس سال کی جوانی پھڑپھڑاتی رہتی ہے، اسے لگام ڈالنے کے لیے کچھ تو کرنا ہی تھا۔ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ وہ عورت ماسٹر کے لیے کتنی اہم ہے۔ اگر تمہاری بدتمیزی سے اسے کوئی نقصان ہو جاتا تو ماسٹر اپنے ہاتھ سے تمہیں گولی مار دیتا۔“ مارک کے ایڈی کو دیے جواب نے اسلم کے کان کھڑے کر دیے۔

”اتنی خوب صورت عورت کی خاطر میری جان بھی چلی جاتی تو کوئی دکھ نہیں ہوتا۔“ ٹھیٹ عاشقوں کے لہجے میں یہ جواب دیتے ہوئے ایڈی کو شاید اپنی زخمی ٹانگ بالکل بھول چکی تھی۔

”او عاشق کی اولاد... اپنا منہ بند کر۔ اس عورت کی کوکھ میں پلتے بچے کو ماسٹر ایسے روپ میں ڈھالنے والا ہے کہ تو اس کے سامنے پانی بھرتا رہ جائے گا۔ تجھے اس بات پر غرور ہے نا کہ تو ماسٹر کا سب سے اچھا شاہکار ہے تو سن لے وہ عورت ایک ایسے بچے کو جنم دینے والی ہے جو تجھ سے کئی گنا بڑھ کر ذہین اور خوب صورت ہوگا۔ پھر ماسٹر تجھے بھول جائے گا اور تو میرے رحم و کرم پر ہوگا۔ اس وقت میں تجھ سے ان پانچ سالوں کا گن گن کر بدلہ لوں گا جن میں تو نے مجھے خوب ستایا ہے۔“ مارک نے ہلکے پھلکے ایڈی کو اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا تھا اور بولتا ہوا اسی راستے پر واپس

چل پڑا تھا جس راستے سے وہ اور ایڈی یہاں آئے تھے۔ آڑ میں چھپ کر کھڑے اسلم کا دل گفتگو کے اس حصے کو سن کر کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگا تھا۔ سننے کو اس نے مارک کی زبان سے کئی عجیب و غریب انکشافات سن لیے تھے لیکن خوب صورت حاملہ عورت کا ذکر سن کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ عورت ماہ بانو ہی ہے۔ اس نے مصطفیٰ خان کی اس کی بیوی بلقیس سے کی جانے والی جو گفتگو سنی تھی، اس سے بھی یہی اندازہ ہوا تھا کہ جنگل میں کوئی ایسی خفیہ تجربہ گاہ قائم کی گئی ہے جہاں حاملہ خواتین پر تجربے کیے جا رہے ہیں۔ یقینی طور پر وہ تجربے ایسے تھے جن کی انسانی حقوق کی تنظیموں کی طرف سے شدید مذمت کی جاتی چنانچہ حکومتی سرپرستی حاصل ہونے کے باوجود یہ تجربات خفیہ اور مجرمانہ طریقوں پر کیے جا رہے تھے۔

اسلم کا دل یہ سن کر بری طرح تڑپنے لگا تھا کہ یہ بے رحم لوگ ایک ننھی جان کو دنیا میں آنے سے قبل ہی اپنے تجربات کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں۔ ان تجربات کا نتیجہ کچھ بھی نکلتا لیکن یہ تو سامنے کی بات تھی کہ ایسا بچہ عام بچوں سے مختلف ہوتا اور معاشرے میں عام فرد کی سی زندگی گزارنے کا اہل نہ ہوتا۔ اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ایڈی نامی وہ نوجوان نما بچہ بھی کسی تجربے کا ہی نتیجہ تھا۔ ظالموں نے جانے کس مقصد کے لیے اس پر کون کون سے تجربات کیے تھے کہ وہ پانچ سال کی عمر میں ہی اپنے بچپن سے محروم تھا اور اب اس کا ہونے والا بچہ بھی شدید خطرے میں تھا۔ ماہ بانو اور بچے کی زندگی کے خطرے میں ہونے کا سوچ کر اس کے وجود میں طیش کی شدید لہریں اٹھ رہی تھیں اور بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی پیچھے سے جا کر مارک کی گردن دبوچ لے۔ اپنی اس خواہش پر اس نے بڑی مشکل سے قابو پایا اور غصے کو دباتے ہوئے احتیاط سے مارک کا پیچھا کرنے لگا۔ مارک اور ایڈی کے درمیان اب بھی مسلسل مکالمہ جاری تھا اور اس گفتگو کا زیادہ تر حصہ ایک دوسرے کو دی جانے والی دھمکیوں پر مشتمل تھا۔ مارک نے ایڈی کو دھمکی دی تھی کہ اگر آئندہ ایڈی نے اسے ستایا تو وہ اس کے ساتھ اس سے بھی زیادہ برا سلوک کرے گا اور اس کے ہاتھ پیر کاٹ کر ڈال دے گا۔ جواب میں ایڈی نے اسے دنیا جہاں کی گالیاں دے ڈالی تھیں۔

”او کے، تم انسانیت سے ماننے والے نہیں ہو۔ تمہیں سبق سکھانا ضروری ہے اور اس کے لیے میں نے پورا پلان سوچ لیا ہے۔ میں تمہیں اسی حالت میں لے جا کر تمہارے بیرک میں پھینک دوں گا۔ گولی ابھی تک ٹانگ کے اندر ہی ہے۔ دو چار دن بغیر علاج کے ایسے ہی پڑے رہو گے تو زخم سڑ جائے گا اور پھر ماسٹر خود تمہاری ٹانگ کاٹنے کا فیصلہ سنانے پر مجبور ہو جائے گا۔“ وہ بہت سفاکانہ فطرت کا آدمی لگ رہا تھا۔

”تت... تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ اس بار ایڈی واضح طور پر خوف زدہ ہو گیا۔

”تم جانتے ہو کہ میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ تمہیں یاد ہے نا کہ پچھلے سال میں نے تمہیں ایک کوبرا کے ساتھ باتھ روم میں بند کر دیا تھا۔ اگر اس روز تم مجھ سے سوری نہیں کرتے تو وہ کوبرا تمہیں تمہارے انجام تک پہنچا دیتا۔“ مارک کی باتوں سے اس کی سفاکانہ فطرت واضح ہوتی جا رہی تھی۔ محتاط فاصلے سے ان کے تعاقب میں چلتا اسلم بھی اس گفتگو کا بیشتر حصہ سن رہا تھا۔ اس گفتگو کو سن کر جہاں اس کے دل میں ایڈی کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہو رہے تھے، وہاں وہ یہ سوچ سوچ کر لرز رہا تھا کہ ایسی سفاک فطرت رکھنے والے آدمی کی قید میں ماہ بانو نہ جانے کس حال میں ہوگی۔ اپنی گفتگو سے مارک اذیت پسند آدمی لگ رہا تھا اور یہ طے تھا کہ اگر اس نے ماہ بانو کو کوئی نقصان پہنچایا ہوگا تو اسلم کے ہاتھوں اس کی سخت سزا بھی بھگتے گا۔ ویسے اس کا امکان ذرا کم ہی تھا کیونکہ مارک اپنی زبان سے کہہ چکا تھا کہ وہ عورت ان کے ماسٹر کے لیے بہت قیمتی ہے اور ماسٹر اسے کوئی نقصان پہنچنا برداشت نہیں کر سکتا۔ اس تسلی نے بھی کسی حد تک اس کے اندر ابھرتے اشتعال کو قابو میں کیے رکھا اور پھر ابھی تو حتمی طور پر یہ طے ہونا بھی باقی تھا کہ وہ عورت ماہ بانو ہے بھی یا نہیں۔ ویسے اس کا وجدان کہہ رہا تھا کہ وہ ماہ بانو ہی ہوگی اسی لیے بڑے صبر و ضبط سے تعاقب جاری رکھے ہوئے تھا۔

ایڈی کو کاندھے پر ڈالے دوسرے ہاتھ میں اپنی گن تھامے مسلسل چلتے مارک کا اسٹیمنا قابلِ تعریف تھا۔ جس مقام سے اس نے ایڈی کو اٹھایا تھا، وہاں سے اب تک کافی فاصلہ طے کر چکا تھا اور ذرا بھی نہیں ہانپ رہا تھا۔ آخرکار چلتے چلتے وہ جنگل کے ایسے حصے میں پہنچ گئے جہاں بہت سے درخت جھنڈ کی شکل میں موجود تھے۔ مارک ایڈی کو لیے ہوئے اس جھنڈ میں داخل ہو گیا۔ اسلم ان کے پیچھے تھا۔ جھنڈ میں داخل ہونے سے پہلے اس نے ایک درخت کی آڑ میں رک کر جھانکا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ جھنڈ ایک خاص ترتیب میں تھا اور درخت اس انداز میں کھڑے

تھے کہ درمیان میں ایک دائرے کی صورت اچھی خاصی جگہ خالی پڑی ہوئی تھی اور بس چند جھاڑیاں وغیرہ ہی نظر آرہی تھیں۔ ان جھاڑیوں میں سے ہی ایک جھاڑی کے پاس پہنچ کر مارک نے ایڈی کو نیچے لٹایا اور خود جھاڑی کو کسی لیور کی طرح پہلے دائیں اور پھر بائیں جانب حرکت دی۔ اس حرکت کے نتیجے میں جھاڑی اپنے نیچے موجود زمین سمیت بائیں جانب کھسک گئی اور ایک اچھا خاصا بڑا چوکور خلا نظر آنے لگا۔ مارک نے زمین پر لیٹے ایڈی کو ایک بار پھر اپنے کندھے پر ڈالا اور اس چوکور خلا میں اتر گیا۔ اسلم اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہاں سیڑھیاں موجود ہوں گی جن کی مدد سے وہ نیچے اتر رہا تھا۔ مارک اور ایڈی کے وجود اس خلا میں نظر آنے بند ہو گئے تو وہ خلا بھی بند ہو گیا اور ایک بار پھر لہلہاتی جھاڑی کے ساتھ زمین بالکل ایسی نظر آنے لگی جیسے وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔

اسلم نے ڈراموں، فلموں میں اس طرح کے خفیہ ٹھکانے اور ان کے کھولنے بند کرنے کے عجیب وغریب طریقے بہت دیکھے تھے لیکن اس وقت اپنی آنکھوں سے حقیقت میں یہ سب دیکھنا بہت عجیب محسوس ہو رہا تھا۔ دل میں ابھرتی اس خواہش پر کہ فوری طور پر خود بھی اس خفیہ ٹھکانے میں گھس جائے، قابو پاتے ہوئے وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا اور اپنے بالکل خشک ہو جانے والے حلق کو اپنے پاس موجود بوتل کے پانی سے تر کرنے کے بعد خود بھی اس جھاڑی کا رخ کیا۔ کئی منٹ گزر جانے کے باعث اسے یقین تھا کہ جب وہ یہ خفیہ راستہ کھول کر اندر داخل ہوگا تو کسی سے فوری طور پر مڈبھیڑ نہیں ہوگی اور مارک بھی زخمی ایڈی کو طبی امداد پہنچانے میں مصروف ہوگا۔ خفیہ راستہ کھولنے کا طریقہ وہ دیکھ ہی چکا تھا چنانچہ ہاتھ جھاڑی کی طرف بڑھایا اور یونہی اس کا ایک پتا پکڑ کر توڑ لیا۔ پتا توڑنے پر اسے احساس ہوا کہ یہ جھاڑی مصنوعی ہے کیونکہ پتا توڑنے پر بھی وہ نمی محسوس نہیں ہوئی تھی جو قدرتی طور پر ہر پودے میں موجود ہوتی ہے، حالانکہ دیکھنے اور چھونے میں وہ جھاڑی بالکل اصلی لگتی تھی۔ اس نے انگلیوں کے بیچ دبا پتا ایک طرف پھینکا اور مارک کی طرح جھاڑی کو پہلے دائیں اور پھر بائیں جانب حرکت دی۔ نتیجے میں ایک بار پھر وہ خلا نمودار ہو گیا جو کچھ دیر پہلے اس نے دیکھا تھا۔ اس نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے خلا میں جھانک کر دیکھا۔ لوہے کا مضبوط زینہ نیچے جا رہا تھا اور اندر جلتی مدھم سی روشنی میں وہاں کسی ذی نفس کا نام ونشان نہیں تھا۔ اس نے اللہ کا نام لے کر سیڑھی پر قدم رکھ دیا۔ دو اسٹیپ نیچے اترتے ہی اسے دیوار میں لگا ایک لیور نظر آ گیا۔ اس لیور کو حرکت دینے پر پیدا ہونے والا خلا بند ہو گیا لیکن اندر حبس یا اندھیرے کا نام ونشان نہیں تھا۔

مدھم سی نیلگوں روشنی میں محسوس کی جانے والی فضا کی تازگی بتا رہی تھی کہ وہاں وینٹی لیشن کا بڑا زبردست اور باقاعدہ نظام ہے۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتا ساری سیڑھیاں اتر گیا۔ نیچے اترنے سے پہلے ہی اس نے اپنا ریوالور نکال کر ہاتھ میں تھام لیا تھا لیکن فی الحال کوئی نظر ہی نہیں آرہا تھا تو ریوالور کے استعمال کی کیا ضرورت پڑتی۔ سیڑھیاں اترنے کے بعد وہ دائیں طرف جاتے گلی نما راستے کی طرف مڑ گیا۔ پتلے سے اس راستے کے دونوں جانب سپاٹ دیواریں تھیں اور ابھی تک اسے کوئی کھڑکی، دروازہ نظر نہیں آیا تھا۔ آخر کار وہ چلتا ہوا درمیان میں پہنچ گیا تب پتا چلا کہ یہ زیر زمین عمارت وہاں سے دائیں اور بائیں دو حصوں میں منقسم ہو رہی ہے اور دونوں طرف کوریڈورز ہیں جن میں مختلف کمروں کے دروازے موجود تھے اور فی الحال یہ سارے کے سارے دروازے بند نظر آرہے تھے۔ اتنی بڑی جگہ پر جو لوگ بھی موجود تھے وہ یقیناً ان بند دروازوں کے پیچھے ہی تھے۔ ان لوگوں میں سے ایک اس کی ماہ بانو بھی تھی لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کس دروازے کے پیچھے موجود ہوگی۔ اسے ڈھونڈنے کے لیے اسے کہیں سے تو آغاز کرنا تھا چنانچہ دائیں طرف کے کوریڈور میں مڑ گیا اور پڑنے والے پہلے ہی دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے کھولنے کی کوشش کی لیکن دروازہ لاک تھا چنانچہ ہینڈل پر دباؤ ڈالنے پر بھی نہیں کھلا۔ اس نے کمرے کے اندر کا معائنہ کرنے کے لیے جھک کر کی ہول سے آنکھ لگائی۔ اسی لمحے اسے اپنے پیچھے حرکت کا سا احساس ہوا۔ اس نے تیزی سے سیدھا ہو کر پیچھے پلٹنے کی کوشش کی لیکن اس سے قبل ہی اس کی گردن میں ایک سوئی سی پیوست ہوئی اور اس نے بہت تیزی سے اپنے جسم کو سن ہوتا ہوا محسوس کیا۔ یہاں تک کہ اس کی ٹانگیں بے جان ہو گئیں اور اپنے قدموں پر کھڑے رہنے کی کوشش میں ناکام ہو کر زمین پر آرہا۔ نیچے گر کر ساکت ہو جانے والی اس کی آنکھ کی پتلیوں پر جو عکس بنا وہ مارک کے مسکراتے ہوئے خبیث چہرے کا تھا۔

یہ پُرپیچ وسنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آیندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

کمبخت کرکٹ

کاشف زبیر

کھیلوں کے شیدائی وقت کی قید سے آزاد ہوتے ہیں... کوئی بھی صورتِ حال ہو... وہ اپنے شوق اور جنوں سے وابستہ ماحول میں رہنا پسند کرتے ہیں... ایک ایسے ہی خاندان کے نفوس کا ماجرا... جو اسٹیڈیم جاکے میچ دیکھنا چاہتے تھے...

کرکٹ... اور گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے حالات کی ایک پُرمزاح وپُرتجسس صورت حال

عظیم الدین اور اس کی پوری فیملی کرکٹ کی دیوانی ہے اور ان کی یہ دیوانگی آج بھی برقرار ہے جبکہ ہماری ٹیم کی اعلیٰ کارکردگی اور پے درپے اسکینڈلز (جن میں بدنام ہوئے تو کیا نام نہ ہوگا والی جنونی کیفیت پائی جاتی ہے) نے اچھے اچھوں کو کرکٹ سے تائب ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔ وہ لوگ جن کا اوڑھنا بچھونا کرکٹ تھی، اب ان کے سامنے کرکٹ کا نام لو تو کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں مگر عظیم الدین کا عشق سلامت تھا۔ شادی سے پہلے جب اس کے والد

امیر الدین جوا کھیلنے کو اتنا برا نہیں سمجھتے تھے جتنا کرکٹ کھیلنے کو۔ تب بھی عظیم الدین کا اتوار سورج نکلنے سے لے کر غروب ہونے کے بعد نظر آنے تک کرکٹ سے معمور رہتا تھا۔ اس زمانے میں نائٹ کرکٹ کا اتنا رواج نہیں تھا اس لیے مجبوراً مغرب کے بعد گھر آنا پڑتا تھا۔ امیر الدین کی ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ بھی عظیم الدین کو کرکٹ کی راہ سے نہیں ہٹا سکی تھی۔ پڑھنے میں وہ شروع سے تیز تھا اس لیے وہ اعتراض نہیں کر سکتے تھے کہ کرکٹ اس کی تعلیم میں حائل تھی۔

امیر الدین کا تعلق ایک کاروباری گھرانے اور برادری سے تھا جس کا اوڑھنا بچھونا ہی کاروبار ہوتا ہے۔ خود امیر الدین صرف بارہ برس کی عمر سے کاروبار کرنے لگے تھے۔ انہوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے بعد پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ ان کا ہوزری کا کام تھا۔ جب عظیم الدین ایم بی اے کر کے ان کے ساتھ کاروبار میں شامل ہوا تو ان کا کاروبار بین الاقوامی ہو چکا تھا اور ان کے کارخانے میں تیار ہونے والا مال درجنوں ممالک میں سپلائی ہوتا تھا۔ میٹرک تک عظیم الدین کا ارادہ کرکٹر بننے کا تھا۔ وہ اچھا بیٹسمین تھا اور اس نے سٹی کرکٹ ایسوسی ایشن کی انڈر ٹائنٹین ٹیم کے لیے ٹرائل بھی دیے تھے لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس کے بعد اس نے کئی بار کوشش کی، ہر بار اسے مسترد کر دیا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے کیونکہ اس سے کہیں کم تر لڑکے منتخب ہو جاتے تھے اور وہ رہ جاتا تھا۔

کالج میں داخلے کے بعد اس نے کرکٹر بننے کا خیال ذہن سے نکال دیا اور تعلیم پر توجہ دینے لگا اور شغل کے طور پر کالج کی کرکٹ ٹیم کی طرف سے کھیلنے لگا۔ گریجویشن کے بعد اس نے ایم بی اے کیا اور جب عملی زندگی میں آیا تو عملی کرکٹ سے تعلق ختم ہو گیا لیکن میچز دیکھنے کی حد تک یہ جنون نہ صرف برقرار رہا بلکہ بڑھ بھی گیا تھا۔ وہ بزنس میں شامل ہوا تو دو سال بعد اس کی شادی کر دی گئی۔ بیوی خاندان سے تھی اور عظیم الدین کی طرح کرکٹ کی شیدائی تھی۔

وقت گزرتا رہا، شادی کے بعد مناسب وقفوں سے عظیم الدین اور ریحانہ کے تین بچے ہوئے۔ بڑا شہباز، اس کے بعد حمزہ اور سب سے آخر میں آمنہ تھی۔ تینوں بچوں میں ڈھائی تین سال کا فرق تھا۔ ماں باپ کی طرح بچے بھی کرکٹ کے شوقین تھے مگر دیکھنے کی حد تک۔ شہباز نے تھوڑی بہت کرکٹ کھیلی بھی اور عظیم الدین کی خواہش تھی کہ وہ عملی کرکٹ کھیلے اور آگے تک جائے مگر شہباز کو کھیلنا زیادہ پسند نہیں تھا۔ حمزہ کو کھیلنے میں فٹ بال پسند تھی مگر دیکھنے میں کرکٹ اچھی لگتی تھی۔ البتہ آمنہ باپ کی طرح دیوانی تھی۔ اس کا بس چلتا تو بھائیوں کی جگہ وہ کھیلتی مگر عظیم الدین نے اسے اجازت نہیں دی۔ وہ سمجھتا تھا کہ کرکٹ سخت کھیل ہے اور اس میں چوٹ لگنے کا امکان ہوتا ہے۔ وہ اپنی لاڈلی بیٹی کی ذرا سی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

امیر الدین نے اپنی زندگی میں ہی وراثت اولاد میں تقسیم کر دی تھی۔ عظیم الدین کے حصے میں ایک کارخانہ آیا تھا جو بیرونِ ملک کے لیے ٹی شرٹس اور ہوزری کی دوسری مصنوعات تیار کرتا تھا۔ عظیم الدین نے اسے مزید ترقی دی۔ امیر الدین کے بعد ان کی اولادیں الگ الگ ہو گئیں۔ سب کے اپنے خاندان بن گئے تھے۔ عظیم الدین نے اپنا بنگلا بنوایا اور بیوی بچوں سمیت وہاں منتقل ہو گیا۔ ٹی وی کا شوق نہیں تھا، صرف کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے اس نے بیالیس انچ کا ایل سی ڈی ٹی وی لیا تھا۔ بزنس کے سلسلے میں اکثر اسے بیرونِ ملک جانا ہوتا تھا۔ یورپ، امریکا، مڈل ایسٹ، فار ایسٹ اور افریقا کے کئی ملکوں میں جانا ہوا تھا۔ کبھی وہ اکیلا جاتا تھا اور کبھی بیوی بچوں کے ساتھ جاتا۔ ان دنوں وہ جنوبی افریقا جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہاں سے اسے کئی آرڈرز ملے تھے۔ اتفاق سے بچوں کے اسکول کی چھٹیاں تھیں اس لیے ریحانہ اور بچوں نے اس سے کہا کہ وہ بھی اس کے ساتھ چلیں گے۔ عظیم الدین نے منع کر دیا کیونکہ وہاں اس کا بیشتر وقت مصروفیت میں گزرتا اور بیوی بچوں کو لے جاتا تو ان کو بھی وقت دینا پڑتا۔

”مجھے اچھا نہیں لگے گا کہ تم لوگ ہوٹلز میں قید رہو۔“

”ہم ہوٹل میں قید نہیں رہیں گے، وہاں گھومیں پھریں گے۔“ ریحانہ بولی اور پھر اسے خیال آیا۔ ”سنیں، آج کل ہماری ٹیم جنوبی افریقا میں ہے۔“

عظیم الدین نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”ہاں، ٹیسٹ میچوں میں تم حشر دیکھ چکی ہو۔“

”بھئی ٹیسٹ میچوں میں دونوں ٹیموں میں زمین آسمان کا فرق ہے اور یہ نتیجہ غیر متوقع نہیں ہے۔“ ریحانہ نے اپنی ٹیم کی سائڈ لی۔ ”لیکن ون ڈے اور ٹی ٹوئنٹی میں ہماری ٹیم اچھی ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اچھا مقابلہ کرے گی اور ممکن ہے ہم سیریز جیت جائیں۔“

عظیم الدین نے غور کیا۔ ”تم لوگ میچز دیکھنا چاہتے ہو؟“

”ہاں نا... کتنے دن ہو گئے اسٹیڈیم میں جا کر میچ دیکھے ہوئے۔“ ریحانہ بولی۔ ”پھر آپ بھول رہے ہیں، جنوبی افریقا میں ہمارے بہت سارے رشتے دار بھی رہتے ہیں۔ غفور دادا سے خاندانی تعلقات ہیں، رشتے میں دادا لگتے ہیں۔ بابا جان کئی بار ان کے ہاں جا چکے ہیں اور جب وہ آتے ہیں تو ہمارے ہاں ہی رکتے ہیں۔“

”غفور دادا جوہانسبرگ میں رہتے ہیں؟“ عظیم الدین نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”مجھے وہیں جانا ہے۔“

ریحانہ خوش ہو گئی۔ ”یہ تو اور اچھا ہے۔ ہمیں ہوٹلز میں نہیں رہنا پڑے گا۔“

عظیم الدین نے بیوی کو گھورا۔ ”یوں منہ اٹھائے کسی کے ہاں نہیں جا سکتے۔ تم پہلے انہیں کال کر کے اپنے آنے کا بتاؤ۔ اگر وہ دعوت دیں گے تب ہم ان کے ہاں جائیں گے۔“

ریحانہ اور بچے خوش ہو گئے کہ عظیم الدین مان گیا تھا۔ اصل میں وہ خود بھی بیوی بچوں کے ساتھ جانا چاہ رہا تھا مگر اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا کہ ان دنوں وہاں کرکٹ ہو رہی تھی۔ اس کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ جنوبی افریقا میں حالات ٹھیک نہیں تھے۔ جرائم کا تناسب کافی زیادہ تھا اور خاص طور سے غیر ملکی اور سیاح نشانہ بن رہے تھے۔ اس لیے بھی عظیم الدین کو بیوی بچوں کو لے جانے کا خیال نہیں آیا مگر جب انہوں نے اصرار کیا تو وہ مان گیا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ جوہانسبرگ میں رہیں گے۔ وہاں پوش علاقوں میں صورتِ حال بہتر تھی مگر اب ریحانہ نے غفور دادا کو درمیان میں ڈال دیا تھا۔ اگلے دن وہ دفتر سے آیا تو ریحانہ نے اسے بتایا۔

”میری غفور دادا سے بات ہوئی ہے۔ وہ تو ہمارے آنے کا سن کر ہی پُرجوش ہو گئے۔ جب میں نے کہا کہ ہم کرکٹ بھی دیکھیں گے تو انہوں نے ٹکٹوں کا ذمہ بھی لے لیا ہے۔“

”وہ تو خیر مسئلہ نہیں ہے۔ میں آن لائن بھی لے سکتا ہوں لیکن یہ اچھا ہے اب تم لوگ گھر کے ماحول میں رہو گے اور جب میں بزنس کے لیے جاؤں گا تو تم لوگ بور نہیں ہو گے۔“

بچے بھی خوش تھے۔ ریحانہ نے تیاریاں شروع کر دیں۔ عظیم الدین کا ارادہ تو ایک ہفتے کا تھا لیکن بیوی بچوں کی خاطر اس نے دو ہفتے کر دیا۔ اس نے سب کے لیے ویزے کی درخواست دے دی تھی۔ ویزے لگ کر آ گئے۔ ریحانہ نے اپنی شاپنگ بھی مکمل کر لی تھی۔

غفور دادا کے والد تقسیم سے پہلے جنوبی افریقا جا کر آباد ہو گئے تھے۔ وہ جدی پشتی تاجر تھے۔ وہاں بھی انہوں نے کاروبار کیا اور اس میں اتنی ترقی کی کہ مرنے کے بعد غفور دادا سمیت اپنی پانچ اولادوں کے لیے لاکھوں روپے کا کاروبار اور جائداد چھوڑ کر گئے تھے۔ غفور دادا خود ذہین اور پڑھے لکھے تھے پھر والد سے کاروبار کی تربیت حاصل کی تھی اس

لیے جب عملی میدان میں قدم رکھا تو جلد اپنے بھائیوں سے آگے نکل گئے۔ انہوں نے بعد میں سونے اور جواہرات کا بزنس بھی کیا اور سونے کی ایک کان میں ان کے شیئرز تھے۔ غفور دادا کے چار بیٹے تھے جو کاروبار کے مختلف حصے دیکھتے تھے اور خود غفور دادا اب نگرانی کرتے تھے۔ ستر سال کی عمر میں وہ پوری طرح چاق و چوبند تھے۔ چاروں بیٹے شادی شدہ اور خود بچوں والے تھے۔ ان کے کئی پوتے پوتیاں جوانی کی حد تک پہنچ گئے تھے۔ یہ پورا خاندان جوہانسبرگ کے نواح میں ایک بڑے سے پیلس میں رہتا تھا۔ یہ ساری معلومات ریحانہ نے وقفے وقفے سے عظیم الدین کے گوش گزار کی تھیں۔

جوہانسبرگ ائرپورٹ پر غفور دادا کا ڈرائیور ایک بڑی سی وین کے ساتھ ان کا منتظر تھا۔ وین میں وہ سب مع اپنے سامان کے آ گئے تھے۔ وہ اس سے پہلے بھی ایک بار جنوبی افریقا آ چکے تھے جب یہاں کرکٹ ورلڈ کپ ہوا تھا لیکن بچے اس وقت چھوٹے تھے۔ شہباز چھ سال کا تھا اس لیے اسے تھوڑا بہت یاد تھا لیکن حمزہ اور آمنہ تو بالکل چھوٹے تھے اس لیے جنوبی افریقا ان کے لیے بالکل نیا ملک تھا۔ وہ سب آس پاس سے گزرتے مناظر کو دیکھ رہے تھے۔ آمنہ نے حیرت سے کہا۔ ”ماما! یہاں تو زیادہ بلیک ہیں۔ میں سمجھتی تھی کہ جنوبی افریقا میں گورے زیادہ ہوتے ہیں۔“

”یہاں اسّی فیصد بلیک ہیں۔ صرف دس فیصد گورے اور باقی سب کونٹیننٹ کے ہیں۔“ عظیم الدین نے پلٹ کر کہا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ڈرائیور پاکستانی تھا اور چند سال پہلے یہاں آیا تھا۔ اس نے انکشاف کرنے کے انداز میں کہا۔

”کالے بہت خطرناک ہوتے ہیں سر... جب سے ان کی حکومت آئی ہے انہوں نے لوٹ مار شروع کر رکھی ہے۔“

ریحانہ کچھ اور سمجھی۔ ”تمہارا مطلب کرپشن ہے؟“

”نہیں جی، میرا مطلب ہے یہاں اسٹریٹ کرائم بہت ہیں اور سب کالے کرتے ہیں۔ ان کا نشانہ زیادہ تر ایشین بنتے ہیں کیونکہ گورے بہت ہوشیار ہیں۔ وہ اپنے علاقے میں محدود رہتے ہیں اور اپنے پاس اسلحہ بھی رکھتے ہیں۔ ہم لوگ امن پسند ہیں اور پھر ہر جگہ رہتے اور پھرتے ہیں اس لیے آسانی سے نشانہ بن جاتے ہیں۔“

”ماما! ہم تو سمجھتے تھے کہ ہمارے ہاں ہی ایسا ہوتا ہے۔“ حمزہ بولا۔

”نہیں بابا، یہاں اس سے زیادہ ہوتا ہے لیکن بہت

ہوشیار لوگ ہیں۔ ادھر سیاح بہت آتے ہیں اس لیے ایسی خبریں دبا دیتے ہیں۔ ابھی دو دن پہلے تین ایشیائی تاجروں کو لوٹنے کے دوران مزاحمت پر گولی ماردی۔ دو مر گئے تیسرا اسپتال میں پڑا ہے۔"

ریحانہ اور عظیم الدین زیادہ فکر مند نہیں تھے کیونکہ وہ یہاں کچھ دن کے لیے آئے تھے اور انہیں صرف پوش علاقوں میں آنا جانا تھا۔ باقی جوہانسبرگ سے انہیں مطلب نہیں تھا۔ غفور دادا کا گھر واقعی محل جیسا تھا۔ عظیم الدین کا خیال تھا کہ وہ درمیانے درجے کے کاروباری ہوں گے لیکن ان کا پیلس دیکھ کر اس کا خیال بدل گیا۔ وہ ارب پتی لگ رہے تھے۔ پورچ میں غفور دادا، ان کے دو بیٹے، بہوئیں اور کچھ پوتی پوتے استقبال کے لیے موجود تھے۔ وہ اتنے پُرجوش طریقے سے ملے کہ ریحانہ اور عظیم الدین کو حیرت ہوئی۔ ان کی خوش اخلاقی اور ملنے جلنے سے لگ نہیں رہا تھا کہ وہ دولت مند طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ غفور پیلس میں بہت بڑا گیسٹ ہاؤس بھی تھا لیکن رشتے داری کی مناسبت سے ان کے لیے پیلس میں کمرے کھولے گئے تھے اور وہ وہیں ٹھہرے۔ پُرتکلف لنچ کے بعد انہوں نے آرام کیا اور شام کو چائے پر سارا خاندان جمع تھا۔ سب سے تعارف ہوا اور انہیں جان کر حیرت ہوئی کہ غفور دادا سب کے بارے میں بنیادی معلومات رکھتے تھے۔ مثلاً انہیں معلوم تھا کہ بچے کون سی کلاسز میں ہیں اور عظیم الدین کا بزنس کیسا چل رہا ہے۔

"ماشاء اللہ تم نے باپ کا بزنس بہت اچھے طریقے سے سنبھالا ہے اور مشکل حالات کے باوجود اسے ترقی بھی دی ہے۔"

غفور دادا حلیے سے صوم وصلوٰۃ کے پابند لگ رہے تھے۔ بڑی سی گھنی سفید داڑھی، ماتھے پر سجدے کا نشان اور سر پر ٹوپی۔ ان کے بچوں میں بھی مذہبی رجحان تھا۔ نوجوان نسل کپڑوں کے معاملے میں ذرا بے پروا تھی۔ مگر غفور دادا کی بہوئیں اچھے طریقے سے مشرقی لباس پہنتی تھیں۔ تقریباً سب ادب وآداب کا خیال رکھتے تھے۔ غفور دادا نے گھر کا ایک ماحول بنا رکھا تھا اور سب کو ان کے بنائے اصول وقواعد پر عمل کرنا پڑتا تھا۔ مگر یہ عمل جبر کے بجائے خود عملی سے سکھایا ہوا تھا۔ عظیم الدین اور ریحانہ نے دیکھا کہ انہیں اپنی اولاد کی کوئی بات غلط محسوس ہوتی تو وہ انہیں براہِ راست نہیں ٹوکتے تھے۔ یہ سب باتیں ایک طرف... عظیم الدین کو یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ غفور دادا خود کرکٹ میں بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ جوانی میں خود بھی کرکٹ کھیلی تھی اور بہت اچھی فاسٹ باؤلنگ کرتے تھے لیکن پھر کاروبار میں لگ گئے تو کرکٹ ایک طرف رہ گئی۔

"بالکل میری والی کہانی ہے۔" عظیم الدین نے ٹھنڈی سانس لی۔

اب غفور دادا دیکھنے کی حد تک شوقین تھے۔ اگر جوہانسبرگ یا آس پاس کوئی بین الاقوامی میچ ہوتا تو وہ لازمی دیکھنے جاتے تھے۔ اسی طرح وہ چند مقامی کلبز کے سرپرست تھے اور ان کے میچز بھی دیکھنے جاتے تھے۔ کرکٹ کے حوالے سے مقامی سطح پر غفور دادا کا نام تھا۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں شہر کی انتظامیہ نے انہیں شیلڈ بھی دی تھی۔ صرف کرکٹ نہیں، وہ فلاحی کاموں میں بھی پیش پیش رہتے تھے اور اس وجہ سے بھی مشہور تھے۔ غفور دادا نے آخری دو ون ڈے میچز کے ٹکٹ لے لیے تھے کیونکہ تیسرا ون ڈے جوہانسبرگ سے دور تھا اور ان دنوں ہی عظیم الدین کو بزنس میٹنگز اٹینڈ کرنا تھیں۔

آخری دو ون ڈے جوہانسبرگ اور اس کے پاس کے ایک شہر میں تھے۔ جوہانسبرگ والے ون ڈے کے لیے تو غفور دادا اور ان کی فیملی بھی جاتی البتہ آخری ون ڈے کے لیے عظیم الدین کی فیملی ہی جاتی۔ اس دن غفور دادا کے گھر ایک تقریب تھی اس لیے وہ اور ان کے گھر والے نہیں جا سکتے تھے۔ تقریب کے لیے مہمانوں کے لانے لے جانے کے لیے ڈرائیور کی ضرورت تھی اس لیے غفور دادا نے ایک گاڑی عظیم الدین کے حوالے کر دی اور ڈرائیور کے لیے معذرت کرلی تھی کہ اس کی گھر میں ضرورت تھی۔ عظیم الدین نے کہا۔ "نو پرابلم، میں جوہانسبرگ کے آس پاس گھوما ہوں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔"

"پھر بھی کوئی بات ہو تو فوراً مجھے کال کرنا اور ہوشیار رہنا۔ جوہانسبرگ کی حد تک تو امن رہتا ہے لیکن اس سے باہر نکلو اور کالوں کے علاقے میں جاؤ تو آدمی بہت ہوشیار رہے۔ یہاں اسٹریٹ کرائمز بہت زیادہ ہیں اور مجرم گولی چلانے میں دیر بھی نہیں کرتے۔ اگر ایسا کوئی موقع آئے تو سب کچھ ڈاکوؤں کے حوالے کر دینا اور بالکل بھی مزاحمت نہیں کرنا۔"

عظیم الدین نے غفور دادا کی تمام باتیں خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

غفور دادا نے ان کے لیے وی آئی پی ٹکٹس لیے اور عظیم الدین کے اصرار کے باوجود ان کی قیمت لینے سے انکار کر دیا تھا۔ میچ دن کا تھا اس لیے وہ صبح سویرے روانہ ہوگئے۔ شہر جہاں میچ تھا، جوہانسبرگ سے تیس میل کے فاصلے پر تھا۔ ایک گھنٹے کی ڈرائیو تھی۔ غفور دادا کے خانساماں نے لنچ اور ریفریشمنٹ کے لیے بہت کچھ ساتھ کر دیا تھا۔

"ماما! میں نے سنا ہے یہاں شیر اور چیتے بھی ہوتے ہیں۔" آمنہ نے پوچھا۔

"بے وقوف وہ سفاری میں ہوتے ہیں۔" حمزہ نے جل کر کہا۔ "یہ ہائی وے ہے۔"

"اکثر ہائی ویز سفاریوں کے درمیان سے گزرتی ہیں۔" عظیم الدین نے ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔ وہ جس جگہ سفر کر رہے تھے یہاں ہائی وے کے دونوں کناروں پر جنگل اور سفاری جیسا علاقہ نظر آ رہا تھا۔ جانوروں کو روکنے کے لیے ہائی وے کے دونوں طرف جنگلے لگے ہوئے تھے مگر ابھی تک انہیں کوئی شیر، چیتا یا اس قبیل کا جانور دکھائی نہیں دیا تھا۔ بعض جانور دکھائی دیے تھے جن کے بارے میں آمنہ کا خیال تھا کہ وہ چھوٹے شیر ہیں مگر حمزہ کا کہنا تھا کہ وہ اصل میں لکڑ بھگے ہیں مگر عظیم الدین نے بتایا کہ وہ اصل میں گیدڑ تھے۔

ہائی وے پر رش تھا اور یہ رش یقیناً کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے جانے والوں کی وجہ سے تھا۔ آمنہ اور حمزہ وقت گزاری کے لیے آپس میں لڑ رہے تھے لیکن جب ایک بار ریحانہ نے پلٹ کر دیکھا تو دونوں نے سمجھ لیا کہ اب بس کرنا چاہیے اس لیے وہ باہر کے مناظر دیکھنے لگے۔ اچانک ایک بڑے ٹائروں والی سیاہ اور سرمئی رنگ کی جیپ بہت تیزی سے ان کے پاس سے گزری۔ اگرچہ عظیم الدین بھی تقریباً اسی کلومیٹرز فی گھنٹا کی رفتار سے ڈرائیو کر رہا تھا لیکن گزرنے والی جیپ کی رفتار اس سے کہیں تیز تھی۔ پھر وہ اتنے پاس سے گزری تھی کہ واضح طور پر ان کی گاڑی ہل کر رہ گئی۔ عظیم الدین نے ناپسندیدگی ظاہر کرنے کے لیے تیز ہارن دیا۔ جیپ آگے نکل گئی تھی لیکن جیسے ہی عظیم الدین نے ہارن دیا، اس کی رفتار کم ہوئی اور دونوں گاڑیوں کے درمیان فاصلہ کم ہونے لگا۔ یہ دو کیبن والی سفاری جیپ تھی جس کے پیچھے کے کھلے حصے میں دو سیاہ فام نوجوان بیٹھے تھے۔ انہوں نے شوخ رنگوں والی پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ ایک نے سر پر مینڈھیاں گوندھ رکھی تھیں اور دوسرے نے کناروں سے مشین پھروا کر اوپر گھونسلا نما بال چھوڑ رکھے تھے۔ وہ اپنے حلیے اور انداز سے ہی بدمعاش لگ رہے تھے۔ جیپ اب ان کی گاڑی سے چند گز آگے تھی اور دونوں سیاہ فام انہیں خوفناک نظروں سے گھور رہے تھے۔ ریحانہ سہم گئی۔ اس نے کہا۔

"آپ کو کیا ضرورت تھی، ہارن دینے کی؟"

"تم نے ان کی حرکت دیکھی تھی؟" عظیم الدین غصے سے بولا۔

"یہ تو اپنے انداز سے بدمعاش لگ رہے ہیں۔" ریحانہ بولی۔ اس دوران میں اگلی گاڑی کی رفتار مسلسل کم ہو رہی تھی۔ اسی مناسبت سے عظیم الدین کو بھی رفتار کم کرنا پڑ رہی تھی۔ کچھ دیر میں دونوں گاڑیوں کی رفتار اتنی کم ہوگئی کہ وہ رینگنے پر آگئی تھیں اور ان کے آس پاس سے گاڑیاں تیزی سے گزر رہی تھیں۔ عظیم الدین نے ہارن دیا مگر جیپ سواروں کے کان پر جوں نہیں رینگی۔ اتنے نزدیک سے وہ دیکھ سکتے تھے کہ جیپ کے اندر بھی کئی افراد تھے اور یہ سب سیاہ فام تھے۔ یہ چھ لین کی ہائی وے تھی، یعنی ایک طرف تین لین میں گاڑیاں چل سکتی تھیں۔ عظیم الدین نے درمیان والی تیز لین پکڑی ہوئی تھی۔ اسے خطرہ محسوس ہوا کہ اتنی سست رفتاری سے ڈرائیو کرنے پر عقب سے آنے والی کوئی گاڑی اس کی گاڑی سے نہ ٹکرا جائے۔ ہائی وے پر ڈرائیو کرنے والے ڈرائیور عام طور سے ریلیکس ہو جاتے ہیں اور آس پاس کا اتنا خیال نہیں کرتے۔ وہ عقب پر نظر رکھتے ہوئے مسلسل ہارن دینے لگا۔

ایسا لگ رہا تھا کہ جیپ کے سوار اب شرارت پر آمادہ ہیں۔ وہ جیپ کی رفتار کو دس میل فی گھنٹا پر لے آئے تھے اور اب اسی رفتار سے چل رہے تھے۔ ریحانہ تو پریشان تھی، بچے بھی متوجہ ہوگئے۔ شہباز نے پیچھے سے کہا۔ "پاپا! کیا ہو رہا ہے؟"

"یہ لوگ شرارت کر رہے ہیں۔" عظیم الدین نے کہا اور چند گہری سانس لے کر خود پر قابو رکھا۔ "مگر فکر مت کرو، شرارت زیادہ دیر نہیں چل سکتی ہے۔"

مگر یہ عظیم الدین کا خیال تھا۔ دس منٹ گزر گئے اور وہ اسی رفتار سے رینگ رہے تھے۔ صبح کے نو بج چکے تھے اور میچ دس بجے شروع ہونا تھا۔ ابھی انہیں شہر پہنچ کر اسٹیڈیم بھی پہنچنا تھا۔ اسٹیڈیم میں داخل ہونے کا مرحلہ بھی تھا کیونکہ لوگ قطار بنا کر اندر جاتے تھے اور ان کی چیکنگ بھی ہوتی تھی۔ اس میں بھی خاصا وقت لگتا۔ حمزہ نے خدشہ ظاہر کیا۔ "پاپا! ہم اسی رفتار سے رینگتے رہے تو میچ شروع ہونے کے بعد ہی میدان میں پہنچ سکیں گے۔"

عظیم الدین کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو رہا تھا، اس نے سوچا اور گاڑی نکال لے جانے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت دائیں بائیں کی دونوں لین میں مسلسل گاڑیاں گزر رہی تھیں اور اوور ٹیک کرنا مشکل کام تھا۔ لیکن ایک بار جیسے ہی بائیں طرف کی

لین میں گاڑیوں کا سلسلہ ٹوٹا، عظیم الدین نے جیپ کو اوورٹیک کرنے کی کوشش کی۔ اس نے رفتار بڑھاتے ہوئے گاڑی نکال لے جانی چاہی لیکن جیپ نہایت خطرناک انداز میں دوبارہ سامنے آئی اور عظیم الدین نے بروقت بریک لگائے۔ گاڑی جھٹکے سے رکی۔ ان چاروں نے سیٹ بیلٹ باندھ رکھی تھیں اس لیے وہ محفوظ رہے لیکن شہباز ایسے ہی بیٹھا تھا، وہ لڑھک گیا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''پاپا! کیا ہوا؟''

عظیم الدین کا غصے سے برا حال ہو رہا تھا۔ اس نے مسلسل تیز ہارن دیا مگر جیپ والوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ پوری طرح خباثت پر اتر آئے تھے۔ اگر عظیم الدین بروقت بریک نہ لگاتا تو دونوں گاڑیاں آپس میں ٹکرا جاتیں۔ جیپ کا کچھ نہ بگڑتا کیونکہ اس کے عقب میں بھی مضبوط جالی لگی تھی مگر ان کی نازک قیمتی کار کا حشر ہو جاتا۔ بدقسمتی سے اب تک کوئی پٹرولنگ پولیس کار بھی دکھائی نہیں دی تھی۔ حالانکہ ہائی وے کے آغاز میں کئی دکھائی دی تھیں۔ عظیم الدین نے دانت پیسے۔ ''یہ لوگ اس طرح نہیں مانیں گے۔''

اس نے جیپ کو اوورٹیک کرنے کی مسلسل کوشش شروع کر دی۔ کبھی وہ دائیں طرف سے نکالنے کی کوشش کرتا اور کبھی بائیں طرف سے۔ اس کی گاڑی لہرا رہی تھی مگر جیپ سے آگے نہیں نکل پا رہی تھی۔ وہ بہت خطرناک انداز میں راستہ روک رہے تھے۔ انہیں دائیں بائیں لین سے گزرنے والی گاڑیوں کی پروا بھی نہیں تھی۔ کئی بار دوسری گاڑیاں تصادم سے بچنے کے لیے لہرائی تھیں۔ وہ ہارن دیتی گزر گئی تھیں۔ ریحانہ کا خوف سے برا حال تھا۔ وہ بار بار اس سے کہہ رہی تھی۔ ''پلیز! ان کے منہ نہ لگیں۔''

ایک بار اس نے کہا تو عظیم الدین بھنا گیا۔ ''تو کیا گاڑی ایک طرف روک کر کھڑی کر لوں؟''

''ہاں، یہی کریں۔'' ریحانہ بولی۔ ''یہ بدمعاش لگ رہے ہیں۔ اگر ان کے پاس ہتھیار ہوئے تو...''

اس بات نے عظیم الدین کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ہتھیار تو کیا بغیر ہتھیاروں کے بھی ان بدمعاشوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ پھر اس کے ساتھ بیوی بچے تھے۔ وہ ان کی ذات پر کوئی رسک نہیں لے سکتا تھا۔ اس کے پاس یہی سب سے بڑی دولت تھی۔ اس نے سر ہلایا اور گاڑی کو سڑک سے اتار کر بیلٹ پر روک دیا۔ اسی لمحے جیپ بھی ہائی وے سے اتر کر سائڈ بیلٹ پر آنے لگی۔ آمنہ ڈر کر بولی۔ ''پاپا! یہ بھی رک گئے ہیں۔ کہیں یہ ادھر نہ آ جائیں۔''

ادھر آمنہ کے منہ سے نکلا اور ادھر جیپ رکتے ہی اس میں سوار دونوں سیاہ فام چھلانگ لگا کر نیچے اترے اور جارحانہ انداز میں ان کی طرف بڑھے۔ ریحانہ گھبرا کر بولی۔ ''پلیز! یہاں سے چلیں۔''

عظیم الدین نے گاڑی کا انجن بند نہیں کیا تھا۔ گاڑی جدید ماڈل کی تھی اور اس کا انجن شاندار حالت میں تھا۔ اس کی آواز نہ ہونے کے برابر تھی اس لیے دور سے آتے سیاہ فاموں کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کی گاڑی اسٹارٹ ہے مگر اس نے گاڑی دوبارہ سڑک پر نہیں کی۔ اس کی نظر عقب میں آتی گاڑیوں پر مرکوز تھی۔ ریحانہ بار بار اسے چلنے کو کہہ رہی تھی مگر عظیم الدین سکون سے بیٹھا تھا۔ حمزہ نے بھی گھبرا کر باپ سے کہا۔ ''پاپا چلیں۔''

''پلیز! تم لوگ ایک منٹ کے لیے خاموش بیٹھو اور شہباز تم سیٹ بیلٹ باندھ لو۔''

شہباز نے جلدی سے سیٹ بیلٹ باندھ لی۔ جیپ کوئی تیس گز آگے رکی تھی اور دونوں سیاہ فام ابھی ان کی گاڑی سے پانچ چھ گز دور تھے کہ عظیم الدین نے اچانک گاڑی تیزی سے سڑک پر چڑھائی اور گیئر بدلتے ہوئے اسے تیسری لین کی طرف لے گیا۔ اس نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ آنے والی گاڑیوں میں خلا پیدا ہوا تھا۔ اس کے باوجود دوسری لین سے گزرنے والی ایک گاڑی تقریباً ان کی گاڑی کا پچھلا حصہ چھوتے ہوئے گزری تھی۔ ہائی وے تیز ہارنوں سے گونج اٹھی تھی۔ دونوں سیاہ فام پلٹ کر بھاگے۔ جیپ دور تھی اور وہ ان دونوں کے بغیر نہیں جا سکتے تھے اس لیے عظیم الدین کو موقع مل گیا۔ وہ گاڑی کو آگے نکال کر لے گیا۔ کچھ دیر بعد جیپ بھی پیچھے آنے لگی۔ عظیم الدین نے رفتار تیز کی۔ گاڑی کا پک اپ اچھا تھا اس لیے جیپ کوشش کے باوجود قریب نہیں آ رہی تھی۔ ویسے بھی وہ شہر کے پاس آ گئے تھے۔

ریحانہ بار بار پلٹ کر دیکھ رہی تھی، اس نے کہا۔ ''اگر یہ ہمارے پیچھے اسٹیڈیم تک پہنچ گئے تو؟''

''وہاں بہت لوگ ہوں گے اور سیکیورٹی بھی ہوگی اس لیے اگر یہ آ بھی گئے تو کچھ نہیں کر سکیں گے۔''

جیپ والوں نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ شہر میں ان کی طرف سے کسی حرکت کے نتیجے میں پولیس مداخلت کر سکتی ہے اس لیے انہوں نے تعاقب ترک کر دیا۔ کچھ دیر میں وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ عظیم الدین اور ریحانہ نے سکون کا سانس لیا۔ بچے بھی مطمئن ہو گئے۔ ساڑھے نو بجے وہ اسٹیڈیم کے باہر موجود تھے۔ یہاں پارکنگ میں بے شمار گاڑیاں تھیں۔ بڑی مشکل سے انہیں ایک جگہ ملی۔ [illegible]

رہے تھے کہ آمنہ نے کہا۔ ''پاپا! کولڈ ڈرنک تو ہے نہیں۔''

''کوئی بھی نہیں ہے۔'' شہباز نے آگاہ کیا۔ اس نے کھانے پینے کی ٹوکری اور آئس بکس پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔

''ٹھیک ہے، تم لوگ رکو... میں کولڈ ڈرنک لے کر آتا ہوں۔''

''پاپا! ہم اندر نہ چلے جائیں... اتنی دیر یہاں کیا کریں گے؟'' شہباز نے کہا۔

عظیم الدین نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ ہجوم دیکھ رہے ہو؟ تم لوگ مس ہو گئے تو میں تلاش نہیں کر سکوں گا۔ ہم ایک ساتھ اندر جائیں گے۔''

پارکنگ میں رضا کار لوگوں کی مدد کر رہے تھے اور گاڑیاں پارک کرا رہے تھے۔ عظیم الدین انہیں چھوڑ کر اس طرف آیا جہاں دور سے عارضی دکانیں نظر آ رہی تھیں۔ یہ دکانیں ٹینٹس میں قائم تھیں۔ یہاں کھانے پینے کی اشیا فروخت ہو رہی تھیں، وہ آئس بکس ساتھ لائے تھے۔ عظیم الدین نے کولڈ ڈرنکس کی چھوٹی بوتلیں اور کچھ چاکلیٹ لیں۔ سارا سامان شاپرز میں ڈلوا کر وہ واپس آ رہا تھا کہ اس کی نظر اسی سرمئی اور سیاہ جیپ پر گئی۔ وہ ان کی گاڑی کے بالکل پاس کھڑی تھی۔ عظیم الدین کچھ دور تھا اور راستے میں گاڑیوں اور لوگوں کا ہجوم بھی تھا اس لیے اسے واضح نظر نہیں آیا تھا لیکن اس جیپ کو اپنی گاڑی کے بالکل پاس دیکھ کر اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ ان کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک آ گئے تھے۔

عظیم الدین تیزی سے گاڑی کی طرف لپکا۔ جب وہ نزدیک آیا تو اس نے دیکھا ایک سیاہ فام نیلی شرٹ میں ملبوس کسی شخص کو جیپ میں دھکا دے رہا تھا۔ اس کے پیچھے وہ خود بھی جیپ میں سوار ہوا اور جیپ چل پڑی۔ عظیم الدین نے رفتار تیز کی۔ جب وہ گاڑی کے پاس پہنچا تو جیپ کے عقب میں سوار سیاہ فاموں نے اسے دیکھ لیا اور ایک نے ہوا میں انگلی بلند کر کے بے ہودہ اشارہ کیا اور جیپ گھوم کر باہر جانے والے راستے پر چلی گئی۔ تب عظیم الدین نے اپنی گاڑی دیکھی اور اسے جھٹکا لگا۔ گاڑی خالی تھی۔ اس میں ریحانہ، شہباز، حمزہ اور آمنہ کوئی نہیں تھا۔ فوراً ہی عظیم الدین کو خیال آیا کہ سیاہ فام اس کی فیملی کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔ اسے سیاہ فام یاد آیا جو نیلی شرٹ والے کو جیپ میں دھکا دے رہا تھا اور شہباز نے بھی نیلی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولنا چاہا تو وہ بند تھا اور تب اسے یاد آیا کہ وہ چابی تو گاڑی میں چھوڑ گیا تھا۔ اس نے جھک کر دیکھا اگنیشن میں چابی نہیں تھی۔ اسے اپنے تعاقب میں آنے سے روکنے کے لیے وہ گاڑی کی چابی ساتھ لے گئے تھے۔

''میرے خدا!'' اس نے سر تھام لیا۔ ''اب میں کیا کروں؟''

فوراً ہی اسے پولیس سے رابطے کا خیال آیا اور اس نے جلدی سے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کچھ ہی دور ایک پولیس مین ہجوم کو کنٹرول کرتا دکھائی دیا۔ عظیم الدین اس کی طرف لپکا۔ پولیس والا سفید فام تھا۔ عظیم الدین نے اس سے کہا۔ ''پلیز! میری مدد کرو۔ کچھ بدمعاش یہاں پارکنگ سے میرے بیوی بچوں کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔''

جرم کا سنتے ہی پولیس والا مستعد ہو گیا۔ ''کب اور کہاں یہ واقعہ پیش آیا؟''

''ابھی کچھ دیر پہلے، میں اپنے بیوی بچوں کو گاڑی میں چھوڑ کر کولڈ ڈرنکس لینے گیا تھا۔'' عظیم الدین نے اسے شاپر دکھایا۔ ''واپس آیا تو وہ بدمعاش میرے بیوی بچوں کو اپنی جیپ میں بٹھا چکے تھے۔ میں نے اپنے بیٹے کی جھلک دیکھی تھی۔''

''وہ کتنے لوگ تھے اور تم نے جیپ کا نمبر دیکھا؟''

عظیم الدین سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی نظر ہائی وے پر متعدد بار جیپ کی نمبر پلیٹ پر گئی تھی مگر اس نے نمبر پر غور نہیں کیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''مجھے پورا نمبر یاد نہیں ہے لیکن جے ایس ٹی کے ساتھ فورٹی ٹو تھا۔ اس سے آگے کے دو نمبر مجھے نہیں یاد۔''

پولیس والے نے اپنے واکی ٹاکی سیٹ پر اسٹیڈیم کی سیکیورٹی پر مامور پولیس کے کنٹرول سینٹر سے رابطہ کر کے یہ معلومات ان کو دیں اور پٹرولنگ پولیس سے مطلوبہ جیپ کو تلاش کرنے کو کہا۔ یہ کام کر کے اس نے عظیم الدین کو تسلی دی۔ ''فکر مت کرو۔ پولیس جلد انہیں تلاش کر لے گی۔ میں نے اطلاع کر دی ہے۔ کچھ دیر میں کوئی پولیس افسر یہاں آئے گا۔ وہی تمہارا کیس دیکھے گا۔''

یہ پولیس مین یہاں ڈیوٹی پر تھا اور وہ عظیم الدین کے لیے اتنا ہی کر سکتا تھا۔ اس کے پاس سوائے انتظار کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا لیکن اس پولیس والے کی مستعدی دیکھ کر اسے امید ہوئی تھی کہ دوسرے پولیس والے بھی اسی طرح مستعدی دکھائیں گے۔ ریحانہ اور بچوں کا سوچ کر اسے کچھ ہو رہا تھا۔ سیاہ فام صورت اور حلیے سے جرائم پیشہ لگتے تھے اور راستے میں ان کا رویہ بتا رہا تھا کہ وہ بلاوجہ دوسروں سے بیر پال لینے والے کینہ پرور لوگ تھے۔ تبھی وہ ان کے پیچھے پیچھے یہاں آئے اور موقع پا کر ریحانہ اور بچوں کو زبردستی اپنے ساتھ لے گئے۔ پریشانی کے عالم میں اسے غفور دادا کا خیال آیا۔ اس نے موبائل نکال کر انہیں کال کی اور واقعے کی

اطلاع دی تو وہ شاید اچھل پڑے۔

''میاں مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟''

''کیا میں آپ سے اتنا بے ہودہ مذاق کر سکتا ہوں؟'' اس نے خفگی سے کہا۔ ''وہ بھی اپنے بیوی بچوں کے حوالے سے؟ آپ کو نہیں پتا اس وقت میری کیا حالت ہو رہی ہے۔''

''اچھا اچھا... میاں پریشان مت ہو، میں آتا ہوں۔''

عظیم الدین نے موبائل بند کیا۔ اسی اثنا میں ایک پولیس افسر وہاں آیا۔ اس نے ڈیوٹی پر موجود پولیس مین سے پوچھا تو اس نے عظیم الدین کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اس کے پاس آیا اور اپنا تعارف کرایا۔ ''مجھے انسپکٹر کلین جارج کہتے ہیں۔''

''عظیم الدین۔'' اس نے انسپکٹر سے ہاتھ ملایا۔

''اب تم مجھے پورا واقعہ سناؤ۔''

عظیم الدین نے تفصیل سے بتایا کہ کس طرح ان سیاہ فاموں نے راستے میں جیپ کی مدد سے ان کا راستہ روکا اور جب وہ ان کو چکر دے کر آگے نکل گیا تو وہ اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آئے۔ راستے میں بھی انہوں نے جارحانہ رویہ اختیار کیا تھا۔ ''اس وجہ سے مجھے یقین ہے کہ وہ میرے بیوی بچوں کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔''

عظیم الدین انسپکٹر کو اپنی گاڑی تک لایا۔ ''میں انہیں یہاں چھوڑ کر گیا تھا اور میں نے کہا تھا کہ ساتھ اندر چلیں گے ورنہ ہجوم میں کھو سکتے ہیں۔''

انسپکٹر کلین اسے کچھ دور ایک بڑے خیمے میں بنے پولیس کنٹرول سینٹر تک لایا۔ وہ میچ کے دوران پولیس سیکیورٹی کا انچارج تھا۔ چونکہ یہ واردات اس کی حد میں ہوئی تھی، اس لیے وہ خود اس کیس کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے عظیم الدین سے جیپ کے بارے میں مزید معلومات دریافت کیں اور پھر ریڈیو پر پٹرولنگ پارٹیوں کو اس کے بارے میں بتایا۔ عظیم الدین نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ غیر ملکی ہے اور پاکستان سے آیا ہے لیکن انسپکٹر کلین نے اس پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ ان کے علاقے میں ایک ممکنہ جرم ہوا تھا اور وہ اس کی تحقیق کر رہے تھے۔ البتہ اس نے گاڑی کے بارے میں پوچھا کہ وہ کس کی ہے۔ عظیم الدین نے بتایا کہ یہ گاڑی اس کے میزبان کی ہے۔ انسپکٹر کلین نے ایک طرف رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم وہاں بیٹھو، پولیس تمہارے بیوی بچوں کو بازیاب کرانے کی پوری کوشش کرے گی۔''

اس دوران میں میدان کی طرف سے آنے والا تماشائیوں کا شور بتا رہا تھا کہ وہاں کھیل کا آغاز ہو گیا تھا مگر عظیم الدین کے ذہن میں کہیں دور دور تک کرکٹ کا خیال نہیں تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے لیے بے چین تھا۔ آخر سیاہ فام انہیں کیوں لے گئے تھے؟ کیا وہ صرف بدلہ لینا چاہتے تھے یا پھر انہوں نے رقم کے لیے یہ جرم کیا تھا؟ اس نے انسپکٹر کلین سے اس بارے میں پوچھا۔ ''کیا یہاں تاوان کے لیے لوگوں کو اغوا کیا جاتا ہے؟''

''ممکن ہے ان لوگوں کا مقصد تاوان حاصل کرنا ہو۔ تم جس گاڑی میں سفر کر رہے تھے، وہ خاصی قیمتی ہے۔ اس سے وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ تم دولت مند ہو اور انہوں نے تاوان حاصل کرنے کے لیے یہ جرم کیا ہو۔ یہاں اغوا برائے تاوان کی وارداتیں ہوتی ہیں کیونکہ یہاں ارب پتی لوگ رہتے ہیں۔ دوسری طرف غربت کا تناسب بھی خاصا زیادہ ہے۔ اس لیے جرائم کا تناسب زیادہ ہے۔''

یہاں صرف عظیم الدین کے پاس موبائل تھا۔ ریحانہ کے پاس بھی موبائل تھا لیکن وہ آتے ہوئے ساتھ لینا بھول گئی تھی۔ شہباز کے پاس موبائل تھا مگر وہ اسے کراچی چھوڑ آیا تھا۔ حمزہ اور آمنہ کے پاس موبائل نہیں تھے۔ عظیم الدین پاکستان سے موبائل ساتھ لایا تھا اور اس نے یہاں کے لیے رومنگ کرالی تھی۔ ریحانہ یہ نمبر جانتی تھی۔ اگر سیاہ فاموں نے اسے اور بچوں کو تاوان کے لیے اغوا کیا تھا تو جلد یا بدیر ان کی طرف سے کال آتی۔ اس کے پاس انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا یا پھر پولیس سیاہ فاموں کی جیپ تلاش کر لیتی۔ انسپکٹر کلین وقفے وقفے سے ریڈیو پر رپورٹ لے رہا تھا لیکن اب تک کہیں سے مذکورہ جیپ نظر آنے کی اطلاع نہیں ملی تھی۔ کنٹرول سینٹر میں سیکیورٹی کے آلات کے ساتھ ایک بڑی اسکرین والا ایل سی ڈی ٹی وی لگا تھا جس پر میدان کے مختلف حصے دکھائے جا رہے تھے اور اسکرین مختلف حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک حصے میں میچ بھی آ رہا تھا۔

عظیم الدین کے اندر ایک ابال سا اٹھ رہا تھا۔ رہ رہ کر اس کی نظروں میں ریحانہ اور بچوں کے چہرے گھوم رہے تھے۔ ریحانہ تقریباً چھتیس برس کی بہت خوب صورت اور نازک اندام عورت تھی۔ عظیم الدین کے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا، کہیں اغوا کرنے والے اس کے ساتھ کوئی برا سلوک نہ کریں۔ کہیں وہ اس کی عزت کو نقصان نہ پہنچا دیں۔ یہ خیال آتے ہی وہ گھبرا کر کرسی سے اٹھ گیا۔ انسپکٹر کلین جو کاغذی مگ میں چائے پی رہا تھا، اس نے سوالیہ نظروں سے عظیم الدین کی طرف دیکھا۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا۔ ''مجھے اپنے بیوی بچوں کا خیال آ رہا ہے۔ کہیں وہ ان کے ساتھ برا سلوک نہ کر رہے ہوں۔''

''بہتری کی امید رکھو۔'' انسپکٹر نے اسے تسلی دی اور پھر چائے کا مگ لے آیا۔ ''چائے پیو اور اپنے اعصاب کو پرسکون رکھو۔ پریشان ہونے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا ہے، پولیس پوری کوشش کر رہی ہے۔''

یہ تو عظیم الدین بھی دیکھ رہا تھا کہ مقامی پولیس پوری کوشش کر رہی تھی حالانکہ اس نے زبانی رپورٹ کی تھی اور اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا کہ مذکورہ جیپ کے سیاہ فاموں نے اس کے بیوی بچوں کو اغوا کیا ہے۔ ہر پانچ چھ منٹ بعد کہیں نہ کہیں سے رپورٹ آ رہی تھی مگر یہ رپورٹ منفی ہوتی تھی، یعنی اب تک مذکورہ حلیے کی جیپ کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ کچھ دیر بعد عظیم الدین کے موبائل کی بیل بجی۔ اس نے جلدی سے نکال کر دیکھا، اس کا خیال تھا شاید اس کے بیوی بچوں کی کوئی خبر ہو یا اغوا کرنے والوں نے کال کی ہو لیکن غفور دادا کا نمبر دیکھ کر اسے کسی قدر مایوسی ہوئی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ''میاں عظیم الدین کہاں ہو؟''

غفور دادا بہت تیزی سے آئے تھے۔ عظیم الدین نے انہیں آدھ گھنٹا پہلے کال کی تھی۔ اس نے انسپکٹر کلین سے پوچھ کر غفور دادا کو سمجھایا کہ انہیں کہاں آنا ہے۔ انسپکٹر کلین نے ان کے بارے میں پوچھا تو عظیم الدین نے جواب دیا۔ ''یہ میرے مقامی میزبان ہیں۔ میں انہی کی گاڑی استعمال کر رہا ہوں اور انہی کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔''

غفور دادا آئے۔ کیونکہ وہ غیر متعلقہ تھے اس لیے انہیں اندر آنے کی اجازت نہیں ملی۔ عظیم الدین اور انسپکٹر کلین ان سے باہر ملے۔ انسپکٹر کلین ان سے کچھ سوالات کر کے اندر چلا گیا۔ غفور دادا نے عظیم الدین کو تسلی دی۔ ''تم فکر مت کرو، یہاں پولیس مستعد ہے۔ وہ جلد انہیں تلاش کر لے گی۔''

''تب تک ان لوگوں پر پتا نہیں کیا گزرے؟''

عظیم الدین کو ریحانہ کے ساتھ شہباز کا خیال بھی تھا۔ وہ غصے کا ذرا تیز تھا۔ اگر کوئی ریحانہ کے ساتھ بدتمیزی کرتا تو وہ برداشت نہیں کرتا۔ غفور دادا کے آنے سے یہ فائدہ ہوا کہ اس کا ذہن بٹ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ غفور دادا آتے ہی ادھر ادھر فون ملائیں گے اور کسی اعلیٰ شخصیت سے بات کریں گے کہ ان کے عزیزوں کو بازیاب کرایا جائے لیکن انہوں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ اس کے ساتھ رہے۔ اسے تسلی اور حوصلہ دیتے رہے۔ میدان کی طرف سے وقفے وقفے سے شور کی آواز بلند ہوتی تھی۔ میچ جاری تھا۔ پاکستان بیٹنگ کر رہا تھا۔ اوپنر نے اچھا آغاز کیا تھا۔ اس کا اندازہ وہاں موجود پولیس والوں کی مایوس آوازوں سے ہو رہا تھا جو وہ ہر چوکے یا رنز اسکور پر نکالتے تھے۔ غفور دادا، عظیم الدین کی کیفیت سمجھ رہے تھے۔ وہ نزدیکی اسٹال سے انرجی ڈرنک لے آئے۔ عظیم الدین نے انکار کیا۔

''آپ سوچیں اس صورتِ حال میں مجھ سے کچھ پیا جائے گا؟''

''میں سمجھتا ہوں۔'' وہ بولے۔ ''لیکن اس سے ذہن بنتا ہے اور جسم کو بہرحال خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔''

غفور دادا کے اصرار پر عظیم الدین نے انرجی ڈرنک لے لی اور اسے پی کر اس نے سچ مچ خود کو بہتر محسوس کیا۔ کچھ دیر بعد انسپکٹر کلین نے اندر سے جھانک کر عظیم الدین اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے خیمے کے اندر آیا۔ ''کیا ہوا انسپکٹر؟''

''شہر کے جنوبی حصے میں اس جیپ کے بارے میں اطلاع آئی ہے۔ ایک سی سی ٹی وی کیمرے میں دکھائی دی ہے اور اب پولیس وہاں اسے تلاش کر رہی ہے۔''

عظیم الدین کا دل دھڑک اٹھا۔ پون گھنٹے بعد یہ پہلی اچھی خبر تھی۔ اس نے خیمے سے باہر جھانک کر غفور دادا کو اطلاع دی۔ وہ خوش ہو گئے۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ یہاں پولیس بہت تیز ہے۔''

وہ اندر آیا۔ اتنی دیر میں انسپکٹر کلین نے سی سی ٹی وی کیمرے کی فوٹیج منگوا لی تھی۔ جیسے ہی اس نے اسے بڑی اسکرین پر چلایا، عظیم الدین اچھل پڑا کیونکہ یہ وہی جیپ تھی۔ اس کی سب سے بڑی نشانی اس کے پچھلے حصے پر ایک ڈینٹ کا نشان تھا اور یہ نشان فوٹیج میں نمایاں تھا۔ ''یہ وہی جیپ ہے۔''

فوٹیج میں اس کا نمبر نمایاں تھا اس لیے اب اسے نمبر کے حوالے سے بھی تلاش کیا جا رہا تھا۔ جیپ کو صرف دس منٹ پہلے دس بج کر دس منٹ پر دیکھا گیا تھا اور اب پولیس اسے اس علاقے میں تلاش کر رہی تھی۔ اس علاقے میں لگے تمام ہی سی سی ٹی وی کیمروں کی نگرانی کی جا رہی تھی مگر جیپ دوبارہ کسی کیمرے میں دکھائی نہیں دی تھی۔ انسپکٹر کلین نے ایک طرف لگے شہر کے بڑے نقشے پر انگلی رکھی۔ ''جیپ اس علاقے میں ہے اور یہ یہاں سے باہر نکلے گی تو فوراً نظر میں آ جائے گی۔''

عظیم الدین دیکھ سکتا تھا کہ یہ علاقہ پوش تھا۔ نقشے میں عمارتوں کی وضاحت بھی تھی۔ یہاں زیادہ تر بینک اور کمرشل عمارتیں تھیں۔ انسپکٹر کلین سوچ میں تھا۔ اس نے عظیم الدین

کی طرف دیکھا۔ ”اگر انہوں نے تمہارے بیوی بچوں کو اغوا کیا ہے تو انہیں اس علاقے میں رکھنا خطرناک ہوسکتا ہے۔“

”ممکن ہے جیپ انہیں کہیں اور چھوڑ چکی ہو۔“ عظیم الدین نے کہا۔

”ہوسکتا ہے۔ لیکن اتنی سمجھ تو ان کو بھی ہوگی کہ پولیس ان کی تلاش شروع کرچکی ہوگی۔ اس کے باوجود یہ اتنی بے خوفی سے گھوم رہے ہیں۔“

عظیم الدین کی سمجھ میں انسپکٹر کلین کی بات آرہی تھی مگر اسے مجرموں کے یوں گھومنے پھرنے سے زیادہ اپنے بیوی بچوں کی فکر تھی۔ پھر اسے خیال آیا کہ اگر یہ صورتِ حال اپنے ملک میں پیش آئی ہوتی تو اب تک وہ تھانے میں رپورٹ ہی کرا رہا ہوتا اور پولیس کسی صورت اس طرح اس کے بیوی بچوں کو تلاش نہیں کرتی۔ روایتی طریقے سے تفتیش کی جاتی اور اس کا نتیجہ ہمیشہ کی طرح صفر نکلتا۔ انسپکٹر کلین کی کال آئی تو وہ سننے چلا گیا۔ عظیم الدین کے کان اسی کی طرف لگے تھے مگر جب اس نے کسی بینک ڈکیتی کا ذکر کیا تو اسے مایوسی ہوئی..... ظاہر ہے کسی بینک ڈکیتی سے اس کے بیوی بچوں کو لے جانے والوں کا کیا تعلق ہوسکتا تھا۔ مگر جب انسپکٹر کلین کال سن کر آیا تو اس کے چہرے پر جوش تھا۔ اس نے کہا۔ ”میرا خیال ہے مجرم ٹریس ہوگئے ہیں۔ پولیس کو یہ جیپ ایک بینک کے باہر ملی اور جب وہ جیپ کے پاس آئے تو اندر موجود مجرموں نے پولیس کو دیکھ کر بینک والوں کو یرغمال بنالیا ہے۔“

”کیا میرے بیوی بچے بھی وہاں ہیں؟“

”جیپ خالی ہے لیکن بینک کے اندر کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا۔ فی الحال پولیس نے وہاں محاصرہ کرلیا ہے۔“

عظیم الدین بے چین ہوگیا۔ ”کیا ہم وہاں نہیں جا سکتے؟“

”میری ڈیوٹی یہاں ہے۔“ انسپکٹر کلین نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں یہاں سے نہیں جاسکتا۔“

انسپکٹر نے یہ اضافی ذمے داری سنبھال لی تھی اور کنٹرول سینٹر میں رہتے ہوئے عظیم الدین کے بیوی بچوں کی تلاش کررہا تھا۔ وہ بینک کا محاصرہ کیے ہوئے پولیس والوں سے مسلسل رابطے میں تھا۔ عظیم الدین نے باہر آکر غفور دادا کو صورتِ حال سے آگاہ کرکے پوچھا۔ ”کیا ہم خود وہاں نہیں جاسکتے؟“

”نہیں، اوّل تو پولیس اپنے کام میں مداخلت پسند نہیں کرے گی، دوسرے ہمیں ایک حد سے آگے نہیں جانے دیا جائے گا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہاں ہمیں کوئی صورتِ حال بتانے والا نہیں ہوگا۔ یہاں انسپکٹر تمہیں صورتِ حال بتا رہا ہے۔“

بات عظیم الدین کی سمجھ میں آگئی اور وہ دل پر جبر کرکے واپس انسپکٹر کلین کے پاس آیا جو بینک کا محاصرہ کیے پولیس کے سربراہ سے رابطے میں تھا۔ اس نے عظیم الدین کو بتایا۔ ”بینک میں تقریباً دو درجن افراد موجود ہیں لیکن یہ قبل از وقت ہوگا کہ ان میں تمہارے بیوی بچے ہیں یا نہیں۔“

پولیس والے ڈاکوؤں سے مذاکرات کررہے تھے کہ وہ یرغمالیوں کو چھوڑ کر خود کو پولیس کے حوالے کردیں۔ عظیم الدین نے پوچھا۔ ”اگر انہوں نے یرغمالی نہ چھوڑے اور خود کو پولیس کے حوالے نہ کیا تو؟“

انسپکٹر کلین نے شانے اچکائے۔ ”اس صورت میں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن امید ہے کہ وہ یرغمالیوں کو چھوڑ کر خود کو پولیس کے حوالے کردیں گے۔“

مگر اس کا بھی امکان تھا کہ ڈاکو ایسا نہ کریں اور اس صورت میں پولیس ریڈ کرتی۔ دونوں طرف سے گولیاں چلتیں اور نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اس میں کون بچے گا اور کون مارا جائے گا۔ بے خیالی میں سوچتے ہوئے وہ کرکٹ والی اسکرین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس وقت پاکستان کی پہلی وکٹ گری تھی اور جنوبی افریقا کے تماشائی پہلی بار جوش میں نظر آئے تھے۔ اب تک اوپنر اچھی بیٹنگ کررہے تھے اور اسٹیڈیم میں پاکستانی شائقین پاکستانی پرچم لہرا رہے تھے۔ اب جنوبی افریقا کے پرچم لہرانے لگے تھے۔ پولیس والے جوش سے اچھل پڑے مگر عظیم الدین کا ذہن کھیل کی طرف نہیں تھا۔ دس چالیس پر کال آئی۔ انسپکٹر کلین نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے آنے والی رپورٹ سنتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، انہیں یہاں لے آؤ۔ ان کی شناخت بھی ہونی ہے۔“

عظیم الدین اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے پاس آگیا۔ جیسے ہی اس نے ریسیور رکھا، اس نے بے تابی سے پوچھا۔ ”کیا وہ پکڑے گئے ہیں..... میرے بیوی بچے مل گئے ہیں؟“

انسپکٹر کلین نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ڈاکوؤں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں مگر بینک سے ملنے والے افراد میں کوئی ایشیائی عورت اور تین بچے نہیں ہیں۔ میں نے پکڑے جانے والے افراد کو یہاں بلوایا ہے۔ تم ان کو شناخت کروگے، اس کے بعد ہم آگے کارروائی کریں گے۔“

عظیم الدین کا دل ڈوبنے لگا۔ اگر اس کے بیوی بچے وہاں نہیں ملے تھے تو اس کا مطلب ہے کہ انہیں کہیں اور لے جایا گیا تھا۔ مگر ایک اچھی بات یہ تھی کہ اس جیپ کے کچھ افراد پکڑے گئے تھے۔ وہ یہاں آرہے تھے۔ بیوی بچوں کے بارے میں کوئی خبر نہ پاکر عظیم الدین پیلا پڑ گیا۔ انسپکٹر کلین نے اسے ہمدردی سے دیکھا مگر وہ اس سے زیادہ کیا کرسکتا تھا۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد پولیس کی گاڑیوں میں گرفتار ہونے والے پانچ افراد وہاں پہنچ گئے۔ ان سب کو ہتھکڑیاں لگائی گئی تھیں۔ ان میں دو وہ بھی تھے جو جیپ کے پچھلے حصے میں سوار تھے اور عظیم الدین انہیں..... پہچانتا تھا۔ اس نے بے ساختہ کہا۔

”یہی ہیں..... ان سے پوچھو، میرے بیوی بچے کہاں ہیں۔“ اس نے آگے بڑھ کر مینڈھیوں والے کا گریبان پکڑ لیا۔ ”کہاں ہیں میرے بیوی بچے..... بولو؟“

سیاہ فام نے جھٹکا دے کر اپنا گریبان چھڑا لیا اور بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”کون سے بیوی بچے..... میں نہیں جانتا۔“

”ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے کسی عورت اور اس کے بچوں کو اغوا نہیں کیا۔“ سیاہ فاموں کو لانے والے ایک پولیس افسر نے کہا۔

عظیم الدین چلّا اٹھا۔ ”جھوٹ بولتے ہیں یہ۔ یہی میرے بیوی بچوں کو اغوا کرکے لے گئے تھے۔“

”ایک منٹ مسٹر۔“ انسپکٹر کلین نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”مجھے ان سے بات کرنے دو۔“ وہ سیاہ فاموں کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تم لوگوں نے ہائی وے پر اس کو ہراساں نہیں کیا تھا؟“

”یہ جھوٹ بولتا ہے۔“ کھڑے بالوں والا ڈھٹائی سے بولا۔ ”آج ہم ہائی وے پر نہیں گئے تھے۔ ہم نے اسے دیکھا تک نہیں۔“

عظیم الدین کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان لوگوں کا گلا دبا کر ریحانہ اور بچوں کا پوچھتا۔ اس نے پھر کہا۔ ”جھوٹ یہ بول رہے ہیں۔ یہ مسلسل ہمارا پیچھا کرتے رہے، ان کی وجہ سے ہماری گاڑی کو حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا اور یہ یہاں آئے جب میں گاڑی سے دور تھا۔ میں نے خود دیکھا کہ یہ میرے بیٹے کو زبردستی جیپ میں بٹھا رہے تھے۔“ کہتے ہوئے عظیم الدین کی نظر ایک مجرم پر گئی۔ اس نے بالکل ویسی نیلی شرٹ پہن رکھی تھی جیسی شہباز نے پہن رکھی تھی۔ انسپکٹر کلین ان کو کڑے تیوروں سے گھور رہا تھا، اس نے کہا۔

”سوچ لو اگر تمہارا جواب غلط ہوا تو اغوا کا کیس بھی ہو گا۔ بینک ڈکیتی کا کیس تو ہے ہی..... تم لوگ پندرہ سے بیس سال کے لیے جیل جاؤ گے۔“

”میں کہہ چکا ہوں کہ ہم اسے نہیں جانتے اور نہ ہی آج ہم ہائی وے پر گئے تھے۔“

انسپکٹر کلین نے کہا۔ ”اس کا پتا چل جائے گا جب ہائی وے پر لگے کیمروں کو چیک کیا جائے گا۔“

یہ سن کر وہ سب فکر مند نظر آنے لگے۔ پھر کھڑے بالوں والا ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”ہم نے غلط بیانی کی ہے۔ آج ہم ہائی وے پر گئے تھے اور ان لوگوں کو تنگ بھی کیا تھا لیکن ہم نے انہیں نقصان نہیں پہنچایا اور نہ ہی اس کے بیوی بچوں کو دیکھا یا اغوا کیا ہے۔“

”تب تم اسٹیڈیم کی پارکنگ میں کیا کررہے تھے، ان کی گاڑی کے پاس؟“

”یہ اتفاق تھا۔ ہم یہاں اپنے اس ساتھی کو لینے آئے تھے۔“ کھڑے بالوں والے نے نیلی شرٹ والے کی طرف اشارہ کیا۔ ”ہم نے اسے دیکھا تھا مگر میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ہم نے اس کے بیوی بچوں کو نہیں دیکھا۔“

”یہ جھوٹ کہہ رہے ہیں۔ اگر تم نے اغوا نہیں کیا تو پھر وہ کہاں گئے؟“ عظیم الدین بولا۔

وہ سب خاموش رہے۔ انسپکٹر کلین نے انہیں وہاں سے لے جانے کا اشارہ کیا اور پولیس والے انہیں لے گئے۔ عظیم الدین نے سر تھام لیا۔ انسپکٹر کلین نے اسے تسلی دی۔ ”ہم کوشش کررہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ جلد مل جائیں گے۔“

”انہوں نے انہیں کہیں اور رکھا ہوگا۔“ عظیم الدین بولا۔

”اگر ایسا ہے تو اس کا بھی پتا چل جائے گا۔“ انسپکٹر کلین نے کہا۔ ”تم نے جن پر شبہ کیا تھا، وہ پکڑے جاچکے ہیں اور اب ہمارا کام تمہارے بیوی بچوں کو تلاش کرنا ہے۔ اب تم جاؤ اور جیسے ہی کوئی پیش رفت ہوئی، ہم تم سے رابطہ کریں گے۔ مجھے اپنا اور اپنے میزبان کا کونٹیکٹ نمبر دے دو۔“

عظیم الدین نے اسے اپنے اور غفور دادا کے نمبرز دیے اور باہر جانے لگا تھا کہ میدان سے شور بلند ہوا۔ نئے آنے والے کھلاڑی نے چھکا لگایا تھا۔ عظیم الدین کی نظر بے ساختہ اسکرین کی طرف گئی۔ کیمرا تماشائیوں کا جوش و خروش دکھا رہا تھا۔ چند لمحے کے لیے وی آئی پی انکلوژر بھی دکھایا گیا اور عظیم الدین کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا کیونکہ وہاں ریحانہ، آمنہ اور حمزہ دکھائی دیے تھے، بس شہباز نہیں تھا۔ وہ

منجمد ہو گیا اور اس کے تاثرات نے انسپکٹر کلین کو بھی چونکا دیا۔ ”مسٹر عظیم! خیریت ہے نا؟“

وہ چونکا اور مضطرب لہجے میں بولا۔ ”میری بیوی بچے...“

”میں نے کہا نا پولیس انہیں تلاش کرنے کی پوری کوشش کرے گی۔“ انسپکٹر کلین نے کسی قدر ناگواری سے کہا۔

”نہیں، وہ اسٹیڈیم میں موجود ہیں۔ ابھی میں نے اسکرین پر دیکھا ہے۔ وی آئی پی انکلوژر میں میری بیوی، ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔“

انسپکٹر کلین کھڑا ہو گیا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“

غفور دادا باہر نہیں تھے، شاید وہ اپنی گاڑی کی طرف چلے گئے تھے۔ وہ تیزی سے اسٹیڈیم میں داخل ہونے والے گیٹ پر آئے۔ عظیم الدین کے پاس ٹکٹ نہیں تھا۔ اس کا ٹکٹ بلکہ سارے ٹکٹ ریحانہ کے پاس تھے۔ اگر انسپکٹر کلین ساتھ نہ ہوتا تو گیٹ کیپر اسے اندر بھی نہ جانے دیتا۔ وہ اندر داخل ہوئے پھر وی آئی پی انکلوژر میں آئے۔ عظیم الدین نے دور سے ریحانہ اور بچوں کو دیکھ لیا تھا۔ شہباز ان کے ساتھ نہیں تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر ان کے پاس پہنچ جائے۔ وہ تقریباً بھاگتا ہوا وہاں پہنچا تو پہلے ریحانہ نے اسے دیکھا اور اس کے پریشان چہرے پر برہمی نمودار ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، ریحانہ اس پر برس پڑی۔ ”کہاں رہ گئے تھے آپ؟ بیوی بچوں کی ذرا بھی فکر نہیں ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے سے ہم پریشان ہو رہے ہیں۔ شہباز بے چارہ اندر باہر کے تین چکر لگا چکا ہے اور پھر آپ کی تلاش میں گیا ہے۔“

عظیم الدین کو بھی غصہ آ گیا، وہ خفگی سے بولا۔ ”میں غائب ہوا تھا یا تم لوگ غائب تھے؟ میں نے کہا تھا میرے آنے تک گاڑی میں رہنا۔“

”انتظامیہ کے ایک آدمی نے گاڑی خالی کرنے کو کہا تھا۔ یہاں گاڑی کھڑی کر کے اس میں بیٹھے رہنے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ کچھ سن بھی نہیں رہا تھا، مجبوراً ہم سامان سمیت اتر آئے اور پھر لائن میں لگ گئے۔ آپ واپس آئے، شہباز آپ کو اشارہ کر رہا تھا اور آوازیں دے رہا تھا... آپ نے سنا ہی نہیں۔“

”وہ میرے پاس آ سکتا تھا۔“

”کیسے آتا؟ سب سے آگے میں تھی اور ٹکٹ میرے پاس تھے۔ وہ لائن سے نکل جاتا تو اسے دوبارہ بہت پیچھے جگہ ملتی اور بغیر ٹکٹ کے وہ اندر کیسے آتا؟ اسی پریشانی میں ہم اندر پہنچ گئے۔ سامان رکھ کر شہباز ٹکٹ لے کر آپ کو تلاش کرنے گیا۔ آپ نہیں ملے تو دوبارہ آیا اور ہمیں بتا کر پھر گیا۔“

”وہ مجھے موبائل پر کال کر سکتا تھا۔“ عظیم الدین کا غصہ اور بڑھ گیا۔ ”حد ہوتی ہے بے وقوفی کی۔“

”کیسے کرتا، اسے کیا معلوم کہ یہاں کال کہاں سے کرتے ہیں۔“ ریحانہ بولی۔ ”سب چھوڑیں، یہ بتائیں کہ آپ کہاں تھے؟“

اس سوال پر عظیم الدین کا غصہ ہوا ہو گیا کیونکہ اب اسے اپنی حماقت کا بتانا پڑتا اور ریحانہ اسے مزید ستاتی۔ اسی لمحے ہانپتا ہوا شہباز آ گیا۔ ”پاپا! کہاں رہ گئے تھے؟ میں نے پورا اسٹیڈیم اور آس پاس چھان مارا۔“

”میں...“ عظیم الدین نے کہتے ہوئے بے چارگی سے انسپکٹر کلین کی طرف دیکھا جو مسکرا رہا تھا۔ وہ اردو سے ناواقف تھا لیکن سمجھتا تھا کہ عظیم الدین کی کھنچائی ہو رہی ہے۔ اچانک عظیم الدین کو خیال آیا۔ ”تم لوگ رکو، میں آ کر بتاتا ہوں۔ باہر غفور دادا بھی آئے ہوئے ہیں۔“

ریحانہ اور بچوں کے لیے یہ بھی ایک اطلاع تھی مگر وہ انہیں مزید سوالات کا موقع دیے بغیر انسپکٹر کلین کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ راستے میں اس نے عظیم الدین سے کہا۔ ”میرا خیال ہے اب کوئی مسئلہ نہیں ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے شرمندگی سے کہا اور پھر انسپکٹر کو ساری بات بتائی۔ وہ مسکرانے لگا۔

”اچھا ہوا ہم بھی زحمت سے بچ گئے۔“ انسپکٹر کلین نے باہر آ کر اس سے ہاتھ ملایا۔

”انسپکٹر! میں سچ مچ تمہارا شکر گزار ہوں۔“

”ویلکم اینڈ گڈ لک۔“

انسپکٹر کے جانے کے بعد اس نے غفور دادا کو تلاش کیا اور جب انہیں اصل صورت حال کا علم ہوا تو ان کا منہ کھلا رہ گیا۔ انہوں نے کہا۔ ”میاں تم نے تو دوڑ لگوا دی۔“

عظیم الدین شرمندہ ہو گیا۔ ”بس کیا کہوں، غلط فہمی ہوئی اور پھر بڑھتی چلی گئی۔“

”لیکن شکر ہے کہ ریحانہ اور بچے خیریت سے ہیں۔“

عظیم الدین نے ایک بار پھر معذرت کر کے غفور دادا کو رخصت کیا اور ان کے جانے کے بعد دل کڑا کر کے اسٹیڈیم کی طرف بڑھ گیا۔ اب اسے بیوی بچوں کا سامنا کرنا تھا اور وہ دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ آج پاکستان ٹیم اچھا کھیلے تا کہ ان کا موڈ بھی اچھا رہے اور اس کی شامت کم آئے۔

عمر قید

محمد فاروق انجم

عاشق کی سرشت میں شکست اور ہار ماننے کا تصور نہیں... ایک ایسے ہی عشق کے روگی کا قصہ جو اپنے محبوب کے لیے سراپا انتظار تھا... عشق کی بازی جیتنے کے لیے اس نے اپنی پسند کی بساط بچھائی تھی... اور ہر مہرہ فتح کی جانب گامزن تھا...

عشق، جنوں اور دیوانگی کے ہمراہ ذہانت کی کارفرمائی... جرم اور عشق کی پرفریب یکجائی

سارہ کا خیال تھا کہ وہ دنیا کی خوش نصیب لڑکی ہے جسے دانیال جیسا پیار کرنے والا اور وفادار شوہر ملا ہے۔ تین سالہ ازدواجی زندگی میں جو پیار، چاہت اور محبت اسے دانیال سے ملی تھی، اس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ دانیال اس کی ایک ایک بات اور ضرورت کا خیال رکھتا تھا۔ دن میں کئی بار اپنے کام اور مصروفیت کے دوران میں وہ فون اور پیغام بھیج کر اس کی خیریت دریافت کرتا رہتا تھا۔ جب وہ اپنے کاروباری سفر پر روانہ ہوتا تو... سارہ کا فون اسے

اپنی طرف ہی متوجہ رکھتا تھا۔ سارہ کی دوست، عزیز رشتے دار اور اس کے فلیٹ کے مکین بھی ان کی محبت پر رشک کرتے تھے۔

ایک دن اچانک سارہ کی زندگی میں بھونچال آگیا۔

دانیال آفس جا چکا تھا۔ سارہ کچن کے برتن سمیٹ کر ابھی ٹیلی وژن کے آگے بیٹھی ہی تھی کہ اچانک دروازے کی گھنٹی نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ دروازہ کھولا تو سامنے کوریئر والا ایک لفافہ لیے کھڑا تھا۔ سارہ نے دستخط کیے اور لفافہ دیکھتے ہوئے اندر آگئی۔ اس لفافے پر اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ وہ ڈاک اس کے نام تھی۔... سارہ کو حیرت ہوئی تھی کہ اسے یہ ڈاک کس نے بھیجی ہے کیونکہ لفافے کی دوسری جانب صرف شہر کا نام لکھا ہوا تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اسے ڈاک اسی شہر سے کسی نے بھیجی ہے۔ سارہ کے دماغ میں یہ خیال بھی آیا کہ یہ ممکن ہے کہ دانیال نے محبت کے اظہار کے لیے اس راستے کو بھی اختیار کر لیا ہو کیونکہ وہ اپنی محبت کے اظہار کا کوئی نہ کوئی طریقہ اور بہانہ نکالتا رہتا تھا۔

سارہ نے لفافہ چاک کیا تو اندر ایک سفید کاغذ تھا۔ اس کاغذ میں چند تصاویر تھیں۔ ان تصاویر کو دیکھا تو سارہ کو لگا جیسے ہر چیز گھومنے لگی ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی بے چینی عود کر آئی تھی۔ چہرہ متغیر ہو گیا۔ لفافے کے اندر سے نکلنے والی تصاویر اس کے شوہر دانیال کی تھیں۔ وہ خلوت میں ایک لڑکی کے ساتھ تھا۔ سارہ نے کئی بار ان تصاویر کو دیکھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ دانیال ایسا بھی کر سکتا ہے۔ تصاویر بڑی واضح تھیں اور جو لڑکی دانیال کے ساتھ تھی، وہ سارہ کی پرانی دوست عینی تھی۔

عینی کئی بار اسے کہہ چکی تھی کہ وہ ان دونوں کی محبت دیکھ کر رشک کرتی ہے۔ وہ اکثر دانیال اور سارہ کی تعریف کیا کرتی تھی۔ وہ ہفتے میں ایک بار ضرور ان کے گھر آتی تھی۔ سارہ کو کبھی یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ اس کی دوست اور اس کا شوہر...... جس کی محبت کا یقین اس کی سانس کے ساتھ دوڑتا تھا، وہ اسے دھوکا دے رہے ہیں۔

سارہ نے تصاویر لفافے میں ڈال کر ایک گلاس پانی پیا اور اپنے آپ کو نارمل کرنے لگی۔ اس کے اندر غصے کا الاؤ دہک رہا تھا۔ سارہ کے لیے یہ سب ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ ایک جذباتی اور سب کچھ کر گزرنے والی لڑکی تھی۔ جو ٹھان لیتی تھی پھر وہ بات پتھر پر لکیر کی حیثیت اختیار کر جاتی تھی۔ اس کے شوہر نے بہت بڑا جرم کیا تھا۔ اس کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ روزانہ وہ کسی نہ کسی طریقے سے سارہ سے اپنی محبت کا اظہار کرتا تھا۔ اس کا مطلب تو کہ وہ روز اس سے جھوٹ بولتا تھا۔ سارہ کو دانیال پر غصہ آرہا تھا۔ جس دل میں دانیال کے لیے محبت تھی، اسی دل میں یکدم نفرت نے جگہ لے لی تھی۔ عینی بھی دوستی کی آڑ میں اسے دھوکا دے رہی تھی۔ اس کے لیے دانیال اور عینی کی یہ بے وفائی ناقابلِ برداشت تھی۔

سارہ نے اپنے غصے پر دھیرے دھیرے قابو پایا اور کچھ دیر کے بعد نارمل ہو گئی۔ اب وہ جذباتی ہو کر سوچنے کے بجائے ٹھنڈے دل و دماغ سے کوئی فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔ سارہ نے سوچا کہ وہ پہلے اس بات کی گہرائی تک پہنچے گی اور اس کے بعد وہ دونوں کو ایسی سزا دے گی جس کے بارے میں ان دونوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔

☆☆☆

شام کو جب دانیال واپس آیا تو سارہ اس کے سامنے ایسی ہی تھی جیسے آج کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔ جب دانیال منہ ہاتھ دھونے کے لیے باتھ روم گیا تو پہلی بار سارہ نے اپنے شوہر کا موبائل دیکھا۔ ان بکس میں عینی کا ایک مختصر پیغام تھا۔

''شام کو تم آرہے ہو؟'' دانیال کے باتھ روم سے نکلنے سے قبل سارہ نے اس کا موبائل فون اسی جگہ رکھ دیا۔ اعتماد اور اعتبار کی ایسی فضا تھی کہ کبھی سارہ نے دانیال کا موبائل فون چیک نہیں کیا تھا۔ آج اسے احساس ہوا کہ وہ غلطی کرتی رہی ہے۔ اس پیغام سے یہ بات عیاں ہو گئی تھی کہ ان دونوں کے بیچ کچھ ہے۔

''کھانے کا کیا ارادہ ہے؟'' جونہی دانیال باتھ روم سے نکلا، سارہ نے مسکرا کر پوچھا۔ دانیال نے پیار بھری نظروں سے سارہ کو دیکھا۔

''جانے کو دل تو نہیں چاہتا لیکن آج کمپنی نے ہم سب کو ڈنر دیا ہے۔''

''میں بھی ساتھ جا رہی ہوں کیا؟'' سارہ کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔

''ویسے تو انہوں نے صرف ہم لوگوں کو ہی بلایا ہے لیکن تمہارے بغیر مجھ سے کچھ نہیں کھایا جائے گا اس لیے تم بھی ساتھ چلو۔'' دانیال نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''اگر نہیں بلایا تو پھر جانے کا فائدہ۔'' سارہ کا چہرہ مرجھا گیا۔

''کوئی بات نہیں، تم تیار ہو جاؤ۔'' دانیال نے اصرار کیا۔ سارہ سوچنے لگی کہ دانیال کس قدر شاطر ہے کہ وہ شک کی گنجائش چھوڑنا ہی نہیں چاہتا۔ اس کے اسی اعتماد نے تو سارہ کو کبھی اس سے آگے سوچنے نہیں دیا۔

''نہیں تم جاؤ، میں تمہارا انتظار کروں گی۔'' سارہ مسکرائی۔

''کاش میں انکار کر سکتا لیکن نوکری کا سوال ہے۔''

دانیال کو اکیلا جاتے ہوئے افسوس ہو رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں، کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔''

''تم اکیلی کیا کرو گی؟''

''تمہارا انتظار کروں گی، ایسا پہلی بار تو نہیں ہو رہا۔''

''ہاں، میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا، تم کھانا کھا لینا۔'' دانیال نے تاکید کی۔

''کس ہوٹل میں جا رہے ہو؟'' اچانک اس نے پوچھا۔ دانیال نے اپنی ٹائی کی ناٹ ٹھیک کرتے ہوئے ہوٹل کا نام بتا دیا۔

☆☆☆

پون گھنٹے کے بعد سارہ بھی اس ہوٹل میں پہنچ گئی۔ ہوٹل کی پارکنگ میں کھڑی دانیال کی کار اس کی موجودگی کا پتا دے رہی تھی۔ سارہ ڈائننگ ہال میں داخل ہوئی تو اس وقت وہاں کافی رش تھا۔ سارہ کی کوشش تھی کہ اس کا چہرہ دکھائی نہ دے۔ وہ دروازے کے پاس والی ہی ایک خالی میز پر براجمان ہو گئی۔ ڈائننگ ہال کی مدھم روشنی میں اس کی متلاشی نگاہیں دور تک گھوم رہی تھیں۔ سارہ کی نظر اچانک دانیال اور عینی کی میز پر رک گئی۔ دونوں خوشگوار موڈ میں کھانا کھا رہے تھے۔ اب شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ سب کچھ واضح ہو گیا تھا۔ دانیال کی بے وفائی کا پول کھل گیا تھا۔ سارہ کے تن بدن میں پھیلی غصے کی آگ نے اسے وہاں ٹھہرنے نہ دیا اور وہ پاؤں پٹختے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

''ایک بات تو بتاؤ۔'' اسی رات سارہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی اپنے کھلے بالوں میں برش کر رہی تھی اور دانیال بیڈ پر نیم دراز ہاتھ میں ریموٹ پکڑے ٹیلی وژن دیکھ رہا تھا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی واپس آیا تھا۔

''پوچھو۔'' دانیال کی نگاہیں ٹی وی پر مرکوز تھیں۔

''تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟'' سارہ نے پوچھا۔ دانیال مسکرایا۔

''یہ بھی کوئی سوال ہے؟''

''بتاؤ تو سہی۔''

''بے انتہا۔'' دانیال کی پیار بھری نگاہیں سارہ کے چہرے کا احاطہ کرنے لگیں۔

''یہ سچ ہے؟''

''تم سے جھوٹ بول سکتا ہوں؟'' دانیال نے کہہ کر اپنی نظریں پھر ٹیلی وژن اسکرین پر جما دیں۔

''اگر کوئی کسی سے بہت پیار کرتا ہو، دل و جان سے محبت کرتا ہو اور اچانک پتا چلے کہ ان میں سے ایک بے وفا ہے تو تمہارے خیال میں اس کی سزا کیا ہونی چاہیے؟'' سارہ کے لہجے میں ذرّہ برابر بھی غصہ یا کوئی ایسا تاثر نہیں تھا جس سے دانیال یہ اندازہ بھی لگا سکتا کہ سارہ کے دل میں کیا ہے۔

''بے وفائی کی سزا موت ہے اور بس موت... کیونکہ محبت میں دھوکا نہیں چلتا۔'' ٹیلی وژن کو دیکھتے ہوئے اپنے ہی خیالوں میں جواب دینے کے بعد اچانک اس نے سارہ کی طرف دیکھا۔ ''تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''ڈرامے کی ایک قسط دیکھ کر میں اپنے طور پر اس کا نتیجہ اخذ کرنا چاہتی تھی۔'' سارہ نے برش ایک طرف رکھا اور مسکرا کر دانیال کی طرف دیکھا۔ جواباً دانیال بھی ہولے سے مسکرا دیا۔

☆☆☆

اس بار جب عینی اس سے ملنے کے لیے آئی تو سارہ نے کہا۔ ''اچھا ہوا کہ تم آگئیں، میں گھر میں بور ہو رہی تھی۔''

''تم مجھے فون کر دیتیں۔''

''میں فون کرنے کا سوچ رہی تھی کہ تم آگئیں۔ کہیں گھومنے چلیں، میں بالکل فری ہوں۔'' سارہ نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ... کچھ دنوں سے عینی کا انتظار کر رہی تھی کیونکہ اس نے اپنے اندر ابلتے ہوئے لاوے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے منصوبہ بندی کر لی تھی۔

''ہاں کیوں نہیں، کہاں چلیں؟'' عینی بھی ایک دم تیار ہو گئی۔

''بہت دن ہوئے تمہارے فارم ہاؤس نہیں گئے، وہاں چلتے ہیں۔''

''ارے تم نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔'' عینی خوش ہو گئی۔

شہر سے بیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہنگاموں سے دور ایک پُرسکون جگہ پر عینی کا فارم ہاؤس تھا جو ابھی چند دن قبل ہی مکمل ہوا تھا۔ وہ فارم ہاؤس عینی کے دولت مند باپ نے اسے بنا کر دیا تھا۔ سارہ اس کے ساتھ ایک بار فارم ہاؤس گئی تھی تب وہ زیرِ تعمیر تھا۔ ابھی عینی نے وہاں کوئی ملازم نہیں رکھا تھا۔

فارم ہاؤس پہنچ کر سارہ نے دیکھا کہ وہ بڑا خوب صورت بن گیا ہے۔ چمکتے ہوئے فرش تھے اور ابھی فارم ہاؤس ہر طرح کے سامان سے مبرّا تھا۔ عینی نے بتایا۔

''چند دنوں میں یہاں سامان آجائے گا لیکن ابھی ہم کہاں بیٹھیں گے؟''
''ہم بیٹھنے نہیں آئے عینی۔'' ایک دم سارہ کا لہجہ متغیر ہوگیا۔ چہرے پر سرخی آگئی اور آنکھوں میں شعلے سے اتر آئے۔
''چلتے پھرتے باتیں کرتے ہیں۔'' عینی مسکرائی۔
''میرے شوہر کے ساتھ تم کب سے یہ کھیل، کھیل رہی ہو؟'' سارہ اس کی مسکراہٹ کو نظرانداز کر کے سپاٹ لہجے میں بولی تو عینی اس کی بات سن کر دم بخود رہ گئی۔ جب عینی کچھ نہ بولی تو سارہ نے اپنا سوال پھر دہرایا۔
''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' عینی نے اس کی بات کو مذاق سمجھ کر ٹالنے کی کوشش کی۔ سارہ نے اپنے ہینڈ بیگ سے وہ تصویریں نکال کر اس کی طرف بڑھا دیں۔
''انہیں دیکھو۔''
کانپتے ہاتھوں سے عینی نے اس کے ہاتھ سے تصویریں لیں اور جونہی اس کی نگاہ ان تصویروں پر پڑی تو جیسے اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ چور اپنی چوری سے باخبر ہوتا ہے۔ اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ اس کی دانست میں وہ بڑی ہوشیاری سے سارہ کی ناک کے نیچے اپنا کھیل کھیل رہی تھی لیکن سارہ کے پاس تو ٹھوس ثبوت تھا۔
''یہ کس کی تصویریں ہیں؟'' سب کچھ دیکھنے کے باوجود عینی نے جھوٹ بولنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز اور الفاظ ٹوٹ رہے تھے۔
''جھوٹ کی گنجائش نہیں ہے۔ تم نے میرے گھر پر ڈاکا ڈالا ہے۔ میرے شوہر کو مجھ سے چھینا ہے اور میرے شوہر نے میری محبت کے باوجود مجھ سے بے وفائی کی ہے اور اس کی سزا کیا ہے؟ اس کا اظہار وہ خود کر چکا ہے۔'' سارہ کے اندر جنون لاوے کی طرح دوڑ رہا تھا۔ وہ ان دونوں کو سزا دینے کی ٹھان چکی تھی پھر اس نے آناً فاناً تیز دھار چھری نکال لی جو اس نے خاص طور پر مارکیٹ سے خریدی تھی۔ اس کا ایک وار عینی کے گلے پر بجلی کی سی تیزی سے کیا۔ خون کا فوارہ نکلا اور وہ اپنی گردن پکڑ کر ایک طرف جا گری... وہ بری طرح تڑپ رہی تھی اور سارہ پتھر کے بت کی طرح اسے اس حالت میں دیکھتی رہی۔ بالآخر اس نے جان دے دی... اس کی بے جان لاش فرش پر پڑی تھی اور چمکتا ہوا فرش سرخ ہوگیا تھا۔
سارہ نے عینی کا موبائل نکالا اور دانیال کو ایک پیغام بھیجا۔ پیغام رگوں میں خون گرما دینے والا تھا۔ آخر میں اس نے جگہ کا نام اور ایک جملہ لکھا۔
''وقت کی سوئیوں کو شکست دے کر میرے دل کے پاس پہنچ جاؤ۔''
دانیال نے اسی وقت پیغام بھیجا کہ وہ آرہا ہے۔ سارہ نے فرش پر بکھری ہوئی تصویریں اٹھا کر پھر اپنے پرس میں رکھ لیں اور اس کا انتظار کرنے لگی۔ اس کا غصہ ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا۔ اس کے تن بدن میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ سارہ نے باہر کا گیٹ تھوڑا سا کھول دیا تھا۔
تھوڑی دیر بعد ہی اسے گیٹ پر گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی۔ دانیال آگیا تھا... دانیال نے گاڑی بند کی اور خوشگوار موڈ میں گنگناتے ہوئے اندر کی جانب بڑھا۔ پورچ اور برآمدہ عبور کر کے وہ کمرے میں داخل ہوا اور ایک دم اس کے قدم اپنی جگہ تھم سے گئے۔ اس کی نظروں کے سامنے عینی کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ وہ حواس باختہ ہوگیا کہ یہ کیا ہو چکا ہے اور کس نے کیا ہے... اس کشمکش میں وہ کھڑا رہا... تھوڑی دیر بعد وہ پلٹا تو جیسے وہاں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا سارہ نے اچانک ہی دانیال کی گردن پر چھری سے حملہ کر دیا اور وہ اپنی جگہ لڑکھڑا کر رہ گیا... وہ سارہ کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ سوال تھے۔
''تمہاری بے وفائی کی سزا، جو تم نے خود اس رات تجویز کی تھی۔ میری محبت کا جواب تم نے اس بے وفائی سے دیا ہے۔ یہ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا دانیال۔'' سارہ نفرت سے بولی۔
خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ دانیال کے گلے سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی پھر وہ نیچے گر گیا۔ اس کا جسم ساکت ہوگیا۔ سارہ نے اپنے بیگ سے ایک کپڑا نکالا۔ اس سے چھری کے دستے کو صاف کیا اور چھری ایک طرف پھینک دی پھر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ اس نے کسی چیز کو نہیں چھوا تھا۔ جس چیز پر اس کا ہاتھ لگا تھا، وہ پہلے ہی صاف کر چکی تھی۔ سارہ ایک کمرے میں چلی گئی اور بغیر آواز نکالے رونے لگی۔ جب وہ خوب رو چکی تو اس نے دیکھا اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ رومال سے صاف کیا۔ اب اس کے چہرے پر کوئی تاسف نہیں تھا۔ اس کے بعد سارہ نے باہر کا جائزہ لیا۔ دور تک کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ جگہ زیادہ تر سنسان تھی۔ سارہ تیزی سے باہر نکلی اور ایک طرف چل دی۔ لگتا تھا جیسے اس جگہ پر صرف وہ ایک ذی روح

اندھیرے کا ایک حصہ ہے۔

☆☆☆

اس واقعے کو ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ سارہ نے شوہر کے قتل پر ایسی غم ناک صورت بنائی کہ سب ہی اس کی اس حالت پر آنسو بہانے لگے۔ قتل کی جگہ سے کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا تھا جس سے پولیس قاتل تک پہنچنے میں کامیاب ہوسکتی۔ یہ بات سب پر کھل گئی تھی کہ دانیال اور عینی کے بیچ تعلقات تھے لیکن انہیں قتل کس نے کیا ہے؟ اس کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ جیسے جیسے دن گزر رہے تھے، یہ کیس فائل میں بند ہوتا جا رہا تھا۔
سارہ کو اگر افسوس تھا تو اس بات کا کہ جس شخص سے اس نے ٹوٹ کر محبت کی، اس نے اسے دھوکا دیا تھا۔ اسے اپنے شوہر کی بے وفائی کا شدید رنج تھا۔
ایک دن وہ گھر میں بیٹھی ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی، سارہ نے دروازہ کھولا تو سامنے نبیل کھڑا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر چونک گئی۔ نبیل اس کے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا۔ اچانک اسے اپنے دروازے پر دیکھ کر سارہ کی حیرت دوچند ہوگئی۔
''کیا میں اندر آسکتا ہوں؟'' نبیل نے اندر آنے کی اجازت چاہی۔
سارہ نے کبھی بھی نبیل کو پسند نہیں کیا تھا۔ جانے کیوں اسے نبیل سے نفرت تھی۔ اس کی مسکراہٹ کا جواب سارہ نے ہمیشہ اپنی نفرت سے دیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے نبیل کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔ پہلے تو اس نے دانیال کی موت کا افسوس کیا اور پھر بولا۔
''سارہ! تمہیں یاد ہے میں نے کالج کے زمانے میں تم سے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا؟''
''تمہیں بھی شاید یاد ہوگا کہ میں نے سخت الفاظ میں انتہائی نفرت سے انکار کر دیا تھا۔'' سارہ نے جان بوجھ کر نفرت کا لفظ استعمال کیا۔
''میرے دل میں اب بھی تمہارے لیے وہی محبت ہے۔ میں اب بھی تمہیں اپنانا چاہتا ہوں۔'' نبیل نے مسکرا کر دھیمے لہجے میں کہا۔
''میرے دل میں اب بھی تمہارے لیے نفرت ہے۔'' سارہ کا لہجہ درشت تھا۔
''تم اس گھر میں اکیلی رہتی ہو۔ تمہیں ایک اچھے ہمسفر کی ضرورت ہے۔'' وہ بولا۔
''اس سے پہلے کہ میری برداشت جواب دے جائے، تم یہاں سے چلے جاؤ۔''
''میں جانتا ہوں کہ تم غصے کی بہت تیز ہو اور کسی کو مارنے پر آؤ تو جان سے ہی مار دیتی ہو۔'' نبیل نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
''میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں...'' نبیل نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے کہا... اس کے ہاتھ میں کیمرا تھا۔
''مجھے کچھ نہیں دیکھنا... تم یہاں سے جاسکتے ہو۔'' سارہ کا غصہ بڑھ رہا تھا۔
مگر نبیل خاموشی سے سارہ کی طرف دیکھنے لگا اور پھر بولا۔ ''میں ایک چینل میں کرائم رپورٹر ہوں۔ دانیال اور عینی کی تصویریں میں نے ہی بھیجی تھیں تمہیں...'' نبیل نے انکشاف کیا۔ ''کیونکہ وہ اچانک ہی میری نظر میں آگئے تھے اور تمہیں پانے کے لیے میرے ذہن میں شاندار منصوبہ ترتیب پا گیا اور وہ تصویریں میں نے تمہیں ارسال کر دیں... اور میری توقع کے مطابق تمہارا ردعمل سامنے آگیا۔ میں جانتا تھا کہ اب تم کیا کرو گی اس لیے میں سائے کی طرح تمہارے پیچھے تھا۔'' نبیل کے اس انکشاف نے سارہ کو چونکا دیا۔ وہ حیرانی اس کی طرف دیکھنے لگی۔ نبیل نے کچھ توقف کے بعد پھر کہا۔ ''ہمارے ہاں قتل کی سزا موت یا پھر عمر قید ہے اور تم نے دو قتل کیے ہیں جو میرے اس کیمرے میں محفوظ ہیں۔ تم دیکھنا چاہو تو دیکھ سکتی ہو... تم کتنی خوفناک لگ رہی ہو... وہ سب کرتے ہوئے۔''
''یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟'' سارہ کی خوف زدہ آواز نکلی اور اس کا سارا غصہ خوف میں کہیں دب گیا۔
''میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ تمہیں ہمیشہ خوش رکھوں گا۔ گرفتار ہو گئیں تو تم شاید عمر قید کی سزا پا کر زندگی کی باقی سانسیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے کاٹ دو۔ اگر تم میری قید میں آجاؤ تو تم اس عمر قید میں خوش حال اور آزاد زندگی گزار سکتی ہو۔ بولو کیا فیصلہ کرتی ہو...''
نبیل کی پیشکش نے سارہ کو مبہوت کر دیا۔ وہ پتھر بنی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی سانسیں اور دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔
''تو کیا فیصلہ کیا تم نے؟ کون سی قید چاہتی ہو... جیل کی سلاخوں والی اذیت ناک یا پھر ایک خوش حال اور آزاد عمر قید؟'' نبیل نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔
سارہ نے کچھ دیر سوچا پھر نرم لہجے میں بولی۔ ''میں جینا چاہتی ہوں۔''

*

کفارہ

بابر نعیم

ماحول کی خوب صورتی... صفائی اور آلودگی سے پاک فضا... زندگی کو بقائے دوام بخشتی ہے... لمحہ بہ لمحہ ماحولیاتی آلودگی کا سبب بننے والے عناصر کے گرد گھومتی ایک سبق آموز روح پرور کہانی... جس کے کردار اپنی بقائے حیات کے لیے دوسروں کے گرد ایسا ان دیکھا جال بُن رہے تھے... جس میں الجھتے الجھتے ان کی سانسیں بھی اٹک رہی تھیں...

قانون کی پاسداری اور جرم کی پرورش کو روکنے کا عزم رکھنے والے شخص کی کوششوں کا پہلا قدم...

جب میں ٹیرل کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے اس کی دادی فرانس میکولن سے ملنے اس کے اپارٹمنٹ پہنچا تو اس نے خلافِ توقع مجھے دیکھ کر دروازہ بند کیا اور نہ ہی یہ کہا کہ ٹیرل اس کے ساتھ نہیں رہتا بلکہ اس کے برعکس اس نے مجھے اندر بلا لیا اور کافی پیش کی... ورنہ عام طور پر لوگ، پولیس یا پرائیویٹ سراغ رسانوں سے اس طرح کا سلوک نہیں کرتے۔ اس کا اصرار تھا کہ ٹیرل ایک اچھا لڑکا تھا جو کسی کے لیے بھی تکلیف کا سبب نہیں بن سکتا۔

فرانس میکولن کی عمر زیادہ سے زیادہ ساٹھ برس ہوگی۔ وہ اب بھی دبلی پتلی اور پُرکشش تھی لیکن اس کے چہرے اور آنکھوں میں تفکرات کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ یقیناً اسے اپنے پوتے سے بہت محبت تھی۔ ٹیرل کا ریکارڈ بھی یہی بتاتا تھا۔ وہ ان لڑکوں میں سے نہیں تھا جو جیل یاترا کرتے رہے ہوں۔ وہ بیس سال کا ہو چکا تھا اور ابھی تک اس کے ریکارڈ میں ایک ہی الزام درج ہوا تھا۔ دو سال پہلے وہ ایک ویڈیو گیم اسٹور میں نقب زنی کرنے کے الزام میں گرفتار ہوا تھا لیکن اس کے بعد سے اب تک اس کا ریکارڈ صاف تھا۔ اس نے کالج کا ایک سیمسٹر بھی مکمل کر لیا تھا لیکن اسے ملازمت کی خاطر تعلیم چھوڑنا پڑی۔ اگر وہ ڈیڑھ ہفتہ قبل عدالت میں حاضر ہو جاتا تو اسے دو سال پرانے مقدمے میں زیادہ سے زیادہ چھ ماہ کی سزا ہوتی۔

"ٹیرل کی ماں اس کے بچپن میں ہی انتقال کر گئی تھی۔ اس کا باپ مارکوس جونیئر اسے میرے پاس چھوڑ گیا لیکن کار کے حادثے میں ہلاک ہو جانے تک وہ ہر ہفتے اس سے ملنے آتا رہا۔ ایک سال پہلے میرے شوہر مارکوس سینئر کا بھی انتقال ہو گیا۔ وہ ایک اچھا انسان تھا۔ وہ ستائیس سال تک پیرش انڈسٹریل پارک میں رات کی چوکیداری کرتا رہا۔ اسے ہڈیوں کا کینسر ہو گیا تھا۔ اس کا پتا اچانک ہی چلا پھر وہ دیکھتے ہی دیکھتے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ معاف کرنا۔ میں بھی کیا دکھڑا لے بیٹھی۔ تمہیں اس درد بھری کہانی سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے مسٹر رینی!"

میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھے چارلی کہہ سکتی ہے اور یہ کہ میں اس کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ اس کے بعد ہمارے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا لہٰذا چند منٹ خاموشی چھائی رہی پھر وہ مزید کافی بنانے کے لیے کچن میں چلی گئی اور میں کھڑکی میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ باہر تاریکی چھا گئی تھی اور خنکی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ میری نظر ایک لمبے سے لڑکے پر گئی جو سڑک پار کر کے پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"کیا تم نے ٹیرل کو آتے دیکھا ہے؟" فرانس میکولن نے کافی کا کپ مجھے پکڑاتے ہوئے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، ایک گاڑی اس کے پاس آ کر رکی۔ فرانس نے میرے عقب سے جھانکا اور بولی۔ "اوہ، میرے خدا! وہ اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔"

گاڑی کی پسنجر سیٹ کی طرف والا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک پچاس سالہ گورا شخص برآمد ہوا۔ ٹیرل نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے ہی اس شخص نے اپنے اوورکوٹ کی اندرونی جیب سے شاٹ گن نکالی اور ٹریگر دبا دیا۔

"اوہ خدا! رحم کر۔" فرانس میرے کان کے قریب چلائی۔

میں نے اپنی جیکٹ سے اعشاریہ چار پانچ کا ریوالور نکالا اور دروازے کی طرف بھاگا۔ میں نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ دوبارہ فائر کی آواز سنائی دی۔ میں سمجھ گیا کہ ٹیرل کو بچانا ممکن نہیں لیکن اس کے باوجود دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اترتا رہا۔ میرے پیچھے پیچھے فرانس بھی چیختی چلاتی سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ جیسے ہی ہم پارکنگ لاٹ تک پہنچے، وہ گاڑی وہاں سے روانہ ہو گئی اور میں ڈرائیور کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا۔ اس کا رنگ گورا اور بال گھنگرالے تھے اور اس نے چشمہ بھی لگا رکھا تھا۔ ہمارے وہاں پہنچنے تک گاڑی جا چکی تھی اور اس کا رخ شمال مشرق کی جانب تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر ریوالور جیب میں رکھ لیا۔

فرانس اپنے پوتے کی لاش کے پاس کھڑی بین کر رہی تھی۔ فائرنگ ختم ہونے کے بعد قرب و جوار کے اپارٹمنٹ سے کچھ لوگ باہر آئے اور جائے وقوعہ کا معائنہ کرنے لگے۔ کسی لڑکی نے فون کر کے ایمبولینس بلالی لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ پہلی گولی گردوں سے ذرا نیچے لگی تھی جبکہ دوسری گولی اس کے سر کے پچھلے حصے کو پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔

میں نے ازراہِ ہمدردی فرانس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ روتے ہوئے بولی۔ "اسے ایک پلے اسٹیشن چاہیے تھا اور اسی لیے اس نے اسٹور میں ڈاکا ڈالا تھا۔ دیکھو میرے بچے کو اس کے جرم کی کتنی بڑی سزا ملی ہے۔"

چار دن کے اندر ہی ٹیرل کے قتل کی تفتیش کرنے والا سراغ رساں میری پے در پے فون کالز سے تنگ آ گیا اور اس نے مجھ سے لنچ پر ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ اپنی پلیٹ ایک طرف کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے بھی تمہاری طرح اس بوڑھی عورت سے ہمدردی ہے لیکن تم کس دنیا میں رہتے ہو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اس شہر میں روزانہ کتنے لڑکوں کا قتل ہوتا ہے؟"

اس کا کہنا صحیح تھا لیکن یہ قتل میری آنکھوں کے سامنے ہوا تھا اس لیے میں اتنی آسانی سے اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے مایوسی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "گویا تم ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے؟"

"تم خود پولیس میں رہ چکے ہو اور جانتے ہو کہ یہ

معاملات کس طرح آگے بڑھتے ہیں۔ آپ کسی ایک کیس پر کام شروع کرتے ہیں تو شام تک مزید دو تین کیس آپ کی میز پر آجاتے ہیں۔ ایسی صورت میں کام کرنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"شاید اسی لیے تم سب سے آسان کیس پر توجہ مرکوز کر دیتے ہو۔" میں نے طنز کیا۔

"ہمارے لیے سب برابر ہیں۔" وہ ویٹرس کو آتا دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد بولا۔ "اس قتل میں یقیناً کوئی گروہ ملوث ہے۔ کوئی نہ کوئی ضرور سامنے آئے گا اور پھر ہمیں اس سے نمٹنے میں کوئی دشواری نہیں ہو گی۔"

وہ اسے کسی گروہ کی کارروائی کہہ رہا تھا جبکہ مقامی اخبارات اور ریڈیو نے اس قتل کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ اس کے برعکس وہ میئر کے دفتر میں ہونے والے تازہ ترین اسکینڈل اور مائیکل مونیسی چلڈرن ہیلتھ سینٹر کی تعمیر میں زیادہ دلچسپی لے رہے تھے جو دنسینٹ مونیسی اپنے بیٹے کی یاد میں بنا رہا تھا جو نو سال کی عمر میں خون کے سرطان میں مبتلا ہو کر چل بسا تھا۔ نیوز اینکر اس لڑکے کی موت اور اس کے باپ کے غم کو بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے تھے لیکن وہ ان بچوں کا تذکرہ کرنا بھول گیا جو مونیسی اور اس کے گروہ کے پھیلائے ہوئے منشیات کے زہر کی وجہ سے مر گئے تھے یا یتیمی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس معاشرے کا یہی المیہ ہے کہ فلاحی کاموں کے لیے اپنی دولت کا معمولی حصہ دینے والوں سے کوئی نہیں پوچھتا کہ انہوں نے دولت کا یہ انبار کیسے اکٹھا کیا۔ اب ایک اور سیاہ فام لڑکا مارا گیا تھا اور نیوز اینکر کی نظر میں اس قتل کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ انہوں نے بھی ٹیرل کے قتل میں کسی گروہ کے ملوث ہونے کا امکان ظاہر کر کے اپنا فرض پورا کر دیا تھا جبکہ اس گاڑی میں آنے والے دونوں افراد سفید فام تھے اور کوئی گروہ اپنی کارروائی کے لیے درمیانی عمر کے سفید فام افراد کو استعمال کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ یہی بات میں نے اس سے بھی کہی۔

"گولی چلانے والا اور ڈرائیور دونوں سفید فام تھے۔ یہ بات میں نے جائے واردات پر پہنچنے والی سراغ رساں کو بتا دی تھی۔"

"ہاں، اس نے اپنی رپورٹ میں اس کا تذکرہ کیا ہے لیکن ہمارے پاس نصف درجن شہادتیں ایسی ہیں جن کے مطابق حملہ آور نوجوان سیاہ فام تھے اور ان کی عمر بیس کے لگ بھگ ہو گی۔"

"میں نے خود نہیں دیکھا ہے۔ وہ سفید فام تھے۔"

"جبکہ دوسرے لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ نوجوان سیاہ فام تھے۔ تم مجھے کیا بتانا چاہ رہے ہو؟"

"ایک لڑکا جس کا واحد جرم یہ تھا کہ اس نے دو سال پہلے ایک ویڈیو شاپ میں چوری کرنے کی کوشش کی تھی، اسے قتل کر دیا گیا اور تم اس کا تعلق کسی گروہ سے جوڑ رہے ہو۔ بہتر ہے کہ اس کیس کو بند کر کے بھول جاؤ۔"

اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ "دیکھو رینی! مجھے یہ بات تمہیں نہیں بتانی چاہیے کیونکہ تم ان معلومات تک رسائی کا حق نہیں رکھتے۔ ٹیرل کا تعلق ان لوگوں میں سے تھا جو مختلف جرائم میں ملوث ہیں۔ بالخصوص وہ ڈیمنڈ جونز اور بوپ ڈریک کے ساتھ زیادہ دیکھا جاتا تھا۔ یہ دونوں لڑکے منشیات فروش ہیں اور ان پر قتل و ڈاکا زنی کا بھی شبہ ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ٹیرل کسی حریف گروہ کا نشانہ بنا ہے یا پھر اس کا اپنے دوستوں ڈریک اور جونز سے جھگڑا ہو گیا تھا۔"

"دوسرے گواہوں نے تمہیں یہی بتایا ہے؟"

"تم جانتے ہو کہ مشتبہ افراد کی نگرانی ہوتی رہتی ہے۔ کچھ شہادتوں اور معلومات کی بنا پر یہ اندازہ لگایا گیا ہے۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "ٹیرل سے ملتے جلتے ایک لڑکے پر تو قتل کرنے کی کوشش کا شبہ بھی ہے۔"

میں اس کی بات سن کر چونک گیا اور حیران ہوتے ہوئے بولا۔ "کیا تم سنجیدہ ہو؟"

"میں یہاں تم سے مذاق کرنے نہیں آیا۔" وہ تھوڑا سا ناراض ہوتے ہوئے بولا۔ "مڈ ساؤتھ ٹرانسپورٹ کمپنی کا ٹرک ڈرائیور اس علاقے میں سامان پہنچانے گیا تھا کہ اس کے ٹرک کے انجن میں کوئی خرابی ہو گئی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ٹرک کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ان تین لڑکوں یعنی ٹیرل، جونز اور ڈریک نے اس کے ٹرک پر آتش گیر مادہ پھینکا۔ شاید کسی سفید فام کو جلانا بھی ان کے لیے ایک تفریح تھی۔ تم چاہو تو ساؤتھ ایون جا کر اس ڈرائیور یعنی ڈان ایلس سے مل سکتے ہو۔"

"ڈان ایلس۔" میں نے زیر لب کہا۔ "شاید میں اسے جانتا ہوں۔"

"لیکن اب تم اسے نہیں پہچان سکو گے۔"

☆☆☆

ڈان ایلس دو کمروں کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ میں اس کے لیونگ روم میں ایک صوفے پر بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ مجھے کسی نے ہائر نہیں کیا پھر میں یہاں کیوں آیا ہوں؟ ٹیرل کی زندگی اور موت سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا

لیکن میں نے اسے اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے دیکھا تھا۔ اس کی بوڑھی دادی کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ "اسے ایک بہلے اسٹیشن چاہیے تھا۔" ٹیرل کون تھا؟ ایک ہونہار طالب علم، محنتی کارکن یا پھر گینگسٹر؟ جس نے ایک معصوم انسان کو زندہ جلانے کی کوشش کی تھی۔ اسی لیے میں نے ڈان ایلس سے ملنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ ٹیرل کو حملہ آور کے طور پر شناخت کر سکے۔

ڈان ایلس نے تصویر پر نظر ڈالی اور اسے میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ "ہو سکتا ہے کہ یہ ان کا ساتھی ہو۔ دراصل رات بہت ہو چکی تھی اور اسٹریٹ لائٹس بھی کام نہیں کر رہی تھیں اس لیے مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔" اس نے میز پر رکھی ہوئی لڑکوں کی تصویروں پر نظر ڈالی اور بولا۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ میں اتنی تکلیف میں مبتلا رہا کہ اس رات کے بارے میں کچھ یاد نہیں۔"

میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اس لیے اس پر زیادہ زور نہیں دیا۔ وہ خود ہی اپنی جھینپ مٹانے کے لیے بولا۔

"ہمیں ایک دوسرے سے رابطے میں رہنا چاہیے تھا۔ گریجویشن کرنے کے بعد تم بہت زیادہ مصروف ہو گئے اور تمہیں یہ احساس ہی نہ رہا کہ دوستوں سے رابطہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔"

ہم دونوں دوست نہیں محض کلاس فیلوز تھے اور سچ تو یہ ہے کہ کالج سے نکلنے کے بعد مجھے کبھی اس کا خیال بھی نہیں آیا۔ "یہ کون ہے؟" ایلس نے ٹیرل کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔

اس نے مجھ سے نظریں چرا لیں اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، اس سے کہیں زیادہ اس رات کے بارے میں جانتا ہے۔ میں نے اس کی کیفیت کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "ایک بیس سالہ لڑکا جسے چند روز قبل شاٹ گن سے فائر کر کے ہلاک کر دیا گیا۔"

"یہ میرے بڑے لڑکے کا ہم عمر لگتا ہے۔" اس نے میز پر سے اپنے بیوی بچوں کی تصویر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تمہارے بچے ہیں؟"

"نہیں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ اس موضوع پر بات کرنا ہی میرے لیے تکلیف دہ تھا۔

"ہم اپنے بچوں کو بہت کچھ دینا چاہتے ہیں۔" اس نے تصویر پر نظریں جماتے ہوئے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ "لیکن میں انہیں کیا دے رہا ہوں۔ ادھار کا بوجھ اور

جدید چاہت

میں چاہتوں کی تلاش میں نکلی تو مجھے اچھی دوستیاں ملیں، میں نے خواہشوں کا پیچھا کیا اور امیدوں کے سہارے پائے، حقیقتوں کے پیچھے بھاگی تو سہانے خواب ہاتھ آئے پھر میں نے ایک بن مانس کی تمنا کی اور تم مجھے مل گئے... اوہ! کتنے پیارے ہو تم!"

☆☆☆

خاتون بہت خوش جمال مگر بدخصال تھیں۔ تلخیوں سے بچنے کے لیے شوہر نامدار ہمیشہ اپنی زبان بند رکھتے، دل ہی دل میں جلتے بھنتے رہتے، اپنی تو بیاہتا بیوی کی دل آزاری کے خیال سے کوئی حرف شکایت زبان پر نہ لاتے۔

ایک صبح ان کی بیوی نے بہت ناز و ادا کے ساتھ ان سے شکوہ کیا کہ رات کو وہ نیند کی حالت میں اسے بہت برا بھلا کہہ رہے تھے۔

شوہر نے بے رخی سے بیوی کی شکایت سنی اور تلخی سے کہا۔ "مجھے سب معلوم ہے، تمہیں جان لینا چاہیے کہ اس وقت میں پوری طرح جاگ رہا تھا۔"

(بھکر سے دانش نواز کا چٹکلا)

سوشل سیکیورٹی کے چیک میں سے بچے ہوئے تیس ڈالرز۔"

"کمپنی تمہیں کچھ نہیں دے رہی؟" میں نے پوچھا۔

"میں ڈرائیور نہیں بلکہ ڈینٹر پینٹر ہوں اور اسکول چھوڑنے کے بعد سے یہی کام کر رہا ہوں۔ ٹرک چلانا میرا پارٹ ٹائم جاب ہے کیونکہ بچوں کو کالج میں پڑھانے کے لیے مجھے اضافی آمدنی کی ضرورت تھی۔"

"تم رات میں ٹرک چلاتے ہو؟"

"ہاں، میرے ٹرک پر ہر طرح کا سامان لادا جاتا ہے۔ یہ ذمے داری میرے باس سال جونیئر کی ہے۔ مجھے تو پیسوں سے غرض ہے جن کی ادائیگی نقد ہوتی ہے۔"

"سال جونیئر۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تم آرکاڈوس کے لیے کام کرتے ہو؟"

وہ جس انداز میں چونکا، اس پر مجھے بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی۔ آرکاڈوس آٹو موٹیو اس شہر کی سب سے بڑی ورکشاپ تھی جہاں انتہائی اعلیٰ درجے کا رنگ کا کام ہوتا تھا۔ سبھی قانون نافذ کرنے والے ادارے جانتے تھے کہ

آرکاڈوس آٹو موٹیو ایک طرح سے مونٹیسی کے جرائم کی پردہ پوشی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اگر سال جونیئرز، مڈساؤتھ ٹرانسپورٹ کو استعمال کر رہا تھا تو گیراج میں کوئی بہت ہی منافع بخش اور غیر قانونی کام ہو رہا تھا۔

''تم ان کا کیا سامان اٹھاتے ہو...... الیکٹرانکس کا سامان جیسے ٹی وی سیٹ یا سگریٹ وغیرہ؟''

''میرے ٹرک پر ایسا کوئی سامان نہیں ہوتا۔ صرف فالتو چیزیں اور کوڑا کرکٹ لے جاتا ہوں اور اس میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کی خاطر وہ مجھ پر حملہ کرتے۔ مجھے یہ سامان انڈسٹریل پارک میں اتارنا تھا۔ ابھی ہم راستے میں ہی تھے کہ ٹرک کا انجن بند ہو گیا۔''

''میرا خیال تھا کہ جب یہ واقعہ پیش آیا تم اس وقت اکیلے تھے؟''

اس نے ایک بار پھر نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب دواؤں کا اثر ہے جس کی وجہ سے میرا ذہن بوجھل ہو رہا ہے۔''

''میں تمہیں کوئی الزام دینے کی کوشش نہیں کر رہا۔'' میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''دیکھو چارلی! میں بہت تھک گیا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب مجھے آرام کرنا چاہیے۔'' وہ کچھ یاد کرتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں سچ بتاتا ہوں چارلی۔ میرا خیال ہے کہ وہ لڑکے صرف مجھے جلتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔''

☆☆☆

میں نے فرانس میکولین کو پہلے سے کہیں زیادہ کمزور اور عمر رسیدہ پایا۔ لگتا تھا کہ پوتے کی موت نے اس سے عمر کے دس سال چھین لیے ہیں۔ وہ اپنے لیونگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے سامنے میز پر پھولوں کے گلدستے اور تعزیتی کارڈز پڑے ہوئے تھے۔ مجھے ٹیرل کے بارے میں کچھ اور معلومات ملی تھیں اور میں اسی سلسلے میں فرانس کے پاس آیا تھا۔ ہومی سائڈ میں ایک پرانے ساتھی نیٹ روڈلف نے صرف میری کال کا جواب دے کر ہی حیران نہیں کیا بلکہ اس نے میری مدد بھی کی تھی۔ دس سال پہلے مجھے ایک مشکل صورتِ حال کے نتیجے میں ملازمت سے استعفا دینا پڑ گیا اور اس کے بعد ہی نیٹ کی ترقی ہو سکی تھی۔ گوکہ اسے ریٹائر ہوئے دو سال ہو چکے تھے لیکن اب بھی محکمے میں اس کی خاصی جان پہچان تھی۔ اسے یہ معلوم کرنے میں بیس منٹ سے بھی کم وقت لگا کہ ڈیمنڈ جونز اور بوپ ڈریک گوکہ ابھی گرفتار نہیں ہوئے تھے لیکن انہی پر ٹیرل کے قتل کا شبہ کیا جا رہا تھا اور جن پانچ میں سے چار لوگوں نے گواہی دی تھی کہ حملہ آور نوجوان سیاہ فام تھے، وہ سب ویسٹ پیرش انڈسٹریل پارک کے ملازمین تھے۔ اسی جگہ فرانس کا مرحوم شوہر بھی ملازمت کرتا تھا۔ میں نے فرانس سے پوچھا۔

''کیا ٹیرل نے بھی کچھ عرصہ یہاں ملازمت کی تھی؟''

''وہ عارضی طور پر وہاں کام کر رہا تھا۔ جب مارکوس کی بیماری کا پتا چلا تو اس کے ساتھ ہی ٹیرل کو بھی جواب مل گیا۔''

''تمہارا شوہر صرف رات میں چوکیداری کرتا تھا۔ کیا تم نہیں سمجھتیں کہ وہاں چوبیس گھنٹے چوکیداری کی ضرورت تھی؟''

''یہ ہمارا مسئلہ نہیں تھا۔ یہی غنیمت تھا کہ ہمیں ہر مہینے باقاعدگی سے تنخواہ کا چیک مل جایا کرتا تھا۔''

''کیا کبھی تمہارے شوہر یا ٹیرل نے مڈساؤتھ ٹرانسپورٹ کا ذکر کیا؟''

''مجھے یاد نہیں۔'' اس نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''مس فرانس! تم اور میں جانتے ہیں کہ ٹیرل کو دو سفید فام افراد نے مارا ہے لیکن پانچ لوگوں کا کہنا ہے کہ فائرنگ کرنے والے سیاہ فام نوجوان تھے۔ ان میں سے چار انڈسٹریل پارک کے ملازم ہیں جہاں تمہارا شوہر اور پوتا کام کرتے رہے ہیں جبکہ پانچواں شخص مڈساؤتھ ٹرانسپورٹ کمپنی کے لیے کام کرتا ہے جو ٹرک کے ذریعے اس پارک میں سامان اتارتا ہے۔ کیا کبھی تمہارے شوہر نے بتایا کہ اس ٹرک کے ذریعے وہاں کس نوعیت کا سامان لایا جاتا ہے؟''

''اس نے کبھی بتایا اور نہ میں نے پوچھا۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں نے تمہاری خدمات حاصل نہیں کیں اور نہ ہی تم کوئی پولیس والے ہو۔ تم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہو؟''

اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں اسے کیا بتاتا کہ ٹیرل کی موت پر اس کا دکھی چہرہ دیکھ کر مجھ پر کیا گزری تھی اور یہ احساس میری نیند اڑا دینے کے لیے کافی تھا کہ اگر میں چند منٹ پہلے پارکنگ لاٹ کی طرف آ جاتا تو شاید ٹیرل کی جان بچ جاتی۔ اب اسی احساس نے مجھے ٹیرل کے قاتلوں کا پیچھا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''تمہیں کسی نے کوئی دھمکی تو نہیں دی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے قدرے غصے سے کہا۔ ''لیکن ان باتوں کی کیا اہمیت ہے؟ اس طرح میرا پوتا تو واپس نہیں آ سکتا۔''

اس نے خالی کپ کی طرف دیکھا اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''بعض اوقات آدمی کو اپنی کھوج بھی کرنی چاہیے۔ تم ہمیشہ آنے والے وقت کے بارے میں سوچ کر پریشان نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کبھی کبھی اپنا خیال بھی رکھنا چاہیے۔''

میں نہیں سمجھ سکا کہ ان باتوں سے اس کا کیا مطلب تھا لیکن مجھے ان سے اتفاق تھا۔ پھر اس نے مجھے یاد دلایا کہ مجھ جیسے آدمی کے لیے یہ علاقہ خطرناک ہے۔

''بہتر ہوگا کہ آئندہ تم یہاں آنے کی کوشش نہ کرو۔'' اس نے مجھے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

میں باہر آیا تو ایک دس گیارہ سال کا لڑکا دو کاروں کے درمیان سے نکل کر اچانک ہی سامنے آ گیا۔ اس کی چال میں جارحانہ پن تھا اور اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ مستقبل میں وہ کوئی بڑا مجرم بنے گا۔

''تم رینی ہو نا؟ کچھ لوگ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''کہاں؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس بلاک کے ختم ہونے پر ایک اسکول ہے۔ اس کے عقب میں ایک احاطہ نظر آئے گا۔ ڈریک اور جونز تمہیں وہیں مل جائیں گے۔''

''تم میرے ساتھ چلنا پسند کرو گے؟'' میں نے اپنی کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

وہ ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ''میں اجنبیوں کے ساتھ گاڑی میں نہیں بیٹھتا۔''

☆☆☆

باسکٹ بال کورٹ کی سیڑھیوں پر وہ دونوں میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ڈیمنڈ جونز بولا۔ ''تمہارے خیال میں ٹیرل کا قاتل کون ہو سکتا ہے؟''

میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کر کے باسکٹ بال کورٹ کی طرف دیکھنا شروع کر دیا جہاں کچھ لڑکے کھیل رہے تھے۔ انہی میں ایک کھلاڑی ایسا بھی تھا جسے میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ وہ کئی یونیورسٹیوں کی جانب سے کھیل چکا تھا اور اس کا مستقبل بہت روشن تھا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ وہاں موجود تماشائیوں میں سے کسی ایک نے بھی اس پر توجہ نہیں دی۔ ان کی نظر میں جونز اور ڈریک جیسے لوگ ہیروز کا درجہ رکھتے تھے جن کی پیروی کر کے مستقبل میں وہ تیرہ چودہ سال کے لڑکے اسلحے کے زور پر منشیات فروشی اور دیگر غیر قانونی کام کر سکتے تھے۔

''کیا یہ سچ ہے کہ تم نے کسی سیاسی وجہ سے اس ٹرک پر آتش گیر مادہ پھینکا تھا؟'' میں نے جواب دینے کے بجائے اپنی طرف سے ایک سوال کر دیا۔

''میں یہ نہیں کہتا کہ ہم نے کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا ہے۔'' ڈریک بولا۔ ''ٹیرل نے اس ٹرک پر آتش گیر مادہ اس لیے پھینکا تھا کہ وہ نشے میں ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی ناراض تھا کہ وہ لوگ ہمیں مار رہے تھے۔''

''اسے تم اجتماعی قتل بھی کہہ سکتے ہو۔'' جونز بولا۔ ''جس طرح ان لوگوں نے روانڈا میں کیا لیکن یہاں کوئی نہیں جانتا، صرف ٹیرل معاملے کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔''

''کیا وہ بھی تمہارے گروہ میں شامل تھا؟''

''کیسا گروہ؟'' ڈریک نے پوچھا۔ ''یہاں ایسا کوئی گروہ نہیں ہے۔''

''ٹیرل کسی سرگرمی میں ملوث نہیں تھا۔ وہ میرے پاس صرف اس لیے آیا تھا کہ ہم اس کی بات سنیں گے۔''

''اس نے تمہیں بتایا تھا کہ انڈسٹریل پارک میں کیا ہو رہا ہے؟''

''مجھے تفصیلات کا علم نہیں البتہ اتنا جانتا ہوں کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔''

''اس نے یہ تو بتایا ہوگا کہ وہ لوگ یہاں کن چیزوں کا ذخیرہ کر رہے ہیں؟''

''کیمیکل اور اس جیسی ناکارہ چیزیں جس میں غیر قانونی مواد بھی شامل ہے۔ ٹیرل کا کہنا تھا کہ اسی وجہ سے اس کے دادا کو ہڈیوں کا سرطان ہو گیا اور وہ مر گئے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی اور مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ محض ایک آوارہ لڑکا نہیں بلکہ ایک دردمند انسان بھی ہے۔ ''وہ یہ بھی کہا کرتا تھا کہ اسی وجہ سے اس کی بہن کو خون کا سرطان ہو گیا تھا۔''

''اسی وجہ سے یہاں کے لوگ مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو رہے ہیں۔'' ڈریک بولا۔ ''میں جس عمارت میں رہتا ہوں وہاں کم از کم چھ بچے سرطان کا شکار ہو گئے ہیں۔''

جونز اس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''ٹیرل نے اس بارے میں مکمل معلومات جمع کر لی تھیں۔ جن دنوں وہ وہاں کام کر رہا تھا تو اس نے اپنے موبائل فون سے تصویریں اتاری تھیں۔ اس کے دادا نے جو کچھ بتایا اور انٹرنیٹ سے جو معلومات حاصل ہوئیں، وہ سب اس نے نوٹ کر لی تھیں۔ اس نے وہ سب چیزیں مجھے دکھائیں کیونکہ وہ جانتا تھا کہ میری اپنی بہن بھی کینسر سے مری تھی۔''

"اسی لیے تم نے ٹرک پر آتش گیر مادہ پھینکا تھا؟" میں نے اسے کریدا۔

"وہ یہ کام خود ہی کرنا چاہتا تھا لیکن ہمارا خیال تھا کہ یہ اس کے بس کا روگ نہیں اس لیے ہم ساتھ چلے گئے۔ شاید ایک وجہ یہ بھی ہو کہ مجھے اپنی چھ سالہ بہن کے مرنے کا بہت دکھ تھا۔"

"ٹیرل ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ جونز کی بہن پاؤلا کو انہی لوگوں نے مارا ہے۔" ڈریک بولا۔ "کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اس زہر کو پھیلنے سے روکتا چنانچہ ہم نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ ہم پارک کے سامنے والے گیٹ پر پہنچے لیکن وہاں ایک ٹرک کھڑا ہوا تھا جس کے انجن میں کوئی خرابی ہو گئی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی ٹیرل پاگل ہو گیا اور چلاتے ہوئے کہنے لگا ---- یہی بچوں کے قاتل ہیں اور نازیوں سے بھی بدتر ہیں۔ پھر اس نے ان پر آتش گیر مادہ پھینک دیا اور ٹرک نے دیکھتے ہی دیکھتے آگ پکڑ لی۔" وہ جمع کا صیغہ استعمال کر رہا تھا۔ اس لیے میں نے پوچھا۔ "کیا ٹرک میں دو افراد تھے؟"

"ہاں اور اسی وجہ سے صورتِ حال پیچیدہ ہو گئی۔" جونز بولا۔ "پسنجر سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی کے ہاتھ میں گن تھی۔ اس نے ٹرک سے چھلانگ لگائی اور ہماری طرف بڑھا۔ مجبوراً مجھے اپنے دفاع میں فائر کرنا پڑا اور تین گولیاں اس کے سینے میں پیوست ہو گئیں۔"

ڈریک نے اِدھر اُدھر دیکھا اور رازداری سے بولا۔ "اس کا نام گیا کومیلی تھا۔"

میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "تم نے پال کارڈو کے بھتیجے کو مار ڈالا۔ جانتے ہو کہ وہ ----"

"وہ مونیٹسی کا ساتھی ہے۔" ڈریک اطمینان سے بولا۔

"صرف یہی نہیں بلکہ وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔"

"ہم جانتے ہیں کہ وہ کیا چیز ہے۔" جونز بولا۔ "ہم نے اسی لیے تمہیں یہاں بلایا ہے۔"

"تمہیں مونیٹسی پر نظر رکھنی ہے۔" ڈریک بولا۔ "اپنا معاوضہ بتاؤ۔ ضروری نہیں کہ ہم اس کی ادائیگی کر سکیں لیکن اس طرح ہمیں بات شروع کرنے میں آسانی رہے گی۔"

"کیا تم میری خدمات حاصل کرنا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ تم اسے کیا نام دیتے ہو۔" جونز بولا۔ "ہمیں اپنے کام سے مطلب ہے۔"

☆☆☆

دوسرے دن صبح گیارہ بجے میں اسپتال کے باہر ایک بینچ پر بیٹھا ان سب باتوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا جو مجھے ڈریک اور جونز سے ملنے کے بعد معلوم ہوئی تھیں۔ وہاں سے میں پبلک لائبریری میں چلا گیا اور دو گھنٹے بعد وہاں سے نکلا تو میرے ذہن میں مختلف کیمیکلز مثلاً بینزین، ڈائی آکسین اور ڈائی کلورومیتھین جیسے لفظ گونج رہے تھے۔ ہر سال بائیس بلین پاؤنڈ زہریلے اور خطرناک کیمیکل غیر قانونی طریقے سے مارکیٹ میں لائے جاتے تھے۔ انہیں ایسی جگہوں پر اسٹور کیا جاتا جو غریب اور سیاہ فام آبادیوں کے سرے پر واقع ہوتی تھیں۔ ان کی وجہ سے ماحول میں آلودگی بڑھ جاتی اور ان سے نکلنے والی زہریلی گیس، بچوں میں سرطان کی بیماری کا سبب بن رہی تھی۔

ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ایک گاڑی اسپتال کے مرکزی دروازے پر آ کر رکی اور اس میں سے ڈان ایلس باہر نکلا۔ اس کے اندر جانے کے تھوڑی دیر بعد میں بھی دوسری منزل پر واقع کیفے ٹیریا میں چلا گیا۔ ایلس ایک میز پر بیٹھا میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم نے فون کیا۔" وہ اپنے پسندیدہ مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔ "تم سے ملنے کے بعد میں مسلسل اسی بارے میں سوچتا رہا ہوں لیکن میری یادداشت اور اعصاب ساتھ نہیں دے رہے۔"

"یہ تو بتا سکتے ہو کہ اس ٹرک پر تم کیا سامان لے کر جاتے تھے؟"

"بڑے بڑے ڈرم اور پلاسٹک کے کین۔ میرا خیال ہے کہ اس میں تیل یا کیمیکل ہوتا تھا لیکن مجھے اس کی تفصیل معلوم نہیں۔ وہ مجھے کوئی کاغذ بھی نہیں دیتے تھے۔ سارا کام فون کے ذریعے ہی ہوتا تھا۔ میں تقریباً پانچ سال سے یہ کام کر رہا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ ان چیزوں کو ذخیرہ کرنے کا سلسلہ بہت پہلے سے چل رہا تھا۔"

"گیا کومیلی تمہارے ساتھ کیوں گیا تھا؟"

"اسے وہاں کوئی کام تھا۔ ویسے بھی میں سوال جواب نہیں کرتا۔ میرا کام ٹرک چلانا ہے۔ اس کی گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ میں نے کہا بھی کہ اگر کوئی معمولی خرابی ہوئی تو ٹھیک کر دیتا ہوں لیکن وہ بولا کہ دیر ہو رہی ہے۔ واپسی پر دیکھ لیں گے پھر جب میرا ٹرک بھی خراب ہو گیا تو وہ پریشان ہو گیا۔ اسی دوران میں وہ لڑکے وہاں آ گئے۔" اس کی آواز بھرا گئی اور وہ لمحہ بھر کے لیے رکنے کے بعد بولا۔ "میرا خیال ہے کہ کسی نے اس کی لاش وہاں سے ہٹا دی ہوگی کیونکہ

مجھے ہوش آیا تو سب لوگ یہی کہہ رہے تھے کہ میں ٹرک میں اکیلا تھا۔ پھر ایک اجنبی شخص آئی سی یو میں مجھ سے ملنے آیا اور بتایا کہ مجھے اپنے بیان میں کیا کہنا ہے۔ اگر کوئی مختلف بات کہی تو معاملات مزید پیچیدہ ہو جائیں گے۔"

"میری بات سنو ایلس!" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "اب بھی پولیس میں میرے کئی دوست موجود ہیں۔"

"اس بات کو بھول جاؤ۔" وہ قدرے بلند آواز میں بولا۔ "میں نے تمہیں اس لیے بتا دیا ہے کہ اپنے ذہن کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا اور ویسے بھی تم اس بارے میں کچھ نہ کچھ جانتے تھے لیکن میں کسی اور کے سامنے کبھی کچھ نہیں کہوں گا۔"

"کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا کہہ دینا بہت ضروری ہے۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میرے لیے اپنی اور بیوی بچوں کی سلامتی بہت ضروری ہے۔" وہ تلخی سے بولا۔ "مجھے جو کہنا تھا وہ کہہ دیا اور اب میں یہ بات دوبارہ نہیں دہراؤں گا۔"

☆☆☆

دو گھنٹے بعد میں اپنے اپارٹمنٹ کی عمارت کے سامنے سڑک پر لیٹے ہوئے اس شخص کے خوفناک چہرے کو دیکھ رہا تھا جس نے میرے سر کی پشت پر کاری ضرب لگا کر گومڑ اور اپنے مضبوط جوتوں کی ٹھوکر سے میری دو پسلیاں توڑ دی تھیں۔ وہ قہر آلود نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "مجھے پہچانتے ہو؟"

میری آنکھوں کے آگے تارے ناچ رہے تھے اور مجھ میں کچھ بولنے کی سکت نہ تھی۔ "میرا نام فرینکی ہے۔"

اس کے بارے میں آخری اطلاع یہ تھی کہ وہ کسی فراڈ کے الزام میں سزا کاٹ رہا ہے۔ میں نے بمشکل کہا۔ "تم جیل سے کب باہر آئے؟"

"دو ماہ پہلے۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے ایک اور لات ماری۔ یوں لگا جیسے مزید پسلیاں ٹوٹ گئی ہوں۔ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"میرے پاس تمہارے لیے ایک پیغام ہے۔"

"یہی کہ میں پیرش انڈسٹریل پارک سے دور رہوں؟"

"امید ہے کہ اب یہ بات اچھی طرح تمہاری سمجھ میں آ گئی ہوگی۔" یہ کہہ کر اس نے پیچھے مڑ کر دور کھڑی سلور لیکسس کی طرف دیکھا جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر گھنگرالے بالوں والا بھاری بھرکم شخص بیٹھا ہوا تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ یہ وہی شخص تھا جو ٹیرل کے قتل کے وقت گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ فرینکی کے ساتھ دیکھ کر اس کا نام بھی ذہن میں آ گیا۔ وہ جیکی مارکونی تھا اور سولہ سال کی عمر سے ہی مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث تھا۔

"جیکی تمہارے ساتھ کیوں آیا ہے؟"

"یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔" وہ غراتے ہوئے بولا۔ "اچھی طرح سمجھ لو کہ کارڈو اس معاملے میں بہت سنجیدہ ہے۔ اگر تم باز نہ آئے تو اگلی بار مجھے تمہارے سر کا نشانہ لینا پڑے گا۔ آج تمہاری جان بخشی صرف ٹونی کی ہدایت پر ہو رہی ہے گو کہ اب وہ باس نہیں رہا لیکن اس کی رائے اہمیت رکھتی ہے۔"

میں نے اس واقعے کا ذکر نیٹ روڈلف سے کیا تو اس نے مجھے ای پی اے سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ وفاقی ادارہ ماحولیاتی تحفظ کے حوالے سے کام کرتا ہے جبکہ میرا خیال تھا کہ وہ اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے متعلقہ ادارے کو اس غیر قانونی سرگرمی اور ٹیرل کے قتل کی تحقیقات کے لیے آمادہ کر سکے گا لیکن لگتا تھا کہ وہاں کسی کو اس معاملے سے دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے مایوس ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا تم نے یہی کہنے کے لیے مجھے بلایا تھا؟"

"نہیں، میرا مشورہ ہے کہ معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بجائے کسی بااختیار ادارے کا سہارا لو۔"

میری پسلیوں میں درد کی شدید لہر اٹھی۔ خوش قسمت تھا کہ صرف تین پسلیاں ہی ٹوٹی تھیں لیکن جو بچ گئی تھیں، ان کا حال بھی کچھ اچھا نہ تھا۔

"وہ بہت خطرناک لوگ ہیں اور فرینکی کی دھمکی کو نظر انداز کرنا حماقت ہوگی۔" وہ بیئر کا گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔ "ای پی اے کو فون کر دو۔ وہ خود ہی اس جگہ کی تلاشی لے کر کارڈو کے خلاف کارروائی کر لیں گے۔"

"ان کی تفتیش مکمل ہونے سے پہلے ہی تمام اہم شہادتیں ضائع کر دی جائیں گی اور میری لاش دریا کی لہروں پر تیر رہی ہوگی۔"

اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں ریٹائر ہو چکا ہوں۔"

☆☆☆

میں ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو کسی عظیم مقصد کی خاطر اپنی جان کی پروا کیے بغیر مجرموں سے ٹکرا جاتے ہیں یا بدعنوان پولیس افسروں کو بے نقاب کرتے ہوئے انہیں کوئی

خوف محسوس نہیں ہوتا۔ مجھے ہمیشہ ان لوگوں کی جرأت اور قربانی نے متاثر کیا۔ میری زندگی میں ایسا کوئی گلیمر نہیں تھا لیکن میں اپنے آپ کو اس صورتِ حال سے بالکل لاتعلق بھی نہیں رکھ سکتا تھا چنانچہ میں نے ای پی اے کو فون کرنے کے بجائے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

اگلے روز سہ پہر کے وقت میں ونی موئیسی سے ملنے جارہا تھا۔ وہ اپنے چچا ٹونی کے کہنے پر مجھے آدھ گھنٹا دینے کے لیے تیار ہوگیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اس ملاقات کے لیے اپنے نصف درجن اطالوی ریستورانوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے گا یا اگر میں زیادہ خوش قسمت ہوا تو مجھے بروکس روڈ پر واقع اس کے وسیع و عریض کلب میں مدعو کیا جائے گا لیکن اس کے بجائے مجھے ایک معمولی درجے کے ریستوران میں بلایا گیا۔ وہاں تین عدد چوڑے کندھوں والے آدمی کاؤنٹر پر بیٹھے کافی سے دل بہلا رہے تھے۔ ان کی پشت میری جانب تھی۔ مجھے یہ دیکھنے کے لیے ان کے چہرے دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ موئیسی کے آدمی ہیں لیکن وہ خود نظر نہیں آرہا تھا۔ شاید اپنے چچا ٹونی کی وجہ سے وہ مجھے عزت دے رہا تھا۔ ٹونی نے اس شہر میں رہ کر پچیس سال تک مافیا کو چلایا تھا۔ وہ لالچی، اقتدار کا بھوکا اور بے رحم شخص تھا لیکن دوستوں کے ساتھ وہ بڑی خوش اخلاقی اور ہمدردی سے پیش آتا اور ان کی ہر ممکن مدد کرتا تھا۔

اس کا بھتیجا موئیسی صرف جسمانی لحاظ سے ہی نہیں بلکہ عادات و اطوار کے حوالے سے بھی اس کے برعکس تھا۔ پولیس کے ریکارڈ میں وہ دہشت گردوں کا بے تاج حکمراں تھا۔ اس نے مافیا کی سربراہی سنبھالتے ہی پرانا نظام یکسر تبدیل کردیا اور ان تمام ٹھکانوں کو پھر سے آباد کیا جو ٹونی کی بیماری اور عدم توجہی کے سبب ویران ہوگئے تھے۔ اب میں اپنے استقبال کے لیے آئے ہوئے ان تین آدمیوں کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ اس چوہے دان میں آکر میں نے شاید اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔

ان میں سے ایک نے بیٹھے بیٹھے اپنا اسٹول گھمایا اور اس پر نظر پڑتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ فرینکی تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر اٹھا اور گھورتے ہوئے بولا۔ ''آخری بوتھ میں چلو۔''

اس کی ہدایت پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میں ڈرتے ڈرتے بوتھ میں داخل ہوا۔ وہاں تمام کرسیاں خالی پڑی تھیں لیکن میز پر کچھ کھانے پینے کا سامان پڑا ہوا تھا۔ لگ رہا تھا جیسے کوئی یہاں سے اٹھ کر گیا ہے۔ دو منٹ بعد موئیسی، ایک ٹشو پیپر سے منہ صاف کرتا ہوا اندر داخل ہوا۔ میں نے فلموں میں دیکھا تھا کہ لوگ اظہارِ عقیدت کے طور پر مافیا کے سربراہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہیں لیکن اس نے میری جانب ہاتھ بڑھانے کے بجائے صرف سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔ وہ مجھ سے سات سال چھوٹا تھا لیکن دیکھنے میں بڑا نظر آرہا تھا۔ لگتا تھا کہ بیٹے کی حادثاتی موت نے اسے اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

اس نے میز پر سے چاکلیٹ ملک کا گلاس اٹھایا اور اسے سونگھ کر واپس رکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں دودھ پسند ہے؟''

''بہت زیادہ نہیں۔ میں کافی اور بیئر کو ترجیح دیتا ہوں۔''

''مجھے بھی نہیں۔ اسے دیکھ کر ہی متلی ہونے لگتی ہے۔'' اس نے ایک بار پھر گلاس اٹھایا اور بولا۔ ''بیمار ہونے سے پہلے مائیکل بے تحاشا دودھ پیا کرتا تھا۔ اسے یہ جگہ بہت پسند تھی اور میں ہر اتوار کو اس کے ساتھ یہاں آیا کرتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس کے مرنے کے بعد میں یہاں کبھی قدم نہیں رکھ پاؤں گا لیکن یہاں آکر مجھے بہت سکون ملتا ہے اور میں اس کی پسندیدہ چیزیں منگوا کر اپنا معدہ بھر لیتا ہوں۔''

''مجھے اس کی موت پر افسوس ہے۔'' میں نے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے کہا لیکن مجھے خود اپنی آواز کھوکھلی محسوس ہورہی تھی۔

''میرے چچا تمہیں پسند کرتے ہیں اور میں ان کی بہت عزت کرتا ہوں۔ اسی لیے تمہاری بات سننے کے لیے تیار ہوگیا ہوں لیکن کوئی وعدہ نہیں کرسکتا۔''

میں نے اسے اپنی معلومات اور شبہات کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ اس نے میری بات غور سے سنی اور بولا۔ ''میں اور پال کارڈو دونوں ہی کاروباری لوگ ہیں اور اپنے اپنے معاملات میں الجھے رہتے ہیں۔''

''تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ تمہیں پیرش انڈسٹریل پارک میں ہونے والی سرگرمیوں کے بارے میں کوئی علم نہیں؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا اور نہ ہی مجھے اس کی پروا ہے۔''

''کیونکہ تمہیں بھی باقاعدگی سے حصہ مل رہا ہے۔''

اس کی زبان ہونٹوں سے باہر آگئی اور وہ چیختے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تمہارے لیے ایک مخلصانہ مشورہ ہے کیونکہ تم میرے چچا کے دوست ہو۔ جو کچھ تم نے مجھے بتایا ہے، اس کا کسی اور بالخصوص سرکاری اہلکاروں کے سامنے مت کہنا۔''

میں نے ایک نظر میز پر رکھی کھانے پینے کی اشیا پر ڈالی اور بولا۔ ''تمہارے بیٹے کی موت کینسر سے واقع ہوئی تھی؟''

''اسے خون کا سرطان ہوگیا تھا۔'' اس کی آواز برف کی طرح سرد تھی۔ ''مجھے ماضی کی طرف مت دھکیلو رینی۔''

''میں کل اسپتال کے ایمرجنسی روم میں گیا تھا۔ وہاں زیادہ تر مریض شہر کے جنوبی حصے سے آئے ہوئے تھے۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' اس نے بے رخی سے کہا۔

''کیا تم میرے ساتھ وہاں جانا پسند کرو گے؟'' میں نے کہا۔

''کیا مطلب ہے؟'' وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''میں وہاں جا کر کیا کروں گا؟''

''صرف ایک گھنٹے کی تو بات ہے۔ اس کے بعد میں اپنی زبان بند کرلوں گا۔ پھر تمہیں یہ پریشانی نہیں ہوگی کہ تمہارا چچا ناراض ہوجائے گا۔''

''میں پریشان نہیں ہوں۔''

''اس طرح تم مجھے قتل کرنے کی زحمت سے بھی بچ جاؤ گے۔''

میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور ذہن کے کسی گوشے سے یہ صدا آرہی تھی کہ میرا آخری وقت قریب آن پہنچا ہے۔

اس نے مجھے دیکھ کر سر ہلایا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں تمہیں ایک گھنٹا دے سکتا ہوں۔ تم ہمارے ساتھ چلو گے۔'' وہ میری کلائی پکڑ کر آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''اگر آئندہ تم نے میرے بیٹے کا نام لے کر مجھے ذہنی جھٹکا دینے کی کوشش کی تو میں خود تمہارا کام تمام کردوں گا۔''

☆☆☆

ہمیں وہاں ایک گھنٹا رکنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ بچوں کے وارڈ میں بیس منٹ گزارنے کے بعد اس نے میرا بازو پکڑا اور بھیگی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔ اس جگہ تو سانس لینا بھی دشوار ہے۔''

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر پلٹا اور سر جھکاتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے سامنے سے گزرتا چلا گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی لفٹ کی طرف بڑھا لیکن اس کے ساتھ آئے ہوئے فرینکی نے میرا راستہ روک لیا اور بولا۔ ''تم اسے یہاں کیوں لائے تھے؟ اس سے تم کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے؟''

''میں اپنی زندگی بچانے کی کوشش کررہا ہوں۔''

فرینکی کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ مستقبل میں وہ مجھے کوئی رعایت دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ وہ طنز کرتے ہوئے بولا۔ ''گڈ لک!''

ونی موئیسی باہر ایک بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہونٹوں میں سگریٹ دبا رکھا تھا اور بار بار اپنی جیبوں میں کچھ تلاش کررہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ''شاید میرا لائٹر گم ہوگیا ہے۔ کہیں میں ریستوران میں تو نہیں بھول آیا؟''

میں نے اپنا لائٹر اسے دیتے ہوئے کہا۔ ''تم ٹھیک تو ہو؟''

اس نے سگریٹ سلگا کر ایک گہرا کش لیا اور دھواں خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے آج دوسری بار لوگوں کو موت سے قریب دیکھا ہے۔ مائیکل دوسرے اسپتال میں تھا لیکن دونوں جگہ منظر ایک جیسا ہی ہے۔ جب مائیکل مرا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ وہ اتنا کمزور ہوچکا تھا کہ اسے میرے ہاتھ پر گرفت قائم رکھنا مشکل ہورہا تھا۔''

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اتنی دیر میں فرینکی اور اس کے دوسرے ساتھی بھی وہاں آگئے۔ فرینکی میری طرف جارحانہ انداز میں بڑھا۔ لگتا تھا کہ وہ میری باقی ماندہ پسلیاں بھی توڑ ڈالے گا۔ موئیسی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا اور بولا۔ ''ان بچوں کی اس حالت کے ہم ذمے دار ہیں۔ ہم نے انڈسٹریل پارک میں جو کچھ جمع کررکھا ہے، اسی کی وجہ سے یہ کینسر میں مبتلا ہوئے ہیں۔''

''تم سب بچوں کے لیے یہ بات نہیں کہہ سکتے۔''

''مجھے اس کی سزا ملی ہے۔ اسی وجہ سے مائیکل کو خون کا سرطان ہوا تھا۔''

''میں یہ نہیں کہہ رہا۔'' میں نے بات کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔

''مجھے اس سے غرض نہیں کہ پال کارڈو عرصہ دراز سے یہ کام کررہا تھا یا انکل ٹونی اس کے منافع میں حصے دار تھا۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ گزشتہ چھ سال سے میں بھی اس جرم میں شریک ہوگیا تھا۔ اسی لیے خدا نے مجھ سے بیٹا چھین لیا۔''

''میں تمہیں دکھ دینے کے لیے یہاں نہیں لایا تھا۔'' میں نے اس سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔

''تم کچھ بھی کہو لیکن میں جانتا ہوں کہ انسان کو اس کے کیے کی سزا دنیا میں ہی مل جاتی ہے۔'' اس نے سگریٹ بجھا کر پاؤں تلے مسلتے ہوئے کہا۔ ''کاش میں یہ منظر دیکھنے

کے لیے زندہ نہ ہوتا۔"

"اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ معاملات کو ٹھیک کرنے کے لیے تمہارے پاس ایک موقع ہے۔"

"اس طرح اچانک کاروبار بند کر دینے سے کئی مسائل پیدا ہو سکتے ہیں اور پال بھی اس سے خوش نہیں ہوگا۔ مجھے بہت ہوشیاری کے ساتھ اس سے معاملہ کرنا پڑے گا۔ اس کے لیے مجھے کم از کم تین ہفتے کا وقت درکار ہے۔ اس طرح میں یقین کرنا چاہتا ہوں کہ میرے یا ٹونی کے لیے کوئی مشکل کھڑی نہیں ہوگی۔ تین ہفتوں بعد تم کسی بھی سرکاری ادارے کو فون کر سکتے ہو۔ وہ خود ہی سارا سامان وہاں سے ہٹا دیں گے۔ فی الحال میں تمہیں یہی پیشکش کر سکتا ہوں۔"

میں نے سوچا کہ اس شہر کے لوگوں کو تیس سال سے زہر دیا جا رہا ہے۔ تین ہفتوں سے کیا فرق پڑے گا، اس طرح میرے ساتھ ساتھ جونز، ڈریک اور ڈان ایلس کی بھی جان بچ جائے گی حالانکہ اس میں کسی مجرم کے بھی صاف بچ نکل جانے کا امکان تھا لیکن اس طرح کے کاموں میں ایسا تو ہوتا ہے۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اپنے ساتھیوں کو پارکنگ کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ ان کے جانے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "کیا تم اس پر یقین رکھتے ہو کہ ہر روز کفارہ ادا کرنے اور ادھار چکانے کا ایک موقع ضرور ملتا ہے؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

وہ مجھے وہاں چھوڑ کر چلا گیا لیکن مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ میرا ضمیر مطمئن تھا۔ اگر وہ اپنی بات پر قائم رہتا تو اس طرح بہت سے لوگوں کی جانیں بچ سکتی تھیں ورنہ میرے پاس دوسرا آپشن موجود تھا۔ بے شک میری جان چلی جاتی لیکن مرنے سے پہلے میں اس کے گھناؤنے کاروبار کا راز ضرور فاش کر دیتا۔

☆☆☆

میں نہیں جانتا تھا کہ یہ معاملہ کس طرح اپنے انجام کو پہنچے گا۔ میں نے اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں کافی وقت ضائع کیا لیکن آخر میں واقعات جس ترتیب سے ظہور پذیر ہوئے، ان کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

پال کارڈو اور اس کی آشنا اپنے اپارٹمنٹ میں مردہ پائے گئے۔ لڑکی کے سینے میں دو گولیاں لگیں اور وہ جانبر نہ ہو سکی۔ پال کارڈو کی باری بعد میں آئی۔ میں نے بیئر کے دو گلاس چڑھانے کے بعد اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس قتل میں میرا ہاتھ نہیں ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ان دونوں کی موت کی ذمے داری مجھ پر عائد ہوتی تھی۔ جب آپ کسی شدت پسند کو کفارہ ادا کرنے کی ترغیب دیں گے تو اس کا کفارہ بھی پُرتشدد ہی ہوگا۔

عام حالات میں شاید جونز اور ڈریک کو بھی اپنی غلطیوں کا احساس ہو جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ چھ ہفتے قبل ڈریک اپنے ساتھی جونز کا گلا کاٹنے کی کوشش کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ ان دونوں کے درمیان منشیات کی فروخت سے حاصل ہونے والے منافع پر جھگڑا ہوا تھا لیکن میرا خیال تھا کہ ڈریک اپنے پارٹنر کی مستقل بکواس سے تنگ آ گیا تھا اور اس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی زبان بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اخبارات میں ان خبروں کی اشاعت کے بعد یہ کہانیاں بھی گردش کرنے لگیں کہ شہر کے جنوبی علاقے میں خطرناک اور زہریلے کیمیکلز کا ذخیرہ کیا جا رہا ہے جن سے نکلنے والی گیسوں کی بدولت فضائی آلودگی خطرناک حد تک بڑھ گئی ہے جو بچوں میں کینسر کی بیماری کے پھیلنے کا سبب بن رہی ہے۔ اس کہانی کے منظرِ عام پر آتے ہی ڈان ایلس نے خودکشی کر لی۔ شاید وہ بھی اپنے آپ کو اس جرم میں شریک سمجھ رہا تھا یا پھر اس نے یہ قدم اپنے بیوی اور بچوں کو موٹیسی اسٹائل کفارے سے بچانے کے لیے اٹھایا تھا۔ وجہ کچھ بھی ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ڈان ایلس ضمیر کا بوجھ برداشت نہ کر سکا اور اسی لیے وہ خودکشی جیسا انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہوا۔

اگلے دو ہفتے ان لوگوں کے لیے بے حد تباہ کن ثابت ہوئے جو کسی بھی طرح انڈسٹریل پارک یا مڈ ساؤتھ ٹرانسپورٹ سے منسلک تھے۔ ان کی گاڑیاں جلا دی گئیں۔ گودام خالی ہو گئے اور وہ خود سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نامعلوم مقامات پر روپوش ہو گئے۔ گویا میں نے موٹیسی کی جانب سے مانگی گئی تین ہفتوں کی مہلت قبول کر کے ان لوگوں کے لیے موت کا پروانہ جاری کر دیا تھا لیکن میرا ضمیر مطمئن تھا اور میں سمجھتا تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ اسی کے مستحق تھے۔

اس تمام صورتِ حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایف بی آئی

اور ای پی اے کو اپنی تحقیقات روکنا پڑی کیونکہ گروہ کے تمام ممبر مارے جا چکے تھے اور ان کے خلاف گواہی دینے والا بھی کوئی نہ تھا۔ کمپنیوں کے سربراہان، اسپتال کی انتظامیہ اور زرخرید سیاست دان جن کی سرپرستی اور تعاون سے یہ کاروبار چل رہا تھا، صاف بچ نکلے اور ان پر کوئی الزام نہ آ سکا۔ میری کیفیت بھی کچھ مختلف نہ تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ موٹیسی سے معاملہ طے کر کے میں نے کوئی غلطی تو نہیں کی۔ اگر میں اپنے آپ کو ٹیرل کے قتل تک ہی محدود رکھتا یا اپنے دوست کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے یہ ساری صورتِ حال سرکاری حکام کے علم میں لے آتا تو مزید مجرموں کی نشان دہی ہو سکتی تھی لیکن ان کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ وہ قانون کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ جب میں نے اس بارے میں سوچنا شروع کیا تو بہت سے سوال سامنے آنے لگے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ کارڈو، ٹیرل تک کیسے پہنچا جبکہ وہ اس کے دوستوں جونز اور ڈریک کو بھی نہیں جانتا تھا۔

جب میں فرانس سے تیسری بار ملنے گیا تو موسمِ بہار شروع ہو چکا تھا لیکن اس کے گھر میں ابھی تک اداسی تھی۔ وہ ایک البم لیے بیٹھی تھی۔ اس نے ٹیرل کی تصویر پر انگلی رکھی اور بولی۔ "وہ اچھا لڑکا تھا۔ مجھے اس کی بات سننا چاہیے تھی۔"

"کیا اس نے تمہیں اپنی فائل دکھائی تھی..... میرا مطلب ہے جس میں اس کا سابقہ ریکارڈ تھا؟"

"ہاں۔" فرانس نے کافی کا گھونٹ لیا اور بولی۔

"اسے اپنے دادا سے بہت محبت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح یہ کاروبار رک جائے۔ اسی لیے اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا کہ وہاں کیا ہو رہا تھا اور وہ لوگ اب تک کیا کچھ کر چکے تھے۔ وہ یہ سب کچھ اخبار والوں کے علم میں لانا چاہتا تھا لیکن میں نے اس سے کہا کہ وہ کہیں اور جانے کے بجائے مسٹر لیونسکی سے بات کرے جو سفید فام ہونے کے علاوہ پارک کی سیکیورٹی کا بھی انچارج تھا۔ وہ لوگ مارکوس کی پنشن بھی دبائے بیٹھے تھے۔"

"پنشن؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں، اس کی پنشن نو سو تیرہ ڈالرز ماہانہ تھی۔ جب ٹیرل نے مجھے یہ سب باتیں بتائیں تو میں نے اس سے کہا کہ وہ مسٹر لیونسکی کے پاس جائے اور ان سے پنشن کا مطالبہ کرے ورنہ ہم وہاں پر ہونے والی غیر قانونی سرگرمیوں کا راز افشا کر دیں گے۔ ٹیرل اس کے حق میں نہیں تھا بلکہ وہ اس جرم کو روکنے کے لیے کوئی عملی قدم اٹھانا چاہ رہا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ صرف وہ خود ہی اپنے بارے میں بہتر سوچ سکتا ہے۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا لہٰذا اس نے میری بات مان لی لیکن تم جانتے ہی ہو کہ اس کے ساتھ کیا ہوا۔"

میں نے جواب میں سر ہلا دیا۔

"میں نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ یہ سب کچھ اسی کے لیے کر رہی ہوں۔ ان پیسوں سے وہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکتا تھا اور میں بھی آخری عمر میں دربدر کی ٹھوکریں کھانے سے بچ سکتی تھی لیکن جب انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ اسے بعد میں فون کریں گے تو میں سمجھ گئی کہ اس کی جان کو خطرہ ہے۔ اسی لیے تمہارے آنے پر مجھے خوشی ہوئی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ جیل میں محفوظ رہے گا۔"

اسے یہ بتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا کہ آدھے سے زیادہ پولیس والے اور جیل کا ایک تہائی عملہ، موٹیسی اور کارڈو جیسے لوگوں کے زرخرید غلام تھے۔ اس کے بجائے میں نے یہ کہہ کر اسے تسلی دی کہ وہ ٹیرل کی بھلائی کے لیے جو کچھ کر سکتی تھی، اس نے کیا۔ اب اس بات کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ لیونسکی بھی ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے دریا میں کود کر موت کو گلے لگا لیا تھا۔

دروازے سے باہر آتے ہوئے میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ٹیرل کی تصویر پر انگلی پھیر رہی تھی۔ شاید مرتے دم تک وہ انہی یادوں کو سینے سے لگائے بیٹھی رہتی پھر میری نظروں کے سامنے موٹیسی کا چہرہ گھوم گیا جو اپنے بیٹے کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے چاکلیٹ ملک پی رہا تھا جس سے اسے متلی ہو جاتی تھی۔ میں جونز اور ڈان ایلس کو بھی فراموش نہیں کر سکتا تھا جو نہ چاہتے ہوئے بھی جرم کی دنیا میں دھکیل دیے گئے تھے۔ لمحہ بھر کے لیے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس اسپتال میں پہنچ گیا جہاں بیس سال پہلے میری بیوی اپنی بیٹی کے بے جان جسم کے پاس بیٹھی رو رہی تھی۔

چند بلاک کے فاصلے پر انڈسٹریل پارک کی صفائی شروع ہو چکی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہم اس زہریلے مادے کو دریا میں پھینک دیں یا جنگلوں میں دفن کر دیں لیکن اس کی یاد ہمیشہ ہمارے ضمیر پر کچوکے لگاتی رہے گی ـــ جب تک ہم خود زمین کے اندر چھ فٹ کی گہرائی میں دفن نہ ہو جائیں۔

ہیروں کے گرد گھومتی تیسری پراسرار کہانی

ہیرے کی تلاش

تنویر ریاض

تاریخی حقائق بعض اوقات وقت گزرنے کے ساتھ مزید سنگینی اختیار کرلیتے ہیں... اس خاندان کے ساتھ بھی یہی کچھ ہورہا تھا... وہ صاحبِ حیثیت تھے مگر ان کا خاندانی پس منظر ہمیشہ ان کے لیے ایک مسئلہ رہا تھا... وہ اپنے خاندانی رازوں کے امین تھے... مگر اچانک ہی ایک خیانت دار سامنے آگیا تھا...

دلچسپ پیرائے میں لمحہ بہ لمحہ ایک نئے پہلو کو اجاگر کرتی پرتجسس کہانی......!

لانگ آئی لینڈ کے معروف وکیل اینڈریو میک نے فریڈرک کو دیکھتے ہی گرم جوشی سے کہا۔ ’’تمہیں یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ میں جانتا ہوں کہ ان دنوں تم اپنے فارم پر کتنے مصروف ہوتے ہو۔‘‘

فریڈرک کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ دوستانہ انداز میں بولا۔ ’’میں نے جونی کو اپنی مدد کے لیے فل ٹائم ملازم رکھ لیا ہے لہٰذا تمہارے لیے کچھ وقت نکال سکتا ہوں۔‘‘

’’مجھے تمہاری یہی بات پسند ہے کہ کبھی کسی کام سے انکار نہیں کرتے۔ یاد ہے کہ آخری بار تم نے میرے ساتھ کب اشتراک کیا تھا؟ گزشتہ مارچ میں جب تم نے ایک بے گناہ عورت کو موت کی سزا سے بچایا تھا۔‘‘

’’ہاں، وہ واقعی بے گناہ تھی۔ خیر چھوڑو اس بات کو... یہ بتاؤ کہ اب میری ضرورت کیوں پیش آگئی؟‘‘

اینڈریو نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے اور قدرے آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ’’کیا کبھی تم نے دی اسٹار آف وارننگ بلڈ کا نام سنا ہے؟‘‘

فریڈرک نے اپنی پلکیں جھپکائیں اور بولا۔ ’’کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا... یہ ہے کیا؟‘‘

’’یہ ایک ہیرا ہے، بہت بڑا... اور اس کا وزن نوّے قیراط ہے۔‘‘

’’واؤ۔‘‘ فریڈرک نے حیرت سے کہا۔

’’یہ بالکل خالص اور انتہائی شفاف ہیرا ہے اور اس حجم کے ہیرے بالعموم نایاب ہوتے ہیں۔‘‘

’’یقیناً یہ بہت قیمتی ہوگا؟‘‘

اینڈریو نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’اس کی تاریخی اہمیت کو دیکھتے ہوئے قیمت کا تعین کرنا تقریباً ناممکن ہے۔‘‘

’’اب یہ ہیرا کہاں ہے؟‘‘ فریڈرک نے پوچھا۔

اینڈریو نے کچھ کہنے سے پہلے میز پر رکھے ہوئے کاغذات اٹھائے اور ان پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

’’یہ ہیرا بارھویں صدی عیسوی میں ہندوستان سے نکالا گیا تھا۔ ایک زمانے میں یہ فرانس کے بادشاہ لوئس ہفتم کی ملکہ کے پاس بھی رہا پھر کافی عرصے تک اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ سولہ سو ستانوے عیسوی میں یہ فرانس کے ایک معزز خاندان کے پاس تھا۔ اسی زمانے میں فرانس نے اسپین کے ساتھ ہسپانیولا کے جزیرے کی تقسیم کا معاہدہ کیا اور اس خاندان کے سربراہ کو فرانسیسی حصے کا حاکم بنا کر بھیجا گیا۔ وہاں پہنچنے کے کچھ ہی عرصے بعد اس کی بیوی کا انتقال ہوگیا اور یہ ہیرا اس کی سترہ سالہ بیٹی ایلینا کی ملکیت میں آگیا۔‘‘

اینڈریو نے کاغذات پلٹتے ہوئے کہا۔ ’’انہی دنوں ایک سرکش برطانوی ملاح جان اسٹیل نے بغاوت کرتے ہوئے جہاز پر قبضہ کرلیا اور جن افسروں یا عملے کے دوسرے لوگوں نے مزاحمت کی، انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پھر اس نے جہاز پر بحری قذاقوں کا مخصوص جھنڈا لگایا اور ایک نئے سفر پر روانہ ہوگیا۔ ایک سال بعد اس نے ہسپانیولا کے قریب ایک بحری جہاز پر ڈاکا ڈالا جس پر ایلینا سوار تھی۔ وہ ایک ہسپانوی شہزادے سے شادی کرنے کے لیے جا

رہی تھی۔ اسٹیل نے نہ صرف اس ہیرے پر قبضہ کیا بلکہ ایلینا کو یرغمال بنا کر شمال کی جانب روانہ ہوگیا۔ بہت سے لوگوں کو شاید یہ بات معلوم نہ ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ سولھویں صدی میں لانگ آئی لینڈ قذاقوں کے لیے جنت تھا۔ اسٹیل کا خیال تھا کہ اس ہیرے کی فروخت اور ایلینا کی رہائی کے عوض تاوان کی رقم سے وہ اس قابل ہوسکے گا کہ بحری قذاقی چھوڑ کر کوئی کاروبار شروع کردے لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ پہلے اسے برطانوی حکومت سے معافی مل جائے۔ اس کے عوض وہ فرانسیسی اور ہسپانوی جہازوں پر حملہ کرنے اور ان کا راستہ روکنے کے لیے تیار تھا۔ یہ ایک طرح کی قانونی ڈاکا زنی ہے جو حکومت کی رضامندی سے کی جاتی ہے۔ اس طرح برطانوی جہازوں کی سمندر پر اجارہ داری ہوجاتی۔‘‘

’’کہانی تو واقعی دلچسپ ہے لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ اس میں ایک اور موڑ آنے والا ہے۔‘‘ فریڈرک نے کہا۔

’’میں اسی طرف آرہا ہوں۔ جب اسٹیل نے جہاز پر قبضہ کیا تو فاتحانہ انداز میں تلوار فضا میں بلند کی جو اس کے بازو پر لگی اور اس جگہ سے خون بہنے لگا۔ یہ دیکھ کر اسٹیل نے فوراً ہی جہاز کا نام وارننگ بلڈ رکھ دیا۔ عملے کے کئی لوگوں کو یہ نام پسند نہیں آیا کیونکہ وہ اسے منحوس سمجھتے تھے لیکن اسٹیل نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ جب یہ جہاز لانگ آئی لینڈ کی جنوبی بندرگاہ کے نزدیک پہنچا تو ایک ہولناک سمندری طوفان میں پھنس گیا۔ کپتان نے جہاز کو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن اسٹیل نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے ایلینا اور ایک نوجوان قذاق جیمس ڈیول کو ساتھ لیا اور ہیرے سمیت کشتی میں سوار ہوکر ساحل تک پہنچ گیا۔ بدقسمتی سے اس نے غلط شخص کا انتخاب کیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ دورانِ سفر ایلینا اور ڈیول کے درمیان تعلقات قائم ہوچکے ہیں۔

ساحل پر بحفاظت پہنچنے کے بعد اسٹیل نے ڈیول کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ اسے قتل کرنے کے ارادے سے آگے بڑھا ہی تھا کہ ایلینا کی آنکھ کھل گئی اور اس نے خنجر سے اسٹیل پر حملہ کردیا۔ اسی اثنا میں کچھ دوسرے قذاق بھی ڈوبتے ہوئے جہاز سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ ایلینا اور ڈیول کو معلوم تھا کہ وہ اسٹیل کے پاس اس ہیرے کی موجودگی کے بارے میں جانتے ہیں اور اگر انہیں معلوم ہوگیا کہ وہ ہیرا ان کے پاس ہے تو وہ دونوں کو مار ڈالیں گے لہٰذا انہوں نے وہ ہیرا وہیں چھپا دیا اور وہاں سے فرار ہوگئے۔ انہوں نے عارضی طور پر ایک بستی میں پناہ لے لی۔ ایک ماہ بعد ڈیول ہیرا نکالنے اس جگہ واپس آیا لیکن وہ

ہیرا غائب ہو چکا تھا۔"

"کیا وہ ہیرا دوسرے قذاقوں کو مل گیا؟" فریڈرک نے پوچھا۔

"کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے بعد کسی نے اس ہیرے کو دیکھا اور نہ اس کے بارے میں کچھ سنا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ وہ ہیرا کسی دوسرے قذاق کے ہاتھ لگ گیا اور اس نے اسے کہیں چھپا دیا لیکن بعد میں اسے وہ دوبارہ حاصل نہ کر سکا۔"

"تمہیں یاد ہے ہم نوجوانی میں بانگ پر وہاں جایا کرتے تھے۔ ہم وہاں کے چپے چپے سے واقف ہیں۔ کیوں نہ ہم اس ہیرے کو تلاش کریں، شاید قسمت ساتھ دے جائے۔"

"میں نے تمہیں اس کام کے لیے نہیں بلایا۔" اینڈریو قدرے جھنجلاتے ہوئے بولا۔ "گزشتہ مارچ میں تم نے میری مدد کی تھی اور اصل قاتل کو تلاش کر کے ایک بے گناہ عورت کو سزا سے بچایا تھا اور اس کام کی کوئی فیس بھی نہیں لی تھی کیونکہ وہ عورت بہت غریب تھی... لیکن اس بار معاملہ مختلف ہے اور ہمارا موکل صرف لانگ آئی لینڈ کا ہی نہیں بلکہ غالباً امریکا کا امیر ترین شخص ہے۔"

"کیا میں اس کا نام جان سکتا ہوں؟"

"وین میر!"

یہ نام سنتے ہی فریڈرک سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور چونکتے ہوئے بولا۔ "تم ان لوگوں کی بات کر رہے ہو جن کا ریلوے اور جہاز رانی کا کاروبار ہے؟"

"اس کے علاوہ بھی وہ کئی دوسرے کاروبار کرتے ہیں۔" اینڈریو بے نیازی سے بولا۔ "میں صرف ان کے مقامی معاملات دیکھتا ہوں، بقیہ معاملات کی ذمے داری نیویارک سٹی کی ایک فرم کے سپرد ہے۔"

"ان لوگوں کا اس ہیرے سے کیا تعلق ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ ڈیول اور ایلینا نے اس ہیرے سے محروم ہو جانے کے بعد زندگی گزارنے کے لیے نئے سرے سے جدوجہد کی ہوگی۔ سب سے پہلے انہوں نے زمین حاصل کی پھر جہاز رانی کی طرف متوجہ ہوئے۔ ڈیول ایک ذہین کاروباری شخص تھا۔ رفتہ رفتہ ترقی کرتے کرتے وہ ایک شپ یارڈ کا مالک بن گیا اور سننے میں آیا ہے کہ وین میرز بھی اسی کی نسل سے ہیں۔"

فریڈرک نے آہستہ سے اپنا سر ہلایا اور بولا۔ "میں نے بھی اڑتی اڑتی یہ بات سنی تھی مگر اندازہ نہیں تھا کہ اس میں کتنی سچائی ہے۔"

"دو دن پہلے اس کا بیٹا رابرٹ میرے پاس آیا تھا۔ اسی نے مجھے اس ہیرے کے بارے میں ایک نئی کہانی سنائی۔"

"کیوں؟" فریڈرک نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ "اسے کسی سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ ایک ایسے ہیرے کو تلاش کر سکے گا جو سولھویں صدی میں گم ہو گیا تھا۔"

"نہیں فریڈرک! یہ مسئلہ کچھ اور ہے۔" اینڈریو نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "رابرٹ دس منٹ میں یہاں پہنچنے والا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اس سے مل لو۔ اگر تم نے اس معاملے میں دلچسپی دکھائی تو میں تمہیں اس کی خفیہ تحقیقات پر مامور کر دوں گا۔ مجھے تمہاری مہارت اور صلاحیت پر پورا بھروسا ہے۔ اگر کامیاب ہو گئے تو اتنا پیسا ملے گا کہ بہ آسانی اپنے فارم کے لیے نیا ٹریکٹر اور دوسرے ضروری آلات خرید سکو گے اور ناکامی کی صورت میں بھی تمہاری کوشش کا معقول معاوضہ مل سکتا ہے۔"

☆☆☆

رابرٹ ایک خوش پوش اور خوش مزاج شخص ثابت ہوا۔ اس نے فریڈرک سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمہارے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی تم بھرپور زندگی گزار رہے ہو۔"

"اس میں میری کوششوں سے زیادہ قسمت کا دخل ہے۔" فریڈرک انکساری سے بولا۔

رابرٹ چھیالیس سالہ دُبلا پتلا اور طویل قامت شخص تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک نظر آ رہی تھی اور وہ اپنے تین بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس نے فریڈرک کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ اینڈریو نے تمہیں اس بارے میں کچھ نہ کچھ بتا دیا ہوگا۔ اس لیے میں اصل معاملے کی طرف آتا ہوں۔ گزشتہ ہفتے میرے والد کو ایک گمنام کال موصول ہوئی۔ کوئی شخص دعویٰ کر رہا تھا کہ وہ ہیرا اس کے پاس ہے۔ اس کی گفتگو سے لگ رہا تھا کہ وہ اس ہیرے کی تاریخ اور مالیت سے واقف ہے جس سے میرے والد نے اندازہ لگایا کہ وہ کوئی جوہری ہے یا پھر ہیرے چرانے والا۔"

"اسے یہ ہیرا کہاں سے ملا؟" فریڈرک نے پوچھا۔

"اس نے یہ بتانے سے انکار کر دیا۔ وہ میرے والد کے اثر رسوخ اور حیثیت سے بھی واقف ہے اور اسے ڈر ہے کہ اگر وہ براہِ راست ہم سے رابطہ کرے گا تو ہم شاید ہیرے پر قانونی حق جتاتے ہوئے اسے کچھ بھی نہ دیں یا اس کی تلاش کے عوض معمولی معاوضے پر ٹرخا دیں جبکہ وہ بھاری رقم کا مطالبہ کر رہا ہے۔"

"اگر اس کا مطالبہ پورا نہ کیا گیا تو وہ کیا کر سکتا ہے؟"

"وہ اس پتھر کے ٹکڑے کر کے چھوٹے چھوٹے ہیروں میں تبدیل کر دے گا جو زیرِ زمین مارکیٹ میں بہ آسانی فروخت ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ نوّے قیراط کے ہیرے کو سرِعام فروخت نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کے لیے کسی اخبار میں کوئی اشتہار دے سکتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہمارے لیے ہیرا کتنا اہم ہے اور ہم اسے برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتے۔ اسی لیے وہ ہمیں بلیک میل کر رہا ہے۔"

اینڈریو نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو اس کہانی میں کوئی منطق نظر نہیں آ رہی۔ اس کے پاس یہ ہیرا کہاں سے آ سکتا ہے؟"

"کسی جرم کے پیچھے کوئی منطق نہیں ہوتی۔" فریڈرک نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"تمہارے خیال میں وہ ہم سے کچھ رقم اینٹھنا چاہ رہا ہے؟ ہم بھی یہی سمجھ رہے ہیں۔" رابرٹ نے کہا۔

"دیکھنا پڑے گا کہ اس بارے میں قانون کیا کہتا ہے لیکن میری نظر میں یہ دھوکا دہی ہے۔ کیا اس نے تمہارے والد کو کوئی دھمکی دی تھی؟" فریڈرک نے پوچھا۔

"نہیں، صرف اس ہیرے کو تباہ کرنے کے علاوہ اس نے کچھ نہیں کہا۔"

"ایسی صورت میں تم بھی... رقم کی ادائیگی پر آمادہ نہیں ہو سکتے جب تک کہ تمہیں اس کے پاس ہیرے کی موجودگی کا یقین نہ ہو جائے۔"

"ظاہر ہے۔" رابرٹ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں اسی لیے تمہارے پاس آیا ہوں۔ تمہارا کام اس شخص کو تلاش کرنا ہے۔ اگر اس کے پاس ہیرا ہے تو ہم اس سے بات چیت کر کے معاملہ طے کر لیں گے... اگر وہ شخص ہمیں ٹھگنے کی کوشش کر رہا ہے تو پھر ہم قانونی کارروائی سے گریز نہیں کریں گے۔"

"میرا مشورہ ہے کہ تم اس کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دو اور کہہ دو کہ بے شک وہ اس ہیرے کے ٹکڑے کر کے زیورات کی مارکیٹ میں بیچ دے... تمہیں اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔" فریڈرک نے کہا۔

"اس میں کچھ مسائل ہیں۔" رابرٹ نے کہا۔ "گو کہ یہ شخص مکار معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود دو باتیں ہمیں کھٹک رہی ہیں۔"

"وہ کیا؟"

"اس نے والد کو بتایا کہ اس کے پاس ہیرے کی تصاویر ہیں، وہ انہیں ڈاک کے ذریعے بھیج سکتا ہے تاکہ ہمیں یقین آ جائے کہ وہ ہیرا اس کے قبضے میں ہے۔ دوسری بات یہ کہ اسے اس ہیرے کے ساتھ ہمارے خاندانی تعلق کے بارے میں کیسے معلوم ہوا جبکہ کبھی کسی باہر کے آدمی کے سامنے اس کا تذکرہ نہیں ہوا۔"

"کیا اس نے وہ تصویریں بھیجیں؟" فریڈرک نے پوچھا۔

"نہیں، والد نے اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا تھا کیونکہ ہماری ڈاک اسٹاف کے ہاتھوں میں جاتی ہے اور ذاتی خطوط بھی پہلے سیکریٹری دیکھتی ہے کیونکہ ایسے خطوط میں بھی لوگ متفرق مسائل بیان کرتے ہیں۔ کوئی سرمایہ کاری کی ترغیب دے رہا ہوتا ہے تو کسی کو قرض چاہیے ہوتا ہے۔ اس لیے ہم نہیں چاہتے تھے کہ وہ تصویریں اسٹاف کی نظر سے گزریں اور انہیں معاملے کا علم ہو جائے۔"

"تمہارے والد نے ہیرے کے حصول میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا؟"

"انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ خاندان کے لوگوں سے مشورہ کرنے کے لیے انہیں کچھ وقت چاہیے۔ اس شخص نے کہا ہے کہ وہ ایک ہفتے بعد یعنی پیر والے دن فون کرے گا اور اگر ہم وہ ہیرا حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں تو اس کے لیے رقم کا انتظام کر لیں۔"

"اس نے کتنی رقم کا مطالبہ کیا ہے؟"

"دس لاکھ پاؤنڈ۔" رابرٹ نے آہستہ سے کہا۔

"اوہ، یہ تو خاصی بڑی رقم ہے۔" فریڈرک اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "اب تو مجھے اس شخص کو تلاش کرنا ہی ہوگا۔"

☆☆☆

منگل کی صبح وہ پبلک لائبریری میں بیٹھا پرانے اخباروں کا مطالعہ کر رہا تھا اور میز پر ایک ضخیم مجلد کتاب بھی رکھی ہوئی تھی جس میں لانگ آئی لینڈ کے بااثر خاندانوں کی تاریخ بیان کی گئی تھی۔ اس مواد کے مطالعے سے فریڈرک کو وین میر کے خاندان کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل ہو گئیں۔ یہ لوگ زبردست کاروباری سوجھ بوجھ کے مالک تھے اور ہمیشہ نفع بخش کاروبار کی تلاش میں رہتے تھے۔ مثلاً ایک موقع پر جب انہیں ریل بزنس میں نقصان کا اندیشہ ہوا تو انہوں نے بڑے پیمانے پر سرمایہ توانائی کے شعبے میں منتقل کر دیا۔ اسی طرح ٹیکس بچانے کے لیے اپنے

جہازوں کی رجسٹریشن پاناما میں کروالی اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی کو جائداد کے کاروبار میں لگا دیا۔ فریڈرک نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ رابرٹ کے باپ اور خاندان کے سربراہ زین وان میر سے ملاقات کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر وہاں سے اٹھ گیا۔

آدھ گھنٹے بعد وہ وان میر کی عالی شان حویلی کے دروازے پر موجود تھا۔ ایک باوردی ملازم نے اس کا استقبال کیا اور اسے ایک وسیع و عریض لائبریری میں لے گیا جو کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ پانچ منٹ کے بعد زین وان میر کی آمد ہوئی۔ اس نے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے تمہاری بہت تعریف سنی ہے۔۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ اس معاملے میں ہماری مدد کرو۔ تمہاری خواہش پر میں نے گھر کے دوسرے لوگوں کو بھی بلا لیا ہے۔ وہ آنے ہی والے ہیں لیکن اس سے پہلے میں تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اگر اس شخص کے پاس وہ ہیرا ہے تو میں اسے حاصل کرنے کے لیے دس لاکھ پاؤنڈز بھی دے سکتا ہوں اور اگر وہ مجھے ٹھگنے کی کوشش کر رہا ہے تو اسے سزا ملنی چاہیے۔ اس صورت میں معافی کی کوئی گنجائش نہیں۔ میں اسے سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہوں گا لیکن یہ تمہارا مسئلہ نہیں۔ تمہیں صرف اس شخص کو تلاش کرنا ہے۔ اگر اس کے پاس ہیرا ہے تو اسے حاصل کرنے کے لیے میں تھوڑی سی ناخوشگوار شہرت بھی برداشت کر لوں گا۔''

''کیا واقعی تم اس صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو؟ جب یہ معاملہ کھلے گا تو بہت سی باتیں سامنے آئیں گی۔'' میں نے اس کے ماضی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے۔

وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ جان ایف کینیڈی کا باپ کینیڈا سے آئرش وہسکی اسمگل کیا کرتا تھا۔ سارا زمانہ یہ بات جانتا ہے۔ اس کے باوجود جان پہلے سینیٹر اور بعد میں امریکا کا صدر منتخب ہو گیا۔ اگر میری رگوں میں کسی بحری قزاق کا خون دوڑ رہا ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کئی سو سال پہلے ہمارے آبا و اجداد نے یہ پیشہ چھوڑ کر کاروبار شروع کر دیا تھا اور اب یہ محض ایک افسانوی سی بات معلوم ہوتی ہے۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی لائبریری کا دروازہ کھلا اور خاندان کے دیگر افراد اندر داخل ہوئے۔ ان میں اس کی بیوی مارتھا، بڑا بیٹا رابرٹ، اس کی بیوی ایملی، چھوٹا بیٹا گریگ، اس کی بیوی اور سب سے بعد میں آنے والی تیس سالہ بیٹی سارہ شامل تھی جس کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔

تعارف مکمل ہونے کے بعد زین نے فریڈرک کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں اس صورتِ حال پر غور کر لیا ہوگا۔ اب ہم اس بارے میں تمہارے خیالات جاننا چاہتے ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ اب تک کسی کو بھی یہ بات معلوم نہیں کہ تمہارے خاندان کا تعلق کسی بحری قزاق سے رہا ہے۔ میں نے تمہارے خاندان کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اور اس میں کہیں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ لیکن لگتا ہے کہ جس شخص سے ہمارا واسطہ پڑا ہے، وہ اس خاندانی راز سے واقف ہے جبکہ اخبارات اور لانگ آئی لینڈ کے خاندانوں کی تاریخ لکھنے والوں کو بھی یہ بات معلوم نہیں تھی۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایسا شخص کون ہو سکتا ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے باری باری تمام افراد پر نظر ڈالی اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ امکان موجود ہے کہ کوئی اجنبی یا واقف کار اس راز سے آشنا ہو گیا ہے اور اس سے فائدہ اٹھانا چاہ رہا ہو۔ دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کے پاس واقعی وہ ہیرا موجود ہے اور وہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور اگر اسے میری گستاخی نہ سمجھا جائے تو اس کمرے میں اس کی موجودگی کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔''

رابرٹ اور گریگ ہنسنے لگے۔ زین نے بھی ان کا ساتھ دیا البتہ خواتین کے چہروں پر ناگواری کے تاثرات تھے۔ زین بولا۔ ''میں تو ڈر رہا تھا کہ کہیں تم ہمارے بٹلر الفریڈ کا نام بھی مشتبہ افراد کی فہرست میں شامل نہ کر لو کیونکہ وہ چوبیس گھنٹے ہمارے ساتھ رہتا ہے اور ہم سب سے بہت قریب ہے۔''

''اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔'' فریڈرک نے کہا۔ ''ممکن ہے کہ اسے کچھ سن گن مل گئی ہو اور اس نے کہانی کے تمام ٹکڑوں کو جوڑنے کے بعد یہ منصوبہ تیار کیا ہو۔ ہم صرف اس بنیاد پر اسے الگ نہیں کر سکتے کہ وہ بٹلر ہے بلکہ میں تو تمہاری سیکریٹری کو بھی مشتبہ سمجھتا ہوں۔''

رابرٹ بولا۔ ''اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟ کیا تم نے کوئی منصوبہ بنایا ہے؟''

فریڈرک نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہ حرکت خاندان کے کسی فرد نے کی ہے تو میں زین کو بتا کر اس معاملے سے الگ ہو جاؤں گا۔ وہ میری مدد کے بغیر بھی معلوم کر سکتا ہے کہ تم میں سے کون اس منصوبے کا خالق ہے۔

صورت یہ ہو سکتی ہے کہ باہر کے کسی فرد کو جیمس ڈیول اور ہیرے کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے اور قطع نظر اس کے کہ ہیرا اس کے پاس ہے یا نہیں، وہ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لہٰذا میرا منصوبہ بالکل واضح ہے۔ مجھے سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ حرکت کس نے کی ہے۔ اگر اس میں باہر کا آدمی ملوث ہے تو میں اسے تلاش کروں گا۔ دوسری صورت میں یہ ایک خاندانی معاملہ بن جائے گا اور میں اس سے الگ ہو جاؤں گا۔''

اس کے بعد فریڈرک نے فرداً فرداً خاندان کے سبھی افراد سے علیحدگی میں بات چیت کی۔ اس کا خیال تھا کہ دوسرے لوگوں کی موجودگی میں کوئی بھی کھل کر اپنی رائے کا اظہار نہیں کر سکے گا۔ سب لوگوں نے ہی اس سے انکار کیا کہ انہوں نے یہ خاندانی راز کسی باہر کے شخص کو بتایا ہے۔ اس گفتگو کے دوران میں فریڈرک کو خاندان کے افراد کے بارے میں تفصیل سے جاننے کا موقع ملا۔ وان میر کے دونوں بیٹے باپ کے زیرِ نگرانی کاروبار میں پوری طرح شامل تھے۔ رابرٹ جائداد کی خرید و فروخت اور جہاز رانی کے کاروبار کی دیکھ بھال کر رہا تھا جبکہ گریگ کے پاس توانائی اور ریل کے شعبے تھے۔ وہ دونوں خوش گوار ازدواجی زندگی گزار رہے تھے اور والدین سے بھی ان کا گہرا تعلق تھا۔ ان کی بیویوں کے درمیان بھی اچھے تعلقات تھے اور وہ اپنی ساس مارتھا کے ساتھ مل کر فلاحی کاموں میں حصہ لیتی تھیں۔

ان لوگوں سے گفتگو کرنے کے بعد فریڈرک کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ وہ سب کھاتے پیتے خوش حال لوگ ہیں جن کے پاس کروڑوں کی جائدادیں اور کاروبار تھا۔ وہ اگر ساری زندگی بیٹھ کر کھاتے، تب بھی ان کی دولت ختم نہ ہوتی۔ اس لیے ان پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب صرف سارہ ہی رہ گئی تھی جس کا وہ انتظار کر رہا تھا۔ اس نے آنے میں خاصی دیر لگا دی۔ وہ خاصی بیزار نظر آ رہی تھی اس نے آتے ہی فریڈرک سے کہا۔ ''میں نہیں سمجھتی کہ اس فضول مشق سے تمہیں کوئی فائدہ ہو سکتا ہے۔''

فریڈرک نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہا۔ ''میں کسی قسم کی تحقیقات نہیں کر رہا۔ یہ محض ایک رسمی گفتگو ہے جس کے ذریعے میں کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' فریڈرک نے کندھے اچکائے اور مزید بولا۔ ''مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ ان حالات میں بھی یہ خاندان متحد اور پُرسکون نظر آ رہا ہے۔''

سارہ کے چہرے کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ''تمہیں مایوسی ہوئی۔ شاید تم توقع کر رہے تھے کہ کوئی چٹپٹی کہانی سامنے آ جائے لیکن میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ ہم میں سے کوئی بھی بشمول الفریڈ اور سیکریٹری اس معاملے میں ملوث نہیں ہیں۔ یہ لوگ تین نسلوں سے ہمارے ملازم ہیں اور کسی بھی دوسرے سرمایہ دار کے مقابلے میں میرے والد سے زیادہ فوائد اور مراعات حاصل کر رہے ہیں۔''

فریڈرک نے سر ہلایا اور اپنے کاغذات پر نظر دوڑاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی تھیں۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔''

''شکریہ۔'' سارہ نرم پڑتے ہوئے بولی۔ ''وائن کا انتقال چار سال پہلے ہو گیا تھا۔ اس وقت میں صرف چھبیس سال کی تھی۔ پیشے کے اعتبار سے وہ وکیل تھا لیکن ہوا بازی کے شوق نے اس کی جان لے لی۔''

''جانتا ہوں کہ یہ دکھ ناقابلِ برداشت ہے لیکن زندگی یادوں کے سہارے نہیں گزاری جاتی۔ تمہیں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہیے۔''

''یہ اتنا آسان نہیں تھا۔'' وہ افسردگی سے بولی پھر اس کے چہرے پر ایک چمک ابھری اور وہ کہنے لگی۔ ''لیکن اب میری ملاقات حال ہی میں روڈنی سے ہوئی ہے۔ وہ نیویارک میں فزیشن ہے۔ مین ہٹن میں ہماری تین جائدادیں ہیں۔ میں اپنا زیادہ وقت وہیں گزارتی ہوں اور اسی دوران روڈنی سے میری ملاقاتیں ہونے لگیں۔''

''یہ تو اچھی خبر ہے۔'' فریڈرک نے اسے کریدنے کی خاطر کہا۔

''ہاں، میں سمجھتی ہوں کہ وہ قدرت کی طرف سے بھیجا گیا تحفہ ہے۔ دراصل وہ بھی لانگ آئی لینڈ کا پرانا باسی ہے اور میں اس کے بچپن کے بارے میں تھوڑا بہت جانتی ہوں۔ اس کا تعلق جزیرے کے ایک قدیم خاندان سے ہے اور وہ نیورو سرجن کے طور پر اپنی شناخت بنا چکا ہے۔ شاید تم نے بھی ڈاکٹر روڈنی کونارڈ کا نام سنا ہوگا؟''

☆☆☆

دوسرے دن فریڈرک ایک بار پھر لائبریری گیا اور اس نے ایک بار پھر ان اخبارات کو پڑھنا شروع کر دیا جنہیں وہ گزشتہ روز پوری طرح نہیں دیکھ پایا تھا۔ پھر اس نے لانگ آئی لینڈ کے پرانے خاندانوں سے متعلق کتاب پر نظر دوڑائی اور اس کی نظریں کونارڈ فیملی پر جم کر رہ گئیں۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور لائبریری کے استقبالیہ کے قریب لگے ہوئے پبلک فون سے

سارہ کا نمبر ملانے کے بعد بولا۔ ”زحمت کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم گھر کے علاوہ کسی دوسری جگہ ملاقات کر سکیں؟“

تھوڑی دیر بعد سارہ کنٹری روڈ کے ایک ریستوران میں اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔ اس نے پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”کیا گزشتہ روز کی ملاقات کافی نہیں تھی؟“

”میں اس سے انکار نہیں کرتا لیکن تم نے جو باتیں بتائی تھیں، ان میں سے چند ایک مجھے پریشان کر رہی تھیں۔ خصوصاً تمہارے دوست روڈنی کونارڈ کے بارے میں کچھ الجھن تھی۔ جب میں نے اس کے خاندان کا پس منظر اور تاریخ کھنگالی تو بہت سے انکشافات سامنے آئے۔ ایک زمانے میں یہ خاندان بھی لانگ آئی لینڈ میں آباد تھا۔ پھر ان کے ستارے گردش میں آگئے اور انہوں نے ایک ایک کر کے اپنی جائدادیں بیچنا شروع کر دیں۔ وال اسٹریٹ جنرل کے مطابق انہوں نے اپنی جائداد کا آخری بڑا حصہ دو سال پہلے تمہارے والد کے ہاتھ فروخت کیا۔ چھ ماہ بعد حکومت کی جانب سے اس علاقے میں ہائی وے کی تعمیر شروع کرنے کا اعلان ہوا تو زمین کی قیمتیں دگنی ہو گئیں اور اس طرح تمہارے والد کو زبردست منافع ہوا۔“

سارہ نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، کونارڈ کا باپ کاروباری شخص نہیں تھا۔ جائداد کا واحد وارث ہونے کے باوجود وہ اسے نہ سنبھال سکا اور ایک ایک کر کے سب کچھ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ روڈنی کو ڈاکٹری کے پیشے سے دلچسپی تھی اور اس کے بھائی کی خواہشات بہت محدود ہیں۔ گو کہ ساری جائداد فروخت ہو چکی ہے لیکن ٹرسٹ سے ہونے والی آمدنی ان کے گزارے کے لیے کافی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب کچھ جان لینے کے بعد تم اسے اس معاملے میں ملوث نہیں کرو گے کیونکہ اس کے لیے یہ ایک مضحکہ خیز بات ہوگی۔“

”فی الحال میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ابھی تو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ البتہ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ میں اس سلسلے میں کونارڈ فیملی سے بھی بات کر سکتا ہوں۔“

”وہ کیوں؟“

”کیا تم نے اسے اپنے خاندانی راز کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا؟“

”کون سا خاندانی راز؟“ وہ اپنی بھویں چڑھاتے ہوئے بولی۔

”یہی کہ تمہارے آباؤ اجداد بحری قذاق تھے۔“

”میرا خیال ہے کہ ہمارے درمیان ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ بے دھیانی میں منہ سے نکل گیا ہو تو کچھ نہیں کہہ سکتی۔“

”یہ کوئی غیر قانونی بات نہیں ہے۔ تمہیں چار سال بعد ایک ایسا شخص ملا جس سے دل کی بات کہہ سکتی تھیں۔ بڑے شہروں کے لوگ زیادہ فراخ دل اور کھلے ذہن کے ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی ہوگی۔“

”جب میرے والد کو وہ گمنام فون کال موصول ہوئی تو روڈنی ویانا میں تھا۔ اگر یہ اوورسیز کال ہوتی تو میرے والد نے تمہیں ضرور اس بارے میں بتایا ہوتا۔ تم اپنے طور پر بھی معلوم کر سکتے ہو کہ روڈنی کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ نیورو سرجن ہے اور ہفتے میں چھ بلکہ بعض اوقات سات دن، دس سے بارہ گھنٹے روزانہ کام کرتا ہے۔ کبھی کبھی تو اس کے پاس میرے لیے بھی وقت نہیں ہوتا۔ وہ ایسی حرکت کیوں کرے گا؟ پیسا اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ وہ کافی مال دار شخص ہے اور اس پیشے سے بھی اچھی خاصی آمدنی ہو رہی ہے۔“

فریڈرک نے بڑے غور سے اس کی بات سنی اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”یہ تمام معلومات بے حد مفید اور دلچسپ ہیں لیکن ان سے ایک بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ تم نے روڈنی کو جیمس ڈیول اور ایلینا کے علاوہ اس ہیرے کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اسی لیے زور و شور سے اس کی وکالت کر رہی ہو۔“

سارہ نے اسے غصے سے دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولی۔ اس کے جانے کے بعد فریڈرک نے اینڈریو کو فون کیا اور بولا۔ ”کیا تم کونارڈ خاندان سے واقف ہو؟“

”ہاں، بہت اچھی طرح۔ دو سال پہلے انہوں نے وان میر سے ایک زمین کا سودا کیا تھا... لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”مجھے وان میر کی بیٹی سارہ نے بتایا ہے کہ اس خاندان کے دو وارث حیات ہیں۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر روڈنی، نیویارک سٹی میں پریکٹس کرتا ہے جبکہ بڑا بھائی کرٹ کونارڈ جزیرے پر ہی مقیم ہے۔ کیا تم اس کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کر سکتے ہو؟ مجھے اس کا پتا اور موجودہ حیثیت کے بارے میں تفصیل درکار ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی تم معلوم کر سکو۔“

اینڈریو نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔ ”اس کے لیے مجھے ان لوگوں سے رابطہ کرنا ہوگا جو اسے جانتے ہیں۔ یہ معلومات کب تک چاہئیں؟“

”جتنی جلد ممکن ہو سکے۔“

”ٹھیک ہے، میں تمہیں بعد میں کسی وقت فون کرتا ہوں۔“

☆☆☆

رات آٹھ بجے فریڈرک نے زین وان میر کو فون کیا اور ”مجھے اس کیس کے سلسلے میں کچھ معلومات حاصل ہوئی ہیں اور اب آگے بڑھنے کے لیے مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔“

”بتاؤ، میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ زین نے کہا۔

”دو تین سال پہلے اویسٹر بے میں ایک اسکول قائم ہوا تھا، اب وہ اسٹیٹ یونیورسٹی کالج آف لانگ آئی لینڈ کہلاتا ہے۔“

”ہاں، گزشتہ سال میں نے اس کے نئے کیمپس کے لیے ڈھائی سو ایکڑ زمین عطیہ کی تھی۔ میں اس کے بورڈ میں بھی شامل ہوں۔“

”اینڈریو نے بتایا ہے کہ کرٹ کونارڈ وہاں ایسوسی ایٹ پروفیسر کے طور پر کام کرتا ہے۔ کیا تم اس شخص کو جانتے ہو؟“

”ہاں، وہ میرے سامنے ہی پلا بڑھا ہے لیکن کئی سالوں سے اسے نہیں دیکھا۔ مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ وہ کسی کالج میں پروفیسر لگ گیا ہے۔ وہ خوابوں اور خیالوں میں رہنے والا شخص ہے، اسے تو کسی پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھنا چاہیے تھا۔ اس کا اس معاملے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ تمہیں معلوم ہوا ہے کہ وہ سارہ کے دوست ڈاکٹر روڈنی کا بھائی ہے؟“

”ہاں، میں نے بھی سنا ہے لیکن اس کے بارے میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ فی الحال یہ ایک مفروضہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر غلط ثابت ہو۔ ایسی صورت میں تمہارا ابھی وقت ضائع ہوگا۔“

”پھر تم کیا چاہتے ہو؟“

”میں یونیورسٹی میں کسی ایسے شخص سے ملنا چاہتا ہوں جس کے زیرِ نگرانی کرٹ کام کر رہا ہے۔ تم اس شخص سے میری ملاقات کا بندوبست کر دو اور اسے یہ بھی بتا دو کہ کونارڈ کو اس ملاقات کا علم نہیں ہونا چاہیے۔ کیا یہ ممکن ہے؟“

”کیا تمہیں اس ڈھائی سو ایکڑ زمین کی قیمت کا اندازہ ہے جو میں نے یونیورسٹی کو عطیے کے طور پر دی ہے؟ وہ میری کسی بات سے انکار نہیں کر سکتے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں کل ہی ان سے ملنا چاہوں گا۔ جمعے سے پہلے یہ ملاقات ضروری ہے کیونکہ پیر کے روز وہ گمنام

شگون

بس میں سفر کے دوران ایک ندیدہ بوڑھا بار بار ایک خوبرو عورت کو تکے جا رہا تھا جس کی گود میں ایک شیر خوار بچہ موجود تھا۔

بوڑھے سے رہا نہ گیا۔ عورت سے بات کرنے کے بہانے وہ بولا۔ ”بہت خوب صورت بچہ ہے۔ تم نے بہت احتیاط سے اسے سینے سے لگایا ہوا ہے۔ ماؤں کو اتنا ہی مہربان ہونا چاہیے... مجھے یقین ہے کہ تمہاری آغوش میں پل کر یہ ایک عظیم آدمی بنے گا۔“

”نہیں... ایسا نہیں ہو سکے گا۔“ عورت نے رکھائی سے جواب دیا۔

بوڑھا اس جواب پر حیران رہ گیا۔ ”ایک ماں کے منہ سے بدشگونی کے ایسے الفاظ اچھے نہیں لگتے۔ تم...!“

عورت نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میری گود میں میری بچی ہے۔ یہ عظیم آدمی نہیں، عظیم عورت بنے گی۔ اپنے شگون اپنے پاس رکھو۔ مجھے پریشان مت کرو۔“

(پشاور سے طاہرہ گلزار کی تنبیہہ)

طعامِ دوستاں

دفتر میں دوپہر کو سب لوگ مل جل کر ایک جگہ کھانا کھاتے تھے۔ ایک صاحب گھر سے کھانا لانے کے عادی نہیں تھے مگر دسترخوان پر باقاعدگی سے موجود ہوتے۔ ایک روز کسی نے ان سے پوچھ لیا۔ ”تم تو خیر ہمارے ساتھ کھانا کھا لیتے ہو، تمہارے گھر والے کہاں کھاتے ہیں؟“

وہ ناراض ہو کر اٹھ گئے۔ سب سے بول چال بند کر دی۔ سب کھانا کھاتے اور وہ الگ تھلگ بیٹھے رہتے یا زبردستی کسی کام میں مصروف ہو جاتے۔

تیسرے دن کسی اور نے ترس کھا کر انہیں معصومیت سے دعوت دی۔ ”غصہ تھوک دو... ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ... روزانہ بچا ہوا کھانا کتے، بلیوں کو ڈالا جا رہا ہے۔“

وہ آگ بگولا ہو کر لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ان کا چہرہ قابلِ دید ہو گیا تھا۔

(امتیاز احمد، ملیر)

شخص تمہیں دوبارہ فون کرے گا۔‘‘

جمعرات کی صبح وہ یونیورسٹی کے لیے روانہ ہوگیا۔ گاڑی چلاتے ہوئے اس کے ذہن میں وہ تمام معلومات گونج رہی تھیں جو اینڈریو اور وان میر نے اسے مہیا کی تھیں۔ کرٹ کونارڈ کو یہ ملازمت اس کے مرحوم باپ کے ایک دوست کے توسط سے ملی تھی۔ اس نے اپنی ساری جمع پونجی اور ورثے میں ملنے والی دولت اپنی شاہ خرچیوں میں اڑا دی تھی اور گزر اوقات کے لیے ملازمت کرنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ دس لاکھ پاؤنڈز کی رقم اس کی تقدیر بدل سکتی تھی۔

شعبۂ تاریخ کے صدر کے صاف ستھرے اور چھوٹے سے دفتر میں بیٹھتے ہی فریڈرک مطلب کی بات پر آگیا۔ اس نے صدر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ’’مسٹر کولن! میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ جانتا ہوں کہ تم کسی دباؤ کے تحت مجھ سے ملنے پر آمادہ ہوئے ہو اور تم نے یہ وعدہ بھی کیا ہے کہ یہ گفتگو راز میں رہے گی۔ امید ہے کہ تم اس وعدے پر سختی سے قائم رہو گے۔‘‘

’’تم بے فکر رہو۔ میں اپنی بات پر قائم ہوں۔‘‘ کولن نے بردباری سے کہا۔

اگلے آدھ گھنٹے کے دوران اسے کرٹ کونارڈ کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوگیا۔ وہ بھرتی کا استاد نہیں تھا بلکہ اسے تاریخ کے مضمون سے گہری دلچسپی تھی۔ خاص طور پر مقامی تاریخ، اہم واقعات اور رسم و رواج پر اس کی گہری نظر تھی۔ اس نے پرنسٹن یونیورسٹی سے امریکن تاریخ میں ڈگری حاصل کی تھی اور وہ بڑی دلجمعی سے اپنا کام کررہا تھا۔

کولن نے اس کے بارے میں تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔ ’’وہ یونیورسٹی کے قیام سے ہی یہاں پڑھا رہا ہے اور کیمپس میں ہونے والی ضروری تقریبات میں شرکت کے علاوہ میں نے اسے کسی اور سرگرمی میں ملوث نہیں دیکھا۔ وہ لیکچر ختم کرکے سیدھا گھر چلا جاتا ہے۔‘‘

’’اس کا خاص مضمون کیا ہے؟‘‘ فریڈرک نے پوچھا۔

’’دو سال تک وہ انیسویں صدی کی امریکن تاریخ پڑھاتا رہا۔ اس سال اس نے خود ہی کہہ کر ایک اور ذمے داری بھی اپنے اوپر لے لی ہے۔‘‘

’’وہ کیا؟‘‘ فریڈرک نے دلچسپی سے پوچھا۔

’’جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ وہ لانگ آئی لینڈ بالخصوص اس کے مشرقی حصے کی تاریخ میں گہری دلچسپی رکھتا ہے، اس نے اپنے طور پر ایک نصاب ترتیب دیا ہے جس میں چڑیلوں کی کہانیاں، ریڈ انڈین کے حملے اور انقلابی جنگ کے علاوہ بحری قذاقوں کے قصے بھی شامل ہیں۔ کیا تم اس کا تصور کرسکتے ہو؟‘‘

فریڈرک کا مقصد پورا ہو چکا تھا اس لیے وہ مزید کچھ کہے بغیر وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

ہفتے کی صبح کو وہ زین وان میر کی عالی شان اسٹڈی میں موجود تھا۔ اس کے دائیں جانب والی کرسی پر سارہ بیٹھی ہوئی تھی اور کافی مضطرب دکھائی دے رہی تھی۔ زین وان میر اپنی بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ ’’تم جانتی ہو سارہ کہ میں نے کبھی اس بات کی پروا نہیں کی کہ لوگ میرا تعلق قذاقوں سے جوڑیں۔ میرے والد نے بھی اس بارے میں کبھی کوئی پریشانی ظاہر نہیں کی۔ البتہ میری والدہ اور اب تمہاری ماں کی بھی یہی خواہش ہے کہ اس بات کو راز میں ہی رکھا جائے۔ میرا خیال ہے کہ نسل در نسل خواتین اس راز پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتی رہی ہیں۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے گہری سانس لی۔ ’’میرا خیال ہے کہ وہ ٹھیک ہی سوچتی تھیں۔ دیکھ لو، اس راز کے افشا ہونے پر کیا ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔‘‘

سارہ نے فریڈرک کو غصے سے دیکھا اور باپ سے معذرت کرتے ہوئے بولی۔ ’’مجھے افسوس ہے۔ میں نہیں جانتی کہ روڈنی کو یہ بات کیوں بتائی۔ لگتا ہے بے دھیانی میں میرے منہ سے نکل گئی لیکن اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ یہ بات اپنے تک ہی رکھے گا۔‘‘

زین غراتے ہوئے بولا۔ ’’تم نے خاندان کے اعتماد کو نقصان پہنچایا ہے۔ آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔‘‘ پھر وہ فریڈرک سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ’’تو تمہیں یقین ہے کہ یہ شخص کرٹ کونارڈ ہی ہے؟‘‘

’’یہ میرا اندازہ ہے۔ فی الحال میرے پاس ابھی کوئی ثبوت نہیں ہے لیکن ہم ان خطوط پر کام کرسکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ قسمت ساتھ دے جائے۔‘‘

’’میں نے دس لاکھ پاؤنڈز کا انتظام کرلیا ہے۔ اس موہوم امید پر کہ وہ ہیرا مجھے مل جائے گا، مجھے یہ کام کرنا پڑا کیونکہ میں آخری منٹ تک انتظار نہیں کرسکتا تھا۔‘‘

’’تم خوش قسمت ہو ورنہ میرے بینک کا کیشیئر تو ڈھائی سو ڈالرز کا چیک دیکھ کر ہی منہ بنا لیتا ہے۔‘‘

زین اس کے مذاق کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ’’اب کیا کرنا ہے؟‘‘

’’جب وہ شخص تمہیں پیر والے دن فون کرے تو اس سے رقم میں کمی کی بات کرنا۔ اس طرح اسے یقین ہو جائے گا

کہ وہ تمہیں پھانسنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ اسے بتا دینا کہ تمہارے لیے اتنی بڑی رقم کا انتظام کرنا ممکن نہیں۔‘‘

’’اچھا آئیڈیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور۔۔۔؟‘‘

’’اس سے یہ بھی کہنا کہ تم اس ہیرے کی تصویریں دیکھنا چاہتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے پاس ایسی کوئی تصویر نہیں ہوگی۔ جب اس کے پاس ہیرا ہی نہیں تو اس کی تصویر کہاں سے آئے گی؟ تم نے خود وہ ہیرا نہیں دیکھا اس لیے وہ اس سے ملتے جلتے ہیرے کی تصویر پیش کرسکتا ہے لیکن یہ بعد کی بات ہے۔ پہلے تو میں اس شخص کو بے نقاب کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’کیا تمہارے خیال میں اس ہیرے کی موجودگی کا کوئی امکان ہے؟‘‘ زین نے بے تابی سے پوچھا۔

’’کیوں نہیں، اسے مشرقی ساحل پر کہیں چھپایا گیا تھا یا بہت ممکن ہے کہ سمندر میں پھینک دیا گیا لیکن کم از کم یہ ہیرا کرٹ کونارڈ کے پاس نہیں ہے۔‘‘

زین کے چہرے پر مایوسی کی جھلک نمودار ہوئی جو بعد میں غصے میں تبدیل ہوگئی۔ وہ جھلاتے ہوئے بولا۔

’’پھر تم کرٹ کے خلاف کیا مقدمہ دائر کرو گے؟‘‘

’’اس کے پاس مواقع اور محرکات ہیں۔ تم نے صرف چھ ماہ پہلے اس سے خریدی ہوئی زمین پر دگنا منافع کمایا۔ وہ کہتا ہے کہ تم نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے اور جب روڈنی نے اسے تمہارے حسب نسب کے بارے میں بتایا تو اس نے روڈنی سے خوب جھگڑا کیا کہ وہ ایک ایسی لڑکی سے کیوں تعلق استوار کررہا ہے جس کے آبا و اجداد بحری قذاق تھے اور جس کے باپ نے دھوکے سے ان کی زمین ہتھیالی ہے۔ اس کے بعد سے دونوں بھائیوں میں بات چیت بند ہے لہٰذا کرٹ جو کچھ کررہا ہے، اس کا ایک محرک پیسا بھی ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے تاریخ سے گہری دلچسپی ہے۔ اس نے یقیناً اس ہیرے کے بارے میں تحقیق کرکے حقائق جمع کیے ہوں گے اور ممکن ہے کہ اس کوشش کے دوران اسے کہیں سے اصلی تصاویر مل گئی ہوں۔‘‘

’’مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔‘‘ زین نے اس کی تائید کی۔

’’چاہے تم اسے رقم ادا کرو یا نہیں، وہ اس کہانی کو اخبارات میں ضرور اچھالے گا۔ اس کے بغیر اسے اطمینان نہیں ہوگا۔‘‘

’’ہم اس سے وہ تصویریں کس طرح حاصل کریں گے؟‘‘ زین نے پوچھا۔

’’پہلے یہ تصدیق تو ہو جائے کہ فون کرنے والا واقعی کرٹ کونارڈ ہے۔‘‘ فریڈرک نے کہا۔ ’’وہ تمہیں کس وقت فون کرے گا؟‘‘

’’پیر کے روز صبح نو بجے۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ فریڈرک نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’اس کے لیے ہمیں ایک چھوٹا سا جال تیار کرنا ہوگا۔ اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہیں اس سے کیا کہنا ہے۔‘‘

☆☆☆

پیر کی صبح سورج نکلنے سے پہلے فریڈرک نے اپنی بیوی کی پچپن ماڈل شیورلیٹ ایک گلی میں پارک کی جہاں اس وقت مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس دن کے کام کے لیے یہ کار بالکل مناسب تھی۔ اس نے تھرماس سے کپ میں کافی انڈیلی اور ایک گھونٹ لینے کے بعد نظریں آسٹن ایونیو کے کاٹیج پر جما دیں۔ مطلوبہ شخص وہیں سے برآمد ہونے والا تھا۔ ٹھیک آٹھ بج کر پچاس منٹ پر گیراج کا دروازہ کھلا۔ فریڈرک نے دوربین سے دیکھا۔ وہ ایک طویل قامت شخص تھا جس کے بال بالکل سیاہ تھے۔ فریڈرک نے جلدی سے جیب میں سے تصویر نکال کر اس شخص سے موازنہ کیا۔ یہ تصویر اس نے اسٹیٹ یونیورسٹی کالج سے حاصل کی تھی۔ وہ بلاشبہ کرٹ کونارڈ ہی تھا۔

چند لمحوں بعد ایک سرخ رنگ کی کار گیراج سے باہر آئی۔ فریڈرک تھوڑا سا آگے کی طرف جھکا اور اس نے اپنی کار کا انجن اسٹارٹ کردیا۔ کونارڈ نے اپنی گاڑی مغرب کی جانب دوڑائی اور کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد سڑک نمبر ایک سو دس پر واقع ایک چھوٹے سے ریستوران کے سامنے رک گیا جس کے مرکزی دروازے کے برابر میں ایک پبلک فون بوتھ نصب تھا۔ کونارڈ گاڑی سے باہر آیا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور بوتھ کی جانب بڑھ گیا۔ پھر اس نے جیب سے سکے نکالے اور ایک فون نمبر ڈائل کرنے لگا۔ فریڈرک کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ نو بج چکے ہیں اور یہ فون زین وان میر کو کیا جارہا ہے جو دوسری جانب اپنا رول نبھانے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

فریڈرک نے دوربین لگا کر دیکھا۔ اسے کونارڈ کے لب ہلتے ہوئے دکھائی دیے۔ پھر اس کی آنکھوں میں حیرت اور غصے کی جھلک نظر آئی۔ چند لمحوں بعد یوں لگا جیسے کونارڈ اور زین کسی رقم پر متفق ہوگئے ہوں۔ فریڈرک نے محسوس کیا کہ جب کونارڈ بولنے کے بجائے صرف سن رہا تھا، شاید زین نے رقم وصول کرنے کے لیے اسے کچھ ہدایات دی ہوں۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کونارڈ نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور فون بند کرکے بوتھ سے باہر آگیا۔

فریڈرک اس کا تعاقب کرتے ہوئے آسٹن اسٹریٹ

تک آیا۔ کونارڈ نے گاڑی ہائی وے کی جانب موڑ دی۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے ایک مکان کے سامنے کار روکی اور اندر چلا گیا۔ اسے واپس آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس کے ایک ہاتھ میں سفید لفافہ اور دوسرے ہاتھ میں سیلوفین ٹیپ تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھا۔ سن رائز ہائی وے پر پہنچ کر اس نے اپنی کار مشرق کی جانب موڑ دی۔ فریڈرک کچھ فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کر رہا تھا تاکہ کونارڈ کی نظروں میں نہ آسکے۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد کونارڈ نے اپنی گاڑی بائیں جانب موڑ لی۔ اب اس کی رفتار کم ہو گئی تھی۔ وہ ایک ریستوران کے پارکنگ لاٹ میں داخل ہو رہا تھا۔ فریڈرک کی نظر اس کے برابر والے پیٹرول پمپ پر پڑی تو اس نے اپنی کار اس جانب موڑ لی اور پیٹرول پمپ کے عقبی حصے میں پارک کر کے باہر آگیا۔ اس نے جیب سے دوربین نکالی اور کونارڈ کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے لگا جو بڑے محتاط انداز میں اپنی گاڑی سے باہر آرہا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ کوئی اس کی جانب متوجہ نہیں ہے تو وہ ریستوران کے مرکزی دروازے کے ساتھ والے فون بوتھ میں داخل ہو گیا۔ اس نے بڑی احتیاط سے وہ لفافہ ٹیپ کی مدد سے شیلف کے نچلے حصے میں چپکا دیا جس پر ٹیلی فون رکھا ہوا تھا پھر اس نے ریسیور اٹھا کر ایک نمبر ڈائل کیا اور کسی سے مختصر گفتگو کرنے کے بعد بوتھ سے باہر آگیا۔

فریڈرک سمجھ گیا کہ اس نے زین کی ہدایات کے مطابق تصویروں والا لفافہ ٹیلی فون بوتھ کے شیلف کے نیچے چھپا دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے زین کو فون کر کے اس جگہ کے محلِ وقوع کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ جب فریڈرک کو اطمینان ہو گیا کہ کونارڈ کافی دور جا چکا ہوگا تو وہ اپنی گاڑی چلاتا ہوا ریستوران کے قریب لایا اور فٹ پاتھ کے ساتھ کھڑی کر کے خود بوتھ کے اندر چلا گیا۔ اس نے آہستہ سے لفافہ باہر نکالا۔ خوش قسمتی سے وہ سیل نہیں تھا۔ اس نے لفافہ کھول کر دیکھا اور مطمئن ہونے کے بعد اسے دوبارہ ٹیپ کے ذریعے اسی جگہ چپکا دیا۔

اس نے پہلے ہی احتیاطاً اپنے ہاتھوں پر دستانے چڑھا لیے تھے اس لیے لفافے یا ٹیلی فون بوتھ کے کسی بھی حصے پر اس کی انگلیوں کے نشانات ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر اس نے زین وان میر کا نمبر ملایا اور بولا۔ ”اب تم پولیس کو فون کر سکتے ہو۔ میں اس جگہ موجود ہوں جہاں کونارڈ نے تصویروں والا لفافہ رکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پولیس کو یہاں تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔“

اسی شام زین وان میر، فریڈرک اور اینڈریو ایک ریستوران میں بیٹھے کامیابی کا جشن منا رہے تھے۔ زین نے ایک نظر ریستوران کا جائزہ لیا اور مینیو پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ”دیکھنے میں یہ جگہ کچھ زیادہ اچھی معلوم نہیں ہوتی لیکن یہاں کا کھانا بہت عمدہ ہوتا ہے اور قیمتیں بھی دوسروں کے مقابلے میں کم ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم لوگوں کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے، اگر آج کے کھانے کا بل میں ادا کروں۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اینڈریو بولا۔ ”میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔“

”اب کیا پریشانی ہے؟“ زین بولا۔ ”وہ بلیک میلر تو اپنے انجام کو پہنچ گیا۔“

”کیا تمہیں یہ فکر نہیں کہ اخبارات اور میڈیا اس واقعے کو کتنا اچھالیں گے اور تمہارا خاندانی راز بھی ساری دنیا کو معلوم ہو جائے گا؟“

”اس کی فکر میری بیوی کو ہونی چاہیے۔ میں ان باتوں کی پروا نہیں کرتا۔ اگر دو سو سال پہلے میرے خاندان میں کوئی بحری قذاق تھا تو اس کی سزا مجھے کیوں دی جائے؟ لوگوں کو میرے ماضی سے نہیں بلکہ حال سے غرض ہونی چاہیے۔“

”کونارڈ نے واقعی بڑی شرم ناک حرکت کی ہے۔“ فریڈرک نے کہا۔ ”سرکاری وکیل اسے سخت ترین سزا دینے کا مطالبہ کرے گا۔“

”میں اس کے حق میں نہیں ہوں۔“ زین نے کہا۔ ”اس نے کوئی سنگین جرم نہیں کیا۔ وہ بے وقوف یہ سمجھ رہا تھا کہ مجھے بلیک میل کر کے کچھ رقم اینٹھ لے گا۔ اگر وہ معافی مانگ لے تو میں اسے سزا دینے پر اصرار نہیں کروں گا۔ ویسے بھی اس نے مجھ پر ایک احسان کیا ہے۔ اس ہیرے کا ذکر کر کے اس نے مجھے ایک بار پھر اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔“

”اب تم کیا کرو گے؟“ فریڈرک نے پوچھا۔

”کرٹ کونارڈ کی تحقیق سے اس بات کی تصدیق ہو گئی ہے کہ وہ ہیرا مشرقی ساحل کے قریب ہی کہیں سمندر کی تہ میں پڑا ہوا ہے۔ میں اسے تلاش کروں گا۔ اب یہی میری زندگی کا مشن ہے۔“ زین نے پُرعزم انداز میں کہا۔

فریڈرک نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرنے لگا کہ اس کا کام صرف گمنام کو تلاش کرنے تک محدود تھا، ورنہ۔۔۔ اس سے آگے کا سوچ کر اسے جھرجھری آ گئی۔

نجات

رزاق شاہد کوہلر

لیل و نہار کی ہزار کروٹوں کے باوجود یہ پاک سرزمین لاتعداد منفی خامیوں کے باوجود اپنی جگہ قائم و دائم ہے... یہ ہمارا المیہ ہے کہ آج پیار محبت، درگزر جیسے مثبت جذبات کی جگہ منفی رویوں نے اپنی جگہ بنالی ہے... معاشرے کا ہر شخص صرف اپنے لیے زندہ ہے... اس کی حیات کا دائرہ صرف اسی کے گرد گھومتا ہے... فائدے اور نقصان کی اس جنگ کا سب سے زیادہ خمیازہ صرف اس سرزمینِ پاک کو اٹھانا پڑ رہا ہے... اپنی ذات سے نکل کے دوسروں کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ رکھنے والے ایک ایسے ہی نوجوان کی حکایتِ خوں چکاں... جسے گردشِ حالات نے غلط راستوں کا مسافر بنا دیا تھا... مگر منزل کا تعین اس کا اپنا فیصلہ تھا...

برائی کی دلدل میں اتر جانے والوں کا قصہ... جو اپنے انجام سے بے خبر بے سائبان تھے...

ان دنوں وہ سخت پریشان تھا، بالکل ان کروڑوں شہریوں کی طرح جنہیں غربت و افلاس نے گزشتہ کئی دہائیوں سے محض اس لیے یرغمال بنا رکھا ہے کہ وہ.... بے وقوف ہیں، مداری کی ڈگڈگی پر ناچنے والے بندر ہیں، بھیڑوں اور بکریوں کا ایک ایسا ریوڑ ہیں جو عوام کہلاتا ہے، جنہیں کبھی غاصب تو کبھی جمہوری لیڈر ہانکنے لگتے ہیں۔ وہ پہروں سوچتا رہتا کہ وہ عوام میں سے کیوں ہے؟ آخر اللہ نے اُسے خواص میں کیوں پیدا نہیں کیا۔ فطرتاً وہ بے حد نیک

نوجوان تھا۔ صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا مگر پھر بھی اکثر خدا سے شاکی رہتا تھا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اُس کے سامنے کسی کی نہیں چلتی، وہ اپنی مرضی کا مالک ہے، جو چاہتا ہے سو کرتا ہے اور جو نہیں چاہتا، اُسے ساری دنیا مل کر بھی نہیں کر سکتی، اُس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی اجازت نہیں ہے، دنیا کی کوئی طاقت اس کی طاقت کو چیلنج نہیں کر سکتی، ہر طاقت کا سرچشمہ وہی ہے، چاہے تو پتھروں میں پھول کھلا سکتا ہے۔ نہ چاہے تو ہری بھری کھیتیوں کو پل میں اُجاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اپنے حال پر قانع رہنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ یہ دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ کروڑوں میں سے کوئی ایک ہی ایسا کر سکتا ہے اور جو کر سکتا ہے، وہ فقیری میں بھی امیری کے انداز رکھتا ہے۔ بدقسمتی سے وہ بھی اُن کروڑوں میں سے تھا جو ایسا نہیں کر سکتے۔ اس لیے اکثر وہ اپنی تقدیر کو کوستا رہتا مگر اس کی تقدیر تو شاید لمبی تان کر سو رہی تھی، کبھی نہ جاگنے کے لیے۔

اس کا ایک ہی دوست تھا مظہار حسین جو مٹھو رامپوری کے نام سے مشہور تھا۔ مٹھو کے اجداد قیام پاکستان کے وقت رامپور سے ہجرت کر کے کراچی پہنچے تھے۔ مٹھو اور اس نے میٹرک تک ایک ساتھ تعلیم حاصل کی تھی۔ ان دونوں کی دوستی مثالی تھی اور دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ مٹھو پڑھنے لکھنے میں ایک اوسط درجے کا طالب علم مگر باتیں کرنے میں ماہر تھا۔ وہ یوں دانش ورانہ انداز میں باتیں کرتا کہ سننے والے مسحور ہو کر رہ جاتے تھے۔ جامع دلائل دے کر کسی بھی شخص کو قائل کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

میٹرک تک مٹھو اس کے دکھ سکھ کا ساتھی رہا مگر اس کے بعد وہ ایسا گم ہوا کہ پھر اس کا سراغ نہیں مل سکا۔ مٹھو سے جدا ہو کر وہ کالج پہنچا اور پھر کئی برس پڑھنے کے ساتھ ساتھ ایک روشن مستقبل کے سہانے خواب دیکھتا رہا۔ آج وہ ایک انجینئر تھا مگر صرف نام کا، کام اُسے متعدد کوششیں کرنے کے باوجود نہیں مل سکا تھا اور نہ آئندہ ملنے کی کوئی امید تھی۔ کیونکہ اُونچے عہدوں پر بیٹھے مُردار خور گدھوں کو رشوت کے نام پر کھلانے کے لیے اُس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ کسی منسٹر کی کال، نہ سفارشی خط اور نہ ہی کرنسی نوٹوں کا بنڈل۔ اگر اس کے پاس کچھ تھا تو وہ تھی اس کی ذہانت جسے وطنِ عزیز میں کوئی پوچھتا نہیں۔ یوں اس کی ذہانت کو بھی کسی نے نہ پوچھا۔

اُس کا باپ ماسٹر عبدالرحمان اسی غم میں گھل گھل کر مر گیا۔ اس بے چارے نے اپنا، بیوی کا اور دو بیٹیوں کا پیٹ کاٹ کر جس بیٹے کو انجینئر بنایا تھا، وہ ریس کے گھوڑے کی طرح بازی ہار چکا تھا۔ ماں اور بہنوں کی نظر میں وہ اب بھی انجینئر سرمد رحمان تھا مگر اپنی نگاہوں میں وہ ایک کھوٹا سکہ تھا، ایک ایسا سکہ جو دنیا کے بازار میں ناکارہ ہوتا ہے اور کسی بھی دُکان پر نہیں چلتا۔ جب وہ تازہ تازہ انجینئر بنا تھا تو اس وقت اس کے پاؤں ہی زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ گاڑی، ایک شان دار کوٹھی اور حسین وجمیل بیوی کے خواب وہ سوتے جاگتے دیکھتا رہتا لیکن خواب، خواب ہی رہے، کبھی تعبیر کے مرتبے پر فائز نہ ہو سکے۔ اس کا اندازہ اسے چند ماہ ہی میں ہو گیا۔ اس وقت ماسٹر عبدالرحمان نہ صرف زندہ تھے بلکہ اپنی سروس کے آخری سال میں تھے۔ انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو ناکام ہونے کے بعد جب آوارہ پھرتے دیکھا تو برداشت نہ کر سکے اور اُسے اپنی جگہ ماسٹر لگوانے کے لیے سیکریٹری ایجوکیشن کے نام درخواست ارسال کر دی۔ انجینئر سرمد کو جب اس کارروائی کا پتا چلا تو وہ بھڑک اُٹھا۔

”میں انجینئر سرمد رحمان ایک اسکول ٹیچر کی نوکری کروں گا؟“ اُس نے باپ سے یوں سوال کیا جیسے کوئی افسر اپنے ماتحت سے پوچھتا ہے۔

”تو کیا کرو گے؟“ ماسٹر کو بھی غصہ آ گیا۔ ”کیا یونہی آوارہ پھرتے رہو گے؟“

وہ بولا۔ ”جو پڑھا ہے وہی کروں گا۔ اگر مجھ سے ماسٹری ہی کرانا تھی تو پھر انجینئر کیوں بننے دیا؟“

”غلطی ہو گئی مجھ سے۔ میں بھول گیا تھا کہ میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کا باشندہ ہوں جہاں ایک مفلس شخص اپنی اولاد کو افسر بنانے کے خواب تو دیکھ سکتا ہے لیکن اُن خوابوں کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا۔“

”خواب آپ نے دیکھا ہے تو سزا میں کیوں بھگتوں۔“ اس نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا۔

ماسٹر نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”پڑھانا کوئی بُرا پیشہ نہیں ہے بیٹے۔ تم چاہو تو ایک نسل کو سنوار سکتے ہو۔ پلیز میری بات مان لو ورنہ ساری زندگی پچھتاتے رہو گے۔“

”سوری ابو... میں ایسا نہیں کر سکتا۔“

”کیوں؟ آخر کیوں؟“ ماسٹر نے چلّا کر پوچھا۔ ”جو کام تمہارے باپ نے کیا ہے وہ تم کیوں نہیں کر سکتے؟“

”میرا باپ انجینئر نہیں تھا، وہ ایک اسکول ماسٹر تھا اور...“

”خاموش۔“ ماسٹر نے قطع کلامی کی۔ ”بدبخت! اسی پیشے کی وجہ سے آج تم انجینئر سرمد رحمان کہلاتے ہو ورنہ تیرے جیسے کتنے ہی یہاں ہوٹلوں میں رات دن بیرا گیری

کرتے ہیں۔“

”میں خوشی سے بیرا گیری کر لیتا اگر میں نے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل نہ کی ہوتی۔ آپ اگر مجھ پر کوئی احسان کرنا چاہتے ہیں تو مجھے ملک سے باہر بھجوا دیں۔“

ماسٹر بولا۔ ”کیسے بھجوا دوں۔ میرے پاس کوئی قارون کا خزانہ تو نہیں ہے؟“

”ایک سال کے بعد آپ کو پنشن ملنے والی ہے، آسانی سے بندوبست ہو سکتا ہے۔“

ماسٹر نے انکار میں سر ہلایا۔ ”میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ مجھے تمہاری دو بہنوں کا جہیز تیار کرنا ہے۔ بہتر ہو گا تم باہر جانے کے خواب دیکھنا چھوڑ دو۔“

”او کے تو پھر مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔“

”تم بہت پچھتاؤ گے سرمد... میرے بعد تمہیں کسی نے یہ ماسٹری بھی نہیں دینی۔“

”مجھے جب ماسٹری کرنی ہی نہیں تو پھر پچھتانا کیسا؟“ اس نے تمسخرانہ انداز میں جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

اس کے بعد بالکل ویسا ہی ہوا جیسا اُس کے باپ ماسٹر عبدالرحمان نے کہا تھا۔ ماسٹر ریٹائرڈ ہوا تو اس کی پنشن دو بیٹیوں کے جہیز اور بیاہ کے اخراجات میں ٹھکانے لگ گئی۔ ماسٹر کی چھوڑی ہوئی پوسٹ ایک ایم پی اے کی مہربانی سے ایک انٹر پاس لڑکے کو مل گئی جس نے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے پی ٹی سی کر رکھی تھی۔ اُس لڑکے کا باپ ایم پی اے کا دیرینہ چمچہ تھا اور پارٹ ٹائم ایم پی اے کی گاؤں والی حویلی میں نہ صرف حقے تازہ کیا کرتا تھا بلکہ بھینسوں کو چارا ڈالنے میں بھی اُسے مہارت حاصل تھی۔ کبھی کبھار وہ ایم پی اے کے اڑھائی من وزنی باپ کی ”چمپی“ بھی کر دیا کرتا تھا۔ حویلی کے بچے اُسے چاچا چمپی کہتے تھے۔

ماسٹر دونوں بیٹیوں کے بیاہ کے بعد دارِ فانی سے کوچ کر گیا اور انجینئر سرمد رحمان دنیا کی ٹھوکریں کھانے کے لیے تنہا رہ گیا۔ اُس نے...... کتنی ہی کنسٹرکشن کمپنیوں میں انٹرویو دیا مگر ہر کمپنی نے اسے یوں دھتکار دیا جیسے وہ کوئی بھکاری ہو اور جاب کے بجائے اُن سے بھیک مانگ رہا ہو۔ اُس کے دن نہایت کسمپرسی کے عالم میں گزر رہے تھے۔ باپ دنیا سے کیا گیا کہ وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے۔ ماسٹر کی ماہوار پنشن جو اس کی وفات کے بعد آدھی رہ گئی تھی، اس سے ان کا گزارہ بمشکل ہو رہا تھا۔ حالانکہ بہنوں کے بیاہ کے بعد اب گھر میں صرف دو ہی افراد رہ گئے تھے لیکن پنشن کی رقم اتنی قلیل تھی کہ کبھی کبھار تو فاقے کی نوبت آ جاتی۔ تب بوڑھی ماں اس کے لتے لینا شروع کر دیتی۔

”تم کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟“ وہ چلّا کر پوچھتی۔ ”کیا ساری عمر مفت کی روٹیاں توڑتے رہو گے؟“

”میں انجینئر ہوں امی...“

وہ قطع کلامی کرتی۔ ”کیا انجینئر کے ہاتھ نہیں ہوتے؟ اگر نوکری نہیں ملتی تو کوئی کام دھندا شروع کر دو۔“

”آپ کیا چاہتی ہیں کہ میں دہی بھلے بیچنا شروع کر دوں؟“

”کچھ بھی کرو لیکن کما کر لاؤ تاکہ گھر کا چولھا باقاعدگی کے ساتھ جلتا رہے۔“

”او کے... میں کوشش کرتا ہوں کہ کوئی کام دھندا مل جائے۔“ وہ ماں کا دل رکھنے کے لیے وعدہ کر لیتا مگر پھر اس سرزنش کو بھول کر اُنہی سپنوں میں کھو جاتا جو وہ انجینئر بننے کے بعد مستقل دیکھتا آ رہا تھا۔

ایک سال اور بیت گیا مگر انجینئر سرمد رحمان کو کہیں جاب نہ مل سکی۔ اس دوران میں اس کی ماں بھی بیمار رہنے لگی۔ اب گھر چلانے کے ساتھ ساتھ ماں کا علاج کرانے کے لیے بھی رقم چاہیے تھی۔ زندگی میں پہلی بار سنجیدگی کے ساتھ کوئی کام دھندا ڈھونڈنے کے لیے اس نے گھر سے باہر قدم رکھا۔ دوپہر تک وہ شہر کی سڑکیں ناپتا رہا لیکن کسی بھی جگہ اُسے کوئی باعزت کام نہ مل سکا۔ بغل میں انجینئر کی ڈگری دبائے اس نے بیسیوں دفاتر کے چکر لگائے اور اپنی مجبوریوں کا رونا رویا۔ وہ کم تنخواہ میں بھی کام کرنے کے لیے تیار تھا مگر ہر آفس میں باس کی سیٹ پر اس نے کہیں کوئی بھیڑیا تو کہیں کسی اُلو کو براجمان پایا۔ بھیڑیے اس پر غرائے اور اُلوؤں نے اس کا مذاق اُڑایا۔ دوپہر ڈھلنے تک وہ بے عزتی کی ففٹی مکمل کر چکا تھا کہ اچانک اس کا حوصلہ جواب دے گیا اور بے عزتی کی سنچری بنتے بنتے رہ گئی۔

دن کے اڑھائی بجے وہ گھر پہنچا تو اس نے ماں کو بے ہوشی کے عالم میں پایا۔ یہ منظر دیکھ کر وہ گھبرا گیا مگر پھر ماں کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ جب اس کی ہر کوشش ناکام ہو گئی تو اس کے ہاتھ پیر پھولنے لگے، تب وہ باہر کی طرف بھاگا اور پھر خوش قسمتی سے اسے گھر کے نزدیک ہی ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ اس وقت اس کی جیب میں چند سو روپے موجود تھے۔ ایک ہفتہ قبل ہی اسے باپ کی ماہوار پنشن ملی تھی جس میں سے یہی چند سو روپے بچے تھے۔ باقی کی رقم گھر کے اخراجات کی نذر ہو گئی تھی۔

اس نے ماں کو ٹیکسی میں ڈالا اور سرکاری اسپتال پہنچ گیا۔ ٹیکسی کا بل ادا کرنے کے بعد اس کی جیب میں دو سو روپے بچے تھے۔ اس نے بے ہوش ماں کو اُٹھایا اور ایمرجنسی کا رخ کیا مگر چونکہ وہ سرکاری اسپتال تھا اس لیے اُس وقت ایمرجنسی میں اُلو بول رہے تھے۔ ڈاکٹر تو کجا وہاں کوئی وارڈ بوائے بھی موجود نہیں تھا۔ اس نے تھوڑی دیر انتظار کیا اور پھر بے ہوش ماں کو ایک بینچ پر لٹا کر ڈاکٹر کو تلاش کرنے لگا مگر وہاں کوئی ڈاکٹر ہوتا تو اسے ملتا۔ اس نے سب وارڈز چھان مارے، ہر وارڈ میں مریض ہی مریض بھرے ہوئے تھے۔ بعض بیڈز پر تو اس نے دو دو مریضوں کو اکٹھا لیٹے ہوئے پایا۔ ایک کا سر اِدھر تو دوسرے کا سر اُدھر، ایک کے پیر دوسرے کے چہرے کا طواف کر رہے تھے۔

اُس وقت وہ ایک وارڈ سے باہر نکل رہا تھا کہ معاً اس کی نظر ایک ڈاکٹر پر پڑی جو اسپتال کے پارکنگ ایریا کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اُس کے کان سے سیل فون لگا ہوا تھا اور وہ بہت عجلت میں نظر آ رہا تھا۔ وہ تقریباً بھاگتا ہوا ڈاکٹر تک پہنچا اور عاجزی سے بولا۔ ”پلیز ڈاکٹر صاحب! میری ماں کو دیکھ لیجیے، وہ ایمرجنسی وارڈ کے کوریڈور میں ایک بینچ پر بے ہوشی کے عالم میں پڑی ہوئی ہے۔“

ڈاکٹر نے کان سے سیل فون ہٹائے بغیر اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور پھر ہاتھ سے دفع ہو جانے کا اشارہ کر دیا۔

اس نے ڈاکٹر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”خُدا کے لیے میری ماں کو دیکھ لیجیے ورنہ وہ مر جائے گی۔“

”بھاڑ میں گئی تیری ماں۔“ ڈاکٹر نے بھنا کر قطع کلامی کی۔ ”میری ڈیوٹی ایمرجنسی میں نہیں ہوتی اور اب دفع ہو جاؤ، کھڑے کھڑے میرا منہ کیوں تک رہے ہو؟“

وہ فطرتاً ایک امن پسند انسان تھا اور لڑائی جھگڑے سے ہمیشہ دُور رہا کرتا تھا مگر اس وقت اُس کا دماغ گھوم گیا۔ ڈاکٹر نے بات ہی ایسی کی تھی کہ وہ خود پر کنٹرول نہ کر سکا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ڈاکٹر پر بھوکے درندے کی طرح جھپٹا اور اس پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ ڈاکٹر جسمانی لحاظ سے اس کے مقابلے میں بہت کمزور تھا، سو دفاع پر اکتفا کرتا رہا مگر بیچ بچاؤ کرانے والے لوگوں کے پہنچتے تک سرمد اس کی اچھی خاصی مرمت کر چکا تھا۔ ڈاکٹر کی ناک اور منہ سے خون ٹپک رہا تھا۔ پھر بھی وہ بدستور سرمد کو کسی سڑک چھاپ غنڈے کے مانند گالیاں بکے جا رہا تھا۔ سرمد کو چند لوگوں نے بمشکل جکڑ رکھا تھا۔ لوگ جھگڑے کا سبب جاننے کے لیے سوالات کر رہے تھے۔ کوئی ڈاکٹر سے تو کوئی سرمد سے پوچھ رہا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہاں بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ایسے ہی وقت کسی وارڈ بوائے نے پولیس کو فون کر دیا۔ دس منٹ کے اندر ہی پولیس وہاں پہنچ گئی۔ تب تک سرمد وہاں موجود لوگوں کے سامنے جھگڑے کی وجہ بیان کر چکا تھا۔ کچھ لوگ ڈاکٹر کو حق بجانب سمجھ رہے تھے مگر بیشتر لوگوں کی ہمدردیاں سرمد کے ساتھ تھیں۔

ایک بڑی توند والا انسپکٹر پولیس وین سے اترا اور معاملہ جاننے کے لیے لوگوں سے پوچھ تاچھ کرنے لگا۔ اس وقت ان لوگوں کے منہ پر تالا لگ گیا جو چند لمحے قبل سرمد سے ہمدردی جتا رہے تھے، تاہم ڈاکٹر اور اس کے حامیوں نے کھل کر سرمد کو قصوروار ٹھہرایا اور اسے منٹوں میں ایک غنڈا ثابت کر دیا۔ ویسے بھی ڈاکٹر کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے اس کا خون آلود چہرہ کافی تھا۔ سرمد چلّا چلّا کر انسپکٹر کو اپنی بیمار اور ایمرجنسی وارڈ کے کوریڈور میں بے ہوشی کے عالم میں پڑی ہوئی ماں کے متعلق بتانے لگا۔

”سر! میں بالکل بے قصور ہوں۔ میری ماں ایمرجنسی وارڈ کے باہر پچھلے ایک گھنٹے سے بے ہوش پڑی ہوئی ہے اور یہاں کوئی ڈاکٹر ہی نہیں ہے۔ اگر اسے فوراً ایڈمٹ نہ کیا گیا تو وہ مر جائے گی۔“

”بے قصور کے بچے۔“ انسپکٹر نے اسے ایک طمانچہ رسید کرتے ہوئے کہا۔ ”غنڈا گردی کرتے ہو اور وہ بھی ایک معزز ڈاکٹر کے ساتھ۔ تیرا تو میں وہ حشر کروں گا کہ نانی یاد آ جائے گی۔ چلو اوئے! اس سور ما کو گاڑی میں ڈالو، تھانے چل کر اس کی سیوا کرتے ہیں۔“ آخری جملہ اس نے اپنے ماتحتوں سے کہا۔

انسپکٹر کا اشارہ پا کر تین ہٹے کٹے کانسٹیبل سرمد پر یوں جھپٹے جیسے چیل مرغی کے چوزوں پر جھپٹتی ہے۔ دو نے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا جبکہ تیسرا اُسے عقب سے ٹھڈے لگا رہا تھا۔ سرمد چیختا رہا، فریاد کرتا رہا کہ پہلے میری ماں کو تو اسپتال میں ایڈمٹ کرا دیں مگر پولیس والوں نے اس کی ایک بھی نہ سنی۔ وہ اسے گاڑی میں ڈال کر چلتے بنے جبکہ اس کی ماں وہیں ایمرجنسی وارڈ کے باہر بینچ پر پڑی رہ گئی۔

تھانے پہنچ کر پولیس نے روایتی انداز میں اس کی خاطر تواضع شروع کر دی۔ پہلے تو اس کی چھترول کی گئی پھر اسے تفتیش کے لیے انسپکٹر کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

انسپکٹر اگرچہ کرسی پر براجمان تھا مگر اس کی توند ٹیبل پر دھری ہوئی تھی۔ چند لمحے تو وہ سرمد کو تحقیر آمیز انداز میں گھورتا رہا پھر پوچھا۔ ”تم نے ڈاکٹر پر ہاتھ کیوں اُٹھایا؟“

”اس نے مجھے گالی دی تھی۔“

”تو تم بھی اسے گالی دیتے۔“ انسپکٹر نے بھڑک کر کہا۔ ”مارنا کیا ضروری تھا؟“

”بس اچانک ہی غصہ آ گیا تھا جی۔“ اس نے مردہ سی آواز میں جواب دیا۔ ”ورنہ میں تو بہت ہی شریف انسان ہوں۔ کبھی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا اور نہ کسی سے کبھی...“

”اوئے چپ ہو جا، زیادہ صفائیاں بیان نہ کر۔“ انسپکٹر نے گرج کر قطع کلامی کی۔ ”میں نے تیرے جیسے بہت سے شریفوں کو سیدھا کیا ہے، تجھے بھی ٹھیک کر دوں گا۔ ابھی تو جلیبی کی طرح ٹیڑھا ہے مگر میں تجھے تیر کی طرح سیدھا کر دوں گا۔ بول تو نے ڈاکٹر کو کیوں مارا... تیری اس سے کیا دشمنی ہے؟“

”دشمنی کیسی جی... میں تو اسے جانتا تک نہیں۔“

پھر اس سے پہلے کہ انسپکٹر اس سے مزید کوئی سوال کرتا، فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ انسپکٹر نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا یا۔

”انسپکٹر! اس غنڈے کا کیا بنا؟“ دوسری جانب سے کسی نے تحکم آمیز انداز میں سوال کیا۔

”آپ کون ہیں جی؟“ انسپکٹر نے الٹا سوال داغا۔

”تیرا باپ ایم پی اے حمید رانا۔“

”س... سوری... جناب...“ انسپکٹر اس قدر سرعت کے ساتھ اُٹھا کہ کرسی اس کی تشریف سے چپکی رہ گئی۔ یہ قابلِ دید منظر قہقہے کا متقاضی تھا۔ اگر سرمد کی جان پر نہ بنی ہوتی تو وہ ضرور قہقہہ لگاتا۔

”حکم کریں جناب۔“ انسپکٹر نے بائیں ہاتھ سے کرسی کو کھینچ کر تشریف کو رہائی دلائی۔ ”وہ غنڈا اس وقت میرے سامنے کھڑا ہے۔“

”حکم کے بچے! وہ اب تک اپنے پیروں پر کیوں کھڑا ہے؟“ حمید رانا نے اسے ڈانٹ پلائی۔ ”معلوم ہوتا ہے تم پولیس کی سروس سے اکتا گئے ہو۔“

”نن... نہیں... جناب! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ ہم نے اس کی بہت چھترول کی ہے۔“ اس نے خوشامدی انداز میں جواب دیا۔

”چھترول کے بچے! میں نے تجھے قربانی پر ذبح کرنے کے لیے تو نہیں پال رکھا۔“

”آپ فکر نہ کریں جناب! میں ابھی اسے ڈرائنگ روم کی سیر کراتا ہوں۔“

حمید رانا نے بے رحمانہ انداز میں کہا۔ ”اس کے ہاتھ پاؤں توڑ کر پھینک دو کسی چوراہے پر بھیک مانگنے کے لیے۔ میرے ہوتے ہوئے تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔“

”ایسا ہی ہوگا رانا صاحب! میں تو جی آپ کا غلام ہوں۔ آپ جو حکم کریں گے وہ سر آنکھوں پر۔ جناب کی اجازت ہو تو اسے پولیس مقابلے میں پار کر دوں؟“

”نہیں، وہ سزا اس کے لیے نجات کا ذریعہ بن جائے گی۔ اس کی زندگی موت سے بدتر بنا دو۔“ رانا نے حکم سنا کر رابطہ منقطع کر دیا۔

”لو جی تو تو اب گیا کام سے۔“ انسپکٹر نے ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے اسے گھورا۔ ”تجھے کس نے کہا تھا کہ رانا صاحب کے داماد سے پنگا لو... مفت میں جان گنوا دی نا!“

سرمد بُری طرح پھنس گیا تھا۔ اسے اب کوئی شک نہیں رہا تھا کہ انسپکٹر اس کی جان لینے پر تلا ہوا ہے۔ انسپکٹر وردی بے شک سرکار کی پہنتا تھا مگر چاکری رانا صاحب کی کرتا تھا۔ رانا صاحب کون تھا؟ یہ سرمد کو معلوم نہیں تھا۔ بہرکیف اس نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ رانا صاحب ضرور کوئی اہم شخصیت ہوں گے ورنہ انسپکٹر اس سے یوں نہ ڈرتا۔ ایک پل میں اس نے ایک فیصلہ کیا اور پھر اس پر عمل کر ڈالا۔

”انسپکٹر صاحب! میں اقبالِ جرم کرتا ہوں۔ آپ مجھے بلا وجہ ٹارچر نہیں کر سکتے۔ ایف آئی آر درج کریں اور مجھے کورٹ میں پیش کر دیں۔ میں یہ کیس بخوشی فیس کر لوں گا۔“

”اوئے! یہ تو وکیل کب سے ہو گیا ہے؟“ انسپکٹر نے تپ کر سوال کیا۔ ”اور یہ تجھے کس نے کہہ دیا کہ میں تجھے ٹارچر نہیں کر سکتا؟ میں تو اب تیری ہڈیاں توڑوں گا... کیا کر لے گا تو بول؟“

وہ بولا۔ ”میں لاوارث نہیں ہوں اور نہ ہی اَن پڑھ اور جاہل ہوں بلکہ ایک انجینئر ہوں۔ ایک صحافی بھی میرا دوست ہے۔ آپ نے اگر قانون ہاتھ میں لیا تو بات بہت اُوپر تک جائے گی۔“

انجینئر اور صحافی کا حوالہ سن کر انسپکٹر کے کان کھڑے ہو گئے مگر دوسری طرف اسے رانا صاحب کی طاقت کا بھی اندازہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رانا صاحب اسے بچا لیں گے۔ سرمد کو چھوڑ کر وہ رانا صاحب کا عتاب مول نہیں لے سکتا تھا۔ چنانچہ لمحہ بھر سوچنے کے بعد وہ سرمد سے بولا۔ ”فی الحال میں تجھے لاک اپ میں ڈال رہا ہوں پھر دیکھ کیا ہوتا ہے۔“

انسپکٹر نے ایک کانسٹیبل کو آواز دی۔ ”اوئے رحمے!

اندر آ۔“

”حکم جناب۔“ کانسٹیبل نے اندر داخل ہوکر سیلیوٹ کیا۔

”لے جاؤ اسے اور لاک اپ میں بند کردو۔“

کانسٹیبل نے سرمد کو بازو سے پکڑا اور آفس سے باہر لے گیا۔ انسپکٹر نے رانا صاحب کا نمبر ڈائل کیا۔ تیسری بیل کے بعد اسے رانا صاحب کی آواز سنائی دی۔ ”بولو انسپکٹر... کیا کام ہوگیا ہے؟“

انسپکٹر نے کہا۔ ”جناب! وہ کوئی عام بندہ نہیں ہے۔ اس کا پکا انتظام کرنا پڑے گا ورنہ اُلٹی آنتیں گلے کو آجائیں گی۔“

”کیا بکواس کررہے ہو... کون ہے وہ؟“ رانا نے جھنجلا کر پوچھا۔

”جناب! وہ خود کو ایک انجینئر بتاتا ہے اور کسی صحافی سے بھی اس کے تعلقات ہیں۔ ایسے میں ہمیں اس کا اِن کاؤنٹر کرنا پڑے گا، نہ رہے گی بانسری نہ بجے گا بانس۔“

”اُلو کے چرخے! مثالیں تو ٹھیک سے دیا کرو۔ بانس سے بانسری بنتی ہے، نہ کہ بانسری سے بانس۔“

”مجھے پتا ہے جی۔“

”کیا پتا ہے؟“

”یہی کہ بانس سے بانسری بنتی ہے۔“

”اور بجتا کیا ہے؟“

”بانس۔“

رانا نے ایک ناقابلِ اشاعت گالی دی۔ ”بانس اور بانسری کو گولی مارو، اس حرام زادے کا کوئی بندوبست کرو، ورنہ میں تیری بانسری بجادوں گا۔ پھر تم دھوبی کے کتے کی طرح کہیں کے بھی نہیں رہوگے۔ نہ تھانے کے نہ گھر کے اور نہ ہی کوئی تجھے راتب ڈالے گا۔“

”اس سے پہلے جناب میں اُس کی بانسری بجادوں گا۔“

”پھر بانسری۔“ رانا چلّایا۔

انسپکٹر بوکھلا کر بولا۔ ”مم... میرا مطلب ہے کہ میں اُسے پولیس مقابلے میں ٹھکانے لگادوں گا۔“

”نہیں... فی الحال تم ایسا کچھ بھی نہیں کروگے۔“

”تو پھر آپ ہی بتائیں جناب کہ میں اُس کا کیا کروں؟“ انسپکٹر نے پریشان ہوکر پوچھا۔

”اس کا فیصلہ میں خود کروں گا۔ تم بس اُسے لاک اپ میں بند رکھو۔“

”ٹھیک ہے جناب اور کوئی حکم؟“

”ابھی نہیں بعد میں بتاؤں گا۔“ رانا نے کال منقطع کردی۔

☆☆☆

جدید طرزِ تعمیر کا نمونہ وہ محل نما کوٹھی شہر کے ایک معروف علاقے میں واقع تھی۔ وہاں اُس جیسی کئی دیگر کوٹھیاں بھی موجود تھیں جن میں سے بہت سی شاید کالے دھن کی مرہونِ منت تھیں۔ ان کوٹھیوں کے باسی وہ لوگ تھے جو گزشتہ کئی دہائیوں سے عوام کہلانے والی بھیڑوں کے ریوڑ کا خون نچوڑ رہے تھے۔ یہ وہ چرواہے تھے جو بھیڑیوں سے زیادہ خونخوار اور لومڑیوں سے بڑھ کر عیار تھے۔

اُس کوٹھی کے مکینوں میں ایک مسلح چوکیدار اور دوسرا خانساماں تھا۔ دونوں چوبیس گھنٹے کوٹھی میں موجود رہا کرتے تھے۔ انتہائی ضرورت کے تحت اُن میں سے کسی ایک کو کبھی کبھار مارکیٹ تک جانے کی اجازت تھی مگر وہ بھی صرف دن کے وقت۔ یہ کوٹھی ایم پی اے حمید رانا کی ملکیت تھی لیکن وہ اسے بطور رہائش استعمال نہیں کرتا تھا۔ اس کی فیملی اپنے آبائی شہر میں رہتی تھی جو وہاں سے محض دو گھنٹوں کی مسافت پر واقع تھا۔ اُس وقت کوٹھی کے ایک ساؤنڈ پروف کمرے میں حمید رانا موجود تھا۔ وہ مہینے میں چند بار ہی وہاں آیا کرتا تھا۔

ابھی اسے وہاں بیٹھے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ... انٹرکام کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے چوکیدار کی مؤدبانہ آواز سنائی دی۔

”جناب! راجا آیا ہے اور آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“

”بھیج دو۔“ یہ کہہ کر اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

ذرا دیر کے بعد ایک قدآور اور وجیہہ نوجوان جس کی عمر ستائیس، اٹھائیس برس کے لگ بھگ تھی، اس کے سامنے موجود تھا۔

”کہو راجا! کیا خبر لائے ہو؟“ اس نے استفسار کیا۔

”انسپکٹر حشمت ٹھیک کہتا ہے سر۔“ راجا بولا۔ ”وہ نوجوان ایک انجینئر ہے مگر صرف نام کا۔“

”کیا اس کی ڈگری جعلی ہے؟“ رانا نے پوچھا۔

”ڈگری اصلی ہے لیکن اس کے پاس جاب نہیں ہے۔ دراصل اسے جاب کسی نے دی ہی نہیں۔“

”مطلب... بندہ کام کا ہے۔“ رانا نے دلچسپی لی۔

”اگر اس پر محنت کی جائے تو ہمارے کام آسکتا ہے۔“

راجا بولا۔ ”آپ بہتر سمجھتے ہیں سر... میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“

”اس کا گھر بار... کوئی آگے پیچھے؟“ رانا نے سوال کیا۔

”صرف دو بہنیں ہیں جو بیاہی جاچکی ہیں۔ ماں باپ

...وں گزر گئے ہیں اور گھر کچی آبادی میں دو نیم پختہ کمروں ...مشتمل ہے۔ آمدنی کا واحد ذریعہ باپ کی ماہوار پنشن تھی جو ...کی بیوہ ماں کو ملتی تھی۔ مگر اب جبکہ اس کی ماں بھی فوت ہو ...گئی ہے تو یہ پنشن بند ہوجائے گی۔“ راجا نے تفصیل بتائی۔

”مگر اس کی ماں تو زندہ تھی... اسی کی وجہ سے تو اس کا ...ڈاکٹر احسن سے جھگڑا ہوا تھا۔“

”وہ اسی روز بینچ پر مردہ پائی گئی تھی۔“

رانا گہری سوچ میں مستغرق ہوگیا جبکہ راجا جواب ...طلب انداز میں اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ راجا کو ...معلوم تھا کہ رانا اس نوجوان کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں الجھا ...ہوا ہے، اس لیے اُس نے کسی قسم کی مداخلت سے گریز کیا۔ ...رانا کسی سے بھی مشورہ لینے کا عادی نہیں تھا۔ وہ بے حد متکبر اور ...خود پسند انسان تھا۔ راجا گزشتہ دس برس سے اس کے لیے ...کام کررہا تھا اور ان دس برسوں میں راجا نے کبھی اپنی حدود ...سے تجاوز نہیں کیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد رانا خود اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ”اوکے! اب تم جاسکتے ہو، میں بعد میں تم سے سیل فون پر رابطہ کرلوں گا۔“

”ٹھیک ہے سر۔“ راجا رخصت ہوگیا۔

راجا کے جانے کے بعد رانا نے انسپکٹر حشمت سے رابطہ کیا اور پھر اسے اُس پلان کے متعلق ہدایات دینے لگا جو تھوڑی دیر قبل اس کے عیار ذہن نے ترتیب دیا تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن شام ڈھلنے سے قبل لاک اپ کا دروازہ کھلا اور سرمد کو باہر نکال کر انسپکٹر حشمت کے سامنے پیش کردیا گیا۔ انسپکٹر نے اسے نظر بھر کر دیکھا اور پھر چہرے پر بناوٹی مسکراہٹ طاری کرتے ہوئے بولا۔ ”خوش قسمت ہے بھئی کہ تجھے رانا صاحب نے معاف کردیا ہے ورنہ تجھے ٹھکانے لگایا جاچکا ہوتا۔“

سرمد نے کہا۔ ”میں رانا صاحب کا اور آپ کا احسان مند ہوں جناب... کیا اب میں جاسکتا ہوں؟“

”نہیں، ہم تجھے خود چھوڑ کر آئیں گے اور یہ رانا صاحب کا حکم ہے۔ ہم اُن کے حکم سے سرتابی نہیں کرسکتے۔“

انسپکٹر کا انداز کچھ ذو معنی سا تھا۔ سرمد کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اُسے بغیر کسی رشوت کے یوں آسانی سے چھوڑا جارہا تھا اور یہی بات اسے ہضم نہیں ہورہی تھی۔ بغیر رشوت لیے تو پولیس والے کبھی کسی کو معاف نہیں کرتے، تو پھر اسے کیوں معاف کیا جارہا تھا؟ یقیناً اس کے پیچھے کوئی سازش تھی جس سے وہ بے خبر تھا۔

قدرے توقف کے بعد وہ بولا۔ ”جناب! آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں، میں خود چلا جاؤں گا۔ میرا گھر نزدیک ہی تو ہے۔ رانا صاحب سے آپ کہہ دینا کہ آپ لوگ مجھے خود چھوڑ کر آئے ہیں۔ انہیں جب معلوم ہی نہیں ہوگا تو وہ کیسے آپ سے اس کوتاہی کی پُرسش کریں گے؟“

”رانا صاحب کی نگاہوں سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رہتا۔ میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔“ انسپکٹر نے حتمی انداز میں جواب دیا۔

سرمد کا رہا سہا شک بھی دُور ہوگیا۔ وہ جان چکا تھا کہ اسے ایک بااختیار شخص کے انتقام کی بھینٹ چڑھانے کا حتمی فیصلہ کیا جاچکا ہے۔

”انسپکٹر صاحب! کیا واقعی مجھے معاف کردیا گیا ہے؟“ اس نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

انسپکٹر نے بگڑ کر کہا۔ ”تمہیں کوئی شک ہے کیا؟“

”نن... نہیں جی... شک کیسا؟“ وہ سٹپٹا گیا۔ ”میں تو ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔“

”ویسے کیوں؟“ انسپکٹر نے اسے گھورا۔ ”تم رانا صاحب کی مہربانی کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہے ہو کیا یہ غلط بات نہیں ہے۔ انہوں نے تم پر اتنا بڑا احسان کیا ہے اور تم ممنون ہونے کے بجائے شک کررہے ہو۔ لعنت ہے تم پر۔“

”مم... میں... معافی چاہتا ہوں جناب، دراصل...“

”کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔“ انسپکٹر نے اس کی بات کاٹی اور پھر ایک کانسٹیبل سے مخاطب ہوا۔ ”اسے لے جاکر گاڑی میں بٹھادو اور چند آدمیوں کو تیار رہنے کا کہو۔ ہم ابھی اسے اس کے گھر چھوڑنے جائیں گے۔“

”سر! میں خود...“

”خاموش۔“ انسپکٹر چلّایا تو سرمد چپ ہوگیا۔ ”اب اگر تُو نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو میں تجھے دوبارہ لاک اپ میں ڈال دوں گا۔ دفعہ تین سو تین کے تحت تم ارادۂ قتل کے مرتکب ہوئے ہو جس کی کم سے کم سزا دس سال ہے۔“

انسپکٹر کی یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور سرمد بے چون و چرا کانسٹیبل کے ساتھ ہولیا۔ اب شاید اس نے سب کچھ تقدیر پر چھوڑ دیا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اُس نے چپ سادھ لی۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک پولیس وین تھانے کے مین گیٹ سے نکلی جس کی فرنٹ سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ انسپکٹر حشمت براجمان تھا جبکہ عقب میں سرمد اور پانچ مسلح کانسٹیبل بیٹھے ہوئے تھے۔ سرمد کے چہرے پر اُمید و نا اُمیدی کی ملی

جلی کیفیت طاری تھی اور وہ بالکل چپ بیٹھا ہوا تھا، تاہم کانسٹیبل ایک دوسرے سے محو گفتگو تھے۔ وین کھلے روڈ پر پہنچ کر لمحہ بھر کے لیے رک گئی اور پھر ٹرن لے کر ایک جانب روانہ ہوگئی۔ سرمد کو ایک دم خطرے کا احساس ہوا تو وہ چلا اٹھا۔

''میرا گھر اس طرف نہیں ہے... یہ... یہ آپ مجھے کس طرف لے کر جا رہے ہیں؟... پلیز گاڑی روکو اور مجھے یہیں اتار دو... مم... میں... خود ہی چلا جاؤں گا۔''

''چلاؤ مت۔'' ایک کرخت صورت کانسٹیبل نے اسے ڈانٹ پلائی۔ ''صاحب کو اس طرف کوئی کام ہے، اس کے بعد تمہیں تمہارے گھر پہنچا دیا جائے گا۔''

وہ بے بسی کے عالم میں بولا۔ ''خدا کے قہر سے ڈرو... ایک بے گناہ انسان کو پولیس مقابلے میں مارنا بہت بڑا ظلم ہے... میں... میں آپ لوگوں کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں، خدا کے لیے مجھ پر رحم کریں۔''

''اوئے پاگل کے بچے! ہم تمہیں مار کر کیا حاصل کریں گے؟'' وہی کانسٹیبل دوبارہ بولا۔ ''تم نے کون سے بم بلاسٹ کیے ہیں یا کسی منسٹر کی کڑی کو اغوا کیا ہے کہ ہم تمہیں پولیس مقابلے میں ماریں گے؟''

دوسرا کانسٹیبل بولا۔ ''اوئے باؤلے! پولیس کے پاس اتنی فالتو گولیاں نہیں ہوتیں کہ وہ انہیں تم جیسے کیڑے مکوڑوں پر ضائع کرتی پھرے۔ آرام سے بیٹھے رہو ورنہ دوں گا ایک کان کے نیچے اور تیرے بارہ بج جائیں گے۔''

تمام کانسٹیبل کھلکھلا کر ہنس پڑے اور سرمد ایک بار پھر چپ سادھ کر بیٹھ گیا کہ اس کے بس میں اس کے سوا کچھ بھی نہیں تھا، تاہم اُن کی باتیں سن کر وہ تھوڑا سا پُرامید ضرور ہوگیا تھا کہ پولیس والوں نے اُسے مارنا ہی ہوتا تو وہ یہ کام تھانے سے نکلنے کے فوراً بعد بھی انجام دے سکتے تھے۔ اُسے اس قدر دُور لے جانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔

وین ایک قدرے سنسان سڑک پر جا کر رک گئی۔ انسپکٹر حشمت تیزی سے نیچے اُترا اور کانسٹیبلوں سے تحکمانہ انداز میں بولا۔ ''جلدی کرو، باہر لاؤ اسے۔ وقت بہت کم ہے ہمارے پاس اور رانا صاحب خوش خبری سننے کے منتظر ہوں گے۔''

کانسٹیبلوں نے سرمد کو گھسیٹ کر نیچے اتارا اور انسپکٹر کے قدموں میں پھینک دیا۔

''چل اُٹھ اوئے!'' انسپکٹر حشمت نے اسے ٹھوکر لگائی۔ ''تیری پرچی کٹ چکی ہے مگر میں تجھے جان بچانے کا ایک موقع ضرور دوں گا۔ اگر تم گولی سے تیز دوڑ سکتے ہو تو پھر بھاگو ورنہ...'' انسپکٹر نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''مم... مم... میں...'' اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

انسپکٹر نے قطع کلامی کی۔ ''بھاگو... نہیں تو ادھر ہی میں سوراخ کر دوں گا۔''

انسپکٹر کے لہجے میں قطعیت تھی، جسے سرمد نے صاف محسوس کرلیا تھا۔ اب اس سے منت سماجت کرنا پتھر سے سر پھوڑنے کے مترادف تھا۔ انسپکٹر، رانا کا پالتو کتا تھا اور اپنے مالک کے اشارے پر اُسے چیر نے پھاڑنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ چنانچہ کسی کتے سے رحم کی بھیک مانگنے کے بجائے اُس نے بہتر یہ سمجھا کہ خود ہی اپنی جان بچانے کی کوئی تدبیر کرے۔ سوچنے کے لیے اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ یہ صرف پل دو پل کا کھیل تھا جو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے کھیلنا تھا۔ بظاہر اس کھیل میں اس کی جان بچنے کے ایک فی صد چانس بھی نہیں تھے۔ ہر دو صورتوں میں اس کے لیے صرف موت ہی موت تھی تاہم دوسری صورت میں وہ بھاگ کر اپنی جان بچانے کی کوشش کرسکتا تھا۔ گو کہ یہ ممکن نہیں تھا مگر کوشش کرنا، انسپکٹر کے قدموں میں جان دینے سے بہتر تھا۔

ایک لمحے میں اُس نے فیصلہ کیا اور پھر تیزی سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ایسے ہی وقت مغرب کی اذان ہونے لگی۔ اُس نے دل ہی دل میں خدا سے مدد طلب کی اور اردگرد کا یوں جائزہ لینے لگا جیسے بھاگنے کے لیے کسی محفوظ سمت کا انتخاب کر رہا ہو۔

انسپکٹر نے کہا۔ ''تم سمت کا تعین اپنی مرضی سے کرسکتے ہو مگر تمہارے پاس وقت بہت کم ہے، میں صرف دس تک گنوں گا۔ اگر تم اس دوران نہ بھاگے تو میں گولی چلانے میں ایک سیکنڈ کی دیر بھی نہیں لگاؤں گا۔''

بات ختم کرتے ہی انسپکٹر نے گنتی شروع کردی۔

''ایک، دو... تین...''

اس دوران میں سرمد بغیر سمت کا تعین کر کے بھاگ کھڑا ہوا۔ اُس کا رُخ ایک چوراہے کی طرف تھا جو وہاں سے نصف فرلانگ کی دُوری پر تھا۔ ابھی اس نے بمشکل آدھے سے بھی کم فاصلہ طے کیا تھا کہ معاً ایک گولی سنسناتی ہوئی اس کے سر کے اُوپر سے گزری۔ وہ چلّا کر منہ کے بل گرا مگر اس دوران میں ایک اور گولی اس کے بالکل نزدیک زمین سے ٹکرائی تو وہ دوبارہ اُٹھ کر چوراہے کی طرف دوڑا۔ آگے زندگی اور پیچھے موت تھی۔ وہ اپنے جسم کی ساری توانائی دوڑنے میں صرف کر رہا تھا جیسے اُسے پَر لگ گئے ہوں۔ چوراہا اب چند قدموں کی دُوری پر تھا۔ اسے بس وہاں تک پہنچ کر دائیں یا بائیں گھوم جانا تھا۔ سو وہ اندھا دھند دوڑ رہا تھا کہ ایسے ہی وقت ایک گولی اس کی بائیں پنڈلی میں کسی گرم سلاخ کی طرح اُتر گئی۔

وہ اچھل کر دوبارہ منہ کے بل گرا تو چند اور گولیاں اس کے اُوپر سے گزر گئیں۔ بغیر کسی توقف کے وہ اُٹھا اور زخمی ٹانگ کو گھسیٹتے ہوئے دائیں ہاتھ پر گھوم گیا۔ آگے بڑھتے ہی وہ سامنے سے آنے والی تیز رفتار کار سے ٹکرایا اور پھر اس کا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔ بے ہوش ہونے سے قبل اس نے کار کے پہیوں کے چیخنے کی آواز سنی تھی۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک صاف ستھرے بستر پر پایا۔ اس نے اردگرد کا جائزہ لیا، یہ ایک کشادہ اور پُرآسائش کمرا تھا۔ اس کے بستر کے ساتھ موجود سائڈ ٹیبل پر چند میڈیسن رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے سر، پنڈلی اور دائیں ہاتھ پر بینڈیج موجود تھی۔ گو کہ اس کے جسم کے کسی حصے میں کوئی درد نہیں تھا تاہم وہ نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ اور اکلوتی کھڑکی بند تھی لیکن انرجی سیور کی سفید اور ٹھنڈی روشنی میں اسے ہر چیز واضح نظر آ رہی تھی۔ وقت کا وہ کوئی اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا۔ کمرے میں کوئی وال کلاک موجود نہیں تھا جسے دیکھ کر وہ دن یا رات کا تعین کرسکتا۔

اسی عالم میں اسے کافی دیر گزر گئی۔ اب وہ پڑے پڑے بوریت محسوس کرنے لگا تھا اور کسی کو آواز دینے کے متعلق سوچ رہا تھا کہ معاً کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان شخص اندر داخل ہوا جو قطعی طور پر اس کے لیے اجنبی تھا۔ اُسے ہوش میں دیکھ کر نوجوان کے لبوں پر خود بخود ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔

''تھینکس گاڈ کہ تمہیں ہوش آگیا۔'' نوجوان یوں گویا ہوا جیسے برسوں سے اس کا شناسا ہو۔ اس کے لہجے میں اپنائیت اور خلوص تھا۔ ''راجا بہت پریشان تھا تمہارے لیے۔''

''کون... راجا؟'' اس نے حیرت اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت میں سوال کیا۔

نوجوان بولا۔ ''وہ تمہارا دوست ہے اور بہت جلد اس سے تمہاری ملاقات ہوگی پھر تم خود ہی جان لوگے کہ وہ کون ہے؟''

''مگر راجا نام کا تو میرا کوئی بھی دوست نہیں ہے۔''

''یار! یہ تم کن چکروں میں پڑ گئے ہو؟'' نوجوان نے بے تکلفی سے کہا۔ ''چلو ہم ایک دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں۔ میرا نام بدرالدین ہے مگر کچھ لوگ مجھے بدرو کہتے ہیں اور وہ جنہیں میرا دوست ہونے کا شرف حاصل ہے، وہ مجھے پیار سے بدرُوح کہتے ہیں جس کا میں قطعی بُرا نہیں مناتا۔''

تعارف کے اس انداز پر وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

''یار! اس میں دانت نکالنے والی کون سی بات ہے۔'' بدرالدین اس کے بیڈ کے نزدیک رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''دل چاہے تو تم بھی مجھے بدرُوح کہہ سکتے ہو... مگر یہ مت بھولنا کہ صرف پیار سے۔ غصے کے عالم میں مجھے بدرالدین صاحب کہہ کر پکارنا... نہیں تو مجھے غصہ آجائے گا جو تمہارے لیے بہت بُرا ثابت ہوگا۔ اب تم اپنا تعارف کراؤ۔''

''مجھے سرمد رحمان کہتے ہیں۔''

''صرف سرمد رحمان۔'' اس نے تاسف کے انداز میں سر ہلایا۔ ''بھلا یہ بھی کوئی تعارف ہے... نہ کوئی اتا نہ پتا... بھئی، پورا تعارف کرائیے؟''

''ایک بے وقعت انسان کا تعارف نام تک ہی محدود ہوتا ہے۔''

''بے وقعت کس لیے بھئی... راجا تو کہہ رہا تھا کہ تم ایک انجینئر ہو۔'' بدرالدین نے حیرت کا اظہار کیا۔ ''کیا وہ غلط کہہ رہا تھا؟... یا پھر تم جھوٹ بول رہے ہو؟''

''انجینئر! ہونہہ...'' اس کے چہرے پر ایک حقارت آمیز تبسم ابھر کر معدوم ہوگیا۔ ''صرف نام کا انجینئر تھا... لیکن اب تو ایک مفرور ہوں۔ انسپکٹر حشمت کسی پاگل کتے کی طرح مجھے ڈھونڈتا پھر رہا ہوگا۔''

''اگر تم محسوس نہ کرو تو میں تمہاری پوری سرگزشت سننا چاہتا ہوں۔''

''میری سرگزشت میں سننے لائق کچھ بھی نہیں ہے۔ تمہارا وقت ضائع ہوگا۔''

بدرالدین بولا۔ ''نو پرابلم... تم شروع ہو جاؤ، میرا وقت کبھی ضائع نہیں ہوتا۔''

''لیکن پہلے میں اپنے اس محسن کا نام جاننا چاہوں گا جس نے میری جان بچائی ہے۔''

''تمہاری جان راجا نے بچائی ہے۔ تم اچانک ہی اس کی گاڑی سے ٹکرا گئے تھے۔ پھر پولیس کے پہنچنے سے قبل ہی راجا تمہیں گاڑی میں ڈال کر یہاں لے آیا۔''

''کیا راجا کو پتا تھا کہ پولیس میرے پیچھے لگی ہے؟''

وہ بولا۔ ''بالکل پتا تھا ورنہ وہ تمہیں یہاں کیوں لاتا؟ تم زخمی تھے اور تمہارے لیے بہترین جگہ اسپتال تھی۔''

''کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ میرا محسن مجھ سے اب تک ملنے نہیں آیا؟''

''وہ کسی ضروری کام سے گیا ہے، جلد آجائے گا۔ تم اس دوران مجھے اپنی بپتا سنادو۔''

''مجھے میری ماں کے بارے میں بتاؤ... میں اسے بے ہوشی کے عالم میں اسپتال کی بینچ پر چھوڑ آیا تھا۔ نہ جانے اس کے ساتھ کیا ہوا ہوگا؟'' اس نے ایک دم پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

''اسے راجا نے ایڈمٹ کرا دیا ہے۔'' بدرالدین نے اسے جھوٹی تسلی دی۔ ''تم اس کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ، وہ انشاء اللہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گی۔''

ماں کے متعلق سن کر وہ قدرے مطمئن ہو گیا اور پھر بدرالدین کے اصرار پر اسے اپنے بیتے ایام کے متعلق بتانے لگا۔

''دوست! تمہارے ساتھ بہت ناانصافی ہوئی ہے۔'' بدرالدین نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔ ''اور یہ صرف تمہارے ساتھ نہیں ہوا بلکہ اس ملک میں ہر اُس شخص کے ساتھ برسوں سے یہی کھیل کھیلا جا رہا ہے جس کے پاس نہ سفارش ہے نہ رشوت۔ یہاں اگر مانگنے سے حق ملتا تو لوگ اپنا حق لینے کے لیے ہتھیار کیوں اُٹھاتے... کیوں قانون اپنے ہاتھ میں لیتے؟ یہاں اقتدار کے ایوانوں پر اُن مردار خور گدھوں اور بھیڑیوں کا قبضہ ہے جو رحم کے لفظ سے ناآشنا ہیں۔ یہاں صرف طاقت والوں کا راج ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ تمہارے جیسے کمزوروں کے ساتھ یہاں کبھی بھی انصاف نہیں ہوگا... جانتے ہو کس لیے؟'' اس نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا اور دوبارہ گویا ہوا۔ ''اس لیے کہ وہ جانتے ہیں تم اُن کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ تمہارے پاس سفارش ہے نہ رشوت۔ ایسے میں کون تمہاری سنے گا؟''

وہ بولا۔ ''میں مانتا ہوں... میرے پاس سفارش ہے نہ رشوت لیکن کیا یہ میرا قصور ہے؟''

''تمہارا پہلا قصور یہ ہے کہ تم نے ایک اسکول ماسٹر کے گھر میں جنم لیا... دوسرا یہ کہ تم نے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی... تیسرا قصور یہ ہے کہ تم نے اسکول ماسٹر بننا گوارا نہ کیا۔ تمہارے جیسے لوگ یا تو بھوکے مرجاتے ہیں یا پھر...'' وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

''یا پھر کیا؟''

''رہنے دو... ابھی وقت نہیں آیا۔ اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے۔''

''ابھی بات کرنے میں کیا حرج ہے؟''

بدرالدین نے کہا۔ ''پہلے تم تندرست ہو جاؤ، اس کے بعد میں اور راجا تمہارے لیے کوئی مناسب کام تلاش کریں گے۔''

''لیکن... میں تو ایک مفرور ہوں اور پولیس میری تلاش میں ہے۔''

''پولیس کی ایسی کی تیسی... یہ تم مجھ پر اور راجا پر چھوڑ دو۔ اب پولیس تمہارے قریب بھی نہیں پھٹکے گی۔''

''کیا راجا بہت بڑا آدمی ہے؟'' اُس نے سوال کیا۔

''تمہاری سوچ سے بھی بڑھ کر۔'' وہ اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''اب آرام کرو، کل جب راجا آجائے گا تو پھر بات کریں گے۔''

''اگر تم مجھے میری ماں کے بارے میں کوئی خبر دے سکو تو یہ مجھ پر احسان ہوگا۔''

''اوکے... میں کوشش کرتا ہوں۔'' بدرالدین اُسے تسلی دیتے ہوئے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

راجا اس وقت رانا صاحب کے سامنے موجود تھا۔ چند لمحے تو رانا صاحب اسے یوں ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتے رہے جیسے انہیں راجا کی بات پر جھوٹ کا گمان ہو پھر سوال کیا۔ ''کیا واقعی وہ تمہارے بچپن کا دوست اور کلاس فیلو ہے؟''

''جی سر۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

رانا نے اسے گھورا۔ ''یہ بات تم نے پہلے مجھ سے کیوں چھپائی؟''

''مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ اس وقت میں نے صرف اس کے والدین کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں۔''

''تم سچ بول رہے ہو؟'' رانا کا انداز مشکوک تھا۔

''جی سر... مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے اسے کل ہی دیکھا ہے مگر وہ مجھ سے ابھی تک نہیں ملا۔ کل جس وقت پولیس اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی تو وہ میری گاڑی سے ٹکرا کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس وقت بدرو اس کے پاس ہے۔''

''چلو اب اس کی برین واشنگ بہ آسانی ہو جائے گی۔ وہ تمہارا دوست ہے اس لیے تمہاری باتوں پر اسے جلدی یقین آئے گا۔''

وہ بولا۔ ''سر! میں کوشش کروں گا لیکن...''

''لیکن کیا؟'' رانا نے ناگوار انداز میں اس کی بات کاٹی۔ ''اور... یہ کوشش کرنے کا کیا مطلب ہے؟''

''سر! میں اسے بچپن سے جانتا ہوں، وہ بہت ضدی ہے۔ اسے سمجھانا بہت مشکل کام ہے، اس لیے میں نے کوشش کا لفظ استعمال کیا ہے۔'' راجا نے صفائی پیش کی۔

''تم جانتے ہو کہ مجھے کوشش کے لفظ سے نفرت ہے۔ آئندہ خیال رکھنا ورنہ اچھا نہ ہوگا۔'' رانا نے وارننگ دی۔

''یس سر! آئندہ محتاط رہوں گا۔''

''اوکے، اب جا کر اس سے ملو اور آج ہی اس کی برین واشنگ شروع کردو... اور ہاں، یہ یاد رکھنا کہ مجھے اس کام میں سو فی صد کامیابی چاہیے، بصورتِ دیگر اسے گولی ماردینا۔''

ذرا دیر کے بعد راجا کار میں بیٹھا رانا صاحب کی کوٹھی سے باہر نکل رہا تھا۔ شہر کی مختلف سڑکوں سے گزرتا ہوا وہ نصف گھنٹے کے اندر اس مکان تک پہنچ گیا جہاں انھوں نے سرمد کو رکھا ہوا تھا۔ یہ ایک جدید طرز کا خاصا بڑا مکان تھا۔ یہ مکان رانا صاحب کے اُن کارندوں کی رہائش گاہ تھی جو اس کے حکم کے غلام تھے اور اُس کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے۔ رانا صاحب اُن کے لیے گاڈ فادر کا درجہ رکھتے تھے۔ حکم عدولی کے مرتکب کارندے کو بلیک لسٹ کرنے کے بعد گولی ماردی جاتی تھی۔

راجا نے کار پورچ میں کھڑی کی اور اس کمرے کی طرف چل دیا جہاں انھوں نے سرمد کو رکھا ہوا تھا۔ سرمد اس کے بچپن کا دوست تھا۔ اُن دونوں نے میٹرک تک ایک ساتھ تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے بعد اُن کے راستے جدا ہو گئے تھے۔ وہ غمِ روزگار میں اُلجھ گیا تھا جبکہ سرمد نے اپنی تعلیم جاری رکھتے ہوئے کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ آج وہ تقریباً دس برس کے بعد سرمد کا سامنا کرنے والا تھا۔ اس کی کیفیت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ ویسے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی، وہ پورے دس برس کے بعد اس سے مل رہا تھا اس لیے کیفیت تو عجیب ہونا ہی تھی۔ اسے سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ وہ سرمد کو کیسے اس کام کے لیے قائل کرے گا جو رانا اس سے کرانا چاہتا ہے۔ سرمد کو اپنے گینگ میں شامل کرنا بہت ہی مشکل کام تھا۔ مگر راجا کو ہر صورت یہ کام سرانجام دینا تھا کہ اسی میں اس کی اور سرمد کی بھلائی تھی۔

کوریڈور سے گزرتا ہوا وہ اس کمرے کے سامنے پہنچ گیا جس میں سرمد موجود تھا۔ دروازہ نیم وا تھا اور کمرے سے کوئی آواز باہر نہیں آرہی تھی۔ اس نے اندر جھانکا تو سرمد اسے بستر پر سیدھا لیٹا ہوا نظر آیا۔ وہ بغیر کوئی آہٹ پیدا کیے کمرے میں داخل ہو گیا۔ بیڈ کے نزدیک پہنچا تو اس نے سرمد کو نیند کے عالم میں پایا۔ وہ چند لمحے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا پھر یوں اس کی پیشانی کو چھوا جیسے ٹمپریچر چیک کر رہا ہو۔

سرمد نے اچانک آنکھیں کھول دیں۔ ایک اجنبی کو اپنے نزدیک پا کر اسے قدرے حیرت ہوئی۔ اُس نے اجنبی کو غور سے دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک لہرائی مگر ذہن پر زور دینے کے باوجود اسے کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔

''کیسے ہو دوست؟'' راجا نے اپنایت سے سوال کیا۔

اس کی آواز سن کر سرمد کو حیرت کا ایک جھٹکا سا لگا اور پھر ایک دم اس کا ذہن دس بارہ برس پیچھے چلا گیا۔ اسے یاد آیا کہ ایسی آواز تو مٹھو کی تھی، وہ مٹھو جو اُس کے اسکول کے زمانے کا دوست تھا اور اسکول میں مٹھو رام پوری کے نام سے مشہور تھا۔ وہ ایک بار پھر غور سے راجا کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس وقت جو شخص اُس کے سامنے کھڑا ہوا تھا، وہ اس مٹھو سے بہت مختلف تھا جو اس کا دوست تھا۔ البتہ اُس کے چہرے کے نقوش کسی حد تک مٹھو سے ملتے جلتے تھے۔

''آپ... آپ مٹھو... ہیں نا؟'' اُس نے قدرے توقف سے سوال کیا۔

راجا مسکرایا۔ ''ہاں... میں کبھی مٹھو ہوا کرتا تھا... مگر اب راجا ہوں... اور یہ تم مجھے اس قدر عزت سے کس لیے مخاطب کر رہے ہو؟ میں تمہارا دوست ہوں یار۔ مجھے آپ، جناب جیسے القاب ہضم نہیں ہوتے۔''

''سچ کہہ رہے ہو؟'' اُس کا انداز مشکوک تھا۔

''سو فی صد سچ... کیا تمہیں یقین نہیں آرہا؟''

''مجھے اپنا پورا نام بتاؤ؟''

وہ بولا۔ ''اوکے... تمہارا شک دور کر دیتا ہوں۔ میرا نام منتظار حسین ہے، اسکول کے ساتھی مجھے مٹھو رام پوری کہتے تھے اور تم سرمد رحمان ہو، ماسٹر عبدالرحمان کے اکلوتے بیٹے... کچھ اور پوچھنا ہے کیا؟''

سرمد کے لیے اب شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ سب کچھ واضح ہو چکا تھا۔ وہ واقعی اس کے اسکول کے زمانے کا دوست مٹھو تھا۔

''مٹھو! میرے دوست، تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟'' اُس نے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا مگر پھر کراہ کر رہ گیا۔

''پلیز... لیٹے رہو، ابھی تم اُٹھنے کے قابل نہیں ہو۔'' راجا پُرخلوص انداز میں بولا۔ ''جب تم ٹھیک ہو جاؤ گے تو میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔''

"میں بالکل ٹھیک ہوں مٹھو... تم میری فکر نہ کرو۔ میں بس تمہاری داستان سننے کے لیے بے چین ہوں۔"

وہ بیڈ کے نزدیک رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "دوست! برا مت منانا، تمہارے لیے میرے احساسات وجذبات ہمیشہ دوستوں والے ہی رہیں گے۔ بس اتنی درخواست کروں گا کہ اب مجھے مٹھو کہلانا بالکل اچھا نہیں لگتا۔ مجھے اس نام سے نفرت ہوگئی ہے۔ وعدہ کرو کہ آئندہ تم مجھے راجا کہا کرو گے۔ ویسے بھی یہاں کوئی مجھے میرے اصل نام سے نہیں جانتا، سوائے تمہارے۔ میں ہمیشہ کے لیے اپنے ماضی کو دفن کر چکا ہوں اور بہتر ہوگا کہ اب تم بھی اپنے ماضی کو ہمیشہ کے لیے بھول جاؤ۔"

"ماضی کو بھول جاؤں... میں کچھ سمجھا نہیں؟"

راجا نے کہا۔ "ہاں، بھول جاؤ... ماضی میں کیا رکھا ہے... سوائے رسوائیوں اور بدنامی کے۔ میرے ساتھ مل کر کام کرو، تمہاری تقدیر سنور جائے گی۔ دولت تمہارے در پر ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوگی۔"

"تم کیا کرتے ہو؟" اس نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

"وہی جو آج کل اِس ملک میں ہو رہا ہے۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھا۔" اس نے الجھ کر سوال کیا۔

"پہلے تم میرے ساتھ مل کر کام کرنے کی ہامی تو بھرو، اس کے بعد تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔"

وہ بولا۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم کسی مجرمانہ دھندے میں ملوث ہو؟"

"ہاں۔" راجا نے صاف گوئی سے کہا۔ "حق جب مانگنے سے نہ ملے تو پھر چھیننا پڑتا ہے۔ یہی اس دنیا کا دستور ہے۔"

"سوری میرے دوست! میں اس دستور کو نہیں مانتا۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔

"اس نام نہاد شرافت نے تمہیں کیا دیا ہے؟" راجا کے لہجے میں طنز تھا۔ "ماسٹر جی تمہاری بے روزگاری کا دُکھ لیے دنیا سے گزر گئے، تمہاری دونوں بہنیں آج بھی کسمپرسی کے عالم میں زندگی بسر کر رہی ہیں اور تمہاری ماں سرکاری اسپتال کی بینچ پر پڑے پڑے لاوارثوں کی طرح مر گئی مگر تم آج بھی اپنے اُن اصولوں سے چمٹے ہوئے ہو جنھوں نے تمہیں گلی کا کتا بنا کر رکھ دیا ہے۔ خود کو بدلو میرے دوست! میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔"

ماں کے مرنے کی خبر سن کر دُکھ کی ایک لہر اس کے پورے بدن میں سرایت کر گئی اور پھر اس کی آنکھیں بھیگتی چلی گئیں۔ وہ کتنا بدقسمت تھا کہ جنم دینے والی ماں کا آخری دیدار بھی نہ کر سکا نہ اُس کے جنازے کو کندھا دے سکا۔ ایک بیٹے کی اس سے بڑی بدبختی اور کیا ہو سکتی تھی؟ راجا بدستور جواب طلب نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن وہ تو اُس وقت کسی اور ہی دنیا میں پہنچا ہوا تھا۔ اس وقت اس کے دماغ میں یادوں کی ایک فلم سی چل رہی تھی۔ بچپن سے لے کر جوانی تک اسے اپنی ماں کے ساتھ گزارا ہوا پل پل یاد آ رہا تھا۔ وہ اُس سے کتنا پیار کرتی تھی... اُس کے لیے ماسٹر صاحب سے کتنا لڑا کرتی تھی... وہ ماں کے ساتھ گزارا ہوا ایک ایک لمحہ یاد کر رہا تھا اور اُس بچے کی طرح روئے جا رہا تھا جو میلے میں ماں سے اچانک ہی بچھڑ جاتا ہے۔ راجا نے بھی اُسے رونے دیا تاکہ اُس کے دل کا بوجھ کم ہو جائے اور وہ بہتر طور پر سوچنے کے قابل ہو سکے۔

قدرے توقف کے بعد وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔ "میری ماں مر گئی اور مجھے خبر تک نہ کی گئی... کیوں... کس لیے مجھے بے خبر رکھا گیا؟"

راجا نے کہا۔ "یہ سب تمہاری بہتری کے لیے کیا گیا ہے۔ اُس وقت تمہاری حالت ایسی تھی کہ تم یہ صدمہ شاید برداشت نہ کر سکتے۔"

"مگر مجھے تو بتایا گیا تھا کہ تم نے میری ماں کو اسپتال میں ایڈمٹ کرا دیا ہے؟"

"وہ جھوٹ تھا۔" راجا کے انداز میں ندامت تھی۔ "تمہاری ماں اُسی روز مر گئی تھی جس روز تمہیں گرفتار کیا گیا تھا۔ میں اس جھوٹ پر تم سے شرمندہ ہوں مگر خدا جانتا ہے کہ میں نے یہ جھوٹ صرف اور صرف تمہاری بھلائی کی خاطر بولا تھا۔ تم کل کی طرح آج بھی میرے دوست ہو، چاہو تو مجھے بُرا بھلا کہہ سکتے ہو۔ میں اس کا قطعی بُرا نہیں مناؤں گا۔"

"تمہیں کوسنے سے میری ماں مجھے واپس مل سکتی تو میں ایسا ضرور کرتا۔" اُس نے رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"وہ میری بھی ماں تھی دوست اور میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں... کاش تم مجھے پہلے ملے ہوتے تو میں اپنی ماں کا بہترین علاج کراتا۔"

"قسمت کے لکھے کو کوئی بھی نہیں ٹال سکتا۔ نہ میں اور نہ تم، ماں کی تقدیر میں شاید ایسی ہی موت لکھی گئی تھی۔"

راجا بولا۔ "نہیں سرمد! میں نہیں مانتا اس بات کو۔ میری بات یقیناً تمہیں بری لگے گی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اپنی ماں کی جان تم نے خود لی ہے۔ اُس کا خون تمہاری...... بے روزگاری اور ہٹ دھرمی نے کیا ہے۔ میں بدرُوسے تمہاری کہانی سن چکا ہوں۔ کاش تم نے ماسٹر جی کی بات مان لی ہوتی۔"

اُس نے راجا کی بات کا کوئی جواب نہ دیا، بس چپ چاپ پڑا رہا۔

راجا نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تمہیں میری ان باتوں سے دُکھ پہنچا ہے لیکن جو سچ تھا میں نے کہہ دیا۔ بُرا لگا ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔"

"مجھے اپنی غلطیوں کا احساس ہے۔" وہ شکست خوردہ انداز میں بولا۔ "کاش میں نے ابو کی بات مان لی ہوتی تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتے۔ میری ماں یوں لاوارثوں کی طرح اسپتال کی بینچ پر ایڑیاں رگڑتے ہوئے نہ مرتی۔"

"تم چاہو تو اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا کر سکتے ہو۔" راجا نے اُسے لائن پر آتے دیکھ کر لقمہ دیا۔

"کیسے کفارہ ادا کر سکتا ہوں؟" اُس نے سوال کیا۔

"میری آفر قبول کر لو... یہی تمہاری غلطیوں کا کفارہ ہوگا۔"

"نہیں۔" اُس نے انکار میں سر ہلایا۔ "میں کسی مجرم کا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

"یہاں سبھی مجرم ہیں میرے دوست! یہ الگ بات ہے کہ اُنھوں نے اپنے چہروں پر نقاب لگا رکھے ہیں۔ کوئی سیاست داں کہلاتا ہے تو کوئی سرمایہ دار... کوئی مذہب کا ٹھیکے دار بنا ہوا ہے تو کسی کے چہرے پر مسیحائی کا نقاب ہے۔ یہاں صرف لٹیرے اور مجرم بستے ہیں۔ تمہاری شرافت کو یہاں کسی نے نہیں پوچھنا۔"

"پلیز... مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔" سرمد نے زچ ہو کر کہا۔ "اس وقت میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا۔"

"ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی۔ میں تمہیں مجبور تو نہیں کر سکتا۔ خیر اب تم آرام کرو، میں پھر کسی وقت آ جاؤں گا۔" اتنا کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا مگر پھر پلٹ کر بولا۔ "تنہائی میں میری باتوں پر غور ضرور کرنا۔"

لیکن جب سرمد نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

وہ ایک پُرآسائش کمرا تھا اور اُس وقت وہاں چار نوجوان موجود تھے۔ شکل وصورت سے چاروں تعلیم یافتہ اور بڑی حد تک سلجھے ہوئے لگتے تھے۔ اُس وقت وہ چاروں کسی مسئلے میں الجھے ہوئے تھے اور آپس میں بحث کر رہے تھے۔ اُن میں سے ایک کا موقف الگ تھا جبکہ باقی تین کا موقف ایک ہی تھا اور وہ اُس پر ڈٹے ہوئے تھے۔

"دیکھو، تم تینوں اگر میری بات پر سنجیدگی سے غور کرو تو میں تمہیں حق بجانب نظر آؤں گا۔" الگ موقف رکھنے والے نے کہا۔ "میں مانتا ہوں کہ وہ محافظوں کے کڑے پہرے میں ہوتا ہے لیکن اُسے ٹارگٹ کرنا اس قدر مشکل نہیں ہے جتنا تم لوگ سمجھ رہے ہو۔"

ایک موقف رکھنے والوں میں بدرالدین بھی موجود تھا۔ اُس نے استہزائیہ انداز میں دوسرے نوجوان کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔ "میرا دل اُس شخص کو داد دینے کو چاہتا ہے جس نے تیرا نام "ماناڈوئی" رکھا ہے۔ ظالم بڑا مردم شناس تھا۔ اگر اِس وقت وہ میرے سامنے ہوتا تو قسم سے میں اُس کے وہ ہونٹ چوم لیتا، جن سے پہلی بار تیرے لیے عمران کے بجائے "ماناڈوئی" کا نام نکلا تھا۔"

"میں خود اُس کتے کے بچے کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔" عمران عرف ماناڈوئی نے کہا۔ "جس دن وہ مجھے مل گیا، اُسی دن اُس کا گلا کاٹ ڈالوں گا۔"

بدرالدین بولا۔ "اِس میں قصور اُس شخص کا نہیں ہے۔ تمہارا چہرہ ہی "ڈوئی" جیسا ہے۔"

اُس کی اس بات پر خاموش بیٹھے ہوئے اُن کے ساتھیوں نے قہقہہ لگایا اور عمران عرف ماناڈوئی جل کر رہ گیا۔ قہقہہ لگانے والوں میں سے ایک کا نام جمشید عرف جمی تھا جبکہ دوسرے کو اس کے ساتھی بالا کہہ کر پکارتے تھے مگر اُس کا اصل نام اقبال تھا۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ تم لوگوں کو میرا پلان پسند نہیں ہے؟" عمران نے ناراض انداز میں پوچھا۔

بدرالدین نے جواب دیا۔ "اِس کا فیصلہ ہم راجا پر چھوڑ دیتے ہیں۔ جو اُس کی رائے ہوگی وہی ہمیں منظور ہوگا۔ کیا پتا اُسے تمہارا پلان پسند آ جائے۔"

پھر اِس سے قبل کہ عمران کچھ کہتا، راجا اندر داخل ہوا اور وہ سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"کس موضوع پر بات ہو رہی ہے دوستو؟" راجا نے سوال کیا۔

بدرالدین نے کہا۔ "باس نے ایک اور ٹاسک دیا ہے۔"

"کیسا ٹاسک؟"

"ایک اسکالر کی بولتی بند کرنے کا ٹاسک۔ وہ باس کے راستے میں روڑے اٹکا رہا ہے بلکہ مستقل سردرد بن چکا ہے۔"

راجا نے کہا۔ "اوہ... تو تم لوگ تیمور فریدی کی بات کر رہے ہو؟"

"ہاں اسی کم بخت کی بات کر رہے ہیں۔" بدرالدین

نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”باس کی طرف سے ہمیں حتمی آرڈر مل چکا ہے۔ انہوں نے ہمیں تین دن کا وقت دیا ہے۔“

”اچھا... تم نے جو منصوبہ تیار کیا ہے بتاؤ مجھے۔“

”تیمور فریدی مغرب کے بعد روزانہ ایک اسکول میں جاتے ہیں اور عشا کے بعد گھر کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ صرف دو مسلح گارڈز ہوتے ہیں۔ ہم راستے میں گھات لگا کر بیٹھے ہوں گے۔ موقع دیکھتے ہی ان پر فائر کھول دیں گے۔“ عمران نے منصوبہ بتایا اور پھر داد طلب نظروں سے راجا کی طرف دیکھنے لگا۔

”تم بالکل گدھے ہو۔“ منصوبہ سن کر راجا نے ریمارکس دیے۔ ”یہ ایک دم فرسودہ ہے۔ اس طرح ہم سیکیورٹی والوں کی نظر میں آجائیں گے۔“

راجا کے ریمارکس سن کر عمران کا چہرہ لٹک گیا جبکہ باقی ساتھیوں کے چہروں پر استہزائیہ مسکراہٹ نظر آنے لگی۔ خاص کر جمی تو بہت ہی خوش نظر آرہا تھا۔ اُس کی عمران کے ساتھ کبھی بنی ہی نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ عمران کی بے عزتی پر بغلیں بجایا کرتا تھا۔

”تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“ عمران نے کھسیائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”تیرے بے ہودہ منصوبوں سے اجتناب کرنا چاہیے، کیونکہ یہ خودکشی کرنے کے مترادف ہوتے ہیں۔“ راجا نے طنزیہ انداز میں جواب دیا تو جمی قہقہہ لگانے پر مجبور ہو گیا۔

”باس! اسے منع کرو ورنہ میں اِس کے دانت توڑ دوں گا۔“ عمران نے بگڑ کر راجا سے درخواست کی۔ ”یہ ہمیشہ میرا مذاق اُڑاتا رہتا ہے۔“

وہ سب راجا کو باس کہا کرتے تھے۔ اُن میں سے کبھی کسی نے حمید رانا کو نہیں دیکھا تھا۔ البتہ کبھی کبھار حمید رانا انہیں فون پر احکامات دے دیا کرتا تھا مگر یہ سب اُس وقت وقوع پذیر ہوتا تھا جب راجا شہر سے باہر ہوتا۔ ورنہ انہیں تمام احکامات راجا کے ذریعے ملا کرتے تھے۔ راجا ایک طرح سے حمید رانا کا نائب تھا۔

راجا نے گھور کر جمی کی طرف دیکھا تو وہ ایک دم خاموش ہو گیا اور پھر نادم انداز میں بولا۔ ”سوری باس! آئندہ احتیاط سے کام لوں گا۔“

”یہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔“ راجا نے اُسے وارننگ دی۔ ”آئندہ مجھے تمہاری شکایت نہیں ملنی چاہیے ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“

جمی کو ڈانٹنے کے بعد راجا نے بدرالدین سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“

دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ ذرا دیر کے بعد وہ دونوں راجا کے کمرے میں موجود تھے۔ یہ کمرا بھی اُسی مکان میں واقع تھا مگر اُس کمرے سے قدرے فاصلے پر تھا جہاں اُن کے ساتھی موجود تھے۔ یہاں وہ بے دھڑک بات کر سکتے تھے۔

”بیٹھو۔“ کمرے میں پہنچتے ہی راجا نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا تو بدرالدین فوراً کرسی پر بیٹھ گیا۔

”اب بتاؤ تم نے شکار کو ٹھکانے لگانے کے لیے کیا پلان بنایا ہے؟“

”ابھی تک تو کچھ بھی پلان نہیں کیا۔“ بدرالدین نے جواب دیا۔

راجا نے کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ باس نے ہمیں تین دن کا ٹائم دیا ہے۔ ایک دن گزر گیا ہے۔ اب ہمارے پاس صرف دو دن بچے ہیں اور ہم نے ان دو دنوں میں یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے۔“

بدرالدین راجا کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ قدرے توقف کے بعد بولا۔ ”ایک پلان ہے تو سہی میرے ذہن میں لیکن شاید وہ آپ کو پسند نہ آئے۔“

”بولو۔“ راجا نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”پلان سن کر ہی میں کوئی فیصلہ کروں گا۔“

بدرالدین بولا۔ ”وہ صبح کی نماز نزدیکی مسجد میں ادا کرتا ہے، میرے خیال میں اُسے ٹھکانے لگانے کے لیے صبح کا وقت مناسب رہے گا۔ اُس وقت پولیس کا تو ویسے بھی کہیں نام و نشان نہیں ہوتا اور رہ گئیں...... پٹرولنگ پارٹیاں تو وہ بھی اُس وقت سست پڑ جاتی ہیں۔ ہم بہ آسانی اُسے شکار کرلیں گے۔“

منصوبہ کسی حد تک قابلِ عمل تھا چنانچہ راجا سوچ میں پڑ گیا۔ بدرالدین اُس کی طرف پُرامید نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ راجا منصوبے کے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد ہی اپنی رائے کا اظہار کرے گا۔ اُسے اگر پلان میں ذرا سی خامی بھی مل گئی تو وہ بلا جھجک انکار کر دے گا۔

”منصوبہ بظاہر تو قابلِ عمل لگتا ہے۔“ قدرے توقف کے بعد راجا نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن پولیس سے ٹکراؤ کا خطرہ بہرحال موجود ہے۔“

”ہاں خطرہ تو ہے۔“ اُس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ”مگر بہت کم۔“

محبت

ڈینٹسٹ کی بیٹی نے اپنے محبوب سے پوچھا۔ ”تم آج بھی ڈیڈی کے کلینک گئے تھے، تم نے آج بھی میری اور اپنی شادی کی بات ان سے نہیں کی؟“ محبوب نے جواب دیا۔

”نہیں... میری آج بھی ہمت نہیں پڑی اور آج میں اپنا چوتھا صحت مند دانت نکلوا کر آگیا ہوں۔“

تنویر احمد بالو، نوشہرہ

”اوکے... ہم صبح کی اذان سے آدھ گھنٹا پہلے نکل جائیں گے۔ سب کو تیار رہنے کا حکم دے دو۔“ راجا نے رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔

☆☆☆

تیمور فریدی نے ابھی کچھ عرصہ قبل ہی سیاست کی دنیا میں قدم رکھا تھا اور وہ روایتی سیاست دانوں سے بالکل مختلف تھے۔ بہت پرہیزگار اور نیک انسان تھے۔ سیاست سے ہٹ کر دیگر معاملات میں بھی وہ قابلِ قدر اخلاق کے مالک تھے۔ نہایت ملنسار اور دوسروں کے دکھ درد بانٹ کر خوشی محسوس کرنے والے انسان تھے۔ بے حد رحم دل تھے، کبھی کسی سائل کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے تھے۔ ہر طرح سے اُن کی زندگی مثالی تھی مگر ایک غم انہیں شب و روز لگا رہتا تھا اور شاید یہی غم انہیں سیاست میں لانے کا محرک بنا تھا۔ وہ ملکی حالات اور اُمتِ مسلمہ کی زبوں حالی پر کُڑھتے رہتے تھے۔ اُن کے اخباری بیانات اور تقریریں اکثر یہود و ہنود کے خلاف ہوا کرتی تھیں۔ وہ مسلمانوں کی موجودہ پستی و ذلت کا ذمے دار یہود و ہنود اور اُن کی مسلمانوں کے خلاف سازشوں کو ٹھہراتے تھے۔ یہ اُن کا پسندیدہ موضوع تھا مگر ملک دشمن طاقتوں کو سخت ناگوار گزرتا تھا۔ چنانچہ تیمور فریدی کو باز رکھنے کے لیے پہلے تو انہوں نے نوٹوں کے بنڈل پیش کیے لیکن جب انہوں نے سکہ رائج الوقت کو ٹھکرا دیا تو اُن کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔

تیمور فریدی صبح کی نماز محلے کی مسجد میں ادا کیا کرتے تھے۔ یہ مسجد اُن کے گھر سے محض چند قدم کے فاصلے پر واقع تھی مگر وہ اذان سنتے ہی مسجد کی طرف روانہ ہو جایا کرتے تھے۔ اُس وقت قدرے تاریکی ہوا کرتی تھی لیکن وہ اپنا یہ معمول کبھی ترک نہیں کیا کرتے تھے۔ باجماعت نماز ادا کرنے سے قبل وہ ذکر وغیرہ کرنے کے عادی تھے۔ اُس روز بھی وہ حسبِ عادت اذان کی آواز سنتے ہی مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔ تین منٹ کے بعد وہ اُس چوراہے پر پہنچ گئے جس کی دائیں جانب مسجد واقع تھی۔ وہ اپنی دُھن میں آگے بڑھتے ہوئے روزانہ کی طرح ورد کرتے جا رہے تھے کہ معاً تین مختلف اطراف سے اُن پر اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ بیک وقت متعدد گولیاں اُن کے توانا وجود کے آر پار ہو گئیں۔ وہ اُچھلے، زمین پر گرے، چند لمحے تڑپے اور پھر ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گئے۔ یوں جیسے گھڑی کی سوئیاں منجمد ہو جاتی ہیں۔ بدن سے روح کا ناتا ٹوٹنے کے باوجود اُن کے چہرے پر اذیت کے بجائے ایک ایسی دل آویز اور پُرسکون مسکراہٹ طاری تھی جو مقدر والوں کے حصے میں آیا کرتی ہے۔

جب اہلِ محلہ اُن کے خون میں لت پت وجود تک پہنچے تب تک وہاں قاتلوں کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ لوگوں کو یہ تک معلوم نہ ہو سکا کہ قاتل پاپیادہ تھے یا کسی گاڑی میں سوار تھے۔ اِس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے شہر کے حالات ابتر ہو گئے۔ توڑ پھوڑ اور لوٹ مار کے واقعات شروع ہو گئے مگر قاتل اپنا کام سرانجام دینے کے بعد حسبِ معمول گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو چکے تھے۔ تاہم صاحبِ اقتدار طبقے کی وہی روایتی بیان بازی جاری تھی۔

☆☆☆

سرمد کو وہاں رہتے ہوئے سات دن گزر چکے تھے۔ اُس کے زخم تقریباً مندمل ہو چکے تھے، بس ہلکے سے نشانات رہ گئے تھے۔ اب وہ اس مکان میں آزادانہ گھوم پھر سکتا تھا مگر مکان سے باہر قدم رکھنے کی اسے اجازت نہیں تھی۔ اسے اچھی طرح یہ باور کرایا جا چکا تھا کہ باہر اس کی جان کو خطرہ ہے۔ پولیس اسے تلاش کرتی پھر رہی ہے، اگر اُس نے مکان سے باہر قدم رکھا تو فوراً دھر لیا جائے گا۔ سو وہ مجبوری کے عالم میں وہاں جیسے تیسے دن بسر کر رہا تھا۔ وہاں سے فرار ہونا اُس کے بس میں ہی نہیں تھا۔ اُس کی رگوں میں صالح خون دوڑ رہا تھا اور اس قسم کے حالات سے زندگی میں پہلی بار اُس کا واسطہ پڑا تھا۔ روز بروز اُس کی پریشانی بڑھتی گئی۔ پہلی ملاقات کے بعد راجا نے ابھی تک اُس کی خبر نہیں لی تھی، بس ایک بدرالدین تھا جو کبھی کبھار اُس کی دل جوئی کرتا رہتا تھا۔ وہ جب بھی بدرالدین سے راجا کے متعلق استفسار کرتا تو جواب ملتا۔ ”فکر مت کرو، راجا سے بہت جلد تمہاری ملاقات ہوگی۔ ابھی وہ کچھ اہم کاموں میں مصروف ہے۔“

ٹھیک پندرہ دنوں کے بعد راجا ایک بار پھر اُس کے سامنے تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد راجا فوراً مطلب کی بات

پڑ آ گیا۔

''ہاں تو دوست! پھر تم نے کیا سوچا؟'' راجا نے اُس کے چہرے پر نگاہیں گاڑتے ہوئے سوال کیا۔

''کس چیز کے بارے میں؟'' وہ جان بوجھ کر انجان بن گیا۔

راجا بولا۔ ''ہمارے ساتھ کام کرنا ہے کہ نہیں؟''

''یہ بات تو تم مجھ سے پہلے بھی پوچھ چکے ہو۔''

''بالکل پوچھ چکا ہوں۔'' وہ بُرا مانے بغیر بولا۔ ''لیکن اُس وقت تم زخمی تھے، پریشان تھے اس لیے میں نے اصرار نہیں کیا مگر اب تم خدا کے فضل و کرم سے بالکل تندرست اور ٹھیک ٹھاک ہو، فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں ہو۔''

''میں نے اُس وقت بھی انکار کیا تھا اور اب بھی انکار کرتا ہوں۔ میں جُرم کے راستے پر نہیں چل سکتا۔ تم میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''میں تمہاری مجبوری کو سمجھتا ہوں مگر پھر بھی تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ تمہاری طرح میں بھی مجبور ہوں اس لیے چاہتا ہوں کہ تم میری بات مان لو، اسی میں تمہاری بہتری ہے۔'' آخری الفاظ راجا نے دھمکی کے انداز میں ادا کیے۔

''بہتری ہو یا بُرائی... میں نہیں مان سکتا۔'' اُس نے حتمی لہجے میں جواب دیا۔

''او کے۔'' راجا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''مت مانو، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تاہم تم بہت بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ تب میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔''

''میں ہر مصیبت کا سامنا کر لوں گا۔ تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''کہنا آسان ہے، کر کے دکھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ تم اکیلے کس کس کا مقابلہ کرو گے؟'' اُس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

وہ بپھر کر بولا۔ ''سب کا مقابلہ کروں گا... مر جاؤں گا یا مار ڈالوں گا۔''

''کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا۔'' راجا نے قہقہہ لگایا۔ ''تم اکیلے پولیس کے ساتھ ساتھ ہمارے باس کا بھی مقابلہ کرو گے... جیب میں ناخن تراش نہیں ہے اور چلے ہو پولیس کا مقابلہ کرنے؟... احمق انسان! یہاں سے باہر قدم رکھتے ہی پولیس والے تمہارا بینڈ بجا دیں گے۔''

''تم بس مجھے کسی طرح یہاں سے باہر نکال دو، آگے میں جانوں اور میرا کام۔''

''مجھے کتے کی موت مرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ میں نے اگر تمہیں یہاں سے نکال دیا تو باس مجھے بغیر کسی تفتیش کے گولی مار دے گا۔''

اُس نے زچ ہو کر کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم لوگ زبردستی مجھے اپنے گروہ میں شامل کرنا چاہتے ہو؟''

راجا بولا۔ ''ہم سب کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ ہم نے بھی اپنی مرضی سے اس راستے کا انتخاب نہیں کیا... بلکہ تمہاری طرح مجبوری کے عالم میں یہاں تک پہنچے ہیں۔''

''بکواس کرتے ہو تم۔'' وہ چلّایا۔ ''جھوٹ بولتے ہو۔ میں... میں سب سمجھتا ہوں... دراصل تم لوگوں کا دھندا یہی ہے۔ تم لوگوں نے اپنی مرضی اور خوشی سے اس راستے کا انتخاب کیا ہے۔ اگر تم لوگ مجبور ہوتے تو یوں ہنسی خوشی زندگی نہ گزار رہے ہوتے... تمہارے لیے یہاں سے نکلنا کون سا مشکل ہے؟''

''تم بلاشبہ احمق ہو انجینئر صاحب۔'' اُس نے قہقہہ لگایا۔ ''یہ بند گلی ہے بے وقوف انسان! یہاں جو ایک بار داخل ہو گیا وہ جیتے جی یہاں سے نہیں نکل سکتا اور تم اس گلی میں داخل ہو چکے ہو اس لیے اب واپسی کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔''

''تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟''

''نہیں۔'' راجا نے انکار میں سر ہلایا۔ ''میں تمہیں قبل از وقت اُن تلخ حقائق سے آگاہ کر رہا ہوں جو یہاں سے نکلنے کے بعد تمہیں پیش آئیں گے۔ یہاں سے نکلتے ہی قدم قدم پر تمہارا سابقہ موت سے پڑے گا۔ کوئی اندھی گولی آئے گی اور تمہاری زندگی کا چراغ ایک پل میں گل کر دے گی۔''

''راجا میرے دوست!'' وہ فریادی انداز میں بولا۔ ''پلیز مجھ پر رحم کرو، میں جرم کے راستے پر نہیں چل سکتا۔ یہ میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ میں کسی انسان پر گولی نہیں چلا سکتا۔ انسان تو کجا میں نے تو آج تک ایک مچھر بھی نہیں مارا۔''

''یہاں رہو گے تو سب کچھ سیکھ جاؤ گے۔ گولی تو کیا گرینیڈ پھینکنا بھی تمہیں مشکل نہیں لگے گا۔ چند دنوں کے اندر ہی انسان تمہیں کیڑے مکوڑوں کی طرح نظر آئیں گے۔ صرف پہلی بار کسی انسان کی جان لینا مشکل لگتا ہے، اس کے بعد کوئی پرابلم نہیں ہوتا، سب کچھ محض ایک کھیل لگتا ہے۔''

''یہ دیکھو۔'' اُس نے راجا کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''تمہیں خدا کا واسطہ، مجھے یہاں سے جانے دو۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ پلیز آج دوستی کا حق ادا کر دو پلیز...''

''ٹھیک ہے اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو میں تمہیں یہاں سے جانے دیتا ہوں... مگر اس سے پہلے تمہیں ایک کام کرنا پڑے گا۔''

''کیسا کام؟'' اُس نے متحیر انداز میں پوچھا۔

''مجھے گولی مار دو۔'' راجا نے پستول نکال کر اُس کی طرف بڑھایا۔ ''اس میں پوری دس گولیاں ہیں، سب کی سب میرے سینے میں اُتار دو۔''

''تت... تم... پاگل تو نہیں ہو؟'' اُس نے بدک کر کہا۔ ''میں بھلا تمہیں کیسے مار سکتا ہوں؟''

''کیوں... کس لیے نہیں مار سکتے؟''

''تت... تم... میرے دوست ہو اور پھر بغیر کسی جرم کے میں تم پر کیوں گولی چلاؤں... کس لیے یہ احمقانہ قدم اُٹھاؤں؟'' اُس نے بے ساختہ جواب دیا۔

''واہ انجینئر صاحب واہ۔'' راجا طنزیہ انداز میں ہنسا۔ ''تم یہ احمقانہ قدم نہیں اُٹھا سکتے مگر مجھے یہ احمقانہ قدم اُٹھانے پر مجبور کر رہے ہو... کیوں؟''

''میں سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' اُس نے اُلجھ کر پوچھا۔

''تم بچے نہیں ہو... میں جانتا ہوں کہ تم پر میرا مطلب واضح ہو چکا ہے اور تم جان بوجھ کر انجان بننے کی کوشش کر رہے ہو۔''

''میں اب بھی نہیں سمجھا۔''

راجا بولا۔ ''سیدھی سی بات ہے، میں نے اگر تمہیں یہاں سے فرار کرا دیا تو باس مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ سو میں نے سوچا کہ جب مرنا ہی ہے تو پھر تمہارے ہاتھ سے کیوں نہ مرا جائے۔''

راجا کے اس جواب نے قصہ ہی تمام کر دیا۔ اب سرمد کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ راجا نے اُسے اچھی طرح باور کرا دیا تھا کہ وہ وہاں سے فرار ہونے کا خیال دل سے نکال دے۔ چند لمحوں کے لیے وہاں خاموشی طاری ہو گئی اور وہ دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اُن دونوں کے پاس بولنے کے لیے کچھ بھی نہ رہا ہو۔ جب خاموشی کا یہ وقفہ طویل ہو گیا تو راجا بولا۔ ''سرمد! اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے، میں مجبوری کے عالم میں تمہیں یہاں لے کر آیا تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو آج زندہ نہ ہوتا۔ میں مکمل طور پر بے اختیار ہوں بلکہ میرے سبھی ساتھی اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ ہم وہی کرتے ہیں جس کا ہمیں اُوپر سے حکم ملتا ہے۔''

''تم لوگوں کا باس کون ہے؟'' سرمد نے بالکل ایک غیر متوقع سوال کر دیا۔

''یہ بھی میں تمہیں فی الحال نہیں بتا سکتا۔''

''کیوں...؟''

''اجازت نہیں ہے۔'' اُس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

''تم اُس سے کبھی ملے ہو؟'' سرمد نے پھر سوال کیا۔

''ہاں۔'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کئی بار مل چکا ہوں... مگر میرے ساتھیوں میں سے کوئی بھی اُسے

نہیں جانتا۔"

وہ بولا۔ "اگر میں اُس سے ملنا چاہوں تو کیا تم اِس کا بندوبست کرسکتے ہو؟"

"میں نے کہا ہے نا کہ فی الحال یہ ناممکن ہے... البتہ اگر تم باس کے لیے کام کرنا شروع کردو تو پھر میں تمہیں... بہ آسانی اُس سے ملاسکوں گا۔"

سرمد نے کہا۔ "مجھے سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔"

"کتنا؟" راجا نے بےتابی سے پوچھا۔

"کل صبح تک۔"

"ٹھیک ہے۔" راجا نے اثبات میں سر ہلایا۔ "مگر میری ایک بات پلّے سے باندھ لو، اگر تم نے یہاں سے فرار ہونے کی کوئی منصوبہ بندی کر رکھی ہے تو اُسے بھول جاؤ... ورنہ بےموت مارے جاؤ گے... یہاں سے فرار ہونا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔"

راجا کے لہجے میں واضح دھمکی تھی جسے اُس نے صاف طور پر محسوس کرلیا تھا۔ راجا اب اُس کے بچپن کا دوست نہیں رہا تھا بلکہ کسی کا دائمی غلام بن چکا تھا۔ اُس کے بچپن کا دوست تو مٹھو تھا جو وقت کی گرد میں کہیں کھو گیا تھا۔ یہ راجا تو اُس کا دشمن تھا اور دشمن سے دھمکی ہی کی توقع رکھی جاسکتی ہے، دلاسے کی نہیں۔

ساری رات وہ سوچتا رہا مگر جان بچانے کی کوئی ترکیب سجھائی نہ دی۔ بقول راجا کے وہ واقعی بند گلی میں کھڑا تھا۔ پیچھے موت تھی تو آگے راستہ مکمل بند تھا۔ اُس کے لیے کوئی جائے مفر نہیں تھی۔ وہ بُری طرح پھنس چکا تھا۔ محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً اُس کی جان پر بن چکی تھی۔ جرم کا راستہ وہ کسی صورت بھی اپنانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ لے دے کر اُس کے پاس ایک ہی راستہ بچا تھا اور وہ راستہ تھا اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لینے کا... گوکہ اُسے سکھایا گیا تھا کہ خودکشی حرام ہے مگر جب انسان کے لیے جینے کی راہیں مسدود ہوجاتی ہیں تو نہ چاہتے ہوئے بھی یہ بُزدلانہ قدم اُٹھانا پڑتا ہے۔ وہ بھی اُس وقت یہ قدم اُٹھانے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوچکا تھا۔ چنانچہ بستر چھوڑ کر وہ کمرے سے باہر نکلا اور دبے پاؤں چلتا ہوا کچن تک پہنچ گیا۔ حسبِ توقع کچن کو تالا نہیں لگایا گیا تھا۔ اُس نے بغیر کوئی آواز پیدا کیے کچن کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ کچن کی لائٹ بجھی ہوئی تھی۔ وہ چونکہ پہلی بار کچن میں داخل ہوا تھا اِس لیے اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ کچن کی لائٹ جلانے والا الیکٹرک بورڈ کس دیوار پر لگا ہوا ہے۔ وہ اندھوں کی طرح دیوار پر ہاتھ پھیرنے لگا... اور کچن میں رکھے ایک چوبی اسٹول سے ٹکرا گیا۔ وہ دھڑام سے نیچے گر گیا، خود کو ممکنہ چوٹ سے بچانے کے لیے اُس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیے مگر شومیٔ قسمت کہ اُس کے ہاتھ برتنوں والے فولادی اسٹینڈ سے جاٹکرائے۔ فولادی اسٹینڈ لہراتا ہوا پختہ فرش پر ایک دھماکے کے ساتھ گرا اور برتن کھنکھناتے ہوئے ایک دوسرے سے ٹکرا کر فرش پر بکھرتے چلے گئے۔

رات کے سنّاٹے میں برتنوں کی آواز دور دور تک گئی تھی اور وہاں تو ویسے بھی مجرموں کا بسیرا تھا جو عام آدمی کی نسبت کہیں زیادہ الرٹ ہوتے ہیں۔ چنانچہ چند لمحوں کے اندر ہی بدرالدین اور عمران عرف "ماناڈوئی" اُس کے سر پر پہنچ گئے۔ کچن میں داخل ہوتے ہی بدرالدین نے لائٹ جلائی تو اُن کے سامنے سرمد حواس باختہ کھڑا تھا۔

"رات کے دو بجے تم کچن میں کیا کر رہے ہو؟" بدرالدین نے مشکوک انداز میں سوال کیا۔

"مم... مجھے... بھوک لگ رہی تھی۔" اُس نے بوکھلا کر جواب دیا۔

"بکواس کررہے ہو تم۔" ماناڈوئی نے بپھر کر کہا۔ "سچ بتاؤ ورنہ بھیجے میں گولی اُتار دوں گا۔"

"خد... خد... خدا کی قسم... یہی سچ ہے۔" وہ جو چند لمحے قبل خود اپنی جان لینے کے بارے میں سنجیدہ تھا، اب موت کے خوف سے اُس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"تم ایسے نہیں بتاؤ گے۔" ماناڈوئی نے پستول نکال کر اُس پر تان لیا۔ "میں پانچ تک گنوں گا۔ اگر اس دوران تم نے سچ نہ بتایا تو میں تمہیں بلاجھجک گولی مار دوں گا... ایک... دو..." بات ختم کرتے ہی اُس نے گنتی شروع کردی۔

ابھی وہ تین تک ہی پہنچا تھا کہ سرمد چلّایا۔ "گو... گو... گولی... مت چلانا... مم... میں بتاتا ہوں۔"

"اوکے۔" ماناڈوئی نے پستول ہٹاتے ہوئے کہا۔ "اب بتاؤ یہاں کیا کررہے تھے؟"

"مم... میں چھری ڈھونڈ رہا تھا۔" اُس نے لرزتے ہوئے بتایا۔

"چھری... وہ کس لیے؟" اب کی بار بدرالدین نے حیرانی سے پوچھا۔

"اپنی جان لینے کے لیے۔" خوف کا اثر زائل کرنے کے لیے اُس نے قدرے جرأت کا مظاہرہ کیا۔

"تم خودکشی کرنا چاہتے ہو؟" ماناڈوئی نے تمسخرانہ انداز میں سوال کیا۔

"ہاں کرنا چاہتا ہوں، تمہیں کوئی اعتراض ہے؟" اپنی توہین پر وہ تلملا اُٹھا۔ "بےگناہوں کی جان لینے سے بہتر ہے کہ میں اپنی ہی جان لے لوں۔"

"واہ بھئی واہ۔" ماناڈوئی نے ایک بھونڈا سا قہقہہ لگایا۔ "جو بُزدل دوسروں کی جان نہیں لے سکتا، وہ بھلا اپنی جان کیسے لے سکتا ہے؟ وہ ایک سرائیکی کے گلوکار نے کیا خوب کہا ہے... کہ... کہ..." بات ادھوری چھوڑ کر وہ سر کھجانے لگا۔

"بھول گئے ناڈوئی۔" بدرالدین نے قہقہہ لگایا۔

"بھولا نہیں ہوں، یاد کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔"

"سر میں دماغ ہوگا تو یاد آئے گا نا۔" بدرالدین نے دوبارہ اُس پر چوٹ کی۔ "کھوپڑی میں گھاس پھوس بھرا ہو تو..."

"ہاں، یاد آگیا۔" اُس کی بات پوری ہونے سے قبل ہی ماناڈوئی چلّایا۔ "جرأت اے خودکشی وی، بھوں لوک کرنہیں سکدے۔"

"ہاں بھئی! تو تم خودکشی کرنا چاہتے ہو؟" وہ دوبارہ سرمد کی طرف متوجہ ہوا۔ "سچ مچ یا پھر مذاق مذاق میں؟"

وہ بولا۔ "میں یہاں کچن میں مذاق کرنے کے لیے تو نہیں آیا تھا۔"

"تو اور کیا کرنے آئے تھے؟"

"بتایا تو ہے کہ چھری ڈھونڈ رہا تھا۔" وہ چلّایا۔ "تم کیا بہرے ہو؟"

"چھری سے تمہیں بہت تکلیف ہوگی... کچن کی چھری تو ویسے بھی کُند ہوتی ہے۔ تم ایسا کرو یہ پستول لو، اپنی کنپٹی پر رکھو اور گھوڑا دبادو... گھوڑا سمجھتے ہو نا؟ ٹریگر کو بولتے ہیں۔ اِدھر تم گھوڑا دباؤ گے، اُدھر بھیجا کچن کی دیوار پر چپکا ہوگا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔" بات ختم کرتے ہی اُس نے آگے بڑھ کر پستول سرمد کو تھما دیا۔

پستول لے کر سرمد نے ایک نظر اُن دونوں کی طرف دیکھا اور پھر پستول اپنی کنپٹی پر رکھ لیا۔ صورتِ حال ایک دم سنسنی خیز ہوگئی تھی۔ سرمد کے ساتھ ساتھ اُن دونوں کے دل بھی بےتحاشا دھڑک رہے تھے۔ پستول پر سائلنسر فٹ تھا۔ اگر سرمد کی نیت بدل جاتی تو وہ بہ آسانی اُن دونوں کو ٹھکانے لگا سکتا تھا کیونکہ وہ دونوں خالی ہاتھ تھے۔ راجا اور اُن کے دوسرے دو ساتھی جمی اور بالا بھی اُس وقت وہاں موجود نہیں تھے۔ یہ ایک جوا تھا جو وہ بلاسوچے سمجھے کھیل رہے تھے مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ وہ سرمد سے پستول واپس مانگ کر اپنی سُبکی نہیں کرانا چاہتے تھے۔ تاہم اُن کے اندر خوف ضرور سرایت کرچکا تھا۔

سرمد نے پستول کنپٹی پر رکھتے ہی آنکھیں بند کرلیں۔ اُس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وقت جیسے تھم سا گیا تھا۔ اُس کا پستول والا ہاتھ آہستہ آہستہ لرز رہا تھا۔ ایک پل میں اُس نے ہمت مجتمع کی اور شہادت والی اُنگلی سرکتی ہوئی ٹریگر تک پہنچ گئی۔ وہ دونوں اب قدرے بےخوف انداز میں اُس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ انہیں اب اطمینان تھا کہ سرمد جیسا بزدل شخص گولی نہیں چلاسکتا۔ اُس کا لرزتا ہاتھ اور پسینے میں نہایا چہرہ اُس کی بُزدلی پر مہر ثبت کرنے کے لیے کافی تھا۔

"بکری کے بچے! اب گولی چلاؤ نا... ہاتھ کیوں کانپ رہا ہے۔" سرمد کی سماعتوں سے ماناڈوئی کی تمسخرانہ آواز ٹکرائی۔

"کیا پدّی اور کیا پدّی کا شوربا۔" بدرالدین نے قہقہہ لگایا۔ "گولی مرد چلاتے ہیں یہ مردوں کا کام ہے تو تو پستول پھینک اور تالی بجا۔"

"ہاں ہاں تالی بجا۔" ماناڈوئی نے قہقہہ لگایا۔

سرمد کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اُن کے قہقہے اُسے یوں محسوس ہونے لگے جیسے کسی نے اُس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا ہو۔ اُس کی شرافت اور بُزدلی ایک پل میں کافور بن کر اُڑ گئی۔ دوسرے ہی لمحے اُس نے آنکھیں کھول کر ایک جھٹکے سے پستول والا ہاتھ سیدھا کیا اور ایک سیکنڈ میں بدرالدین پر فائر جھونک دیا۔ گولی سیدھی بدرالدین کے سینے پر لگی۔ وہ اچھلا اور گر کر تڑپنے لگا۔ صورتِ حال کی سنگینی دیکھ کر ماناڈوئی پلٹ کر کچن کے دروازے کی طرف بھاگا مگر اُسے دروازے سے باہر قدم رکھنا نصیب نہ ہوا۔ یکے بعد دیگرے اُس کی پشت میں تین گولیاں پیوست ہوگئیں۔ وہ دروازے کے بیچ اِس طرح گرا کہ آدھا دھڑ کچن کے اندر اور آدھا باہر تھا۔ ذرا سی دیر میں وہ دونوں تڑپ کر ٹھنڈے ہوگئے۔

سرمد نے جس جذبے کے تحت یہ کارنامہ سرانجام دیا تھا، وہ آن کی آن میں ماند پڑ گیا اور وہ ایک بار پھر خوف زدہ ہوگیا تاہم پستول بدستور اُس کے ہاتھ میں موجود تھا۔ وہ دو قتل کرچکا تھا اور اب خود کو ذہنی طور پر مرنے کے لیے تیار کررہا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ ابھی ان دونوں کے ساتھی آئیں گے اور اُسے گولیوں سے بھون ڈالیں گے مگر جب کافی

دیر تک کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا تب اُسے یاد آیا کہ گولیاں چلنے کی تو آواز ہی نہیں آئی تھی۔ اُس نے پستول کو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اُس پر سائلنسر فٹ ہے۔ اب اُس نے ہمت باندھی اور اُٹھ کر بنگلے کا جائزہ لینے لگا۔ تمام کمرے خالی پڑے ہوئے تھے۔ وہاں اُس کے سوا کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔ یہ وہاں سے فرار ہونے کا سنہری موقع تھا مگر جب اُس نے صورتِ حال پر غور کیا تو اُسے فرار ہونے کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ فرار ہو کر وہ دُہرے قتل کے الزام میں پھنس سکتا تھا جبکہ وہاں رہ کر وہ اپنا دفاع کر سکتا تھا۔ راجا کسی طرح بھی اُس پر شک نہیں کر سکتا تھا۔ راجا کی نظروں میں وہ ایک بزدل اور شریف انسان تھا۔ چنانچہ اُس نے پستول پر سے اپنی اُنگلیوں کے نشانات صاف کیے اور پھر پستول مُردہ بدرالدین کے ہاتھ میں تھما دیا۔ سب کچھ تقدیر پر چھوڑ کر وہ اپنے کمرے میں پہنچا، اندر سے کمرے کو بند کیا اور بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆

دستک کی آواز اِس قدر زوردار تھی کہ مُردہ بھی اُٹھ کر بیٹھ جاتا جبکہ وہ تو پہلے ہی جاگ رہا تھا۔ دو قتل کرنے کے بعد نیند کا آنا ممکن نہیں تھا۔ تاہم جاگنے کا اُسے ایک فائدہ ضرور ہوا۔ وہ راجا اور اُس کے ساتھیوں کے ساتھ کام کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکا تھا۔ اُس کے پاس دوسرا کوئی آپشن ہی نہیں تھا۔ اُسے زندہ رہنے کے لیے اُن کا ساتھ دینا ہی تھا۔ وہ اگر ایسا نہ کرتا تو پھر راجا اور اُس کے نامعلوم باس سے کچھ بھی بعید نہ تھا، وہ اُسے گولی مار کر کسی چوراہے پر پھینک سکتے تھے۔ پولیس کے حوالے بھی کر سکتے تھے۔ انسپکٹر حشمت تو ویسے بھی اُس کے خون کا پیاسا تھا۔ وہ اُس کا اِن کاؤنٹر کر دیتا یا پھر اُسے عمر بھر کے لیے جیل میں سڑنا پڑتا۔

دستک کی آواز سن کر وہ بستر سے اُٹھا اور بناوٹی انداز میں آنکھیں ملتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ اِسی دوران میں دوسری دستک ہوئی اور اُس نے تیزی سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے راجا موجود تھا۔ اُس کے چہرے پر پریشانی اور وحشت کی ملی جلی کیفیت طاری تھی۔

"جلدی کرو، ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہے۔" اُسے دیکھتے ہی راجا نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔"

"کک... کیا... پولیس کا چھاپا پڑنے والا ہے؟" اُس نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

"نہیں۔" راجا بولا۔ "ہمارے مخالف گینگ نے ہمارے دو ساتھیوں کو قتل کر دیا ہے، شکر کرو کہ تمہاری جان بچ گئی۔"

"ق... ق... قتل... پر... کیسے؟" اُس نے خوف زدہ ہونے کی اِس قدر شان دار اداکاری کی کہ پل بھر کے لیے تو خود بھی حیران رہ گیا۔

"تفصیل بتانے کا وقت نہیں ہے میرے پاس۔ تم بس جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہمیں فوراً یہ ٹھکانا چھوڑنے کا حکم ملا ہے۔"

اُس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ راجا نے اُس پر کسی قسم کا شک... نہیں کیا تھا۔ تاہم راجا سے افسوس کا اظہار کرنا ضروری تھا، وہ افسردہ انداز میں بولا۔ "راجا! مجھے تمہارے ساتھیوں کے مرنے کا بہت افسوس ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر قاتل کا ایک روز یہی انجام ہوتا ہے جو تمہارے ساتھیوں کا ہوا ہے۔"

"یار افسوس کو گولی مارو اور فوراً نکلنے کی کرو۔" راجا جھنجلا کر بولا۔ "تمہارے افسوس کرنے سے وہ زندہ نہیں ہو جائیں گے۔"

"مجھے کون سی تیاری کرنی ہے۔ چند جوڑے کپڑوں کے ہیں اور کیا ہے میرے پاس؟"

"جو کچھ بھی ہے بس سمیٹو اور فوراً باہر آجاؤ۔"

وہ بغیر کچھ کہے پلٹا اور اپنا ضروری سامان سمیٹنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ راجا کے ساتھ ایک بلائنڈ شیشوں والی گاڑی میں بیٹھا کسی نامعلوم منزل کی طرف رواں تھا۔ راستے میں راجا نے اُسے بدرالدین اور عمران عرف مانا ڈوئی کے مارے جانے کے متعلق بتا دیا تھا۔ سرمد نے جان بوجھ کر کسی بھی سوال سے گریز کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ راجا اُس پر کسی قسم کا شک کرے۔ تاہم پورا واقعہ سنانے کے بعد راجا بولا۔ "سرمد! اب ہمارے گینگ میں دو بندے کم ہو گئے ہیں اِس لیے میں تمہارے فیصلے کا منتظر ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ ایسی صورتِ حال میں تم مجھے مایوس نہیں کرو گے۔ ویسے بھی تم نے سوچنے کے لیے آج صبح تک کا وقت مانگا تھا۔ اب بتاؤ تم نے کیا سوچا ہے؟"

سرمد ایک دم رضامندی کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا، سو مایوس انداز میں بولا۔ "میرے سوچنے یا نہ سوچنے سے کیا ہوگا؟ میں جانتا ہوں کہ اب اِس دلدل سے نکلنا ناممکن ہے۔"

"یہ دلدل نہیں ہے میرے دوست!" راجا نے پُرجوش انداز میں کہا۔ "بلکہ وہ جنت ہے جس میں قدم رکھتے ہی تمہارے سارے دُکھ درد ایک پل میں ختم ہو جائیں گے اور تم پر مسرتوں کے سب دروازے کھل جائیں گے۔ تم شہزادوں جیسی زندگی بسر کرو گے اور..."

"اور پھر ایک دن کتے کی موت مارا جاؤں گا۔" سرمد نے قطع کلامی کی۔

"موت اٹل ہے بے وقوف انسان۔" راجا نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ "اور ایک مقررہ وقت پر ہی آنی ہے۔ تم یہاں صرف کراچی ہی میں دیکھ لو، روزانہ کتنے لوگ گولیوں کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ کیا وہ سب گینگسٹر ہوتے ہیں؟"

"ٹھیک ہے۔" اُس نے مُردہ سی آواز میں رضامندی کا اظہار کیا۔ "مجھے منظور ہے لیکن ایک بات سن لو مجھے آتا واتا کچھ نہیں۔ گولی چلانا تو کجا میں نے تو آج تک کسی ہتھیار کو چھوا تک نہیں ہے۔"

"نو پرابلم۔" وہ خوش ہو کر بولا۔ "میں تمہیں ایک ماہ کے اندر سب کچھ سکھا دوں گا۔ ایسا شوٹر بنا دوں گا کہ اُڑتی ہوئی چڑیا بھی تمہاری گولی سے بچ نہیں پائے گی۔ لوگ تمہارا نام سن کر کانپیں گے۔ میں اگر راجا ہوں تو تم مہاراجا بنو گے۔"

راجا کی بات سن کر اُس نے محض سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔

مختلف شاہراہوں پر سے گزرتے ہوئے تقریباً ایک گھنٹے کے بعد اُن کی گاڑی ایک شان دار کوٹھی کے پورچ میں جا کر رُک گئی۔ وہ دونوں گاڑی سے اُترے اور ایک وسیع و عریض کوریڈور کی طرف بڑھ گئے۔ سرمد نے ہاتھ میں ایک درمیانے سائز کا لیدر سوٹ کیس اُٹھا رکھا تھا۔ مختلف کمروں کے سامنے سے گزرتے ہوئے آخر کار وہ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرا بہت شان دار اور خوب صورت انداز میں سجا ہوا تھا۔ وہاں ضروریاتِ زندگی کی تقریباً ہر چیز موجود تھی۔ سرمد حیرت سے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

راجا نے کہا۔ "کمرا کیسا ہے..... پسند آیا؟"

"ہاں، بہت خوب صورت ہے۔ کیا تمہارا ہے؟"

"نہیں۔" راجا نے انکار میں سر ہلایا۔

"تو کیا تمہارے باس کا ہے؟" اُس نے دوبارہ سوال کیا۔

"باس ہمارے ساتھ نہیں رہتے۔"

"تو پھر یقیناً تمہارے کسی ساتھی کا ہوگا؟"

"تمہارا ہے یار۔" راجا فراخ دلانہ انداز میں بولا۔ "یہاں رہو اور عیش کرو۔ فریج میں کھانے پینے کی بہت سی اشیا رکھی ہیں مگر پہلے میں تمہارے لیے ناشتے کا کہہ دوں پھر آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔" وہ سرمد کو متحیر چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

سرمد کو وہاں رہتے ہوئے چند ماہ گزر چکے تھے۔ اس عرصے کے دوران میں اُس نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا اور اب ہر واردات کے وقت اُن کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اب اُسے کسی پر بھی گولی چلاتے ہوئے جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اُنہی کی طرح وہ بھی درندہ بن چکا تھا۔ اب اُس کی سماعتوں کو رحم دلی، محبت اور شفقت جیسے لفظ اجنبی لگتے تھے۔ اُس نے پہلے ٹرائل ہی میں خود کو ایک قاتل اور دلیر گینگسٹر ثابت کر دیا تھا۔ حمید رانا کی نگاہوں میں وہ اب راجا سے بھی زیادہ اہمیت اختیار کر چکا تھا۔ راجا کو بھی اِس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ جلد یا بدیر سرمد اُس کی جگہ لینے والا ہے۔ حمید رانا بہادر لوگوں کا قدر دان تھا اور سرمد خود کو بہادر ثابت کر چکا تھا۔ کسی بھی وقت رانا اُسے گینگ کا لیڈر بنا سکتا تھا۔

غیر محسوس انداز میں راجا، سرمد سے حسد کرنے لگا مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ سرمد نے حمید رانا کو اِس قدر اپنا گرویدہ بنا لیا تھا کہ اب وہ راجا کے بجائے سرمد پر زیادہ بھروسا کرنے لگا تھا۔ سرمد بظاہر تو رانا صاحب کا بے حد وفادار بنا ہوا تھا لیکن درحقیقت اُس کے ارادے کچھ اور تھے۔ وہ رانا صاحب کی اصلیت معلوم کرنا چاہتا تھا۔ رانا بارہا اُس کے سامنے ملک دشمنی کی باتیں کر چکا تھا اور اُس کی اُنہی باتوں نے سرمد کو شک میں مبتلا کر دیا تھا۔ سرمد اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھا، سو اُس کا شک میں پڑنا ایک فطرتی بات تھی۔ رانا ہر محبِ وطن پاکستانی سیاست داں سے متنفر تھا۔ سرمد پر چونکہ اب کسی قسم کی پابندی نہیں تھی اِس لیے وہ خفیہ انداز میں رانا کی ٹوہ میں لگ گیا اور موقع ملنے پر رانا کا کبھی کبھار تعاقب بھی کرنے لگا۔

رانا صاحب کو کبھی سرمد کی ان خفیہ سرگرمیوں کی خبر نہیں ہو سکی تھی تاہم سرمد نے اُسے کئی بار مشکوک لوگوں سے ملتے ہوئے دیکھا تھا۔ رفتہ رفتہ سرمد کا یہ شک یقین میں بدل گیا کہ ہو نہ ہو رانا کا تعلق ضرور پڑوسی ملک کی خفیہ ایجنسی را سے ہے۔ اب سرمد کو کسی مناسب موقع کا انتظار تھا، جب وہ حمید رانا پر ہاتھ ڈالتا۔ اُن کے چار اہم آدمیوں کو وہ پہلے ہی ٹھکانے لگا چکا تھا۔ اقبال عرف بالا اور جمشید عرف جمی کو اُس نے ایک ماہ قبل ایک واردات کے دوران اُس وقت گولی ماری تھی جب اچانک ہی اُن پر قانون نافذ کرنے والے

اداروں کے اہل کاروں نے ایک ساتھ دھاوا بول دیا تھا۔ اُن دونوں کو گولی مارنے کے بعد سرمد اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوا تھا۔ جمی اور بالا کی موت کا ذمے دار پولیس کو ٹھہرایا گیا۔ سرمد پر کسی نے بھی شک کا اظہار نہیں کیا.... گینگ کی اہم شخصیات میں اب صرف راجا اور رانا صاحب ہی باقی بچے تھے مگر اُن دونوں کو ٹھکانے لگانا بہت مشکل بلکہ ایک طرح سے ناممکن تھا۔ تاہم وہ اپنی جان دے کر اُن کی جان لے سکتا تھا۔

دو دن بعد ہی یوم آزادی تھا۔ سرمد اُس وقت اپنے پُرآسائش کمرے میں اکیلا پڑا سوچوں میں مستغرق تھا۔ ایسے ہی وقت اُس کا دھیان اِس دن کی طرف گیا تو بچپن کی کئی یادیں اُس کے ذہن میں تازہ ہو گئیں۔ اُسے اپنے باپ ماسٹر عبدالرحمٰن کی یاد آئی، جو اسکول میں یوم آزادی کو بڑی دھوم دھام اور جوش و خروش کے ساتھ یومِ نجات کے نام سے منایا کرتے تھے۔ اُس دن ماسٹر صاحب تمام بچوں کو اپنی جیب سے مٹھائی کھلایا کرتے تھے۔ اسکول کے تمام بچے ملی گیت گاتے تھے۔ اِس کے بعد ماسٹر صاحب بچوں کو تقسیم کے وقت کے دل خراش واقعات سناتے، انہیں ہندوؤں اور سکھوں کے مظالم کے بارے میں بتاتے جو اُن دونوں قوموں نے مل کر مسلمانوں پر ڈھائے تھے۔ یہ واقعات سناتے ہوئے ہمیشہ ماسٹر صاحب کی آواز رندھ جاتی اور آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ باپ کو یوں آنسو بہاتے دیکھ کر سرمد اکثر جذباتی ہو جایا کرتا تھا۔ تب وہ دل ہی دل میں عہد کرتا کہ بڑا ہو کر ہندوؤں اور سکھوں سے اِن مظالم کا بدلہ لے گا۔

بچپن کی اِن یادوں نے پل بھر میں اُسے ایک ایسا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا جو شاید ایک عام آدمی بھول کر بھی نہ کرتا۔ اب اُسے انتظار تھا تو صرف یومِ نجات کا جس کے آنے میں صرف دو دن باقی تھے۔

☆☆☆

چودہ اگست کی صبح سورج طلوع ہونے سے ایک گھنٹا قبل ہی سرمد جاگ گیا۔ غسل کرنے کے بعد اُس نے نئے کپڑے زیب تن کیے اور پھر بڑے عرصے کے بعد بڑے ہی خشوع و خضوع کے ساتھ صبح کی نماز ادا کی۔ جب اُس نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے تو نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کی آنکھیں بھیگتی چلی گئیں۔ اُس نے رو رو کر اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی، اپنے اور والدین کے لیے مغفرت طلب کی۔ سورج طلوع ہوا تو باورچی حسبِ معمول اُس کے لیے ناشتا لے کر حاضر ہو گیا۔ اُس نے ڈٹ کر ناشتا کیا اور پھر اپنے بنائے گئے منصوبے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگا۔ وہ کوئی بھی کمزور پہلو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

مکمل تیاری کرنے کے بعد وہ کمرے سے نکلنے ہی والا تھا کہ اچانک بالکل غیر متوقع طور پر راجا آ دھمکا۔

"کہاں کی تیاری ہے بھئی؟" راجا نے اُس پر ایک ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

وہ بولا۔ "آج چودہ اگست ہے نا! بس یوں ہی ذرا سیر و تفریح کا موڈ بن گیا ہے۔ چلو گے کیا؟"

"بہت مشکل ہے۔" راجا نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم اِس وقت باہر نہیں جا سکتے۔"

"کیوں؟" اُس نے تحیر آمیز انداز میں پوچھا۔

"باس نے ہم دونوں کو طلب کیا ہے۔"

"کیا کوئی خاص کام ہے؟"

"خاص ہی ہوگا ورنہ باس کو ہماری شکلیں دیکھنے کا شوق تو نہیں ہے۔" راجا نے ذومعنی انداز میں جواب دیا۔

"تو چلو پہلے باس سے مل لیتے ہیں۔"

"آؤ۔" راجا گھوم کر دروازے کی طرف بڑھا مگر اُسے دروازے سے باہر قدم رکھنا نصیب نہ ہوا۔ سرمد نے سرعت کے ساتھ پستول نکالا اور پوری طاقت سے اُس کا دستہ راجا کے سر کے عقبی حصے پر رسید کر دیا۔

راجا تڑپ کر پلٹا مگر دوسری ضرب نے اُسے زمین بوس کر دیا۔ سرمد نے جھک کر اُس کی نبض چیک کی اور پھر مطمئن انداز میں کمرے سے باہر نکل کر دروازے کو لاک کر دیا۔ راجا کو اب کم سے کم ایک گھنٹے سے پہلے ہوش نہیں آ سکتا تھا۔

مختلف کوریڈورز اور کمروں کے سامنے سے گزرتا ہوا آخرکار وہ اُس خاص کمرے کے سامنے پہنچ گیا جو حمید رانا کے لیے مخصوص تھا۔ چند لمحوں کے لیے اُس نے کچھ سوچا اور پھر دروازے پر لگا ہوا ایک سُرخ بٹن پریس کر دیا۔ دوسرے ہی پل دروازہ میکانکی انداز میں کھلتا چلا گیا۔ یہ وہ ساؤنڈ پروف کمرا تھا جس میں کوئی بھی شخص مسلح ہو کر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہاں ایسے خودکار آلات نصب تھے جو ایک سیکنڈ میں ہتھیار کی نشان دہی کر دیتے تھے لیکن سرمد کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر وہاں تک پہنچا تھا سو انجام کی پروا کیے بغیر تیزی سے اندر گھس گیا۔ جونہی دروازہ میکانکی انداز میں بند ہوا، خطرے کا الارم بجنے لگا لیکن اِس دوران سرمد پستول نکال چکا تھا جس کی نال پر سائلنسر فٹ تھا۔

حمید رانا جو اُس وقت اپنے دو دوستوں کے ساتھ ایک صوفے پر براجمان تھا اور اُن کے سامنے بلوریں گلاسوں میں ولایتی شراب پڑی ہوئی تھی، سر پر موجود خطرے کو دیکھتے ہی اُس نے نہایت تیزی کے ساتھ اُٹھنے کی کوشش کی تو سرمد غرایا۔ "ہلنے کی کوشش مت کرنا حمید رانا عرف رویندرا کوشک... ورنہ بھیجا دیوار پر چپکا ہوگا۔ تیرا کھیل ختم ہو چکا ہے۔"

"تت... تت... تم... پاگل تو نہیں ہو گئے ہو۔" حمید رانا نے حواس باختہ ہو کر پوچھا۔

"میں پاگل تھا مگر اب نہیں ہوں۔" سرمد نے سرد لہجے میں جواب دیا اور پھر اُس کے ایک ساتھی کو چشمِ زدن میں گولی مار دی۔

گولی کھانے والا تڑپ کر صوفے سے نیچے جا گرا جبکہ رانا اور اُس کا دوسرا ساتھی چلاتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

"رویندرا! شاید تیری یادداشت کمزور ہے۔ میں نے کیا کہا تھا؟" سرمد نے غراتے ہوئے پوچھا اور ایک بار پھر ٹریگر دبا دیا۔ اب کی بار رانا کا دوسرا ساتھی پشت کے بل گرا اور دبیز کارپٹ پر چند سیکنڈ تڑپنے کے بعد ٹھنڈا ہو گیا۔

"بیٹھ جاؤ۔" سرمد دوبارہ غرایا۔ "ورنہ دنیا سے اُٹھ جاؤ گے۔ اپنے ساتھیوں کا انجام تم دیکھ چکے ہو۔"

رانا کانپتا ہوا دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا اور پھر لکنت آمیز انداز میں بولا۔ "خد... خدا... کے لیے... مم... مجھے... یہاں سے... جانے دو... مم... میں یہ سب... کک... کچھ... تمہارے حوالے... کر دوں گا۔"

سرمد چلّایا۔ "اپنی گندی زبان سے خدا کا نام مت لے... تیرا سارا بھارت مل کر بھی مجھے نہیں خرید سکتا۔"

"پھر... تمہیں کیا چاہیے؟" رانا نے بدستور لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

سرمد نے کہا۔ "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم رویندرا کوشک سے حمید رانا کیسے بنے؟"

چار و ناچار رانا کو اپنی سرگزشت بیان کرنا پڑی۔ "ہاں، میں رویندرا کوشک ہوں۔ را میں ایجنٹ بھرتی ہونے کے بعد میں نے ٹریننگ حاصل کی۔ اِس کے بعد مجھے دبئی بھیجا گیا، دبئی سے جعلی پاسپورٹ بنا کر میں کراچی آ گیا۔ یہاں کراچی میں مجھے بھارتی شہری سے ملنا تھا لیکن اُس کا ایڈریس مجھ سے کھو گیا۔ چند ماہ تو میں مارا مارا پھرتا رہا لیکن پھر ایک دن مجھے ایک ہمدرد مل گیا۔ اُس کا نام حمید رانا تھا۔ کچھ عرصہ اُس نے مجھے اپنے ساتھ رکھا مگر اِس کے بعد جب وہ دبئی کے لیے عازمِ سفر ہوا تو میں نے اُس کے سامنے اپنی مجبوری بیان کی۔ چنانچہ اُس نے اپنی تعلیمی اسناد میرے حوالے کر دیں اور خود دبئی چلا گیا۔ اُس زمانے میں چونکہ تعلیمی اسناد پر تصویر نہیں ہوا کرتی تھی، سو مجھے اِس سلسلے میں کوئی پریشانی نہ ہوئی اور یوں مجھے بہ آسانی پاکستانی شہریت مل گئی۔ اِس کے بعد را کے ایک ایجنٹ نے مجھے ڈھونڈ نکالا اور میں را کے مفادات کے لیے کام کرنے لگا۔ را نے مجھے پیسا فراہم کیا۔ میں نے پاکستانی سیاست میں حصہ لیا اور رفتہ رفتہ ایم پی اے کی سیٹ تک پہنچ گیا۔"

"بہت خوب رویندرا کوشک عرف حمید رانا!" سرمد نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "تم واقعی ایک ذہین انسان ہو مگر افسوس کہ تم ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص کو اپنے گینگ میں شامل کرنے کی غلطی کر بیٹھے۔ مجھے تمہارے انجام پر خوشی کے ساتھ ساتھ افسوس بھی ہوگا۔"

"مجھے... چھوڑ دو... مم... میں تمہیں ارب پتی... بنا دوں گا۔" رویندرا کوشک نے اُسے آفر کی۔

"سب لوگ بکاؤ نہیں ہوتے کتّے!" سرمد گرجا۔ "مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"پلیز... پلیز... پلیز..." رویندرا کوشک موت کے خوف سے چلّایا۔ "تمہیں تمہارے خدا کا واسطہ... مم... مجھے... مت مارو..."

"بھارت ماتا کی جے بول اور گولی کھا کر... وہ کیا بولتے ہیں... سورگ..." سرمد کی بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ ایسے ہی وقت ساؤنڈ پروف کمرے کا دروازہ ایک دھماکے کے ساتھ کھل گیا اور سیکیورٹی فورس کے افراد اندر داخل ہو گئے مگر سرمد اُن کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ وہ بدستور رویندرا کوشک کو نشانے پر رکھے ہوئے تھا۔

"ڈراپ دی گن ورنہ گولی مار دوں گا۔" سرمد کی سماعتوں سے ایک بارعب آواز ٹکرائی۔

"کبھی نہیں، سرایہ میرے وطن کا دشمن ہے۔" سرمد نے چلّا کر کہا اور پھر ٹریگر دباتا چلا گیا۔ ایسے ہی وقت کئی گولیاں سرمد کی پشت میں سے چھید بناتی ہوئی گزر گئیں۔ رویندرا کوشک پشت کے بل گرا تھا جبکہ سرمد منہ کے بل گر کر یوم آزادی منانے کے ساتھ ساتھ یومِ نجات بھی منا چکا تھا۔ اُس کی زندگی بے شک ناکامیوں میں بسر ہوئی تھی مگر موت نے اُسے سرخرو کر دیا تھا۔

☆

مقتول قاتل

غوثیہ شبیر

احساسات و جذبات کی شدت کو شکست دینا آسان نہیں ہوتا... وہ بھی جذبات کی شوریدہ سری کا شکار تھی... مگر وقت کے تقاضوں نے اسے بے طرح جکڑا ہوا تھا کہ وہ جو کرنا چاہتی تھی... اسے انجام دینے سے قاصر تھی... رشتوں کی ڈور سے بندھی ایسی ہی کہانی... جس کے نفوس جذباتی وابستگی کے باوجود ایک دوسرے سے سیکڑوں میل کی دوری پر کھڑے تھے... قربتوں کے باوجود نفرتوں کے الاؤ میں دہکنے کا انتخاب کرنے والوں کی دردناک کتھا...

محبت اور سچائی کی آڑ میں رسوائیوں کا سودا کرنے والے خریدار کا انجام

"یہ اچھا ہوا کہ اس گھر میں لوگ آگئے ورنہ رفعت کی فیملی کے جانے کے بعد تو میں بہت اداس ہوگئی تھی۔ اتنے اچھے لوگ تھے لیکن تھے تو کرائے دار ہی۔ کب تک ان کا ساتھ رہتا۔" محسن چند فائلیں سامنے میز پر رکھے ان کا مطالعہ کررہا تھا کہ اس کی والدہ ثروت بیگم چائے کی پیالیوں سمیت وہاں چلی آئیں اور دائیں طرف کے مکان کے سامنے سامان اترتے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا لیکن ساتھ ہی وہ پچھلے مکینوں کے جانے پر بھی اداس تھیں۔

"آپ جانتی ہیں کہ کرائے داروں کو ایک دن گھر چھوڑ کر چلے جانا ہوتا ہے تو پھر ان کے ساتھ دل لگاتی ہی کیوں ہیں؟" محسن نے ساتھ والے مکان میں منتقل ہوتے سامان کی طرف ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر کہا۔ اس وقت وہ لوگ اپنے مکان کے ٹیرس پر موجود تھے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ آج وہ اس وقت گھر میں موجود تھا ورنہ اس کی ملازمت کی نوعیت ایسی تھی کہ اسے رات سے پہلے گھر آنا نصیب نہیں ہوتا تھا۔ وہ محکمۂ پولیس میں ڈی ایس پی کے عہدے پر کام کررہا تھا۔ اس نے یہ ملازمت کمیشن کا امتحان پاس کر کے حاصل کی تھی اور ان خوش نصیبوں میں سے تھا جو نوجوانی میں ہی کامیابی کی سیڑھیوں پر تیزی سے سفر شروع کر دیتے ہیں۔

"ان سے دل نہ لگاؤں تو اور کس سے دل لگاؤں؟ میرے پاس دل لگانے کے لیے ہے ہی کیا؟ تم باپ بیٹے صبح سے نکلتے ہو تو اندھیرا ہونے سے پہلے شکل نہیں دکھاتے۔ تیسرا وہ حسن ہے تو اس کی اتنی زیادہ مصروفیات ہیں کہ ٹک کر دو گھڑی کے لیے گھر میں نہیں بیٹھتا۔ یونیورسٹی سے آنے کے بعد بھی جانے اسے کیا کیا کام ہوتے ہیں کہ ابھی آتا ہوں، بول کر جو گھر سے نکلتا ہے تو گھنٹوں واپس آنے کا نام نہیں لیتا۔ آجاتا ہے تو پھر کمپیوٹر کے سامنے جم کر بیٹھ جاتا ہے یا پھر دیکھو تو گدھے گھوڑے سب بیچ کر سو رہا ہوتا ہے۔ میں سارا سارا دن پاگلوں کی طرح دیواریں تکتے ہوئے گزار دیتی ہوں۔"

اس کی بات سن کر ثروت بیگم نے نہایت تپے ہوئے لہجے میں جواب دیا جس پر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اپنے شکوے میں غلط نہیں ہیں اور اپنے سوا کسی دوسرے نسوانی وجود سے محروم اس گھر میں واقعی تنہائی کا شکار ہیں لیکن فی الحال اس مسئلے کا کوئی حل بھی نہیں تھا۔ وہ تینوں باپ بیٹے بچ بچ اپنی اپنی جگہ بہت مصروف تھے۔ ان کے والد حیدر صاحب کا اسپورٹ گڈز کا چھوٹا سا کاروبار تھا جس کے ذریعے وہ اپنے بیوی بچوں کو حلال کمائی میں خوش حال زندگی مہیا کرنے کے لیے سخت محنت کرتے تھے۔

"ہنسو... ماں کی بے بسی پر ہنسنے کے سوا تو تم کچھ کر نہیں سکتے۔" انہوں نے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ محسن کی مسکراہٹ نے بے ساختہ قہقہے کا روپ دھار لیا۔ ثروت بیگم کو اس پل وہ اتنا پیارا لگا کہ بے ساختہ ہی دل میں اس کے نظر بد سے بچنے کی دعا مانگنے لگیں۔ وہ اس دعا کو مانگنے میں حق پر بھی تھیں۔ گندمی رنگت، چمک دار ذہین آنکھوں اور کھڑی مغرور سی ناک والا ان کا بیٹا تھا بھی اتنا خوب رو کہ لوگ ایک کے بعد دوسری نظر ضرور ڈالتے تھے۔

پولیس کی نوکری میں آنے کے بعد اس کی جسمانی خوب صورتی میں بھی اضافہ ہوگیا تھا اور باقاعدہ ورزش کی وجہ سے وہ بہت ہینڈسم لگنے لگا تھا۔ ہر ایک کی متفقہ رائے یہ تھی کہ اس پر پولیس کی یونیفارم بہت سجتی ہے اور وہ بالکل کسی فلمی ہیرو کی طرح لگتا ہے۔

"مجھے آپ کی تنہائی کا خیال ہے امی لیکن آپ ہماری مجبوریوں کو سمجھ سکتی ہیں۔ میں حسن سے کہوں گا کہ وہ آپ کو تھوڑا وقت دیا کرے لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ کوئی بیکار میں اِدھر اُدھر آوارہ گردی کرنے والا نکما لڑکا نہیں ہے۔ میں نے اس کی پروگریس پر پوری نظر رکھی ہوئی ہے اور اس کا تعلیمی ریکارڈ یہ بتاتا ہے کہ وہ بہت محنتی طالب علم ہے۔" ہونٹوں کے گوشے دبا کر اس نے پہلے اپنی ہنسی کو قابو میں کیا پھر سنجیدگی سے انہیں سمجھانے لگا۔

"تمہیں میری تنہائی کا خیال ہے تو ایسا کرو کہ شادی کرلو۔ بہو گھر میں آئے گی تو میں اس کے ساتھ مصروف ہو جاؤں گی اور پھر تم باپ بیٹوں سے کوئی شکوہ نہیں کروں گی۔" انہوں نے ایسی فرمائش کی کہ اس نے بے ساختہ ہی اپنے کان پکڑ لیے۔

"ابھی تو آپ مجھے معاف رکھیں والدہ محترمہ اور میری طرف سے ان نئے آنے والے کرائے داروں سمیت پورے محلے سے دوستی کرلیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" اپنی گردن پھنستی دیکھ کر اس نے نہایت فراخ دلی سے انہیں پیشکش کی۔

"ہونہہ... اس محلے میں دوستی کرنے کے لیے ہے ہی کون۔ بائیں طرف وہ قنوطی بڑھیا رہتی ہے جو کسی کو اپنے گھر میں گھسنے دیتی ہے نہ خود کسی کے گھر جاتی ہے۔ ایک مسز ملک ہیں جنہیں اپنی بہوؤں کی برائیاں کرنے سے ہی فرصت نہیں ملتی اور میں اتنی زیادہ غیبتیں سن کر ڈائریکٹ جہنم میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ وہ فاخرہ ہے تو اس کے اوپر تلے کے

چاروں بچے اتنے شرارتی ہیں کہ ماں کو دو گھڑی ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھنے دیتے۔ وہ بے چاری کسی سے کیا بات کرے گی۔ مشتاق خان صاحب کی بیوی کو اپنے گاؤں سے آئے پانچ سال ہو گئے لیکن اللہ کی بندی نے قسم کھا رکھی ہے کہ پشتو کے علاوہ کسی اور زبان کا ایک لفظ سیکھے گی نہ بولے گی۔ علی عباس تنہا آدمی ہے، اس کے گھر میں عورت کا کوئی گزر ہی نہیں۔ اب تم بتاؤ کہ میں اس گھر میں آنے والے کرائے داروں سے آس نہ لگاؤں تو کیا کروں؟ پتا نہیں یہاں بھی کوئی ڈھنگ کے لوگ آتے ہیں یا نہیں؟'' لمحوں میں پورے محلے کا پوسٹ مارٹم کرنے کے بعد انہوں نے اپنی فکرمندی کا اظہار کیا تو محسن سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

اس کی والدہ کا مسئلہ واقعی گمبھیر تھا۔ اسے ماننا پڑا کہ دائیں طرف کے مکان میں رہنے والے کرائے داروں سے دوستی کرنا ان کے لیے ناگزیر ہے۔ کیونکہ گنتی کے چند گھروں پر مشتمل اس محلے میں ان کے پاس واحد چوائس یہی تھی۔ وہ جس محلے میں رہتے تھے، وہاں آمنے سامنے مکان نہیں بنے ہوئے تھے بلکہ گنتی کے ان سات آٹھ مکانوں کے سامنے بچوں کے ایک پلے گراؤنڈ کی دیوار تھی۔ گھر کے سامنے پلے گراؤنڈ ہونے کا جہاں انہیں یہ فائدہ تھا کہ ہوا کی بلا رکاوٹ آمدورفت کی وجہ سے گرمی کا طویل موسم لوڈشیڈنگ کے باوجود اچھا گزر جاتا تھا، وہیں مختصر محلے داری کی وجہ سے ثروت بیگم جیسی تنہائی کا شکار گھریلو خاتون شکوے کرتی نظر آتی تھیں۔

''سامان دیکھ کر تو لگ رہا ہے کہ کوئی چھوٹی سی فیملی یہاں رہنے آرہی ہے اور اس فیملی میں کوئی بچہ نہیں ہے ورنہ کچھ کھلونے وغیرہ ضرور نظر آتے۔'' خوشبودار چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے اس نے پڑوس میں آنے والے سامان کا جائزہ لیا اور ساتھ ہی اپنا خیال بھی پیش کر دیا۔ ثروت بیگم جس موڈ میں یہاں بیٹھی تھیں، اس سے وہ یہ تو سمجھ گیا تھا کہ فی الحال وہ اپنے کام پر توجہ نہیں دے سکتا اس لیے ان سے ان کے من پسند موضوع پر گفتگو کرنا ہی مناسب سمجھا۔

''ہوسکتا ہے کوئی نیا شادی شدہ جوڑا رہنے کے لیے آرہا ہو۔ فرنیچر وغیرہ دیکھ کر تو لگ رہا ہے کہ سارا سامان بالکل نیا ہے۔'' وہ بھی آخر پولیس والے کی والدہ تھیں اس لیے فوراً اپنا اندازہ بھی پیش کر دیا۔

''لگتا تو یہی ہے۔'' اس نے ان سے اختلاف نہیں کیا۔ اسی وقت ایک ٹیکسی گھر کے سامنے آکر رکی جس میں سے پہلے تقریباً پینتالیس سال کا ایک مرد برآمد ہوا اور پینٹ کی جیب سے پرس برآمد کر کے اس میں سے نوٹ نکال کر گننے لگا۔ وہ یقیناً ٹیکسی والے کو کرایہ ادا کرنا چاہتا تھا لیکن محسن کی توجہ اس سے ہٹ کر پچھلے دروازے سے باہر نکلتی لڑکی کی طرف مبذول ہو گئی۔ دیکھنے میں وہ لڑکی اٹھارہ انیس سال سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ اس نے ہلکے گلابی رنگ کا کاٹن کا سوٹ پہن رکھا تھا جس کے ساتھ سیاہ اور گلابی امتزاج کا چادر نما دوپٹا اس کے سر اور گردن کے گرد مضبوطی سے لپٹا ہوا تھا۔ لڑکی کے نقوش بہت خوب صورت تھے اور ان نقوش میں سب سے نمایاں اس کی بڑی بڑی آنکھیں تھیں جن میں وہ فاصلے کے باوجود اداسی کی دھند دیکھ سکتا تھا۔ ٹیکسی سے اترنے کے بعد وہ نہایت لاتعلقی سے کھڑی ہو گئی تھی۔ مرد کرایہ ادا کرنے کے بعد اس کی طرف متوجہ ہوا اور کچھ کہتا ہوا اسے لے کر مکان کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ محسن کے گھر کی طرح پڑوس کے مکان میں کوئی ٹیرس نہیں تھا اور وہ وہاں سامنے کے کھلے حصے میں ہونے والی نقل و حرکت کو بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔ مرد آگے آگے چل رہا تھا جبکہ لڑکی سر جھکائے اس کے پیچھے تھی۔

''یہ تو باپ بیٹی لگتے ہیں۔'' ثروت بیگم نے کچھ مایوسی سے تبصرہ کیا تو وہ چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوا۔

''لڑکی ہے بھی بہت کم عمر۔ اتنی چھوٹی سی لڑکی سے بھلا میری کیا دوستی ہوگی۔'' وہ اپنی ہی فکر میں مبتلا تھیں۔

''دوستی کے لیے ہم عمری کی نہیں، ذہنی ہم آہنگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ اپنی سی کوشش کر کے دیکھ لیجیے گا۔ ویسے بھی ہوسکتا ہے کہ ابھی یہ دو افراد ہی آئے ہوں اور باقی فیملی بعد میں آئے۔'' محسن نے انہیں دلاسا دیا پھر مزید بولا۔ ''ایسا کریں آج رات کا کھانا آپ انہیں بھجوا دیں۔ گھر کی سیٹنگ میں انہیں کہاں فرصت ملے گی کہ کھانا وانا تیار کرسکیں۔''

''کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔ میں ابھی چائے پی کر کچن میں جاتی ہوں۔ تمہارے ابو نے آج پلاؤ کی فرمائش کی تھی۔ ساتھ میں ایک آدھ ڈش اور تیار کرلوں گی۔'' ثروت بیگم فوراً فارم میں آگئیں۔ اس سے قبل بھی وہ پڑوس میں آنے والے نت نئے کرائے داروں کی اس طرح مدارات کرتی رہی تھیں۔ خیرسگالی کے طور پر کی گئی یہ مدارات پڑوسیوں سے اچھے تعلقات قائم کرنے میں بڑی مدد دیتی تھی لیکن بعض اوقات لوگ صحیح نہ ہونے کی وجہ سے وہ بری طرح پھنس بھی جاتی تھیں۔ ایسے میں محسن اور حسن کو میدان میں اتر کر ''دیکھ

لم کے پڑوسیوں سے ان کی جان چھڑانی پڑتی تھی۔ اس وجہ سے وہ کبھی کبھار ماں کی اس روش پر تنقید بھی کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے لیکن اس وقت محسن کو اس لڑکی میں ایسی کشش محسوس ہوئی تھی کہ وہ خود اپنے منہ سے انہیں ایسا کرنے کا مشورہ دے بیٹھا۔ وہ بھی ایسی بھولی تھیں کہ بجائے چونکنے کے فوراً ہی اس سے اپنا پروگرام ڈسکس کرنے لگیں۔

''اگر بازار سے کچھ منگوانا ہے تو بتا دیں۔ میں باہر نکلنے والا ہوں، واپسی میں لیتا ہوا آجاؤں گا۔'' وہ چائے ختم کر چکا تھا چنانچہ ایک فائل اٹھا کر اس پر نظریں جمائے ہوئے بظاہر سرسری لہجے میں پوچھا۔

''بخشو میاں! مجھے کچھ منگوانا بھی ہوا تو کسی اور سے منگوالوں گی۔ تمہارا کیا ہے، گھنٹے بھر کا بول کر گھر سے نکلو گے اور آدھی رات کو آؤ گے۔۔۔ وہ بھی خالی ہاتھ یہ کہتے ہوئے کہ سوری امی! مصروفیت بہت تھی، مجھے آپ کا کام یاد ہی نہیں رہا۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی چائے کی پیالیاں سمیٹ کر وہاں سے چلی گئیں جس پر محسن کو زور سے ہنسی آگئی۔ واقعی ماضی میں کئی بار وہ ان کے ساتھ یہ حرکت کر چکا تھا۔

☆☆☆

''بڑے شریف لوگ ہیں۔ سکھر سے یہاں آئے ہیں۔ بس باپ بیٹی ہی ہیں۔ ماں پانچ سال پہلے گردے فیل ہونے کی وجہ سے فوت ہو گئی تھی۔ حاکم صاحب نے اس کے بعد دوسری شادی کرنا پسند نہیں کیا اور خود کو بیٹی کے لیے وقف کر دیا۔ وہ ایک سرکاری محکمے میں ملازمت کرتے ہیں۔ آمدنی معقول ہے لیکن بے چارے اکیلے ہونے کی وجہ سے بیٹی کے سلسلے میں صحیح فیصلہ نہیں کرسکے۔ انہوں نے سوچا کہ میں اکیلا کیسے جوان بیٹی کو سنبھالوں گا۔ دفتر میں رہتے تھے تو تب بھی یہ خیال رہتا تھا کہ نادیہ کالج سے آنے کے بعد گھر میں اکیلی ہوگی۔ دس بار گھر فون کر کے اس کی خیریت دریافت کرتے تھے پھر بھی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ ان کی یہ پریشانی دیکھ کر دفتر کے ہی ایک ساتھی نے مشورہ دیا کہ بیٹی کی شادی کر دو۔ اپنے حالات کے مطابق انہیں یہ مشورہ درست محسوس ہوا اور انہوں نے اپنے اسی ساتھی سے کسی اچھے رشتے کے لیے مدد کی درخواست کی۔ جلد ہی ان کی معرفت نادیہ کا رشتہ طے ہو گیا۔ لڑکا قبول صورت اور تعلیم یافتہ تھا۔ اس کا ذاتی چھوٹا سا کاروبار تھا۔ ماں باپ فوت ہو چکے تھے اور صرف ایک بہن تھی جس کی شادی ہونے والی تھی۔ حاکم صاحب کو رشتہ مناسب لگا۔ وہ خود بھی اپنی کم عمر اور نازوں پلی بٹیا کو بھرے پُرے سسرال کے جھنجٹ میں نہیں پھنسانا چاہتے تھے اس لیے فوراً ہاں کر دی اور یہیں سے بے چاری نادیہ کی بدنصیبی کا آغاز ہو گیا۔'' پڑوس میں نئے کرائے داروں کی آمد کے ٹھیک پانچویں دن ناشتے کے وقت ثروت بیگم اس کے سرسری سے لہجے میں پڑوسیوں کے متعلق کیے گئے سوال کے جواب میں پوری رام کہانی سنانے بیٹھ گئیں۔

اصل میں درمیان کے چار دن وہ بہت مصروف رہا تھا۔ ان دنوں میں وزیراعظم کا کراچی میں قیام رہا تھا چنانچہ پولیس کو سیکیورٹی اور دوسرے چکروں میں بہت بھاگ دوڑ کرنی پڑی تھی۔ وہ صبح منہ اندھیرے گھر سے نکلتا تھا تو رات گئے ہی واپسی نصیب ہوتی تھی اور گھر پر گزارے گئے ان چند گھنٹوں میں اسے آرام کے سوا کوئی دوسری خواہش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ایسے میں بھلا اسے پڑوسیوں کے بارے میں کیا خبر ہو پاتی لیکن ثروت بیگم تھیں نا اسے باخبر کرنے کے لیے۔ ایک سامع میسر آتے ہی انہوں نے فوراً پورا قصہ چھیڑ دیا۔ وہ بھی پچھلے دنوں کی بھاگ دوڑ کے بعد آج ذرا دیر سے تھانے جانے کا ارادہ رکھتا تھا اس لیے قدرے تاخیر سے سو کر اٹھا تھا اور اب بھی اطمینان سے بیٹھا پوری دلچسپی سے ان کی بات سن رہا تھا جس پر ظاہر ہے وہ بہت خوش تھیں۔

''دوست پر اعتبار کر کے حاکم صاحب نے لڑکے کے بارے میں کوئی خاص چھان بین نہیں کی اور نادیہ کی شادی کر دی۔ شادی کے بعد نادیہ پر جلد ہی یہ بات کھل گئی کہ اس کا شوہر تعلیم یافتہ تو ہے لیکن نشے کی لت نے اس سے تہذیب و شائستگی کو چھین لیا ہے۔ اوّل اوّل پھر بھی وہ اس کے ساتھ کچھ پیار و محبت سے پیش آیا لیکن بہن کی شادی کے بعد تو اس نے بالکل نظریں پھیر لیں۔ بہن کی شادی تک بھی اس نے شاید اس لیے لحاظ کیا تھا کہ نادیہ سے اس کے زیورات اور جہیز کی دوسری قیمتی اشیا ہتھیا سکے۔ نادیہ کے سامنے اپنے کاروبار کی خراب ہوتی حالت کا رونا رو کر پہلے اس نے اس سے اس کے زیورات لے لیے۔ حاکم صاحب کی ایک ہی بیٹی تھی اس لیے انہوں نے اسے کافی بھاری زیور دیا تھا۔ اس کے شوہر نے وہ زیور بیچ کر اپنی بہن کے لیے دوسرے ڈیزائن کا ذرا ہلکا زیور بنوایا اور باقی رقم شادی کے دوسرے انتظامات کے لیے سنبھال کر رکھ لی۔ جہیز کے لیے بھی اس نے نادیہ کی مشینری، بیڈشیٹس اور دوسری کئی چیزیں اتنی صفائی سے غائب کیں کہ اس معصوم کو علم ہی نہیں ہوسکا۔ نند کی شادی کے بعد اسے جب ذرا فرصت ملی تو اس کا دھیان اپنی چیزوں کی طرف گیا۔ اس نے شوہر سے استفسار کیا تو اس نے چار چوٹ کی لگائی کہ بدبخت عورت مجھ پر الزام لگاتی ہے۔ بعد میں نند ملنے آئی تو

اس نے الٹا نادیہ کو ہی الزام دیا کہ تم کیوں مردذات کے منہ لگتی ہو۔ عورت کی زبان چلے گی تو لازماً مرد کا ہاتھ اٹھے گا۔ یہ بے چاری کم عمر تھی، ڈر گئی۔ باپ کو بھی کچھ بتا کر دکھی نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے خاموش تماشائی بن کر سب کچھ لٹتا دیکھتی رہی۔ اس کے نشے باز شوہر نے فریج، ٹی وی، واشنگ مشین ایک ایک کر کے اس کے جہیز کی باقی ماندہ چیزیں بھی بیچ ڈالیں۔ حاکم صاحب بے چارے پرانی روایتوں کی پاسداری کرتے ہوئے بیٹی کے گھر جانے سے گریز کرتے تھے۔ نادیہ خود ہی کبھی کبھار ان سے ملنے آجاتی تھی اور ان کے استفسار پر یہی بتاتی تھی کہ وہ بہت خوش ہے لیکن ان کا دل مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ ایسے میں جب انہیں پتا چلا کہ وہ نانا بننے والے ہیں تو بہت خوش ہوئے اور ہر وہم کو دل سے نکال دیا۔ ایک بار نادیہ کئی دنوں تک کے لیے نہیں آئی تو انہوں نے سوچا کہ وہ خود اس سے مل کر آجاتے ہیں۔ وہ پھل وغیرہ لے کر اس کے گھر جا پہنچے۔ دروازہ نادیہ نے خود کھولا اور باپ کو سامنے دیکھ کر بوکھلا گئی۔ ادھر وہ بھی اس کی حالت دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ اس کے سارے چہرے پر نیل پڑے ہوئے تھے اور ماتھے پر کسی مندمل ہوتے زخم کا نشان تھا۔ اس کے گیلے کپڑے دیکھ کر پتا چل رہا تھا کہ شاید وہ کپڑے دھوتے ہوئے اٹھ کر دروازہ کھولنے آئی ہے۔ حاکم صاحب اس کے پیچھے گھر میں داخل ہوئے اور اس سے اس کی چوٹوں کے بارے میں استفسار کیا۔ اس نے بہانہ بنا دیا کہ وہ باتھ روم میں پیر پھسلنے سے گر گئی تھی لیکن حاکم صاحب کھٹک چکے تھے۔ انہوں نے نادیہ سے تو اس بارے میں کچھ نہیں کہا لیکن خود کھلی آنکھوں سے حالات کا جائزہ لینے کا فیصلہ کرلیا۔ نادیہ چاہتی تھی کہ ہمیشہ کی طرح آج بھی باپ کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دے لیکن وہ راضی نہیں ہوئے اور اس سے کہا کہ تم اپنا کام کرو، میں یہ فروٹ فریج میں رکھ دیتا ہوں۔''

''فریج خراب ہوگیا ہے، بننے کے لیے گیا ہے۔'' نادیہ نے ہونٹ چباتے ہوئے بتایا۔

''تم کپڑے ہاتھ سے کیوں دھو رہی ہو، واشنگ مشین کہاں ہے؟'' انہوں نے اس سے پوچھا تو اس نے وہی جواب دیا جو فریج کے متعلق دیا تھا۔

''واشنگ مشین خراب تھی تو تم ہاتھ سے کپڑے دھونے کیوں بیٹھ گئیں؟ دھوبی کے ہاں بھجوا دیتیں۔'' انہوں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے بیٹی سے پوچھا جس پر اس نے جواب دیا کہ اس کے شوہر کو دھوبی کے ہاتھ سے دھلے ہوئے کپڑے پسند نہیں ہیں۔ حاکم صاحب ایک نظر میں گھر کا اچھی طرح جائزہ لے چکے تھے اور انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ جہیز میں دیا گیا اکیس انچ کا رنگین ٹی وی بھی کہیں نظر نہیں آرہا اس لیے اس کے جواب پر کوئی ردِعمل ظاہر کرنے کے بجائے رسان سے بولے۔ ''اچھا تم کپڑے دھوؤ، میں جب تک خبریں دیکھ لیتا ہوں۔'' یہ سن کر نادیہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ حاکم صاحب نے کہا۔ ''کیا ہوا بیٹی... کیا ٹی وی بھی خراب ہوگیا ہے؟'' جس پر نادیہ نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔ حاکم صاحب کو غصہ آگیا اور بولے۔ ''میں نے تمہیں ہر چیز بہت اچھی کمپنی کی دی تھی۔ چند مہینوں میں ساری چیزیں خراب کیسے ہوگئیں؟ اور ہوگئیں تو تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ ابھی تو ہر شے کی وارنٹی کی مدت باقی ہے۔ کمپلین پر کمپنی خود ٹھیک کروا کر دیتی۔'' نادیہ سمجھ گئی کہ باپ کو شک ہوگیا ہے۔ خود اس کا ضبط بھی جواب دے گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ باپ نے بڑی مشکل سے چپ کروایا تو اس نے شروع سے آخر تک ساری بپتا کہہ سنائی۔ یہ سن کر حاکم صاحب کو غصہ آگیا۔ انہوں نے اسی وقت داماد کو فون کر کے گھر بلوایا۔ وہ ان کے لہجے پر ٹھٹک گیا تھا۔ گھر آیا تو ان کے ماتھے کے بل دیکھ کر سمجھ گیا کہ بات کھل گئی ہے۔ وہ ڈھٹائی سے سینہ تان کر سامنے کھڑا ہوگیا اور بولا۔

''میں شرابی بھی ہوں، جواری بھی اور بازاری عورتوں کے پاس بھی جاتا ہوں۔ تمہارا کام تھا شادی سے پہلے چھان بین کرتے۔ اگر نہیں کی تھی تو اب بھگتو۔'' اس کی اس ڈھٹائی اور بے شرمی پر حاکم صاحب کا غصہ اور بڑھ گیا اور انہوں نے فوری طور پر اس سے نادیہ کو طلاق دینے کا مطالبہ کیا۔ وہ مہر کی رقم معاف کرنے کی شرط پر طلاق دینے پر راضی ہوگیا۔ حاکم صاحب نے بھی شرط رکھ دی کہ اس صورت میں اس کا ہونے والے بچے سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ وہ تیار ہوگیا۔ یوں نادیہ کی اس بدبخت سے جان چھوٹی اور وہ لوٹ کر واپس میکے آگئی۔'' ثروت بیگم نے نہایت دکھی لہجے میں ساری کہانی اس کے گوش گزار کی۔

''حاکم صاحب کو چاہیے تھا کہ اپنے اس دوست کا گریبان پکڑتے جس نے یہ رشتہ کروایا تھا۔'' اس چھوٹی سی لڑکی پر گزرنے والے اتنے سخت حالات کو سن کر محسن کو بھی آزردگی محسوس ہوئی اور وہ کچھ جذباتی پن سے بولا۔

''ارے بیٹا! لوگ کہاں اپنا قصور مانتے ہیں۔ ان صاحب نے صاف کہہ دیا کہ مجھے یہ سب نہیں معلوم تھا۔ ایک اچھا رشتہ نظر میں آیا تھا، سو میں نے آپ کو بتا دیا۔ باقی آپ کا فرض تھا کہ چھان بین کر کے بیٹی بیاہتے۔''

''کہا تو انہوں نے بھی درست ہے۔ ماں باپ کا فرض ہوتا ہے کہ دوسروں پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کرنے کے بجائے اپنی اولاد کا برا بھلا خود اچھی طرح دیکھ بھال لیں۔'' ان کا جواب سن کر اس نے تبصرہ کیا۔

''بس کیا کہیں، جب تقدیر میں چوٹ کھانا لکھا ہو تو آدمی سے ایسی غلطیاں سرزد ہو ہی جاتی ہیں۔ بہرحال تم تو اپنا ناشتا پورا کرو۔ اتنا سا کھا کر ہی ہاتھ کھینچ لیا ہے۔'' اس کی بات کا جواب دینے کے ساتھ ہی انہوں نے اسے ٹوکا۔

''نہیں بس، میں کھا چکا ہوں۔ آپ مجھے ایک کپ چائے اور دے دیں۔'' اس نے جواب دیا تو وہ دل میں اس بات پر افسوس کرتی ہوئی کہ کھانے کے دوران یہ قصہ کیوں چھیڑا، اس کے لیے چائے بنانے لگیں۔

''حاکم صاحب نے کیا اپنا تبادلہ خود کراچی میں کروایا ہے؟'' وہ کچن میں ہی پڑی چار کرسیوں والی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا تھا چنانچہ انہیں چائے بناتے دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''ہاں، ان کا خیال ہے کہ سکھر میں رہ کر نادیہ کا خود کو سنبھالنا بہت مشکل ہوتا اس لیے انہوں نے اس شہر کو چھوڑ دینا ہی مناسب سمجھا۔''

''بڑے مثالی باپ ہیں حاکم صاحب جو اپنی بیٹی سے اتنا پیار کرتے ہیں۔'' اس نے تبصرہ کیا۔

''واقعی، ورنہ انسان کے لیے بڑا مشکل ہوتا ہے کہ اپنا شہر چھوڑ کر دوسری جگہ چلا جائے۔ لیکن انہوں نے تو نادیہ کی خاطر اس حد تک کیا ہے کہ پرانے گھر کا سارا سامان بیچ کر یہاں کے لیے نیا سامان خرید لیا ہے تاکہ وہ ماضی سے زیادہ سے زیادہ دور رہ سکے۔'' انہوں نے بھی اس سے اتفاق کیا۔

''ان کی اتنی قربانی کا نادیہ پر کچھ اثر پڑا ہے یا نہیں؟'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''اتنی جلدی وہ خود کو کیسے سنبھال سکتی ہے۔ بے چاری بچی کو تو چپ ہی لگ گئی۔ حاکم صاحب جب مجھے یہ سارا قصہ سنا رہے تھے تو وہ وہاں سے اٹھ کر ہی چلی گئی تھی۔ بعد میں، میں نے جا کر دیکھا تو کچن میں کھڑی رو رہی تھی۔'' انہوں نے تاسف سے بتاتے ہوئے چائے کپ میں نکال کر اس کے سامنے رکھی۔ محسن کے ساتھ یہ شاید زندگی میں پہلی بار ہوا کہ امی کے ہاتھ کی بنی خوشبودار چائے نے بالکل مزہ نہیں دیا اور اس نے نہایت بے دلی سے کپ خالی کر کے واپس رکھ دیا۔

☆☆☆

محسن آج کل ایک اہم کیس پر کام کر رہا تھا۔ ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے پولیس اور عوام کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ تین مہینے کے عرصے میں انہوں نے دو بینکوں اور متعدد دکانوں میں وارداتیں کی تھیں۔ ان دکانوں میں جیولرز کی دکانیں سرفہرست تھیں۔ ان کے علاوہ خوب چلتے ہوئے ریسٹورنٹس بھی ان کی کارروائی سے نہیں بچ سکے تھے۔ شہر میں ہونے والی بے شمار وارداتوں میں سے کسی ایک مخصوص گروہ کی کارروائیوں کو الگ سے شناخت کرنا شاید پولیس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ لیکن اس گروہ کی سب سے خاص بات یہ تھی کہ ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہوتی تھی جس کی مدد سے وہ زیادہ آسانی سے اپنا کام کر گزرتے تھے۔ وہ لوگ اتنے چالاک تھے کہ پیچھے اپنا کوئی سراغ چھوڑ کر نہیں جاتے تھے۔ بینکوں اور دیگر جگہوں پر جہاں کیمرے نصب تھے، وہ نہایت ہوشیاری سے یا تو ریکارڈنگ کی کیسٹ نکال کر لے گئے تھے یا اندر گھستے ہی کیمروں کو ہی توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ان حالات میں یہ پولیس کی خوش قسمتی تھی کہ ایک جیولر شاپ پر ان کی کارروائی کے دوران ایک شخص اپنے موبائل سے نہ صرف ان کی تصویر کھینچنے میں کامیاب ہوگیا تھا بلکہ اس نے اپنا موبائل بھی نہایت ہوشیاری سے چھپا دیا تھا ورنہ ڈاکوؤں کا یہ طریقۂ کار تھا کہ وہ جہاں بھی واردات کرتے تھے، وہاں موجود افراد کے موبائل فون بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ تصویر کھینچنے والا سیلز مین ایک نوجوان لڑکا تھا جس نے اپنے شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر دو دو موبائل رکھے ہوئے تھے۔ ڈاکوؤں کو اس کے پاس سے ایک موبائل مل گیا تو وہ مطمئن ہوگئے اور ذہن میں یہ خیال تک نہیں آیا کہ دوسرا موبائل وہ پہلے ہی چھپا چکا ہے۔

سیلز مین کی کھینچی ہوئی وہ تصویر بہت زیادہ صاف نہیں تھی لیکن بہرحال کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔ اس موقع پر محسن کے ذہن نے بھی خوب کام کیا۔ اسے معلوم تھا کہ کسی بھی بڑی کارروائی سے پہلے ڈاکو جائے واردات کا اچھی طرح جائزہ ضرور لیتے ہیں اور اس گروہ نے جتنی بھی وارداتیں کی تھیں، اس میں یہ بات خاص طور پر نوٹس میں آئی تھی کہ وہ جائے واردات کے نقشے اور دیگر تفصیلات سے متعلق اچھی طرح واقف ہوتے تھے لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ کہیں بھی کسی شخص نے انہیں شناخت نہیں کیا تھا اور ہر ایک کا یہی کہنا تھا کہ ڈاکو ان کے لیے مکمل طور پر اجنبی تھے۔ بہت غور و خوض کے بعد محسن نے ان تمام جگہوں سے واردات سے کچھ دن قبل کا سی سی ٹی وی فوٹیج ریکارڈ جمع کر لیا۔ اس ریکارڈ کی مدد سے اسے ڈاکوؤں کو شناخت کرنے میں آسانی ہو سکتی تھی۔ جیولرز شاپ کے سیلز مین کی کھینچی ہوئی تصویر کو

کمپیوٹر پر بڑا کرنے کے بعد وہ تصویر میں موجود چہروں کو ان ویڈیوز میں تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ابھی تک اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔ اس کے لیے یہ کیس ایک چیلنج بن گیا تھا اور وہ آدھی رات گزر جانے کے باوجود ابھی تک اس گتھی کو سلجھانے میں مصروف تھا۔ کام کرتے کرتے جب اسے تھکن کا احساس ہوا تو خود کو فریش کرنے کے لیے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر لے کر ٹیرس پر آ گیا۔ وہ سگریٹ نوشی کا عادی نہیں تھا لیکن پولیس کی ملازمت اختیار کرنے کے بعد کبھی کبھی یہ شغل کرنے لگا تھا۔ وہ بھی عموماً اس وقت جب بہت زیادہ تھک جاتا اور امی کے ہاتھ کی چائے میسر نہیں ہوتی ورنہ اس کے نزدیک تھکن کا سب سے بہترین علاج امی کے ہاتھ کی چائے تھی۔ اس وقت وہ گھر پر موجود ہونے کے باوجود اتنی رات گئے انہیں ڈسٹرب نہیں کر سکتا تھا اس لیے تھکن محسوس ہونے پر سگریٹ نوشی کا سہارا لینے پر مجبور تھا۔ لیکن یہ اس کی مجبوری تھی کہ وہ بند کمرے میں ہرگز بھی سگریٹ نہیں پی سکتا تھا اس لیے ٹیرس پر آ گیا تھا۔ ٹیرس پر آ کر اس نے کھلی فضا میں چند گہرے گہرے سانس لیے اور سگریٹ کے پیکٹ میں سے اپنے لیے سگریٹ منتخب کرنے لگا۔ اسی وقت ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔

''نادیہ! بہت رات ہو گئی ہے۔ اب اندر آ جاؤ۔'' یہ حاکم صاحب کی آواز تھی جو انہوں نے اندرونی دروازے پر کھڑے ہو کر باہر کھلے حصے میں موجود نادیہ کو دی تھی۔ محسن سگریٹ سلگانا بھول کر بے اختیار ہی ٹیرس کے اس حصے کی طرف بڑھ گیا جہاں سے حاکم صاحب کا گھر واضح طور پر نظر آتا تھا۔ ٹیرس پر آتے ہوئے اس نے یہاں کا بلب روشن نہیں کیا تھا۔ اس لیے اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ اسے وہاں کھڑا دیکھ لیا جاتا۔ خود حاکم صاحب کے گھر کے بیرونی حصے میں بھی بہت کم پاور کا بلب جل رہا تھا۔

''ابھی میرا دل نہیں چاہ رہا۔ میں تھوڑی دیر بعد اندر آ جاؤں گی۔'' اگر رات کا سناٹا نہ ہوتا تو وہ نادیہ کی دھیمی آواز بالکل نہ سن پاتا۔ آواز سے اس کی موجودگی کے مقام کا تعین کر کے محسن نے اپنی نظروں کو حرکت دی۔ وہ اسے ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی نظر آئی۔ روشنی کی کمی کی وجہ سے وہ اسے بہت اچھی طرح نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن پھر بھی یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا کہ پہلے دن کے مقابلے میں وہ کچھ بھری بھری لگ رہی ہے۔ ثروت بیگم کی زبانی اس کے حالات سن کر وہ یہ تو جان ہی گیا تھا کہ وہ تحقیق کے مراحل سے گزر رہی ہے اس لیے اس کی یہ تبدیلی غیر معمولی نہیں لگی۔ ان لوگوں کو ان کے پڑوس میں آئے دو مہینے کا عرصہ ہو چلا تھا اور یہ عرصہ تبدیلی کے لیے بہت تھا۔ نادیہ کے چہرے کے اپنے ذہن پر پہلی نظر میں انمٹ نقوش چھوڑنے کے باوجود اس عرصے میں وہ اسے دوبارہ نہیں دیکھ سکا جس کی ایک وجہ تو خود اس کی اپنی بے تحاشا مصروفیت تھی، دوسرے نادیہ بھی گھر سے باہر آتے جاتے دکھائی نہیں دیتی تھی۔

''بہانے مت بناؤ۔ تمہیں ابھی اندر آنا ہوگا۔'' حاکم صاحب بولتے ہوئے باہر آ گئے تھے اور محسن کو نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے بغیر آستین کی بنیان اور ڈھیلا ڈھالا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ شاید وہ سونے کے لیے لیٹ چکے تھے اور نادیہ کو بلانے کے لیے بستر سے اٹھ کر باہر آئے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے لہجے میں ہلکی سی جھنجلاہٹ تھی۔

''میں بہانہ نہیں بنا رہی۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اندر میرا دم گھٹ رہا ہے۔'' نادیہ نے گھٹی گھٹی آواز میں انہیں جواب دیا۔

''طبیعت اس لیے ٹھیک نہیں ہے کہ تم وقت پر کھانا اور دوائیں نہیں لیتی ہو۔ میں نے تمہارے لیے فریج میں کتنے جوسز اور فروٹ لا کر رکھے ہیں لیکن تمہیں کوئی قدر ہی نہیں ہے۔ بس ہر وقت منہ بسورے اِدھر اُدھر بیٹھی رہتی ہو۔'' وہ اس سے خاصے سخت لہجے میں بات کر رہے تھے اور یہ لہجہ جانے کیوں محسن کو بُرا لگا لیکن پھر اس نے خود ہی حاکم صاحب کو اس رویّے کے لیے حق بجانب سمجھا۔ انہوں نے نادیہ کی خاطر اتنا سب کچھ کیا تھا اور اسے ان کی قربانیوں کا احساس ہی نہیں تھا۔ وہ بس اپنے غم کے حصار میں قید تھی۔

''میرا کچھ بھی کھانے پینے کا دل نہیں چاہتا۔ آپ خوامخواہ اپنے پیسے ضائع مت کیا کریں۔'' نادیہ کی آواز میں ہلکی سی بیزاری تھی۔

''اس گھر میں کیا ہونا ہے اور کیا نہیں، یہ میں طے کروں گا۔ اب سیدھی طرح اندر چلو۔ صبح مجھے آفس بھی جانا ہے۔'' بالکل قطعی لہجے میں بولتے ہوئے انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو وہ اس طرح گھسٹتی ہوئی ان کے ساتھ آگے بڑھی جیسے بادلِ ناخواستہ اندر جا رہی ہو۔ ان دونوں کے منظر سے غائب ہونے کے بعد محسن وہاں سے ہٹ گیا لیکن اب اس کے اعصاب پہلے سے بھی کہیں زیادہ کشیدہ ہو گئے تھے اور اسے مزید شدت سے سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی۔ اس نے پہلے سے منتخب کردہ سگریٹ پیکٹ سے نکال کر سلگا لیا۔ بہت تیزی سے اس سگریٹ کو ختم کرنے کے بعد اس نے فوراً

ہی دوسرا سگریٹ بھی سلگا لیا۔ یہ اس کے معمول کے خلاف تھا۔ اس سے قبل کبھی بھی اس نے ایک ساتھ ایک وقت میں دو سگریٹ نہیں پیے تھے لیکن اس وقت وہ نہ صرف ایسا کر چکا تھا بلکہ تیسرے کے لیے بھی پیکٹ کھول لیا تھا لیکن پھر اسے خود ہی احساس ہو گیا اور اس نے اپنے ہاتھ کو واپس کھینچ لیا اور ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کمرے میں واپس چلا گیا جہاں ہنوز ڈھیر سارا کام اس کی توجہ کا منتظر تھا۔

☆☆☆

''امی! آپ روزانہ پڑوس میں ایک چکر لگا لیا کریں۔'' رات وہ بہت مصروف رہا تھا اور مشکل سے دو ڈھائی گھنٹے کی نیند ہی لے سکا، اس کے باوجود پڑوس کا منظر اس کے ذہن سے محو نہیں ہو سکا تھا اس لیے صبح ناشتے کی میز پر ہی ثروت بیگم سے کہہ بیٹھا۔

''دو تین دن چھوڑ کر جاتی تو ہوں لیکن روز روز جانا اچھا نہیں لگتا۔ ویسے بھی وہاں ہے ہی کون۔ حاکم صاحب دفتر چلے جاتے ہیں اور نادیہ کو زیادہ بات چیت کی عادت نہیں۔ میں تھوڑی دیر بیٹھ کر ہی واپس آ جاتی ہوں۔'' انہیں نئے پڑوسیوں کی آمد سے جو خوشی ہوئی تھی، وہ اب غائب ہو چکی تھی کہ پڑوس کی فیملی ان کے تنہائی کے مسئلے کو حل کرنے سے قاصر تھی۔

''میں اس لیے آپ سے کہہ رہا ہوں کہ حاکم صاحب کی غیر موجودگی میں ان کی بیٹی تنہا ہوتی ہے۔ وہ بے چاری عدت میں ہے۔ کوئی ضرورت پڑے تو باہر نکل کر پوری بھی نہیں کر سکتی۔ قریبی پڑوسی ہونے کے ناتے ہمارا فرض بنتا ہے کہ خبر گیری کرتے رہیں۔'' اس نے انہیں احساس دلایا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن حاکم صاحب بڑے ذمے دار آدمی ہیں۔ نادیہ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ انہوں نے ضرورت کی ہر چیز کا گھر میں ڈھیر لگا رکھا ہے۔ جھاڑو، برتن اور کپڑوں کی دھلائی کے لیے صبح ایک عورت آ جاتی ہے۔ نادیہ کو صرف دو افراد کا کھانا بنانا پڑتا ہے۔ وہ بھی حاکم صاحب اکثر باہر سے ہی لے آتے ہیں۔'' جواب میں وہ حاکم صاحب کی خوبیوں کے گن گانے لگیں۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے۔ دنیا کا ہر باپ اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے اور نادیہ تو حاکم صاحب کی اکلوتی بیٹی ہے۔ وہ اس کا خیال رکھتے ہیں تو یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے لیکن وہ ایک مرد ہیں جو دن بھر دفتر میں سر کھپا کر آنے کے بعد اس قسم کی ذمے داریوں کو نبھاتے ہوئے الجھ جاتے ہوں گے۔ ایسے میں اگر آپ نادیہ کا تھوڑا سا خیال رکھ لیں گی تو انہیں ذرا ریلیف مل جائے گا۔'' اسے تھوڑی سے جھنجلاہٹ تو ہوئی لیکن لہجے کو نرم رکھتے ہوئے انہیں سمجھانے لگا۔

''یہ آج تمہیں حاکم صاحب اور نادیہ کا اتنا خیال کیوں آ رہا ہے؟ سچ بتاؤ کہ اصل بات کیا ہے؟'' محسن کبھی ارد گرد کے معاملات میں اتنا دخیل نہیں ہوتا تھا اس لیے اسے مسلسل ایک بات پر اصرار کرتے دیکھ کر وہ چونکیں۔ جواب میں اس نے بھی رات کا واقعہ کہہ سنایا جسے سن کر وہ سنجیدہ ہو گئیں۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مرد اپنی معاشی جدوجہد میں اٹھائی جانے والی پریشانیوں کی وجہ سے الجھن کا شکار رہتے ہیں۔ اس لیے گھر کی طرف سے زیادہ ذہنی دباؤ برداشت نہیں کر پاتے۔ وہ بہت خیال رکھنے والے باپ ہیں لیکن ظاہر ہے ان حالات میں اس طرح نادیہ کی دیکھ بھال اور دل جوئی نہیں کر سکتے جس طرح اس کی ماں کر سکتی تھی.... یہ بے چاری بچی کی بدقسمتی ہے کہ ایک تو ماں سے محروم ہو گئی اور اوپر سے سر پر اتنی بڑی مصیبت آ پڑی۔'' وہ تاسف کا اظہار کرنے لگیں۔

''اوہو.... آپ خود اس انداز سے سوچتی رہیں گی تو اس کی ہمت کیسے بندھائیں گی۔ آپ ہر وقت اسے.... بے چاری لڑکی، بے چاری لڑکی پکارنے کے بجائے وہاں جا کر اسے سمجھائیں اور اس کی ہمت بندھائیں کہ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا ہے، وہ دنیا میں کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے۔ افسوس ناک ہونے کے باوجود دنیا میں کئی لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہو جاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایسی ہر لڑکی خود پر زندگی اور خوشیوں کے دروازے بند کر لے۔ ٹھیک ہے اس پر ایک برا وقت آیا ہے لیکن اسے اس وقت کو بھول کر آگے کے لیے پلاننگ کرنا چاہیے۔ ہر کسی کو خوشیاں تھالی میں سجا کر نہیں ملتی ہیں۔ اس کے لیے انسان کو خود بھی کوشش اور جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اسے چاہیے کہ جو ہوا، اسے فراموش کر کے اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کی کوشش کرے۔'' وہ بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا۔

''ٹھیک ہے بھئی، میں تمہاری بات اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ اب تم سکون سے ناشتا کر کے گھر سے روانہ ہو جاؤ تاکہ میں بھی اپنا کام نمٹا کر اس مشن پر نکل سکوں۔'' ثروت بیگم نے اسے ٹوکا تو وہ جھینپ کر ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا جو اب ٹھنڈا ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

''ہاں بھئی توقیر! تم نے وہ ویڈیوز دیکھیں جو میں نے تمہیں دیکھنے کے لیے دی تھیں؟'' تھانے میں اس نے اپنے

جونیئر سے جو اس کے ساتھ ہی ڈاکوؤں والے کیس پر کام کر رہا تھا، دریافت کیا۔

”یس سر! لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ساری ویڈیوز دیکھنے کے باوجود مجھے ایسا کوئی شخص نظر نہیں آیا جو جیولر شاپ کے سیلز مین کی کھینچی ہوئی تصویر سے مماثلت رکھتا ہو۔“ توقیر نے فوراً اس کی بات کا جواب دیا۔

”تو کیا تم میری اس تھیوری سے متفق نہیں ہو کہ ڈاکازنی کی اتنی منتظم کارروائی کرنے والے ملزمان نے واردات سے قبل لازماً جائے واردات کا اچھی طرح جائزہ لیا ہوگا... اسی لیے ایک بار بھی نہ تو وہ ناکام رہے اور نہ ہی پکڑائی میں آسکے؟“ اس نے گہری نظروں سے توقیر کو دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”یہ تو میں بھی جانتا ہوں سر... لیکن ضروری تو نہیں ہے نا کہ ملزمان نے خود جائے واردات کا جائزہ لیا ہو۔ وہ کسی اور ذریعے سے بھی یہ معلومات اکٹھی کر سکتے ہیں۔“ توقیر نے دلیل دی۔

”یہ... یہی تو پوائنٹ ہے جسے ذہن میں رکھ کر میں ایک بڑی کامیابی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ ذرا تم یہ تصویریں تو دیکھو۔“ اس نے اپنا لیپ ٹاپ کھول کر توقیر کے سامنے رکھ دیا۔ توقیر ایک ایک کر کے ساری تصویریں دیکھتا چلا گیا۔ یہ مرد و زن کے ایک جوڑے کی تصویریں تھیں جنہیں حلیے کی معمولی سی تبدیلیوں کے باوجود شناخت کیا جا سکتا تھا کہ ہر تصویر میں موجود جوڑا ایک ہی ہے۔ محسن نے ہر تصویر کے ساتھ مختصراً یہ بھی درج کر دیا تھا کہ کون سی تصویر کس تاریخ کو اور کس جگہ پر لی گئی ہے۔

”ایک خاص بات نوٹ کرو۔ عورت نے ہر تصویر میں کپڑوں سے میچ کرتی بڑی نفیس سی جیولری پہن رکھی ہے لیکن دائیں کلائی میں مستقل ایک بھدا سا چوڑا کڑا موجود ہے۔ مجھے شک ہے کہ اس کڑے میں کوئی چھوٹا سا خفیہ کیمرا نصب ہوگا جس کی مدد سے وہ جائے وقوعہ کی ویڈیو تیار کر کے اپنے ساتھ لے جاتی ہوگی۔ میں نے یہ بھی نوٹ کیا ہے کہ جس جگہ بھی واردات ہوئی ہے، وہاں اس جوڑے نے یا دونوں میں سے ایک نے ایک سے زیادہ بار چکر لگایا ہے جس کا مقصد ظاہر ہے، وہ جائے وقوعہ کے بارے میں مکمل تفصیلات جمع کرنے کے بعد ہی واردات کرنے والے گروہ کو اوکے کا اشارہ دیتے ہوں گے۔“ اس نے توقیر کی توجہ عورت کے کڑے کی طرف مبذول کرواتے ہوئے اپنا نقطۂ نظر بیان کیا۔

”بالکل صحیح سر! آپ تو کمال کی نظر رکھتے ہیں۔ میں نے تو اس زاویے سے ویڈیوز کو دیکھا ہی نہیں تھا کہ کوئی تھرڈ پارٹی بھی ڈاکوؤں کی مددگار ہو سکتی ہے۔ اس جوڑے کی مدد سے ہم آسانی سے اصل مجرموں تک پہنچ سکتے ہیں۔“ توقیر فوراً پُرجوش ہو گیا۔

”کیسے؟“ محسن نے مسکراتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

”دیکھیں نا سر! اس گروہ نے زیادہ تر وارداتیں ایسی جگہوں پر کی ہیں جہاں لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے لیکن بینک اور جیولرز شاپس ایسی جگہ نہیں ہوتیں کہ کوئی یونہی تفریحاً وہاں جائے اور واپس آجائے۔ ایسی جگہوں پر جانے اور وہ بھی بار بار جانے کے لیے آدمی کے پاس کوئی جواز ہونا چاہیے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ دونوں بینکوں کے عملے اور جیولر شاپس کے ملازمین میں ہمیں کچھ افراد ضرور ایسے مل جائیں گے جو ان لوگوں کو شناخت کر سکیں۔ یہی لوگ ہماری مجرموں کے پتے تک پہنچنے میں بھی مدد کر سکتے ہیں۔“

”گڈ! مجھے تم سے اسی جواب کی امید تھی۔ تمہاری صلاحیتوں پر بھروسا کرتے ہوئے میں یہ ذمے داری تمہیں سونپ رہا ہوں کہ اس جوڑے کو گرفتار کر کے ان سے ان کے باقی ساتھیوں کا ٹھکانا معلوم کرو۔ اور ہاں، اس کام کے لیے میں تمہیں زیادہ مہلت نہیں دے سکتا اس لیے جلد از جلد اس کام کو نمٹا کر مجھے رپورٹ دو۔“ توقیر کو سراہتے ہوئے آخر میں اس کے لہجے میں وہی حاکمانہ سختی در آئی جو ایک افسر کی شان اور ضرورت ہوتی ہے۔

☆☆☆

وہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں اپنے گھر کے قریبی علاقے میں آیا تھا۔ واپسی میں گھڑی دیکھی تو سوچا گھر سے لنچ کرتا ہوا چلے۔ شروع ہی سے وہ باہر کا کھانا بہت کم کھاتا تھا۔ صحت کے اصولوں کے علاوہ اس میں بڑا دخل ثروت بیگم کی ککنگ کا بھی تھا۔ ان کا شمار بہت لذیذ کھانا بنانے والی خواتین میں ہوتا تھا اس لیے اس کی کوشش ہوتی تھی کہ کھانا گھر پر ہی کھائے۔ اس وقت بھی اسی ارادے سے اس نے گھر کا رخ کیا تھا لیکن گاڑی گیٹ کے سامنے روکتے ہی چونک گیا۔ وہ ثروت بیگم تھیں جو افتاں وخیزاں پڑوس کے گھر سے باہر نکل رہی تھیں۔ اسے سامنے موجود پا کر گویا ان کی رکی ہوئی سانسیں بحال ہو گئیں۔

”بڑے وقت پر آئے ہو بیٹا... اس وقت کسی مرد کی شدید ضرورت تھی۔“ انہوں نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔

”خیریت امی! آپ اتنی پریشان کیوں نظر آرہی ہیں؟“ پڑوس کے گھر سے انہیں نکلتے دیکھ کر اسے اتنا تو اندازہ ہو گیا تھا کہ پریشانی کا تعلق وہاں سے ہے۔ حاکم صاحب اس وقت دفتر گئے ہوئے تھے اس لیے لامحالہ اس کا ذہن نادیہ کی طرف چلا گیا۔ ویسے بھی وہ آج کل جس کنڈیشن میں تھی، اس میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

”خیریت نہیں ہے بیٹا! نادیہ غسل خانے میں پھسل کر گر گئی ہے۔ میں نے ایمبولینس کے لیے کال کر دی ہے۔ وہ پہنچتی ہی ہوگی۔ میں گھر سے اپنی چادر اور پیسے لینے جا رہی ہوں۔“ انہوں نے تیزی سے جواب دیتے ہوئے اس کے اندازے کی تصدیق کی۔

”آپ نادیہ کے پاس جائیں۔ میں لاتا ہوں آپ کی چادر اور پیسے۔“ وہ جو گاڑی سے اتر چکا تھا، حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے تیزی سے حرکت میں آیا۔ ان کے گھر کے دروازے پر آٹومیٹک لاک لگا تھا جس کی چابی گھر کے ہر فرد کے پاس موجود تھی۔ اس نے تیزی سے اپنے پاس موجود چابی سے گھر کا دروازہ کھولا اور ایک منٹ کے اندر اندر امی کی چادر اور رقم لے کر باہر آ گیا۔ وہ باہر نکلا تو ایمبولینس کا سائرن سنائی دے رہا تھا۔ ایمبولینس گلی میں پہنچی تو اس نے عملے کے ایک فرد اور اسٹریچر کے ساتھ حاکم صاحب کے گھر کا رخ کیا۔ وہاں ثروت بیگم کے ساتھ محلے کی ایک عورت فاخرہ بھی موجود تھی۔ اس کی مدد سے ثروت بیگم نے نادیہ کو غسل خانے سے باہر نکال لیا تھا اور اس کا جسم ایک بڑی سی چادر سے ڈھک دیا تھا۔ اسے نیم بے ہوش نادیہ کا صرف چہرہ دکھائی دے رہا تھا جو بالکل زرد پڑا ہوا تھا اور اس کے منہ سے ہلکی ہلکی کراہیں نکل رہی تھیں۔ اس نے دونوں خواتین کی مدد سے نادیہ کو اسٹریچر پر منتقل کیا۔

”آنٹی! میں آپ کے ساتھ اسپتال چلتی لیکن بچوں کے اسکول سے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔“ وہ ایمبولینس کے ساتھ آنے والے آدمی کے ساتھ نادیہ کو اسٹریچر پر ڈالے باہر جا رہا تھا جب اس نے فاخرہ کی آواز سنی۔

”مجھے معلوم ہے فاخرہ! تم بس اچھی طرح اس گھر کو بند کر دو اور حاکم صاحب آئیں تو انہیں بتا دو کہ ہم نادیہ کو اسپتال لے کر گئے ہیں۔“ ثروت بیگم نے عجلت بھرے انداز میں اسے ہدایات دیں اور خود بھی باہر نکل گئیں۔ وہ نادیہ کے ساتھ ایمبولینس میں بیٹھی تھیں جبکہ محسن اپنی گاڑی میں ان کے پیچھے پیچھے تھا۔

”حاکم صاحب سے رابطے کی کوئی صورت نہیں ہے امی؟“ اسپتال پہنچ کر نادیہ کو اسٹاف کے حوالے کرنے کے بعد اس نے ثروت بیگم سے دریافت کیا۔

”نہیں بیٹا! کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ ان سے ان کا موبائل نمبر لے لوں۔ نادیہ کو معلوم ہوگا لیکن اس وقت اس کی حالت ایسی نہیں ہے کہ کچھ بتا سکے۔“ انہوں نے پریشانی سے جواب دیا۔

”آپ اس کے موبائل میں چیک کر لیتیں۔ اس میں تو اس نے نمبر فیڈ کیا ہوا ہوگا۔“

”میرا اس طرف دھیان نہیں گیا۔ ویسے میں نے کبھی اس کے پاس موبائل دیکھا بھی نہیں۔ پتا نہیں ہے بھی یا نہیں۔“

”چلیں اللہ مالک ہے۔ دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ ویسے اس وقت حاکم صاحب یہاں ہوتے تو بہتر ہوتا۔“ ابھی اس نے یہ الفاظ ادا ہی کیے تھے کہ ایک نرس ان کے قریب چلی آئی۔

”پیشنٹ کی حالت بہت سیریس ہے۔ ماں اور بچے کی جان بچانے کے لیے فوری طور پر سیزر کرنا ہوگا۔ آپ اس پیپر پر سائن کر دیں اور کاؤنٹر پر فیس جمع کروا کر خون وغیرہ کا بھی بندوبست کریں۔“ تیز تیز بولتے ہوئے اس نے ایک کاغذ محسن کے سامنے کیا۔ وہ یقیناً اسے نادیہ کا شوہر سمجھ رہی تھی۔ اس نے بھی وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اسے صورتِ حال سے آگاہ کرنا ضروری نہیں سمجھا اور خاموشی سے سائن کر دیے۔ اگلا ایک گھنٹا وہ بہت مصروف رہا۔ اسپتال کے ساتھ جو بلڈ بینک تھا، وہ مطلوبہ گروپ کا بلڈ اس وقت تک مہیا نہیں کرتا تھا جب تک خون کا طلب گار فرد بدلے میں خون ڈونیٹ نہ کرے۔ دو انسانی جانوں کو بچانے کے لیے وہ اپنا بلڈ ڈونیٹ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ بلڈ سینٹر کے بیڈ پر لیٹے ہوئے بھی وہ خاصا مصروف رہا۔ پہلے تو اس نے حسن کے موبائل پر کال کر کے اس کو اطلاع دی کہ امی کہاں ہیں ورنہ وہ یونیورسٹی سے آکر خلافِ معمول انہیں گھر سے غائب پا کر پریشان ہو جاتا۔ اس کے بعد اس نے توقیر کو فون کیا اور اپنے ایک ایمرجنسی میں پھنس جانے کی اطلاع دے کر اس سے رپورٹ طلب کی۔ اس کی کارکردگی قابلِ اطمینان تھی۔ اس کے علاوہ اس کے پاس دوسرا کوئی کیس ایسا نہ تھا جس پر فوری توجہ دینا ضروری ہو، اس لیے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ بلڈ دے کر فارغ ہونے کے بعد وہ چاہتا تو وہاں سے جا سکتا تھا لیکن حاکم صاحب کے نہ ہونے کے باعث

اسے یہ مناسب معلوم نہ ہوا۔ نادیہ آپریشن تھیٹر میں تھی اور آپریشن کے ذریعے ایک پری میچور بچے کی ماں بننے والی تھی۔ معلوم نہیں بعد میں کیا صورتِ حال پیش آتی۔ اکیلی ثروت بیگم زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کرسکتی تھیں، بس یہ سوچ کر ہی وہ وہاں رک گیا۔

”مبارک ہو سر! آپ کے ہاں بیٹی ہوئی ہے۔ بہت کیوٹ ہے بالکل آپ کی مسز کی طرح۔“ سستی سے گزرتے وقت کے جاں گسل انتظار کا اختتام اس خبر پر ہوا۔ یہ اطلاع دینے والی ایک نوعمر اور نازک سی نرس تھی جو خود بھی بہت پیاری تھی۔ نادیہ کے ساتھ محسن اور ثروت بیگم کو دیکھ کر اس نے خود ہی یہ فرض کرلیا تھا کہ محسن، نادیہ کا شوہر ہے۔

”ماں اور بچی کی حالت کیسی ہے؟“ وہ ثروت بیگم کے سامنے نرس کی غلط فہمی پر جھینپ گیا تھا چنانچہ جلدی سے سوال کر کے خود کو اس سچویشن سے نکالنے کی کوشش کی۔

”الحمدللہ دونوں خیریت سے ہیں لیکن انہیں چند دن اسپتال میں ہی رہنا پڑے گا۔ بچی پری میچور ہے۔ اسے ہم انکیوبیٹر میں رکھ کر انڈر آبزرویشن رکھیں گے۔ آپ کی مسز کو بھی یہیں رکنا ہوگا کیونکہ وہ بچی کو فیڈ کروائیں گی۔ اس کے علاوہ وہ خود بھی بہت کمزور ہیں اور انہیں اسپیشل اٹینشن کی ضرورت ہے۔“ وہ کچھ باتونی مزاج کی تھی‘ اسے جواب دے کر ثروت بیگم کی طرف متوجہ ہوگئی۔

”آنٹی! جلدی سے بچی کے کپڑے وغیرہ دے دیں۔“

”کپڑے....“ ثروت بیگم اس مطالبے پر بوکھلا گئیں۔

”جی ہاں کپڑے۔“ وہ کھلکھلائی۔

”سوری بیٹا! ہم اتنی ایمرجنسی میں نادیہ کو اسپتال لے کر آئے تھے کہ کسی چیز کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔“ انہوں نے ذرا شرمندگی سے وضاحت پیش کی۔

”اے نمی! کیا وہاں جا کر چپک گئی ہے؟ کسی سے بخشش مانگی تو اچھا نہیں ہوگا۔ بڑی ڈاکٹر صاحبہ نے سختی سے منع کیا ہے۔“ ثروت بیگم کی وضاحت کے جواب میں نمی کچھ ارشاد کرتی، اس سے پہلے ہی اسے ایک سینئر نرس نے ڈانٹنے والے انداز میں پکارا۔

”آرہی ہوں باجی۔ ان سے بچی کے کپڑے لینے آئی تھی۔“ اس نے جلدی سے جواب دیا پھر منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ ”سب کو اپنے جیسا سمجھ رکھا ہے۔ میں کیوں مانگنے لگی کسی سے بخشش؟ مجھے کوئی کمی ہے کیا؟“

”تم سے کس نے کہا ہے کہ کپڑے لے کر آؤ..... انکیوبیٹر میں کب بچوں کو کپڑے پہنائے جاتے ہیں؟“ سینئر نرس نے کچھ اور سختی سے اسے ڈانٹا تو اس بار وہ سچ مچ شرمندہ ہوگئی اور تیزی سے وہاں سے ہٹ گئی۔

”کمال کی لڑکی تھی۔ جو منہ میں آیا بولتی چلی گئی۔ میں تو سچ مچ بوکھلا گئی تھی کہ کہاں سے اسے کپڑے دوں؟“ اس کے جانے کے بعد ثروت بیگم نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا تو وہ مسکرادیا۔

”میں فاخرہ سے فون کر کے پوچھتی ہوں کہ حاکم صاحب گھر واپس آئے یا نہیں۔ عام طور پر تو ساڑھے چار اور پانچ کے درمیان گھر واپس آجاتے ہیں۔“ وہ اپنے پرس سے موبائل نکال کر اس پر مصروف ہوگئیں۔ اسی وقت اس نے نمی نامی نرس کو دوبارہ اپنی طرف آتے دیکھا۔

”آپ کی مسز کو ریکوری میں شفٹ کیا جارہا ہے۔ جلدی سے آکر ان سے مل لیں۔ ہم ریکوری روم کے باہر بس ایک منٹ کے لیے اسٹریچر روکیں گے۔ اس کے بعد جتنی دیر وہ وہاں رہیں گی، کسی مرد کو اندر جانا الاؤ نہیں ہوگا۔“ قریب آکر اس نے تیز تیز بولتے ہوئے اسے اطلاع دی۔ اس نے بے بسی سے ثروت بیگم کی طرف دیکھا۔ وہ ذرا سائڈ پر ہو کر فون پر باتیں کرنے میں مصروف تھیں۔

”اِدھر اُدھر کیا دیکھ رہے ہیں سر! جلدی آئیں۔ ورنہ ملاقات نہیں ہوسکے گی۔“ نرس نے اسے ٹوکا تو وہ بے بس سا اس کے پیچھے چل پڑا۔ ریکوری روم کے سامنے کوریڈور میں نادیہ کا اسٹریچر رکا ہوا تھا۔ اس کا جسم پیر سے لے کر گردن تک چادر سے ڈھکا ہوا تھا اور صرف چہرہ نظر آرہا تھا جو پہلے سے بھی زیادہ زرد پڑ گیا تھا۔

”بیٹی مبارک ہو۔“ اس نے آہستگی سے اس سے کہا۔ جواب میں اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک نہیں آئی اور وہ بے تاثر آنکھوں سے اس کی طرف ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔

”حوصلے سے کام لیجیے۔ اللہ نے احسان کیا اور اتنے بڑے حادثے کے بعد بھی آپ اور آپ کی بچی محفوظ رہے۔ آگے بھی وہ انشاء اللہ اچھا ہی کرے گا۔“ اسے اس کی بے تاثر آنکھوں سے کچھ الجھن ہوئی تو نرمی سے سمجھانے لگا لیکن جواب میں اس کے چہرے پر ایسا تاثر ابھرا جو قطعی اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

”چلو بھئی، انہیں اندر لے جاؤ۔“ ایک لیڈی ڈاکٹر نے وہاں سے گزرتے ہوئے نرسنگ اسٹاف کو ہدایت دی تو وہ لوگ اسٹریچر کو دھکیلتے ہوئے ریکوری روم میں لے گئے۔ وہ

الجھا ہوا سا وہیں کھڑا رہ گیا۔ نادیہ کے انداز میں اس خوشی کا شائبہ تک نہیں تھا جو ماں بننے پر عورت کے دل میں اترتی ہے۔ شاید اسے اس وقت اپنی زندگی کے وہ تکلیف دہ لمحات یاد آگئے تھے جو اس نے اس بچی کے باپ کے ساتھ گزارے تھے۔ اسے بے ساختہ ہی اس شخص پر غصہ آیا جو اتنی پیاری لڑکی کی قدر نہیں کرسکا تھا اور اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

”آپ بچی کو دیکھنا پسند کریں گے؟ مسلمانوں کی اولاد ہے تو یقیناً کان میں اذان کی آواز تو جانی چاہیے۔“ وہی نرس پھر اس کے سر پر سوار تھی۔ اس کے لہجے میں موجود طنز کو نظر انداز کر کے محسن نے اسی سے نرسری تک راہنمائی کی درخواست کی۔ وہ ساتھ چل پڑی۔

”میرا ڈیوٹی ٹائم ختم ہوگیا ہے اس لیے میں آپ کے ساتھ چل رہی ہوں ورنہ ڈیوٹی ٹائم میں ہمیں اس طرح آزادی سے گھومنے پھرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔“ شاید اس نے سوچا ہو کہ وہ اسے بالکل فارغ ہی نہ سمجھ لے، اس لیے اس کے ساتھ چلتے ہوئے وضاحت پیش کرنے لگی۔ ”اصل میں آپ کی مسز اور بچی دونوں اتنی کیوٹ ہیں کہ میرا ان پر دل آگیا ہے ورنہ میں ہر کسی کے لیے اتنی زحمت نہیں اٹھاتی ہوں۔“ اس کی وضاحتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ محسن کوئی بھی جواب دیے بغیر اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے نرسری میں داخل ہو کر اسے شیشے کے ایک باکس کے سامنے لے جا کر کھڑا کردیا۔ اندر صرف ہیمپر پہنے ننھی سی نازک پری بے خبر سورہی تھی۔ نرس نے اس کے بارے میں بالکل ٹھیک کہا تھا، وہ واقعی نادیہ کا پرتو تھی۔ اسے بے ساختہ ہی اس پر پیار آیا۔

”اسے تھوڑی دیر کے لیے باکس سے باہر نکال سکتے ہیں کیا؟ مجھے اس کے کان میں اذان دینی ہے۔“ اس نے بے ساختہ ہی اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

”کیوں نہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے بچی کو باہر نکالا۔ محسن نے بہت آہستگی سے اسے تھام کر اس کے ماتھے کو چوما لیکن بچوں کو گود میں لینے کا کوئی تجربہ نہ ہونے کے باعث اسے بچی کو سنبھالنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔

”لائیے اسے میں گود میں لے لیتی ہوں۔ آپ جلدی سے اذان دے دیں ورنہ آپ کے ساتھ مجھے بھی اتنی دیر یہاں رکنے پر ڈانٹ پڑ جائے گی۔“ نرس نے مسکراتے ہوئے کسمساتی ہوئی بچی کو اس سے لے لیا تو وہ اس کے کان میں اذان دینے لگا۔ اذان دینے کے بعد نرس نے فوراً ہی بچی کو واپس اس کی جگہ پر لٹایا اور وہ دونوں باہر آگئے۔

”دیکھا کتنی پیاری بچی ہے اور آپ تھے کہ اسے دیکھنے کے بھی آرزومند نہیں تھے۔“ باہر نکل کر نرس نے کچھ فتح مندانہ انداز میں اس سے کہا۔ اپنے طور پر تو وہ بچی کے باپ کے دل میں اس کی محبت کی جوت روشن کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

”درست فرمایا آپ نے۔ واقعی بہت پیاری بچی ہے لیکن میری نہیں ہے۔“ اس نے بہتر سمجھا کہ نرس کی غلط فہمی کو دور کردے۔

”جی...؟“ وہ جو اتنی دیر سے اسے بچی کا باپ سمجھ رہی تھی، ہکا بکا رہ گئی۔

”جی ہاں، نادیہ صاحبہ میری پڑوسی ہیں۔ ان کے ساتھ جب یہ حادثہ پیش آیا، اس وقت یہ اپنے گھر میں اکیلی تھیں۔ اس لیے میں اور میری والدہ انہیں اپنے ساتھ اسپتال لے کر آئے ہیں۔ ان کے ہسبینڈ نہیں ہیں اور یہ اپنے والد کے ساتھ رہتی ہیں۔ جیسے ہی ان سے رابطہ ہوا، ہم انہیں اسپتال بلالیں گے۔“ اس نے نرس کو ذرا تفصیلی جواب دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اسے یقین تھا کہ پیچھے وہ نرس اب بھی ہکا بکا کھڑی ہوگی۔

☆☆☆

”میں نے ساری معلومات حاصل کرلی ہیں سر۔ بینک کے ایک ملازم اور جیولر شاپ کے مالک نے اس مشکوک جوڑے کو پہچان لیا ہے۔ جس بینک میں ڈاکا پڑا ہے، وہ دونوں اس میں باقاعدہ اکاؤنٹ ہولڈرز ہیں۔ یہ اکاؤنٹ انہوں نے ڈاکا پڑنے سے چند دن پہلے ہی کھلوایا تھا اور اس سلسلے میں بینک کے کئی چکر لگائے تھے۔ بینک کے جس ملازم نے انہیں شناخت کیا ہے، اسی نے اکاؤنٹ کھولنے کے سلسلے میں ساری کاغذی کارروائی کی تھی اس لیے اس کے ذہن میں ان دونوں کی شکلیں محفوظ رہیں۔ بینک کی طرح انہوں نے جیولر شاپ کے بھی کئی چکر لگائے تھے۔ پہلے تنہا مرد وہاں گیا تھا اور اس نے ایک قیمتی جڑاؤ سیٹ یہ کہہ کر خریدا تھا کہ وہ یہ سیٹ اپنی بیوی کو اس کی سالگرہ پر تحفتاً دینا چاہتا ہے۔ بعد میں دونوں میاں بیوی اکٹھے وہاں گئے اور مرد نے بتایا کہ اس کی بیوی کو اس کے دیے ہوئے سیٹ کا ڈیزائن پسند نہیں آیا ہے اس لیے وہ یہ سیٹ واپس کر کے اپنی بیوی کو اس کی پسند کا سیٹ دلانا چاہتا ہے۔ سیٹ پسند کرنے میں عورت نے کافی وقت لگایا تھا اور وہ دونوں بہت دیر تک وہاں ٹھہرے رہے تھے۔ سیٹ کی خریداری کے چند دن بعد وہ عورت دوبارہ شاپ پر گئی تھی اور اس وقت اس نے یہ بہانہ کیا تھا کہ

اس کے خریدے ہوئے سیٹ میں سے دو نگینے جھڑ گئے ہیں جنہیں دوبارہ لگانا ہے۔ اس نے جیولر کو کافی باتیں بھی سنائی تھیں کہ وہ لوگ اتنا ناقص کام کرتے ہیں کہ چند دن میں ہی نگینے جھڑ گئے۔ جیولر خود بہت حیران ہوا تھا کہ اتنی جلدی نگینے کیسے جھڑ گئے۔ بہر حال اس نے عورت کی شکایت دور کرنے کے لیے اسے اسی وقت نگینے لگوا کر دے دیے تھے لیکن ظاہر ہے عورت کو کام ہونے تک انتظار کرنا پڑا تھا۔ اس دوران جیولر نے اسے کولڈ ڈرنک منگوا کر پلائی تھی اور اس نے ادھر اُدھر کی باتیں بناتے ہوئے شاپ پر خاصا وقت گزار لیا تھا۔ دیگر جگہوں پر بھی دونوں میاں بیوی کے واردات سے پہلے موجودگی کے آثار ملے ہیں لیکن سب سے مضبوط شواہد ان دونوں جگہوں کے ہی ہیں۔'' اگلے دن وہ تھانے پہنچا تو توقیر نے اسے تفصیلی رپورٹ پیش کی جسے سن کر وہ خوش ہو گیا۔

''ویری گڈ! تم نے تو ایک ہی دن میں خاصا کام کر دکھایا۔ اب یہ بتاؤ کہ تم نے اس جوڑے کی گرفتاری کے لیے کیا قدم اٹھایا؟ بینک اور جیولرز شاپ سے تمہیں ان دونوں کا کوئی اتا پتا تو ضرور مل گیا ہوگا؟''

''جی سر! لیکن دونوں جگہ مختلف پتے درج تھے۔ پہلے ہم بینک والے پتے پر گئے لیکن وہاں سے معلوم ہوا کہ وہ دونوں وہاں کرائے دار تھے اور گھر چھوڑ چکے ہیں۔ جیولرز شاپ سے ملنے والا پتا کلفٹن میں واقع ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ کا تھا۔ حسبِ توقع اس پتے پر بھی وہ ہمیں نہیں ملے لیکن تصویر دیکھ کر ایک بچے نے دونوں کو شناخت کر لیا اور بتایا کہ وہ دونوں ذرا فاصلے پر ایک دوسری بلڈنگ کے اپارٹمنٹ میں رہ رہے ہیں۔ ہم نے خفیہ طور پر اس کی تصدیق کر لی۔ واقعی وہ دونوں وہاں موجود ہیں۔ میں نے دو سادہ پوش اہلکاروں کو نگرانی کے لیے وہاں تعینات کر دیا ہے۔ اب آپ جب حکم دیں، انہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔'' اس کے سوال کے جواب میں توقیر نے ایک اور خوش خبری سنائی۔

''انتظار کیسا توقیر! فاٹافٹ انہیں گرفتار کرو اور ان سے تفتیش کرو کہ ان کے گروہ کے باقی افراد کہاں ملیں گے۔ اب ہمارے پاس انہیں مہلت دینے کی گنجائش نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جلد از جلد یہ کیس نمٹ جائے تاکہ ہم بھی سکون کی نیند سو سکیں۔'' اس نے احکامات جاری کیے جس کے نتیجے میں تھوڑی دیر کے لیے تھانے میں ہلچل سی مچ گئی جس کا خاتمہ پولیس پارٹی کی روانگی پر ہوا۔ آخری لمحات میں اس نے خود بھی اس پارٹی میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا چنانچہ دیگر اہلکاروں کے ساتھ کلفٹن کی طرف اڑا جا رہا تھا۔ نگرانی کرنے والے سادہ پوشوں کو بھی پولیس پارٹی کی آمد کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ پولیس پارٹی وہاں پہنچی تو محسن نے پہلے اپارٹمنٹ سے نکاسی کے راستوں پر اہلکار متعین کیے پھر خود توقیر کے ساتھ اپارٹمنٹ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ توقیر کے متعین کردہ سادہ پوش بھی اسی فلور پر موجود تھے۔ اس کا اشارہ پا کر توقیر نے کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھی۔ ذرا دیر میں انہیں دروازے کے پیچھے کسی کی آہٹ محسوس ہوئی پھر ایک نسوانی آواز نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

''کون؟''

''ذرا دو منٹ کے لیے باہر آیئے میڈم... ہم ووٹر لسٹ کی تصدیق کے لیے آئے ہیں۔'' انہیں اس بات کا احساس تھا کہ ڈور آئی سے انہیں دیکھا جا رہا ہے اس لیے محسن نے مہذبانہ لہجے میں جواب دیا۔ ریڈ کے لیے نکلتے وقت ہی انہوں نے طے کر لیا تھا کہ مجرموں کی گرفتاری خفیہ طور پر عمل میں لائی جائے گی تاکہ ان کے ساتھیوں کو خبر نہ ہو سکے اسی لیے ان دونوں سمیت ان کے باقی ساتھیوں نے بھی یونیفارم کی جگہ سادہ لباس پہن رکھے تھے۔

''ہم یہاں کرائے دار ہیں اور ہمارا ووٹ اس علاقے میں نہیں ہے۔'' اس کی درخواست پر دروازہ کھولنے کے بجائے عورت نے بیزاری سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، آپ یہاں کرائے دار ہیں لیکن ہمیں تو یہاں کے بارے میں مکمل تفصیلات درکار ہیں۔ آپ ہمیں وہ فراہم کر دیں۔'' اس نے اس بار بھی اپنا لہجہ شائستہ ہی رکھا۔

''ہم نے یہ اپارٹمنٹ اسٹیٹ ایجنٹ کے تھرو لیا تھا اس لیے میں آپ کو کوئی تفصیل نہیں بتا سکتی۔'' وہ لوگ ایک ڈکیت گروہ کے ساتھ منسلک تھے اس لیے عورت کی اس قدر احتیاط سمجھ آتی تھی۔ وہ کسی بھی طرح دو اجنبیوں کے لیے دروازہ کھولنے پر تیار نہیں تھی۔

''دیکھیں میڈم! ہم سرکاری ملازم ہیں اور اپنی ڈیوٹی پر ہیں۔ اگر آپ نے ہمارے ساتھ تعاون نہیں کیا تو ہم اپنے ساتھ آئے ہوئے فوجی اہلکاروں سے کمپلین کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔'' اس بار اس نے بھی نرمی چھوڑ کر سختی کا راستہ اختیار کیا جس پر لحہ بھر کے لیے سکوت چھا گیا اور پھر لاک کھلنے کی خفیف سی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھلا لیکن بس تھوڑا سا اور عورت نے جسم دروازے کی آڑ میں رکھتے ہوئے اپنا سر باہر نکالا۔

''پوچھیے جو پوچھنا ہے لیکن میں آپ کو پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ مجھے یہاں کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے اس لیے

کچھ بتا بھی نہیں سکتی۔ اگر آپ کچھ جاننا چاہتے ہیں تو میں آپ کو اس اسٹیٹ ایجنٹ کا پتا دے دیتی ہوں جس کے ذریعے ہم نے یہ اپارٹمنٹ کرائے پر لیا تھا۔'' انہوں نے اس عورت کی جو تصویریں اور ویڈیوز دیکھی تھیں، ان میں وہ اچھی خاصی بنی سنوری ہوئی تھی جبکہ اس وقت اس کا چہرہ بالکل سادہ تھا پھر بھی محسن نے پہچان لیا کہ یہ وہی عورت ہے۔ اس نے پھرتی سے اپنا ریوالور نکال کر اس کی نال عورت کی پیشانی پر رکھ دی اور غراتے ہوئے بولا۔

''ہم جو جاننا چاہتے ہیں، وہ معلوم کرنے کا ہنر بھی ہمیں آتا ہے اس لیے ہمیں تمہارے مشوروں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' ردِعمل میں عورت نے دروازہ دھکیل کر بند کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی یہ کوشش توقیر کی طاقت کے مقابلے میں کچھ نہیں تھی۔ اس نے اتنی زور سے دروازے کو دھکا دیا کہ دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی عورت دیوار سے جا ٹکرائی اور محسن کے ریوالور کی نال اس کی پیشانی سے ہٹ گئی۔ وہ دونوں پھرتی سے اندر داخل ہوئے۔ عورت کا سر دیوار سے ٹکرایا تھا اس لیے اسے چکر آ گیا تھا اور وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''کیا ہوا نشاط! دروازے پر کون ہے؟'' عورت کے دیوار سے ٹکرانے سے ہلکی سی دھمک پیدا ہوئی تھی، اسی پر اندر موجود آدمی متوجہ ہوا اور غنودہ سی آواز میں پوچھا۔ اس کی آواز نے یہ تعین کر دیا کہ وہ اس اپارٹمنٹ کے کس کمرے میں موجود ہے اس لیے عورت کو توقیر پر چھوڑ کر محسن خود اس کمرے کی طرف لپکا۔ دوسری طرف وہ آدمی شاید خود بھی یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ اپارٹمنٹ میں کوئی غیر معمولی صورتِ حال پیش آ چکی ہے اس لیے جب محسن کمرے کے دروازے پر پہنچا تو وہ خود بھی ہاتھ میں پسٹل لیے بستر سے نیچے کھڑا تھا۔ چند سیکنڈز تک وہ دونوں ایک دوسرے کو نشانے پر لیے گھورتے رہے پھر محسن نے سرد لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

''پسٹل نیچے پھینک دو۔ معاملہ اب ہمارے ہاتھ میں ہے۔'' اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی توقیر عورت کو نشانے پر لیے پیچھے سے نمودار ہوا۔

''تم یہاں سے جو لے جانا چاہتے ہو وہ لے جاؤ لیکن مجھے اور میری بیوی کو چھوڑ دو۔'' صورتِ حال کو سمجھتے ہوئے اس نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا لیکن پسٹل بہر حال اب بھی اس کے ہاتھ میں ہی تھا۔ زبردستی اپنے گھر میں گھسنے والے افراد کو شاید اس نے ڈاکو تصور کیا تھا اس لیے ایسی پیشکش کر رہا تھا۔

''ہم یہاں سے تمہیں اور تمہاری بیوی کو لے جانے آئے ہیں اور اس کی وضاحت کے لیے صرف ایک لفظ کافی ہے... پولیس۔'' محسن نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو گویا اسے کرنٹ لگ گیا۔

''کوئی بھی الٹی سیدھی حرکت کرنے سے پہلے سوچ لینا کہ اس بلڈنگ کے چپے چپے پر ہمارے آدمی موجود ہیں۔ اگر تم کسی طرح اس اپارٹمنٹ سے نکل بھی گئے تو بھاگ کر کہیں نہیں جا سکو گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ خاموشی سے گرفتاری دے دو۔'' محسن نے اسے خبردار کیا۔

''لیکن کیوں؟ ہم پُرامن شہری ہیں، تم ہمیں یوں بلاجواز گرفتار نہیں کر سکتے۔'' اس کی دھمکی پر آدمی تو ڈھیلا پڑ گیا تھا لیکن عورت کمال کی دیدہ دلیری دکھاتے ہوئے سینہ تان کر کھڑی ہو گئی۔ ''میں ابھی یونین کے صدر کو بلا کر پوچھتی ہوں کہ کیا ان کا سیکیورٹی سسٹم اتنا خراب ہے کہ کوئی بھی یوں دندناتا ہوا اندر آ جائے اور شریف لوگوں کو تنگ کرے۔''

''آپ کو زحمت کی ضرورت نہیں ہے محترمہ۔ یونین کے صدر کو ہم خود کال کر چکے ہیں۔ وہ پہنچتے ہی ہوں گے۔ ہم انہیں گواہ بنا کر جائیں گے کہ آپ دونوں کو کیوں اور کس جرم میں گرفتار کیا جا رہا ہے؟'' محسن نے طنزیہ لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔ اوپر آنے سے پہلے وہ اپنے ایک آدمی کو ہدایت دے کر آیا تھا کہ یونین کے صدر کو ٹھیک دس منٹ بعد اس اپارٹمنٹ میں بھیج دیا جائے۔ دس منٹ پورے ہونے والے تھے۔ وہ یقیناً پہنچ چکا ہوگا لیکن اندر اسی وقت آ سکتا تھا جب وہ باہر موجود سادہ پوشوں کو گرین سگنل دیتے۔

''جانے دو نشاط! ہمارا کھیل اب ختم ہو چکا ہے۔ مزاحمت سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' مرد نے اپنا پسٹل والا ہاتھ نیچے کر لیا اور بیوی کو سمجھانے لگا۔ شوہر کو ہتھیار ڈالتے دیکھ کر وہ بھی ڈھیلی پڑ گئی۔ اگلے چند منٹوں میں انہوں نے وہاں اپنی کارروائی مکمل کر لی۔ بلڈنگ کے یونین کے صدر کو محسن نے اختصار کے ساتھ بس اتنا بتایا کہ وہ دونوں میاں بیوی ایک اہم کیس کے سلسلے میں پولیس کو درکار ہیں اور وہ ان کے ساتھیوں کی گرفتاری تک ان کی گرفتاری کو خفیہ رکھنا چاہتا ہے۔ صدر نے وعدہ کر لیا کہ وہ ان کے ساتھ تعاون کرے گا اور اگر کوئی ان دونوں کے بارے میں پوچھتا ہوا آیا تو اسے یہی بتایا جائے گا کہ وہ دونوں کسی کو کچھ بتا کر نہیں گئے ہیں۔ وہاں سے روانہ ہوتے وقت دونوں میاں بیوی کے ساتھ ان کے ہتھیار اور موبائل فونز بھی انہوں نے اپنے قبضے میں کر لیے تھے۔ دو سادہ پوشوں کو وہیں چھوڑ دیا گیا تھا جو اپارٹمنٹ کی تفصیلی تلاشی لے کر تمام مشکوک اشیا اپنی تحویل میں لے لیتے

اور یونین کے صدر کو ان اشیا کی فہرست فراہم کردی جاتی۔

تھانے پہنچنے کے بعد انہوں نے پولیس کے مخصوص ہتھکنڈے استعمال کر کے جلد ہی دونوں ملزمان کو زبان کھولنے پر مجبور کردیا۔ ہر جائے واردات پر اپنی موجودگی کی فوٹیج دیکھ کر ان دونوں کو دانتوں پسینا آگیا اور وہ اسے محض اتفاق قرار نہیں دے سکے۔ انہوں نے اپنے اعترافی بیان میں قبول کرلیا کہ وہ اسی ڈکیت گروہ کا حصہ ہیں۔ ان سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق وہ دونوں سکھر کے رہائشی تھے اور صرف چند ماہ قبل کراچی منتقل ہوئے تھے۔ ان کی یہ منتقلی ایک سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھی۔ مرد شہباز نے بتایا کہ ترسی ہوئی زندگی سے تنگ آکر اس نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ یہ منصوبہ بنایا تھا کہ کراچی یا لاہور جا کر اس قسم کی وارداتیں کریں تاکہ عیش و عشرت کی زندگی گزار سکیں۔ شہباز خود پولیس کے محکمے میں ملازمت کرتا تھا۔ اس لیے اس کے لیے ہتھیاروں وغیرہ کی فراہمی مسئلہ ثابت نہیں ہوئی اور کراچی کے گنجان اور تجارتی شہر ہونے کے باعث وہ اس کا انتخاب کر کے اپنی بیوی کے ساتھ وہاں منتقل ہوگیا۔ شروع شروع میں اس نے اپنی بیوی کو کچھ نہیں بتایا اور اس کی لاعلمی میں اسے چند ایسی جگہوں پر لے گیا جہاں ڈاکا ڈالنے کے مواقع میسر آسکتے تھے۔ یہاں آنے سے قبل وہ اپنے شہر میں اپنے ساتھیوں کو اسلحہ استعمال کرنے کا طریقہ سکھا کر آیا تھا۔ ساتھ ہی انہیں یہ بھی ہدایت کردی تھی کہ باقاعدگی سے ورزش کرنے کے ساتھ ساتھ بھاگنے اور مختلف گاڑیوں کو چلانے کی مشق کرتے رہیں۔ ابتدا میں انہوں نے چھوٹی چھوٹی وارداتیں کی تھیں لیکن ان سے بھی انہیں اتنا مل گیا تھا کہ بیویوں کو گھر میں خوش حالی کا احساس ہونے لگا۔ نشاط نے شہباز سے اس بارے میں دریافت کیا تو اس نے کچھ ایسے ڈھب سے اسے حقیقت سے آگاہ کیا کہ وہ ماننے پر مجبور ہوگئی کہ ایک اچھی زندگی کے لیے ان کے پاس اس کے سوا کوئی حل نہیں ہے، چنانچہ خوشی خوشی شوہر کا ساتھ دینے لگی۔ یوں بھی ان کے حصے میں جو کام تھا، وہ زیادہ خطرناک نہیں تھا۔ ان کا کام مناسب جائے واردات تلاش کر کے اس کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کرنا تھا اور اب تک وہ نہایت کامیابی سے یہ کام کرتے رہے تھے۔

شہباز کے ایک دوست نبیل کی بیوی سب سے تیز نکلی۔ اس نے نہ صرف کھل کر میاں کے عمل کی حمایت کی بلکہ اسے احساس دلایا کہ گروہ میں ایک عورت کی موجودگی ان کے کام کو کتنا آسان کردے گی چنانچہ اسے ایکشن گروپ میں شامل کرلیا گیا۔ اس نے خود کو اس کا اہل بھی ثابت کر دکھایا۔ ہر واردات کے وقت وہ اپنے شوہر نبیل کے ساتھ سکھر اور کراچی کا درمیانی فاصلہ... برقع پہن کر طے کرتی تھی۔ اس سفر کے لیے اس نے ساس کو یہ کہہ کر مطمئن کردیا تھا کہ وہ کراچی کی ایک لیڈی ڈاکٹر سے اپنا علاج کروا رہی ہے تاکہ جلد ماں بن سکے۔ اس میں زیادہ جھوٹ بھی نہیں تھا۔ ہر چکر پر واردات سے پہلے واقعی وہ ایک گائنا کولوجسٹ سے اپنے علاج کے سلسلے میں ملتی تھی۔ وہ ڈاکٹر اتنی مہنگی تھی کہ اپنے شوہر کی حلال کمائی میں وہ اس کے کلینک میں داخل ہونے کا بھی تصور نہیں کرسکتی تھی لیکن اب آرام سے اپنا ٹریٹمنٹ کروا رہی تھی۔

ان دونوں جوڑوں کے علاوہ گروہ میں موجود دوسرے افراد اپنے گھر والوں کو حقیقت سے آگاہ کرنے کی ہمت نہیں کرسکے تھے اور ہر دفعہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر گھر سے نکلتے تھے۔ ان کا طریقۂ کار یہ تھا کہ جب شہباز اور اس کی بیوی نشاط انہیں کسی جگہ کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کردیتے تو وہ آپس میں مل کر یہ طے کرلیتے کہ کون سی واردات کیسے اور کب کرنی ہے۔ پھر الگ الگ ذرائع سے کراچی پہنچ جاتے۔ ان کے ہتھیار اور دوسرے ضروری آلات شہباز کے پاس ہی رہا کرتے تھے۔ وہ نہایت ہوشیاری سے واردات سے قبل انہیں یہ اشیا فراہم کردیتا اور واردات کے بعد طے شدہ طریقۂ کار کے مطابق وصول بھی کر لیتا۔ وہ لوگ اپنے کام سے فارغ ہو کر فوراً ہی کراچی چھوڑ دیتے اور عموماً سیدھے سکھر جانے کے بجائے کہیں نہ کہیں سے ہو کر واپس جاتے۔ ان کے اس محتاط رویّے نے انہیں اب تک محفوظ رکھا تھا لیکن بدقسمتی سے ان کا واسطہ محسن سے پڑ گیا اور اس نے ان سے زیادہ ذہانت سے کام لیتے ہوئے ان تک پہنچنے کی سبیل نکال لی۔ شہباز نے بتایا کہ بظاہر واردات میں شامل نہ ہونے کے باعث اسے کسی طور مشکوک نہیں قرار دیا جاسکتا تھا، اس کے باوجود وہ ہر واردات کے بعد اپنی رہائش گاہ بدل لیتا تھا۔ صرف اس بار ایسا ہوا تھا کہ نشاط کو جگہ بہت پسند آجانے کی وجہ سے انہوں نے بلڈنگ سے نکلنے کے بجائے صرف اپارٹمنٹ کی تبدیلی پر اکتفا کرلیا تھا اور شہباز کے مطابق ایک ناقص العقل عورت کی بات مان کر اس نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی تھی۔ اس کمنٹ پر اس کی تھانے میں ہی اپنی بیوی سے خاصی تُو تُو میں میں ہوگئی جسے ایک سپاہی کی للکار نے بند کروایا۔

دونوں میاں بیوی سے ان کے ساتھیوں کے نام پتے دریافت کیے گئے جو انہوں نے تھوڑی سی مزاحمت کے بعد

اگل دیے۔ دونوں ملزمان کے بیانات لینے کے بعد یہ واضح ہوگیا تھا کہ انہیں باقی افراد کی گرفتاری کے لیے سکھر جانا پڑے گا۔ محسن اس سلسلے کی ضروری کارروائیاں نمٹا کر فارغ ہوا تو گھر جانے کے ارادے سے تھانے سے نکل کھڑا ہوا۔ طے یہ پایا تھا کہ آج رات کی فلائٹ سے وہ اور توقیر سکھر کے لیے روانہ ہوجائیں گے، باقی نفری انہیں سکھر پولیس کی طرف سے فراہم کی جاتی۔ روانگی کے لیے ابھی ان کے پاس چند گھنٹے کی مہلت تھی اس لیے وہ گھر جا کر اپنا ضروری سامان پیک کرنے کے علاوہ فریش ہونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ گھر کی طرف جاتے ہوئے اس کا اس راستے پر سے بھی گزر ہوا جہاں وہ اسپتال واقع تھا جس میں نادیہ اور اس کی بیٹی ایڈمٹ تھے۔ اس نے بے اختیار ہی گاڑی کا رخ اسپتال کی طرف موڑ دیا۔ استقبالیہ سے معلوم کرنے پر پتا چلا کہ نادیہ کو اب ایک پرائیویٹ روم میں شفٹ کردیا گیا ہے۔ وہ روم نمبر معلوم کر کے لفٹ کے ذریعے دوسری منزل پر پہنچ گیا۔ قطار سے بنے کمروں میں اسے روم نمبر ستاسی تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچ کر اس نے دستک کے لیے ہاتھ بلند کیا لیکن پھر اندر سے آتی تیز آوازوں نے اس کا ہاتھ روک دیا۔

”تم نہایت ناشکری لڑکی ہو۔ تمہاری ماں بھی ایسی تھی۔ جب تک زندہ رہی، مجھے تنگ کر کے رکھا۔“ یہ حاکم صاحب تھے جو نہایت جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ محسن نے ہمیشہ اپنی ماں سے حاکم صاحب کے لیے اچھے الفاظ سنے تھے اور ان کا دعویٰ تھا کہ حاکم صاحب دنیا کے بہترین باپ ہیں لیکن جب بھی اسے ان باپ بیٹی کے درمیان مکالمہ سننے کا موقع ملا تھا، اس نے انہیں خوش گوار لہجے میں بولتے ہوئے نہیں پایا تھا۔

”تو مت زندہ رکھیں آپ مجھے۔ ہم ماں بیٹی کا گلا گھونٹ کر ہمیں بھی وہاں پہنچا دیں جہاں میری ماں ہے۔ اس طرح کم از کم مجھے سکون تو مل جائے گا۔“ نادیہ نے اپنی کمزور سی آواز میں انہیں جواب دیا اور سسک سسک کر رونے لگی۔ اس کے رونے کی آواز سن کر باہر کھڑے محسن کے دل کو کچھ ہونے لگا لیکن وہ مجبور تھا۔ اس کا نادیہ سے ایسا کوئی رشتہ نہیں تھا کہ وہ اسے خاموش کروانے کے لیے کچھ کر پاتا۔

”اس طرح رو کر خود کو زیادہ مظلوم ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کبھی بھی تمہیں اپنے ہاتھ سے نہیں مار سکتا۔ تم تو میری جان ہو اور اپنی جان کون لیتا ہے؟“ حاکم صاحب کا لہجہ بولتے بولتے بتدریج نرم اور پھر شیریں ہوتا چلا گیا۔ محسن حیران ہوا کہ کیا عجیب آدمی ہے۔ ایک پل میں سخت تو دوسرے میں بے حد نرم۔ شاید ثروت بیگم نے ٹھیک کہا تھا۔ کسی مرد کے لیے اتنا زیادہ دباؤ برداشت کرنا ممکن نہیں ہوتا اور وہ جلد جھنجلا جاتا ہے۔ حاکم صاحب کے رویّے پر اس سے زیادہ غور کرنے کے بجائے اس نے دروازے پر دستک دے دی۔

”کون؟“ اندر سے حاکم صاحب نے دریافت کیا۔

”جی میں محسن ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔

”السلام علیکم انکل! میں یہاں سے گزر رہا تھا تو سوچا خیریت پوچھتا چلوں۔“ اس نے کچھ جھینپے ہوئے لہجے میں اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔

”بہت بہت شکریہ بیٹا! میں تو ویسے بھی تمہارا اور تمہاری والدہ کا شکر گزار ہوں کہ تم لوگوں نے اتنے نازک وقت میں ساتھ دیا ورنہ میرے دفتر سے آنے تک نہ جانے کیا ہوجاتا۔“ انہوں نے نہایت حلیم لہجے میں اسے جواب دیا۔ البتہ نادیہ آنکھیں موندے یوں بستر پر لیٹی ہوئی تھی جیسے گہری نیند سو رہی ہو۔ اس کی اس ادا پر محسن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی، البتہ مخاطب وہ حاکم صاحب سے رہا۔

”اس میں شکریے کی کیا بات ہے انکل... پڑوسی ہونے کے ناتے ہم لوگوں کا یہ اخلاقی فرض بنتا تھا کہ مشکل وقت میں کام آتے۔“

”پھر بھی بیٹا، میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہاری جاب کس نوعیت کی ہے۔ ایسے میں اگر تم نے ساتھ دیا تو بہت بڑی بات ہے۔“ ان کی عاجزی و انکساری قائم رہی لیکن اس کے ذہن میں ایک چونکا دینے والا خیال آیا۔

”انکل! اگر آپ چاہیں تو میں اپنی جاب کا فائدہ اٹھا کر آپ کے لیے کچھ اور بھی کرسکتا ہوں۔“

”کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔“ وہ حیران ہوئے۔

”میں اپنے ایک کام کے سلسلے میں سکھر جا رہا ہوں۔ آپ کہیں تو وہاں میں آپ کے سابقہ داماد سے بھی نمٹ لیتا ہوں۔ میرے خیال میں تو ایسے شخص کو سبق سکھانا بہت ضروری ہے تاکہ وہ نادیہ کے بعد کسی اور لڑکی کی زندگی خراب نہ کرسکے۔“ اپنی اس پیشکش کے جواب میں اس نے سونے کی اداکاری کرنے والی نادیہ اور حاکم صاحب دونوں کے چہروں پر تناؤ دیکھا پھر حاکم صاحب بولے۔

”تمہاری پیشکش کا شکریہ بیٹا... لیکن ہمیں اب اس شخص میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔ ہم نے یہ معاملہ اوپر والے

پر چھوڑ دیا ہے۔ اب وہی اس شخص کا فیصلہ کرے گا۔"

"پھر بھی انکل! ایسے آدمی کو ایک بار سبق تو سکھانا چاہیے۔" اس نے اصرار کیا۔

"میں نے کہا نا کہ ہم ایسا کچھ نہیں چاہتے۔" ان کا لہجہ یک دم ہی سخت ہو گیا جس پر محسن کو ذرا سبکی کا احساس ہوا اور وہ فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"اچھا تو پھر مجھے اجازت دیجیے۔ مجھے آج رات ہی سکھر کے لیے روانہ ہونا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ تیاریاں کرنی ہیں اگر آپ کو مجھ سے کوئی کام ہو تو بلا تکلف بتا سکتے ہیں۔" سپاٹ سے لہجے میں ان سے کہتے ہوئے اس نے اجازت چاہی۔ حاکم صاحب نے کوئی جواب دینے کے بجائے مصافحہ کر کے اسے وہاں سے رخصت کر دیا۔ وہ دل میں عجیب بے کیفی سی محسوس کرتا ہوا وہاں سے گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

وہ اور توقیر سکھر پہنچے تو سکھر پولیس نے ان کا کھلے دل سے استقبال کیا اور انہوں نے آپس کی مشاورت سے ملزمان کی گرفتاری کے لیے منصوبہ تیار کر لیا۔ شہباز سے حاصل شدہ معلومات وہ پہلے ہی سکھر پولیس تک منتقل کر چکا تھا اور ان معلومات کی روشنی میں انہوں نے ان دونوں کے پہنچنے سے پہلے ہی اس بات کی تصدیق کر لی تھی کہ تمام ملزمان اپنے اپنے ٹھکانوں پر موجود ہیں۔ طے یہ پایا کہ مختلف ٹیمیں بنا کر بیک وقت تمام ملزمان کے ٹھکانوں پر ریڈ کیا جائے گا تا کہ اس بات کا احتمال نہ رہے کہ خبر ہو جانے پر کوئی ملزم فرار ہونے میں کامیاب ہو جائے۔ جو ٹیمیں تشکیل دی گئیں، ان میں سے ایک ایک کی قیادت محسن اور توقیر کر رہے تھے جبکہ باقی دو ٹیمیں مقامی افسران کی قیادت میں ریڈ کرتیں۔ محسن نے اپنے لیے اس ٹیم کا انتخاب کیا تھا جو نبیل نامی ملزم کے گھر پر ریڈ کرتی کیونکہ وہاں ملزم کے ساتھ ساتھ اس کی بیوی بھی اس کی شریکِ جرم تھی اور ہر واردات میں اس کا عملی ساتھ دیتی رہی تھی۔ ان دونوں میاں بیوی کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ کچھ ماہ قبل ہی انہوں نے اپنی رہائش تبدیل کی تھی اور پرانا سکھر میں موجود والدین کے گھر کو چھوڑ کر نئے مکان میں شفٹ ہو گئے تھے۔ سارے خاندان میں نبیل کی واہ واہ ہوتی تھی کہ اس نے ہمت سے کام لے کر گئی بندھی نوکری چھوڑی اور اپنا ذاتی گارمنٹس کا کاروبار شروع کر کے اس مقام تک پہنچ گیا کہ اپنا ذاتی گھر لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کامیابی کے پیچھے جو راز تھا، اس کا بھانڈا آج پولیس کے ریڈ کے بعد پھوٹ جانا تھا۔

پولیس پارٹی کے ساتھ ریڈ کے لیے نبیل کے گھر تک پہنچنے پر پہلا جھٹکا خود محسن کو لگا۔ نبیل کے گھر کے دروازے پر حاکم مراد علی کے نام کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ بالکل ایسی ہی نیم پلیٹ کراچی میں اس کے پڑوس کے مکان پر بھی لگی ہوئی تھی۔ بہرحال، یہ اس اتفاق کا کھوج لگانے کا موقع نہیں تھا چنانچہ اس نے اپنی کارروائی شروع کر دی۔ وہ لوگ اپنے ساتھ لیڈی پولیس لے کر آئے تھے۔ نبیل تو آسانی سے ان کے قابو میں آ گیا لیکن نبیل کی بیوی آمنہ نے گرفتاری دینے میں سخت مزاحمت کی اور لیڈی پولیس انسپکٹر سے ہاتھا پائی کرنے لگی۔ پولیس والی کیونکر رعایت کرتی۔ اس نے بھی آمنہ کو خوب ٹھڈے مارے اور بالوں سے پکڑ کر اسے باہر کی طرف کھینچنے لگی۔ اس سارے ہنگامے نے محسن کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی اور وہ صورتِ حال جاننے کے لیے اندرونی کمرے کی طرف بڑھا۔ یہی وہ وقت تھا جب آمنہ نے نہ جانے کیسے ایک قریبی دراز کھول کر اس میں سے پستل نکال لیا۔ لیڈی پولیس انسپکٹر کو لگا کہ وہ اس پر فائر کرنا چاہتی ہے چنانچہ اس کے ہاتھ کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔ جھٹکے کی وجہ سے اس کے ہاتھ سے پستل تو نہیں نکلا لیکن گولی چل گئی اور اس گولی کی زد میں اسی وقت کمرے کے دروازے پر پہنچنے والا محسن آ گیا۔ لمحوں میں اس کے دائیں بازو کی آستین خون میں تر ہو گئی۔ گولی چلنے کی آواز سن کر دوسرے اہلکار بھی اس طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے آمنہ کو قابو میں کر کے اس کے قبضے سے پستل چھیننے کے علاوہ محسن کو اسپتال پہنچانے کا کام تیزی سے نمٹایا۔ گولی نے محض گوشت کو پھاڑا تھا، اس کے باوجود اسے اسپتال میں داخل کر لیا گیا۔ باقی کی خبریں اسے اسپتال میں ہی ملیں۔ نبیل اور آمنہ کے علاوہ باقی ملزمان کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا اور ان کے قبضے سے لوٹے ہوئے مال کی بڑی مقدار بھی نکلوالی گئی تھی۔ باقی جو انہوں نے کھا پی لیا تھا، اس کی تفصیلات بھی حاصل ہو گئی تھیں۔

نبیل اور آمنہ نے اپنے حصے میں آنے والے مال سے ایک طرف گارمنٹس کا کاروبار شروع کر رکھا تھا تو دوسری طرف رہائش کے لیے علیحدہ گھر خرید لیا تھا تا کہ گھر والوں کو ان کی سرگرمیوں کی خبر نہ ہو سکے۔ انہوں نے یہ گھر کچھ عرصہ قبل کراچی شفٹ ہونے والے حاکم مراد علی سے خریدا تھا لیکن آمنہ کے کئی بار دھیان دلوانے کے باوجود نبیل نیم پلیٹ کی تبدیلی کے معمولی سے کام کو ٹالتا آ رہا تھا۔ اس بیان نے جہاں محسن کی الجھن دور کی، وہیں ایک بار پھر اس کے دل میں یہ خیال جاگ اٹھا کہ نادیہ کے سابق شوہر کا اتا پتا معلوم کر کے اسے ایک معصوم لڑکی کی زندگی تباہ کرنے کی سزا دی جائے۔ بہرحال، اپنے اس پروگرام پر وہ اس وقت عمل کر سکتا تھا جب اسپتال سے نجات ملتی۔ ابھی تو وہ اس کیس کو حل کرنے پر اپنے حصے میں آنے والی عزت و شہرت کو انجوائے کر رہا تھا۔ کئی چینلز کے نمائندوں نے اس سے اسپتال میں آ کر ہی ملاقات کی تھی اور اپنے اپنے چینل پر فوٹیج بھی چلائی تھی جس میں ایک بہادر افسر کو اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران اپنی جان خطرے میں ڈالنے پر بھرپور الفاظ میں سراہا گیا تھا۔ محکمے کے اعلیٰ افسران نے بھی کھلے الفاظ میں محسن کی ذہانت اور اس کی ٹیم کی محنت کو سراہا تھا۔

محسن کے حصے میں زیادہ تعریف و توصیف اس لیے آئی تھی کہ اس کیس کی اصل گتھی سلجھانے کا سہرا اسی کے سر تھا۔ اگر وہ اپنی ذہانت کے بل پر شہباز اور نشاط کو پھانسنے کا کارنامہ سرانجام نہ دیتا تو شاید اب تک یہ کیس کھٹائی میں ہی پڑا رہتا اور یہ گروہ اپنی لوٹ مار جاری رکھتا۔ محسن کے زخمی ہونے کی خبر سن کر اس کے گھر والے بے حد بے چین ہو گئے تھے۔ ثروت بیگم تو فون پر اس سے بات کرتے ہوئے بری طرح رو پڑی تھیں۔ اس نے بڑی مشکل سے انہیں یقین دلایا تھا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے اور زخم زیادہ گہرا نہیں ہے۔ حسن فوری طور پر اس کے پاس سکھر آنا چاہتا تھا لیکن اس نے اسے روک دیا کہ وہ وہیں رہ کر اپنی تعلیم پر توجہ دے اور امی ابو کا خیال رکھے۔ خصوصاً اس نے اسے امی کا دھیان رکھنے کی تاکید کی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس کی لاکھ تسلیوں کے باوجود بھی وہ اپنی جگہ پریشان ہی رہیں گی۔ اس موقع پر حاکم صاحب نے بھی اس کے موبائل پر کال کر کے اس کی مزاج پرسی کی۔ لاشعوری طور پر وہ منتظر رہا کہ شاید نادیہ بھی اس کی عیادت کے لیے فون کرے لیکن اس کا انتظار محض انتظار ہی رہا۔

ادھر نبیل کی بیوی آمنہ پر پولیس اہلکار پر ہاتھ اٹھانے اور ایک پولیس افسر کو گولی کا نشانہ بنانے پر سخت مقدمات قائم کیے گئے تھے۔ آمنہ نے اپنے بیان میں بتایا تھا کہ وہ کسی پولیس والے پر گولی چلانے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ اس نے دراز سے پستل خودکشی کی نیت سے نکالا تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ زندہ گرفتار ہونے کی صورت میں میکے اور سسرال سے تعلق رکھنے والے رشتے داروں کے سامنے شرمندہ ہو۔ محسن کو اس کے اس بیان میں صداقت محسوس ہوئی تھی کیونکہ اس بات کا تو وہ خود گواہ تھا کہ آمنہ نے جان بوجھ کر اسے نشانہ نہیں بنایا تھا بلکہ لیڈی پولیس انسپکٹر سے ہاتھا پائی کے

دوران خود بخود ہی گولی چل گئی تھی۔ بہرحال، یہ سب حقائق تو وہ اس وقت بیان کرتا جب مقدمے کی کارروائی کے دوران اسے عدالت میں طلب کیا جاتا۔ فی الحال تو وہ اسپتال میں پھنسا ہوا تھا۔

اپنے ساتھ آنے والے توقیر کو اس نے زبردستی کراچی واپس بھیج دیا تھا کیونکہ اس کی عدم موجودگی میں اسی کو اس کیس کے باقی معاملات نمٹانے تھے۔ یہاں اس کا ہم منصب سہیل چانڈیو اس کا بھرپور خیال رکھ رہا تھا۔ دو دن بعد اسے اسپتال سے چھٹی ملی تو سہیل چانڈیو اس کے لاکھ عذر کے باوجود اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گیا۔ سہیل کی مہمان نوازی سے لطف اٹھاتے محسن کے ذہن میں ایک بار پھر نادیہ سے ہمدردی کا کیڑا کلبلایا اور ایک دن وہ موقع پا کر اس محلے میں جا نکلا جہاں حاکم صاحب اور نادیہ رہتے تھے۔ وہاں پہنچ کر اس نے حاکم صاحب کے قریب ترین پڑوسی کے گھر کی بیل بجائی اور باہر آنے والے صاحب سے اپنا تعارف ایک پولیس افسر کی حیثیت سے کرواتے ہوئے کچھ دیر کے لیے گھر میں بیٹھ کر بات چیت کرنے کی درخواست کی۔ وہ صاحب اگرچہ حال ہی میں پڑوس میں ہونے والی پولیس کارروائی کے نتیجے میں کچھ گھبرائے ہوئے تھے لیکن اس کی فرمائش رد کرنے کی جرأت نہیں کر سکے۔

"آپ میری آمد سے پریشان نہ ہوں اور نہ ہی کسی قسم کی زحمت کریں۔ میں بے شک پولیس آفیسر ہوں لیکن اس وقت ذاتی حیثیت میں آپ سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں۔" ان کے سادہ سے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر نرمی سے کہتے ہوئے اس نے ان صاحب کی گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ دور کرنے کی کوشش کی کیونکہ وہ بے چارے اس بری طرح گڑبڑائے تھے کہ اسے ڈرائنگ روم کی طرف لاتے ہوئے بیوی کو بیک وقت چائے اور شربت تیار کرنے کا حکم دے آئے تھے۔

"آپ جو پوچھنا چاہیں ضرور پوچھیں سر... لیکن اگر آپ ہمارے پڑوسیوں کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں تو میں صاف بتا دوں کہ ہمیں ان دونوں ڈاکو میاں بیوی کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے۔ وہ لوگ چند مہینے پہلے ہی ہمارے محلے میں آئے تھے اور محلے والوں سے ان کی زیادہ راہ و رسم نہیں تھی۔ دونوں ہی کچھ مغرور سے تھے۔" وہ اس کی طرف سے واضح سوال کیے بغیر خود ہی بولنا شروع ہو گیا۔

"دیکھیں صاحب، مجھے آپ سے آپ کے پڑوسیوں کے بارے میں تو بے شک بات کرنی ہے لیکن ان نئے پڑوسی

کے بارے میں نہیں بلکہ اس سے پہلے یہاں رہنے والے حاکم صاحب اور ان کی فیملی کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔" بولنے کا موقع ملتے ہی اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔

"حاکم صاحب کی بات کررہے ہیں آپ؟" اس نے استفسار کیا جس کا محسن کی طرف سے اثبات میں جواب پاکر بولنے لگا۔ "حاکم صاحب تو بڑے بھلے مانس تھے۔ پانچ سال اس محلے میں رہے لیکن کسی کو کوئی تکلیف نہیں دی۔ محلے کے مردوں سے ان کی آتے جاتے سلام دعا رہتی تھی اور وہ محلے کی بہتری کے لیے مشترکہ طور پر اٹھائے جانے والے اقدامات میں بھی بھرپور حصہ لیتے تھے۔ لیکن بیوی اور بیٹی کے بارے میں ذرا سخت مزاج کے تھے۔ انہیں اپنے گھر کی خواتین کا محلے میں میل جول پسند نہیں تھا۔ بیوی کے انتقال کے بعد محلے والوں نے ان کی بیٹی کی تنہائی بانٹنے کی کوشش کی لیکن ان کی طرف سے اس اقدام کو زیادہ پسند نہیں کیا گیا تو محلے کی خواتین بھی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ گئیں۔ بعد میں جانے کیا ہوا کہ انہوں نے اچانک ہی یہاں سے شفٹ ہونے کا فیصلہ کرلیا اور محلہ چھوڑ کر چلے گئے۔ آپ بتائیں کہ اب وہ کہاں ہیں؟ کہیں ان کے ساتھ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی؟" اس شخص کے لہجے میں تجسس تھا۔

"گڑبڑ تو جو ہونا تھی، یہیں ہو گئی تھی۔ بے چارے اپنی اکلوتی بیٹی کی وجہ سے بہت آزردہ رہتے ہیں۔ اتنی کم عمری میں اس کا گھر اجڑنے کا غم ان کے لیے بہت بڑا ہے۔"

"کیا یہاں سے جاکر انہوں نے بیٹی کی کہیں شادی کر دی تھی؟" محسن کا جواب سن کر اس نے سوال کیا۔

"شادی تو یہیں ہوئی تھی بلکہ طلاق بھی... اس کی طلاق کے بعد ہی تو وہ یہاں سے شفٹ ہوئے تھے۔" اس شخص کے سوال نے محسن کو حیران کردیا۔

"ارے نہیں صاحب! اس بچی کی شادی کہاں ہوئی تھی۔ وہ تو باپ کے ساتھ اسی گھر میں رہتی تھی۔" ہاتھ سے پڑوس کے گھر کی طرف اشارہ کر کے بولتے ہوئے انہوں نے محسن کو حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اسی وقت ڈرائنگ روم کے دروازے پر دستک ہوئی اور کسی خاتون نے آواز دے کر شربت کی ٹرے تھام لینے کو کہا۔

"اندر ہی آجاؤ نیک بخت۔ اپنے بیٹے کی عمر کا ہی بچہ ہے۔ اس سے کیا پردہ کرنا۔" ان صاحب نے بیوی کو اندر ہی بلا لیا تو وہ ٹرے میز پر رکھ کر خود ایک صوفے پر براجمان ہو گئیں۔

"تمہیں کچھ یاد پڑتا ہے کہ یہ جو اپنے پڑوس میں حاکم صاحب رہتے تھے، ان کی بیٹی کی کہیں شادی وادی کا سلسلہ بنا تھا یا نہیں؟" محسن کو گلاس تھماتے ہوئے ان صاحب نے اپنی بیوی سے استفسار کیا۔

"یاد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس بچی کی کہیں نسبت طے نہیں ہوئی تھی۔ میں تو خود اپنے بابر کا رشتہ اس کے ساتھ کرنا چاہتی تھی اور حاکم صاحب کے سامنے ذکر بھی کیا تھا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ اتنی جلدی اپنی بیٹی کی شادی نہیں کرنا چاہتے اور ان کی خواہش ہے کہ ان کی بیٹی مزید چند سال ان کے ساتھ ہی گزارے۔ اس پر میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی کہ مناسب وقت پر آنے والے لڑکیوں کے رشتے ٹال دینا کوئی دانش مندی نہیں ہے لیکن حاکم صاحب کا تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ اپنے گھریلو معاملات میں کسی کی دخل اندازی کہاں قبول کرتے تھے۔ مجھے بھی ٹکا سا جواب دے دیا تھا۔" خاتون نے منہ بناتے ہوئے ان کی بات کا جواب دیا جو محسن کے لیے حیرت انگیز تھا۔ حاکم صاحب نے خود ثروت بیگم کو نادیہ کے حالات سے آگاہ کیا تھا اور چند روز قبل ہی نادیہ ایک بیٹی کی ماں بنی تھی۔ بغیر شادی کے بیٹی کی پیدائش اپنی جگہ خود ایک سوال تھی۔

"آپ کے پڑوسی حاکم صاحب کی بیٹی کا نام کیا تھا؟" اسے لگا کہ وہ کسی غلط جگہ پہنچ گیا ہے، اس لیے یہ اہم سوال کیا۔

"نادیہ... نادیہ نام تھا اس بچی کا۔ بڑی ہی خوب صورت اور پیاری بچی تھی۔" خاتون نے اس کے سوال کا جواب دیا تو اس کے لیے منہ میں لیا شربت کا گھونٹ حلق سے نیچے اتارنا مشکل ہو گیا۔

"کیا ہوا بیٹا! تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟" خاتون اس کی افسری کو خاطر میں لائے بغیر فوراً اسے اپنا بیٹا بنا بیٹھیں۔

"کچھ نہیں آنٹی! اصل میں مجھے جن حاکم صاحب کی تلاش ہے ان کی بیٹی کا نام نادیہ نہیں ہے۔ میں یقیناً غلط جگہ آ گیا ہوں۔ آپ لوگوں سے معذرت چاہتا ہوں کہ آپ کو زحمت دی اور آپ کا اتنا وقت لیا۔" وہ یک دم ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس گھر سے نکلتے ہوئے اس کے سر میں دھماکے ہو رہے تھے اور وہ قطعی نہیں سن سکا تھا کہ وہ دونوں میاں بیوی اس سے کیا کہہ رہے ہیں۔

☆☆☆

محسن کراچی واپس آ گیا تھا لیکن آتے ہوئے اپنا سکھ

چین لٹا آیا تھا۔ محکمے کی طرف سے ملنے والی تعریفی سند، میڈیا کی واہ واہ اور عزیزوں کی ناز برداری کچھ بھی اس کے دل پر چھائی اداسی کی دھند کو چھٹانے میں مددگار ثابت نہیں ہوا تھا۔ لاشعوری طور پر اس کے دل نے نادیہ کے لیے پسندیدگی کے مراحل بہت تیزی سے طے کیے تھے لیکن وہ سکھر سے اس کے متعلق جو معلومات حاصل کر کے آیا تھا ان کی روشنی میں بھولی بھولی اور مظلوم نظر آنے والی نادیہ کا کوئی اور چہرہ ہی سامنے آیا تھا اور وہ سمجھ رہا تھا کہ حاکم صاحب نے نادیہ کی ناکام شادی کی جو داستان سنائی تھی، وہ محض اپنی عزت بچانے کی ایک تدبیر تھی۔ ان کی کنواری بیٹی ماں بننے جارہی تھی۔ وہ یہ حقیقت کس منہ سے لوگوں کو بتاتے؟ بے چارے اپنی عزت بچانے کے لیے چپ چپاتے نقل مکانی کر گئے تھے۔ اسے اب یہ بات بھی سمجھ آنے لگی تھی کہ حاکم صاحب کا رویّہ نادیہ کے ساتھ تنہائی میں درشت کیوں ہو جاتا تھا۔ اکلوتی اولاد جسے یقیناً انہوں نے بڑی چاہت سے ناز اٹھا کر پالا تھا، ان کی عزت کو بٹا لگا بیٹھی تھی۔ انہوں نے ہمت سے کام لے کر اس بدنامی سے بچنے کا کچھ نہ کچھ انتظام تو کرلیا تھا لیکن ظاہر ہے وہ جس کوفت میں مبتلا تھے، اس کا تقاضا یہی تھا کہ بول بال کر اپنا غصہ نکال لیتے۔ ان بے چاروں کی مصیبت اس لیے بھی بڑی تھی کہ مشکل کی اس گھڑی میں کوئی ان کا غم بانٹنے والا بھی نہیں تھا۔ شریکِ حیات زندہ ہوتی تو وہ کم از کم اسی سے کچھ کہہ سن لیتے۔ یہ دکھ ایسا تو تھا نہیں کہ ہر کسی سے بانٹا جا سکتا۔ یقیناً بے چارے اندر ہی اندر جلتے کڑھتے رہتے ہوں گے۔

اسے اپنے دل میں حاکم صاحب سے گہری ہمدردی محسوس ہونے لگی جبکہ نادیہ جو اچانک ہی دل کو بہت اچھی لگنے لگی تھی، سخت زہر معلوم ہونے لگی۔ اس کی بھولی صورت دیکھ کر بھلا کون اندازہ کرسکتا تھا کہ وہ کیسے سیاہ کرتوتوں کی مالک ہے۔ پابندیوں کے باوجود باپ کی عزت نیلام کر بیٹھی تھی۔ وہ جتنا اس کے متعلق سوچتا، اتنا ہی غصہ آنے لگتا۔ ساتھ ہی خود پر بھی حیرت ہونے لگتی کہ وہ پولیس والا ہو کر کیسے اس کی صورت سے دھوکا کھا گیا ورنہ اس کے پیشے نے تو اس کی آنکھوں میں ایسی ایکسرے مشین فٹ کردی تھی کہ وہ اندر تک بندے کو کھنگال کر اس کی اصلیت جان لیتا تھا۔ غصہ، افسوس، جھنجلاہٹ سب نے مل ملا کر اسے خاصا چڑچڑا بنا دیا تھا۔ محکمے کی طرف سے اسے مکمل صحت یابی تک رخصت دے دی گئی تھی اور فرصت کے یہ دن رات اسے مزید کاٹ رہے تھے، حالانکہ گھر والے اپنے طور پر اس کی مکمل ناز برداری کررہے تھے۔ گھر واپس آنے کے بعد اس کی جان کا صدقہ دیا گیا تھا اور ماں باپ نے شکرانے کے نفل پڑھے تھے۔ ثروت بیگم کا تو بس نہیں چلتا تھا کہ اس کے لیے کیا کچھ کر ڈالیں۔ دن بھر اس کے لیے طرح طرح کی مقوی غذائیں اور جوسز تیار کر کے کھلانے پلانے میں جتی رہتیں یا آتے جاتے بلائیں لیتی رہتیں۔ اپنی ان کوششوں کے باوجود انہیں شک تھا کہ ان کے لاڈلے کی پہلی جیسی صحت واپس نہیں لوٹی ہے اور چہرہ کمزوری سے زرد ہو رہا ہے۔ شوہر اور چھوٹا بیٹا حسن ان کی ایسی باتوں پر مذاق اڑاتے۔ حسن تو یہاں تک بھی کہہ دیتا کہ امی کے سگے بیٹے تو صرف محسن بھائی لگتے ہیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ دونوں باپ بیٹا بھی محسن کا خوب خیال رکھ رہے تھے۔ کبھی گھر میں نہ ٹکنے والے حسن کی کوشش ہوتی تھی کہ بھائی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزار سکے تاکہ اسے بوریت کا احساس نہ ہو لیکن محسن کا قنوطی پن تھا کہ کسی طور کم ہونے پر نہیں آ رہا تھا۔ شاید یہ صدمہ تھا کہ پہلی بار جس لڑکی پر دل آیا، وہ ایسا فریبِ نظر ثابت ہوئی کہ وہ اس کی اصلیت کو سمجھ نہیں سکا۔ اگر اتفاقاً سکھر جانا نہ ہوتا تو شاید کچھ عرصے بعد وہ اسے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کرلیتا اور ساری عمر دھوکا کھاتا رہتا۔ وہ دھوکا کھانے سے بچ گیا تھا لیکن دل پر ایسی چوٹ لگی تھی کہ سنبھلنا مشکل تھا۔ اپنی پسند پر افسوس کرتا ہوا سارا دن بستر پر گزار دیتا تھا۔ اس وقت بھی آنکھیں موندے لیٹا تھا کہ ثروت بیگم ایپل جوس کا گلاس لیے چلی آئیں۔

"لو بیٹا! یہ جوس پی لو، میں تب تک ذرا پڑوس کا چکر لگا کر آجاتی ہوں۔" جوس سے بھرا گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے انہوں نے اس سے کہا تو وہ بلاوجہ ہی چڑ گیا۔

"کیوں؟ کیا ضرورت پڑی ہے آپ کو پڑوس میں جانے کی؟" وہ ماں سے الجھ پڑا۔

"کیا ہو گیا ہے بیٹا! تمہیں معلوم تو ہے کہ نادیہ کے آپریشن سے بیٹی ہوئی ہے۔ ایسی حالت میں گھر میں اس کا کوئی خیال رکھنے والا تو ہے نہیں۔ میں ہی دن میں ایک آدھ بار چکر لگا کر اس کی خیریت معلوم کرلیتی ہوں اور چھوٹا موٹا کوئی کام نمٹا دیتی ہوں۔ بے چاری کم عمری نا تجربہ کار بچی ہے، اس پر سے اولاد بھی اتنے بڑے آپریشن کے بعد ملی ہے۔ کسی کو تو اس کا خیال رکھنا ہی ہوگا ورنہ بے چاری کے ٹانکے خراب ہو جائیں گے۔ اس کی ماں زندہ ہوتی تو بستر سے پیر بھی نیچے نہ رکھنے دیتی لیکن بدنصیب ہے کہ ساری سختیاں سہنے کو تنہا رہ گئی ہے۔ باپ بھلا کیا کیا دیکھ سکتا ہے۔

اسے اپنی نوکری بھی تو کرنی ہے۔'' اسے سمجھانے کے لیے وہ بولنے پر آئیں تو بولتی ہی چلی گئیں جس پر وہ کچھ اور جھنجلاہٹ میں مبتلا ہو گیا اور اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''جن کے مسائل ہیں وہ خود ان کا حل نکال لیں گے۔ آپ کو خوامخواہ زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی آپ میرے پاس بیٹھیں اور مجھ سے باتیں کریں۔''

''ایسے کیوں بول رہے ہو بیٹا؟ میں پڑوسی ہو کر اس کا خیال نہیں رکھوں گی تو اور کون خیال کرے گا؟ پڑوسیوں کے بڑے حقوق ہوتے ہیں اور اس وقت تو نادیہ نے خود فون کر کے مجھے بلایا ہے۔ تم مجھے اس کی بات سن کر تو آنے دو۔'' وہ پریشان سی کسی چھوٹے بچے کی طرح اسے سمجھانے لگیں۔

''میں نے کہہ دیا ہے نا کہ آپ میرے پاس بیٹھیں۔ اگر آپ نہیں بیٹھیں تو میں یہ جوس بھی نہیں پیوں گا۔'' وہ ضدی بچوں کی طرح ہٹیلے پن سے بولا تو ناچار ثروت بیگم کو اس کے پاس بیٹھنا پڑا۔ ان کے بیٹھ جانے پر اسے کچھ تسلی ہوئی تو جوس کا گلاس ہاتھ میں تھاما لیکن آدھا گلاس سے زیادہ نہیں پی سکا۔ ذہن میں یہ کھد بد جو شروع ہو گئی تھی کہ نادیہ نے نہ جانے کس ضرورت کے تحت امی کو بلایا تھا۔

''پورا گلاس تو خالی کرو۔'' اسے گلاس واپس میز پر رکھتے دیکھ کر انہوں نے ٹوکا۔

''نہیں بس اور پینے کا دل نہیں چاہ رہا۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔'' وہ انکار کرنے کے بعد فوراً ہی آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا تو وہ مزید اصرار نہیں کر سکیں اور دھیرے دھیرے اس کا سر دبانے لگیں۔ ماں کا یوں سر دبانا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی انگلیوں سے سکون کی لہریں سی نکل کر جسم میں سرایت کر رہی ہوں لیکن دوسری طرف یہ خیال کانٹے کی طرح ذہن میں چبھا ہوا تھا کہ جانے نادیہ نے کس ضرورت کے تحت امی کو بلایا ہے۔ کہیں دیر سے پہنچنے کی صورت میں کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔ وہ ایک اکیلی جان نہیں ہے، اس کے ساتھ ایک نومولود گڑیا سی بچی بھی ہے۔ کیا معلوم اس بچی کا ہی کوئی مسئلہ ہو؟ یہ سارے خیالات اتنی تیزی سے اس کے ذہن میں آئے تو سکون کا وہ احساس اڑن چھو ہو گیا جو ماں کے سر دبانے سے وہ اپنے اندر محسوس کر رہا تھا۔

''جائیں امی! آپ چلی جائیں۔ میں اب سوؤں گا۔'' بے چینی اتنی بڑھی کہ آخرکار اسے امی سے کہنا ہی پڑا لیکن خود اندر ہی اندر اپنے آپ پر خوب تلملایا کہ کیسے نادیہ کی حقیقت جان لینے کے باوجود دل کو اس کی فکر سے آزاد کرنے میں ناکام ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسی کو سوچتا رہتا ہے۔

اس کی اس بے بسی اور تلملاہٹ پر دل اس کے سینے میں رہ کر بھی اس سے دور کھڑا خوب قہقہے لگا کر ہنس رہا تھا کہ بچو! محبت اتنی آسانی سے آزاد کر دینے والے جال کا نام نہیں ہے۔ مجھے کسی کی محبت میں مبتلا کیا ہے تو اب مزہ بھی چکھو۔

☆☆☆

رات بے پناہ تاریک تھی حالانکہ آج چاند کی چودھویں تھیں اور اصولاً ہر سو چاندی بکھری ہونی چاہیے تھی لیکن کبھی کبھی انہونی بھی ہو جاتی ہے۔ شہر میں دوپہر تک بادلوں کا نام و نشان بھی نہیں تھا اور حقیقتاً سورج قہر برسا رہا تھا لیکن سہ پہر کے بعد اچانک ہی بادلوں نے آسمان پر ڈیرا جمانا شروع کیا اور سورج ڈوبتے ڈوبتے کچھ اس طرح سے چھا گئے کہ بے چارے چودھویں کے چاند کو اپنا مکھڑا دکھانے کا موقع نہیں ملا۔ ابتدا ہلکی ہلکی بوندا باندی سے ہوئی پھر پھوار پڑی اور آخرکار بادل جم کر برسنے لگے۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے چند گھنٹے قبل موسم کے ان بدلتے تیوروں کو بے نیازی سے دیکھتے محسن کو یہ خیال چھو کر بھی نہیں گزرا تھا کہ اس برستے موسم میں وہ گاڑی لیے شہر کی سڑکوں پر آوارہ گردی کر رہا ہو گا۔ وہ بھی اس عالم میں کہ اس کی کار کی ڈکی میں ایک عدد لاش موجود تھی۔ ہاں... اس وقت وہ سچ مچ ایک لاش کے ساتھ سفر کر رہا تھا اور اسے کسی جگہ ٹھکانے لگانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ قانون کے محافظ سے اس انتہائی غیر قانونی حرکت کی ہرگز بھی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ خصوصاً محسن تو ایک نہایت قانون پسند انسان تھا جس نے پولیس کی ملازمت اختیار ہی اس وجہ سے کی تھی کہ اگر اس جیسے اصول پسند اور سلجھی ہوئی سوچ رکھنے والے لوگ پولیس کے محکمے میں نہیں آئیں گے تو یہ محکمہ روز بروز گندگی کا ڈھیر بنتا جائے گا۔

اس فیلڈ کا انتخاب کرنے پر اسے ابتدا میں ثروت بیگم کی مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا کیونکہ فطری طور پر وہ اس بات کو پسند نہیں کرتی تھیں کہ ان کا بیٹا ایک ایسے محکمے کا حصہ بنے جس سے وابستہ افراد کو لوگ ہمیشہ گالیاں ہی دیتے رہتے ہیں۔ محسن نے بڑی جان ماری کے بعد انہیں اپنی اس ملازمت کے لیے راضی کیا تھا اور اس وقت وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ایسی کوئی غیر قانونی حرکت کرے گا جس کا اس وقت مرتکب ہونے جا رہا تھا۔ تسلسل سے برستی بارش کی وجہ سے سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس پر سونے پہ سہاگا حسبِ روایت شہر کے بیشتر حصوں میں بجلی غائب ہونے کی وجہ سے راستے بھی اندھیرے پڑے تھے۔ اس کا زخمی بازو تقریباً ٹھیک ہو چکا تھا لیکن کافی دن بعد ڈرائیونگ کرنے

کی وجہ سے اسے کچھ بے آرامی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ اسے لاش کو اپنی گاڑی میں منتقل کرنے کے لیے بھی خاصی محنت کرنی پڑی تھی جس کی وجہ سے بازو کے زخم پر خاصا زور پڑا تھا اور وہ وہاں درد کی ہلکی ہلکی لہریں محسوس کر رہا تھا۔ گورا قبرستان سے آگے نکلنے کے بعد اچانک ہی اسے پولیس کی ایک پٹرولنگ کار نے روک لیا۔

''اتنی رات کو وہ بھی ایسے خراب موسم میں کہاں جا رہے ہو صاحب بہادر؟'' ایک اے ایس آئی نے اس کے گاڑی روکنے کے بعد کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے بڑی ترنگ میں پوچھا جبکہ اس کے ساتھ موجود سپاہی ٹارچ سے گاڑی کی پچھلی سیٹوں پر روشنی مار کر وہاں کا جائزہ لے رہا تھا۔

''کیوں اتنی رات کو ایسے موسم میں کہیں جانا خلافِ قانون ہے کیا؟'' اس بے وقت کی پوچھ گچھ نے اس کا موڈ مزید خراب کر دیا اور اس نے تلخی سے الٹا سوال کرتے ہوئے اے ایس آئی کو گھورا۔

''تم تو سچ مچ کے صاحب بہادر ہو بھئی۔ ذرا گاڑی سے باہر آؤ تا پھر تم سے بات کرتے ہیں۔'' اس کا اندازِ گفتگو اختیار کے نشے میں چور اے ایس آئی کو پسند نہیں آیا اور وہ ہاتھ میں پکڑی اسٹک سے گاڑی کی چھت کو بجاتا ہوا سختی سے بولا۔ محسن اس وقت سرکاری جیپ کے بجائے اپنی ذاتی گاڑی میں موجود تھا اور پرانے ماڈل کی یہ کرولا.... ہرگز بھی ایسی نہیں تھی کہ اے ایس آئی کو یہ خدشہ لاحق ہوتا کہ وہ کسی بڑے گھر کے سپوت یا با اختیار آدمی کو چھیڑ بیٹھا ہے، اس لیے اپنے ادنیٰ سے اختیار کے زعم میں پوری طرح سے ڈوبا ہوا تھا۔

''سوچ لو، میرا باہر آنا کہیں تمہیں مہنگا نہ پڑ جائے۔'' اس کے انداز سے متاثر ہوئے بغیر محسن نے اسے دھمکایا۔

''پولیس کو دھمکی دیتا ہے۔ اوئے تلاشی لو اس کی گاڑی کی۔ دیکھو تو یہ ڈکی میں کوئی پاؤڈر واؤڈر تو چھپا کر نہیں لے جا رہا ہے۔ ابھی تو اس کی چھینٹی لگاؤ پھر بعد میں اس کے بڑوں سے نمٹ لیں گے۔'' اے ایس آئی نے اپنے طور پر فرض کر لیا تھا کہ وہ کسی ڈرگ ڈیلر کا بندہ ہے اور شاید مال بنانے کے چکر میں اس کی کھنچائی کرنا چاہتا تھا۔ اس کا ڈکی کی تلاشی لینے کا ارادہ سن کر محسن کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ پولیس میں کتنے ہی اچھے عہدے پر سہی لیکن اگر رات کے اس پہر یہ معمولی عہدے دار اس کی کار کی ڈکی سے لاش برآمد کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو اس کے لیے خلاصی کی کوئی

راہ نہیں رہتی۔ چنانچہ معاملے کو سنبھالنے کے لیے اپنے لہجے میں وقار پیدا کرتا ہوا ذرا سنجیدگی سے بولا۔

"میں اس وقت اپنے ایک ذاتی کام سے جارہا ہوں لیکن اگر آپ لوگوں کو کوئی اعتراض ہی ہے تو پہلے ایک نظر میرے اس کارڈ کو دیکھ لیں۔"

اس کے انداز میں ایسا کچھ تھا کہ اے ایس آئی نے ہاتھ بڑھا کر کارڈ تھام لیا اور ٹارچ کی روشنی میں اس پر ایک نظر ڈالتے ہی بوکھلایا ہوا نظر آنے لگا۔

"آئی ایم سوری سر! ویری ویری سوری۔ آپ سرکاری جیپ میں ہوتے تو ہم سے یہ غلطی نہیں ہوتی۔" کچھ سمجھ نہیں آیا تو وہ سیلیوٹ مار کر وہیں کھڑا معذرت کرنے لگا۔

"اٹس اوکے لیکن ذرا احتیاط کیا کرو۔ شریف شہریوں کو اس طرح تنگ کرنا مناسب نہیں ہے۔" محسن نے نہایت اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً ہی اس کی معذرت قبول کرلی۔ یہ اعلیٰ ظرفی اس کے اپنے حالات کی مجبوری تھی ورنہ عمومی حالات میں تو وہ اس شخص کو تھوڑا بہت سبق ضرور سکھاتا۔

"میں ایک بار پھر معافی چاہتا ہوں سر... بس غلط فہمی ہوگئی تھی۔" اے ایس آئی نے لجاجت سے کہا تو وہ اسے ہاتھ سے 'جانے دو' کا اشارہ کر کے خود گاڑی آگے بڑھا لے گیا اور ٹشو بکس سے ایک ساتھ دو تین ٹشو کھینچ کر اپنے ماتھے پر آیا پسینا صاف کیا۔ آج پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ آدمی جب کوئی مجرمانہ حرکت کر رہا ہوتا ہے تو اندر سے کتنا کمزور اور بزدل ہوجاتا ہے۔ وہ خود پولیس افسر تھا لیکن پکڑے جانے کے ڈر سے نہایت سہما ہوا تھا۔ باقی کا راستہ بھی اس نے دھڑکتے دل سے طے کیا۔ اس کی منزل ملیر ندی تھی جہاں وہ اپنی گاڑی کی ڈکی میں پڑی لاش کو ٹھکانے لگانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ منزل پر پہنچنے کے بعد اس نے گاڑی کو ایک مناسب جگہ کھڑا کیا اور خود باہر نکل کر ڈکی کھولنے لگا۔ ویرانے میں اس وقت اگر کوئی روشنی تھی تو بس اس ٹارچ کی جسے اس نے منہ میں دبا رکھا تھا۔ جیسے ہی ڈکی کھلی، اس کی نظر اس بوری پر پڑی جس میں ایک عدد لاش موجود تھی۔ بوری کو ڈکی میں سے نکالنے سے قبل جانے اسے کیا سوجھی کہ بوری کھول کر لاش کا جائزہ لینے لگا۔ اس شخص نے خاکی رنگ کا پینٹ شرٹ پہن رکھا تھا اور موت کا سبب وہ گولی تھی جو عین اس کے سینے پر ماری گئی تھی۔ خاکی رنگ کی قمیص پر خون کا سرخ دھبا خاصا نمایاں نظر آرہا تھا۔ لاش کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے ذہن کے پردے پر نادیہ کی شبیہ لہرائی۔ یہ نادیہ ہی تھی جس کی وجہ سے وہ اتنی رات گئے ایک لاش کو ٹھکانے لگانے پر مجبور ہوا تھا۔

لاش کی صورت ڈکی میں پڑے شخص سے بے انتہا نفرت کا سبب بھی نادیہ ہی بنی تھی۔ بوری کا منہ بند کرنے سے پہلے اس نے مردہ شخص کے چہرے پر آخری نفرت بھری نگاہ ڈالی اور پھر بوری کا منہ بند کردیا۔ مشکل سے ڈکی میں ٹھونسی گئی لاش کو باہر نکالنے میں اسے خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑا لیکن بہرحال اس کے ورزشی جسم نے یہ کام انجام دے ہی ڈالا۔ لاش چھپاکے سے ندی کے پانی میں گری اور اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ وہ بھیگتا ہوا واپس گاڑی میں آبیٹھا۔ گاڑی کو واپسی کے راستے پر ڈالتے ہوئے اسے یقین تھا کہ دنیا کو ایک مکروہ وجود سے نجات مل چکی ہے جس کے قتل کا سراغ لگانا بھی مشکل ہوگا۔ بارش جس تسلسل سے ہو رہی تھی توقع یہی تھی کہ ندی میں طغیانی آجائے گی اور لاش بہہ کر جانے کہاں سے کہاں نکل جائے گی بلکہ پولیس کے لیے تو یہ تعین کرنا بھی ممکن نہ ہوسکے گا کہ لاش کو کس مقام سے ندی میں پھینکا گیا ہے کیونکہ جب ندی میں طغیانی آتی تھی تو وہ سڑک بھی زیرآب آجاتی تھی اور ظاہر ہے پانی اترنے کے بعد وہاں ایسی کسی نشانی کے باقی رہنے کا امکان نہیں تھا جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ لاش کو کون سی گاڑی میں لاکر، کس جگہ سے سپردِ آب کیا گیا تھا۔

☆☆☆

محسن بہت عجیب انداز میں قتل کی اس واردات کا حصہ بنا تھا۔ گھر میں رہ رہ کر اس کے سونے جاگنے کے معمولات بگڑ چکے تھے اور اکثر راتوں کو اسے نیند نہیں آتی تھی۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب چاہے ثروت بیگم چھٹی بڑھانے پر کتنا ہی اصرار کریں، وہ کل پرسوں تک دوبارہ اپنی ڈیوٹی جوائن کر لے گا۔ اس کا بازو اب بہت بہتر حالت میں تھا۔ اس برستی رات میں روٹھی نیند کو منانے کی تمام تدبیریں ناکام ہوجانے کے بعد وہ بستر چھوڑ کر کمرے سے نکل کر ٹیرس پر آگیا تھا۔ ٹیرس پر اِدھر سے اُدھر ٹہل کر اسموکنگ کرتے ہوئے اس کی نظر بار بار نادیہ کے گھر کی طرف اٹھ جاتی تھی اور دل میں ایک کسک سی اٹھتی تھی کہ اس نے دل لگایا بھی تو ایسی بدکردار لڑکی سے جو بغیر شادی کے ہی ماں بن بیٹھی تھی اور یقیناً اپنے باپ کو بھی ایک ناقابلِ بیان اذیت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اسی طرح کی باتیں سوچتا ہوا وہ ایک بار پھر ٹیرس کے اس حصے میں پہنچا جہاں سے نادیہ کے گھر کا کھلا حصہ نظر آتا تھا۔ اسے وہاں کچھ ہلچل کا احساس ہوا۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوگیا

کہ وہ نادیہ تھی جو بھاگتی ہوئی اندر سے باہر نکلی تھی۔

''واپس آجاؤ نادیہ ورنہ بہت برا ہوگا۔'' سناٹے میں اسے حاکم صاحب کی آواز سنائی دی۔

''ہرگز نہیں۔'' نادیہ کا انداز کچھ ہیجانی تھا۔

''اگر تم واپس نہیں آئیں تو میں تمہیں گولی مار دوں گا۔'' حاکم صاحب نے اسے دھمکایا اور ساتھ ہی محسن کو ایک کھڑکی سے ان کا ریوالور بردار ہاتھ نظر آیا۔ باہر کے مقابلے میں اندر روشنی تھی اس لیے وہ حاکم صاحب کے ہاتھ کو واضح طور پر دیکھ سکتا تھا لیکن ان کا چہرہ اس کے سامنے نہیں تھا۔ کھڑکی پر بھاری پردہ پڑا ہوا تھا اور انہوں نے پردے کو سرکا کر بس ایک ہاتھ ذرا سا باہر نکال رکھا تھا۔ ان کی آواز بھی زیادہ بلند نہیں تھی۔ اگر محسن اس طرف متوجہ نہ ہوتا تو شاید ان باپ بیٹی کے درمیان جاری مکالمہ سننے میں ناکام رہتا۔

''مار دیں گولی... ایسے جینے سے تو مرنا ہی بہتر ہے۔'' نادیہ کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

''سالی دن رات عیش کرتی ہے پھر بھی رونا گانا چلتا رہتا ہے۔'' جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولتے وہ کہیں سے وہ حاکم صاحب نہیں لگ رہے تھے جن سے وہ واقف تھا۔

''عیاش تو تم ہو جسے کسی رشتے کا پاس نہیں۔'' نادیہ کا لہجہ نفرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ محسن کے حواس پر گویا بجلی سی گری۔

''اگر تم فوراً اندر نہیں آئیں تو میں تمہاری بچی کا گلا دبا دوں گا۔'' حاکم صاحب نے مکروہ لہجے میں اسے دھمکایا اور اس بار نادیہ کچھ کمزور پڑتی نظر آئی۔

''تم ایسا نہیں کرسکتے۔ وہ معصوم اور بے قصور بچی ہے۔'' بولتے ہوئے اس کی آواز کانپ گئی تھی۔ محسن نے یہ بات خصوصیت سے نوٹ کی کہ اس کے اندازِ گفتگو میں اس ادب واحترام کا نام ونشان بھی نہیں ہے جو باپ بیٹی کے رشتے میں پایا جاتا ہے۔

''تم جانتی ہو کہ میں کچھ بھی کرسکتا ہوں۔ شاباش اب جلدی سے اندر آجاؤ اور میرا موڈ مزید خراب مت کرو۔'' عجیب سے لہجے میں دیے گئے اس حکم پر نادیہ اس انداز میں پیر گھسیٹتی واپس پلٹی جیسے اپنے کندھوں پر اپنی لاش اٹھا رکھی ہو۔ باہر اندھیرا ہونے کے باعث محسن اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ وہ رو رہی ہے۔ وہ سن سا اپنی جگہ کھڑا اسے اندر جاتا دیکھتا رہا۔ جو کچھ اس وقت اس نے سنا اور دیکھا تھا، اس سے یہی اندازہ ہورہا تھا کہ نادیہ کے حالات کو سمجھنے میں اس سے غلطی ہوگئی ہے۔ وہ دوڑتا ہوا اپنے کمرے میں گیا اور اپنا پستل نکال لیا۔ حقائق جاننے کے لیے

آج اس کا نادیہ کے گھر میں گھسنا ناگزیر تھا۔ اپنے ٹیرس سے وہاں اترنے میں اسے زیادہ مشکل پیش نہیں آئی لیکن دروازہ بند ہونے کے باعث اس کی گھر کے اندر تک رسائی ممکن نہیں تھی۔ مجبوراً اس نے اس کھڑکی کا رخ کیا جہاں کچھ دیر قبل حاکم صاحب کا پستل بردار ہاتھ نظر آیا تھا۔ کھڑکی کا پٹ کھلا ہوا تھا اور اندر سے بچی کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ محسن نے نہایت احتیاط سے پردے کو بس اس حد تک کھسکایا کہ اس میں ہلکی سی جھری بن جائے جس سے وہ اندر کا نظارہ کر سکے۔ اندر کا منظر زیادہ خلافِ توقع نہیں تھا۔

حاکم صاحب ایک صوفے پر اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ انہوں نے اپنے پیر سامنے رکھی میز پر پھیلا رکھے تھے اور پیروں کے پاس ہی ان کا پستل بھی رکھا ہوا تھا۔ نادیہ ان کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کا انگوری رنگ کا لباس بارش میں بھیگ جانے کے باعث بدن پر چپک رہا تھا اور کئی مقامات سے جلد کی گلابی رنگت جھلک رہی تھی۔ وہ دوپٹے سے بے نیاز تھی اور اس کے ریشمی بال بھیگ کر لٹوں کی صورت میں اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر بے بسی اور مجبوری چھائی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ اس لڑکی نے ماضی میں بدکاری جیسا گھناؤنا فعل انجام دیا ہے۔ آنسوؤں سے لبالب آنکھیں لیے وہ اپنے گلابی ہونٹوں کو بیدردی سے دانتوں سے کچل رہی تھی اور اس کی نظریں رہ رہ کر اس کاؤچ کی طرف اٹھ رہی تھیں جس پر اس کی شیرخوار بیٹی لیٹی ہوئی بری طرح رو رہی تھی۔

''جاؤ میرے لیے ایک گلاس دودھ لے کر آؤ۔ تمہارے بیکار کے نخروں نے میرے سارے موڈ کا ستیاناس کردیا ہے اور اب تمہیں اس کی سزا بھگتنی ہوگی۔''

حاکم کی طرف سے دی جانے والی دھمکی نے نادیہ کے جسم پر کپکپاہٹ طاری کردی اور وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''کچھ تو اللہ سے ڈرو اور میرا پیچھا چھوڑ دو۔ آخر کب تک اپنے کالے کرتوت چھپانے کے لیے اِدھر سے اُدھر بھاگتے رہوگے؟''

''بکواس بند کرو اور جو میں نے کہا ہے وہ کرو۔'' حاکم جواباً زور سے دہاڑا تو نادیہ روتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔ اس کی بچی بدستور اپنی جگہ پڑی رو رہی تھی جبکہ محسن کھڑکی میں سن سا کھڑا تھا۔ اس کی عقل اندر کے منظر کا جو مفہوم سمجھا رہی تھی، دل اس کو ماننے کے لیے قطعی راضی نہیں تھا۔ چنانچہ وہ منتظر تھا کہ صورتِ حال کچھ اور کھل کر اس کے سامنے آجائے۔ نادیہ دودھ کا گلاس لیے جلد ہی واپس آگئی اور

جھک کر گلاس میز پر رکھنا چاہا۔

''اس بھیگے لباس میں تو تُو بہت ہی غضب ڈھا رہی ہے۔'' یہ الفاظ کسی باپ کے نہیں ہوسکتے تھے۔ محسن مرد ہوکر بھی اندر سے کانپ گیا۔ اگلا لمحہ اس کے لیے حیرت انگیز تھا۔ نادیہ نے دودھ کا گلاس میز پر رکھنے کے بجائے یکدم ہی حاکم کے منہ پر دے مارا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ اس اچانک حملے سے سنبھلتا، نادیہ نے میز پر اس کے پیروں کے پاس رکھا پستل اٹھا لیا۔

''یہ... یہ تم کیا کررہی ہو؟'' اس کا ارادہ بھانپ کر حاکم نے ہکلاتے ہوئے پوچھا اور اپنے پیر میز سے اتارنے کی کوشش کی۔

''کاش میں یہ بہت پہلے کرپاتی۔'' وہ ہیجانی لہجے میں بولی اور ٹریگر دبا دیا۔ اس کے پستل پکڑنے کے انداز نے محسن کو اس کے اناڑی ہونے کا بتا دیا تھا لیکن آج شاید حاکم کا یومِ حساب تھا۔ گولی پستل سے نکلی اور سیدھی حاکم کے سینے میں گھس گئی۔ وہ کسی ذبح کیے جانے والے جانور کی طرح ڈکرایا اور صوفے سے نیچے گرا۔ اپنے اس کارنامے پر خود ہی دم بخود رہ جانے والی نادیہ کے ہاتھ سے پستل گر گیا اور وہ آنکھیں پھاڑے فرش پر گر کر تڑپتے حاکم کو دیکھنے لگی۔ محسن بھی گویا سکتے کی کیفیت سے باہر آیا۔ اسے امید تھی کہ بارش کے شور میں اپنے آرام دہ بستروں میں دبکے لوگوں نے گولی چلنے کی آواز اور حاکم کی آخری چیخ نہیں سنی ہوگی۔ اس نے نادیہ کو دھیمی آواز میں پکارا۔ اس کی پکار سن کر وہ تڑپ کر کھڑکی کی طرف پلٹی اور اسے وہاں پاکر مزید متوحش نظر آنے لگی۔

''دروازہ کھولو نادیہ... میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔'' محسن نے اپنے لہجے کو اتنا نرم رکھا کہ اسے یقین آجائے کہ وہ سچ مچ اس کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ نادیہ نے کسی سحرزدہ انسان کی طرح اس کی بات پر عمل کیا۔

''میں نے دنیا کو اس شیطان کے وجود سے پاک کر دیا۔'' وہ اندر داخل ہوا تو اس نے حاکم کی فرش پر پڑی لاش کی طرف اشارہ کرکے نہایت معصومانہ انداز میں بتایا۔

''بہت اچھا کیا۔ یہ شخص اسی لائق تھا۔'' محسن نے خود کو ایک ایسی بات کہتے سنا جس کی عام حالات میں وہ خود سے امید نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ قانون کا محافظ تھا اور اصولاً اسے کسی صورت میں ایک انسان کے قتل کی حمایت نہیں کرنا چاہیے تھی لیکن ضروری تو نہیں کہ لباس پہن کر دو ٹانگوں پر چلنے والی ہر مخلوق کو انسان مان لیا جائے۔ کم از کم وہ حاکم جیسے مکروہ شخص کو انسان تسلیم نہیں کرسکتا تھا۔

''تم نے جو کیا بالکل صحیح کیا لیکن اب خود کو سنبھالو اور اس معصوم کو بھی دیکھو پھر ہم تسلی سے بیٹھ کر اس معاملے پر بات کریں گے۔'' وہ دیکھ رہا تھا کہ نادیہ شدید شاک کی حالت میں ہے اس لیے نرمی سے اسے سمجھایا۔ شکر کہ اس نے فوری طور پر اس کی بات سمجھ لی اور بچی کے لیے فیڈر تیار کر لائی۔ ننھی جان رو رو کر اس حد تک ہلکان ہوچکی تھی کہ اب اس کی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ نادیہ نے اس کے منہ سے فیڈر لگایا تو وہ بے تابی سے دودھ پینے لگی اور فیڈر میں موجود پورا دودھ ختم ہونے سے پہلے ہی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

''اب بتاؤ کہ یہ سارا چکر کیا ہے؟ جو کچھ میں نے دیکھا اور سمجھا ہے، اس نے مجھے چکرا کر رکھ دیا ہے اور مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ شخص سچ مچ تمہارا باپ ہے۔'' محسن کی الجھن سوال بن کر اس کے لبوں پر آگئی۔

''یہ میرا سگا باپ نہیں بلکہ میری ماں کا دوسرا شوہر ہے۔'' نادیہ نے انکشاف کیا اور پھر ایک معمول کی طرح اس کو ساری تفصیلات سے آگاہ کرتی چلی گئی جس کے مطابق اس کی ماں نے اس کے باپ کے مرنے کے کئی سال بعد حالات سے مجبور ہوکر حاکم سے شادی کی تھی۔ وہ خوب صورت تھی اور مردوں کے اس معاشرے میں کسی مرد کے بغیر زندگی گزارنا ناممکن ہوگیا تھا۔ خصوصاً اپنے والدین کے انتقال کے بعد کوئی بھائی بہن نہ ہونے کی وجہ سے بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ حاکم علی نے اسے سہارا تو دیا لیکن جیسے جیسے نادیہ بڑی ہوتی گئی، اس کی نیت میں فتور آتا چلا گیا۔ نادیہ کو شک تھا کہ اس کی ماں کی موت طبعی نہیں تھی بلکہ حاکم نے سلو پوائزن دے کر... اسے قتل کیا تھا۔ یہ شک اس کے دل میں اس وقت آیا جب ماں کے مرنے کے بعد اسے حاکم کا اصل چہرہ دیکھنے کو ملا۔ وہ فطرتاً بزدل تھی۔ حاکم نے اسے کچھ اس طرح ڈرایا کہ وہ خوف زدہ ہوکر اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کو کسی کے سامنے لبوں پر لانے کی جرأت نہیں کرسکی لیکن آخر کب تک یہ گھناؤنا جرم چھپتا؟ اس نے نادیہ کی کوکھ میں پنپنا شروع کر دیا۔ نادان و ناتجربہ کار نادیہ فوری طور پر اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکی اور جب بات سمجھ آئی تو اتنی دیر ہوچکی تھی کہ اس کی کوکھ میں پھوٹنے والی کونپل کو مسلنا ممکن نہیں تھا۔ حاکم علی نے عجلت میں اپنے ٹرانسفر کا بندوبست کیا اور راتوں رات وہ لوگ کراچی منتقل ہوگئے۔ حاکم علی کے رویے کی وجہ سے محلے داروں کا ان کے گھر آنا جانا نہیں تھا اس لیے کسی کو معلوم نہ ہوا کہ نادیہ پر کیا بیت رہی ہے اور وہ اسے لے کر ایک من گھڑت داستان کے ساتھ یہاں منتقل ہوگیا۔

''اس بچی کے وجود نے مجھے میری بزدلی سے نجات دلائی اور میرے اندر یہ ہمت پیدا ہوئی کہ میں حاکم کے ظلم کے خلاف بول سکوں کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ میں اس معصوم جیسی مزید ننھی جانوں کو دنیا میں لانے کے گناہِ عظیم کی مرتکب ہوں۔ میں نے جو کچھ کیا، مجھے اس پر کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔ آپ مجھے گرفتار کرلیں اور تھانے لے چلیں۔ میں اپنے کیے کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔'' ساری داستان سنانے کے بعد نادیہ نے اس سے یہ الفاظ کہے تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''کیا سوچ رہے ہیں آپ؟ گرفتار کیوں نہیں کرتے مجھے؟'' وہ ہذیانی سے انداز میں بولی تو محسن اٹھ کر اس کے قریب گیا اور اس کا شانہ تھپکتے ہوئے رسان سے بولا۔

''میری بات کو ذرا ٹھنڈے دل سے سنو نادیہ! اس کے بعد تم جو فیصلہ کرو گی مجھے منظور ہوگا۔'' وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم حاکم کے قتل کا اعتراف نہیں کرو۔ یہ لاش میں کہیں ٹھکانے لگا دوں گا۔ تم لوگوں سے کہہ دینا کہ رات تمہاری بچی کے پیٹ میں شدید درد تھا۔ حاکم بچی کے لیے دوا لینے گھر سے نکلا اور واپس نہیں آیا۔ لاش ملنے یا نہ ملنے دونوں صورتوں میں لوگ یہی سمجھیں گے کہ حاکم شہر میں آئے روز ہونے والی کسی واردات کا شکار ہوگیا ہے۔ اس قسم کی اموات ہمارے ہاں ایسا معمول بن گئی ہیں کہ اب کوئی اس سلسلے میں زیادہ چھان بین نہیں کرتا۔ تم نے ابھی خود یہ تجربہ کرلیا ہے کہ گولی چلنے کی آواز پر کوئی متوجہ نہیں ہوا کیونکہ اس شہر کے باسی ان آوازوں کے اتنے عادی ہوگئے ہیں کہ سن کر بھی نہیں سنتے۔''

''لیکن کیوں... آپ مجھے کیوں بچانا چاہتے ہیں؟'' محسن کی بات سن کر وہ حیران ہوئی۔

''اس سوال کا ایک بہت سادہ سا جواب تو یہ ہوسکتا ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تمہیں مزید برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتا لیکن یہ پورا سچ نہیں ہے۔ اگر میرے دل و دماغ تمہیں مجرم مانتے تو میں تم سے بے حد محبت کرنے کے باوجود تمہیں قانون کی گرفت میں دیکھنا پسند کرتا۔ اس قتل پر پردہ ڈالنے کے لیے میرے پاس دو بڑی وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ تمہاری اور اس بچی کی زندگی تباہی سے بچانا ہے۔ یہ کیس عوام کے سامنے آیا تو چاہے تم سزا سے بچ جاؤ لیکن آگے کی زندگی تم دونوں ماں بیٹی کے لیے بہت کٹھن ہوجائے گی۔ ہمارا یہ ظالم معاشرہ کبھی تمہیں سکھ سے جینے نہیں دے گا۔

دوسری وجہ اور بھی نازک ہے۔ تمہاری ماں کی طرح کتنی ہی عورتیں مجبور ہوتی ہیں کہ پہلے خاوند کی موت یا طلاق وغیرہ کی صورت میں دوسری شادی کریں۔ اس طرح نہ صرف انہیں سہارا مل جاتا ہے بلکہ ان کے بچوں کو باپ کا سایہ بھی... لیکن اگر تمہارے حالات سامنے آئے تو ایسی کتنی ہی عورتیں تذبذب میں پڑ جائیں گی۔ ایک ایسا رشتہ جو عزت و احترام کا حق دار ہے شکوک و شبہات کی دھند میں لپٹ جائے گا۔ دنیا میں ہر مرد حاکم نہیں ہوتا لیکن ایسی ہر عورت جو تمہاری ماں جیسے حالات سے دوچار ہوگی، اسی خدشے میں مبتلا ہوجائے گی کہ ''سوتیلے باپ'' کی صورت کہیں وہ اپنے بچوں کو عذاب میں تو مبتلا نہیں کرنے جارہی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ قصہ بس یہیں اسی کمرے میں ختم ہوجائے اور آج کے بعد تم اپنی زندگی کے اس بھیانک دور کے بارے میں سوچو بھی نہیں۔'' ٹھہر ٹھہر کر نرمی سے بولتے محسن کی بات نادیہ کے دل کو لگی اور وہ اس کی بات پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوگئی۔ اس کے بعد حاکم کی لاش کو بوری میں بند کرکے محسن کی گاڑی میں منتقل کرنے اور غرق آب کرنے کے مراحل کس مشکل سے طے پائے، یہ تفصیل غیر اہم ہے۔ اہمیت اس بات کی تھی کہ محسن خاموشی سے یہ کام [illegible] میں کامیاب ہوگیا تھا اور ایک انسانیت دشمن کو اس [illegible] بالکل بھی نادم نہیں تھا۔ اس کے نز[illegible] اس مردہ متعفن کتے کی لاش [illegible] فلاح عامہ کے لیے مناسب طریقے سے ٹھکانے لگا [illegible] دیتا ہے ورنہ اس کا تعفن کسی کو سکھ سے نہیں جینے دیتا۔

واپسی کا سفر طے کرتے ہوئے اس کے ذہن میں یہ الجھن البتہ ضرور تھی کہ جانے نادیہ اس کی محبت کو قبول کرے گی بھی یا نہیں کیونکہ دودھ کا جلا تو چھاج بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ اپنے سوتیلے باپ کے انسانیت سوز ظلم کو سہنے کے بعد جانے اسے اپنی بیٹی کے لیے ایک ''سوتیلا باپ'' قبول ہوتا بھی یا نہیں؟ یہ سارے سوالات بہرحال بعد کے تھے۔ ابھی تو اسے ایک اچھے پڑوسی کی طرح حاکم صاحب کی گمشدگی کی ''اطلاع'' سن کر نادیہ کی ''مدد'' کرنی تھی اور نہایت صفائی سے یہ کیس نمٹانا تھا۔ بعد میں اپنے خلوص سے وہ نادیہ پر ثابت کرسکتا تھا کہ وہ اس کی بچی کا سوتیلا باپ نہیں بلکہ صرف ''باپ'' بننے کا اہل ہے کیونکہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اور حاکم جیسے کردار جو معاشرے کا ناسور ہیں، اللہ کے فضل و کرم سے بہت ہی کم ہوتے ہیں۔

☆